(ماہ نامہ)

سب رس



ادارہ ادبیات اردو

حیدر آباد دکن

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ضروری اطلاع

نیا سال شروع ہو چکا ہے جن خریدار اصحاب نے ابتک چندہ ادا نہیں فرمایا وہ براہ کرم اپنا چندہ تقسیم کنندۂ سب رس سے دفتر ہذا کی مطبوعہ رسید حاصل فرما کر عنایت کریں یا بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمادیں۔

اضلاع کے اصحاب بھی اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجکر شکریہ کا موقع عطا فرمائیں یا دفتر ہذا کو وی پی کرنے کا آرڈر روانہ کریں۔

جن خریدار اصحاب کے نام رسالہ وی پی سے بھیجا جا رہا ہے ان کی علم دوستی سے توقع ہے کہ وہ ضرور وی پی حاصل فرما کر اپنی اردو نوازی کا ثبوت دیں گے۔ رسالہ ہر ماہ ۱۵ تاریخ تک نہ ملے تو براہ کرم ۲۰ تاریخ تک دفتر ہذا کو مطلع فرمادیں۔ مہینہ گزر جانے پر اطلاع دینے سے تعمیل ارشاد میں مجبوری ہے۔ کیونکہ مہینے کے ختم پر رسالے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

خواجہ حمید الدین بی اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شایع ہوا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible]

[illegible]



حضرت والا شان ڈاکٹر شہزادہ معظم جاہ بہادر 'شجیع'

ﷲ

[illegible]

[illegible]

١٤١٣

شالامار

ہمیں مطلوب سیرِ باغ نہیں
دل میں جا باقی بہرِ داغ نہیں

کون کہتا ہے شالامار ہے تو
عہدِ ماضی کی یادگار ہے تو

تری ہر جا پہ داستانیں ہیں
جتنے منہ اتنی ہی زبانیں ہیں

غم سے اب غیر حال ہے تیرا
سبزہ بھی پائمال ہے تیرا

تیرے پھولوں کا رنگ باسی ہے
تیرے سبزہ پہ بھی اداسی ہے

صاف رنگِ خزاں بہار میں ہے
شور نوحے کا آبشار میں ہے

باعثِ ننگ کا شمب ہیں پھول
لٹ گیا سارا زر فقیر ہیں پھول

یاد آتے ہیں پہلے نظارے
رو رہے ہیں تمام فوارے

لبِ فوارہ پر سخن جاری
سر بلندی میں ہے نگوں ساری

یوں کبھی تھے ترے گلاب کے پھول
جیسے سینہ پہ ہوں شباب کے پھول

رنگ اب وہ نہیں وہ آب نہیں
اک کتابِ الم گلاب نہیں

سبز ہیں یا کہ زرد ہیں پتے
صاف تصویرِ درد ہیں پتے

آتشِ غم میں جلتے ہیں پتے
کفِ افسوس ملتے ہیں پتے

غم کی تصویر ہیں شکستہ ہیں
جتنی کلیاں ہیں دل گرفتہ ہیں

چار سو جو گلوں کے تھالے ہیں
باغباں کے جگر کے چھالے ہیں

حالِ گلشن ہے اب تو آئینہ
پھٹ گیا غم سے کوہ کا سینہ

ہیں وہ روتے صفیں سفیدوں کی
یا قطاریں ستم رسیدوں کی

کیا گھنی چھاؤں ہے چناروں کی
یہ بستی ہے غم کے ماروں کی

دلِ مجروح کو مسلتی ہیں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں

کوئی آخر کہاں تک چھانٹے
ہیں گلوں میں ہزار ہا کانٹے

ایک حسرت سی آج پھیلی ہے
چاندنی بھی تو میلی میلی ہے

شکل ہر ایک بے قرار سا ہے
پتے پتے میں اضطرار سا ہے

ذکرِ سبزہ ہے اب تو افسانہ
تھا جو اپنا بھی ہے وہ بیگانہ

ٹکنے اک جا بھی یہ نہیں پایا
لوٹتا ہے زمیں پر سایا

کیا اثر ہو چلا ہے آہوں میں — چھا گیا ہے دھواں نگاہوں میں
چھائی تاریکی ہے سفیدوں پر — پانی اب پھر گیا امیدوں پر
چشم نرگس کی اُف رے حیرانی — ہو گیا خشک آنکھوں کا پانی
دولت دید کھو چکی نرگس — اپنی آنکھوں کو رو چکی نرگس
کس کے ماتم کا ہائے ساماں ہے — زلف سنبل کی جو پریشاں ہے
غم فرقت سے زار و محزوں ہے — پیکر عشق بید مجنوں ہے
غم کبر اک سے فزوں چنار کا ہے — یہ تو پروردہ ہی بہار کا ہے
کب ایک آخر مصیبتیں جھیلیں — گلے مل مل کے روتی ہیں بیلیں
کون پرساں ہے غم کے ماروں کا — دل دھڑکتا ہے آبشاروں کا
ہل رہا ہے ہوا سے یوں گل درد — دل میں جیسے کسی کے ہو تا ہے درد
اب کہاں گل عذار جھولوں پر — پڑ گئی اوس تیرے پھولوں پر
بجھ گیا عہد مغلیہ کا چراغ — لالہ کے دل میں آج تک ہے داغ
گل صد برگ کا ہر ایک ورق — بے ثباتی کا دے رہا ہے سبق
کیا ہری دوب ہے کناروں پر — چادریں سبز ہیں مزاروں پر
بلبلوں کے لباس ہیں کالے — قمریوں کے اداس ہیں نالے
چلتی کس زور سے ہوائیں ہیں — اناللہ کی صدائیں ہیں
سرو کو دیکھ کر قرینے سے — آہ نکلی زمیں کے سینے سے
قمقمے ہیں جو ضو فشانی میں — آگ روشن ہے آج پانی میں
کون کہتا ہے شالامار ہے تو — دور اسلام کا مزار ہے تو
وہ تزک ہے نہ احتشام ہے اب — خاص جو تھا وہ باغ عام ہے اب
سب چلے آرہے ہیں روکے انہیں — کوئی درباں نہیں جو ٹوکے انہیں
کیا عبرت فزا یہ منظر ہے — اب جہانگیر ہے نہ اکبر ہے
ہائے کیا عہد تھا جہانگیری — اب وہ کشمیر ہے نہ کشمیری
ہائے تفریح گاہ شاہ جہاں — اب وہ تفریح کرنے والے کہاں
آئے جہانگیر کی تفریح گاہ — پھر گئی تجھ سے آسماں کی نگاہ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(١)

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

(٢)

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(ސޯލޯ) ------------ ކޯރަސް

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

(ސޯލޯ) ------------ ކޯރަސް

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

(ސޯލޯ) ------------ ކޯރަސް

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

(ސޯލޯ) ------------ ކޯރަސް

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

([illegible])

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ނިމުނީ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(٨)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

الحمد لله

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

زندگی

زندگی جبرِ مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں

وقت کے آہنی انداز سمجھتی ہی نہیں — فکر کی لغزشِ پرواز سمجھتی ہی نہیں
خامشی، لذتِ آواز سمجھتی ہی نہیں — کون ہے مونس و دمساز سمجھتی ہی نہیں
ایک مظلوم عقیدت کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی جبرِ مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں

چشمِ مجروحِ نظارہ ہے، نظر خوابیدہ — آہ، محرومِ اثر، ذوقِ اثر خوابیدہ
روح محبوس، غمِ فتنہ و شر خوابیدہ — عقل مفلوج، دلِ حوصلہ گر خوابیدہ
ایک انجانِ ارادت کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی جبرِ مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں

نیتِ شوقِ فراواں سے خبردار نہیں — فطرتِ حسنِ بہاراں سے خبردار نہیں
لعنتِ شورشِ دوراں سے خبردار نہیں — ایک دریا ہے جو طوفاں سے خبردار نہیں
ایک سہمی ہوئی لذت کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی جبرِ مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں

لاکھ افلاک پہ چمکا ہی کئے شمس و قمر — لاکھ نظروں میں دمکتے ہی رہے لعل و گہر
لاکھ شبنم سے سنورتے ہی رہے غنچۂ تر — رات کی بالیں پہ روتا ہی رہا انجمِ سحر
ایک محسوس حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی جبرِ مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں

قہقہے، انجمنِ ناز میں مہ پاروں کے — زمزمے پہلوئے ناہید میں سیاروں کے
چہچہے فطرتِ فیاض کے شہ کاروں کے — ولولے عہدِ جوانی کے جگرداروں کے
ایک بیباک ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی جبرِ مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں

خونِ خورشید سے رنگین سایۂ دامنِ شام — یہ دہکتے ہوئے گلشن یہ سلگتے در و بام
یہ بعنوانِ بغاوت، کسی ساقی سے کلام — یہ دمکتے ہوئے چہرے یہ چھلکتے ہوئے جام

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

١٦

[illegible]

محذوف ہے۔ یہ تقدیر زبان میں جائز ہے۔ اس خلا کو ذہن بھر لیتا ہے۔ بلکہ تکرار کے ساتھ (ل ل) نے جو بیقراری کا مفہوم پیدا کر دیا وہ حسن مضمون میں اضافہ کر رہا ہے۔

آیا کہ دل گیا کوئی پوچھے تو کیا کہوں
(۴) یہ جانتا ہوں دل اِدھر آیا اُدھر گیا

اس شعر پر نواب صاحب کا اعتراض عجیب ہے۔ فرماتے ہیں:۔

" اس شعر میں دل کا آنا کس معنی میں استعمال ہوا ہے؟
اگر لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے "آنا جانا" تو
عاشق کا دل ٹینس بال ٹھیرا یعنی ادھر آیا ادھر گیا۔
مگر "دل آنا" مجازاً عاشق ہونا کے معنی میں استعمال
ہوا ہے تو جب بھی ادھر آیا ادھر گیا سے کیا مراد ہے؟"

نواب صاحب نے تامل نہیں فرمایا ورنہ اس اعتراض کا محل نہ تھا۔ دل کا آنا اور جانا دونوں مجازی معنوں ہی میں استعمال ہو سکتے ہیں اور فانی نے بھی دوسرے مصرع میں مجازاً ہی لکھے ہیں۔ یہاں لغوی معنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن پہلے مصرع میں بطور صنعت قول بالموجب کے لغوی معنوں سے لطف بیان پیدا کیا ہے۔ اور بہت دلچسپ شعر نکالا ہے۔ اس طرح کسی محاورہ کے لغوی و مجازی پہلوؤں سے مضمون پیدا کرنا اصل میں متقدمین کا طرز تھا۔ اُن بزرگوں نے لفظوں سے بہت کھیل کھیلے ہیں۔ فانی کا یہ انداز نہیں۔ پھر بھی ان کے کلام میں کہیں کہیں نظر آ جاتا ہے۔

"دل آنا" کی طرح "دل جانا" بھی مجازاً عاشق ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً

مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے (میر تقی میر)

لیکن اس محاورے میں دل کا ہاتھ سے جاتا رہنا بھی مفہوم ہوتا ہے جیسا کہ مرزا داغ کے اس مطلع میں عیاں ہے۔

دل گیا۔ تم نے لیا، ہم کیا کریں
جانے والی چیز کا غم کیا کریں

یا جیسے مومن خاں دہلوی اس سے بھی زیادہ تصریح کرتے ہیں۔

کیا لگاوٹ دل آرام سے ہاتھ
دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ (مومن)

آئینہ جلدی سے ٹپک دو کہیں
دل ہی نہیں ہاتھ سے دیکھو گیا (مومن)

انہی محاوروں کی بنا پر فانی کہتے ہیں کہ یہاں تو یہ حال ہے کہ دل کا آنا اور جانا ایک ہی بات ہے۔ آنے جانے میں کوئی وقفہ نہیں۔ اودھر آیا ادھر گیا۔ کہنے کو آتا ہے، لیکن اصل میں جاتا ہی ہے۔ یا یوں سمجھو کہ دل ادھر آیا (عاشق ہوئے) ادھر گیا (پہلو سے، ہاتھ سے، کام سے) اب اگر کوئی پوچھے کہ "دل آیا کہ گیا؟" تو بتاؤں میں کیا جواب دوں۔

شاید کہ شام ہجر کے مارے بھی جی اٹھے
(۵) صبح بہار حشر کا چہرہ اُتر گیا!

"جی اٹھے" یہ الفاظ صاف بتلا رہے ہیں کہ "شام ہجر کے مارے" "کشتگان شام ہجر" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن اردو میں اس کے معنی ہیں "وہ لوگ جن کو شام ہجر نے ستایا ہے" جیسے مصیبت کا مارا، مصیبت زدہ کا ترجمہ ہے، "کشتۂ مصیبت" کا نہیں۔

جیسا میں نے اوپر عرض کیا فانی کبھی کبھی رعایت الفاظ سے بھی کام لیتے ہیں۔ اسی غرض سے "جی اٹھے" کے تضاد کی خاطر "شام ہجر کے مارے" کہہ دیا لیکن اس کے معنی "کشتگان شام ہجر" کے نہیں لئے ہیں بلکہ "شام ہجر کے ستائے ہوئے عاشق بھی جی اٹھے"۔ اس لئے کہ جی اٹھنے کے تذکرے کے لئے کشتے یا مردے کا لفظ لانا ضروری نہیں ہے۔ فانی کے مصرع میں

(مارے) اور (بھی اچھے) آنے سے ایہام تضاد کا حسن پیدا ہو گیا ہے۔
مجھے فانی کے اس شعر پر ایک اور اعتراض ہے جو نواب صاحب کے اعتراض سے الگ ہے۔ یعنی دوسرے مصرع میں لفظ "ہمارا" نے کوئی خاص فائدہ نہیں دیا۔ "صبح حشر" کہنا کافی تھا۔

اس کے بعد کے شعر میں فانی نے (صدقہ اتر گیا) لکھا ہے۔ اس پر نواب صاحب کا یہ اعتراض درست ہے کہ "صدقہ اترجانا" صحیح نہیں، "صدقہ اترنا" اردو میں مستعمل ہے۔

اب میں "نقد سخن" کے سلسلے کو توڑ کر مختلف اشعار کی تنقید اور اپنی رائے لکھتا ہوں۔ مجھے "نقد سخن" کے اشعار نمبر ۸، ۹ میں بھی نواب صاحب کی تنقید سے اختلاف ہے۔ لیکن ہر شعر پر کچھ نہ کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ آئندہ اشعار کے نمبر اس مضمون کے سلسلے سے ہیں۔

مجھے خبر ہے! ترے تیر بے پناہ کی خیر
(۹) بہت دنوں سے دل ناتواں نہیں ملتا

نواب صاحب فرماتے ہیں۔

دوسرے مصرع میں الفاظ سبق کے لحاظ سے ردیف "نہیں ملتا" صحیح نہیں۔ یہ مقام "نہیں ملا" کا ہے۔

میری رائے میں (نہیں ملتا) سے تلاش کا جاری ہونا پایا جاتا ہے۔ اس لئے اسی میں زیادہ معنویت ہے۔ یہ مفہوم ہے کہ ہم بہت دنوں سے ڈھونڈھ رہے ہیں۔ لیکن نہیں ملتا۔ (نہیں ملا) کی صورت میں صرف یہ معنی ہوں گے کہ "بہت دنوں سے نہیں ملا" اس میں جستجوئے پیہم و جاری نہ پائی جائے گی۔

فانی کے اس شعر کا مرزا داغ کے مندرجہ ذیل شعر سے توارد دلچسپ ہے۔

ملتا نہیں ہم کو دل گم گشتہ ہمارا
تو نے تو کہیں اے غم جاناں نہیں دیکھا (داغ)

مرزا صاحب کا خطاب "غم جاناں" سے نہایت لطیف اور معنی خیز ہے۔ فانی نے خود محبوب سے پوچھا ہے۔ اس میں کوئی لطف نہ تھا لیکن "ترے تیر بے پناہ کی خیر" کہہ کر اسلوب بیان میں حسن پیدا کر دیا۔

وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں
(۷) مجھے یہ غم کہ غم جاوداں نہیں ملتا

نواب صاحب کا اعتراض ہے کہ غم کے ساتھ ملنا استعمال نہیں ہوتا۔ "غمگین ہونا" کے معنی میں "غم ملنا" بے شک مستعمل نہیں ہے اور غلط ہے۔ لیکن فانی کے شعر میں یہ معنی نہیں ہیں۔ "غم جاوداں نہیں ملتا" کے یہ معنی ہیں کہ "غم جاوداں میسر نہیں ہوتا" اس مفہوم کے لئے ملنا درست ہے۔

تری تلاش کا فی الجملہ ماحصل یہ ہے
(۸) کہ تو یہاں نہیں ملتا وہاں نہیں ملتا

نواب صاحب کا ارشاد ہے ـــــ مصرع ثانی میں "نہیں" کے عوض دونوں جگہ "نہ" چاہیے۔ جیسے "تو نہ یہاں ملتا نہ وہاں ملتا"

یہ اعتراض عجیب ہے۔ نواب صاحب کی تجویز کے مطابق شعر کی عبارت یہ ہوگی ـــــ "تری تلاش کا ماحصل یہ ہے کہ تو نہ یہاں ملتا نہ وہاں ملتا" میری رائے میں یہ صحیح اردو نہیں ہے۔ (ماحصل یہ ہے) کی حالت میں اس طرح درست ہو سکتا ہے۔

"تری تلاش کا ماحصل یہ ہے کہ تو نہ یہاں ملتا ہے نہ وہاں ملتا ہے"۔

یہی مضمون فانی کے اسلوب کا ہے۔ (نہیں ملتا) سے یہی مطلب ادا ہوتا ہے۔ (نہیں) کے ساتھ (ہے) کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور (نہ) کے ساتھ (ہے) لازم ہے۔ ورنہ (نہ یہاں ملتا نہ وہاں ملتا) کے معنی بدل جائیں گے۔ نواب صاحب نے جو دونوں جگہ (نہ) تجویز کیا ہے وہ اس صورت میں درست ہو سکتا ہے کہ مصرع اول میں (ماحصل یہ ہے) کی جگہ

(١٠)

(٩)

(١١)

یعنی یہ مفہوم نکلے گا کہ ـــ "ایسا بھی کیا ضبطِ غم کہ یہ ماجرا بالکل
بیان ہی میں نہ آسکا۔ کہیں کہیں سے تو بیان کیا جاتا۔"
طرزِ قدیم یہ نہ تھا کہ بات کو ناتمام چھوڑ دیا جائے۔ لیکن
اب غزل جدید اور نئی شاعری میں یہ اسلوب پیدا کیا گیا ہے اور
یہ انگریزی اندازِ بیان کا اثر ہے کہ بات پوری نہیں کی جاتی۔
کچھ حصہ سامع کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس طرزِ کلام کی
عادت اور رواجِ عام کے سبب سے سامع کا ذہن کمی کو پورا کر لیتا
ہے۔ مثلاً سراج لکھنوی کا یہ شعر دیکھئے :۔

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے ⁂ اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

یعنی اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی لیکن پاؤں ہٹا لیجئے۔ فصحائے
قدیم اس طرزِ بیان کو نامکمل کہیں گے۔ اسی بنا پر نواب صاحب
نے اعتراض فرمایا ہے۔

مجھ کو مرے نصیب نے روزِ ازل نہ کیا دیا
(۱۵) دولتِ دو جہاں نہ دی اک دلِ مبتلا دیا

"بحالت اضافت "دوجہاں" میں "واو" کو ملفوظ لانا
صحیح نہیں۔ "دو" فارسی کا لفظ ہے۔ فارسی میں
اور جب اردو میں فارسی ترکیب کے ساتھ استعمال
ہوتا ہے تو واؤ معدولہ ہوگا جیسے ع :۔
"آدم دوبارہ سوئے بہشتِ بریں گیا" (ذوق)
اور جب اردو کی ترکیب میں استعمال ہوتا ہے تو واؤ
کو ملفوظ لانا ضروری ہے۔ جیسے ع :۔
"سن لیجئے دو بول ہے افسانہ ہمارا" (میرؔ)
علاوہ اس کے مصرعِ اولیٰ میں حرفِ نفی "نہ" کی
تقدیم مخلِ فصاحت ہے اور غلط بھی! یہاں "نہیں"
چاہیے۔

نواب صاحب کی یہ پوری تنقید نہایت درست و مناسب،
ضروری اور مفید ہے۔ کوئی فارسی یا عربی ترکیب اردو میں استعمال
کی جائے تو فارسی و عربی زبان کے اصول کے مطابق لینا چاہیے
اردو والوں کو اس کے تلفظ یا ساخت میں تصرف کرنے کا حق
نہیں مگر اس وقت ایسا تغیر مستند ہو جاتا ہے جب اردو کے
اساتذۂ معتبر اس غلطی کو کسی ضرورت سے درست مان لیں اور
استعمال کرنے لگیں۔ مثلاً

(۱) دل مضطر (بمعنی دلِ بیتاب) چھیڑ کر نشترِ مژگاں سے کہاں جاتے ہو
دیکھتے جاؤ ہمارے دلِ مضطر کی طرف (داغ)

(۲) عرصۂ محشر :۔ اب کیوں نہ کریں [illegible] تو نہیں ہے
یہ عرصۂ محشر ہے ترا گھر تو نہیں ہے (داغ)

(۳) تکلیف پردہ داری :۔ شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراغ
تکلیفِ پردہ داریٔ زخمِ جگر گئی (غالب)

(۴) خوشبو (بمعنی بوئے خوش) دیکھو تو اتحاد ذرا حسن و عشق کا
بلبل کے آنسوؤں میں ہے خوشبو گلاب کی (امیر مینائی)

فانی نے شعر زیرِ نظر میں "دولتِ دوجہاں" فارسی ترکیب
لی ہے لیکن فارسی تلفظ کے خلاف (دوجہاں) میں واؤ ملفوظ نظم
کیا ہے۔ یہ غلط ہے۔ اس طرح لکھنا چاہیے جیسے میر انیس نے لکھا ہے
"غل ہے گھوڑے سے امامِ دوجہاں گرتے ہیں"
یہی "دوجہاں" کا لفظ جب بغیر ترکیبِ فارسی آئے تو
"واؤ" صاف پڑھا جانا چاہیئے۔ مثلاً
دوجہاں سے کھو دیا تیری کمر کی یاد نے
کھولتا ہے کیوں کفن میت مری کا فور ہے (راسخ دہلوی)
اسی پر تمام الفاظ۔۔ دوعالم، دوگیتی، دوچار، دوچند، دونیم وغیرہ
کو قیاس کرنا چاہیے۔

نواب صاحب کا دوسرا اعتراض بھی بالکل درست ہے کہ
"مصرع اولیٰ میں حرف نفی 'نہ' کی تقدیم مخل فصاحت ہے اور غلط
بھی ہے ('نہیں' ہوا ہے) یعنی اس طرح ہونا چاہیئے:۔
"مجھ کو مرے نصیب نے روز ازل کیا نہیں دیا"
ماسوائے دل میں اک ہنگامہ برپا کر گیا
(۱۶) چشم کافر کا وہ دل لے کر کر دیکھنا
نواب صاحب یہ تعقیب فرماتے ہیں:۔
"ماسوا" بمعنی "جو سوا ہو" مجموعہ ان چیزوں کے لئے
استعمال ہوتا ہے جو ماسوائے ذات باری تعالیٰ ہیں۔
یعنی موجودات، مخلوقات، لیکن اردو میں "سوا"
بمعنی "علاوہ" مستعمل ہے اور اس کے ساتھ لفظ "ما"
عموماً نہیں ہوتا۔ یہاں "ماسوائے دل" سے کیا مراد
ہے؟ اور دل کے سوا عاشق کے پاس وہ کونسی چیزیں
ہیں جن میں ہنگامہ برپا ہو سکتا ہے؟
اس لفظ پر بھی اعتراض ڈاکٹر عندلیب شادانی نے بھی رسالہ ساقی
(بابت نومبر ۱۹۴۲ء) میں کیا ہے۔ نواب صاحب نے نہایت متانت
اور سنجیدگی کے ساتھ اصل اعتراض لکھ دیا۔ لیکن ہمارے دوست ڈاکٹر
شادانی عجیب زندہ دل آدمی ہیں۔ انھوں نے یہ ظرافت آرائی
فرمائی ہے:۔
"ماسوائے دل" کے معنی ہیں "دل کے علاوہ اور جو کچھ
ہے" لہٰذا شعر کا مطلب یہ ہوا کہ چشم کافر نے دل لینے
کے بعد جب کر کر دیکھا تو دل کے علاوہ اور جو کچھ ہے
اس میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اب اگر "ماسوائے دل"
محدود معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس کا تعلق شخص
اپنی ذات سے ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دل کے
علاوہ دوسرے اعضا اس سے متاثر ہوئے، مثلاً
پیٹ چلنے لگا، یعنی چشم کافر نے مسہل کا کام کیا۔
اور اگر "ماسوائے دل" وسیع معنی میں استعمال ہوا
ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دنیا میں بڑے بڑے
انقلاب رونما ہو گئے۔ شاہ اٹلی نے حبش پر قبضہ کر لیا۔
اس کے بعد ڈاکٹر شادانی نے "ماسوا" کی اصل وضع اور معنی اور
استعمال بتائے ہیں۔ بہرحال فانی پر یہ اعتراض درست ہے۔ موجودہ
زمانہ میں عربی کا علم بہت کم ہو گیا ہے۔ اس لئے عصر حاضر کے شعر و ادب
میں عربی الفاظ، ترکیبیں، اقوال و امثال کے غلط تلفظ اور استعمال
نظر آجاتے ہیں۔
تجھ کو مضطر دیکھ کر ان کو حجاب آنے لگا
(۱۷) ہو چلی ہیں وہ نگاہیں راز دان اضطراب
نواب صاحب کا تبصرہ ہے:۔ "ہو چلی ہیں" فصیح نہیں "ہوتی
چلی ہیں" چاہیئے۔
ڈاکٹر شادانی کی تنقید ہے:۔ اس محل پر "مضطر" کا
استعمال غلط ہے۔ "مضطرب" کے معنی ہیں پریشان اور
"مضطر" کے معنی عاجز، بیچارہ۔
میری رائے ہے:۔ دونوں حضرات کے اعتراضات غلط
ہیں۔ فانی کا شعر بالکل صحیح اور بے عیب ہے۔
نواب صاحب نے ڈاکٹر صاحب والا اعتراض لفظ "مضطر" پر نہیں
کیا، اس لئے کہ عربی میں "مضطر" کے معنی "پریشان" نہ ہوں۔
لیکن جب اردو میں بڑے بڑے استادوں نے اس مفہوم کے لئے
استعمال کیا ہے تو اب اردو میں تنہا اور مع اضافت دونوں طرح
درست ہے۔ ڈاکٹر شادانی نے نواب صاحب والا اعتراض (ہو چلی
ہیں) پر اس لئے نہیں کیا کہ ان کے نزدیک یہ روزمرہ درست و
مستعمل ہے۔ اور میرے علم میں بھی فصحا اس طرح کہتے ہیں بلکہ اس
موقع پر (ہو چلی ہیں) فصحائے دہلی و لکھنؤ وغیرہ کی زبان نہیں ہے

[illegible]

داغ دہلوی

فصیح الملک نواب مرزا داغؔ دہلوی دبستانِ سخن کے آخری بڑے شاعر تھے۔ ان کے بعد دلی سے پھر کوئی سرتاجِ سخن پیدا ہو سکا ہے نہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچہ بدل گیا۔ وہ زبان و ادب کے جس گہوارے میں انہوں نے پرورش پائی تھی وہ مرزا داغؔ کے بعد کسی کو نصیب نہ ہوا۔ سب کو معلوم ہے کہ وہ دلی کے لال قلعہ میں سلاطین مغلیہ کے آخری تاجدار ابو ظفر بہادر شاہ کے ولی عہد مرزا فتح الملک فخرو کی محل سرا میں پروان چڑھ رہے تھے کہ ان کے سرپرست یعنی ولی عہد سلطنت نے وفات پائی اور اپنے بعد ولی عہدی کا ایک نیا جھگڑا چھوڑ گئے جس کے لئے خود ابو ظفر بہادر شاہ اور ان کے اعیان و مقربین کے آپس میں بڑی کشمکش پیدا ہوئی۔ خدا خدا کر کے بوڑھے بادشاہ کی محبوب بیگم نواب زینت محل کی دیرینہ آرزو (شہزادہ مرزا جواں بخت کو ولی عہد سلطنت بنانے کی) پوری ہونے پائی تھی کہ خود بساطِ سلطنت الٹ گئی اور بادشاہ اور ولی عہد دونوں کو جلاوطنی کے عالم میں اپنی زندگی کے بقیہ ایام گزارنے پڑے۔ اس طرح نواب مرزا داغؔ لال قلعہ دہلی کے محلات شاہی کے آخری پرورش یافتہ ہیں اور ان کے ساتھ صحیح معنوں میں اس اردو کا خاتمہ ہو گیا جو صدیوں سے مغلوں کے عظیم الشان لشکروں اور محل سراؤں میں نشو و نما پاتی جا رہی تھی۔

نواب مرزا کی ابتدائی زندگی بظاہر شاہی محلات میں گزری لیکن اس امرِ واقعہ سے شاید بہت کم لوگ واقف ہیں کہ اگر زمانہ مساعدت کرتا تو یہ سرتاجِ سخن خود بھی ایک ملک اور ریاست کا والی اور رئیس ہوتا۔ ان کے والد نواب شمس الدین احمد خاں والیٔ فیروز پور جھرکہ، نواب احمد بخش خاں فخر الدولہ کے بڑے بیٹے تھے اور نواب موصوف کی جگہ فیروز پور جھرکہ کی ریاست کے حکمران تھے۔ ان کے دوسرے بھائی نواب امین الدین احمد خاں کو لوہارو کی ریاست ملی تھی جو اب تک قائم ہے اور جس پر ان کی اولاد حکمرانی کر رہی ہے۔ لیکن شمس الدین احمد خاں ایک بے باک اور تند مزاج رئیس تھے اس لئے ان کے اعزہ و اقربا سے ان کے تعلقات اچھے نہ رہ سکے اور بعضوں کو شکایت پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے باپ نواب فخر الدولہ کی وصیت اور حکومت انگریزی کے فیصلہ کے مطابق اپنے اعزہ کو حصہ نہیں پہنچا رہے ہیں۔ انہی لوگوں میں اردو کے مشہور شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ بھی شامل تھے جو بے باکی اور تند مزاجی میں مرزا داغؔ کے والد سے کسی طرح کم نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے دلی اور بعد کو کلکتہ کے سپریم کورٹ میں اپنے سالے شمس الدین احمد خاں کے خلاف مقدمات دائر کئے اور انگریز عہدہ داروں اور ان کے ہندوستانی ماتحتین کے دلوں میں نواب سے ایسی بدظنی پیدا کر دی کہ ان کا وقار اور اطمینان غائب ہو گیا۔ انہوں نے بھی غالبؔ کو ستانے اور ذلیل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ چنانچہ غالبؔ کی قید کے واقعہ کے ڈانڈے بھی اسی سے جا ملتے ہیں۔ دلی کے رزیڈنٹ فریزر اور دیگر حکام غالبؔ کی شاعری اور انگریزی حکومت نیز ملکۂ وکٹوریہ کی مدح سرائی کے باعث ان کے قدر دان تھے اور نواب شمس الدین احمد خاں سے بدظن۔ بہ وجوہات چند در چند نتیجہ یہ ہوا کہ رزیڈنٹ صاحب چاندنی چوک میں قتل کر دئے گئے اور اس کا الزام مرزا داغؔ کے والد نواب شمس الدین احمد خاں پر لگایا گیا اور وہ نہ صرف اپنی ریاست و حکومت بلکہ زیست سے بھی محروم کر دئے گئے اور مرزا داغؔ جو غالباً ان کے بعد فیروز پور جھرکہ کے حکمران ہوتے ایک مقہور و معتوب یتیم بچے کی شکل میں اپنی ماں کے ساتھ دلی چلے آئے اور چونکہ آگے چل کر ان کو اردو زبان اور شاعری کا سرتاج بننا تھا اس لئے مرزا فخرو فتح الملک ولی عہد سلطنت نے ان کو اپنے زیرِ پرورش لے لیا۔ اگر قسمت یا زمانہ موقع دیتا اور سلطان فتح الملک مرزا فخرو

بادشاہ ہونے پاتے تو مرزا داغ کو تلاش معاش کی خاطر دلی سے نکلنا نہ پڑتا۔ اور وہ پریشانیاں نہ پیش آتیں جو [illegible]
والی رامپور کی وفات کے بعد نواب مرزا داغ کی سرگردانی اور ایک شہر سے دوسرے شہر تک پا بہ جولانی [illegible]

— ۲ —

داغ جب سن شعور کو پہنچے تو ہر طرف شعر و سخن کا چرچا تھا لال قلعہ کے سلاطین اور شہزادے اور دربار کے امراء [illegible] سب کے سب شعر و سخن کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ چونکہ خود بادشاہ کی حیثیت ایک وظیفہ یاب قیدی سے بڑھ کر نہ تھی اس لئے جہانگیری و جہانبانی کے ولولوں کی جگہ شاعرانہ ترنگوں اور بے باکیوں نے لے لی تھی۔ خود دربار میں مشاعرے ہوتے تھے اور بادشاہ سے لے کر ماہی تک سبھوں پر شاعری کا نشہ طاری تھا۔ اس بزم کے ساقی خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق جیسے استاد سخن تھے جن کی جودت طبع اور قوت کلام نے شہر کے تمام اساتذۂ سخن کو پیچھے ڈال دیا تھا۔ نواب مرزا داغ نے بھی اس جگت استاد سے شعر گوئی کا فیض حاصل کیا اور پھر اپنی طبعی مناسبت سے اس فن میں وہ کمال اور کامیابی پیدا کی کہ آخر کار خود بھی جہاں استاد فصیح الملک ناظم یار جنگ دبیر الدولہ جیسے خطاب کے مستحق قرار پائے اور اتنی کثیر دولت اور عظیم الشان مشاہرہ پاتے رہے جس کا ان کے استاد خاقانی ہند تصور بھی نہ کرسکتے تھے۔

داغ ایک حقیقی شاعر تھے اور ان کی شاعری ان کے احول کی بہترین آئینہ دار ہے۔ ان کا کلام تصنع اور آورد سے پاک ہے۔ وہ جو دیکھتے اور جس طرح محسوس کرتے تھے اس کی بعینہٖ ترجمانی کرتے تھے اور اسی لئے ان کے بعض شعر عریانی کی حد تک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن اس میں خود ان کی کوئی غلطی نہ تھی ان کی طبیعت کی بے باکی اور رئیسانہ شان نے ان کے کلام میں ایک خاص آن پیدا کردی ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یا سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ وہ ریاکار نہ تھے۔ اور اردو کے اکثر و بیشتر شاعروں کی طرح فرضی عشق و محبت کی ترجمانی نہیں کرتے تھے۔ ان کی اصلی زندگی اور ان کی شاعری میں کوئی فرق نہیں۔ انہوں نے کبھی اپنی کوئی تخیلی دنیا نہیں بنائی اور نہ ان کے کلام میں عشق و عاشقی کی فرضی واردات محض شعر گوئی کی خاطر شامل ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ داغ غزل گوئی کے میدان میں اردو کے تمام غزل گو شعراء سے اتنے آگے نکل چکے ہیں کہ شاید ہی کوئی شاعر تغزل میں ان کے قریب پہنچ سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے کلام میں میر تقی میر جیسا سوز و گداز، خواجہ میر درد جیسی عارفانہ حلاوت، مرزا غالب جیسی فلسفہ آرائی اور مومن خاں جیسی مضمون آفرینی کی کمی ہے لیکن سلاست زبان، اعجاز بیان، رنگینی محاکات اور شوخی ادا جو تغزل کی جان ہیں داغ سے بڑھ کر کسی کو نصیب نہ ہوئے۔ ان کی شاعری میں جو تازگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے اس کی نظیر خود نظیر اکبرآبادی جیسے زندہ دل اور لاابالی شاعر کے کلام میں بھی نظر نہیں آتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعری نہیں کرتے گفتگو کرتے ہیں اور گفتگو بھی ایسی جو بڑے بڑے استادان سخن کے فصیح و بلیغ اشعار سے زیادہ رنگین اور شگفتہ ہوتی ہے۔ اردو زبان کا کوئی شاعر اتنا سہل ممتنع کلام شاید ہی اس فراوانی سے کبھی پیش کرسکے گا۔

داغ نے حسن و شباب کی جیسی اعلیٰ نمائندگی کی ہے شاید ہی عہد حاضر کا کوئی ماہر شبابیات کرسکے۔ عشق و عاشقی کی گھاتوں اور جنسی معاملات کی باتوں کو داغ نے جس بے تکلفی اور شگفتگی کے ساتھ قلمبند کیا ہے اس کی تقلید آج کل کے ترقی پسند ادیب بھی اپنی تحریر کو

سبب سے جنبل بعض جیسے ذکر سکیں گے۔ داغ کے بعض اشعار بھی اگرچہ اس الزام سے نہ بچ سکے اور ان کے حریفوں نے ان کی فطری شوخی و رندانہ رنگینی کو مبتذل اور سوقیانہ قرار دینے میں کوئی کسر نہیں کی لیکن عہد حاضر کے نئے ادب سے متعلق افسانوں اور کلام میں جو بے حجابی نمایاں ہوتی جا رہی ہے اس کے مقابلے میں داغ کا مبتذل سے مبتذل شعر بھی معصوم معلوم ہوتا ہے اور پھر اس رنگ میں داغ تنہا نہیں ہیں ان کی طرح لکھنؤ کے بعض اور خاص طور پر شاعر وزیر، صبا، رند اور مشکے عریاں نگاری میں داغ سے بہت آگے نکل گئے ہیں، اور خاص کر داغ کے ایک ہم عصر استاد سخن امیر مینائی بھی اپنے زہد و ورع کے باوجود اس حمام میں داغ سے عریاں بے حجاب نظر آتے ہیں۔

۳

اردو زبان کی تاریخ میں داغ کو شاعری کے علاوہ ایک اور وجہ سے بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ اور اس اہمیت کی طرف اب تک نہایت کم توجہ کی گئی ہے۔ موجودہ اردو کے بنانے اور سنوارنے میں لکھنؤ کے مشہور استاد ناسخ کا بہت بڑا دخل ہے لیکن ان کی کاوشیں زیادہ تر دبستان لکھنؤ پر اثر انداز رہیں۔ دہلی کے دبستان نے ذوق و غالب جیسے اساتذۂ سخن کے زمانے تک بھی اپنی لسانی برتری کا احساس ہونے کے باوجود اردو کی اصلاح اور اس کو تمام ہندستان کے لئے معیاری بنانے کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ باہر والوں کی زبان میں تو اہل دلی کو بڑے بڑے عیب نظر آتے تھے لیکن خود اپنی آنکھ کا شہتیر وہ نہ دیکھ سکے۔ اس عیب کو داغ کی نظر نے دیکھ لیا اور انھوں نے اپنے کلام کو ان تمام لسانی معائب سے پاک رکھا جو غالب، مومن، ظفر اور خود ان کے استاد ذوق کے کلام میں کثرت سے موجود تھے۔ مثال کے طور پر اس وقت اس قسم کی دو چار اصلاحوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

برج بھاشا کا اثر اردو زبان کے افعال تا، نے اور تی پر ختم ہوتے ہیں مثلاً آتا ہے، جاتے ہیں، کھاتی ہے۔ اور برج بھاشا میں ان کی جگہ آئے ہے۔ جاؤ ہو وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔ چونکہ شمالی ہند میں اردو کے ابتدائی شعراء میں سے بعض بڑے شاعر مثلاً آرزو، آبرو، میر، نظیر وغیرہ آگرہ اور گوالیار کے رہنے والے تھے جو برج بھاشا کا مرکز ہے اس لئے اردو شاعری میں بھی افعال کی یہ شکلیں رائج ہو گئیں اور ان کی تقلید میں غالب و ذوق نے بھی ان کو صحیح اور مستند سمجھ کر استعمال کیا۔ مثلاً ذوق کہتے ہیں؀

کہے ہے خنجر قاتل سے یوں گلو میرا — کمی جو مجھ سے کرے تو پیئے لہو میرا

بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے — اُف رے بے تابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے

مومن کے شعر ہیں:—

اس آفت جاں کو دل دیا ہائے — جو عیب گنے ہے دل دہی کو

ہے نگاہ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے — یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے

غالب کہتے ہیں:— آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب — کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے — میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ان اساتذۂ سخن اور ان کے علاوہ دیگر شعرائے دلی نے اسی طرح اپنے کلام میں برج بھاشا کے افعال استعمال کئے ہیں۔

[illegible]

بُندے

[illegible] شہر کی وہ لڑکیاں تھیں۔ اُسے نیلم
کی [illegible] کی [illegible] و نیلم کی محبت، اس کا رنگین تبسم اور
[illegible] دو شوخیاں کو دو اقلیم بنا دیتی — دونوں
کے [illegible] کو [illegible] کیسے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کے احساس
[illegible]۔ پھر بھی اس عشرت زار میں رہ رہ کر ایک خیال
بر [illegible] ستاتا —

نیلم کو بُندے بہت پیارے تھے اور اب اس کے کان
بغیر بُندوں کے بہت برے لگ رہے تھے۔ اس نے اکثر ندیم
سے اس کا ذکر بھی کیا تھا اور ندیم خود بھی محسوس کرتا —
ہیرے کے بُندے ڈال دیے جائیں تو وہ کتنے خوبصورت معلوم
ہوں گے! — لیکن شہری زندگی میں پچاس روپے جیسی قلیل
آمدنی والے شخص کا ہیرے کے بُندوں کا خیال "ہوائی قلعہ" سے
زیادہ اہمیت نہ رکھتا تھا!

ندیم ایک اخبار کے دفتر میں پچاس روپے ماہوار پر کام
کرتا تھا۔ اتفاق سے اس کی نیلم سے پہچان ہو گئی۔ اس نے یہ جان کر
بھی نیلم سے محبت کی کہ اس کی ماں ایک بیسوا ہے۔ کوئی دولتمند
ماں یہ گوارا کر سکتی ہے کہ اس کی بیٹی ایک پچاس روپے کے
آدمی سے بیاہی جائے؟ پھر نیلم کی ماں ٹھیری کاروباری عورت!
اس نے نیلم کو اس "اچھوت" سے بچائے رکھنے کی پوری کوشش
کی۔ لیکن محبت اندھی ہوتی ہے، ایا ہیچ نہیں! —
آخر ایک دن نیلم امارت و ثروت کی بلند چوٹی سے غربت
کی دشوار گزار گھاٹی میں مسکراتی ہوئی اتر آئی! مگر اس کی ماں نے
سارا زیور اور بُندے اتار لئے اور آئندہ گھر نہ آنے کی دھمکی بھی دی۔
ایک دن نیلم کو بُندوں کے خیال نے اس قدر ستایا کہ وہ
تکیے میں منہ چھپائے رونے لگی۔ اسے تسلی دیتے ہوئے ندیم نے کہا

— میں نے جلد ہی بُندے خریدنے کا انتظام کر لیا ہے۔
ترشح کے وقت قوس قزح جیسی دکھائی دیتی ہے نا، اسی
طرح نیلم کے آنسو کے ہر قطرہ سے خلوص و محبت کے پارے رنگ
اپنی پوری شوخی کے ساتھ چمک اٹھے —
دوسرے روز ندیم ایک جاننے پہچاننے جوہری کے پاس گیا۔
بُندوں کی قیمتیں دریافت کیں۔ نیلم کے کانوں میں زیب دینے
جیسے نقلی ہیرے بھی پچاس سے کم نہ تھے۔ اس کے لئے اتنی
بڑی کھٹن جرمنی کے مقابلے میں پولینڈ کی فتح تھی! لیکن محبت
بہت سارے ناممکنات کو ممکنات بنا دیتی ہے۔ ندیم نے اپنے
موازنے پر غور کیا وہ مہینہ بھر میں مشکل سے چار روپے بچا سکتا تھا۔
حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ آٹھ مہینے میں بُندے مل سکیں گے۔
آٹھ مہینے — اس کا دل جل گیا۔ وہ داغی محنت
کرنے والوں پر لعنت بھیجنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ داغی بہار
پر جینے والوں کی زندگی کیکر کا درخت ہے۔ قریب جاؤ تو سایہ
نہیں البتہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کب کانٹا لگ جائے گا! —
نیلم کو آٹھ مہینے انتظار میں رکھنا اسے اچھا معلوم نہ ہوا۔
اس نے گناہ کی ٹھانی۔ کونسا گناہ؟ کیسا گناہ؟ —
ممکن ہے بہت سارے لوگ اس کے خیال سے اتفاق نہ کریں۔
وہ میرے سے جرم ماننے تیار ہی نہ ہوں۔ ہو سکتا ہے! لیکن سچ
تو یہ ہے کہ اب بھی جب کبھی اس کی یاد آ جاتی ہے تو ندیم کے رونگٹے
کھڑے ہو جاتے ہیں! — ادب کی منڈی میں فحش اور عریاں
ادب کی کافی مانگ ہے۔ اس کا بازار بہت وسیع ہے۔ ساری دنیا
کا یہی حال ہے۔ ندیم نے روپیہ کمانے کی خاطر ایسی ہی چار پانچ
کہانیاں لکھیں۔ اس وقت اس کے معیاری اور سنجیدہ افسانوں
کی کوئی قدر نہ تھی! معیاری — ان معیاری افسانوں کی
جن کی تخلیق جذبات، احساسات کی صداقت، روشن خیال اور

وست نظری کی مرہون منت ہوتی ہے! لیکن ان "مقبول عام" افسانوں نے بہت جلد لوگوں سے اس کا تعارف کرادیا! ــــــ

ندیم نے پچاس روپے کے نقلی ہیرے کے بُندے خرید لئے۔ نیلم بڑی مسرور ہوئی۔ اس کی خوشی سے ندیم کا کنول بھی کھل گیا! مگر اپنے آپ کو اصلی ہیرے کے بُندے خریدنے کے قابل نہ پاکر کچھ ملول ہوگیا' اس نے کہا ــــــ خوش ہونے میں کون بات ہے! یہ تو نقلی ہیرے ہیں' آخر آبگینے ہی تو! فرق اتنا ہے کہ چمک ہیروں کی سی ہے!! ــــــ

"یہ نقلی سہی لیکن تمہاری محبت تو اصلی ہے نا ــــــ

اس ایک جملہ میں کتنا گہرا مفہوم تھا ــــــ

صبح جب ندیم دفتر پہنچا تو اڈیٹر اس کا منتظر کھڑا تھا۔ کل اس نے چند کتابوں پر تبصرہ کیا تھا۔ وہ پروف اڈیٹر کے ہاتھ میں تھے۔ اسے ایک تنقید دکھاتے ہوئے کہنے لگا ــــــ تم نے اس ناول کو بہت سراہا ہے ــــــ ندیم نے جواب دیا "واقعی ناول بہت اچھا ہے"۔ چشمہ پیشانی پر سرکاتے ہوئے کوری نگاہ سے دیکھ کر اڈیٹر نے کہا ــــــ یہ اخبار میرا ہے' مصنف ہمارا دشمن ہے خوب خیال رہے۔ ہمارے اخبار میں اس کی توہین ہی ہونی چاہئے۔ ایسی غلطی پھر نہ کرنا۔ دوبارہ لکھو! ــــــ

ندیم نے مسلسل دو گھنٹے کاغذ اور روشنائی ضایع کی اور اپنے خیالوں کا خون کرتا رہا۔ پھر بھی وہ کوئی قابل اعتنا تنقیص نہ کرسکا! اس نے اڈیٹر سے کہا ــــــ میں لکھنے والا ہوں گردن مارنے والا نہیں! ــــــ

اڈیٹر نے چپکے سے ایک ماہ کی تنخواہ اس کے حوالے کرکے اسے رخصت کردیا۔ وہ حیران تھا۔ اس کا دل ٹوٹ گیا! اُسے سوجھتا نہ تھا کہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ ــــــ

وہ چپ چاپ گھر آیا۔ دروازہ پر تار والا کھڑا تھا۔ نیلم کی ماں کا تار تھا ــــــ جلد چلی آؤ' حالت نازک ہے! ــــــ

گو ندیم نیلم کو اس کی ماں کے پاس بھیجنے کے لئے کسی صورت تیار نہ تھا۔ وہ اسے اپنے پاس سے علٰحدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر صبح کے واقعہ سے اس نے محسوس کیا کہ ایسے وقت نیلم کا چلا جانا ہی بہتر ہے۔ رات کی گاڑی سے اس نے نیلم کو بھیج دیا۔ گاڑی چلتے وقت کھڑکی سے باہر سر نکالے وہ کس قدر بے تابی سے دیکھ رہی تھی! اک دم بجلی کے قمقمے کی روشنی سے نیلم کے بائیں کان کا بُندا چمک سے چمکا! ندیم کو خیال ہوا کہ اس نے بُندے لے دیئے بہت اچھا کیا۔ ورنہ اب تو جینے کے لالے پڑے ہیں بُندے کیونکر خرید ے جاتے؟ ــــــ

دوسرے دن وہ سارے اخباروں کے دفتر میں جوتیاں چٹخاتا پھرا۔ کہیں دال نہ گلی۔ پہلے ہی شہر بھر میں افواہ پھیل چکی تھی کہ ندیم خود رائے' دیانت دار' راستباز اور ہیکڑ آدمی ہے۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں۔ چاروں طرف اسے اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دے رہا تھا ــــــ

دن بھر وہ سارے شہر میں بھٹکتا رہتا اور رات کو اپنی ساری ارمانوں اور حسرتوں کا لاشہ لئے بستر پر لیٹ جاتا۔ مگر لیٹنے سے کہیں نیند آتی ہے! رہ رہ کر خیال آتا۔ کاش نیلم ہوتی! اس کے احساسِ قربت سے کچھ سکون میسر آتا! انسانی دل بھی کیسی عجیب شے ہے! مجموعۂ اضداد! نیلم کی موجودگی مناسب نہ سمجھ کر بھیج دیا اور اب اس کی قربت کا خواہاں!! صحرا میں گزرنے والے قافلے کو دور آگ دیکھ کر کتنا اطمینان ہوتا ہے! گو یہ آگ اس کی گزرگاہ کو روشن نہیں کرسکتی پھر بھی قافلے والوں کے مایوس دلوں میں امید کی کرن دوڑ جاتی ہے! صرف اسی لئے ندیم کو نیلم کی ضرورت تھی! لیکن ــــــ

بستر پر کروٹ بدلتے ہی وہ نیلم کے متعلق سوچنے لگتا۔ نیلم کے تصور کے ساتھ ساتھ اس کی ماں اور بہن کی تصویریں اس کی سطح دماغ پر تیرنے لگتیں۔ اس کی بہن کے پاس زانوں کو آنے دے

گئے تھے ـــــــ یہ کہ سستے کے اس ذہن پر پہنچے ہی وہ بیچوں بیچ ایک اجنبی دہ اور بھی بڑھتا جاتا اور سوچتا ـــــــ نیلم کے بارے میں کم غلطی کی ـــــــ

نیلم کو خود نے آ میرے گاؤں کی بستی میں تبدیل ہی ڈال دیا۔ اسے کچھ اسٹ چلنے تک ۔ وہ وہیں ٹھیرنے والی تھی ۔ کہاں ؟ اسی شہر میں ! ندیم نے فوراً نیلم کو کھینچ لانے کا خیال کیا مگر جیب جو خالی تھی ! ـــــــ

نوکری بھی جلد ہی ملنے کی توقع نہ تھی ۔ دو تین سنجیدہ افسانے لے کر اپنے سابق ناشر کے پاس پہنچا ۔ اس نے دیکھ کر کہا "ایسی کہانیاں مصنف کی موت کے بعد اس کی شہرت کا باعث ہوتی ہیں ۔ جیتے جی اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا" ناشر نے پہلے جیسے چند دلچسپ اور عریاں افسانے لکھنے کی رائے دی اسے بھی ان کا چسکا پڑ گیا تھا ۔ مگر فوراً ہی اس نے سوچا ـــــــ جس نے ایک شخص کی چھوٹی برائی نہ کر کے نوکری پر لات ماردی کیا ساری سماج کو زہریلا نشہ پلانا اس کے لئے مناسب ہے ؟ نہیں ! بھوکوں مرنا بہتر ہے مگر اپنی ذہنیت کو گروی رکھنا اپنی انفرادیت کھونا انسانیت کی ہتک ہے۔

خیال اور عمل میں بہت بڑا فرق ہے ۔ خیالات کی چہار دیواری میں رہنا آسان ہے مگر عمل کا میدان جگر پگھلا دیتا ہے ! اور پھر بھوکا رہنے کا خیال !! ـــــــ دو مہینے ندیم نے کیونکر گزارے ؟ چاروں طرف اداسی، ناکامی اور یاس چھائے ہوئے تھے ۔ بولنے کو جی نہیں چاہتا تھا ۔ دنیا کو دیکھ کر اس کے جی میں آتا کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ لگا دے ۔ زندگی تو جیسے اسے کاٹ رہی تھی ۔ وہ تو اچھا ہوا کہ نیلم نہ تھی ورنہ عجب نہیں وہ اس کی تکلیفوں کو برداشت نہ کر کے ناشر کا مشورہ مان جاتا ـــــــ

ان دو مہینے کے تاثرات سے ندیم جان چکا تھا کہ تہذیب کے بہت سے مجنون کھانے اور تمدن کے عرق پینے پر بھی موجودہ نسل کے خون میں انسانیت، اصلاح و ترقی پوری طرح حلول نہیں کر گئے ۔ وہ موجودہ تہذیب و تمدن کو بیل پر کھلنے والے نہیں بلکہ مصنوعی پھول سمجھنے لگا ـــــــ اس کی اپنی دانست میں اچھے ناول کی مذمت نہ کرنا انسانیت ضرور تھی لیکن اس کا یہی فعل حکام بعض احباب کے نزدیک بے وقوفی پر مبنی تھا ! فحش اور عریاں ادب کے ڈھیر میں تھوڑی گندگی اور نہ جمع کرنا اس کے دماغی فتور پر محمول کیا گیا ۔

ع رقصاں ہے تہذیب کے پردے میں عریاں وحشت کی دیوی !

اسے محسوس ہوا کہ تہذیب و تمدن کے جنون نے بنی آدم کی بہیمیت اور بربریت، وحشت و خود غرضی کو اس طرح چھپا دیا ہے جیسے سمندر کے ہیجان سے ساحل کی بے ڈھنگی چٹانوں کو موجوں کا چڑھاؤ وقتی طور پر ڈھک دیتا ہے ۔ اسے یقین ہو گیا کہ انسان نے بیسوں صدی تک کی طویل مسافت طے کر لی پھر بھی وہ تہذیب کی اصلی منزل تک نہ پہنچ سکا ۔ تہذیب و تمدن کی ہڑ بونگ مچا کر بھی زندہ رہنے اور اپنا جیون سکھی بنانے کے لئے ہر جائز و ناجائز فعل کا ارتکاب ہی اس کا مسلک ہے ۔ اسی قدیم پیمانہ حربے سے اب بھی بعض وقت کام لیتا ہے ع بردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کشی !

دو ماہ بعد ـــــــ نیلم واپس آ گئی مگر ندیم کچھ زیادہ خوش نہ ہوا ۔ نیلم نے خیال کیا ۔ شاید میکے میں زیادہ دن رہنے کا سبب ہو اس کی دلجوئی کے لئے نیلم حسن کے ترکش میں، غمزہ، عشوہ، ناز اور ادا کے تیر لئے نزدیک آئی اور کہنے لگی ـــــ ماں زیادہ بیمار تھیں اس لئے ٹھیر گئی ۔ مگر میں نے پریم کی ڈور تو ڈھیلی نہیں کی ! ـــــــ

دو مہینے سے مکان کا کرایہ واجب الادا تھا ۔ ندیم کو یقین تھا کہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی مہاجن دروازہ پر موجود ہوگا ۔ شام تک اس نے خوب سوچا ۔ لیکن کسان کے سوکھتی ہوئی کھیتی میں کھڑے ہو کر سر پر منڈلانے والے ابر کی طرف دیکھنے سے بھی کہیں بارش ہوتی ہے ! آنے والی رسوائیوں کے انسداد کے لئے خوب سوچا۔

یہ معمہ حل نہ ہو سکا!

پانچ بجے چائے پیتے ہوئے اس نے پھر نیلم کو دیکھا۔
اس کے کانوں میں بُندے کتنے خوبصورت معلوم ہو رہے تھے!۔
کانوں میں موتی آویزاں　　ہر موتی میں بجلی رقصاں
ندیم جیسے چائے "نچپین" کو چائے پیتے ہوئے بھی افسردہ پاکر نیلم کہنے لگی ـــــ "کیا سوچ رہے ہو؟ صبح سے یہی حال ہے؟ صبح سے یہی حال ہے، دشمنوں کے مزاج ناساز ہیں؟"

نہیں تو! میری صحت بہت اچھی ہے، لیکن ـــــ

وہ قریب آئی، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی۔ کیا دو مہینے میں اتنی غیر ہو گئی؟ تمہیں میرے سر کی قسم ـــــ! وہ آگے کچھ نہ بول سکی کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ دو آنسو سیکڑوں الفاظ پر بھاری ہوتے ہیں ـــــ

آخر کار ندیم نے کہا ـــــ میرا ایک دوست مالی پریشانیوں کا شکار ہے آج اسے رقم نہ ملی تو ـــــ

نیلم نے درمیان ہی میں پوچھا ـــــ کتنی رقم؟ ـــــ

"پچاس روپے!" کہہ کر وہ نیلم کے بُندوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اور ساتھ ہی اس کے تیور بھی! جیسے جیسے نیلم کی نارضامندی کا احساس ہونے لگا اس کی ضد بڑھتی گئی ـــــ "اس سے بہتر لا دوں گا" کہنے پر بھی وہ کیوں راضی نہ ہوئی۔ یہ ندیم نہ سمجھ سکا۔ تھوڑی سی بحث و تکرار کے بعد ہزار پس و پیش کے ساتھ نیلم نے بُندے ندیم کے ہاتھ پر رکھ دئے۔ لیکن صرف بُندے ہی نہیں تھے بلکہ ان پر دو آبدار آنسو بھی!! ـ ندیم نیلم کی اس حرکت پر حیران تھا۔ وہ عجیب باتیں سوچنے لگا۔ اسی ادھیڑ بُن میں جوہری کے پاس پہنچا۔ جب جوہری نے بندوں کی قیمت تین سو روپے بتائی اور کہا اصلی ہیرے ہیں تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ جوہری کو گھورتا ہوا چپ چاپ چلا گیا ـــــ

رات کے وحشت ناک سناٹے میں نہ جانے وہ کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔
کسی زخم پر بار بار چوٹ پڑتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ ایک ایک خیال اس کے قلب و دماغ پر نیش زنی کرنے لگا ـــــ نیلم نے دھوکا تو نہیں کی۔ بُندے دینے میں پس و پیش ہوئی یا ان بُندوں کے پس منظر میں کوئی راز ضرور ہے۔ مگر اس نے تو کبھی کر یم کی ڈور ڈھیلی نہیں کی! اس کی ماں نے تو نہیں دیئے۔ لیکن ایسا ہوتا تو وہ کیوں چھپاتی۔ تو یہ اصلی ہیرے! ـــــ اس کی بہن کے پاس آنے والے رنگیلے ـــ اس کے گھر کا گندہ ماحول ـــــ ایک ایک کرکے اس کے دماغ پر بگولے بیلوں کی طرح ابھار گھومنے لگا ـــــ شک و شبہ سے اس کا دل بیٹھ گیا۔ دس بجے گھر لوٹا۔ چپ چاپ بستر پر لیٹ گیا۔ کھانے کے لئے نیلم راہ دیکھ رہی تھی۔ پوچھی ـــــ "کھائیں گے نا؟"

وہ غرایا ـــ "بھوک نہیں مجھے" ـــ نیلم اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔ آہستہ سے اس نے پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ آج تک اس کا لمس نازک پھول سا محسوس ہوتا مگر آج جیسے پیشانی میں کیکر کا موٹا اور پرانا کانٹا لگ گیا۔ ندیم نے غصہ سے نیلم کا ہاتھ جھٹک دیا وہ سسکنے لگی۔ ندیم نے گرج کر کہا ـــــ "ختم کر دو نے کا ناٹک! میں سب جان گیا!"۔

ایک معصوم بچے کی طرح نیلم اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن وہ نہ پسیجا! اس کی آنکھوں کے سامنے تو تین سو روپے کے بُندے ناچ رہے تھے اور بندوں کے ہیروں سے نیلم کی بہن کے پاس آنے والے رنگیلوں کے "بے ہنگم قہقہے" سنائی دے رہے تھے۔ نیلم کی سسکیاں ہچکیاں بن گئیں، ندیم ایک زخمی سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ندیم ایک ایسے مقام پر رہتا تھا جہاں دیوار کے بھی کان تھے ورنہ ـــــ وہ نیلم کو پیٹنے۔ اس کا گلا گھونٹ دینے میں بھی کمی نہ کرتا ـــــ

سنسناہٹ سمیٹے وہ مہاجن کے خوف سے باہر نکل گیا تین بجنے تک آدھ گھنٹہ کا اک باہر کا پیاسا۔ آہستہ آہستہ پاؤں جواب دینے لگے۔ ابھی تک بُندے اسی کے پاس تھے۔ نیلم کے باپ کی کمائی اس کے حوالے کر کے بیٹھ کے لئے اسے میکے بھیج دینے کے خیال سے اس نے گھر کا رخ لیا۔ دروازے پر اُسے پوسٹ مین ملا۔ خط نیلم کے نام تھا پھر اس کے میکے کی تھی۔ غصے سے کانپتے ہوئے اس نے لفافہ چاک کیا۔ مگر اس کی حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا ــــــــ

بیٹی!

خوش رہو! تم نے یہاں بیٹھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تم میری ایک پائی کو بھی ہاتھ نہ لگاؤ گی لیکن اماں نے مجھے چپ رہنے نہ دیا۔ تمہارے نقلی ہیرے کے بُندوں کی وضع کے اصلی ہیرے کے بُندے بنوائے! جمعہ کو جب تم نہانے گئیں تو تم نے اپنے بُندے میرے پاس دے دیئے تھے۔ میں نے فوراً بدل دیئے۔ میں تمہیں ہرگز یہ راز نہ بتاتی مگر تمہارا شوہر غریب ہے اندیشہ ہے کہ شاید کسی ضرورت کے وقت تم اسے دے دو اور وہ نقلی ہیرے سمجھ کر سستے داموں بیچ ڈالے۔ تمہارے نقلی بُندے محفوظ ہیں۔ تمہیں میٹی ہونے پر بھیج دوں گی"

ندیم دوڑتا ہوا اندر گیا۔ باورچی خانے میں گھس گیا اور برتن جوں کے توں دھرے تھے۔ نیلم کمرے میں بستر پر بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ندیم کی تصویر تھی اور آنکھوں میں ....

ندیم نے پیچھے کھڑے ہو کر مسکراتے ہوئے کہا ؏

تکلف برطرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

وہ جلدی سے اٹھی اور بولی ــــــــ تصویر میں ایک خوبی آدمی سے زیادہ ہوتی ہے کہ وہ بھاگ نہیں جاتی!

دونوں کی نظریں ایک ہوئیں اور چند منٹوں تک دونوں ایک دوسرے کی طرف چپ چاپ ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ گویا ان کی آنکھوں نے اپنی رسیلی زبان میں اس دنیا کی خودغرضی، ناانصافی، بے رحمی اور وحشت کے ساتھ ساتھ اپنی اندرونی خلش کا بھی اظہار کر دیا ــــــــ

محمد عبدالقادر فاروقی

رات کا بھولا اور دیگر افسانے ۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے۔ ایل ایل بی صدر شعبۂ اُردو، فارسی و عربی۔ مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شایع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں مثلاً دنیائے افسانہ اور کردار افسانہ وغیرہ شایع کی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ اس کتاب کا ٹائیٹل ملک کے بلند پایہ آرٹ کار مسٹر عبدالقیوم نے بنایا ہے۔ طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات ۱۶۸ قیمت ؏

محبت کی چھاؤں ۔ مرزا ظفر الحسن صاحب بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ ہر فسانہ میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کارفرما ہیں ـــ نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لئے فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔ ۱۳۲ صفحے قیمت مجلد ؏

مذاق

اس کے معنی (Taste) کے بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً فلاں کا مذاق لباس کی حد تک بہت اچھا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ہم کو یہاں اس مذاق سے متعلق کچھ کہنا نہیں ہے۔ ہم کو تو اس مذاق سے فی الوقت دلچسپی ہے جو آپ ہم تنے دن اپنی زندگی میں ایک دوسرے سے کہتے رہتے ہیں۔ جس کا شائستگی و تہذیب سے گرجانا بھونڈے پن پر دلالت کرتا ہے۔ مذاق ذائقہ کی چیز ہے۔ اس کے مزہ کو بدلنے نہ دیجئے۔ تہذیب سے گرا ہوا مذاق آپ کی وقعت کو گھٹا دیتا ہے۔ لوگ ــــ ایسے لوگ جو سماج کے علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ مذاق کو سمجھ نہیں سکتے۔ کسی کی صورت شکل، وضع قطع غرض ہر پہلو پہ بے تکے فقرے کستے ہیں۔ اس کو ہم حیثیوں کے سامنے ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن خدا جس کو عزت دیتا ہے اس کو بندہ کی کیا بساط ہے کہ وہ ذلیل کرے۔ تاہم ــــ ایسے لوگ کتنی غلطی کرتے ہیں جب وہ کسی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے غالباً کہ اس طریقہ سے ان کا اپنا مذاق ہو رہا ہے۔ ایسا شخص واقعی شیطان کا ایک قہقہہ ہے۔

زید تنہائی میں تم سے بڑی تہذیب سے ملتا ہے۔ تمہاری تعریف تمہارے منہ پر کرتا ہے۔ جو خود پرلے سرے کی ایک بدمذاقی ہے۔ غرض وہ بکر وتنہا بذات خود بہت اچھا ہے۔ لیکن جونہی سوسائٹی میں تم سے دوچار ہوتا ہے اس کا مذاق بھی بدل جاتا ہے۔ وہ تمہاری برائیوں کو اچھالتا ہے۔ تمہارے عیوب کا پردہ چاک کرتا ہے۔ غرض ایک بے تکا بے محل سا انسان بن جاتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس کے اپنے کردار کی تکمیل نہیں ہوئی ہے۔ اس کا کیریکٹر پوری طرح بنا نہیں ہے اور اس کی فطرت انتہا درجہ پست ہے۔ لیکن اگر وہ جاہل ہے۔ علم کی اس کو ہوا بھی نہیں لگی تو ہم اس کو معاف کرسکتے ہیں۔ یہ سمجھ کر کہ بچارا مجبور ہے۔ عقل و علم سے محروم۔ لیکن عالم کا غلطی و بدتر از گناہ ہو جاتا ہے۔ علم تم کو بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ علم تم کو گہرائیوں کے نقوش سمجھا دیتا ہے۔ حصول علم کے بعد تم سے ایسی غیر انسانی حرکتیں ــــ ع چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی !!

برخود غلط سے لوگ اس قسم کے مذاق کو خوش اخلاقی پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن علم کی منزلیں طے کرنے کے بعد تو کم از کم ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ خوش اخلاقی دوسروں کے جذبات کا احترام کرنے کا نام ہے اور ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کو سمجھنے سے ہم اس مرتبہ پر پہنچتے ہیں جس کا نام خوش اخلاقی ہے۔ ایک کا دل توڑ کر ہم کسی دوسرے کا دل خوش کر دیں تو یہ ہمارے اخلاق کا کتنا خونیں انجام ہے!

دل کی منزل بڑی نازک ہے۔ اس کا مرحلہ آسانی سے طے نہیں ہوتا۔ دل باتوں باتوں میں دیکھتے دیکھتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور جڑ جائے نہیں جڑتے اور ٹوٹنے والے دل میں ہی احساس کے جوہر بھرے ہوتے ہیں۔

ہمارا مسلک ہے کہ ہمارا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ لیکن ہم سوسائٹی کا دورنگی نقش دیکھ دیکھ کر اب یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ ہم کو بھی دورنگی اختیار کرنی چاہئے۔ دل صاف نہ بھی ہو تو ظاہرداری برتو۔ غرض یہ ہے ہماری زندگی! یوں دنیا تمہاری ہنسی اڑائے تو تم کو فکر نہ ہوگی۔ کیونکہ ایسا تو کوئی نہیں ہے جس کو سب ہی متفق ہو کر اچھا کہیں ــــ لیکن یہی ہنسی، تبسم کی شکل میں تمہارے کسی قریبی عزیز یا سچے دوست سے تم کو دوچار کردے تو پھر شاید ہی تمہارا دل مندمل ہوسکے۔ دل کے زخم بھرے رہتے ہیں۔ ان کا اندمال مشکل ہو جاتا ہے۔ دل کی چار دیواری آبگینے سے زیادہ حساس ہوتی ہے۔ اس کو توڑا تو پھر کہاں یہ بن سکتا ہے۔

مذاق مذاق میں بہت فرق ہے۔ ایک خوش مذاق انسان ہی خوش مزاج ہو سکتا ہے۔ لوگ اس کی سنگت کو ڈھونڈتے ہیں۔ محفل اس بغیر سونی سونی ہوتی ہے۔ لیکن اس کی زبان پر اس کو قدرت رہتی ہے۔ وہ سوچ بچار کے مذاق کرنے کا عادی ہے۔ اس کے مذاق میں مٹھاس ہی مٹھاس ہوتی ہے۔ کڑواپن نہیں بے جا قسم کے طعن و طنز سے بھی انسان سبک ہو جاتا ہے۔ اس سے بات چیت کرنے کا مطلق جی نہیں چاہتا۔ اس کی صحبت میں جو بھی وقت گزرتا ہے وہ سولی پر۔

اب دنیا اتنی اونچی ہوگئی ہے۔ اس کے خیالات اتنے بلند ہوتے جاتے ہیں کہ اس کو مثالیں دے کر سمجھانے کی ضرورت نہیں رہی۔ تم خود ایک زندہ مثال ایک چلتا پھرتا اخلاق کا مجسمہ یا نمونہ بن کر اس کی پستیوں اور اس کی ذلتوں کا مقابلہ کرو۔

غرض کسی کی سلجھی ہوئی زندگی کو الجھا دینے کے اسباب نہ ڈھونڈو۔ بعض جاہل قسم کے لوگ بھونڈے اور بے تکے مذاق کا ترکی بہ ترکی جواب دے کر مذاق کرنے والے کا منہ بند کر دیتے ہیں۔ لیکن عالم سنجیدہ ہوتا ہے۔ وہ اس قسم کے اتفاق کو قدرت کی بھول سمجھتا ہے۔ اور سنجیدگی و متانت سے سب کچھ جھیل لیتا ہے۔ اس خاموش طوفان سے بچ کر رہنے کی کوشش کرو۔ کوہ آتش فشاں میں آگ دبی رہتی ہے۔ مگر وہ کسی نہ کسی دن اس آگ کو اگل بھی سکتا ہے۔

اقبال کے اس نظریہ کو ذرا حافظہ میں محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے ؎

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا مروت حسن عالمگیر ہے مردان غازی کا

جہاں بانو بیگم

دکن کے مقدس مقامات

مملکت آصفیہ دکن میں ہر قوم و مذہب کے لوگ مثلاً مسلمان، ہندو، سکھ، لنگایت، عیسائی، پارسی اور جین وغیرہ رہتے بستے آئے ہیں جنھیں پوری مذہبی آزادی حاصل رہی ہے۔ میں آج صرف اپنے ہی ملک کے چند مشہور مقدس مقامات کا تذکرہ کروں گا۔ یوں تو دکن میں مسلمانوں کے مقدس مقامات بے شمار ہیں لیکن جو زیادہ اہم ہیں ان ہی کا مختصر ذکر کروں گا۔

پہاڑی بابا شرف الدینؒ ۔ حضرت بابا شرف الدینؒ پہلے بزرگ ہیں جو دکن میں تشریف لائے۔ آپ عراق کے رہنے والے اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ مکہ یا تنفے کے بعد آپ نے موجودہ شہر حیدرآباد کے جنوب و مغرب کی طرف اس پہاڑی پر قیام فرمایا جہاں آپ کا مزار ہے۔ اس وقت یہ پہاڑی خوفناک درندوں کا مسکن تھی اور لوگ اس کے قریب جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ایسے مقام پر آپ کا ٹھیرنا ہی لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا اور اطراف و نزدیک کے چرواہے اور کسان آپ کے معتقد ہو گئے۔ آپ کی کرامتوں کے عجیب و غریب قصے مشہور ہیں مثلاً ایک بار کسی دھوبی کا بیل گم ہو گیا وہ پریشان ہو کر حضرتؒ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا کہ: "بابا میرا بیل کھو گیا۔ ہر جگہ ڈھونڈا کہیں پتہ نہ چلا۔ بیل میری زندگی کا سہارا تھا۔ اس غریب بال بچے والے کی مدد کیجئے۔" حضرتؒ نے ایک ٹھیکری پر کوئلے سے کچھ لکھا اور فرمایا کہ "یہ ٹھیکری اس بت کے پاس لے جا وہ تیرا بیل لادے گا۔" حضرت کے حکم کے موافق دھوبی مورتی کے پاس پہنچا اور ٹھیکری اس کے سامنے رکھ کر کچھ دیر تک انتظار کیا کہ دیکھوں یہ بت کس طرح بیل لادے گا۔ جب کافی وقت گزر گیا تو وہ مایوس ہو کر وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی نکلنے نہ پایا تھا کہ مورتی کے پیچھے کچھ حرکت محسوس ہوئی اور دھوبی نے دیکھا کہ اس کا بیل چرتا ہوا کھڑا ہے۔ دوڑ کر اس کو پکڑ لیا اور خوش خوش اپنے گھر پہنچا۔ اس واقعہ نے حضرتؒ کو مرجع خلائق بنا دیا یہاں تک کہ گولکنڈہ کا ہندو رئیس بھی آپ کا معتقد ہو گیا۔

اگرچہ کہ بابا شرف الدینؒ کو وصال کئے ہوئے (۶۷۵) سال ہو چکے ہیں لیکن آج بھی آپ کا فیضان برابر جاری ہے۔ ہر جمعرات اور خاص طور پر ہجری مہینے کی پہلی جمعرات کو آپ کی درگاہ پر ہندو اور مسلمان بڑی تعداد میں زیارت کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ ہر سال ماہ شعبان کی ۲۰ تاریخ کو سالانہ عرس شاندار پیمانے پر ہوتا ہے۔

دوسرا مقدس مقام **گلبرگہ** ہے۔ یہ سلاطین بہمنیہ کا قدیم پایہ تخت اور موجودہ حالت میں دولت آصفیہ کے صوبۂ گلبرگہ کا صدر مقام اور جی آئی پی ریلوے پر واقع ہے۔
یہاں حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی درگاہ ہے۔ سالانہ عرس وسط ذی قعدہ میں بڑی دھوم دھام سے ہوتا ہے۔ اس عظیم الشان عرس میں شمالی ہند اور دکن کے ہر حصے سے لوگ اس کثرت سے آتے ہیں کہ تقریباً پچاس ساٹھ ہزار کا مجمع ہو جاتا ہے۔

حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کا اصلی نام سید محمد محمود گیسو درازؒ ہے۔ آپ کا سلسلۂ بیعت پانچویں پشت میں حضرت سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتیؒ کو پہنچتا ہے۔ آج سے سوا پانچسو سال پہلے بعہد فیروز شاہ بہمنی دہلی سے گلبرگہ تشریف لائے۔ آپ کی کرامت کا مشہور واقعہ جس سے عام طور پر سب لوگ واقف ہیں یہ ہے کہ بادشاہ فیروز شاہ بہمنی کے خلاف اس کا بھائی احمد شاہ ولی بہمنی محض حضرت کی توجہ اور دعا سے کامیاب ہو کر تخت و تاج کا مالک ہوا۔ ۱۰ یا ۱۶ ذی قعدہ ۸۲۵ھ کو گلبرگہ میں آپ کا وصال ہوا۔ مزار کی دیواروں پر قرآنی آیات طلا شدہ حروف سے لکھی ہوئی ہیں اور حضرت کے اوصاف کا ایک فارسی قصیدہ بھی وہاں درج ہے۔

تیسرا مقدس مقام **مولا علیؑ کا پہاڑ** ہے جو شہر حیدرآباد سے (۸) میل بر جانب شمال واقع ہے اس کا مشہور واقعہ یہ ہے کہ یعقوب نام قطب شاہی خواجہ سرا نے ماہ رجب کی سترھویں تاریخ کو خواب میں جناب امیر علیہ السلام کو وہاں تشریف فرما اور خود کو آپ کے روبرو کھڑا دیکھا۔ علی الصباح اس پہاڑ پر پہنچا۔ دیکھا کہ جس پتھر کو آپ تکیہ کئے ہوئے تھے اس پر دست مبارک اور پہلوئے شریف کا نقش موجود تھا چنانچہ اس نے اس مقام پر ایک محراب بنوا کر اس پتھر کو محراب کے اندر رکھ دیا جو اب چاندی کی محرابوں کے اندر ہے اور جس پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ اس کے بعد ابراہیم قطب شاہ نے ۱۳ رجب کو جو حضرت امیر علیہ السلام کی پیدائش کی تاریخ ہے وہاں پہنچ کر پُرتکلف جشن حیدری ترتیب دیا اور محراب کے مقابل ایک مسجد بھی بنوادی۔ اس وقت سے اس پہاڑ کو مولا علیؑ کا پہاڑ کہنے لگے۔ ہر سال رجب کی سترہ تاریخ کو بڑی دھوم دھام سے عرس ہوتا ہے۔ عرس شریف کے موقع پر دکن کے ہر حصے کے لوگ بڑی تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔

دکن کا ایک اور مقدس مقام **میر مومن صاحب کا دائرہ** ہے۔ حضرت میر محمد مومنؒ اب سے پونے چار سو برس پہلے ایران سے یہاں تشریف لائے

آپ کی بزرگی اور نیک نفسی، زہد و تقویٰ اور علم و فضل کو دیکھ کر بادشاہ محمد قلی قطب شاہ آپ کا معتقد ہو گیا اور سیکڑوں حاجت مند آپ کی دعا اور توجہ سے فیض یاب ہوئے۔ آپ کی کرامتوں کے کئی ایک واقعات مشہور ہیں اور آج بھی جب کہ آپ کو دنیا سے پردہ کئے (۳۲۸) سال گزر چکے ہیں آپ کا فیضان برابر جاری ہے۔ چنانچہ آپ کی تربت کے اطراف پانی کے کوزے اور چھوٹی بڑی صراحیاں روزانہ دھری نظر آتی ہیں۔ لوگ بڑی عقیدت سے بیماروں کو پانی پلاتے ہیں۔ فہم و دانش کند ذہن بچوں کو یہاں لاکر قبر کو بوسہ دلواتے اور سنگ مزار کو چٹواتے ہیں۔ آپ کی قبر اندرون بلدۂ حیدرآباد دائرہ میر مومن واقع ہے۔ اس وسیع زمین کو جہاں پہلے سے شاہ چراغ صاحبؒ اور شاہ نور الہدیٰ صاحبؒ کے مزار تھے خود میر صاحبؒ نے اپنی زندگی میں خرید کر ذاتی صرفہ سے کربلائے معلیٰ کی خاک پاک کو چند جہازوں میں منگوا کر اس میدان میں قدِ آدم برابر بچھوا دیا تھا۔ اس کے بعد میر صاحبؒ نے مسلمانوں کے عام قبرستان کے لئے اس کو وقف فرما دیا۔ گزشتہ تین سو سال کے عرصے میں یہاں لاکھوں سادات اور بزرگان دین دفن ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر زور صاحب نے اپنی قابل قدر کتاب "میر محمد مومن" میں حضرت کی زندگی کے حالات بہت تحقیق سے شائع کئے ہیں۔

دکن کا ایک اور مشہور و قابل ذکر مقدس مقام درگاہ حضرت یوسفینؒ ہے۔ حضرت شاہ یوسف صاحبؒ اور حضرت شاہ شریف صاحبؒ۔ دونوں بزرگ ہم وطن اور آپس میں پیر بھائی ہیں۔ معظم شاہ عرف بہادر شاہ بادشاہ دہلی کی فوج میں ملازم تھے۔ دونوں بزرگوں میں اس قدر محبت اور یگانگت تھی کہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے۔ جب بہادر شاہ اپنے ۱۲۳ سالہ عہد شاہزادہ کام بخش صوبیدار دکن کے مقابلہ کے لئے فوج لے کر دہلی سے نکلا تو یہ دونوں حضرات بھی ساتھ تھے۔ اتفاق سے رات کو راستے میں اس زور کی بارش اور آندھی آئی کہ فوج کے تمام ڈیرے اور راوٹیاں اکھڑ گئیں جس کی وجہ سے فوج میں پریشانی پھیل گئی لیکن یہ دونوں بزرگ اپنی راوٹی میں اطمینان سے بیٹھے تلاوت قرآن شریف میں معروف تھے اور چراغ روشن تھا۔ فوجیوں نے جب یہ حالت دیکھی تو اسی وقت سے آپ حضرات کی بزرگی اور کرامت کے قائل ہو گئے اور حیدرآباد پہنچنے تک خاصی شہرت ہو گئی۔ یہاں آکر آپ حضرات نے ملازمت چھوڑ دی اور عبادت و قناعت کے ساتھ رہنے لگے۔ پانچویں ماہ ذی الحجہ ۱۱۲۳ھ کو حضرت شاہ یوسف صاحبؒ کا وصال ہوا۔ کہتے ہیں کہ حضرت شاہ شریف صاحبؒ آپ کی رحلت کے وقت موجود نہ تھے تھوڑی دیر بعد تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ شاہ یوسف صاحبؒ کا وصال ہو چکا۔ سنتے ہی بہت غمگین ہوئے اور فرمایا کہ "دوستی اس کا نام نہیں کہ زندگی بھر تو مل کر رہیں اور اب بچھڑ جائیں"۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے غسل کیا باوضو ہو کر حجرہ میں داخل ہوئے اور سفید چادر چہرہ پر ڈال کر لیٹ گئے۔ اسی وقت آپ کا بھی وصال ہو گیا۔ خادموں نے دونوں بزرگوں کو ایک ہی جگہ قریب قریب دفن کیا۔ آپ کا عالی شان گنبد محلہ نام پلی میں واقع ہے۔ ہر جمعرات کو حاجت مندوں کا خاصہ میلہ لگتا ہے اور سالانہ عرس بڑی دھوم سے ہوتا ہے۔

ان مقامات کے علاوہ دکن میں اور بیسیوں مقدس مقامات ہیں مثلاً درگاہ حضرت حسین شاہ ولیؒ جو گولکنڈہ سے پرے واقع ہے۔ ابراہیم قطب شاہ نے اپنی لڑکی ان بزرگ کے عقد نکاح میں دی تھی۔ مشہور تالاب حسین ساگر آپ ہی کے نام سے موسوم ہے۔ حضرت شاہ میران حسینی عرف شاہ ابدالؒ یہ بزرگ بہ عہد محمد قلی قطب شاہ دسویں صدی ہجری کے اواخر میں مع معتقدین کے ساتھ تشریف لائے۔ لنگر حوض قریب قلعہ گولکنڈہ آپ کا مزار ہے۔ لاعلاج اور آسیب زدہ مریض اکثر یہاں آکر ٹھیرتے اور شفا پاتے ہیں۔ ماہ ذی الحجہ کی آخری تاریخوں میں سالانہ عرس اعلیٰ پیمانے پر ہوتا ہے۔ حضرت شاہ راجوؒ یہ بزرگ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے پڑپوتے اور ابوالحسن تانا شاہ کے مرشد ہیں۔ بیرون فتح دروازہ آپ کا عالی شان گنبد ہے آپ کی کرامت کا مشہور واقعہ یہ ہے کہ تانا شاہ آپ ہی کی توجہ اور دعا سے عبداللہ قطب شاہ کا داماد اور وارث تخت و تاج ہوا۔ اسی طرح ہنمکنڈہ میں حضرت معشوق ربانیؒ اور خلد آباد شریف میں حضرت خواجہ منتجب الدینؒ اور آپ کے بھائی شاہ برہان الدین اولیاؒ کے مزار ہیں۔ ہزاروں لوگ زیارت کے لئے آتے اور ان بزرگوں کے فیض جاریہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

دکن میں مسلمانوں کا ایک اور قابل ذکر مقدس مقام بابا بڈن کی پہاڑی ہے۔ اہل ہنود چندرا درونا کہتے ہیں۔ یہ مقام ریاست میسور کے ضلع کڈور میں واقع ہے۔ دو سو سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزرا کہ ایک مسلمان ولی مکہ سے یہاں کافی کا پودا لائے تھے۔ ان ہی کے نام پر اس پہاڑ کا نام رکھا گیا ہے۔ مسلمان کثیر تعداد میں دور دور سے زیارت کے لئے آتے ہیں اور اہل ہنود کے نزدیک بھی یہ مقام ویسا ہی متبرک ہے کیونکہ وہ اس کو دتاتریہ کا تخت خیال کرتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق اس بزرگ کا اسی غار میں سے جہاں وہ زمانۂ سلف میں غائب ہوئے ہیں دوبارہ ظاہر ہونا وشنو کے آخری اوتار اور دست جگ کا نشان ہوگا۔ فروری یا مارچ کے مہینے میں بابا بڈن کے مزار پر ہر سال بڑی دھوم دھام سے عرس ہوتا ہے۔ بابا بڈن

[1] تاریخی لحاظ سے یہ واقعہ غلط ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھو کتاب "میر محمد مومن" مطبوعہ ادارۂ ادبیات اُردو۔ — ادارہ

جانے کے لئے مدراس سدرن مرہٹہ ریلوے کی شاخ شنوگا کے ریلوے اسٹیشن برڈر پر اترنا پڑتا ہے جو اس مقام کا قریب ترین ریلوے اسٹیشن ہے۔

اہل ہنود کے مقدس مقامات دکن اور خاص کر مملکت آصفیہ میں بے شمار ہیں۔ جن میں سے کئی ایک مشہور ہیں مثال کے طور پر میں اس وقت دو تین نام پیش کروں گا۔ **ورنگل** کی آبادی کا زمانہ گیارھویں صدی عیسوی شمار کیا جاتا ہے۔ بعضوں نے بتلایا ہے کہ کاکتیا خاندان کے پرتاپ راج نے اس کو آباد کیا اور بعض مورخین کا خیال ہے کہ ورنگل کو آندھرا خاندان کے راجاؤں نے آباد کیا۔ بہرحال ورنگل چونکہ ایک عرصے تک راجگان تلنگانہ کی راجدھانی بنا رہا اس لئے ورنگل اور ہنمکنڈہ میں متھ اور مندر بہ کثرت ہیں۔ مثلاً شیو کا دیول، راماپا کا دیول، دشنو کا دیول وغیرہ۔ ان میں سے ہزار کھم کا قدیم مندر قابل دید ہے جو گجرات سدھپور کے رودر مالا کے نمونے پر بنایا گیا ہے۔ اہل ہنود اس کو بہت مقدس اور متبرک مانتے ہیں۔ ہر سال جاترا خاص اہتمام کے ساتھ ہوتی ہے۔ حکومت سرکار عالی کی جانب سے ان مندروں کو کافی امداد حاصل ہے چنانچہ آج سے بارہ سال پہلے راماپا کے دیول کا کچھ حصہ پرانا اور بوسیدہ ہوکر گر گیا تھا جس کو درست کرنے کے لئے اعلیٰ حضرت شہریار دکن نے چودہ ہزار روپے منظور فرمائے۔

بینگل ضلع نظام آباد اور پیٹھن ضلع اورنگ آباد بھی اہل ہنود کے مقدس مقامات ہیں۔ بینگل میں نارائن سوامی کا دیول اور پیٹھن میں ایکناتھ مہاراج کا دیول ہے۔ ان مقامات کی جاترائیں اعلیٰ پیمانے پر ہوتی ہیں۔ جاترا کے زمانے میں دکن کے ہر حصے سے لوگ بڑی تعداد میں یہاں جمع ہوتے ہیں۔

ناندیڑ سے قریب ہندوؤں کا ایک اور مقدس مقام مالیگاؤں ہے۔ ہر سال مارگیسر کے مہینے کی آخری تاریخوں میں جاترا ہوا کرتی ہے۔ بڑا بھاری میلہ لگتا ہے۔ مویشی اور بالخصوص گھوڑوں کی تجارت خوب ہوتی ہے۔ جاترا کے زمانے میں سرکاری انتظامات رہتے ہیں۔

غارہائے ایلورہ اور اجنٹہ جو دنیا بھر میں مشہور ہیں کسی زمانے میں اہل ہنود کے مقدس مقامات سمجھے جاتے تھے لیکن اب آثار قدیمہ میں شامل ہیں۔ دیول چنلداائی گٹہ بلدہ حیدرآباد سے جنوب کی طرف ۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے یہاں کی سالانہ جاترا بھی بہت مشہور ہے۔

سکھوں کا مقدس مقام ناندیڑ میں گردوارہ سکھاں ہے۔ ناندیڑ دریائے گوداوری کے کنارے واقع ہے۔ قدیم زمانے میں تلنگانہ کا پائے تخت تھا۔ اسٹیشن ناندیڑ سے مشرق کی طرف ایک میل کے فاصلے پر سکھوں کا مشہور گردوارہ ہے۔ اس میں شری گرو گوبند جی مہاراج دفن ہیں۔ ان کا زمانہ آج سے (۲۳۶) سال پہلے کا ہے۔ دسہرہ اور بالخصوص ہولی کے تہوار میں یہاں بڑا بھاری میلہ لگتا ہے۔ امراء و روسائے ہند و دکن کے کئی نایاب تحفے اور عطیے یہاں محفوظ ہیں۔ گردوارہ کے انتظامات کے لئے حکومت سرکار عالی کے زیر نگرانی باقاعدہ عملہ اور ایک مہتمم مقرر ہے۔ پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے حصوں سے سال کے ہر حصے میں جاتری یہاں آتے رہتے ہیں۔ روزانہ شام کے وقت بھجن ہوا کرتا ہے جس میں اکثر شری گرونتھ صاحب کی نظمیں پڑھی جاتی ہیں۔ شرکت کی عام اجازت ہے۔ پوری عمارت سنگ مرمر کی گنبد نما ہے جو بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ ریل سے گزرنے والے مسافروں کو کئی میل کے فاصلے سے نظر آتی ہے۔ عمارت کے اکثر حصوں پر سونا چاندی مڑھا ہوا ہے۔

دکن میں ہندوؤں کا ایک فرقہ **لنگایت** بھی بہت قدیم ہے۔ اس فرقے کے مقدس مقامات اضلاع گلبرگہ اور عثمان آباد میں واقع ہیں۔ بارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں کلیانی کے چالوکیہ راج کا جب خاتمہ ہوگیا تو لنگایتوں نے اس پر قبضہ کرلیا لیکن بہت جلد اس راج کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ دراصل کلیانی کی ایک مقدس ہستی مسمی بسیا نے اس مذہب کی بنا ڈالی۔ فرقہ لنگایت کے مقدس گرو نرن بسیا سادھو کا سمادھ مستقر گلبرگہ میں واقع ہے۔ ہر سال پھاگن کے مہینے میں جاترا بڑے اہتمام کے ساتھ ہوتی ہے۔

اوسہ ضلع عثمان آباد جو تلنگ سے ۳۲ میل کے فاصلے پر ہے یہاں بھی اس فرقے کے ایک گرو رہتے ہیں جن کی زیارت کے لئے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔

(دکن ریڈیو کی ایک تقریر) سید مراد علی طالع

تنقید و تبصرہ

مسئلہ غذا اور قیمتوں پر نگرانی - از ایم نرسنگ راؤ ایڈیٹر "رعیت" مجلد ۱۳۲ صفحے قیمت عہ۔ ناشر ماڈرن بک ڈپو سلطان بازار حیدرآباد دکن

اس کتاب میں حیدرآباد کے مسئلہ غذا پر عہد حاضر کی روشنی میں قابلیت کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ افراط زر اور قلت اشیاء کے مسئلہ کو بھی بخوبی واضح کیا گیا ہے۔ رسد و طلب اور اس پر نگرانی، راتب بندی کی ضرورت اور اس کے اصول کی نسبت جو تجاویز پیش کی گئی ہیں وہ اس قابل ہیں کہ ارباب متعلقہ ضرور ان پر غور کریں۔ نگرانی نرخ اشیاء کی پالیسی اور اس کے نتائج، نگرانی نرخ اشیاء سے متعلق حکومت ہند اور حکومت سرکار عالی کی کانفرنسیں اور ان کے اثرات، حکومت ہند کی غذائی پالیسی کے بنیادی اصول اور ان کی حیدرآباد میں تعلید، رقبہ کاشت کے اعداد و شمار اور اس کی پیداوار کی صراحت، حیدرآباد کی غذائی ضروریں اور ان کی قلت، گیہوں، چاول، جوار اور باجرے کی درآمد و برآمد کے اعداد، زیادہ غلہ اگاؤ کی مہم کی اہمیت اور اس کو خاطر خواہ کامیاب بنانے کی تجاویز غرض کہ مسئلہ غذا اور نگرانی نرخ اشیاء کی نسبت قابل مولف نے کوئی مسئلہ ایسا نہیں چھوڑا ہے کہ جس کی نسبت مزید وضاحت اور صراحت کی ضرورت ہو۔ دور حاضر کے اس اہم مسئلہ پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو بڑی محنت سے لکھی گئی ہے اور اس قابل ہے کہ بہت غور سے پڑھی جائے۔

"س"

مضامین اقبال - مرتبہ تصدق حسین صاحب تاج

یہ کتاب اقبال کی تصانیف ہی کی تقطیع پر خاص اہتمام سے مجلد شایع ہوئی ہے۔ اس میں دو سو چار سے زیادہ صفحات ہیں اور علامہ اقبال کی وہ تصویر بھی ابتدا میں شامل ہے جو پہلی بار سب رس کے اقبال نمبر میں چھپی تھی اور علامہ کی سب تصویروں میں سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ کتاب کی ابتدا اعلام دستگیر صاحب رشید استاد فارسی نظام کالج کی ایک تمہید سے ہوتی ہے جو "صبح مراد" کے عنوان سے لکھی گئی ہے۔ اس کے بعد اقبال کے چند اردو کے مضامین درج ہیں اور چند انگریزی مضمونوں کے اُردو ترجمے۔ دو مضمونوں میں تین نہایت دلچسپ اور مفید ہیں۔

۱۔ اردو زبان پنجاب میں ۲۔ قومی زندگی ۳۔ زبان اُردو

موخر الذکر مضمون میں اقبال نے عام خیال کے تحت اردو کو برج بھاشا سے مشتق قرار دیا ہے لیکن یہ غلط ہے اس لئے کہ اردو برج بھاشا سے بالکل جدا اور ایک آزاد زبان ہے جو اسی زمانہ میں سرزمین پنجاب میں بن رہی تھی جب کہ برج بھاشا برج کے علاقہ یعنی آگرہ، گوالیار، متھرا اور دہلی کے نواح میں ایک انفرادی شکل حاصل کر رہی تھی۔

بہ حیثیت مجموعی یہ مضامین شاعر مشرق کے رجحانات اور انشا پردازی کے اچھے نمونے ہیں اور توقع ہے کہ اردو دنیا میں ان کے مجموعہ ہائے نظم کی طرح مقبول و مشہور ہوں گے۔

اقبال کے چند جواہر ریزے - مطبوعہ اقبال اکیڈیمی پریس، لاہور۔ مرتبہ - پروفیسر خواجہ عبدالحمید صاحب - یہ اصل میں صاحب موصوف کا وہ مضمون ہے جو رسالہ معارف میں اسی نام سے دو سال قبل شایع ہو چکا ہے۔ اس میں اقبال کی ملاقاتوں اور ان کے دلچسپ مکالموں کی پرلطف جھلکیں نظر آتی ہیں۔

اقبال کا تصور زماں و مکاں - مطبوعہ اقبال اکیڈیمی۔ ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی کے ایک مضمون پر مشتمل ہے جو چند ماہ قبل حیدرآباد سے بھی شایع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ان علم دوستوں میں سے ہیں جو اقبال کے کلام کے اسرار و غوامض پر خاص نظر رکھتے ہیں۔

اقبال سے متعلق اس قسم کی چھوٹی چھوٹی کتابیں دیدہ زیب صورت میں شایع کر کے اقبال اکیڈیمی اردو ادب میں مفید اضافے کر رہی ہے۔

[illegible]

Through floods and flames

[illegible]

ادارے کی خبریں

ذیلی مجلس اردو امتحانات

اردو امتحانات کی ذیلی کمیٹی کا اجلاس بروز پیر ... شام کے ساڑھے چار بجے مولوی ... سجاد مرزا صاحب بیگ ... پرنسپل ٹریننگ کالج کی صدارت میں دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔ حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور

مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی۔

مولوی سید محمد صاحب ایم اے شریک معتمد اردو امتحانات۔

(۱) گزشتہ اجلاس کی روداد کی توثیق کے بعد دسمبر کے امتحان اردو دانی کے نتائج پیش ہوئے اور جن امیدواروں کے نتیجے زیر غور تھے ان کے بابت مناسب تصفیے کئے گئے۔

(۲) اردو امتحانات میں نصابی تبدیلیوں سے متعلق مولوی میر عابد علی خاں صاحب بی اے اور مولوی میر حسن علی صاحب صدر شاخ ادارۂ ادبیات اردو ویکاپور اور مولوی سید شاہ نصیر الدین احمد صاحب نہری منصف و سرپرست شاخ ادارۂ ادبیات اردو ویکاپور نے جو تحریکات روانہ فرمائی تھیں ان کو کمیٹی میں پڑھ کر سنایا گیا اور طے پایا کہ:

"امتحان اردو زباندانی میں "حساب" بطور اختیاری شریک کیا جائے اور حساب کی علاحدہ ایک اختیاری پرچہ فوجی اور غیر فوجی امیدواروں کے لئے مشترک رہے۔ دیگر امتحانات میں حساب کی شرکت غیر ضروری ہے۔"

(۳) طے پایا کہ شنکرن صاحب آر ایجوکیشنل آفیسر کو توجہ دلائی جائے کہ فوجی معلومات کا نصاب جلد روانہ کریں۔

(۴) مہتمم صاحب ادارہ نے رپورٹ کی کہ اردو امتحانات کے قواعد و ضوابط کے نسخے قریب الختم ہیں اس لئے دوبارہ شایع کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس بارے میں طے پایا کہ یہ کتابچہ بلا ضرورت طبع کیا جائے لیکن اس میں حسب ذیل امور کا اندراج ہے۔

۱. نصاب فوجی معلومات۔

۲. کتاب معلم بالغان جو مولوی زاہد حسین صاحب ایم اے نے خاص طور پر اردو دانی اور اردو زباندانی کے معلمین کے مطالعے کے لیے لکھوائی گئی ہے اور جو قریب میں چھپ جائے گی اس کے متعلق ان امتحانات کے نصاب کے سلسلہ میں نوٹ درج ہے کہ معلمین اس کا ضرور مطالعہ کریں۔

(۵) اردو فاضل کے پرچہ نظم کی بعض کتابیں چونکہ دستیاب نہیں ہو رہی ہیں اس لئے طے پایا کہ شعرائے حال کے کلام کا ایک نمایندہ انتخاب ادارے کی طرف سے مرتب اور شایع کیا جائے۔ ترتیب کا کام پروفیسر سروری کے سپرد ہو۔ اور جب یہ مجموعہ شایع ہو تو بانگ درا اور فکر و نشاط کی جگہ اس کے شریک نصاب ہونے کا اعلان کیا جائے۔

(۶) حالی اور پریم چند جو سنہ ... کے لئے اختیاری مصنف منتخب کئے گئے ہیں ان کے بارے میں قابل مطالعہ کتب کی فہرست مولوی سید محمد صاحب مرتب فرمادیں تاکہ کتابچہ قواعد و ضوابط میں شریک ہو سکے۔

(۷) مولوی اکبر الدین صاحب صدیقی نے پریم چند پر جو مقالہ تحریر کیا ہے اس کو ادارے کی طرف سے شایع کرنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

(۸) امتحان اردو دانی میں اردو دانی کی دوسری کتاب
کے ساتھ متبادل حیثیت سے کتاب "آسان اردو" حصہ دوم
مولفہ سید شہاب الدین صاحب دسنوی کو شریک نصاب کیا جائے۔
(۹) گم شدہ سند کی نقل دینے کی نسبت محمد مسعود مرزا
خاں صاحب کی درخواست پیش ہوئی اور بعد غور و خوض طے پایا کہ
فی الوقت درخواست گزار کو ادارے کی جانب سے ایک تصدیق
لکھ دی جائے۔
(۱۰) درخواست ہائے امتحانات میں آئندہ سے
عمر کے اندراج کا بھی التزام کیا جائے۔

ادارۂ ادبیات اردو بنگلور بنگلور میں ادارے کے شعبۂ نسواں کی جو شاخ
تین سال سے اردو کا کام کر رہی ہے اس کا دوسرا سالانہ اجلاس
۲۳ جنوری کو منعقد ہوا جس کے لئے اعلیٰ پیمانے پر تیاری کی گئی
اور حسب ذیل اطلاع نامے اخباروں اور رقعوں کی شکل میں
شایع ہوئے۔

ادارۂ ادبیات اردو (شعبۂ نسواں) شاخ بنگلور کا

سالانہ جلسہ

زیر صدارت ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ایم اے پی ایچ ڈی
اردو پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن
یکشنبہ ۲۳ جنوری [illegible] شام کے ٹھیک پانچ بجے بمقام مہارانی کالج بنگلور
مقرر ہے جس میں تقریریں فرمانے کے لئے
جناب عبدالوہاب صاحب بخاری ایم اے پرنسپل اسلامیہ کالج وانمباڑی
اور جناب نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے اردو پروفیسر بمبئی یونیورسٹی
و جناب عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی اردو پروفیسر جامعہ میسور
سے درخواست کی گئی ہے اس میں آپ کی شمولیت موجب مسرت و حوصلہ
افزائی ہے۔ پردہ کا انتظام ہوگا۔ چھوٹے بچوں کو ہال میں لانے کی
اجازت نہ ہوگی۔

سکریٹری	صدر
حبیب النساء بیگم ایم اے	عقیلہ بیگم ایم، آر، اے

سالانہ روئداد شعبۂ نسواں بنگلور

جناب صدر صاحب، معزز مقررین اور عزیز بہنو!
میں اپنی رپورٹ کے پیش کرنے سے پہلے جناب صدر صاحب
بذل الرحمٰن پرنسپل اسمٰعیل کالج اندھیری اور معزز مقررین جناب
نجیب اشرف صاحب ندوی، عالی جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب
قادری زور اور پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کو خوش آمدید
کہتی ہوں آپ کو ہمارے درمیان دیکھ کر جو جذبات تشکر و مسرت
کہ اس وقت ہمارے دلوں میں موجزن ہو رہے ہیں اس کا اظہار
لفظوں میں نہیں ہو سکتا۔

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

آپ میں سے بعض صاحبوں کی شاگردی کا فخر مجھے
حاصل ہے اور یہ وہ خوش قسمتی ہے کہ جس پر میں تا دم زیست نازاں
رہوں گی اور انتہائی فخر و مسرت کے ساتھ ان خوشگوار لمحوں کو یاد کرتی
رہوں گی۔

اس وقت ہندوستان کی ان مایہ ناز ہستیوں کی موجودگی
ہمارے لئے بے انتہا حوصلہ افزائی کا باعث ہے، آپ نے ہماری
ناچیز درخواست کو شرف قبولیت عنایت فرما کر اپنی پرخلوص خدمت
اور قومی ہمدردی کا ثبوت دیا اس کے شکریہ میں یہ اپنے چند ناچیز
الفاظ عقیدت و صداقت کا تحفۂ نیاز پیش کرتی ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

بہنو! آج ادارۂ ادبیات اردو کی دوسری سالگرہ ہے شعبۂ نسواں کی

پہلی جنوری سنہ ۱۹۴۱ء دسمبر میں قائم ہوئی تھی اور کتب خانہ
شروع میں محترمہ سیدہ امتین صاحبہ کی ۱۰۰
کتابوں کا عطیہ سے دسمبر میں شروع ہوا تھا
جنوری میں ادارۂ ادبیات اردو سے ملا دیا گیا اور اس کے
صرف چھ ماہ بعد ۱۱ جولائی سنہ ۱۹۴۱ء کو ادارہ کا پہلا جلسہ عام
منایا گیا۔ اس وقت ادارہ کا یہ دوسرا جلسہ ہے ما شاء اللہ اس کی
عمر اس وقت دو سال کی ہو گئی اور کتب خانہ میں ۲۷۰ کتابیں موجود
ہیں۔ خواتین بنگلور میں سے متعدد صاحب ذوق اس کی ممبر ہیں
اور ہر ہفتہ کتابیں لیکر پڑھتی رہتی ہیں اس عرصہ میں اراکین
مجلس عاملہ کی رائے سے عہدہ داروں میں موقع و محل کے مطابق
بعض تبدیلیاں ہوتی رہیں یعنی اسسٹنٹ سکریٹری صاحبہ بعض
وجوہ کی بنا پر اس مجلس کے جلسوں میں گزشتہ ایک سال
سے شریک نہ ہو سکیں تو طالبات کالج سے ہی مجلس عاملہ کی رائے
سے مدد لینی پڑی، پہلے پہل وحیدہ بیگم صاحبہ اور بعد میں شریف النساء
بیگم صاحبہ اس خدمت کو انجام دیتی رہیں، اراکین مجلس عاملہ
ابتدا میں ہر مہینہ اور بعد میں سواری وغیرہ کی تکلیف کی وجہ سے
سہ ماہی میں ایک مرتبہ ملتی رہیں۔ اراکین مجلس عاملہ کی کوششوں کے
باوجود گزشتہ سال بنگلور میں ادارہ کے اردو امتحانات کا مرکز
قائم نہیں ہو سکا، اس مرتبہ اگر کم از کم دس بہنیں اردو عالم
میں اور ۲۰ اردو دانی کے امتحان میں شریک ہونے پر آمادہ
ہو جائیں تو جولائی کے امتحان کے لئے بنگلور مرکز بن سکتا ہے۔
اردو عالم میں شرکت کے لئے پانچ بہنوں نے اپنے نام دیئے ہیں۔
کولار اور ممکور سے بھی ایک دو بہنوں نے گزشتہ سال امتحان
اردو عالم میں شرکت کا ارادہ ظاہر کیا اور ان کا نام فیس
اور فارم مدت مقررہ تک بھیج دینے کی درخواست ہم نے شائع
بھی کر دی تھی لیکن کسی بہن نے بھی اپنی درخواست نہیں بھیجی۔
جس کی وجہ سے صرف دو تین خواتین کے لئے جو امتحان میں شریک
ہونا چاہتی تھیں یہاں مرکز قائم نہیں ہو سکا۔ اس مرتبہ جو بہنیں
ادارہ کے اردو عالم کے امتحان میں شریک ہونا چاہتی ہیں از راہ
مہربانی ۲۸ فروری سے پہلے اس کی اطلاع سکریٹری ادارہ کو
دے دیں۔ نصاب اردو عالم بھی شائع کیا جا رہا ہے یہ سب کتابیں
سب رس کتاب گھر، رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن سے
مل سکتی ہیں۔ امتحان میں شرکت کے لئے فارم سکریٹری ادارۂ
ادبیات اردو شاخ بنگلور سے مل سکتے ہیں، ادارۂ ادبیات اردو
شاخ کے سالانہ جلسہ کی پہلی رپورٹ میں ۱۱ جولائی سنہ ۱۹۴۱ء تک
کی آمد و خرچ کا حساب پیش کیا گیا تھا۔

گزشتہ سال کے جلسہ کے بعد سے جو محترمہ حاجی بی بی،
ملک سلطان بیگم کا ذرونی کی صدارت میں ہوا تھا اس وقت
تک مجلس عاملہ کے نو اجلاس ہوئے۔ اراکین مجلس کی حاضری
حسب ذیل ہے۔

۸۔ محترمہ عقیلہ بیگم صدر۔ ۸۔ محترمہ صابرہ بیگم۔ ۷۔ محترمہ محبوب جان
بی اے۔ ۹۔ محترمہ رفعت خلیلہ۔ ۴۔ محترمہ زلیخا بی۔ بی اے ۲۔
محترمہ عالیہ بیگم بی اے۔ ۹۔ محترمہ حبیب النساء بیگم سکریٹری۔

ان اجلاسوں میں مختلف امور پر بحث ہوئی حساب و کتاب
مجلس عاملہ کی منظوری کے لئے پیش کیا جاتا رہا۔ کتب خانہ کے
لئے کتابیں خریدی گئیں تعلیم بالغاں کے لئے بسون گراھی
میں ایک مدرسہ کھولا گیا۔ بنگلور میں امتحانات کا مرکز قائم
کرنے کی کوشش کی گئی۔ صدر اور سکریٹری ادارہ نے اردو
کی تبلیغ اور اشاعت کے سلسلہ میں کری سندرا نامی دیہات کو
جا کر تقریریں کیں۔ اس مجلس کے نویں جلسہ میں ادارہ کے
قواعد و ضوابط کی ترمیم کی گئی آئندہ کے لئے عہدہ داروں کا
انتخاب ہوا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱. مجلس عاملہ کے اراکین کی تعداد ۹ ہے اور جلسہ کے لئے کورم ۳ مقرر کیا جائے۔

۲. اگر کوئی مجلس عاملہ کی ممبر بہن چار جلسوں تک لگاتار غیر حاضر رہے تو ان کی یہ نشست مجلس عاملہ کی رائے سے کسی اور بہن کو دی جائے۔

۳. صرف مجلس عاملہ کی اراکین اور کتب خانہ نسواں یا ادارہ کی ممبر بہنوں کو جو ایک سال کا چندہ کم از کم سالانہ تین روپے کے حساب سے ادا کر چکی ہوں حق حاصل ہوگا کہ عہدہ داروں کے انتخاب میں ووٹ دیں اور ادارہ کے جلسہ عام میں اپنی رائے کا اظہار کریں یا کوئی رزولیوشن پیش کریں (رزولیوشن کے پیش کرنے کے لئے جلسہ عام سے دو ہفتہ پہلے دفتر ادارہ کو بھیج کر مجلس عاملہ سے اس کی منظوری حاصل کر لینی چاہیے۔) تاہم دوسری تمام بہنیں اپنی رائے سے صدر یا سکرٹری کو مستفید فرماسکتی ہیں۔

۴. مجلس عاملہ کو اختیار ہوگا کہ ان قواعد میں موقع محل کی مناسبت سے تغیر و تبدل کرے یا نئے قواعد کا اضافہ کرے جو جلسہ عام کے پاس کردہ قواعد کے خلاف نہ ہوں ایسے نئے قواعد دوسرے جلسہ عام میں منظوری کے لئے پیش کئے جائیں گے۔

عہدہ داروں کا انتخاب۔

صدر:۔ محترمہ عقیلہ بیگم ایم آر اے۔

سکرٹری:۔ حبیب النساء بیگم (ایم اے اردو فارسی)

اسسٹنٹ سکرٹری:۔ شمیم زیب النساء بیگم صاحبہ۔

اراکین مجلس عاملہ مذکورہ بالا عہدہ داروں کے علاوہ محترمہ محبوب جان بی اے۔ محترمہ عالیہ بیگم بی اے۔ محترمہ زلیخا بی۔ بی اے۔ محترمہ صابرہ بیگم صاحبہ۔ محترمہ رفعت خلیل [illegible]

محترمہ ملکہ حفیظ صاحبہ۔

اپنی رپورٹ کے خاتمہ پر اپنی بہنوں سے اپیل کرتی ہوں کہ براہ مہربانی اردو کی ترقی و اشاعت کے سلسلہ میں کوشش میں ہمارا ہاتھ بٹائیں اپنے قیمتی خیالات سے آگاہ فرماتی رہیں اور اچھی طرح جان لیں کہ اس وقت ہماری زبان اور تمدن کی موت و حیات کا سوال ہے رسمی لفظی یا نمائشی کام تو بہت کر چکے اب ہر کام میں صداقت کی تڑپ کی ضرورت ہے۔ ع

جا چکے ہے نمائش داغ جنوں کے دن

اب شہید وفا میں تڑپ نقد جاں کی ہے

خدائے پاک بہنوں کو اس کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے اخلاص کو خلعت قبولیت بخشے آمین یا رب العالمین۔ اس موقع پر میں اپنی عزیز طالبات کو مبارکباد دیئے بغیر نہیں رہ سکتی ان میں اردو کی خدمت کا خاص ذوق و شوق پایا جاتا ہے ادارہ کے سالانہ جلسے انہیں کی مدد سے ہوا کرتے ہیں۔ گزشتہ ماہ میں انہوں نے یوم اردو نہایت ہی اعلیٰ پیمانہ پر منایا تھا جس میں کالج کی طرف سے تقریباً ۴۵ روپے کی اور عطیہ جات سے ۱۵ روپے کل جملہ ۶۰ روپے کی کتابیں مختلف تحریری و تقریری مقابلوں میں بطور انعامات دی گئیں گو کہ ہم میدان عمل میں کسی طرح اپنے بھائیوں سے پیچھے نہیں ہیں تاہم ہم صرف طالبات سے ہی نہیں بلکہ آپ سب بہنوں سے مدد کی خواہاں ہوں بہنیں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ دوسری زبانوں کی ترویج و اشاعت کے لئے جو کوششیں ہو رہی ہیں اس کا عشر عشیر بھی ہم نہیں کر رہی ہیں۔ میری آپ سے یہ درخواست ہے کہ اس ادارہ کی شاخیں ہر محلہ میں کھول دیں اور اس کا کام نہایت گرم جوشی اور صداقت کے ساتھ کر دکھائیں ادارہ کے

کتب خانہ کی ممبر بن کر اس سے فائدہ اٹھائیں۔

آخر میں محترمہ صغریٰ امین صاحبہ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انھوں نے ۵۰۰ روپے کا عطیہ ادارہ کو عنایت فرمانے کا وعدہ فرمایا۔ ابتداء سے یہ ادارہ ان کے زیر بار احسان رہا ہے۔ محترمہ مرزا اسمٰعیل صاحبہ کی عنایات کو یہ ادارہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا آپ کو ہمیشہ ہماری کوششوں سے دلچسپی رہی ہے اور اپنے بیش بہا مشوروں سے ہمیں مستفید فرماتی رہی ہیں۔ لہٰذا آپ کی خدمت میں اپنا ناچیز ہدیہ تشکر پیش کرتی ہوں۔ محترمہ بیگم جسٹس عبدالغنی صاحبہ جو ادارہ کی سرپرست ہیں۔ ان کی عالی امداد کا شکریہ نہ کرنا کفران نعمت ہوگا۔ لہٰذا یہ چند الفاظ شکریہ پیشکش ہیں۔ عالیجناب یم سید غوث محی الدین ایڈیٹر الکلام کا شکریہ تہہ دل سے ادا کرتی ہوں آپ اپنے اخبار گرامی کے ذریعہ اس ادارہ کے اغراض و مقاصد کے پھیلانے میں ہماری مدد کرتے رہے ہیں۔

جناب صدر صاحب معزز مقررین کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے باوجود دور دراز سفر کی زحمت کے ہماری درخواست کو قبول فرما کر ہمیں ممنون فرمایا۔

سکرٹری۔ حبیب النساء بیگم یم اے۔

سالانہ جلسے کی روئداد

ادارۂ ادبیات اردو شعبہ نسواں کا سالانہ جلسہ عام اگرچہ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب کی صدارت میں منعقد ہونے کا اعلان ہوا تھا لیکن خود ڈاکٹر صاحب موصوف نے عالیجناب ڈاکٹر بذل الرحمن صاحب یم اے پی ایچ ڈی پرنسپل اسمٰعیل کالج جوگیشوری کی موجودگی کی بنا پر ان کی صدارت کی تحریک فرمائی۔

جلسے سے کچھ دن پیشتر ہی ملک بھر کے نہایت ہی مقبول اخبار "الکلام" میں اس کا اعلان چھپوا یا گیا تھا۔ اطلاعات شہر بنگلور میں جلسہ سے دو دن پیشتر ہی تقسیم ہونے شروع ہوئے۔ سٹی میونسپلٹی نے ادارہ خواتین کالج کو جلسے کا انتظام کیا۔ مسز کمل پرنسپل بادامی کالج نے کالج کے خوبصورت ہال کے استعمال کی اجازت دی۔ بہت سی معلمات خواتین شریک جلسہ تھیں پردہ کا معقول انتظام کیا گیا تھا۔ جناب صدر صاحب اور معزز مقررین اور دوسرے اراکین نے ادارہ کی چائے نوشی میں شرکت کی۔ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب کی تحریک اور سکرٹری ادارہ کی تائید سے جناب بذل الرحمن صاحب یم اے پرنسپل اسمٰعیل کالج جوگیشوری اس جلسہ کے صدر مقرر ہوئے جلسہ کا آغاز قرأت قرآنی سے ہوا۔ پھر شہزادی بیگم صاحبہ نے حمد خوش الحانی سے پڑھی۔ محترمہ عقیلہ بیگم ایم اے صدر مجلس عاملہ نے معزز و محترم مہمانوں کو خیر مقدم کہتے ہوئے تقریر فرمائی۔ سالانہ رپورٹ محترمہ حبیب النساء بیگم صاحبہ ایم اے (اردو فارسی) سکرٹری ادارۂ ادبیات اردو نے پیش کی جس کے خاتمہ پر صدر جلسہ نے اس رپورٹ کے پاس کئے جانے کی منظوری لی اور پاس ہونے کے بعد آمد و خرچ کے حساب کی کتاب پر اپنے دستخط کر دیئے۔

عالیجناب نجیب اشرف صاحب ندوی نے اپنی نہایت ہی فصیح و بلیغ تقریر کے دوران میں مادری زبان کی اہمیت اور اس کے نشو و نما میں خواتین کے حصہ کو تفصیلاً بیان کیا۔

نیز آپ نے فرمایا۔ زبان کی اہمیت جو آپ خواتین سے ہے وہ صرف اس ایک نکتہ سے ہی اظہر من الشمس ہے کہ ملکی زبان کو ہمیشہ مادری زبان کہا جاتا ہے "پدری" نہیں۔ لہٰذا آپ کا تعلق زبان سے بہت گہرا ہے۔ دراصل عورتیں ہی زبان کی صحیح معلم اور رکھوالی ہیں آپ نے سنا ہوگا کہ لکھنؤ کی عام اردو محلات اور

بیگمات سے نکلی تھی۔ اب جبکہ انقلاب آرہا ہے۔ جبکہ ہر قسم کی بندش توڑی جارہی ہے آپ کا فرض ہے کہ اس حسین چیز (زبان) کو ہر قسم کی آلائش سے محفوظ کریں اور اپنی زبان کے محاورات، تشبیہات وغیرہ کی حفاظت کریں۔ پھر محترم مقرر نے میسور میں اردو مصنفہ عبدالخالق سعید کی کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے میسور کی خواتین کے علمی ذوق و خدمات کا ذکر کیا اور آخر میں کہا کہ خواتین اکثر کسی کام کا ارادہ کرنے اور نتیجہ پر پہونچنے میں بہت سا وقت لیتی ہیں مگر جب وہ کوئی ارادہ کرلیتی ہیں تو کوئی طاقت ان کو روک نہیں سکتی جس کا ثبوت خود یہی انجمن ہے۔ آخر میں آپ نے فرمایا۔ اب جبکہ آپ لوگوں نے ایک منزل مقصود مقرر کرلی ہے تو ضروری ہے کہ آپ اپنی ثابت قدم رہیں۔ آپ سے ہم لوگوں کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ مدراس، حیدرآباد اور میسور میں اردو کے لئے جو جوش و عشق کا اظہار ہورہا ہے یقیناً آنیوالی فتح کل کی خبر دیتا ہے۔

سروری صاحب نے شہر بنگلور میں معزز مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے میسور میں اردو کے متعلق نہایت ہی دلچسپ تقریر فرمائی۔ آپ نے فرمایا میسور کے نوجوان آج کل اردو کی بہت ہی خدمت کر رہے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے لئے ایسے مواقع میسر نہیں جن میں ان کی خدمات کا اعلان ہوسکے۔ بزم اردو فارسی کا ذکر کیا اور ہفتہ بزم جو ۱۲ر ڈسمبر سے ۲۲ر ڈسمبر تک میسور میں منایا گیا تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس بڑے جلسے کے تحت یوم اقبال ویوم خواتین کے جلسے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خواتین نے جس جوش سے اس میں حصہ لیا ہے اس سے صاف

پایا جاتا ہے کہ میسور میں بھی خواتین اور طالبات اپنی زبان تہذیب و شائستگی کی خدمت کررہی ہیں چنانچہ فرسٹ آنرز کی ایک خاتون شکسپیر کی زندگی اور کارنامے پر اور دوسری خاتون انشاءاللہ خاں انشاؔ کی زندگی اور کارناموں پر بہترین تبصرہ لکھ رہی ہیں۔ نیز ہم نے ادبیات اردو میسور کے نام سے ایک سلسلہ کی اشاعت شروع کی ہے جس کے تحقیقی کام کے سلسلے میں شاہ محمد صدرالدین صاحب کے متعدد رسالے ملے ہیں۔ اور ایک اور ہندو مصنف لالہ مہتاب رائے سبقت کا پتہ لگا ہے۔ آخرالذکر صاحب کے نام سے اب تک ہماری علمی دنیا ناواقف تھی ان کے اردو رسالے کی دستیابی درحقیقت اردو ادب میں اضافہ کا موجب ہوئی ہے۔ پھر عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب نے اپنی پر مغز و فصیح تقریر کے دوران میں نہایت ہی کارآمد مشورے دیئے اور اس سلسلہ میں گفتگو جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا ہم کو سب سے پہلے جس بات پر توجہ کرنی چاہیے وہ اردو نوشت و خواند کو عام کرنا ہے۔ ان خواتین کو جو اس دولت سے محروم ہیں پڑھا کر اس کیف روحانی سے آگاہ کردیا جائے۔ خواتین بنگلور کے ذوق علمی کا ثبوت اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض خواتین نے ادارہ امتحانات ادارہ کی کتابیں بھی منگوائی تھیں۔ چونکہ گزشتہ سال یہاں مرکز قائم نہ ہوسکا تھا۔ لہذا انھوں نے شائد اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔ لیکن اس مرتبہ آپ کوشش کیجئے کہ مرکز امتحانات یہاں قائم ہوجائے۔ بمبئی میں سال گزشتہ مرکز قائم ہوا اور کئی بالغوں نے امتحانات میں شرکت بھی کی۔ وقت کی اہم ضرورت یہ ہے کہ علم کو عام کردیا جائے۔ اگر تعلیم یافتہ خواتین بھی امتحانات میں شریک ہوں تو نہایت

[illegible] معلوم ہو سکے گا کہ اردو ادب کی باضابطہ تعلیم و تربیت [illegible] ہے اور اردو کے صحیح ذوق کے کیا معنی ہیں۔ حیدرآباد میں [illegible] یافتہ خواتین نے بھی اس میں دلچسپی لیکر امتحانات میں شرکت کی ہے آپ بھی دوسروں کو بھی اور ترغیب دلانے کے لئے ایسا کر سکتی ہیں۔ اردو کی تعلیم کو عام بنانے کے لئے یا جیسا کہ ہم گھر کے نوکروں کو اردو نوشت و خواند سکھلائیں۔ اس کے علاوہ اردو کتب خانوں کی ممبر بنیں اور کم از کم ایک سال میں ایک ان پڑھ کو اردو لکھنا پڑھنا سکھلائیں آخر میں اردو کی اشاعت ترویج و ہر دلعزیزی اور علم کو پھیلانے کے ہر ممکن طریقے کو آپ ضروری سمجھیں۔ ان طریقوں سے آپ اپنی زبان اپنے ادب اور اپنی تہذیب کی صحیح خدمت گزار بن سکتی ہیں۔

اس کے بعد جناب صدر صاحب نے نہایت ہی مفید اور پرمغز تقریر کے ذریعے سے اردو کی توسیع و اشاعت کے لئے مشورہ دیئے جلسہ کے انعقاد اور میسور میں اردو کی ترقی کی کوششوں پر خوشنودی کا اظہار کیا۔

آخر میں شمیمہ زیب النساء بیگم نے جناب صدر صاحب معززہ مقررین پرنسپل کالج۔ اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا اور تقریباً ۱ بجے جلسہ کے ختم ہونے کا صدر صاحب نے اعلان کیا اور معزز مہمانوں کو پھول کے ہار پہنائے گئے۔ دوسرے دن ادارہ کی طرف سے طالبات مہارانی کالج کو جنہوں نے جلسہ کے انتظام میں سکریٹری کی مدد فرمائی تھی عصرانہ دیا گیا۔

حبیب النساء بیگم

منظوم خیر مقدم

صدر شعبہ نسواں بنگلور نے اس سالانہ اجلاس میں اپنی خیر مقدمی تقریر کے بعد جو نظم سنائی وہ درج ذیل ہے۔

شہر بنگلور آج کیوں رشک گلستاں ہے بنا
ہر جہت سرسبز و ہر حصہ ہے اس کا پرفضا
طنز اور شوخی سے ہیں قائم کنارِ جوئے آب
نونہالانِ چمن پہنے ہوئے رنگیں قبا
بس نزاکت سے ہیں جھکتے یاں جلاجل برگ کے
آتی ہے شہنائی کی منقارِ بلبل سے صدا
قمریاں گاتی ہیں ذوق اور چین کے دل سے یہ راگ
خیر مقدم، خیر مقدم، خیر مقدم آپ کا
ہو مبارک آپ کو اے خواہرانِ باصفا
اجتماع یہ رہبران و عالمانِ قوم کا
آئے ہیں تکلیف اٹھا کر یہ نہایت دور سے
غور سے سنئے پیام ان کا ہے بے شک جانفزا
لیجئے اس کا اثر دل پر نہایت شوق سے
ہو مگر اس کا اثر ظاہر عمل سے آپ کے

عقیلہ بیگم کی عقیلہ [illegible]

جگتیال میں شاخ ادارہ کا قیام

حسب تحریک مولوی سید کلیم اللہ حسینی صاحب مولوی فاضل، منشی فاضل، اردو فاضل تعلقہ ہذا میں ادارہ کی ایک شاخ قائم کی گئی ہے جس کے عہدہ دار صاحبین کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ میر مجلس۔ عالیجناب مولوی ثناء اللہ صاحب دوم تعلقدار جگتیال۔
۲۔ معتمد۔ جناب مولوی محمد عظیم الدین صاحب وکیل درجہ اول۔
۳۔ نائب معتمد۔ جناب مولوی حبیب الرحمن صاحب مدرس۔
۴۔ منتظم۔ مولوی محمد عبد الغنی صاحب معتمد دار العلوم شریف جگتیال۔
۵۔ رکن۔ مسٹر کشمی نرسہوال راؤ صاحب وکیل درجہ دوم۔
۶۔ " " بلیپت راؤ صاحب

،، رکن جناب مولوی ذکاء اللہ صاحب مولوی فاضل مدرس۔
،، ،، ،، عزیز الدین صاحب محاسب بلدیہ[illegible]

شاخ ناگر کرنول

معتمد صاحب شاخ ادارہ کے مکان میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت خاکسار کی اہلیہ سعید النساء بیگم نے کی اور اولاً رحمت النساء بیگم اردو کی اہمیت پر تقریر کی اس کے بعد وزیر النساء بیگم صدر وزیری کامیاب امتحان ادارہ ادبیات اردو نے بھی اردو کی ترقی کی ترغیب دلاتے ہوئے تقریر کی۔ اس کے بعد خیر النساء بیگم [illegible] نے تقریر کی اس کے بعد آخر میں سعید النساء بیگم صاحبہ صدر اہلیہ معتمد شاخ ادارہ نے اردو کی ضرورت و اہمیت پر تبصرہ کیا۔ ان تقاریر کے اثر نے محض عورتوں کے دل میں اردو کی رغبت اور اس کی ترقی کی خواہش پیدا کی اور بعض خواتین نے شاخ ادارۂ ادبیات اردو ناگر کرنول کی رکنیت قبول کی اور چندہ دہندگان میں اپنا نام شریک کروایا۔ آئندہ کے لئے ادارہ میں مزید ترقی کا باعث ہوئیں اور یہ معتمد بہر نوع امکانی سعی و قیام دار المطالعہ کی نسبت کر رہا ہے انشاء اللہ ایک روز یہ کوشش کامیاب رہے گی۔

شیخ منصور علی معتمد

شاخ کپل

ادارے کی شاخ کپل نے اپنا مجلس [illegible] کا نیا انتخاب کیا جو حسب ذیل اصحاب پر مشتمل ہے۔

صدر۔ مولوی سید مصطفےٰ حسین صاحب ایم اے [illegible]
نائب صدر۔ مولوی محمد رحمت اللہ صاحب [illegible] ایل ایل۔ بی [illegible]
معتمد۔ مولوی سید ضیاء الدین [illegible] صاحب وکیل۔
شریک معتمد۔ مولوی سید فیض علی صاحب مولوی کامل مددگار [illegible]
خازن۔ خان محمد سیٹھ نورانی صاحب
ارکان مجلس انتظامی۔ پنڈت سی۔ دالگو ندرا ؤ صاحب چالیس۔
عالیجناب قادر محی الدین صاحب مہتمم تعلیمات۔
مولوی حمید الدین صاحب بی ایس سی۔ بی۔ ٹی اول مددگار۔
مولوی محمد حسین صاحب مدرس وظیفہ یاب۔
پنڈت طیا صاحب وکیل۔
جناب ممتاز علی صاحب وارثی بی اے سررشتہ گرد اوری۔
مولوی سید امین الدین صاحب وکیل۔
،، سراج الحسن صاحب قادری کنٹراکٹر۔
،، حافظ حکیم سید احمد علی صاحب ٹونکی۔
پنڈت نارائن راؤ صاحب جوشی بی ایس سی۔ مددگار مدرسہ فوقانیہ۔
مولوی اختر علی صاحب بی اے مددگار مدرسہ فوقانیہ۔

اگر آپ کو اردو کی بلند پایہ معیاری کتابوں کے مطالعہ کا ذوق ہے تو اس بارے میں ادارۂ ادبیات اردو سے مراسلت کیجئے جو آپ کے ذوق ادب کی تشفی کے وسائل بہم پہونچائیگا۔

دلچسپ تاریخی کتابیں

[illegible] حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے استاد تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ لکھی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقاء، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں، علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔
بڑی سائز ۳۲۵ سے زیادہ صفحات قیمت ہے

مقدمۂ تاریخ دکن پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کی ہے اس میں سرزمین دکن کے پچیس حکمران خاندانوں کے آغاز، ارتقاء عروج اور زوال کے متعلق تعارفی معلومات کے علاوہ حکمرانوں کا پورا شجرۂ نسب اور حکمرانوں کی تاریخیں بھی قلمبند کردی گئی ہیں۔
متوسط التقطیع ۱۴۴ صفحات۔ قیمت عہ

میر محمد مومن عہد محمد قلی قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ میں پیشوائے سلطنت اور وزیر مطلق تھے۔ دنیوی عروج کے علاوہ ان کی مذہبی سیادت و فضیلت بھی بہت مشہور ہے۔ انھوں نے ہزارہا روپے کے صرفے سے ایک دائرہ بنایا تھا جس میں خاک کربلائے معلی بچھادی تھی۔ اور یہ دائرہ اب تک "دائرۂ میر مومن" کے نام سے حیدرآباد میں مشہور و معروف ہے۔ میر محمد مومن صاحب اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر بھی تھے اور حیدرآباد آنے سے قبل شاہ ایران کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ ان کے نہایت تفصیلی اور تحقیقی حالات زندگی اس کتاب میں جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور نے اپنے دلچسپ و مقبول عام اسلوب میں تحریر فرمائے ہیں۔ تقریباً تین سو صفحات مع تصاویر قیمت عہر

ریاض مختاریہ حیدرآباد کے بیدار مغز عالی الہام نواب مختار الملک سر سالار جنگ اول کے حالات زندگی اور کارناموں کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ خاندان، تعلیم و تربیت، دیوانی کا ذکر، مشہور واقعات، تعلیمی و سیاسی خدمات، نظم و نسق سلطنت، غرض حیدرآباد کے گزشتہ حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف مولوی میر دلاور علی دانش مرحوم ہیں۔ یہ کتاب اب تک قلمی مسودے کی صورت میں تھی لیکن اب ادارہ کی طرف سے شائع ہوچکی ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب صفحات (۱۰۴) قیمت عہ

ہندوستانی تمدن از پروفیسر ڈاکٹر ایشورا ٹوپا ڈی فل ریڈر تاریخ تمدن ہند جامعہ عثمانیہ۔ یہ تقریباً پانچ سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جس میں فاضل پروفیسر صاحب نے ہندستان کے قدیم تمدن کو دس ابواب میں شرح و بسط اور تحقیق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر اردو تو کجا کسی اور زبان میں بھی ایسی عالمانہ کتاب اب تک نہیں لکھی گئی تھی۔ جو لوگ قدیم ہندستان سے واقف ہونا چاہتے ہیں اس کو ضرور پڑھیں صفحات (۴۴۰) قیمت ہے

مشاہیر قندہار دکن اس تذکرہ میں مولوی اکبرالدین صاحب صدیقی ایم اے نے دکن کے مشہور و معروف اور مردم خیز خطۂ قندہار شریف کے معزز خاندانوں اور ان کے باکمال و مایۂ ناز افراد کا اجمالی خاکہ کھینچا ہے۔ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی استاد تاریخ جامعہ عثمانیہ کا بصیرت افروز مقدمہ اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

قندہار شریف دکن کا بگرام سمجھا جاتا ہے اور محمد تغلق کے زمانے سے آج تک وہاں کی سرزمین سے بڑے بڑے اولیاء، علماء، شعرا اور

شاعر پیدا ہوتے رہے ہیں۔ دکن کے مختلف شہروں اور قصبوں میں قاضیوں، خطیبوں، محتسبوں اور دیگر اہل خدمات شرعیہ کے جو خاندان آباد ہیں ان میں سے اکثروں کا تعلق قندھار شریف ہی کے بزرگوں سے ہے اس لئے یہ کتاب دکن کے شرفاء اور بزرگوں کا ایک مستند اور مبسوط تذکرہ بھی جا سکتی ہے اور اس کے مطالعہ سے یہاں کی علمی و ادبی چہل پہل کا اندازہ ہو سکتا ہے۔
صفحات ۱۸۴۔ تعداد تصاویر ۹ قیمت عہ ۔

نذرِ دکن ادارے کے شعبۂ نسواں کی معتمد محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے اس مجموعہ کو مرتب کر کے اپنی خوش مذاقی اور ادبی ذوق کا ثبوت دیا ہے، اس مجموعے میں دکن سے متعلق صنف نازک کے مضامین اور نظمیں شائع کی گئی ہیں۔ اگرچہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے لیکن بہت کامیاب رہی۔ خواتین دکن کا یہ گلدستۂ رنگ و بو تعلیم یافتہ گھرانوں کی زینت بننے کے لائق ہے (۱۰۴)
صفحات قیمت ۱۲؍

تاریخ ادب و زبان کی کتابیں

تاریخ ادب اُردو اردو زبان اور ادب کی کوئی اچھی تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی۔ یہ تاریخ صرف طلبہ اور عوام کے لئے لکھی گئی ہے۔ اردو صحافت اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے جملہ اصحاب کے لئے تاریخی معلومات کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگی۔
چھوٹی تقطیع ۱۷۶ صفحات۔ قیمت ۱۲؍

مدراس میں اُردو مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے مدراس میں اُردو کے نشو و نما اور اس کے ارتقاء کی تاریخ پیش کی ہے۔ ہر دور کے شاعروں اور نثر نگاروں کے سوانح حیات اور نمونۂ کلام تفصیل سے درج ہے۔ تاریخ ادب اُردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ صفحات ۲۰۰
قیمت ...

اُردو مثنوی کا ارتقاء بڑی عالمانہ تحقیقات کتاب چھپ گئی ادارہ اور معیار کے اظہار کے لئے حرف اس کے مصنف پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کا نام کافی ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جو اپنے موضوع اور اہمیت کے لحاظ سے نہایت کامیاب کوشش ہے۔ یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے جن سے اس کی اہمیت اور تلاش و جستجو کا اندازہ ہو سکے گا۔
بڑی سائز (۲۴۳) صفحات قیمت ۱۲؍

مغربی تصانیف کے اُردو تراجم اس میں مولوی میر حسن صاحب ایم اے نے ان تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے جو صدیوں سے اردو زبان کو مالا مال کرنے کے لئے دوسری زبانوں کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے سلسلے میں کی جاتی رہی ہیں۔ یہ تذکرہ نہایت ہی محنت اور تحقیق سے لکھا گیا ہے اس لئے مستند بھی ہے اور مفید بھی نقد ادب اور تاریخی طریقۂ تنقید کے علاوہ ماخذوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں ایسی کتابوں کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔
چھوٹی تقطیع ۱۸۴ صفحات قیمت مجلد ۱۲؍

آریائی زبانیں یہ کتاب اردو کی ابتدائی تاریخ اور اس کے ماخذوں کا مستند تذکرہ ہے جس کو خاص ادارہ کے لئے ڈاکٹر سدھیشور ورما صاحب ایم اے ڈی لٹ پروفیسر سنسکرت و لسانیات و صدر کل ہند انجمن لسانیات نے خاص طور پر مرتب کیا ہے۔ صفحات ۱۴۲ قیمت عہ ۔

بلاغت یہ کتاب فن شعر و انشاء کے محاسن سے متعلق ضروری معلومات پر مشتمل ہے جس کا پہلا حصہ معانی دوسرا بیان اور تیسرا علم بدیع سے بحث کرتا ہے۔ یہ کتاب اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں اور خاص کر اردو کے طلبہ کے افادے کے لئے

... حسین صاحب، منشی فاضل، مولوی فاضل، ... مرتب کرائی گئی ہے۔ صفحات (۵۲) قیمت مرقسہ

سرگزشت غالب اسلام کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی حیات، کارناموں اور اعزہ و احباب کا ایک مجمل تذکرہ ہے جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی (لندن) نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کیا ہے۔ طلبہ اور ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بے حد مفید ہے۔ غالب کی تصویر اور خاندانی شجرے بھی شائع کئے گئے ہیں۔ بڑی سائز، صفحات ۴۷ کتابت و طباعت و کاغذ اعلیٰ۔ قیمت ۸ ر۔

محمد حسین آزاد اردو کے اس بڑے شاعر اور انشا پرداز کے مکمل حالات زندگی اب تک شائع نہیں ہوئے تھے۔ اس کتاب کو محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے لکچرار اردو کلیہ اناث جامعہ عثمانیہ نے نہایت شرح وبسط اور تحقیق کے ساتھ قلمبند کیا ہے یہ کتاب سات ابواب میں تقسیم کی گئی ہے جن میں آزاد کی زندگی، شاعری اور تصانیف سے متعلق مکمل معلومات شامل ہیں۔ مع تصویر آزاد (۲۰۰) صفحات قیمت عاں

یوسف ہندی قید فرنگ میں اس کتاب میں محسن بن شبیر صاحب بی اے ایل ایل بی نے غالب کی قید کے واقعہ پر محققانہ نظر ڈالی ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس زمانہ کے قیدیوں کی حالت آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ آخر میں غالب کا ترکیب بند اسیری بھی نقل کیا گیا ہے صفحات ۸۰ قیمت ۸ ر

اردو نامہ اس میں اردو ادب سے متعلق ہندوستان کے بہترین انشا پردازوں اور تنقید نگاروں کے معلومات آفریں مضامین اور مقالے درج ہیں جو خاص طور پر لکھوائے گئے۔ اکثر و بیشتر مشہور شاعروں کی غیر مطبوعہ غزلیں اور نظمیں بطور خاص حاصل کر کے شائع کی گئیں۔ ان میں قدیم و جدید شاعری کے جو نمونے ہیں ان سے اردو شاعری کے مختلف رجحانات کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کی مختلف جامعات کے اردو کے پروفیسروں کے حالات زندگی اور علمی خدمات سے اہل زبان کو روشناس کرایا گیا ہے، جن کی دماغی محنت اور ایثار سے نوخیز ادیبوں، انشا پردازوں اور شاعروں کی صحت بخش تربیت ہوتی ہے۔ مشاہیر اردو کے غیر مطبوعہ خطوط کو پہلی دفعہ منظر عام پر لایا گیا ہے۔ یہ خطوط اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہیں۔ اس میں کئی تصویریں بھی ہیں جو یا تو اردو کے شاعروں، ادیبوں اور محسنوں کی ہیں یا اردو سے تعلق رکھتی ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ اور ارتقاء پر ایک جامع اور مفید کتاب ہے صفحات (۲۰۰) قیمت عاں

روح غالب اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگزشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب جس کو جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے نہایت محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم اے (کیمبرج) صدر المہام تعلیمات و معین امیر جامعہ عثمانیہ نے تحریر فرمایا ہے۔ اس کتاب میں سب سے پہلی دفعہ غالب کے خاندان و اعزہ اور ان کے سسرالی اعزہ و اقارب کے دو تفصیلی شجرے بھی شائع کئے گئے ہیں۔

غالب کی فارسی اور اردو تصنیفات کی تفصیل، ان کی نوعیت، زمانہ تصنیف، ان کی اشاعت کی تاریخیں غرض تمام ضروری معلومات اس میں شامل ہیں۔ تاریخ ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے

یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔

اس میں غالب کے خطوط کے ادبی حصوں کا نہایت نفیس انتخاب کیا گیا ہے تاکہ جو لوگ علمی بحثوں میں الجھنا نہیں چاہتے اور غالب کے شگفتہ اور پاکیزہ اسلوب سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں وہ بے تکلف ان ادب پاروں سے محظوظ ہو سکیں۔ صفحات (۲۴۰) تعداد تصاویر (۳) کتابت و طباعت نفیس کاغذ اعلیٰ قیمت عہ

مکتوبات شاد عظیم آبادی پٹنہ کے مشہور شاعر اور ادیب شاد عظیم آبادی کے غیر مطبوعہ خطوط کا مجموعہ ہے جس کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے نہایت سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ شاد کا زمانہ اردو ادب میں اس لحاظ سے معرکۃ الآرا تھا کہ اس وقت حالی اور سرسید کی تحریکیں شروع ہوگئی تھیں۔ ان تحریکوں کا اندازہ تاریخ سے اس قدر واضح نہیں ہوتا جتنا کہ ادب اور خاص طور پر ایسے خطوط سے ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کتاب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ ایک بیش بہا تحفہ ہے چھوٹی تقطیع (۲۰۰) صفحات قیمت عہ۔

شاد اقبال اقبال اور شاد دونوں کی ہستیاں محتاج تعارف نہیں البتہ اس خبر سے اردو دنیا میں مسرت کی ایک لہر دوڑ جائے گی کہ علامہ اقبال مرحوم اور مہاراجہ یمین السلطنۃ کے درمیان پچیس تیس سال تک جو مسلسل مراسلت ہوتی رہی ہے اس کو اہتمام سے مرتب کیا گیا اور یہ پوری مراسلت ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے مطالعہ سے اقبال کی زندگی اور کردار کے ایسے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جن کے متعلق دوسرے ذرائع سے کوئی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان گراں مایہ خطوط کو جناب ڈاکٹر [illegible] صاحب نے اپنے بسیط مقدمہ کے ساتھ مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ شاد اور اقبال کی نایاب تصاویر بھی شامل ہیں۔ صفحات ۲۰۰ قیمت عہ

نذر ولی اس میں دکن کی چار ایم اے کامیاب خواتین [illegible] محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ محترمہ نعیم النساء بیگم صاحبہ اور محترمہ نجم النساء بیگم صاحبہ کے دلچسپ مضامین ہیں جو بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی اور خصوصیاتِ کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب میں اور جدید ترین نقطہ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں ولی کی معلومات، ان کے تخیل، ان کے فن شعر اور ذوقِ عرفان کے علاوہ ان کے اسلوب، زبان اور انتخاب الفاظ کے متعلق بھی نہایت مفید اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ ولی کے متعلق یہ پہلی مستقل اور جامع کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ تشنگانِ ادب کی تسلی کا باعث ہوگا۔
صفحات ۲۴۸ طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر دو جگہ سنہری نام قیمت مجلد عہ

گارساں دتاسی اردو کے پہلے پروفیسر، فرانس کے مشہور مستشرق اور ہندستانیوں کے سچے بہی خواہ کے علمی و ادبی کارناموں، طریقۂ تعلیم، تلامذہ، کتب خانہ، اردو کی حمایت اور تبلیغ کی کوششوں اور اس کے عہد کی یورپ کی درس گاہوں، اردو کے پروفیسروں اور بہی خواہوں کا ایک اجمالی تذکرہ ہے۔ اس کتاب کو جناب ڈاکٹر زور صاحب نے نہایت تحقیق اور جانفشانی سے تالیف کیا ہے۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب صفحات (۱۲۸) قیمت عہ

نقد سخن نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز نے حضرت فانی بدایونی کے کلام پر فنی نقطۂ نظر سے سخن ورانہ تنقید کی ہے۔
تعداد صفحات (۱۷۶) قیمت عہ۔

نام کتاب				نام کتاب			
[illegible] ...	۸۰	۰	۸	سبج کا جادو ...	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible] غالب ...	۹۴	۰	۸	طبیعیاتی کلمات ...	۹۸	[illegible]	[illegible]
[illegible] ...	۴۰	۰	۴	متاع سخن ...	۱۳۴	۰	۱۱
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	کیف سخن ...	۱۲۲	۰	۱۱
[illegible] (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	بادہ سخن ...	۱۲۷	۰	۱۱
ارمغان جذب ...	۱۲۰	۰	۱۲	سراج سخن ...	۱۵۲	۰	۱۲
[illegible] خاں ...	۴۸	۰	۴	ایمان سخن ...	۱۲۰	۰	۱۴
سر سید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲	فیض سخن ...	۲۳۴	۰	۱۲
سر سالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	[illegible]	۸	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	" دوم (۵۰)	۳۳۲	۸	۰
مصیبت کی جھاڑن ...	۱۳۲	۱	۴	نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰
اقبال نمبر ...	۱۶۸	۱	۴	نذر ولی ...	۲۳۸	۲	۳
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰	گریہ و تبسم ...	۱۹۲	۲	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲	مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	من کی دنیا ...	۱۴۵	۱	۰
دادا بھائی ...	۱۶	۰	۲	مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	۰	محرم نامہ ...	۱۱۲	۱	۴
ارسطو جاہ ...	۶۵	۰	۶	نذر دکن ...	۱۵۴	۱	۴
عماد الملک ...	۴۰	۰	۶	روح غالب ...	۲۴۰	۲	۸
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۵	عاصر ...	۴۰۰	۱	۴
" دوسری کتاب	۵۶	۰	۵	دفتری معلومات ...	۵۶	۰	۹
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲
فن تقریر ...	۹۲	۰	۸	نمود زندگی ...	۲۱۶	۱	۸
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	[illegible]	۱۲
ہندستانی تمدن ...	۳۴۰	۳	۸	میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۳	۸
پودوں کی کہانی ...	۸۰	۰	۱۰	بلقان	۳۲	۰	۳
مرلقا ...	۱۰۰	۱	۰	خطابیات ...	۱۱۳	۰	۱۲
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	۶	علم خانہ داری ...	۱۵۰	۱	۸
رسائل طبیہ ...	۳۱۲	۲	۸	چیرتی (۱۶) تصاویر	۱۲۸	۱	۸
سلک گوہر ...	۴۰	۰	۴	انوار ...	۱۶۸	۱	۸
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۹	۱	۴	کشش ثانی (۳) تصاویر	۸۰	۰	[illegible]
ورڈس ورتھ اور اس کی شاعری	۱۸۴	۱	۴	کارستان دکنی ...	۱۶۸	[illegible]	[illegible]
ہوش کے ناخن ...	۹۴	[illegible]	[illegible]	رات کا بھولا ...	۱۹۸	[illegible]	[illegible]
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹	۱	۰	سکندر جاہ ...	[illegible]	[illegible]	[illegible]
شاد اقبال ...	۱۷۹	۲	۸	بلاغت ...	۵۹	[illegible]	[illegible]
آریائی زبانیں ...	۱۴۴	۱	[illegible]	ادارہ [illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
نظام علی خاں ...	۳۲	[illegible]	۴	ناصر الدولہ ...	[illegible]	[illegible]	[illegible]
تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰	افضل الدولہ ...	[illegible]	[illegible]	[illegible]
عرب اور [illegible] ...	۵۲	۰	۱۰	نواب [illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین بی اے
سکینہ بیگم
عبد الحفیظ صدیقی بی ایس سی

[illegible] ۱۵۳
[illegible] ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۵ر

جلد (۷) — بابت مارچ ۱۹۴۴ء — شمارہ (۳)

خواجہ حمید الدین شاہد [illegible] کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس [illegible] ادارہ [illegible] شائع ہوا۔

نیا گھر

مئو کے پٹھانوں میں ویسے تو سب ہی میں کچھ نہ کچھ اکھڑ پن پایا
جاتا ہے لیکن ان میں بھی دلاور خاں سب پر فوقیت لئے ہوئے تھے۔ تھے
گھر کے کھاتے پیتے۔ دکن کنٹنجنٹ سے رسالداری کی پنشن ملتی تھی۔
تھوڑی بہت زمینداری بھی تھی جو انھوں نے دکن سے واپسی پر
خریدی تھی۔ ویسے ان کے باپ دادا کی جاگیر بہت تھی جو غدر کے
بعد ضبطی میں آگئی تھی۔ بچے کھچے کچھ کھیت رہ گئے تھے سو وہ بھی مہاجنوں
کے سود در سود کی نذر ہوگئے۔ غدر کے تھوڑے ہی دنوں بعد دلاور خاں
کے والد فوت ہوگئے اور وہ کم عمری میں اپنے ماموں کے پاس دکن
چلے گئے اور فوج میں بھرتی ہوگئے۔ اگرچہ ان کا سن اس وقت
اٹھارہ سال کا تھا لیکن تھے کڑیل جوان۔ ساری فوج میں ایسا
خوش رو، جری اور رعب دار جوان نہ تھا۔ معمولی سپاہی اور دفعدار
کرنیل کی خوشامد میں رہتے لیکن دلاور خاں کو کبھی کسی نے کسی افسر کی
چاپلوسی کرتے نہیں دیکھا۔ وہ بس اپنے کام سے کام رکھتے۔ جو وقت
فوجی فرصت سے بچتا اس میں فارسی کی کتابیں پڑھتے جنھیں دس
بارہ برس کی عمر میں انھوں نے مئو میں ایک ملاجی سے پڑھا تھا۔
اس زمانے کے انگریز افسر بالعموم اعلیٰ خاندان کے شرفا ہوا کرتے تھے۔
دلاور خاں کا کرنیل اس قسم کا شخص تھا۔ بڑا ملنسار اور شریفوں کی قدر
کرنے والا۔ باوجود اس کے کہ دلاور خاں سوائے سرکاری کام کے
کبھی اس کے ہاں نہیں جاتے تھے لیکن وہ انھیں بہت پسند کرتا اور
دلاور خاں کی خودداری کی دل سے قدر کرتا تھا۔ چنانچہ اور دوسروں کے
کے مقابلے میں دلاور خاں نے جلد ترقی کی اور بہت جلد رسالدار ہوگئے۔
رسالداری سے پنشن لے کر اطمینان سے مئو میں زندگی بسر کرتے تھے۔
بالعموم سرکاری نوکری کے بعد لوگ پنشن لے کر اپنے گاؤں یا
قصبے میں زندگی کے باقی دن گزارنے آتے ہیں وہ اپنے وطن میں اپنے
آپ کو اجنبی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ان لوگوں کی طبیعت اس لئے
اور بھی زیادہ اچاٹ رہا کرتی ہے کہ انھیں جانتے کہ وقت کس طرح کاٹیں۔
لیکن دلاور خاں نے نچلی طبیعت پائی تھی۔ وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے
تھے۔ دکن سے واپسی کے بعد انھوں نے اپنے مکان کے پاس آم کے دو
باغیچے لگائے تاکہ انھی سے تھوڑی بہت دلبستگی رہے۔ ان کا دن کا
زیادہ وقت ان باغیچوں کی دیکھ بھال میں گزرتا اور رات محلے کی پاسبانی
اور چوروں کی تاک میں۔ ان دنوں مئو کے آس پاس چوریاں اکثر ہوتی
تھیں اور کبھی کبھی پٹھانوں کے محلوں میں بھی امیر لوگ راتوں کو چھاپے
مارتے۔ ایک رات کیا ہوا کہ شامت کا مارا ایک چور جو ذات کا کُرمی تھا دلاور خاں
کے مکان سے تھوڑی دور پر ایک محلے کی بیوہ کے کٹھل توڑنے آیا۔ رات اتنی
اندھیری تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ کچھ بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔
اتفاق سے خاں صاحب ادھر سے گزر رہے تھے۔ چونکہ آہٹ پاکر کھٹکے
اور گُن گُن لیتے ہوئے اس کٹھل کے درخت کے نیچے پہونچ گئے جس پر چور چڑھا ہوا تھا۔
خاں صاحب کی آہٹ پاکر چور درخت پر سے کودا اور جو اسی میں بھاگنا چاہتا تھا
کہ خاں صاحب نے پکڑ لیا۔ ڈر کے مارے چور کی گھگھی بندھ گئی۔ پھر کیا تھا لاٹھی
سے اتنا مارا اتنا مارا کہ بیچارہ چور ادھ مرا ہوگیا۔ رات کے دو بجے اسے باندھ کر
گھسیٹتے ہوئے تھانہ لے گئے اور تھانہ دار کو سوتے سے اٹھا کر چور کو اس کے
حوالے کیا۔ وہ تو یہ کہئے تھانہ دار خاں صاحب کو جانتا پہچانتا تھا ورنہ
الٹا ان پر مقدمہ قائم ہو جاتا۔ وہ کُرمی بیچارہ کئی مہینے ہسپتال میں پڑا رہا
اس کے بعد اس قابل ہوا کہ اس کا چالان کیا جاسکے۔ اس واقعہ کے بعد سے
دلاور خاں کے محلے میں چوروں کے پر جلنے لگے۔ عام طور پر بستی میں مشہور ہوگیا کہ
دلاور خاں رات میں کبھی سوتے نہیں۔ دن میں ایک آدھ گھنٹے میں کبھی
جھپکی لے لی تو لے لی۔

دلاور خاں تھے نہایت غصیلے۔ ایسے کہ ناک پر کبھی مکھی نہ بیٹھنے دیں۔
لوگوں سے عام طور پر ملتے جلتے بھی کم تھے لیکن محلے والے ہمیشہ ان کی تعریف
کے گیت گایا کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ صبح بھاجی ترکاری
لینے خود بازار جاتے۔ جانے سے پہلے روزانہ محلے کی بیواؤں کے یہاں ضرور
ہوتے جاتے اور باہر ڈیوڑھی پر سے کسی بچے کو پکار کر پوچھ لیتے کہ کچھ بازار سے

۔۔۔تا نہیں ہے۔ اگر کسی کو کچھ منگانا ہوتا تو وہ پیسے بھیج دیتی۔ یکہ ۔۔۔ جوبن کے محلے میں رہتی تھی اس کا سالانہ وظیفہ پچاس سے اکو دیا کرتے تھے، اور اس کے علاوہ چار روپے مہینہ بھی اس کو دیتے تھے۔ دلاور خاں کا قاعدہ تھا کہ بازار سے واپسی پر پہلے محلے والوں کا سامان پہنچا دیتے پھر اپنے گھر آتے۔ محلے کے غریب غربا کو ان کی ذات سے سو قسم کے فائدے تھے۔ ہر ایک کے ساتھ وہ ہمدردی اور نیک سلوک کرتے۔

وہ اپنا آموں کا بڑا باغ کبھی فروخت نہیں کرتے تھے۔ اگر فروخت کرتے تو سو ڈیڑھ سو روپے کہیں نہیں گئے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنے باغ بیچا کرنے ہیں۔ ہم نے اپنے باغ تجارت کے لئے تھوڑی لگائے ہیں۔ یہ آم کھانے کھلانے کے لئے ہوتے ہیں۔ آموں کی فصل میں رات بھر کے گرے ہوئے آم درختوں کے نیچے پڑے رہتے اور کسی راہگیر کی مجال نہیں کہ ایک پھل بھی زمین سے اٹھائے۔ آموں کے اس باغ کے چاروں طرف کوئی چار دیواری نہیں تھی۔ بستی کے مختلف محلوں کو اس باغ میں سے ہو کر راستے جاتے تھے۔ دلاور خاں کے رعب کا یہ عالم تھا کہ رات بھر کے گرے ہوئے آم صبح اس وقت تک پڑے رہتے جب تک کہ وہ خود آ کر اپنے ہاتھ سے انھیں نہ اٹھاتے۔ سب آم ایک جگہ اکٹھا کر کے مختلف ٹوکریوں میں انھیں رکھ دیتے اور اپنے نوکر راجہ سے انھیں محلے والوں اور عزیز و اقارب کو بھجوا دیتے۔ محلے والوں کو فصل بھر آم خریدنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ پھر بستی بھر میں کوئی ملاقاتی اور عزیز ایسا نہ تھا جسے متعدد مرتبہ فصل میں آم نہ بھیجے جاتے ہوں۔

دلاور خاں کو جوانی میں کسرت کا بڑا شوق تھا جس زمانے میں وہ دکن کنٹنجنٹ میں ملازم تھے ایک مشہور پیشہ ور سکھ پہلوان اورنگ آباد آیا۔ فوج والوں نے خاں صاحب کو اس سے کشتی کے لئے آمادہ کیا۔ خاں صاحب ہر چند انکار کرتے رہے کہ میں شوقیہ کسرت کرتا ہوں۔ پیشہ ور پہلوانوں سے میں نے کبھی کشتی نہیں لڑی ہاں فوج میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کبھی کبھی زور کر لیتا ہوں۔ ان میں اور اس میں بڑا فرق ہے۔ لیکن لوگ نہیں مانے اور بالآخر کشتی مقرر ہو گئی۔ فوج کا کرنیل اور دوسرے انگریز افسر بھی تماشا دیکھنے آئے۔ خاں صاحب کو کشتی کے داؤں پیچ تو زیادہ نہیں آتے تھے لیکن ان کی قوت بلا کی تھی۔ اکھاڑہ میں اترتے ہی سکھ پہلوان کا ہاتھ پکڑ کر اس زور سے جھٹکا دیا کہ اس کا ہاتھ کاندھے سے اکھڑ گیا۔ ایک منٹ کے اندر خاں صاحب اس کے سینے پر سوار نظر آ رہے تھے۔ پھر کیا تھا فوج والے خوشی میں اپنی کلاہیں اچھال رہے تھے۔ کرنیل اور دوسرے انگریز افسر بھی خوشی سے بدحواس ہو گئے۔ سکھ پہلوان کو فوراً شفاخانے میں رجوع کیا گیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اس پہلوان کی یہ آخری کشتی تھی۔ اب چاہے اس کا ہاتھ بالکل اچھا ہو جائے لیکن وہ کبھی کشتی لڑنے کے قابل نہ ہو سکے گا۔

دکن سے واپسی پر جب کہ دلاور خاں کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی، وہ روزانہ ہزار ڈیڑھ ہزار ڈنڈ بیٹھک نکال لیتے تھے۔ آموں کے موسم میں اپنے باغ کے بیچوں بیچ ایک اکھاڑہ قائم کرتے جہاں بستی کے نوجوان روزانہ شام کے وقت زور کرنے آتے تھے۔ خاں صاحب مونڈھے پر بیٹھے نوجوانوں سے ہنسی دل لگی کی باتیں کرتے اور اپنی جوانی کے قصے سنایا کرتے تھے۔ خاں صاحب کے ہاں دو تین بھینسوں کا دودھ ہوتا تھا۔ کسرت اور کشتی کے بعد وہ ہر نوجوان کو آم کھانے اور دودھ پینے پر مجبور کرتے اور کہتے کہ آموں کے بعد دودھ پینا ضروری ہے ورنہ پیاس کی تونس لگ جاتی ہے۔ خاں صاحب کے اکھاڑہ کا منظر دیکھنے کے لائق تھا۔ ادھر پانی چھم چھم برس رہا ہے، ادھر آم ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔ نوجوان کسرت کرتے جاتے ہیں، آموں تلے سے آم اٹھا اٹھا کر چوستے جاتے ہیں۔ خاں صاحب ہیں کہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ دوسرے کو کھلانے سے انھیں جس قدر خوشی حاصل ہوتی تھی اور ان کا دل جو لذت پاتا تھا اس کا اندازہ غالباً کھانے والوں کو نہ تھا۔

دلاور خاں دل سے مذہبی آدمی تھے اگرچہ روزہ نماز کے زیادہ پابند نہ تھے۔ ایک طرف مزاج میں بلا کی سختی تھی اور دوسری طرف انتہائی نرمی بھی تھی۔ وہ مسلمانوں کو مصیبت میں دیکھ کر ان کا دل بھر آتا تھا۔ غریبوں، بے کسوں اور یتیموں کا

چاہتے تھے بن پڑتا مدد کرتے پھر ساتھ ہی اس کا سخت اہتمام رہتا کہ کسی کو ان کی امداد کی خبر نہ ہونے پائے۔ سوائے ان کے نوکر راجہ کے بستی کے دوسرے لوگوں کو ان کی خیرات کا بہت کم علم ہوتا تھا۔ ان کے گھر سے کبھی کوئی مانگنے والا خالی ہاتھ نہ جاتا۔ ان کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ اپنی ذات پر وہ بہت کم خرچ کرتے تھے۔ ان کی پنشن اتنی تھی کہ مئو جیسی بستی میں وہ بڑی بھلے پر رئیسانہ ٹھاٹ کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے تھے۔ پھر ان کے دونوں لڑکے انہیں ماہوار خرچ بھیجتے تھے۔ بڑا لڑکا دکن کی کسی ریاست میں رسالداری کے عہدہ پر فائز تھا اور چھوٹے لڑکے نے اورنگ آباد میں وکالت شروع کر دی تھی۔ پچھلے دنوں جب چھوٹا لڑکا مئو آیا تو پانچ ہزار روپیہ پکی حویلی بنوانے کے لئے چھوڑ گیا۔ یہ روپیہ گھر ہی میں رکھ لیا گیا اس واسطے کہ دلاور خاں کو بنکوں پر زیادہ اعتبار نہ تھا اور بالخصوص ایسی صورت میں کہ بنک بستی سے دور فتح گڑھ میں ہو۔ اگر بستی میں ہوتا تو کم از کم اتنا اطمینان رہتا کہ مار پیٹ کر آدمی اپنا روپیہ نکلوا بھی لے لیکن اجنبی جگہ میں ظاہر ہے ایسا کرنے میں دشواری ہوتی۔ خاں صاحب نے اپنے آموں کے باغ کے قریب اینٹوں کی بھٹی لگالی اور اپنی نگرانی میں مکان کی تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔

باوجود اس مشغولیت کے ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہی صبح اٹھنا، محلے والوں کے یہاں جانا اور سودا سلف بازار سے لاکر دینا۔ ان کے چھوٹے لڑکے نے جب وہ مئو آیا تھا ہر چند دلاور خاں سے کہا کہ اب ابا جان آپ بوڑھے ہوگئے ہیں خود بازار جانے کی بجائے راجہ سے سودا سلف منگا لیا کیجئے۔ اس پر خاں صاحب بگڑ کر بولے "لوگ کہیں گے کہ بیٹے کی کمائی پر دماغ میں ریاست کی بو باس پیدا ہوگئی۔ یہ بات وضعداری کے خلاف ہے۔ ہماری زندگی کا ڈھنگ وہی رہے گا جو اب تک رہا ہے۔ ہمارے گھر میں چار پیسے ہوگئے تو گیا اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم اپنا کام اپنے ہاتھ سے نہ کریں۔ پھر راجہ کم بخت کو اچھے برے گوشت کی پہچان نہیں۔ کبھی اس سے گوشت منگایا تو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لال لال لیچھڑے لاتا ہے۔ ایسے کہ دو دن بھی چولہے پر چڑھے رہیں تو نہ گلیں۔ بھلا ایسا گوشت کھانے سے فائدہ؟ کہنے میں جو غریب بڑی بوڑھیاں اور بیوائیں رہتی ہیں ان سے راجہ کو ازلی دشمنی ہے۔ اس کا بس چلے تو ان سبھوں کو زندہ دفن کر دے۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ میں ان کی مدد کیوں کرتا ہوں۔ جب دیکھو وہ ان غریبوں کا میرے سامنے برائی کیا کرتا تھا۔ بس کسی کا مجھ سے تھوڑا بہت کچھ لے جانا ہے تو اسے نہ جانے کیوں کھلتا ہے۔ لیکن اگر راجہ میں یہ کوئی بات نہ ہوتی جب بھی بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اپنے بڑھاپے کی دیکھ بھال چھوڑ دوں اور سودے سلف کے لئے نوکروں کا دست نگر ہو جاؤں۔"

دلاور خاں کے چھوٹے لڑکے نے باپ کو ہر چند قائل کرنا چاہا لیکن وہ اپنی بات پر قائم رہے۔

ایک دن صبح کے وقت دلاور خاں حسب معمول سودا سلف خریدنے بازار جا رہے تھے کہ راستے میں ایک شخص کو دیکھا کہ ایک آم کے درخت تلے ننگا دھڑنگا بیٹھا ہے اور چلا چلا کر کسی کو گالیاں دے رہا ہے۔ دلاور خاں جب اس شخص کی طرف مڑ کر دیکھا تو وہ بولا "دیکھتا کیا ہے، تجھی کو کہہ رہا ہوں۔ آیا بڑا طرہ باز کہیں کا۔"

دلاور خاں اس قسم کے طرز خطاب کے مطلق عادی نہ تھے۔ پہلے کچھ چیں بجبیں ہوئے لیکن پھر خیال کیا کہ شاید کوئی پاگل شخص ہے اس سے کون منہ لگے۔ اتنے میں دو شخص صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے آم کی جڑ کے پیچھے سے دلاور خاں کی طرف بڑھے اور ان کے پاس آکر کہنے لگے "کرم علی شاہ میاں یہی ہیں۔ یہ جسے گالی دے دیں یا مخاطب ہو جائیں سمجھو اس کی قسمت جاگ گئی۔ ہم دونوں دو گھنٹے سے یہیں آس پاس پھر رہے ہیں لیکن یہ ہماری طرف دیکھتے ہی نہیں۔ دنیا کا عجیب حال ہے۔ بن مانگے موتی اور مانگے بھیک نہیں ملتی۔"

دلاور خاں نے چال ڈھال سے پہچان لیا کہ یہ دونوں شخص کہیں باہر کے ساہوکار ہیں۔ ان کی طرف خطاب کرتے ہوئے کہا "آپ دونوں مجھے یہاں کے نہیں معلوم ہوتے۔" ان میں سے ایک نے جواب دیا "ہم پٹیالے کے رہنے والے ہیں۔ ہم نے ایک گوسائیں کی زبانی سنا ہے کہ یہاں ور کے ایک بنئے کو جو سٹہ کرتا ہے کرم علی شاہ نے لکھ پتی بنا دیا۔ ہم دونوں اسی فکر میں آئے ہیں کہ میاں صاحب کی ہم پر بھی عنایت کی نظر ہو جائے۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اس ننگے دھڑنگے شخص نے پھر چلا کر دلاور خاں کی طرف خطاب کرتے ہوئے کہا "ہم اکیلے ہی اکیلے کھاتے ہیں۔ اکیلے ہی اکیلے ہم یہاں یوں ہی پلے آموں کے رہیں"۔

دلاور خاں کے دل پر ایک ہیبت سی طاری ہوگئی۔ انھوں نے

[illegible] کو دیا سمجھا کہ جیسے کوئی طاقت انھیں اپنی [illegible] خان کو تھوڑی دیر تک غور سے دیکھتے رہے، [illegible] آہستہ آہستہ گنگنانے لگے۔

[illegible] گھر تشریف لے گئے۔ بابا کے سر پر بڑ قسم کے آموں کی پوٹلی [illegible] کی طرف چلے۔ کرم علی شاہ نے دور سے دیکھا تو قہقہہ مار کر ہنسے۔ [illegible] پیش کئے۔ سلام کیا اور بازار کی طرف چل دیے۔ بازار میں سودا سلف خریدا اور اسی راستے سے واپس آ رہے تھے کہ دیکھتے کیا ہیں کہ گنج کا مشہور بنیا ننھو لال کرم علی شاہ کی جھونپڑی کے پاس ہاتھ جوڑے کھڑا ہے۔ میاں صاحب چپ ہیں کہ اس کی طرف دیکھتے ہی نہیں۔ ننھو لال کا شہر میں لاکھوں کا لین دین تھا اور بڑے بڑے پٹھان جو اپنی مونچھوں پر تاؤ دے کر پھرتے تھے اس کے مقروض تھے۔ بستی میں عام طور پر مشہور تھا کہ مونچھوں پر تاؤ دینے والوں کو مونچھیں تر کرنے کو کڑوا تیل اسی وقت نصیب ہوتا ہے جب کہ ننھو لال ادھار دے۔ پٹھانوں کی بڑی بڑی جائدادیں یا تو اس کے قبضے میں آ گئی تھیں، یا رہن تھیں جنھیں چھڑوانا ممکن نہ تھا۔

خاں صاحب جھونپڑی کی طرف سے گزر رہے تھے کہ کرم علی شاہ نے آنکھیں اٹھائیں اور کہنے لگے! ”یہ مرد بچہ ہے مرد بچہ۔ آج ایک مرد بچے کو دیکھ۔ دنیا کا کتا نہیں۔ کل بھی آنا۔ بھئی غصے والا ہی کام کا آدمی ہوتا ہے۔ ٹھنڈی مٹی کس کام کی۔ بھیج ڈالو تو کچھ اگے بھی نہیں۔ ٹھنڈی مٹی کس کام کی۔“

میاں صاحب یہ کہہ کر چپ ہوئے ہی تھے کہ خاں صاحب نے سلام کیا اور گھر کی طرف چل دیے۔ ننھو لال بنیا ان کے پیچھے ہو لیا اور جب میاں صاحب کی جھونپڑی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تو خاں صاحب کو پکارا کہ ذرا ٹھہرنا۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا دونا تھا جس میں جلیبیاں، امرتیاں اور برفی کے دانے تھے۔ ننھو لال خاں صاحب سے یوں مخاطب ہوا ”خان تم بڑے قسمت کے دھنی ہو۔ تم نے نہ معلوم میاں صاحب پر کیا جادو کر دیا کہ تم پر اتنے مہربان ہیں۔ میں آج چھ دن سے روز آتا ہوں گھونٹوں مٹھائی کا دونا لئے جھونپڑی کے چاروں طرف پھرتا ہوں کہ میرے حال پر عنایت کی

خاں صاحب ننھو لال کو خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ سال کے سال اسی کی دکان سے گھر بھر کے لئے کپڑا خریدتے تھے۔ خاں صاحب بولے ”لالہ جی میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ آج صبح ادھر سے بازار جا رہا تھا کہ خود میاں صاحب نے مجھ سے خطاب فرمایا۔ یہ ان کی بڑی مہربانی ہے، ان کا بڑا کرم ہے۔“

ننھو لال۔ میاں صاحب کو اب یہاں آئے ہوئے پندرہ روز کے قریب ہو گئے خدا کی مخلوق ہے کہ ٹوٹی پڑ رہی ہے لیکن ان کی بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ کسی سے بولنا تو کجا کسی کی طرف دیکھتے تک نہیں۔ ان کی کرامات کی قنوج سے لے کر کمپل تک دھوم ہے۔ ایوب پور میں تو انھوں نے ایک کوڑھی کو اچھا کر دیا اور ایک جنے پر مہربان ہوئے تو اس کو لاکھوں کا آدمی بنا دیا۔

خاں صاحب۔ میاں کرم علی شاہ اصل میں کہاں کے ہیں اور کون ہیں؟

ننھو لال۔ میاں صاحب اصل میں رہنے والے تو چھپر مئو کی طرف کے ہیں۔ پہلے ذات کے کلاسنر تھے۔ عربی فارسی خوب جانتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ دیوان حافظ تو انھیں پورا حفظ ہے۔ قنوج میں ایک تحصیلی مدرسے میں پڑھاتے تھے۔ کوئی سرحدی فقیر قنوج آئے تھے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور دنیا کو چھوڑ چھاڑ کبھی آج یہاں ہیں تو کل وہاں۔ پرماتما نے ان کی زبان میں ایسی تاثیر دی ہے کہ جو کہہ دیں وہ پورا ہو جاتا ہے۔ کوئی چار سال کا عرصہ ہوا میں نے انھیں اسی حالت میں چٹیالے میں دیکھا تھا۔ کوئی دو برس ہونے کو آئے اسی حالت میں قادر گنج کے میلے میں دیکھا۔ لوگ گنیوں اور روپیوں کی تھیلیاں لا کر دیتے تھے اور میاں صاحب میلے میں جا کر بھیک مانگنے والوں اور لنگڑے لولے فقیروں کو سب بانٹ آتے تھے۔ میں تو اسی وقت سے ان کا معتقد ہو گیا کہ جس شخص کو دھن دولت کی پروا نہیں اس سے بڑھ کر کوئی مہاتما نہیں ہو سکتا۔ جب کسی پر بہت مہربان ہوتے ہیں تو اس سے کچھ لانے کی فرمائش کر دیتے ہیں لیکن وہ جو کچھ منگاتے ہیں اپنے لئے نہیں، دوسروں کے لئے۔ آج صبح نہ معلوم انھیں آم کون دے گیا تھا جب میں آیا تو وہ سامنے کی بھنگیوں کی جھونپڑیوں میں بچوں کو آم تقسیم کر رہے تھے۔ جس بچے کو آم دیتے اس کا

خاں صاحب ۔ اچھا آم تقسیم کرتے ۔ کل پچو میاں صاحب کے لئے آم لاؤنگا ۔

منفو لال ۔ آم کیا تم لائے تھے ؟

خاں صاحب ۔ ہاں ابھی کوئی ڈیڑھ گھنٹہ ہوا آموں کی پیٹری میاں صاحب کے پاس چھوڑ گیا تھا چن چن کے میٹھی میٹھی جگیاں لایا تھا ۔

منفو لال ۔ پٹھان تمہیں مبارک ہو ۔ تم خوش قسمت ہو کہ میاں صاحب نے تم سے فرمائش کی ۔ لوگ تو مہینوں چکر کاٹتے ہیں لیکن میاں صاحب انہیں دیکھتے تک نہیں ۔

یہ کہہ کر منفو لال نے مسکاری اور خاں صاحب ان سب باتوں پر جو ابھی منفو لال سے ہوئیں غور کرتے ہوئے گھر کی طرف لوٹے ۔ گھر پہنچ کر منہ ہاتھ دھویا ، کھانا کھایا ، حقہ پیا اور ذرا آرام کرنے لیٹے ۔ رہ رہ کر کرم علی شاہ کی نورانی شکل ان کی نظروں کے سامنے آجاتی تھی ۔ سوچتے سوچتے ذرا جھپکی سی آگئی تو خواب کیا دیکھتے ہیں کہ کرم علی شاہ ان کی انگلی پکڑے ایک ندی پار کرا رہے ہیں ۔ ندی کا پانی بڑی تیزی سے بہہ رہا تھا ۔ یہ ندی اسی طرح کی تھی جیسی کہ انھوں نے دکن کے پہاڑی علاقوں میں برسات کے زمانے میں ندیاں دیکھی تھیں جن کے ریلے کے آگے ہاتھی بھی نہ رک سکے ۔ کرم علی شاہ آہستہ آہستہ ندی میں قدم بڑھا رہے ہیں اور کہتے جاتے ہیں ، ہمت ، میرے ساتھ ساتھ چلے آؤ ۔ پٹھان ڈرتے نہیں ۔

اب خاں صاحب کے دل میں کرم علی شاہ کی عقیدت پیدا ہوگئی ۔ کوئی دن ناغہ جاتا جب کہ وہ گھنٹہ دو گھنٹے ان کی صحبت میں نہ بیٹھتے ہوں ۔ کرم علی شاہ بھی کبھی کبھی خاں صاحب کے یہاں آتے اور گھنٹوں بیٹھتے ۔ دیوان حافظ اور عراقی کی غزلوں کے اشعار گا کر پڑھتے ۔ آدمی تھے نہایت خوش الحان عراقی کی غزل کا جب یہ شعر پڑھتے ؎

صنما رہ قلندر سزد ار بمن نمائی   کہ دراز دور دیدم رہ و رسم پارسائی

تو ان کی بوٹی بوٹی پھڑکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی گویا کہ رقص مجسم بن گئے ہیں ۔

حافظ کی یہ غزل بہت پسند تھی ۔ پڑھتے جاتے اور جھومتے جاتے ؎

اے خسرو خوباں نظرے سوئے گدا کن   رحمے بمن سوختۂ بے سر و پا کن

دارد دل درویش تمنائے نگاہے   زاں چشم سیہ مست بیک غمزہ روا کن

یا دل شدگان جور و جفا تا بکے آخر   آہنگ وفا ترک جفا بہر خدا کن

تشویش دشمن بدگوئے خسدا را   با حافظ مسکین خود آ دوست وفا کن

ایک دن کرم علی شاہ ، خاں صاحب کے مکان کے سامنے آم کے سایہ میں بیٹھے

جس نے مکان کی تعمیر کے لئے چولے وغیرہ کا ان سے ٹھیکہ لے لیا تھا ۔ وہ شخص ذرا بٹھہ باز تھا ۔ اس نے بھاؤ تاؤ میں کچھ بد معاملگی کی ۔ خاں صاحب طیش میں آپے سے باہر ہوگئے اور اس کو کچھ برا بھلا کہا ۔ خاں صاحب کا خیال تھا کہ کرم علی شاہ جو دور کچھ فاصلے پر بیٹھے تھے ان کی باتیں نہیں سن رہے ہیں ۔ لیکن وہ سب کچھ بیٹھے بیٹھے سن رہے تھے ۔ جب بنیا چلا گیا تو خاں صاحب کرم علی شاہ کے پاس آ کر بڑے ادب سے دوزانو ہو کر بیٹھ گئے ۔ کرم علی شاہ خاں صاحب کو دیکھ کر یوں مخاطب ہوئے ۔

" پٹھان تم بڑے غصیلے ہو ۔ تم نے بنئے کو خواہ مخواہ برا بھلا کہا ۔ اگر تمہارا معاملہ آج نہیں پٹتا تو کسی دوسرے سے معاملہ کر لو ۔ لیکن کسی شخص کو برا بھلا کہنے سے کیا فائدہ تمہارا غصہ میں کم کروں گا ۔ اچھا آج ہی شہر چلے جاؤ ۔ ایک مہینے وہاں رہو اور اسی حالت میں واپس آؤ اور مجھ سے ملو ۔ تب میں تم سے بولوں گا "

خاں صاحب نے کرم علی شاہ کا حکم سنا اور ان پر سکتہ کی سی حالت طاری ہوگئی ۔ جسم میں خون معلوم ہوتا تھا جیسے خشک ہوگیا ہو ۔ مکان کی نیو کھد چکی تھی ۔ تعمیر کا سامان خریدا جا چکا تھا اور جو سامان باقی تھا اس کے لئے روپیہ پیشگی دیا جا چکا تھا ۔ برسات کا موسم سر پر آ رہا تھا ۔ گھر پر اور کوئی شخص موجود نہیں جو دیکھ بھال کر سکے ۔ ایسی حالت میں سب کچھ چھوڑ کر متھرا جانا ۔

خاں صاحب یہ باتیں سوچ ہی رہے تھے کہ کرم علی شاہ یوں بولے :۔

" جس مکان کی نیو پر پوری برسات گزر جائے وہ مضبوط رہتا ہے اور بننے کے بعد چاہے برسوں تک اس کی دیکھ بھال نہ ہو تب بھی نہیں گرتا ۔ نیو کو خوب پانی کھانے دو ، خوب تپنے دو اس سے پٹھان نقصان میں نہیں رہوگے "

اب خاں صاحب نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے کوئی ان کی زندگی کو بالکل بدلے دیتا ہے ۔ انھوں نے دل میں ایک طرح کا اطمینان اور خوشی محسوس کی اور کرم علی شاہ کی طرف دیکھ کر کہا " جو حضور کہتے ہیں وہ پورا کروں گا " کرم علی شاہ بازار کی طرف چل دئے ۔ خاں صاحب نے فوراً متھرا روانہ ہونے کی تیاری شروع کر دی اپنے بہنوئی رستم خاں کو گھر بار کا انتظام سپرد کیا اور صبح سویرے متھرا کی راہ لی ۔

گرمیوں کا موسم تھا ۔ برسات سے کچھ دن پہلے کی گرمی بڑی سخت ہوتی ہے ۔ دن کو چلچلاتی دھوپ اور رات کو گرم گرم بھوبل آسمان سے گرتی ہے کہ آدمی کو نہ بیٹھے چین اور نہ لیٹے چین ملے ۔ پانی پر زندگی ہوتی ہے ۔ ایسے وقت تھے جب کہ

[illegible] کہیں کسی سرائے میں آرام کرتے۔ آٹھویں دن [illegible]۔ ایک سرائے میں ٹھیرے۔ میاں حقا کے حکم کے مطابق اتھے پر [illegible] چند روز رہنا اٹھی۔ جس سرائے میں ٹھیرے اس کے سامنے [illegible] سادھو دھونی رمائے بیٹھا رہتا تھا۔ خاں حقا کا جب جی گھبراتا تو اس کے پاس [illegible] ادھر ادھر کی باتیں کرنے۔ چند روز میں سادھو سے دوستی [illegible]۔ اسے اپنا سدا اصلی حال بتلادیا۔ سادھو بہت مہربان ہوگیا۔ وہ کرم علی شاہ کو جانتا تھا اور ان پر اعتقاد رکھتا تھا۔ اس نے کہا کہ جب تم متھرا واپس جاؤ تو شاہ صاحب کو میرا سلام کہنا۔ سادھو کا نام سنیس بہاری تھا۔

کرم علی شاہ کی صحبت میں خاں حقا کی دھن میں ایسی جلا پیدا ہوگئی تھی کہ وہ درویشوں کے اشاروں کنایوں کی باتوں کو خوب سمجھنے لگے تھے۔ سادھو ان سے اس قسم کی باتیں کیا کرتا اور وہ ان سے خوب لطف اندوز ہوتے۔

ایک رات سنیس بہاری کے پاس بیٹھے تھے کہ باز و والے گھر سے گانے ناچنے کی آواز سنائی دی۔ سنیس بہاری نے کہا "جانتے ہو یہ کیا ہے؟" خاں حقا بولے کہ شاید کسی جشن کی خوشی منائی جا رہی ہوگی۔ سنیس بہاری نے کہا "یہ موت کی خوشی ہے"۔

خاں حقا یہ جملہ نہیں سمجھے۔ انھیں ہکا بکا دیکھ کر سنیس بہاری بولے "ابھی چند مہینے گزرے اسی مکان کے مالک کا انتقال ہوا۔ اس کا بیٹا ساری جائداد کا مالک ہوا۔ یہ لڑکا سادھوؤں سے اپنے باپ کے مرنے کی دعائیں کرایا کرتا تھا۔ میرے پاس بھی کئی دفعہ آیا میں نے دھتکار دیا۔ اب یہ پاگل اس رقاصہ سے جو اس وقت اس کی محفل کی رونق بنی ہوئی ہے بیاہ کرنا چاہتا ہے۔ آج پھر میرے پاس دعا کرانے آیا تھا کہ یہ عورت اس سے محبت کرنے لگے۔ لیکن اس عورت کو دھن دولت کی پروا نہیں۔ وہ خود سونے اور موتیوں میں لدی ہوئی ہے اور اس کا دل اس کے مکھ سے زیادہ روشن ہے۔ اس کی قسمت میں نجات ہے۔ وہ ہرگز اس سے بیاہ نہیں کرے گی۔ بہت جلد وہ اپنا پیشہ چھوڑ کر نیکی کی زندگی بسر کرے گی۔ اپنا سارا دھن دولت غریبوں اور بے کسوں پر خرچ کرے گی۔ کئی دفعہ وہ اپنے دل کا دکھڑا میرے سامنے رو چکی ہے۔ مجھ سے کہتی ہے دعا کرو کہ اس گوگناہ کی زندگی سے چھٹکارا ملے۔ اسے ضرور ایک دن نجات ملے گی اور وہ دن بہت دور نہیں ہے۔ وہ کسی نیک آدمی سے بیاہ کرے گی اس کو سکھ دے گی اور خود بھی سکھی ہوگی۔ اور وہ لڑکا تو آتا کا روگی ہے۔ اگر یہ رقاصہ اس کے پلے پڑی تو وہ اس کی نجات میں بھی روڑا اٹکائے گا۔ وہ آتما کا روگی ہے آتما روگی۔ اس کی ساری عمر عیاشیوں میں گزر رہی ہے۔ باپ کی ساری جائداد یوں ہی عیش و عشرت میں تباہ کرے گا اور پھر لنگوٹی لگائے پھرے گا۔ اس کی قسمت میں یہ ہے۔ جیسے جنگل میں سوتے ہوئے ہرن پر سانپ لپٹ جاتا ہے اور ہرن کو اس کی خبر نہیں ہوتی' اسی طرح مایا کا سانپ اس کے تن بدن پر لپٹا ہوا ہے اور آہستہ آہستہ اس کا زہر اس کے جسم میں سرایت کر رہا ہے۔ دنیا دیکھے گی کہ ایک دن وہ دھڑ سے زمین پر گر پڑے گا جیسے ہرن گرتا ہے۔ ایسوں ہی کی آتما مرنے کے بعد بھٹکتی پھرتی ہے۔ تم میرے ساتھ مرگھٹ چلو وہاں تمھیں ایسے بہت سوں کی روحوں کا تماشا کراؤں گا۔ جس کو زندگی میں شانتی نہیں نصیب ہوئی اس کو مرنے کے بعد بھی سکھ نہیں مل سکتا' آؤ دیکھو چلیں۔

خاں حقا۔ سنیس بہاری جی' آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن مجھے بھوت پلید سے ڈر لگتا ہے۔

سنیس بہاری۔ پٹھان ہو کر اور ڈرا کرم علی شاہ کے چیلے کو سوائے خدا کے کسی سے نہیں ڈرنا چاہئے آؤ ذرا چلو تو' کیا مزہ کا تماشا تمھیں دکھاؤں۔ مرگھٹ یہاں سے بہت دور نہیں۔ ابھی ابھی ہم پہونچتے ہیں۔

یہ کہہ کر سنیس بہاری نے اپنا ڈنڈا اٹھایا اور چل کھڑے ہوئے۔ خاں حقا ان کے پیچھے پیچھے ہوئے۔ متھرا کی تنگ و تاریک گلیوں میں ہوتے ہوئے شہر کے باہر ذرا فاصلہ پر مرگھٹ پہونچے۔ ایک نیم کے پیڑ تلے سنیس بہاری بیٹھ گئے اور مراقبہ میں چند منٹ تک آنکھیں بند کرلیں اس کے بعد خاں حقا کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے "وہ دیکھو سامنے ہوا میں ایک آدمی نظر آرہا ہے جس کے نیچے کے آدھے دھڑ سے دہکتے ہوئے شعلے نکل رہے ہیں۔ دیکھو اس کی آنکھیں کیسی پھٹی پھٹی ہیں' ایک ہونٹ نیچے کو لٹکتا ہوا' دانت باہر نکلے ہوئے اور سر پر بالوں کی جگہ کانٹے ہیں۔ دیکھا تم نے....."

خاں حقا۔ ہاں' دیکھا' کیسی تکلیف میں ہوگی اس کی جان۔

سنیس بہاری۔ جانتے ہو یہ کون ہے؟ یہ اس بستی کا مشہور سیٹھ تھا۔ لاکھوں روپیہ اس نے کمایا۔ اپنے فن کا بڑا ماہر لیکن انتہا درجہ لالچی تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاتھ میں شفا نہیں تھی۔ اگر کوئی پیسے والا موٹا اسامی اس کے پھندے میں پڑجاتا تو اپنی گوٹ خوب گرم کرتا اور جہاں تک بن پڑتا بیماری کو بڑھاتا تاکہ جب تک وہ پیسہ نہ ختم ہو ہٹ سکے۔ غریبوں کی طرف بے توجہی کرتا تھا۔ جو آدمی دیا ہوا علم ٹھیک طور پر استعمال نہیں کرتا اس کی یہ حالت ہوتی ہے۔

یہ جملہ ختم کرتے ہی سینیس بہاری نے دکن کی طرف ہاتھ اٹھایا اور کہا:۔ "دیکھو، وہ غصیلا زمیندار ہے۔" یہ ایک بوڑھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں اور زبان میں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی اور گال لٹکے ہوئے تھے۔

خاں صاحب نے سینیس بہاری سے پوچھا "یہ اس کی زبان میں شعلے کیوں نکل رہے ہیں؟" سینیس بہاری نے کہا "اس کی زبان سے کوئی محفوظ نہ تھا۔ یہ ہر شخص کو جو اس سے کمزور ہوتا گالی گلوچ کیا کرتا تھا۔"

خاں صاحب کو یہ منظر دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی۔ اب وہ سمجھے کہ کرم علی شاہ نے انھیں متھرا کیوں بھیجا تھا۔ کیا اسی منظر کو مجھے دکھانا مطلوب تھا۔ اب آئندہ میری زبان سے کسی کے خلاف ایک لفظ نہیں نکلے گا۔ خاں صاحب ابھی یہ باتیں دل ہی دل میں کر رہے تھے کہ سینیس بہاری نے اتر کی طرف اشارہ کیا اور کہا "وہ دیکھو، ایک نیک آدمی جا رہا ہے۔ یہ یہاں کی پلید روحوں سے دور جمنا جی کے کنارہ رہتا ہے۔ اس کی چال میں کس قدر اعتماد ہے۔ چہرہ پر نور اور شانتی برستی ہے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھیں کیسی روشن ہیں۔ یہ ایک اچھوت تھا۔ اپنے کرموں کی بدولت اس کا رتبہ برہمنوں سے اونچا ہے۔ آدمی کی ذات پات قوم کچھ کام نہیں آتی۔ اگر کوئی چیز کام آتی ہے تو اس کی نیکی۔ جو نیکی کرے گا وہ اس کا پھل پائے گا۔"

سینیس بہاری نے خاں صاحب سے پوچھا "کہو کچھ اور دیکھو گے یا گھر چلیں۔" خاں صاحب اب بالکل تھک گئے تھے۔ بولے "اب گھر ہی چلیں۔"

راستہ بھر سینیس بہاری کرم علی شاہ کے گن گاتے اور بتاتے رہے کہ کس طرح ان کی صحبت میں انسان کو روحانی فیض حاصل ہوتا ہے۔ باتیں کرتے جاتے اور بیچ بیچ میں کبیر داس کے دوہے گاتے جاتے۔ سرائے کے پاس پہونچے تو سینیس بہاری اپنی دھونی پر چلے گئے اور خاں صاحب سرائے میں۔ خاں صاحب نے وضو کر کے عشاء کی نماز ادا کی اور چارپائی پر جا کر لیٹ رہے۔ لیٹتے ہی نیند آگئی۔ خواب میں وہی ایک مرتبہ پھر مرگھٹ کے اُدھر جانب دیکھا تھا، نظر آئے۔ خاں صاحب کرم علی شاہ کی باتیں کرتے رہے اور ان کی خوبیاں بیان کرتے رہے۔ چلتے چلتے کہا۔ "دھن، دولت، علم اور قوت سب مایا ہے۔ نیکی اور کرم اصل چیز ہے۔ سب چیزیں مٹنے والی ہیں لیکن آدمی کی نیکی کبھی نہیں مٹتی وہ پرماتما کی طرح ہمیشہ ہمیشہ باقی رہتی ہے۔"

خاں صاحب کی آنکھ کھلی تو صبح کی پو پھٹ رہی تھی۔ حاجتِ ضروریہ سے فارغ ہو وضو کر کے فجر کی نماز ادا کی اور نماز کے بعد گڑگڑا گڑگڑا کر دعا مانگی کہ اے خدا! اے دنیا کے پیدا کرنے والے! مجھے توفیق دے کہ میں مخلوق کی بھلائی کے لئے اپنے آپ کو تج دوں۔ کبھی کسی کو میرے ہاتھ یا میری زبان سے تکلیف نہ پہونچے۔ میں جب تک زندہ رہوں تیرے احکام کی بجا آوری کروں اور جب مروں تو میری روح کو امن و سکون بخش۔"

دلاور خاں کو اب متھرا میں ایک مہینہ گزر چکا تھا وہ مئو روانہ ہونے سے پہلے سینیس بہاری سے جا کر رخصت ہوئے۔ سرائے والوں کا حساب بے باق کیا اور صبح سویرے پیدل روانہ ہو گئے۔ ا ٹیلہ اور ٹیلے ہوتے ہوئے ساتویں دن مئو واپس پہونچے۔ گھر پر سب لوگ واپسی کے منتظر تھے۔ سب سے مل ملا کر سیدھے کرم علی شاہ کی جھونپڑی کو چلے۔ شاہ صاحب نے دور سے خاں صاحب کو آتے دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور کہا "آؤ خان آؤ، لوہا جتنا تپتا ہے اتنا ہی مضبوط اور کارآمد بنتا ہے۔" خاں صاحب کرم علی شاہ کے سامنے آنکھیں نیچے کئے بیٹھے رہے۔ کرم علی شاہ نے پوچھا "کہو متھرا میں کیا دیکھا؟" خاں صاحب نے سینیس بہاری اور مرگھٹ کے مناظر کا ذکر کیا۔ کرم علی شاہ نے سینیس بہاری کا نام سنا تو اچھل پڑے اور بولے "ارے، وہ ہمارا دوست آج کل متھرا میں ہے، اس سے ملے ہوئے مدتیں ہو گئیں، بڑا اسمان آدمی ہے۔"

بے بختی

ایک پہاڑی خطے کی کہانی ہے، جہاں اکثر خانہ بدوش قبیلے آکر ٹھہرتے رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ یہاں شینو اور اس کے قبیلے کے لوگ آکر ٹھہرے۔ یہ لوگ چھوٹی موٹی تجارت کرتے تھے لیکن نوجوان شینو کی شدہ فطرت نے چوری اور لوٹ مار کو اپنا ذریعۂ معاش بنا رکھا تھا۔ وہ اپنے قبیلے میں بہت ہر دل عزیز تھا۔ قدرت نے اُسے شیر کا سا دل دیا تھا یہی وجہ تھی کہ اس کے سب ساتھی اس کی برتری تسلیم کرتے تھے۔ شینو کو یہاں آئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا لیکن اس عرصے میں اطراف و اکناف کے مقامات کی شاید ہی کوئی دکان یا شاید ہی کوئی مکان ہوگا جسے شینو نے نہ لوٹا ہو۔ وہ چالاک اور طاقتور بھی تھا جس سے بڑی جگہ بھی ہاتھ ڈالنے میں اسے جھجک نہ ہوتی۔

پہاڑی خطوں کی برساتیں یوں تو عام طور پر بڑی پُرکیف ہوتی ہیں لیکن اس حصہ میں تو بس ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شراب رس رہی ہو۔ چاروں طرف سبزہ لہلہانے لگا تھا، موسم گرما کی سخت دھوپ سے جھلسی ہوئی پہاڑیاں نظر فریب ہوتی جا رہی تھیں متعدد چھوٹے چھوٹے آبشار پیدا ہو رہے تھے جس کا مسلسل ترنم فضا میں ایک خاص شعریت پیدا کرتا تھا۔ اسی موسم کا آغاز تھا جب شینو کے قبیلے کے قریب ایک دوسرا خانہ بدوش جرگہ آکر قیام پذیر ہوا جس کے مرد تو اطراف کے گاؤں میں ہاتھ دیکھ کر لوگوں کو ان کی قسمت بتا کر روزی کماتے تھے اور عورتیں اپنی پہاڑیوں میں اپنی بکریاں وغیرہ چراتی تھیں۔

ایک روز شام کے وقت شینو ان پہاڑیوں پر یونہی گھوم رہا تھا اس کی عادت تھی کہ جب اسے اپنے محبوب مشغلے سے فرصت ملتی تو وہ اکیلا اطراف کی ان ٹیکریوں پر گھوما کرتا۔ عالم خود فراموشی میں غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں سامنے چرنے والی چند بکریوں پر پڑیں چند لمحوں کے بعد ایک قریبی ٹیلے کی آڑ سے اس مختصر سے گلّے کی رکھوالن بھی نمودار ہوئی۔ حسن، کم عمری اور سادگی کا اس سے زیادہ دلکش مجموعہ شینو نے کبھی نہ دیکھا تھا اس کی نگاہیں وہیں جم کر رہ گئیں، لڑکی نے شینو کو نہیں دیکھا اور آتے ہی اپنی بکریوں کو بلانا شروع کیا، سورج غروب ہونے کے قریب تھا لڑکی بہ عجلت تمام اپنی بکریوں کو جمع کر کے اپنے گھر چلی جانا چاہتی تھی لیکن شوخ بکریاں اس کے قابو میں نہیں آرہی تھیں بے بسی اور غصہ سے اس کا پھول سا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ شینو چونکا جیسے کسی نے اسے گہری نیند سے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا ہو۔ وہ آہستہ آہستہ لڑکی کے پاس گیا اور کہا:۔

میں ہانک دوں؟ لڑکی نے مڑ کر دیکھا پہلے تو جھجکی اور پھر مجھے دیکھتے ہوئے کہا ہانک دو، شینو نے جلدی سے بکریاں جمع کیں اور انھیں راستہ پر لگا کر ہانکنے لگا لڑکی نے احسان مندانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، پھر دونوں راستہ پر ہو لئے۔

شینو نے اس سے پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟

"مُنّی" اس نے ایک خاص لہجہ میں اور ایک خاص ادا کے ساتھ کہا، شینو کو ایک سرور محسوس ہوا اور اسی عالم میں اس نے پھر پوچھا۔

تم کہاں رہتی ہو؟

"وہ سامنے ہمارے لوگ ٹھیرے ہوئے ہیں" اس نے سر سے اشارہ کرتے ہوئے کہا، شینو کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ وہ نووارد قبیلہ کی طرف اشارہ کر رہی تھی، اسے کچھ اطمینان بھی ہوا۔

کیا روز ادھر ہی جاتی ہو؟ شینو نے کچھ ٹھیر کر سوال کیا۔

"ہاں" اس نے شینو کو ایک خاص نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا،

شیخو نے پھر ایک اطمینان کا سانس لیا۔ پڑاؤ قریب آرہا تھا باقی راستہ دونوں نے خاموشی سے طے کیا۔ البتہ دونوں ایک دوسرے کو چپکے سے دیکھ لیتے تھے اور جب دونوں کی نگاہیں ملتی تھیں تو ایسے ڈر جاتے تھے جیسے ایک دوسرے کو کوئی گناہ کرتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ پہلے منی کا پڑاؤ آیا شیخو ایک جگہ کھڑا ہو کر اسے دیکھتا رہا، وہ بھی بار بار مڑ کر اسے دیکھتی اور آخر چھوٹے چھوٹے خیموں میں غائب ہوگئی۔

یہ شیخو اور منی کی پہلی ملاقات تھی۔ رات وہ کھویا کھویا سا نظر آرہا تھا کسی نے بھی اس نے برائے نام کھایا، وہ اپنی چارپائی پر نہ معلوم کن تصورات میں ڈوبا ہوا دیر سے بیٹھا تھا کہ اس کے ساتھیوں میں سے عبدل اور رحمن اس کے پاس آئے۔ عبدل نے کہا۔

کیوں شیخو کس سوچ میں بیٹھے ہو؟ کیا کسی بڑی جگہ چھاپا مارنا ہے؟

نہیں، چپ یوں ہی بیٹھا ہوں، شیخو نے آہستہ سے کہا اُسے اپنے تخیلات میں یہ مداخلت اچھی نہ معلوم ہوئی لیکن رحمن نے اس پر غور نہ کیا اور چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

یہاں سے چار پانچ میل کے فاصلہ پر ہری پور میں کل جاترا ہے، بڑا میلہ لگے گا، بہت ساری دکانیں آئیں گی تفریح کی تفریح رہے گی اور امید ہے کہ کچھ ہاتھ بھی آجائے گا، کل کب چلوگے؟

میں نہیں چلوں گا، شیخو نے بالکل غیر متوقع طور پر کہا، عبدل اور رحمن ششدر تھے اور وجہ پوچھنے ہی والے تھے کہ شیخو نے کہا

میری طبیعت سست ہے، مجھے تنہا چھوڑ دو۔ عبدل، رحمن ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے اور اندر ہی اندر تعجب کرتے ہوئے چلے گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شیخو نے ایسے اچھے موقعہ سے فائدہ اٹھانے سے انکار کیا تھا۔ شیخو بہت دیر تک ویسے ہی بیٹھا رہا۔ نہ معلوم کیوں اسے ایک خوف سا معلوم ہو رہا تھا، بہت رات گئے اس کی آنکھ تو لگی لیکن وہ ڈراؤنے اور بھیانک خواب دیکھتا رہا۔

وہ جب صبح اٹھا تو موسم بڑا اچھا تھا، ہلکی ہلکی پھوار ہو رہی تھی، کبھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بھی آجاتے تھے چھاؤنی کے اطراف کی پہاڑیوں میں یہ موسم غضب ڈھا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد پھوار ختم ہوئی اور سورج نکل آیا، لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ شیخو نے بھی کھانا کھایا اور کچھ دیر ادھر ادھر گھوم کر سیدھا اُن ٹیکریوں کی طرف چل دیا جہاں کل اس کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا تھا۔

اس نے مُنی کو بہت جلد پالیا۔ مُنی خود اس کی منتظر تھی، اس دن وہ دونوں کچھ بے تکلف سے ہوگئے تھے، پوری نیند نہ ہونے سے شیخو کی آنکھیں اب تک سرخ تھیں۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد مُنی نے پوچھا۔

تمہاری آنکھیں لال کیوں ہیں؟

رات نہ معلوم کیوں بہت دیر تک نیند نہیں آئی صبح صبح آنکھ لگی، اس لئے دیر سے اٹھا، شیخو نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

تمہیں نیند کیوں نہ آئی؟ مُنی نے اشتیاق سے پوچھا۔

شیخو نے اس کی مخمور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ دیر تک دیکھا پھر مسکرا کر کہنے لگا۔

"خیر چھوڑو چلو سامنے چل کر بیٹھیں" دونوں مل کر آبشار کے قریب بیٹھ گئے۔ بارش کی وجہ سے قریب کی پہاڑی میں چھوٹا سا آبشار پیدا ہوگیا تھا موسم بھی بڑا خوش گوار تھا۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھا رہے تھے، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، مُنی شیخو کو بے انتہا حسین نظر آرہی تھی وہ محسوس کر رہا تھا کہ آبشار کے سُروں میں مُنی ہی کے حسن کی تعریف گا رہا ہے۔

[illegible]

[illegible] شاہ پور کی درگاہ میں چھپا پا رہا ہوں۔ تم سے یہ
امر بھی پوشیدہ نہیں کہ میں مقدس مقامات میں گناہ کرنے سے
احتراز کرتا ہوں۔ مجھے اس سے بہت کچھ بھی ملا لیکن وہ اپنی خو پر
[illegible] ہیں تم نے مجھ سے وعدہ کر لیا ہے، میرا دل گواہی دے رہا ہے
کہیں اس مرتبہ پکڑا جاؤں گا اور قانون کے مطابق مجھے موت
کی سزا دی جائے گی۔ لیکن میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں اور آج
وہیں جا رہا ہوں، اگر قسمت نے یاوری کی تو اچھا ہی ہے اور اگر
پکڑا گیا اور مروا دیا جاؤں تو مراد مجھ سے وعدہ کرو کہ منی بھی میرے بعد
زندہ نہ رہے گی۔ یہ نہ میں گوارا کر سکتا ہوں اور نہ تم گوارا کرو گے
کہ منی میرے بعد جیم کے ساتھ رنگ رلیاں کرے۔ یہ عورت مجھے
دانستہ موت کے منہ میں بھیج رہی ہے، اگر میں مارا جاؤں تو اُسے
بھی میرے بعد زندہ رہنے کا کوئی حق نہ ہونا چاہئے"۔۔۔۔
شیخو کچھ دیر کے لئے ٹھیرا اور پھر کہنے لگا "اگر تم نے ایسا نہ کیا مراد تو
میری روح قبر میں بھی بے چین رہے گی" یہ کہہ کر اس نے مراد کی طرف
پکا وعدہ کرنے کے لئے مضطربانہ ہاتھ بڑھایا۔ مراد کا خون کھولنے لگا
اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں، وہ منی سے انتقام لینے
بے تاب ہو گیا اور جوش سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔
میں منی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا بھیا اور اپنا ہاتھ شیخو
کے ہاتھ میں دے دیا۔ شیخو نے محسوس کیا کہ مراد کا ہاتھ جل رہا تھا
اسی روز شیخو شاہ پور چلا گیا۔ چاندنی راتیں تو تھیں۔
لیکن اس روز ہلکے ہلکے بادلوں کی وجہ سے چاندنی مدھم پڑ رہی
تھی۔ اسی مدھم روشنی میں اس نے درگاہ پر پہلی نگاہ ڈالی اسے
ایسا معلوم ہوا جیسے درگاہ اسے گھور گھور کر دیکھ رہی ہو، شیخو کانپ گیا
لیکن منی کا حکم تھا جس کے ٹالنے کی اس میں تاب نہ تھی اس نے
ہمت سے کام لیا اور وہیں قریب ہی بیٹھ کر رات کے زیادہ ہونے
کا انتظار کرنے لگا۔ رات کے بارہ بجے ہوں گے کہ شیخو اٹھا اور
درگاہ کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ اس کے چہرہ سے حسب معمول کے
مطابق عزم و استقلال کے آثار ظاہر ہو رہے تھے اور وہ محتاط
بھی معلوم ہو رہا تھا۔ چاندنی ابھی پھیکی ہی تھی۔ درگاہ کے
مجاورین محوِ خواب تھے۔ شیخو درگاہ کے صدر دروازے سے
ہوتا ہوا اندر داخل ہوا۔ عود کی دھیمی دھیمی خوشبو درگاہ کی
فضا میں بسی ہوئی تھی، لیکن شاید شیخو نے اسے محسوس نہیں
کیا اسے اپنی دھن لگی ہوئی تھی وہ تیز قدم بڑھاتا ہوا
درگاہ کے اس حجرہ کی طرف گیا جسے ایک بڑا سا قفل لگا ہوا
تھا۔ اس نے دیکھا کہ تمام حجروں میں یہی ایک حجرہ مقفل ہے
اسے یقین ہو گیا کہ جو کچھ ہے یہیں ہے۔ اس نے کمال احتیاط
سے قفل توڑنے کی کوشش شروع کی، قفل بڑا تھا احتیاط کے باوجود
کچھ نہ کچھ آواز پیدا ہو ہی جاتی تھی، آخر اسی آواز سے ایک مجاور
جاگ پڑا اس نے اٹھ کر جو یہ ماجرا دیکھا تو دوسرے کو اٹھایا،
دوسرے نے تیسرے کو اور اس طرح سب جاگ پڑے اس عرصہ
میں شیخو قفل توڑ کر اندر داخل ہو چکا تھا اور اندر کی قیمتی چیزیں
جمع کر رہا تھا۔ سب کے سب مجاورین اس پر ٹوٹ پڑے اور عین
ارتکاب جرم کی حالت میں اسے پکڑ لیا۔ ملک کے اس حصہ میں
اس قسم کی بے حرمتی کی سزا موت مقرر تھی۔
جب شیخو اپنے پڑاؤ سے روانہ ہو رہا تھا ٹھیک اسی گھڑی
سے مراد اس کے لئے امید و بیم کی حالت میں چشم براہ تھا۔
کبھی اسے خیال آتا کہ شیخو کا ہاتھ بہت صاف ہے وہ نہیں
پکڑا جائے گا اور کبھی ناامید ہو جاتا کہ معاملہ بڑا مشکل ہے۔
اسی طرح ایک دن گزر گیا۔ مراد پہلے تو ڈرا لیکن بعد میں اس
نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو ڈھارس دی کہ ممکن ہے شیخو کو موقعہ نہ
ملا ہو اور وہ کسی بہتر موقع کی تلاش میں ہو۔ دوسرا دن بھی
گزر گیا لیکن شیخو کا پتہ نہیں تھا۔ مراد نے پھر وہی کہہ کر

اپنے آپ کو سمجھایا، تیسرا دن بھی یونہی گزر گیا۔ آخر چوتھا دن طلوع ہوا۔ وہ اسی طرح اسے بانسے بیٹھا تھا کہ ایک شخص نے آکر اس سے کہا کہ شیبو میں ارکا بہ جرم کی حالت میں پکڑا گیا اور اُسے قانون کے مطابق سزائے موت دی گئی ہے۔ مراد کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں لیکن اس نے کچھ نہیں کہا، ایک گہری آہ بھر کر آسمان پر نگاہیں جما دیں۔

جس دن شیبو کو پھانسی دی جانے والی تھی اس دن مراد بھی مقررہ جگہ پر گیا اور تماشائیوں میں چپ چاپ کھڑا ہوگیا۔ شیبو پابزنجیر پھانسی کے تختے پر لایا جا رہا تھا دونوں بھائیوں کی نگاہیں ملیں اور جب شیبو مراد کے قریب سے گزرنے لگا تو اس نے آہستہ سے کہا 'بھولنا مت'

'اطمینان رکھو' مراد نے فوراً لیکن گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ شیبو کے چہرہ پر بدستور عزم و استقلال کے آثار تھے۔ لیکن اس وقت اطمینان و سکون کا بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ اس نے بڑی بہادری اور پامردی سے جان دی۔ مراد کی آنکھوں سے دو جلتے ہوئے آنسو نکلے اور وہ اپنے پڑاؤ کی طرف پیچ و تاب کھاتا ہوا روانہ ہوگیا۔

اسی روز سے مراد مُنی کی گھات میں لگ گیا۔ وہ اس نابکار لڑکی پر ہر دم لعنتیں بھیجتا تھا جس نے اس کے بھائی کو موت کی نیند سونے مجبور کیا۔

کئی دن گزر گئے مراد کو اپنا وعدہ پورا کرنے کا موقع نہ ملا، اس کی حالت ٹھیک آگ کے اس ڈھیر کے مانند تھی جو جل کر ختم ہوگئی ہو لیکن چنگاریاں اندر دبی پڑی ہوں، جیسے یہ چنگاریاں ہوا کے کسی تیز جھونکے سے بھڑک اٹھتی ہیں اسی طرح مراد کا جوش انتقام بھی بھڑک اٹھنے کے لئے کسی موزوں موقع کا منتظر تھا۔ اس عرصے میں مُنی اور رحیم کے تعلقات بڑھنے لگے۔ وہ اُسے اسی طرح چاہنے لگی جیسے وہ شیبو کو چاہتی تھی۔ ویسی ہی ملاقاتیں اور ویسی ہی تفریحیں

وہی محبت اور وہی اخلاص، حتیٰ کہ ان دونوں کی شادی کا بھی تقرر ہوگیا۔

مراد یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اس کے دل پر سانپ لوٹ رہے تھے اسے تعجب ہوتا تھا کہ کس طرح ایک لڑکی ایک مرد کو چاہنے کے بعد کسی دوسرے کو بھی چاہ سکتی ہے۔ رحیم اور مُنی میں محبت کی پینگیں بڑھتی دیکھ کر کبھی اسے اس جوڑے پر رحم آتا اور وہ سوچنے لگتا کہ دو محبت بھرے دلوں کو جو ایک دوسرے پر دیوانہ وار فدا نظر آتے ہیں، جدا کر دینا کتنا بڑا ظلم ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی اسے اپنے وعدہ کا خیال آتا اور اس کے کانوں میں شیبو کے الفاظ گونجنے لگتے، اپنے بھائی کی نامراد مظلوم روح مضطرب اور بے چین اس کی آنکھوں میں پھرنے لگتی اس پر وہ مُنی کی جان لینے کا پھر سے ارادہ کر لیتا۔

رحیم اور مُنی کی شادی کا وقت قریب آرہا تھا۔ رحیم نے اپنے خیمہ کو اپنی حیثیت کے مطابق سجایا، دروازوں پر خوبصورت کپڑوں کے پردے ڈالے اور صاف ستھرے فرش کا بھی بندوبست کیا وہ مُنی کو ہمیشہ کے لئے اپنی کر لینے کے لئے بہت بے چین تھا اور اس روز کا انتظار وہ ایک ایک گھڑی گن کے کر رہا تھا۔

ایک روز خوب بارش ہوئی، اطراف کے تمام ندی نالے زور و شور سے بہنے لگے۔ مراد کو اچانک کچھ خیال آیا، وہ فوراً پریشان صورت بنائے مُنی کے پاس گیا اور گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہنے لگا۔

"یہاں سے کچھ دور جو بڑی ندی ہے نا، جس کے کناروں پر ایک بڑا سا تختہ لوگوں کی آمد و رفت کے لئے رکھا ہوا ہے وہاں میں نے ایک کوٹ اور شلوار بری طرح پڑا ہوا دیکھا کہیں وہ رحیم کے تو نہیں؟" مُنی کا رنگ فق ہوگیا اس کا نیچے کا سانس نیچے اور اوپر کا اوپر ہوگیا وہ کچھ نہ بول سکی، کافی دیر کے بعد اس نے حواس مجتمع کئے اور مراد کے ساتھ مذکورہ مقام پر گئی۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے تختہ پر قدم رکھے مراد نے موقع پا کر

[illegible]

[illegible]

بھونگو۔ سرکار، کچھ نہیں، چھوٹے ہیں، ہم بھی چل رہا ہوں۔ مالکن کی کیسی حالت ہے؟

رامیشور۔ کیا بتاؤں بھونگو۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ دو ایک دن کی مہمان ہیں۔

(بھونگو کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں)

بھونگو۔ سرکار! بھگوان پر بھروسہ رکھیں جو کچھ قسمت میں ہے وہی ہوگا۔ موہن بھی ابھی بالکل بچہ ہے۔

(دیونارائن آتا ہے وہ مسکرا رہا ہے۔ آکر رامیشور کے قریب بیٹھ جاتا ہے)

دیونارائن۔ پرمانند نے جب کھنا کی شکایت کی تو صاحب بجائے اس کے کہ کھنا کے خلاف کوئی کارروائی کریں انھوں نے پرمانند ہی کو ڈِس مِس کردیا۔

(رامیشور اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

رامیشور۔ میں ابھی ٹامسن کے پاس جاتا ہوں۔ پرمانند کے چھے بچے ہیں۔ بڑھیا ماں ہے، بیوی ہے۔ یہ سب بھوکے مریں گے (رامیشور دو قدم بڑھتا ہے اسی وقت دیونارائن اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

دیونارائن۔ بے وقوفی نہ کرو، کیوں اپنے پیروں پر کلہاڑی مارتے ہو؟ کھنا کے خلاف کوئی بات نہیں سنی جائے گی۔ یہ ہم سب جانتے ہیں۔ پرمانند نے وہاں جاکر غلطی کی اور وہ اب اپنی غلطی کا نتیجہ برداشت کرے گا۔ (شیام لال آتا ہے)

رامیشور۔ (شیام لال کو دیکھ) ارے شیام لال!

شیام لال۔ آپ کو ڈھونڈ رہا تھا......... آں.....

شیام لال۔ آں...... موہن دو منزل سے گر پڑا اور گرتے ہی اس دنیا...... سے چل...... بسا...... بہو جی نے جب سنا تب وہ زور لگا کر اٹھیں اور ویسے ہی لڑھک پڑیں......... چلتے

(رامیشور کرسی پر گر پڑتا ہے)

رامیشور۔ ہوں! تو سب ختم ہوگیا؟ (خاموشی سے چاروں طرف دیکھتا ہے)

(مسٹر کھنا مسٹر ٹامسن کے ساتھ آتا ہے)

کھنا۔ مسٹر رامیشور میں نے آپ کو جو فائل دی تھی۔ اس پر آپ نے ابھی تک کوئی کارروائی نہیں کی۔ کیوں!

ٹامسن۔ مسٹر رامیشور، مسٹر کھنا نے آپ کی شکایتیں کی ہیں، مجھے آپ سے امید نہیں کہ آپ اتنی بے پروائی کریں گے۔ دیکھئے اس فائل پر کاروائی میرے پاس بھیج دیجئے۔

(کھنا اور ٹامسن چلنے لگتے ہیں۔ رامیشور کھڑا ہو جاتا ہے)

رامیشور۔ مسٹر ٹامسن! میں ایک بات پوچھتا ہوں۔

(ٹامسن اور کھنا رک جاتے ہیں، دونوں تعجب سے رامیشور کو دیکھتے ہیں)

رامیشور۔ آپ نے پرمانند کو کیوں علٰحدہ کیا؟

کھنا۔ تم پوچھنے والے کون ہو؟

رامیشور۔ (کھنا سے) تم چپ رہو، میں تم سے نہیں پوچھ رہا ہوں (ٹامسن سے) آپ جانتے ہیں کہ اس کا خاندان بڑا ہے، اور وہ تنہا اکیلا کمانے والا ہے، اُس کے معزول ہونے کے معنی ہیں دس انسانوں کا بھوکا مرنا۔

ٹامسن۔ مجھے افسوس ہے رامیشور۔ مجھے کھنا اور پرمانند میں سے صرف ایک کو رکھنا تھا اور ایک کو الگ کرنا تھا

رامیشور۔ آپ نے ایک شیطان کو اپنے ساتھ رکھا اور ایک انسان کو الگ کردیا۔

کھنا۔ اور اب مسٹر ٹامسن کو مجھ میں اور تم میں بھی کسی ایک کو علٰحدہ کرنا پڑے گا۔ اور ایک کو رکھنا پڑے گا۔ جو آدمی ایک افسر کی بے عزتی کرتا ہے وہ دوسرے کی بھی بے عزتی کرسکتا ہے اور یہ مسٹر ٹامسن اچھی طرح جانتے ہیں۔

ٹامسن۔ مسٹر رامیشور مجھے افسوس ہے کہ آپ اس طرح کی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

ބ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

تہذیب کا اثر ادب پر

افلاطون کی جمہوریت سے دھتکاری ہوئی حساس اور مترنم صنفِ ادب کے متعلق کسی نے کتنی پیاری بات کہی "زندگی شاعری ہے اور شاعری زندگی" اور کسی دوسرے من چلے نے اسی خیال کو اک ذرا وضاحت کے ساتھ یوں پیش کیا ہے "ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے"، لیکن انیسویں صدی کے فرنگی نقاد میتھو آرنلڈ نے کچھ اوہی انداز میں رائے دی ہے "ادب نہ صرف تفسیرِ حیات ہے بلکہ تنقیدِ حیات بھی"۔ سچ تو یہ ہے کہ تفسیر اور تنقید تو رہگزار ہے، ادب کی منزلِ مقصود تخلیقِ حیات ہے۔

دیکھا آپ نے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ یہ حضرت انسان جن میں "ارتقا کے انبیا" اور "انقلاب کے رسول مبعوث ہوتے رہے ہیں"، نچلا بیٹھنا تو جانتے ہی نہیں۔ بات میں بات اور خیال میں خیال پیدا کر نا ان کی گھٹی میں پڑا ہے۔ خیر! بڑے آدمیوں کے بڑے خیالات ہوتے ہیں کیوں نہ ہم خود ہی اس ادب، زندگی اور تہذیب کے بحرِ ناپیدا کنار میں شوقِ غواصی کریں۔ درِ شہوار نہ سہی کوئی گھٹیا قسم کا ہی سہی بہرحال کوئی موتی ہاتھ لگ ہی جائے گا۔

آدم و حوا پر جب تک کیفیتِ سرشاری طاری رہی ہوگی اس وقت تک تو خیر ایک جنبشِ چشم و ابرو سے دل کی بات دل تک پہونچا دی گئی ہوگی لیکن جوں ہی اس خاکدان کی آب و ہوا نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا ہوگا تو احتیاجِ زندگی کے حصول کی خاطر ہاتھ پاؤں ہلانے پڑے اور انھوں نے اپنے "دہنِ مبارک" کو نیم وا کر کے کچھ عجیب قسم کی آوازیں نکالیں۔ یہی بے معنی آوازیں لفظ بنے اور اطراف و اکناف کی چیزوں کے نام رکھے گئے۔ اسی طرح ایک بولی چل پڑی۔

آدم و حوا تو خیر! انھوں نے اپنا شباب جنتِ نعیم کی مقدس اور نمناک فضا میں بسر کیا۔ البتہ ان کی اولاد کی اٹھان کا زمانہ آیا تو فطرت کی رعنائیوں اور جنسی کشش کی دلربائیوں نے بڑھ کر دامن تھام لیا۔ سیدھے سادھے گڈریے اور کسان کے دل میں کوئی چپکے چپکے سمانے لگا۔ دھیمے سروں میں بانسری سی بجنے لگی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر کسی الھڑ دخترِ حوا کا دامن تھام لیا۔ اور دل کا ڈر، من کا کھوٹ۔ منہ پر آئی ہوئی بات کے پیرائے کا خیال نہ ڈھب ہجراں کی بھیانک سیاہیوں کا تصور، بس جو دل میں تھا سو زبان پر آگیا۔ یہ ہے آپ کا پہلا آرٹسٹ۔ پہلا حسن کار، شاعر!!

اسی کی نظر کے سامنے کائنات کی نیرنگیاں، فطرت کا حسین زرتار جال اور خود اپنے من کی ہیجانی دنیا تھی۔ کبھی وہ خارجی حالات کو ترنم کے سانچوں میں ڈھالتا تو کبھی اپنی آنکھوں سے نکلے ہوئے آنسوؤں اور منہ سے گرتے ہوئے قہقہوں کی لڑیاں پروتا۔ اور اس طرح ایک ادب کی داغ بیل پڑی۔

زندگی کا جدلیاتی فلسفہ غیر شعوری طور پر شگوفے کھلانے لگا اور ارتقا کی قوتیں نت نیا راستہ نکالنے لگیں۔ نیلے آکاش تلے بلی تاننے والے ماں باپ کی اولاد دروں اور وادیوں سے نکل کر پھوس کے جھونپڑوں اور کچے مکانوں میں زندگی گزارنے لگی۔ دو سے چار اور چار سے آٹھ ہوئے اور یہ سب مل جل کر رہنے سہنے لگے۔ بھوک سبھی کو لگتی، سردی سے سبھی کے جسم سکڑتے، گرمی سے سبھی الاماں کہہ اٹھتے۔ درندوں کا کھٹکا اور آفاتِ آسمانی سبھی کو خوف زدہ کئے رکھتے "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" تو ان کی شریعت ہی ٹھیری۔ اس لئے اس ابتدائی انسانی گروہ نے کسی بڑے بوڑھے کو اپنا نگہبان اور رہبر بنایا۔ تقسیمِ محنت اور تقسیمِ دولت کے ابتدائی اصول بنے اور یوں معاشی تنظیم، ابتدائی معاشرت اور پھر تہذیب وجود میں آئی۔

یہ تھی آپ کی ابتدائی تہذیب اور اس دور کا ادب! چونکہ حضرتِ انسان ماندۂ درگاہ نہیں اور یوں بھی ہر قوت سے وہ لرزہ براندام ہو جاتے تھے اس لئے خدا اور اس کا نام ہر شعبۂ حیات میں جاری و ساری رہا۔ خوف درجاسے گھبرا کر انھوں نے مذہب کے دامانِ تنگ میں پناہ لی اور انہیں مذہب کے رکھوالوں نے نہ صرف ادب پر بھی قبضہ جما لیا بلکہ وارثِ اصلی بن بیٹھے۔ تہذیب و معاشرت اور دیگر شعبہ جاتِ حیات تو براہِ راست ان کی ملکیت ہی تھی لیکن ادب بھی ان کی

کیونکہ عملی طور پر آلۂ کار بن گیا۔ یہ مخصوص گروہ فقر و فاقہ کا حامی، دنیا اور دنیا والوں سے رشتہ توڑ کر زندگی اور اس کی دلچسپیوں سے منہ موڑ کر بظاہر ایک کیف مجہول کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اس گروہ کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اندھیرے کمرہ میں ایک ایسی سیاہ بلی کی تلاش کر رہا ہو جو وہاں موجود نہیں۔ چنانچہ اس دور کے ادب میں اس مخصوص مذہبی تصوریت کی جھلک نمایاں ہے اس دور کا ادب محض جوگی یا راہب بن کر رہ گیا ہے۔ زندگی اور اس کی کشمکش کے خط و خال ڈھونڈے سے بھی نہیں دکھائی دیتے۔ ہاں موت آسا سکوت اور جمود نواز کیفیت ضرور پائی جاتی ہے۔

مختصر یوں سمجھئے کہ اس دور کی تہذیب کی رگ رگ میں مذہب کا خون دوڑ رہا تھا چونکہ ادب کا تہذیب یا کلچر سے براہ راست تعلق ہے اس لئے یہ عنصر ادب میں صاف نظر آتا ہے۔

کچھ ہی دنوں میں خانقاہوں کا بازار سرد پڑ گیا اور حویلیوں کی قسمت جاگی۔ تقدس کا چراغ گل ہوا تو امارت کے ہاں چراغاں کئے جانے لگے فقیروں اور سنیاسیوں کی گود میں کھیل کود کر بچپن گزارنے بھی نہ پایا تھا کہ ادب سرمایہ کی خلوت میں داخل ہوا۔ جذبات کی تابش نے اس کو یہاں بہت جلد پگھلا کر سیال کر دیا اور دل کھول کر داد تعیش حاصل کی۔ اس رنگ میں ادب کچھ ایسا رس بس کر نکھر آیا کہ "بابا صاحب" اسے دیکھیں تو پہچاننا تو رہی اور بات لاحول نہ پڑھیں تو ہمارا ذمہ۔ آیئے آپ بھی اس اٹھان اور مستی کو دیکھئے مگر ذرا دل کو تھام کر۔ اس لئے کہ ع اچھے اچھوں کا وضو جاتا ہے ٹوٹ

صبا کی مجبوری ملاحظہ ہو ؎ یا گل اندام سے پہلو جو خالی ہوگیا سو کے کر میں شکل تصویر نہالی ہوگیا

اور آتش کی تڑپ دیکھئے ؎ خال رخ کے عشق میں تیرے ہیں عاشق سیکڑوں تل ڈھانک لو اور ابروئے خمدار دکھاؤ

رضا فرنگی محلی نے تو بے حیائی کی حد کر دی۔ کہتے ہیں ؎

لپٹا یار رضا ہم نے تو جھنجھلا کے وہ بولے اب آپ کے گھر ہم کبھی آیا نہ کریں گے

جان کی نسائیت بھی قابل توجہ ہے ؎ کرنے جو بیٹھی شام سے پی صبح ہوگئی دو بار میں ہوئی نہ وہ دو دوپہر ہوا

ریاض خیرآبادی کے دو ایک شعر بھی سنئے ؎ آڑی ہیکل کو چوم لے گی وہ شئے جو کچھ اٹھی اٹھی سی ہے

دیگر ؎ وصل کی شب جب نہ چلی ایک بھی شوخی ان کی کچھ نہ بن آئی تو چپ کے سے کہاں ان گئے

حتیٰ کہ غالب جیسے بلند پایہ فلسفی شاعر کے کلام میں بھی چند ایسے مقامات آتے ہیں اور اس کے ہاتھ سے سنجیدگی اور متانت کا دامن چھوٹ جاتا ہے ؎ صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

قدیم قبائلی زندگی اور زرعی تہذیبوں کے عہد میں تو خیر عوام کی جہالت سے من ملنے قائم اٹھایا گیا اور توہمات کے پردوں میں حقیقت چھپی رہی لیکن اس صنعتی سرمایہ داری کے تحت پیدائش دولت کے تعلقات کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں نے ادب کے مسئلے کو بھی بے حد پیچیدہ اور گراں بنا دیا ہے۔ بجائے اس کے کہ ادب بہ حیثیت مجموعی سارے سماج کا ورثہ ہوتا ہے ایک مخصوص طبقہ کا استحقاق بن کر رہ گیا ہے جو حرمت نصیب اور صاحب اقتدار ہے۔ جب سے ادب نے سماج سے ناتا توڑ کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی ہے اس نے اپنا وہ اصل مقام چھوڑ دیا ہے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ارباب طریقت

ــہ چو باحبیب نشینی و بادہ پیمائی ٭ بیاد آر حریفانِ بادہ پیما را

ایک عرصہ ہوا کہ انھیں دیکھا تھا۔ آپ کو دھوکا دیتی ہوں کہ بھول گئی۔ لیکن دل سے جواب آتا ہے نہیں کبھی نہیں۔ تم انھیں کبھی نہیں بھول سکوگی۔ اب بھی وہ آنکھوں کے سامنے ہیں۔ بس مجھے تو یہی یاد ہے ہنستا ہوا چہرہ۔ روتی ہوئی آنکھیں۔ شعر و شاعری کے دلدادہ، خاموش دوستی و محبت کے قائل۔ کبھی کبھی تو ان کی باتوں کی چھیڑ سے سازِ دل کا تار تار جھنجھلا اٹھتا۔ لیکن خود انھیں خبر نہیں کہ کیا کر دیا۔ شاید اسی وجہ سے بیحد محبوب ہیں وہ مجھے۔ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور لبوں کی شادابی، جانے کیا چیز تھی اب بھی جب بھی یاد آتے ہیں تو بے چین ہو جاتی ہوں۔ لیکن اتنی انست کے باوجود انھیں نہ سمجھ سکی۔ ایک دفعہ جو پوچھا کہ آپ خود سمجھا دیجئے کہ کیا ہیں۔ تو کیسے مسکرا کر کہا تھا ــہ

سمجھ میں خاک نہ آئیں گے معنی و مطلب
مجھے نہ سن کہ بہت دور کی صدا ہوں میں

سو اب تو وہ واقعی دور کی صدا بن گئے۔ قسمت شاید اسی کا نام ہے۔

(۲) سانپ کو دیکھا تھا۔ اکثر مداریوں کے پاس۔ ان کی چمکتی ہوئی کھال۔ مسحور آنکھوں کو بھی۔ خوبصورت ناگوں کو بھی میں نے شوق سے دیکھا تھا کہ کس طرح ان کی خوبصورتی ان کے پوشیدہ زہر کی مرہونِ منت ہے۔ لیکن انسانوں میں بھی ایسے سے واسطہ نہ پڑا تھا۔ مگر جب ان کو دیکھا تو معلوم ہو گیا کہ زہر بھی میٹھا ہوتا ہے۔ آف ظاہر و باطن کس قدر مختلف۔ میں نے انھیں کیا سمجھا اور پھر کیا نکلے۔ اکثر سوچتی ہوں کہ کیا وہ سب باتیں دھوکا تھیں۔ وہ شفقت وہ محبت۔ عمروں کے تفاوت کے باوجود قربت اب بھی چاندنی راتوں میں جب میرا دل کہانیاں سننے کو چاہتا ہے تو میں انھیں یاد کرتی ہوں بیساختہ۔ نہ جانے وہ اب مجھے یاد بھی کرتے ہیں کہ نہیں۔ میں انھیں بھول نہ سکوں گی۔ مجھے بعض اوقات یقین نہیں آتا کہ وہ دشمن تھے۔ لیکن انھوں نے ہی تو مجھے ادب اور افسانے سے محبت کرنا سکھایا۔ وہ مجھے کتنی میٹھی میٹھی نظمیں سنایا کرتے۔ اور جب میں مسلسل کئی مہینوں بیمار رہی تھی تو انھوں نے کیسی تیمارداری کی تھی میری۔ اور مجھے رات بھر نیند نہیں آتی تھی تو اکثر پاؤں دباتے ہوئے وہ مجھے افسانے سنایا کرتے۔ مختلف زبانوں کے افسانے۔ انھیں کیسی قدرت تھی فسانہ گوئی میں، ہر رنگ خیال کے افسانے آتے تھے۔ جب سے وہ گئے ہیں میں سمجھتی ہوں کہ بہت سی محبوب چیزیں مجھ سے چھین لی گئیں۔ اور کتنا جی ترستا ہے میرا وہ باتیں ایک دفعہ صرف ایک دفعہ پھر سننے کے لئے۔ لیکن ــــ یہ تو ناممکن ہے ــ

مر کے بھی ہم سے ان کو بھلایا نہ جا سکا

(۳) بس یونہی میری زندگی میں دبے پاؤں چپ چاپ سے یہ داخل ہو گئے۔ پہلے تو مجھے احساس بھی نہ ہوا تھا کہ یہ دوست بھی بن سکیں گے۔ لیکن طریقوں کی یکسانی، مذاق کی ہم آہنگی خیالات کا اشتراک ہی وہ چیزیں ہیں جو شاید غیر محسوس طریقہ پر ہم کو ایک دوسرے کے قریب کرتی گئیں لیکن اب بھی ہم دونوں میں سے کسی ایک نے بھی اعتراف نہیں کیا کہ ہم میں دوستی ہے۔ طبیعت کو میں اکثر ابھی پہچاننے لگی ہوں۔

لیکن ابھی انھوں نے اپنے آپ کو میرے سامنے عیاں نہیں کیا ہے۔ احساسات کی نہایت عمیق گہرائیوں میں بستی ہیں۔ جیسے شائد وہ بھی نہ جانتی ہوں۔ اپنے آپ پر قابو حاصل ہے۔ مذاق نہایت لطیف۔ بحث ومباحثہ کی عادی۔ ہم دونوں میں بعض اختلافات بھی ہیں لیکن اس کے باوجود بھی ہم قریب ہیں۔ چند برائیاں بھی۔ جس کو ہم طبیعتوں کا عنصر سمجھ کر برداشت کر لیتے ہیں۔ فلسفی اور شاعر بھی ہیں، افسانہ نگار اور مقالہ نویس بھی بھی ہوں کچھ ہوا چھے ہیں۔

(۴) ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ۔ سامنے تو ہمیشہ یقین دلائیں کہ دوست ہیں۔ لیکن ہیں بس کی گانٹھ جہاں موقع ملا اپنی چال چلتے ہیں۔ اور ہماری برائی کرتے ہیں۔ لیکن کچھ اس انداز سے کہ سننے والے کو شبہ بھی نہ ہو کہ یہ ہمارے دشمن ہیں۔ یہ بھی تو ایک کمال ہے۔ دوست نما دشمن۔ آستین کے سانپ ہوتے ہیں نا۔ ان سے جی بہت گھبراتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے نبھانا ہی پڑتا ہے۔ وہ بھی اپنی فطرت سے مجبور ہیں۔ اس لئے میں قابل معافی سمجھتی ہوں۔ علم کا خاص شوق ہے۔ لیکن علم علم کی خاطر نہیں نام ونمود کی خاطر چاہتے ہیں۔ ظاہرا بھولے بھالے بنتے ہیں۔ لیکن کیا کہوں وہ کیا ہیں، خدا ان کی شرارتوں سے بچائے۔ نہ صرف مجھے بلکہ ہر ایک کو۔ غضب تو یہ ہے کہ آہستہ آہستہ ایک اور کو مجھ سے بدگمان کئے دیتے ہیں۔ بعض اوقات تو رونا آتا ہے۔ پھر بھی اپنے آپ کو فرشتہ سمجھتے ہیں۔ بُرے کام بذاتِ خود نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن ویسے شرکت کر لیتے ہیں۔ شائد خود اپنے آپ سے دھوکا کھا رہے ہیں۔

(۵) ان کی آنکھیں مجھے بہت پسند ہیں۔ آنکھوں سے زیادہ ان کی ذات۔ ذات سے زیادہ صفات۔ بہرحال یاد رکھے جانے کے قابل۔ نہ صرف میری محبت بلکہ عقیدت کے بھی مستحق۔ باتیں کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سوتا دھیرے دھیرے اپنی خاموش موسیقیوں کو ابل رہا ہو۔ جب شعر پڑھتے ہیں تو خود سرتاپا شعر ہو جاتے ہیں۔ احساسات کی فراوانی سے اکثر قوس قزح کی رنگینیاں چہرے پر کھیلا کرتی ہیں۔ صلح جو اور نیک خصلت۔ خندۂ زیرلب کے قائل۔ ہمیشہ خود مسرور رہیں اور دوسروں کو بھی مسرور بنائے رکھیں۔ ان کو دیکھتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی نیلی شفاف جھیل میں سفید کنول تیر رہا ہو۔ ہوا کے ہلکے ہلکے ٹکورے جھولا جھل رہے ہوں۔ حسین ہونے کے باوجود احساس حسن نہیں۔ کام خود بھی دلچسپی سے کریں اور دوسروں سے بھی کام لینا جانیں۔ بہرحال سرتاپا ایک لطیف شعر ایک پاکیزہ خیال ہیں۔

(۶) خوبصورت تو نہیں لیکن پھر بھی ایک دلکش چہرے کے مالک ہیں۔ ادب نواز، شعر وشاعری سے بیحد انس ہے۔ افسانے ان کی جان ہیں۔ مذاق نہایت پاکیزہ اور شستہ۔ خطوط لکھنا تو کوئی ان سے سیکھے۔ جی چاہتا ہے کہ شروع کرنے کے بعد کبھی ختم نہ ہو۔ بات کرتے ہیں تو گمان ہوتا ہے کہ جھرنا جھر رہا ہے۔ جھر جھر۔ زندگی کو خوب سمجھتے ہیں۔ زمانہ کو باوجود اپنی کم عمری کے آزما کر دیکھا ہے۔ پہلے بیحد شریر تھے۔ اب کچھ سنجیدگی پیدا ہو چلی ہے جس میں پوشیدہ حزن کروٹیں لیتا ہے۔ آنکھیں غماز ہیں کہ دل میں ایک کسک ضرور ہے محبت میں کامیابی کے کبھی قائل نہیں۔ ہنس ہنس کر تیر کھانا کوئی ان سے سیکھے۔ کسی کی برائی نہ چتیں۔

تخیل کی دنیا ہمیشہ آباد کئے ہوتے ہیں۔ ہمیشہ تصور میں کھوئے سے۔ اونچے خیالات کے ساتھ علو ہمتی بھی عطا ہوئی ہے۔ لیکن حال میں لکھا تھا "زندگی کی ویرانیوں نے زندگی کو بے مزا کردیا ہے۔ لیکن پھر بھی جے جا رہے ہیں۔ اب کچھ نہیں رہا میرے پاس۔ ہاں کبھی بہت کچھ تھا۔ اب سوائے یاد ماضی کے دل میں کوئی خیال نہیں۔ بہت سے دن گزر گئے۔ اب جو یہ ہیں وہ بھی گزر جائیں گے۔ اور گزشتہ دنوں میں مل کر ماضی بن جائیں گے وہ ماضی جو پھر کبھی نہیں لوٹتا"

میں نے انھیں بچپن سے جانا ہے۔ ایام طفلی میں ساتھ پروان چڑھے ہے۔ مذاق کی ہم آہنگی اور طبیعت کے لاابالی پن نے ایک دوسرے سے بیحد قریب کردیا تھا۔ لیکن اب بہت دور ہیں۔ آنکھ اوٹ پہاڑ اوٹ۔ کبھی کبھار ایک آدھ خط بھیج دیتے ہیں۔ جسے پڑھ کر میں پھر ماضی میں کھو جاتی ہوں۔ اتنی دور ہونے کے بعد بھی ہم دور نہ ہو سکے۔ ابھی تک افسانوں کا مل کر اسکول میں پڑھنا یاد آتا ہے۔ اور کیا کچھ یاد نہیں آتا ہو۔

(۷) سانولے سلونے ہیں۔ آنکھیں بہت پیاری سی معصومیت جن میں کروٹیں لیتی ہے۔ ان کی آنکھوں کو دیکھ کر کسی رم خوردہ غزال کا ان پر دھوکا ہونے لگتا ہے۔ اپنی رعنائیوں پر آنکھیں آپ ہی حیران سی ہیں۔ لیکن نظروں کو ابھی بہکنا نہیں آیا۔ مرنجان و مرنج شخصیت کے مالک ہیں۔ دوستی کا نبھانا خوب آتا ہے۔ کبھی ہمارے ساتھ ساتھ ہی رہتے تھے۔ اب ظالم آسمان نے ان کو ہم سے جدا کردیا۔ واقعات نے بیحد دور کردیا۔ لیکن خطوط سے ہمیشہ یاد کیا کرتے ہیں۔ دل بہت وسیع پایا ہے۔ اپنے دشمنوں سے بھی بیر نہیں ہے۔ دوست تو پھر دوست ہوتے ہیں۔ پہلے نہایت سیدھی سادھی طبیعت تھی۔ زندگی کی تلخ رنگینیوں سے ناواقف تھے۔ لیکن اب دل کے کسی گوشے میں ایک مچلتا احساس جاگ اٹھا ہے۔ ابھی تو امید و بیم کے دریا میں ان کا سفینۂ حیات ہلکورے لے رہا ہے۔ معلوم نہیں اس بنسری کی تان کب ٹوٹے۔ اس میٹھے انوکھے سپنے سے جانے کب جاگ اٹھیں۔ سوچتی ہوں کیا اگر اس کا انجام تلخ ہو تو وہ سہار سکیں گے۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ انھیں کبھی حزن سے واسطہ نہ پڑے جو کچھ ابھی تک پڑا وہی بہت زیادہ تھا۔ جی چاہتا ہے پھر وہ رونق محفل بن جائیں۔ اکثر اوقات بڑی بری طرح یاد آتی ہے۔ یاد رکھنے کے قابل جو ہوئے۔

زینت

ایثار

تلوتما سسرال سے چھ ماہ بعد گاؤں آئی۔ اس کو خبر ملی کہ سریندر اب تک اس سے آکر نہیں ملا۔ وہ سریندر جو اس کے لئے اپنی جان خوشی دولت ہر چیز دینے تیار رہتا تھا۔ جو ہر وقت اس کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ تلوتما کو آئے چار دن ہوگئے سریندر گھر پر بیکار رہتے ہوئے بھی اس سے ملنے نہیں آیا۔

تلوتما سریندر سے محبت کرتی تھی اس کی لاثانی محبت کی قدر کرتی تھی لیکن خاندان کی دشمنی اور غریبی نے دونوں کو ایک نہ ہونے دیا۔ آخر تلوتما سے نہ رہا گیا۔ اس نے ماں سے سریندر کے متعلق پوچھ ہی لیا۔ "وہ تو اب امیر ہوگیا ہے۔ ایشور کی کرپا سے معقول آمدنی ہوگئی ہے۔ اب باہر نہیں نکلتا۔ پرماتما جانے وہ کیوں اداس رہتا ہے۔" ان جملوں نے تلوتما کو مشکوک کردیا۔ شاید غریبی کے ساتھ تلوتما کو بھول چکا ہو۔ لیکن وہ اداس کیوں ہے! نہیں! وہ تلوتما کو نہیں بھول سکتا۔ تلوتما ماں سے پوچھ کر سریندر سے ملنے گئی، سریندر کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ تلوتما سریندر کے قریب پہنچ گئی۔ سریندر اس کی تصویر اتارنے میں مصروف تھا۔ پورا کاغذ اس کے نام سے سیاہ تھا۔

"یہ تمہاری کیا حالت ہے سریندر!" تلوتما نے اس کے کپڑوں وغیرہ کو دیکھ کر کہا۔

"کون تلوتما!" سریندر نے حیرت سے پلٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں لیکن تمہاری حالت تو دیکھو، کپڑے بال شکل دیکھو۔ میں نے سنا ہے کہ تم اداس رہتے ہو۔ باہر نہیں نکلتے، کیا بات ہے؟" تلوتما نے پوچھا۔

"تم پوچھ رہی ہو تلوتما؟ وجہ تمہیں بھی نہیں معلوم؟ آہ! خیر تمہارے بدلنے سے میں نہیں بدل سکتا، تلوتما میں اب بھی تمہارے لئے ہر وہ چیز کرسکتا ہوں جو شائد کمار بھی نہ کرسکے۔ ہاں! تم خوش تو ہو؟" سریندر نے پوچھا۔

"میں تو خوش ہوں لیکن تمہاری یہ حالت خوشی چھین لے گی۔"

"شکریہ" سریندر نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

"اس میں میرا کیا دوش ہے سریندر۔ قسمت کے فیصلہ پر صبر کرلینا چاہیے۔ میری محبت تمہارے لئے وہی ہے لیکن بالکل پاکیزہ، مجھے سسرال میں دو کی جدائی محسوس ہوتی رہی۔ ایک ماں اور ایک میرا حقیقی بھائی یعنی تم۔ میں نے یہاں تمہارا انتظار کیا۔ تم نہیں آئے۔ میں خود منانے آئی جس بھائی کو میں یاد کرتی تھی، اس کو نہ منایا۔"

"اچھا تلوتما اب تم جاسکتی ہو۔ میرے جذبات سے کافی دیر کھیل چکی ہو۔" سریندر نے پلٹتے ہوئے کہا۔ تلوتما رنجیدہ واپس ہوگئی۔

کمار مر چکا ہے۔ تلوتما ماں کے پاس آئی ہوئی ہے وہ ساس نندوں کی گالیوں کی تاب نہ لاسکی۔ اس کو کمار سے والہانہ محبت تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو خود مرجاتی لیکن آہ! پتی کو بچا لیتی۔ اس پر بھی لوگ اس کو خطاوار کہتے ہیں۔ وہ ہر وقت بدنصیب، منحوس کے الفاظ نہ سن سکی، وہ ماں کے پاس غریبی سے رہ سکتی تھی لیکن ناحق کے طعنہ نہ سن سکی۔

گاؤں میں طاعون کا زور ہے۔ تلوتما کی ماں سریندر کی ان تھک کوشش کے باوجود بچ نہ سکی۔ اب اس کا بچہ بیمار ہے۔ ماں کی بیماری سے ہی سریندر تلوتما اور اس کے بچے کی خدمت

[illegible]

"اچھا ہی ہے جتنا جلد مرو۔ اس نگوڑے پریم سے بھی پاپ کئے ایشور کرے۔ بڑی پرچھنے آئی ہے جیسا رہی تو جائے گی۔ غیرت دار ہوتی تو کب کی مرگئی ہوتی جب تمھارا مول کٹے گا تب وہ مجھ سے خوش رہیں گے۔"

آج تلوتما کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا، اگر سریندر اس کی موت کے بعد خوش رہے گا تو وہ خوشی سے مرسکے گی۔ اس سے بڑھ کر خوشی اور کیا ہوسکتی ہے کہ سریندر خوش رہے۔ اس نے آج پریم کو رخصت کردیا۔ جاتے وقت اس کو گلے لگا کر رونے لگی: "پریم! شاید یہ میری آخری خواہش ہو اس کو پورا کرنے کی ہمیشہ کوشش کرنا۔ ہر وقت تمھارے ماما (سریندر) کو خوش رکھنے کا خیال رکھنا، چاہے تم کو رنج پہنچے پر ماما اور مامی کی خوشی کا خیال رکھنا۔" پریم رونے لگا۔ "دیکھو اماں اگر تم روئیں گی تو میں نہ مناؤں گا۔ تم آج ایسی باتیں کیوں کررہی ہو، مجھے خوشی سے رخصت کرو، جب بلواؤ میں آجاؤں گا، تم ہی تو بھیج رہی ہو، تم کیوں نہیں چلتیں۔" اس نے رنجیدہ ہوکر کہا۔

تلوتما بستر پر پڑی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر کی رائے ہے کہ اس نے زہر کھالیا ہے۔ سریندر حیران ہے کہ شام تک وہ اچھی تھی، اب کیا ہوا اس نے زہر کیوں کھایا، ڈاکٹر نے طاقت کی دوا دی تاکہ وہ آخری بار کچھ کہہ سکے۔ تلوتما نے اشارے سے سریندر اور سمترا کو بلایا، سمترا کافی متاثر ہوچکی تھی۔ تلوتما بولی۔ "سریندر! دیکھو بھیا! اپنی مرتی ہوئی بہن کی آخری تمنا ہے ضرور پوری کرنا۔ میں نے تمھیں خوش دیکھنے کے لئے خوشی سے زہر کھایا ہے تم مجھ سے وعدہ کرو کہ میرے مرنے پر تم سمترا کو سکھی رکھو گے اور تم بھی خوش رہو گے۔ اگر میری آتما کو سکھی رکھنا ہے تو تمھیں ہر حال میں خوش رہنا چاہیے۔"

"تلوتما تم دیوی ہو، مجھے معاف کردو، مجھ پاپی کے کارن تمھارا یہ حال ہوا۔ میں سمترا..." وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اس سے زیادہ نہ کہہ سکا۔

"سمترا! میں نے تمھیں ہمیشہ بہن سمجھا اور بڑی خوشی سے تمھارے اور سریندر کے لئے زہر کھایا۔ تم بہن کے آخری [illegible] سریندر کو خوش رکھنے کا وچن دو۔" سمترا روتی ہوئی تلوتما کے پاؤں پر گرگئی: "مجھے معاف کرو بہن۔ کاش تمھاری جگہ میں مرسکتی۔ میں نے اپنے ہاتھوں اپنی محسن بہن کو زہر دیا۔ میں بڑی ابھاگن ہوں۔ کہو معاف کردیا۔" تلوتما نے پریم کی تصویر منگوائی اور اس کو گلے سے لگا کر سوگئی۔ وہ نیند جس میں [illegible] سکے کچھ بھی نہیں۔ جو آنے کے بعد پھر نہیں جاتی۔

سمترا بیوہ کے اس ایثار سے بیحد متاثر ہے، اس [illegible] پریم کو بڑی مشکلوں اور منتوں کے بعد اپنے پاس رکھ لیا۔ پریم [illegible] ان کی خوشی اس میں دیکھ کر رہنے پر راضی ہوگیا، وہ ہر [illegible] دونوں کی خوشی کا خیال رکھتا ہے، سمترا اور سریندر ایک دوسرے کو خوش رکھنے کا خیال رکھتے ہیں، سریندر اس رنج سے کہیں کا نہ رہا۔ لیکن اس کو تلوتما کی آخری آرزو [illegible] کرنی پڑی، وہ صرف اس کی آتما کو سکھی رکھنے خوش رہنا [illegible] ہے۔ اس ایثار نے اس کو خوش رہنے پر مجبور کردیا ہے اور بدنصیب تلوتما کی آخری آرزو پوری ہوتی نظر آتی ہے۔

مقبول عبدالرحمن

[illegible]

نظریں پڑیں تو بے خود سا ہو گیا۔ بیخودی کے عالم میں ہی تھا کہ کسی کی السلام علیکم کی صدا نے مجھے یکایک ہوش و خرد کے عالم میں لا کھڑا کیا۔ اپنے اطراف نگاہیں دوڑائیں تو ایک مسن شخص کو اپنے پیچھے کھڑے مسکراتے ہوئے پایا۔ جو مجھ سے کہہ رہا تھا، صاحبزادے! ایسی بھی کیا بیخودی، نوجوانوں کو اتنی بیخودی سے کیا واسطہ؟ میں نے بوڑھے کی باتوں کا خیال نہ کرتے ہوئے وعلیکم السلام کہا جس پر اس نے اپنا سلسلۂ کلام بدلتے ہوئے دعائیں دیں اور بڑے ہی تعجب سے پوچھنے لگا۔ میاں! آپ جیسے نوجوان اور اس ویرانے میں؟ تماشا ہے، حیرت ہے!! میں نے بڑے میاں کی بزرگی کا پاس کرتے ہوئے ادب سے کہا۔ اس مسجد کی مقناطیسی کشش نے مجھے یہاں کھینچ لایا ورنہ کہاں مسجد اور کہاں تہذیب کے فرزند..... بوڑھے کی باچھیں کھل گئیں، کھل کھلا کر ہنس پڑا، ہنستا جاتا اور میرے کہے ہوئے الفاظ دہراتا جاتا۔ "کہاں مسجد اور کہاں تہذیب کے فرزند" خوب کہا میاں خوب کہا۔ جب ذرا سکون ہوا تو میرے چہرے پر بوڑھے نے استفسار کے آثار پائے، مجھے ساتھ لے مسجد کے اس مقام کی طرف بڑھا جس کو وہ اپنی زندگی کے آخر لمحات کا ملجا و ماوی [illegible] کرتا تھا۔ ہم دونوں ایک چبوترے پر بیٹھ گئے۔ میں خوب سمجھ رہا تھا کہ کوئی راز ہے، مسجد کی جس پر بنیاد ہے اور بوڑھے کا سینہ جس کا گھر ہے۔ میری دلچسپی نے بوڑھے کو اپنا راز مجھ پر عیاں کر دینے کے لئے آمادہ کر لیا۔ "دل را بہ دل رہیست" کوئی آنسو پونچھنے والا نظر آتا ہے تو نگاہیں اشکبار ہو ہی جاتی ہیں۔ چنانچہ میرا خیال صحیح نکلا۔ تھوڑی ہی دیر میں ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بوڑھے نے اپنی رام کہانی اس طرح پر شروع کی..... کہنے لگا۔ میرے آبا و اجداد کی عمریں قطب شاہی سلطنت کی خدمت گزاری میں بسر ہوئیں، میں خود بھی قلعہ گولکنڈہ کا ایک وظیفہ یاب سپاہی ہوں، اس کے اطراف و نواح میرے عہد طفولیت میں کھیل کود کا گہوارہ بنے رہے ہیں۔ عہد شباب میں بارہا یہ مسجد میرا مسکن بنی رہی اور اب آخری ایام بھی اسی کے ماحول میں گزار دینے کا تہیہ کر بیٹھا ہوں۔ وقت کی موزونیت نے بوڑھے کی گفتگو میں مجھے ایسا محو کر دیا کہ جب وہ کہہ رہا تھا "یہی قلعہ جو آج کھنڈر ہے کبھی قطب شاہی خاندان کی شان شوکت کا نمونہ تھا"...... بوڑھے کی دھیمی دھیمی آوازیں میرے کانوں پر پڑ رہی تھیں اور محویت کے عالم میں میں دیکھ رہا تھا کہ قلعہ ویسا ہی شان و شوکت کا نمونہ بنا ہوا ہے، ہر طرف ایک ہل چل مچی ہوئی ہے، اچانک ایک برات آتی ہوئی نظر آتی ہے، بیچ میں ایک پالکی ہے۔ شاہی بانڈ سامنے بجاتا چلا آ رہا ہے، اسی مقام کا رخ ہے جہاں اب مسجد کھڑی نوحہ کر رہی ہے۔ پالکی منزل مقصود پر پہنچ گئی ہے، نگاہیں منتظر ہیں کہ پالکی رکھی گئی، اس کا پردہ کھلا، ایک چہرہ حسن و جمال کا نمونہ نظروں کو خیرہ کرتا ہوا نکلا۔ یہی ہے پریم متی ویدی، سلطان کے قلب کا سرور، آنکھوں کا نور، اپنے محبوب کی بارگاہِ محبت "مسجد" سجدہ گاہ خاص و عام، نذر کرنے کی خاطر اور اس مسجد کی تعمیر کے متعلق احکام دینے آئی ہے۔ بوڑھے کی آواز دھیمی ہو گئی اور اس نے چند لمحوں کے وقفہ کے بعد ایک آہ سرد بھری اور اپنی درد بھری داستان شروع کی اور میں پھر ایک بار محویت کے عالم میں غرق ہو گیا

کیا دیکھتا ہوں، مسجد مکمل ہونے کے قریب ہے' قلعہ میں ایک عجیب طرح ہر طرف سے آہ و بکا کی صدائیں آ رہی ہیں۔ لوگوں پر بدحواسی کا عالم طاری ہے' قلعہ کی در و دیوار سے حسرت برس رہی ہے کہ اتنے میں قلعہ کا دروازہ کھلتا ہے چار آدمی اپنے کندھوں پر ایک جنازہ سنبھالے نکلتے ہیں۔ پیچھے ہی ایک شخص نظریں نیچی کئے رنج و الم کی تصویر بنا چلا آ رہا ہے۔ یہ سلطان عبداللہ قطب شاہ ہے۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر لوگوں کا ایک ہجوم ہے جن کے چہروں پر حسرت و یاس، ہراس و پریشانی کے آثار نمایاں ہیں۔ آہ نیرنگی عالم! تقدیر تو..... اے چرخ گردان تفو..... اُف کیا حسرت بھرا منظر!! یہ وہی پریم متی ہے جس کے حسن و عشق کے کل گھر گھر چرچے تھے۔ شاہ کے دل پر وہ حکمران تھی..... آج قلعہ سے اسی کا جنازہ نکلا ہے۔ خود شاہ بنفس نفیس اپنی آرام جاں کو اپنے ہاتھوں سے سپرد خاک کرنے پر مجبور ہوا ہے..... اسی کا غم ہے جس نے شاہ کو نیم مردہ بنا ڈالا ہے' اس کے دل کی گہرائیوں میں ٹھیس لگی ہے جس کا کوئی علاج نہیں' رہ رہ کر بادشاہ کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے اور اسے آمادہ بہ حشر کر دیتی ہے۔ وقت ہے کہ اپنے قرنہا قرن کے معمول کے مطابق، بے نیاز اس سے کہ بستی کسی کے دل کی اجڑ گئی یا بس گئی' کشتی محبت کسی کی آشنائے ساحل ہوئی یا درمیان ہی میں نذر طوفان ہوگئی' رفتار میں مشغول ہے......

پریم متی کو عالم بقا کی طرف سدھارے تیسرا روز ہے کہ بے اختیار بادشاہ کو اس کی یاد آئی اور وہ اپنی محبوبہ کی قبر کی طرف چل کھڑا ہوا۔ قبر پر نگاہیں پڑیں' آنکھیں اشکبار ہو گئیں' دل پکار اٹھا آہ کل جو قصر عالیشان پر حکمران تھی' آج منوں مٹی کے نیچے ہے' مقبرہ تک نہیں۔ فوراً ایک عظیم الشان مقبرہ کی تیاری کا حکم صادر ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مقبرہ تیار ہو جاتا ہے جو زبان حال سے انسان کو منزل آخرت کا نشان بتاتا ہے۔ شاہ کے حکم کے مطابق اس پر یہ مصرع کندہ کیا جاتا ہے: "بعد از زوال گل چنی' پریم متی" شاہ پھر ایک بار اس یادگار کو دیکھنے نکلتا ہے جس میں اس کے دل کا کنول مرجھایا ہوا پڑا ہے کہ اسے اس نذر کا خیال آتا ہے جو حسن کی بارگاہ سے محبت کے مندر پر چڑھائی جانے والی تھی۔ وہی مسجد..... شاہ حسرت بھری نگاہوں سے اس کی نامکمل حالت کو دیکھتا ہے' دل کی دنیا میں ہیجان سا پیدا ہو جاتا ہے۔ فوراً مسجد کی بقیہ تعمیر بند کر ڈالنے کا فرمان دیتا ہے..... اپنے سے کہتا ہے جب معطی ہی باقی نہیں تو اس کے عطیہ ہی کا کیا لطف؟

سورج چمک رہا تھا' اس کی تیز تیز چمکیلی کرنیں ہم پر پڑ رہی تھیں' بوڑھے نے اپنی داستان پُرغم ختم کر دی تھی' چند لمحوں تک ہم دونوں پر سکوت کا عالم طاری رہا۔ یکایک میں گویا ایک گہری نیند سے چونک پڑا..... کیا دیکھتا ہوں وہی ماحول ہے' سر سبز شاداب کھیت' اجڑی مسجد' دیو کی طرح سامنے کھڑا ہوا گولکنڈہ کا قلعہ.....

حیران تھا سوچ رہا تھا کہ کس دنیا میں جا پہنچا تھا اور اب کہاں آ پہنچا۔ اٹھا' بوڑھے کا شکریہ ادا کیا جس نے مجھے چند ساعتوں کے لئے اس دور میں پہنچایا جب کہ قلعہ گولکنڈہ اور اس کے اطراف و اکناف پر شان برستی تھی..... دماغ میں یہی خیال لئے گھر کا رخ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

موج کرنا

اگر موج کرنے کے لئے کچھ پیسہ ہو تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غریب زیادہ موج کرتا ہے یا امیر؟ حالات پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاید غریب ہی زیادہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کو جو کبھی تھوڑا سا پیسا اڑانے کے لئے مل جاتا ہے تو یہ خود ایک بڑی پُرلطف چیز ہوتی ہے اور ہر وہ لطف جس کے لئے انسان سخت محنت کرتا ہے زیادہ مزہ دار ہو جاتا ہے۔ اچھی چیز کا بہت زیادہ میسر ہونا یا بہت زیادہ دیر تک میسر رہنا، اکثر یکسانیت و یک رنگی کی وجہ سے بیزاری پیدا کرتا ہے۔ جنت کی دوامی مسرت کے تصور سے بھی بعض شعرا شاید اسی لئے گھبرا اٹھے کہ یکساں دوامی مسرت غالباً تھوڑے ہی عرصے میں اجیرن ہو جائے گی۔ مسرت کا بڑا راز یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان تھوڑے سے عرصے کیلئے وہ چیز حاصل کر سکے جس کے ایک عرصے تک حاصل کرنے اور رکھنے کا آرزومند رہا ہو اور حاصل نہ کر سکا ہو۔ کیونکہ اس چیز کے لئے اس کو محنت سے مواقع نکالنے پڑتے ہیں اور ایسے مواقع نکلنے کے بعد ان سے لطف اندوز ہونے کے ذرائع بھی مہیا کرنے پڑتے ہیں۔ ان ہی وجوہ سے ایسا خیال ہوتا ہے کہ جب غریب کو موج کرنے کا موقع ملتا ہے تو وہ امیروں سے زیادہ مکمل طور پر اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ امیر صبح سے شام تک بہت سے ایسے مشغلوں میں مصروف رہتا ہے جن سے در اصل وہ کوئی خاص لطف نہیں اٹھاتا مگر اس لئے مشغول رہتا ہے کہ اس کا طبقہ ان کو پُرلطف مشغلے یا فیشن سمجھتا ہے۔

اور شاید ان سے تجربے کے بعد بھی یہ محسوس ہونے نہیں پاتا کہ جس چیز کا نام اس نے "خوش وقتی" رکھا ہے وہ اس چیز کا نام نہیں ہے کہ وہ چند دوستوں کو ساتھ لیکر ایسا تماشا دیکھنے پر مجبور ہو کہ جس میں سب سے زیادہ قہقہے لگانے والے اور ہنسنے والے وہی افراد ہوں جو اسٹیج پر ہوں اور جو محض تنخواہ کی خاطر ایسا کر رہے ہوں۔ غریب کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو اپنی بہترین شکل میں بھی بیزاری کا باعث ہو لیکن اس کو جب کوئی تفریح اس کی مرضی کے مطابق مل جاتی ہے تو پھر وہ خود کو اس میں اس شغف اور جوش کے ساتھ منہمک کر لیتا ہے کہ دیکھنے والا بھی اس کا متعدی اثر اس طرح سے لیتا ہے جیسے موسم بہار کی پُرمسرت فضا کا۔ غریب کے مزے کرنے کے انداز غالباً زیادہ پُرشور ہوتے ہیں مگر یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ لازماً زیادہ ذلیل بھی ہوتے ہیں۔ یہ بہرحال ظاہر ہے کہ غریب کے مشغلے میں نمائش کا پہلو بہت کم ہوتا ہے اور اس کا مشغلہ شاید زیادہ بے فائدہ بھی نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے امیر کی "خوش وقتی" ایسی مصنوعی سہولتوں کا غالباً ایک طویل سلسلہ ہو کر رہ جاتی ہے جس سے نہ کوئی لطف حاصل ہوتا ہے نہ فائدہ اور نہ کوئی سبق ہی۔

اسی وجہ سے شاید یہ کہا جاتا ہے کہ ہر وہ چیز جو کامل طور پر فطری ہو ذلیل نہیں ہو سکتی بلکہ ذلت کا مفہوم اس وقت پیدا ہوتا ہے جب دکھاوا، نمائش اور شرم اس میں داخل ہو جائیں بہت کم چیزیں گھمنڈ سے زیادہ ذلیل ہو سکتی ہیں خواہ وہ دولت کی وجہ سے ہو یا علم یا قوت کی وجہ سے ہو یا دنیوی مرتبے کی وجہ سے۔

بعض اشخاص اس کو زیادہ پسند کریں گے کہ کسی میلے میں غریب لوگوں کو اپنی معصومانہ چھوٹی چھوٹی سی تفریحات میں

بغیر تصنع کے حصہ لیتے ہوئے دیکھنے کا لطف اٹھائیں نسبت اس کے کہ کسی "ریس کورس" کے پہلے احاطے کے اشخاص کی پُر تصنع حرکات کا تماشا کریں۔ ایک خاص معیار کے اندر اپنے کو جکڑے رکھنا ایک ایسا مشغلہ ہے جس کا مطالعہ بھی، اپنے نئے پن کے رفع ہونے کے بعد، دوبھر ہو جاتا ہے۔ لیکن آدمیوں کو اپنے فطری انداز میں فطری اور بے تصنع تفریح میں مشغول دیکھنا ایک فرحت آور اثر رکھتا ہے اسی طرح جس طرح کہ آپ قدرت کے مختلف مظاہر کی مختلف کیفیات سے فرحت اندوز ہوتے ہیں۔ اور بالآخر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ زندگی کی سیدھی سادی اور بے تصنع خوشیاں ہی وہ ہیں جن کو حقیقت میں ہم زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ممکن ہے ہم یہ تصور کریں کہ زندگی کی زیادہ پیچیدہ اور قیمتی قسم کی مسرتوں کو ہم زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مگر یہ تصور زیادہ تر نفس کا ایک فریب اور دھوکا ہوتا ہے، گو بہت سے اشخاص اس چیز کو اس وقت تک سمجھ نہیں سکتے جبکہ سمجھنے کے بعد اس علم سے فائدہ اٹھانے کا وقت نہیں رہتا۔

بعض کا خیال ہے کہ اگر شعرا عشق کے متعلق اس قدر بلند اور دلکش تصورات نہ پیش کرتے تو شاید اکثر نوجوان اپنے دو مسلسل خیالات بھی اس پر صرف نہ کرتے۔ مگر قصہ یہ ہے کہ وہ محبت اور عشق کے متعلق اس قدر سنتے رہتے ہیں کہ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ انھیں عشق میں ضرور مبتلا ہونا چاہیے اور اگر وہ ایسا کرنے سے قاصر رہیں تو بڑی سبکی کی بات ہوگی یا خود ان کی جسمانی خوبصورتی اور جاذبیت پر حرف آجائے گا۔
شاید "لطف اندوزی" کا فلسفہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ چند اشخاص نے حالات کے چند خاص خاص مجموعوں کا نام مسرت رکھ لیا ہے اور اس کو لطف اندوزی سے تعبیر کرتے ہیں۔ پس ہر شخص اس مخصوص اجتماع حالات [illegible] متلاشی ہوتا ہے اور اس مخصوص نسخے کے حصول کے بعد فخر کے ساتھ دوسروں سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ "دیکھو تم اس قدر بے وقوف ہو کہ تم یہ چیزیں حاصل نہ کر سکے!"

غالباً آپ کو یاد ہوگا وہ کسی نے کہا تھا کہ "اس قسم کے کھیل تماشے کم ہوتے تو شاید زندگی برداشت کے قابل ہو جاتی۔" بہرحال اس کے قول کا کچھ اسی قسم کا مطلب تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس نے ایک بڑی بات کہی تھی گو لوگ اس کو ایک واقعہ ماننے سے کچھ گھبراتے ہیں۔ اپنے بہترین کپڑے پہن کر پھرتے پھرتے خود بیزار ہو جانا گویا ایک ایسا نمونہ ہے جو اس معاشی کشمکش والی دنیا کے سامنے ایک ایسے انعام کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ اگر اس کے لئے کافی اور طویل کوشش کیجائے تو وہ قابل حصول ہے! لیکن دنیا میں کتنے بہت سے احمق جمع ہیں کہ وہ برابر اسی قسم کی چیزوں کے پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں اور چونکہ دوڑتے پھرتے ہیں ان پر اعتقاد بھی رکھتے ہیں۔ اسی لئے تو کسی دل جلے نے کہا تھا کہ اگر دنیا میں اس قدر بے وقوف نہ بستے تو اس قدر زیادہ عقیدے کہاں سے پیدا ہو جاتے؟

آج کل جنگ کا زمانہ ہے، چو طرف جنگ کے قصے ہیں۔ ایک دوست جو جنگ کے حالات کا قریبی مطالعہ کر چکے ہیں اپنے تجربے کی بنا پر کہتے تھے کہ جہاں تک موج کرنے اور خوشی منانے کا تعلق ہے اس کی صلاحیت ایک "سپاہی" میں بہ نسبت اس کے افسر کے زیادہ ہوتی ہے۔ اور اسی لئے اس کی ضیافت کرنا نسبتاً آسان تر ہوتا ہے۔ بلکہ ایک ساتھی کی حیثیت سے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

طلبہ کا طبی معائنہ

دنیا کی ہر مہذب قوم اور ملک میں عوام کی تعلیم کا مسئلہ نہایت اہم سمجھا جاتا ہے۔ خاص حالات اور ضروریات کے تحت اس کے حل کی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو پیش کیا جا سکتا ہے جہاں دو کروڑ سے زائد بچے یعنی کل آبادی کا بڑا حصہ پبلک اسکولوں میں تعلیم پاتا ہے۔ ان مدارس کے مجموعی مصارف تقریباً چالیس کروڑ ڈالر ہوتے ہیں اس کے علاوہ ہر سال کثیر رقم مدارس کی عمارات پر صرف ہوتی ہے۔ ان مصارف کا زیادہ حصہ عوام سے وصول کیا جاتا ہے لیکن وہاں کے لوگ اس بار کو بخوشی برداشت کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کو کتنا اہم سمجھتے ہیں۔ نہ صرف یہی امداد کی جاتی ہے بلکہ کئی لائق افراد نے اپنی مفت خدمات ان اداروں کی بہتری کے لئے وقف کر دی ہیں۔

طب کی روزافزوں ترقی کے ساتھ ساتھ حفظان صحت کے اصول کے متعلق بھی معلومات میں اضافہ ہوا اور ساتھ ساتھ یہ حیثیت عیاں ہونے لگی کہ بچوں کے دماغی اور جسمانی حالت میں بہت ہی قریبی تعلق ہے۔ استاد اور طبیب دونوں نے اس کو محسوس کیا کہ مختلف بچوں کی دماغی صلاحیتیں ان کی جسمانی حالت کی مناسبت سے مختلف ہوتی ہیں اور پھر یہ دونوں اس کی وجہ معلوم کرنے کی طرف رجوع ہوئے اور اس طرح مدارس میں لڑکوں کا طبی امتحان ایک ضروری چیز بن گئی۔

تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مدارس میں بعض مخصوص امراض بچوں میں پیدا ہو جاتے ہیں جیسے قریب نظری اور جسمانی یا ذہنی کمزوری ([illegible]) وغیرہ۔ بچوں کی کثیر تعداد کے معائنے سے یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ جسمانی نقائص کی ابتدا بچپن میں ہوتی ہے۔ اس کا تجربہ اس طرح ہوا کہ امریکی فوج میں جو رنگروٹ بھرتی کئے گئے تھے ان میں سے ۵۰ فیصد فوجی ملازمت کے نااہل اور ۲۰ فیصد صرف معمولی خدمت انجام دینے کے قابل تھے۔ باقاعدہ طبی امتحان سے ظاہر ہوا کہ مرض کی ابتدا بچپن میں ہوئی تھی۔ صرف اس ایک مشاہدہ سے بلکہ اکثر ممالک کے امراض کے اعداد و شمار دیکھنے سے بھی اسی حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔

تاریخ۔ مدارس کے طبی امتحان کی اہمیت کو اس سے زیادہ اور کوئی دوسری چیز واضح نہیں کر سکتی کہ تمام مہذب ممالک کی مجالس قانون ساز نے اس کو قانون کے ذریعہ لازمی قرار دیا ہے۔ مدارس میں طبی معائنہ کی تاریخ ۱۸۳۶ء سے شروع ہوتی ہے۔ اس سال یہ تحریک جرمنی میں شروع ہوئی اس کے بعد ڈاکٹروں کا باقاعدہ تقرر مدارس کے لئے ۱۸۸۰ء میں شروع ہوا جو میڈیکل انسپکٹر آف اسکول کہلاتے تھے۔ انگلستان میں اس سے متعلق پارلیمانی قانون ۱۹۰۷ء میں منظور ہوا۔ گزشتہ جنگ عظیم کی وجہ سے یہ کچھ معرض التوا میں پڑا رہا لیکن اس جنگ نے اس کی اہمیت خوب واضح کر دی کہ فوج کی طاقت کا دارومدار اور قوم و ملک کی آئندہ فلاح و بہبود کا انحصار بچوں کی صحت پر ہے۔ انگلستان میں ان بچوں کو جن کے متعلق اساتذہ کا خیال تھا کہ کسی متعدی مرض میں مبتلا ہیں میڈیکل انسپکٹر کے پاس روانہ کیا گیا لیکن بعد کو ہر لڑکے کا باضابطہ امتحان کیا جانے لگا اور غیر حاضر لڑکوں کے لئے ان کے گھر پر انسپکٹر کو روانہ کیا جاتا تھا اور جو بچے کسی متعدی مرض میں مبتلا پائے جاتے تھے ان کو دوسرے صحت مند بچوں سے علیحدہ رکھا جاتا تھا۔ اور اس کے بعد اس بات کی پوری احتیاط کی گئی کہ ان متاثرہ بچوں کا باقاعدہ علاج کیا جائے۔

لیکن جب ہم اپنے ملک کی حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پہلے تو طبی امتحان کے لئے کوئی قانون نافذ نہیں ہے اور اگر اس پر توجہ بھی کی گئی تو صرف اس حد تک کہ ایک قلیل رقم موازنہ میں اس کے لئے مختص کر دی گئی۔ مدرسے میں سال میں ایک مرتبہ بچوں کا طبی معائنہ کیا بھی جاتا ہے تو معمولی سرسری طور سے لیکن بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ لڑکوں کی بیماریوں یا جسمانی خرابیوں کی طرف توجہ کر کے ان کو دور کرنے کے متعلق عملی تدابیر اختیار کی جاتی ہوں۔ دوسری طرف مدرسے سے بچوں کی صحت کے متعلق جو رپورٹ آتی ہے تو والدین یا سرپرستوں نے بھی بہت کم اپنے بچوں کی جسمانی صحت کو بہتر بنانے یا امراض کے دور کرنے کی عملی سعی کی ہے۔ ہمارے ملک میں مشکل سے پانچ فیصد والدین ایسے ہوں گے جو اپنے لڑکے کے متعلق بتائے ہوئے امراض کا خاص توجہ سے علاج کرواتے ہوں۔

[illegible] کے لئے ہر سال طبی امتحان ہوا کرتا ہے اور اس سے وہ فوائد حاصل نہیں ہوتے جو اس اسکیم کا اہم مقصد ہے۔
[illegible] کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ کسی قوم کے بچوں کی صحت و نشوونما اور ان کی تعلیم و تربیت ہی پر اس قوم کی فلاح و بہبود منحصر ہے۔ اگر ان بچوں کی صحت کی طرف سے غفلت برتی گئی تو قوم کو بہت بڑے نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان سب خرابیوں کا ازالہ صرف بچوں کی صحت پر ہے لیکن ہمارے [illegible] انتہائی غفلت برتی جاتی ہے اور اگر سب سے کم توجہ دی جاتی ہے تو اسی حفظان صحت کے اصولوں پر۔ اور اگر اس کے باوجود یہ امید کی جائے کہ قوم میں بہترین جسمانی اور دماغی قابلیت کے افراد پیدا ہوں تو محض ایک خواب ہے۔ مدرسہ میں بچے کا طبی امتحان اس لئے بھی ضروری ہے کہ [illegible] بچوں کی بڑی تعداد یہاں آتی ہے اور یہیں نہ صرف ان کی جسمانی بلکہ دماغی صلاحیتوں کو وقتاً فوقتاً جانچا جا سکتا ہے۔ کئی سال تک ایک بچے کی نگہداشت یہاں کی جا سکتی ہے جس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ قوم کے یہ نونہال آئندہ ہر لحاظ سے کارآمد اور قابل ہستیاں بنیں اور کسب معاش میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو۔ جو بچے شروع سے جسمانی اور ذہنی اعتبار سے اچھے ہوں ان کے لئے کسی خاص توجہ کی ضرورت نہ ہوگی لیکن وہ جن میں کچھ نہ کچھ جسمانی نقائص موجود ہیں جیسے بصارت کی کمزوری یا ثقل سماعت یا پیدائشی کند ذہنی ان کے لئے شروع ہی سے مستقل معالجہ کی ضرورت لاحق ہوتی ہے تاکہ ان نقائص کا سد باب ہو سکے اور وہ آئندہ کامیاب زندگی بسر کر سکیں۔ ہمارے مدرسوں میں بچوں کی ایک کثیر تعداد ایسی ہوتی ہے جن کو اچھی غذا میسر نہیں آتی اور جو عموماً معمولی بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ بعض ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جو درجہ اول میں کامیابی حاصل کرتے ہیں لیکن سخت محنت کی وجہ سے ان کی صحت بالکل گری ہوئی ہوتی ہے ایسے طلبا امتحانات میں امتیاز کے ساتھ کامیاب تو ہو جاتے ہیں لیکن عمر بھر اطبا کے زیر مشق رہتے ہیں۔ بعض والدین کی لاپروائی کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کی طرف توجہ نہ کرکے مصر ہیں کہ یہ بغیر آرام لئے یا صحت کی طرف توجہ کئے تعلیم کو جاری رکھیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے بچے والدین کی غلطیوں کی وجہ سے تلف ہو جاتے ہیں۔ اگر تلف نہ ہوں تو یہ معمولی خرابیاں بڑھ کر ناقابل علاج ہو جاتی ہیں۔ ہونہار بچوں کی موت نہ صرف ان کی اپنی جان کا نقصان ہے بلکہ قوم اور ملک کے ارمان ان کے ساتھ دفن ہو جاتے ہیں۔ یہ خرابیاں اس وجہ سے ہوتی ہیں کہ قبل از قبل امتحان نہ کیا جا کر کوئی باقاعدہ طریقۂ علاج اختیار نہیں کیا گیا۔ نہ صرف مریضوں کا بلکہ صحت مندوں کا طبی امتحان بھی ضروری ہے۔ اس ملک میں حفاظتی تدابیر کی اہمیت لوگوں کو اچھی طرح سے معلوم نہیں ہے جب تک بچہ کسی مرض میں اتنا مبتلا نہ ہو جائے کہ اس سے اس کو خاصی تکلیف پہنچنے لگے اس وقت تک خاص علاج کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

پس اس قدر اس کی اہمیت کو واضح کر دینے کے بعد یہ بتلانا ضروری ہے کہ تعلیم کے دوران میں لڑکیوں میں دماغی اور جسمانی خرابیاں کس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور اور کیا احتیاطیں ضروری ہیں۔

بصارت۔ مثال کے طور پر جماعت کے اندر روشنی کی کمی اور نشستوں کی غلط ترتیب سے بصارت متاثر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ خود کرسی اور میز کے درمیانی فاصلے اور ان کی اونچائی کی غیر موزونیت کی وجہ سے (Postural defects) پیدا ہوتے ہیں۔ پس ان چیزوں سے قبل از قبل احتیاط ضروری ہے جن بچوں کی بصارت کمزور ہو ان کو ہمیشہ سامنے کی نشستوں پر جگہ دی جانی چاہیے۔

ورزش جسمانی۔ اس مسئلہ سے یہاں زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہر شخص اس کی اہمیت سے واقف ہے تعلیم کا مقصد محض عالم فاضل بنانا ہی نہیں بلکہ کامل نشوونما کی تحصیل ہے جو تندرستی جسم اور عقل سلیم کا ممد و معاون ہے۔ یورپی ممالک میں ہر درجے میں ورزش جسمانی اور میدانی کھیل تعلیم کا ایک ضروری جز ہیں اور ان کی حاضری لازمی ہے اور خود ان کھیلوں کو اس قدر دلچسپ بنایا جاتا ہے کہ طالب علم خود اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں پہلے تو ہر مدرسے کے لئے کھیل کے میدان مہیا نہیں ہیں اور کسی کے لئے ہیں تو ان میں سوائے چند مستثنیات کے باقاعدہ انتظام یا حاضری لازمی نہیں ہے۔ اس منزل پر چند

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

تشنگان محبت

یک مدت کے بعد ہواؤں کا سیلاب برگ و باد سے ٹکرا کر شور پیدا کر رہا تھا، آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں چاند کا نقرئی بجرہ ہولے ہولے ابر پر تیر رہا تھا، وہ سنگلاخ پہاڑیوں میں بل کھاتی ہوئی، سبزہ زمین کے آغوش میں سرائے کو آنے والی سڑک نور کی دیوی کے نقرئی آنچل کی طرح لہرا رہی تھی۔ اسی وقت ایک قزاق گھوڑے پر سوار چلا آ رہا تھا، آخر کار قدیم سرائے کے صدر دروازے پر آ کر وہ رکا ۔۔۔ اس نے ایک فرانسیسی ٹوپی پہن رکھی تھی، ایک نفیس رومال اس کے گلے کا احاطہ کئے ہوئے تھا، ایک مخملی کوٹ اور ملگجی رنگ کا پتلون اس کے زیب بدن تھا، اس کا لباس شکنوں سے تمام و کمال پاک تھا، اس کے لمبے بوٹ اس کے مضبوط اور سڈول پنڈلیوں کو چوم رہے تھے ۔۔۔ اس کا رنگین لباس چاند کی سیمیں کرنوں میں ایسا جگمگا رہا تھا جیسے دو تارے یکجا میں سراپا جگمگا رہا ہو، اس کا پستول بھی چاند سے کسب نور کر کے جگمگ جگمگ کر رہا تھا، اس کی تیغ آبدار کا دستہ بھی تاروں کے جھلملاتے آسمان کے نیچے جگمگا رہا تھا، اس کا گھوڑا سرائے کے منقش پتھروں کو روندتا ہوا تیزی سے سرائے کے صدر دروازہ پر آ کر ٹھیر گیا! اس نے اپنے چابک کے دستے سے سرائے کے بڑے دروازہ کو کئی بار کھٹکھٹایا، پھر اس نے ہولے ہولے سیٹی بجائی جو سرائے کے سکوت کو توڑتی ہوئی فضاؤں میں تحلیل ہو گئی، سرائے کی ایک کھڑکی میں سرائے کے مالک کی لڑکی بس (Bess) کھڑی اس کے انتظار کی کٹھن گھڑیاں گن گن کر کاٹ رہی تھی، اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کتنی حسین تھیں جیسے حسن و شباب کی دو گہری جھیلیں ۔۔۔ وہ اس وقت اپنے سیاہ دراز گیسوؤں کو سنوار کر ان پر سنہری ربن باندھ رہی تھی! سرائے کی ظلمتوں میں دھیمی سی چرچراہٹ کے ساتھ ایک خفیہ دروازہ کھلا، جہاں سرائے کے اصطبل کا ملازم ٹم (Tim) کھڑا چپکے چپکے اس حسن و شباب کے مجسمہ کی پوجا کر رہا تھا، کسی کے صدر دروازے کو کھٹکھٹانے اور سیٹی بجانے کی آواز جب ٹم کے کانوں کو چیرتی ہوئی گزری تو حسد و آز سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا ۔۔۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے عمق میں پاگل پن رقص کرنے لگا۔ اس کے دراز بال بھیگی ہوئی گھاس سے مشابہ معلوم ہو رہے تھے، ٹم سرائے کے مالک کی لڑکی بس سے محبت کرتا تھا جس کے لب ارغوانی سے لعل و یاقوت نے کسب رنگ و نور کیا تھا ۔۔۔ !

وہ مجسم سکوت بنا قزاق کے یہ الفاظ سن رہا تھا ۔۔۔

"میری دل و جان سے عزیز محبوبہ مجھے اجازت دے کہ میں تیرے لب لعلین کا ایک بوسہ لوں، کیونکہ اے میری محبوبہ! آج رات میں ڈاکہ زنی کی ایک بڑی مہم سر کرنے جا رہا ہوں اور اس سے پیشتر کہ غازۂ صبح ظلمت شب کو پاش پاش کر دے میں سونے کی ایک بڑی مقدار اپنے پہلو میں لئے تیرے پاس لوٹ آؤں گا۔ لیکن اگر پولیس یا شاہی فوج دن بھر میرا تعاقب کرتی رہے اور مجھے پریشان کرتی رہے تو شب کو میرا انتظار کرنا جب کہ چاند اپنے احمریں ساغر سے سیمیں کرنوں کی شراب دنیا کی وسعتوں پر انڈیل رہا ہو ۔۔۔ میں ضرور چاند کی ضیا باریوں میں تجھ سے ملنے آؤں گا۔ خواہ مجھے کتنے ہی سخت ترین خطرات کا سامنا کرنا پڑے!"

وہ رکاب پر کھڑا ہو گیا لیکن اس کے لب صرف بس کے صبیح ہاتھوں کو چوم سکے، لیکن بس نے جس کا حسین چہرہ مسرت و انبساط سے چمک رہا تھا اپنے سیاہ دراز گیسوؤں کو کھڑکی سے نیچے چھوڑ دیا ۔۔۔ جوں ہی یہ سیاہ عنبر بیز گیسوؤں کا آبشار لہراتا ہوا اس کے سینے سے آ ٹکرایا۔ ...... اس نے گیسوؤں کے ان لہروں کو دیوانہ وار کئی بوسے دئے جن میں چاند کی سیمیں کرنیں ڈوب جانا چاہتی تھیں ۔۔۔ اس کے

سیاہ گیسوؤں کی لہریں چاند کی سیمین کرنوں میں نہا کر کتنی حسین ہو کر رہا معلوم ہو رہی تھیں، اپنی مہم پر جانے سے پیشتر اس نے الوداعی نظریں اپنا محبوبہ پر ڈالتے ہوئے گھوڑے کی باگ سنبھالی اور جلد ہی مغرب میں کہیں روپوش ہو گیا ـــــ تم نے چپکے سے جا کر اپنے "ناصب محبت" اور حسین لِس کی تمام و کمال گفتگو کی خبر حکومت کو کر دی تھی

(۳)

وہ ظلمت شب کے پاش پاش ہونے پر بھی نہ آیا۔ وہ اس وقت بھی نہ آیا جب شاہ عادل اپنی منزل کا آدھا راستہ طے کر چکا تھا لیکن جب سورج مغرب کی وادیوں میں کہیں اپنا منہ چھپانے دوڑا جا رہا تھا اور شام کے سائے دراز ہونے جا رہے تھے، سرائے کو آنے والی سڑک منجو و سیع قطعات زمین کے درمیان شفق کی رنگا رنگیوں کی عکاسی کر رہی تھی۔ اس وقت شاہ جارج کی فوج کا ایک دستہ قدیم سرائے کے صدر دروازہ پر آ رکا ـــــ اس دستہ کے سپاہیوں نے سرائے کے مالک کی کوئی پرواہ نہ کی اور نہ اپنے آنے ہی کی کوئی وجہ بتائی، بلکہ انھوں نے زبردستی اس کی شراب پی ـــ اور سرائے کے مالک کی لڑکی لِس کو انھوں نے بستر پر کس کر باندھ دیا، اس کے منہ پر کپڑا باندھ دیا تاکہ وہ چیخ و پکار نہ کر سکے اور اس کو کھڑکی کے قریب کھڑا کر دیا گیا ـــــ دو سپاہی اس کے دونوں بازؤں پر اپنی بندوقوں کو کھڑکی پر رکھے چھپ کر بیٹھ گئے، اور دیگر شاہی سپاہی سرائے کی دوسری کھڑکیوں میں اپنے شکار کی تاک میں چھپ کر بیٹھ گئے وہاں پر کھڑکی سے موت کھڑی جھانک رہی تھی اور وہ کھڑکی جہاں حسین لِس کو بے دست و پا کر کے کھڑا کر دیا گیا تھا، دوزخ سے مشابہ معلوم ہو رہی تھی، کیونکہ لِس کی آنکھوں کے آگے سرائے کو آنے والی سڑک دور تک نظر آ رہی تھی جس پر اب اس کا محبوب اس سے ملنے آنے والا تھا، اور وہ اس وقت کے تصور سے سہمی جا رہی تھی جب کہ اس کی نظروں کے آگے وہ خاک و خون میں لتھڑا پڑا ہوگا، اس خیال سے اس کے جسم کی نس نس سے شعلہائے محبت نکل رہے تھے جو اس کی روح کی جانب دیوانہ وار لپک رہے تھے، اُن بے درد سپاہیوں نے لِس کی غیر فانی محبت کا بے جا مذاق اڑاتے ہوئے اس کے شعریت سے پُر بدن کو رسیوں سے باندھ کر کھڑا کر دیا کہ اگر اس کا محبوب آئے تو اسے یہ معلوم ہو کہ کھڑکی میں کھڑی وہ اس کا انتظار کر رہی ہے، سپاہیوں نے ایک بندوق بھی لِس کے جسم کے پیچھے باندھ رکھی تھی جس کی نالی اس کے مرمریں جسم کو چوم رہی تھی، جب وہ یہ سب کچھ ظلم کر چکے تو انھوں نے اس کی حالت زار کو دیکھ کر فلک شگاف قہقہے لگائے اور کہا "اب کرو حفاظت اپنے محبوب کی" ـــــ لِس کی آنکھوں بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے، اُسے اب یقین ہو چلا تھا کہ بہت جلد شاہی سپاہیوں کی بندوقوں کا نشانہ بن کر اس کا محبوب اس کی نظروں کے آگے آخری سانسیں لے رہا ہوگا ـــ یکایک اس کے کانوں میں اس کے محبوب کے وہ الفاظ گونجے!

"ظلمت شب کے پاش پاش ہونے سے پیشتر میں تمہارے پاس آؤں گا تم میری راہ دیکھنا ـــ نہیں تو شب کو اس وقت میرا انتظار کرنا جب کہ چاند اپنے احمریں ساغر سے سیمین کرنوں کی شراب دنیا کی وسعتوں پر انڈیل رہا ہو ـــــ میں ضرور چاند کی ضیا باریوں میں تجھ سے ملنے آؤں گا خواہ مجھے کتنے ہی سخت ترین خطرات کا سامنا کرنا پڑے"

اس نے اپنے نگاریں ہاتھوں کو آزاد کرنے کی سعی کی لیکن سپاہیوں کے بے درد ہاتھوں نے انہیں مضبوط باندھ رکھا تھا، پھر بھی اس نے اپنے ہاتھوں کو آزاد کرنے کی مسلسل سعی کی، جسم کی تمام تر توانوں کو ہاتھوں میں سمیٹ لیا، نتیجتہً اس کی مخروطی انگلیوں سے پسینہ اور خون بہنے لگا ـــ طائر وقت کی پرواز میں کوئی فرق نہ آیا لیکن حسین لِس کو اس وقت ایک ایک گھنٹہ ایک ایک سال کے مماثل معلوم ہو رہا تھا۔

۳

آخر کار بانسہ کا غم انگیز گیت فضاؤں میں گونجا، جیسے رفتار زمانہ نے کسی آنے والے بھیانک و غم انگیز واقعہ کی پیشین گوئی کردی، انتہائی کشمکش کے بعد بس اپنی ایک انگلی آزاد کرنے میں کامیاب ہوگئی، اور اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اس کی انگلی بندوق کی لبلبی کو بہ آسانی دبا سکتی ہے، اس کے بعد وہ بالکل ساکت و صامت کھڑی ہوگئی۔ کیونکہ اب وہ اپنے ہاتھوں کو آزاد کرنے کا خطرہ مول لینا نہ چاہتی تھی مبادا کسی سپاہی کو اس کے حرکات و سکنات کی خبر ہوجائے! اس نے سرائے کو آنے والی سڑک پر ایک نظر دوڑائی جو چاندنی کی سیمین کرنوں سے ہم آغوش تھی اور جس پر کسی راہرو کے قدموں کی چاپ سنائی نہ دے رہی تھی ـــــ اس کے رگوں میں دوڑنے والے خون کی دھڑکنیں جس میں اس کے محبوب کی محبت حلول کرگئی تھی یکایک جیسے رک گئیں، کیونکہ دور اس نے گھوڑے کے ٹاپوں کی مدھم سی آواز سنی ٹپ ٹپ ..... ٹپ، اس کے دل میں اس وقت یہ خواہش کروٹ لینے لگی کہ کاش یہ تمام سپاہی بہرے ہوجائیں اور میرے محبوب کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نہ سن سکیں، اس کا محبوب ناہموار زمینوں سے گزر کر دور پہاڑ کی پیشانی پر نمودار ہوا اور اب وہ اس سڑک پر چلا آرہا تھا جو سرائے کو آتی تھی، سپاہیوں نے اپنی بندوقوں کو ٹھیک کرلیا ـــــ اب ٹاپوں کی آواز صاف سنائی دینے لگی، ٹپ ٹپ ..... ٹپ ٹپ .. ٹپ ٹپ وہ سرائے سے ابھی کچھ ہی فاصلہ پر تھا، اس وقت بس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پھیل گئیں جیسے کہ وہ اپنے محبوب کو ان میں سمیٹ لینا چاہتی ہیں، اس نے ایک گہرا سانس لیا، اس سانس کے زیر و بم میں اس کی المناک مایوسیاں اور تمنائیں ڈوب کر رہ گئیں اس کی خون آلودہ نقرئی انگلی کو حرکت ہوئی ـــــ وہ لبلبی سے جا ٹکرائی، بندوق کی ہولناک آواز فضاؤں کو چیرتی ہوئی نکل گئی وہ اپنے ساتھ بس کی روح کو بھی لیتی گئی ـــــ بس کے محبوب کو خطرہ کا علم ہوگیا، اس نے گھوڑے کی باگ موڑی اور تیزی سے مغربی کہساروں کے دامن میں کہیں روپوش ہوگیا ـــ اسے کیا معلوم کہ اس کی بے جان محبوبہ نے جس کا سر اس کے بلوریں سینہ پر ڈھلک آیا تھا اور جس کے خون سے بندوق رنگین ہوگئی تھی ـــــ اس کو بچانے کی خاطر محبت کی راہوں میں اپنی جان دے دی اور یوں اس کو آنے والے بھیانک خطرہ سے آگاہ کیا، صبح صادق تک اسے اس سانحہ کی کوئی خبر نہ ملی، لیکن جب سورج کی اولین کرنیں گیتی کو چومنے لگیں تو اس نے لوگوں کی زبانی یہ الم انگیز خبر سنی کہ کس طرح سرائے کے مالک کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی لڑکی بس نے چاند کی سیمیں کرنوں تلے اس کا انتظار کیا، اور اس کو جان لیوا خطرہ سے بچانے کی خاطر اپنی جان محبت کے دیوتا کے تندوں کی بھینٹ چڑھا دی ـــ فلک کج رفتار کی ستم ظریفی کو برا بھلا کہتے ہوئے اس نے پاگلوں کی طرح سرائے کی جانب اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑانا شروع کیا۔ گرد و غبار کے بادل اس کے ہم رکاب تھے، اس کے ہاتھ میں اس کی آبدار کٹار سورج کی تیز شعاعوں سے ٹکرا کر جگمگا رہی تھی، جوں جوں وہ سرائے سے قریب ہوتا جارہا تھا موت سے قریب تر ہوتا جارہا تھا گھوڑے کو اس نے اس طوفان خیز رفتار سے دوڑایا کہ سرائے کو پہنچتے پہنچتے مہمیز سے خون کی دھاریاں ٹپکنے لگیں، اس کا مخملی کوٹ پسینہ میں نہا کر سرخ ہوگیا تھا ـــــ بالآخر جب وہ ان شاہی سپاہیوں کے نشانہ کی زد میں آگیا تو انہوں نے بندوق کے کئی فائر کئے، یک لخت وہ اپنے گھوڑے پر سے گر پڑا ـــــ ان وحشی سپاہیوں نے اُسے کتے کی طرح مار ڈالا، سرائے کی سڑک پر وہ بے جان پڑا تھا ـــــ اس نے اپنا وعدہ وفا کیا ـــــ اس نے بس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ظلمت شب کے پاش پاش ہونے سے پہلے، بس سے

ملنے آئے گا۔ یا نہیں تو چاند کی سیمین کرنوں تلے اس نے بس سے اپنا انتظار کرنے کو کہا تھا ـــــــ اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ ضرور اس سے ملنے آئے گا خواہ اُسے کتنے ہی مہیب خطرات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے ـــــــ وہ اب بس سے مل چکا تھا۔ بس اور اس کے محبوب کی روحیں ایک دوسرے میں مدغم ہو کر شراب محبت کے پیالوں میں ڈوب چکیں تھیں!!

ـــــــ ۴ ـــــــ

"اگرچہ بس اور اس کے محبوب کو مرے ہوئے عرصہ دراز ہو گیا، لیکن اب بھی اس ماحول میں رہنے والوں کا بیان ہے کہ ہر سال سردی کے شبنمی موسم میں ایک رات کو جب کہ ہواؤں کا سیلاب برگ و بار سے ٹکرا کر شور پیدا کرتا ہے، آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں چاند کا نقرئی بجرہ بہلے ہوئے ابر پاروں پر تیرتا رہتا ہے، دور تک پھیلی ہوئی بنجر زمین کے آغوش میں سرائے کو آنے والی سڑک نور کی دیوی کے نقرئی آنچل کی طرح لہراتی رہتی ہے، اسی سڑک پر وہ قزاق گھوڑے پر سوار چلا آتا ہے، اس کا گھوڑا سرائے کے منقش پتھروں کو روندتا ہوا سرائے کے صدر دروازہ کے پاس آ کر رکتا ہے، وہ اپنے چابک کے دستہ سے سرائے کے بڑے دروازہ کو کئی بار کھٹکھٹاتا ہے، پھر ہولے ہولے سیٹی بجاتا ہے جو سرائے کے سکوت کو توڑتی ہوئی فضاؤں میں تحلیل ہو جاتی ہے ـــــ سرائے کی ایک کھڑکی میں سرائے کے مالک کی لڑکی بس کھڑی اس کے انتظار کی کٹھن گھڑیاں گن گن کر کاٹتی رہتی ہے، اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کتنی حسین نظر آتی ہیں جیسے حسن و شباب کی دو گہری جھیلیں، اس وقت وہ اپنے سیاہ دراز گیسوؤں کو سنوار کر ان پر سنہری ربن باندھتی رہتی ہے۔"

(آزاد ترجمہ)

انجم صہبائی

سر سالار جنگ اعظم

(دوسرا ایڈیشن)

یہ کتاب ادارہ کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کی طرف سے شایع ہوئی ہے۔ اس کے مولف مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے ایم ایڈ ہیں۔ جن کو سوانح نگاری کا خاص ملکہ ہے اور مفید معلومات کو بڑے دلچسپ اور سادہ پیرایہ میں قلمبند کر دیا ہے۔ یہ کتاب مدرسوں کے طلبہ اور عوام کے مطالعہ کے لئے بہت ضروری ہے چھوٹی تقطیع ۴۸ صفحات۔ قیمت ۶؍

ہندوستانی تمدن

از پروفیسر ڈاکٹر انیتورا ٹو پاڈی فل ریڈر تاریخ تمدن ہند جامعہ عثمانیہ۔ یہ تقریباً پانچ سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ جس میں فاضل پروفیسر صاحب نے ہندوستان کے قدیم تمدن کو دس ابواب میں شرح و بسط اور تحقیق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر اردو تو کجا کسی اور زبان میں بھی ایسی عالمانہ کتاب اب تک نہیں لکھی گئی تھی۔ جو لوگ قدیم ہندوستان سے واقف ہونا چاہتے ہیں اس کو ضرور پڑھیں۔ صفحات (۳۴۰) قیمت ۱۲؍

تنقید و تبصرہ

کاروانِ علم ۔ مرتبہ بادشاہ حسین و فیض محمد صدیقی صاحبان ناشر ادارۂ اشاعت اُردو ۔

یہ ۱۵۰ صفحات کی ایک باتصویر کتاب ہے جس میں مشہور انگریزی کتاب بک آف نالج کی طرح طلبہ اور عوام کے لئے عام فہم انداز میں مختلف موضوعوں کی ضروری معلومات درج کی گئی ہیں۔ مضامین کی ترتیب اور تصویروں کی تیاری اور کتابت و طباعت کے لحاظ سے یہ مجموعہ معلومات جدید اردو مطبوعات میں ایک خاص اہمیت کا مالک ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مرتب صاحبان نے ابتداء میں مندرجات کی کوئی فہرست نہیں دی جس کی وجہ سے یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ اس مجموعہ میں کن کن موضوعوں پر معلومات درج ہیں۔ سب سے پہلے مرتبین نے خوش سلیقگی کے ساتھ کتاب کی اہمیت اور اردو میں اس کی ضرورت سے متعلق ایک پُر از معلومات دیباچہ تحریر کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو چھ جلدوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر جلد میں ایک ایک حصہ ہر عنوان کے لئے وقف ہے لیکن یہاں بھی عنوانوں کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ بہرحال یہ ایک قابلِ قدر کوشش ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ حسین اور فیض محمد صدیقی صاحبان کو ترتیب و تالیف کا ایک خاص ذوق ہے اور وہ علم و فضل کی ہمہ گیر شناسائی رکھتے ہیں۔ یہی اصحاب ادارۂ ادبیات اُردو کے اُردو انسائیکلوپیڈیا کے بھی معتمد ہیں اور توقع ہے کہ ان کی کوششوں کی وجہ سے اردو زبان میں اعلیٰ پائے کی حوالہ جاتی کتابوں کی جو کمی ہے وہ بہ آئین شائستہ پوری ہوجائے گی۔

جو اصحاب اپنے پڑھے لکھے بچوں کے لئے دلچسپ معلوماتی کتب کے متلاشی رہتے ہیں ان کے لئے یہ کاروانِ علم ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگا۔

جنگ کی کہانی ۔ از افضل عابدی صاحب ۔ ناشر اشاعت گھر حیدرآباد ۔

یہ ۴۲ صفحات کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس میں افضل عابدی صاحب نے بچوں کے لئے جنگ کے حالات نہایت سلیس اور شگفتہ اسلوب میں بیان کئے ہیں۔ یہ موضوع بہت مشکل تھا خاص کر عہدِ حاضر کی جنگوں کی پیچیدہ سیاست بڑوں کے لئے بھی اکثر ناقابلِ فہم ثابت ہوتی ہے لیکن افضل عابدی صاحب نے کہانی کے پیرائے میں بہت سی پیچیدگیوں کو اس طرح سے حل کردیا ہے کہ بچوں کے ساتھ ساتھ بڑے بھی ان کی اس کتاب سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔ کتاب کے آغاز میں صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب میکش کی ایک تمہید ہے جس میں بچوں سے مخاطب ہوکر صاحبزادہ موصوف نے کتاب کے موضوع کو خوبی سے واضح کیا ہے۔ اس کتاب کے اکثر حصے نشرگاہ حیدرآباد سے نشر ہوچکے ہیں۔

آفتاب ۔ مرتبہ ملک حامد حسین صاحب صدر آفتاب مجلس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

یہ کتاب علی گڑھ کے لائق طلبہ کے ان مضامین کا ایک ضخیم مجموعہ ہے جو بیسویں صدی کے اردو ادب پر لکھے گئے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ میں اب بھی ایسے ادیب اور انشاپرداز پیدا ہورہے ہیں جو اپنی فکر و نظر اور جذبۂ عمل سے نوخیز نسلوں کی قیادت کرسکیں گے۔ اس مجموعے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا ایک مبسوط مضمون ترقی پسند ادب کے عنوان سے شریک ہے جو بجائے خود ایک چھوٹی سی کتاب ہے چونکہ یہ موضوع کچھ عرصے سے اردو ادب میں معرکۃ الآرا بن گیا ہے اس لئے مناسب ہوگا اگر آفتاب مجلس کی جانب سے اس کو کتابی صورت میں علحدہ بھی شائع

کیا جائے۔ اس مجموعہ کے مرتب ملک حامد حسین صاحب نے جو مقدمہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اردو ادب کا ذوق وسیع کرنے کے لئے مفید مصروفیتیں زیر بحث ہیں اور وہاں کے طلبہ ذوق نظر کے ساتھ علمی و تنقیدی مضامین و مقالے قلمبند کرتے رہتے ہیں۔

آفتاب مجلس قابل مبارک باد ہے کہ اس نے بیسویں صدی کے اردو ادب پر اتنے اچھے مضامین لکھوا کر شایع کئے جن کی وجہ سے ادب اُردو سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کی معلومات میں کافی اضافہ ہوسکتا ہے۔

ہوس ۔ از عزیز احمد صاحب ناشر مکتبۂ جدید لاہور۔

عزیز احمد صاحب جامعہ عثمانیہ میں انگریزی کے لکچرار ہیں لیکن اُردو کا بھی بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کی چند اردو نظموں کا ایک مجموعہ "ماہ لقا" اور دیگر نظمیں ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے گزشتہ سال شایع ہوچکیں ہیں اور اس پر اس سے قبل تبصرہ بھی ہوچکا ہے۔ زیر نظر کتاب ایک ناول ہے جس میں مصنف نے آرٹ کی آڑ میں عقل و جذبات، محبت و ہوس اور مرد و عورت کے تعلقات کی کشاکش کو بڑی خوش اسلوبی سے دکھایا ہے۔ اردو میں اچھے ناولوں کی کمی ہے اور یوں بھی جب سے افسانہ نگاری مقبول ہوئی ہے ناول نگاری کی طرف سے ہمارے ادیب بے پروا ہوگئے ہیں۔ یہ ناول اپنی اعلیٰ خصوصیات کے لحاظ سے توقع ہے کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا اور ہمارے ادب کی ایک معیوب کمی اس قسم کے ناولوں سے بھی دور ہوسکے گی۔

عربوں کی قومی تحریک ۔ از مسعود عالم ندوی حجم ۴ ۶ صفحے قیمت ۸ ر پتہ مکتبۂ اُردو۔ لاہور۔

زیر نظر کتاب میں تاریخ کی روشنی میں عربوں کا ادب، ان کی تعلیم، تہذیب، سیاست، تنظیم، ترکی کے ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے عربوں پر اثرات، گزشتہ جنگ عظیم کے زمانے میں ان کی بغاوت موجودہ جنگ میں ان کے علاقوں کی حیثیت، عراق میں ان کے اتحاد کی تحریک کے نتائج غرض یہ کہ اس فاضلانہ مقالے میں عربوں کی سیاسی، قومی اور علمی تحریک کی نسبت دلچسپ پیرائے میں بحث کی گئی ہے۔

سیاست جاپان ۔ از علی امام بلگرامی ایم اے۔ حجم ۶۰ صفحے قیمت ۱ار۔ پتہ ادارۂ اشاعت اردو۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

جاپان کے تاریک دور کی اس مختصر تاریخ میں چین کے حملے کے جاپان پر اثرات، شوگنوں اور ڈائمو کا دور حکومت، شہنشاہیت کی تجدید دارالامرا اور دارالعوام کی تنظیم، سیاسی جماعتوں کا قیام، سرمایہ داری کا آغاز، فسطائی تحریک، نئے آئین کا نفاذ، جنگ عظیم کے بعد کا انقلاب، جاپان کی سیاسی حیثیت، فسطائیوں کی بغاوت، جاپانی فوج کی خصوصیت وغیرہ پر مصنف نے عام فہم زبان میں تبصرہ کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ جاپان کے حالات اور اس کی فسطائیت سے عوام کو روشناس کرایا جائے۔ اس وقت ضرورت ہے کہ اس کتاب کا عام طور پر مطالعہ کیا جائے۔

تانیا ۔ از پی لیڈوف۔ مترجمہ ساحر لدھیانوی حجم ۵۰ صفحے قیمت ۸ ر پتہ مکتبۂ اُردو لاہور۔

یہ ایک بہادر روسی لڑکی کی سرگزشت ہے جس نے نہایت دلیری سے تختہ دار پر چڑھنا پسند کیا مگر آخر وقت تک اپنے راز کو افشا نہیں کیا۔ یہ لڑکی موجودہ جنگ روس و جرمنی میں جرمنوں کے اصطبل کو آگ لگانے کی کوشش کرتے وقت پکڑی جاتی ہے اور اقسام کے مظالم برداشت کرکے تختہ دار پر چڑھ جاتی ہے۔

معیشت زر ۔ از ابن الحسن بی اے۔ حجم ۶۸ صفحے قیمت ۸ ر پتہ۔ مکتبہ اردو۔ لاہور۔

اس مختصر کتاب میں روپیہ یا زر کی ارتقائی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

زندگی نیز اس کی اہمیت اس کے فوائد اور نقصانات' اس کا استعمال اس کا معیار' کاغذی زر وغیرہ کی نسبت دلچسپ پیرایہ میں بحث کی گئی ہے۔ دورِ حاضر میں اس کتاب کے مطالعہ کی سخت ضرورت ہے۔

شانتی ۔ از بشورناتھ مدرس دھرم ونت اسکول۔ حجم ۲۴ صفحے قیمت ۲/۲ ۔ پتہ بزم ادب۔ کوٹلہ عالی جاہ۔ حیدرآباد دکن۔

بچوں کے ماہوار رسالہ "بزم ادب" کا یہ خاص نمبر ہے۔ "شانتی" ایک سبق آموز اور نصیحت خیز کہانی ہے۔ مہارانی شانتی اپنے حسن عمل سے یہ ثابت کرتی ہے کہ عورت چاہے تو مرد کو راج راجیشور بنا سکتی ہے اور چاہے تو بھکاری اور سنیاسی! نوخیز لڑکیوں کو یہ کہانی ضرور پڑھنا چاہئے۔

ایاز قدر خود بشناس ۔ از محمد شمس الدین صدیقی۔ وظیفہ یاب منصف حجم ۶ صفحے۔ غالباً مصنف سے یہ کتاب مفت مل سکتی ہے۔

محمود غزنوی کے "ایاز" سے اس کتاب کا آغاز ہوتا ہے اسی سلسلہ میں دکن کے قدیم امرا اور عہدہ داروں کے آداب شاہی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ چند رشوت خوار عہدہ داروں کے عبرت انگیز حالات بھی اس میں درج ہیں اور آخر میں جناب مصنف کے رسالہ "اعانت اخلاق" پر چند تبصرے درج ہوئے ہیں۔

پنکھڑیاں ۔ از مسٹر رحیم حسین دہلوی۔ حجم ۱۶۸ صفحے۔ قیمت عا ملنے کا پتہ۔ نیا کتاب گھر اُردو بازار۔ جامع مسجد دہلی۔

یہ مصنف کے گیارہ منتشر افسانوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ سماج کی اصلاح کے لئے ان پنکھڑیوں میں نوک خار بھی پوشیدہ ہیں۔ یوں تو ہر افسانہ دلچسپ ہی ہے لیکن سب سے زیادہ "سائنس کے کھیل" "عجیب کھیل ہیں" "گناہ غربت" بھی برا نہیں۔ "ملعون" بھی سماج کی دکھتی رگ کیلئے نشتر سے کم نہیں۔ یہ کچھ زیادہ بلند پایہ افسانے تو نہیں کہے جا سکتے لیکن بین بین ضرور ہیں۔ تاہم ذرا کچھ اور بھی گہری نظر جاتی تو اچھا تھا۔

تاریخی رومان ۔ مرتبہ جناب عبدالرحیم شبلی۔ بی۔ کام۔ ایڈیٹر "عالمگیر" و "خیام" لاہور۔ مطبوعہ عالمگیر پریس سید مٹھا بازار۔ لاہور۔

مجموعہ ہے اُردو کے پندرہ نامور ادیبوں کے لکھے ہوئے رومان کا۔ قابل مولف نے اپنی اس تالیف کو' مرزا ادیب' کے نام نامی سے معنون کیا ہے۔ جن کا ایک سنسنی خیز افسانہ 'فرعون کی محبوبہ' اس مجموعہ کی روح رواں ہے۔ افسانوں کا انتخاب بہت خوب ہے۔ یہ معاشقہ و رومان کی درد انگیز داستانیں کتنی غیر یقینی سی ہو جاتیں اگر تاریخی نہ ہوتیں! جب کہ "ہمدردی سرد مہری کا لفظ ہے۔ اس سنسار میں انتہائی مسرت اور خوشی کی ساعتیں بہت ہی محدود اور سریع الزوال ہوتی ہیں۔ رومان محض ایک اضطراری کیفیت کا نام ہے۔ فلک پیر کے ترکش میں زہریلے تیر چھپے ہوئے ہیں" —— تو یہ خواب اور افسانہ بنی ہوئی وارداتیں آخر بھر سے دہرائی کیوں جاتی ہیں؟

اس مجموعے کا ہر افسانہ ایک انفرادی شان رکھتا ہے۔ زبان' پلاٹ' محاکات نگاری' ادیبانہ شان غرض ہر لحاظ سے کتاب دلچسپ اور دلنشین ہے۔

علامہ اقبال ۔ از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ ایک ۱۰ ورقی ترانہ ہے جو علامہ اقبال کی شان میں ان کے فلسفہ و عرفان سے متاثر و محظوظ ہو کر خلیفہ صاحب نے لکھا ہے۔ اس کو پڑھنے سے اقبال کے صاحب موصوف کی عقیدت و خلوص کا پتہ چلتا ہے۔

قیمت ندارد۔ اتحاد پریس بل روڈ لاہور سے مل سکتی ہے۔

ادارہ

نئی کتابیں

۱۔ دروانہ (ڈرامے) از کرشن چندر قیمت عا۔ مکتبۂ ابراہیمیہ۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

۲۔ سمن پوش (افسانے) از مجنوں گورکھپوری قیمت ۱۲؍ مکتبۂ ابراہیمیہ۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

۳۔ شوہر کا روگ (ناول) از نسیم انہونوی۔ قیمت [illegible] 〃 〃 〃 〃 〃

۴۔ زنجیریں (افسانے) از محمد امین خترقپوری قیمت عا 〃 〃 〃 〃 〃

۵۔ طوفان حوادث (ناول) از شبیر حسین قیمت ۱۰؍ 〃 〃 〃 〃 〃

۶۔ کنول (نظمیں) از برق موسوی۔ قیمت ۱۰؍ 〃 〃 〃 〃 〃

۷۔ زندگی کے موڑ پر (افسانے) از کرشن چندر۔ قیمت عا 〃 〃 〃 〃 〃

۸۔ صد سلام (تسلاموں کا مجموعہ) از نواب شہید یار جنگ بہادر شہید ۱۰۲ صفحے قیمت عا۔ مشیر عالم پریس حیدرآباد۔

۹۔ مشاہیر کے رومان (افسانے) از شبلی بی۔ کام قیمت عا ادارہ ادب جدید شاہراہ عثمانی۔ حیدرآباد

۱۰۔ شرارے (نظمیں) از خورشید احمد جامی ۱۰۰ صفحے۔ ادارہ اشاعت ادب سلطان پورہ۔ 〃

۱۱۔ تذکرہ حبیبی (سوانح) از حافظ شاہ علی حیدر ۱۳۵۰ صفحے۔ قیمت [illegible]۔ کتب خانہ انواریہ۔ کاکوری۔ لکھنو۔

۱۲۔ مولانا عبید اللہ سندھی (سوانح) از پروفیسر محمد سرور ۴۰۰ صفحے قیمت للعہ۔ سندھ ساگر اکیڈیمی۔ ٹمپل روڈ۔ لاہور۔

۱۳۔ مسئلہ غذا اور قیمتوں پر نگرانی۔ از ایم زسنگ راؤ قیمت عا۔ ماڈرن بک ڈپو۔ سلطان بازار۔ حیدرآباد۔

۱۴۔ جنگ اور اغذیہ۔ از ڈاکٹر انور اقبال قریشی۔ قیمت ۱۰؍۔ ادارۂ ادب جدید۔ شاہراہ عثمانی۔ 〃

۱۵۔ ریاض مختاریہ (نواب مختار الملک مرحوم کے حالات) از دلاور علی دانش ۴۰۲ صفحے۔ قیمت للعہ۔ سب رس کتاب گھر حیدرآباد۔

۱۶۔ جاپان کی صنعتی ترقی۔ از ناصر علی لکچرار شعبۂ معاشیات جامعہ عثمانیہ ۴۷ صفحے۔ قیمت [illegible]۔ از مصنف۔

۱۷۔ مضامین اقبال (مقالات اور تقریروں کا مجموعہ) ۲۱۶ صفحے قیمت [illegible]۔ احمد حسین جعفر علی تاجر کتب چار مینار۔ حیدرآباد

۱۸۔ سیاہ کاران اعظم۔ از منشی تیرتھ رام فیروزپوری قیمت [illegible]۔ دائرہ ادبیہ۔ رام گلی لاہور

۱۹۔ کاروان (ٹیگور کے افسانے) مترجمہ گیارہ ادیب۔ قیمت [illegible]۔ دائرہ ادبیہ لاہور

۲۰۔ عشق اور موت (افسانے) از منشی تیرتھ رام فیروزپوری۔ قیمت [illegible] 〃 〃

۲۱۔ مداوا (نظمیں و مضامین) مرتبہ غلام احمد فرقت۔ ۲۴۵ صفحے۔ قیمت للعہ۔ یوسفی پریس۔ لکھنو۔

۲۲۔ لطیف النجوم۔ از حسین بخش منجم۔ قیمت [illegible] از مولف۔ پتھر گٹی۔ حیدرآباد دکن۔

۲۳۔ معیشت زر۔ از ابن الحسن ۴۶ صفحے۔ قیمت ۸؍ مکتبہ اردو۔ لاہور۔

۲۴۔ تانیا۔ مترجمہ ساحر لدھیانوی۔ قیمت ۸؍ 〃 〃 〃 〃

مرزا سیف علی خاں

ادارے کی خبریں

شعبۂ تاریخ دکن

ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ تاریخ دکن کا ایک جلسہ ۹ فروردی ۱۳۴۲ف مطابق ۸ فروری ۱۹۳۳ء بروز پنجشنبہ شام کے ساڑھے پانچ بجے دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد میں منعقد ہوا۔ حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور

مولوی خواجہ محمد احمد صاحب ایم اے مددگار ناظم آثار قدیمہ

مولوی میر محمود علی صاحب ایم اے لکچرار تاریخ سٹی کالج

مولوی محمد غوث صاحب ایم اے۔

مولوی سید سراج الدین صاحب ایم اے لکچرار تاریخ جامعہ عثمانیہ۔

مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی ریڈر تاریخ جامعہ عثمانیہ۔

۱۔ مجلس معتمدین شعبہ جات کی یہ تجویز پیش اور منظور ہوئی کہ شعبۂ تاریخ دکن کی اس طرح توسیع کی جائے کہ مجموعی طور پر یہ شعبۂ تاریخ دکن سمجھا جائے اور تین ذیلی شعبوں میں اس کی تقسیم ہو۔

(۱) تاریخ دکن (۲) جغرافیہ (۳) عام تاریخ۔

مضمون کے اعتبار سے ہر کمیٹی کے مختلف ارکان مقرر کئے جائیں لیکن معتمد یا داعی ایک ہی ہو جو تمام کمیٹیوں کے انتظام اور انصرام کے فرائض انجام دے۔

۲۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور اور مولوی خواجہ محمد احمد صاحب کی تحریک و تائید سے یہ طے پایا کہ پہلی کم از کم ایک مرتبہ تاریخ دکن کا ایک جلسہ عام منعقد کیا جائے۔

اس جلسہ میں پہلے شعبۂ تاریخ کی روداد سنائی جائے جو معتمد کے فرائض میں داخل ہے نیز حسب ذیل اصحاب سے مقالے پڑھنے کی درخواست کی جائے۔

نواب عنایت جنگ بہادر

نواب سر نظامت جنگ بہادر

مولوی غلام احمد خاں صاحب

مولوی خواجہ محمد احمد صاحب

مولوی مرزا نجف علی خاں صاحب

مولوی محمد غوث صاحب

مولوی علی اصغر صاحب بلگرامی

مولوی میر محمود علی صاحب

یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ سب اصحاب پہلے ہی جلسہ میں اپنے مقالے پڑھیں بلکہ حسب فرصت بعض اصحاب آئندہ جلسوں کے لئے اپنے مقالے تیار کر سکتے ہیں۔

یہ بھی طے ہوا کہ پہلا جلسہ مارچ میں کسی مناسب تاریخ میں منعقد کیا جائے۔

طے پایا کہ شعبۂ تاریخ دکن کے ارکان میں حسب ذیل اصحاب کا شریک کئے جائیں۔

نواب عنایت جنگ بہادر

مولوی غلام احمد خاں صاحب

مولوی مرزا نجف علی خاں صاحب۔

مولوی قاسم علی صاحب سجن لال

کتاب دل والے مولفہ مولوی سید مراد علی صاحب طالع جلسہ میں پیش ہوئی۔ اس کے متعلق طے ہوا کہ مولوی میر محمود علی صاحب اس کتاب کو پڑھ کر اس کی اشاعت کے متعلق رائے دیں۔

تاریخ سیاسیات مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی اور ہندستانی قومیت کا مسئلہ مولفہ ڈاکٹر ایشور اٹوپا صاحب کے متعلق طے پایا کہ اول الذکر شائع کی جائے اور موخر الذکر پر مولوی خواجہ محمد احمد صاحب کی رائے حاصل کی جائے۔

مولوی خواجہ محمد احمد صاحب نے تحریک کی کہ شعبہ کی طرف سے تاریخی سیاحت اور دوروں کا انتظام کیا جائے۔ اور اس سفر میں ارکان شعبہ کے علاوہ عام لوگ بھی شریک کئے جائیں تاکہ تاریخ کی دلچسپی عام ہو۔ یہ تحریک منظور ہوئی اور اس سال کے لئے حسب ذیل پیش نامہ طے ہوا۔

۱۔ پہلا دورہ مقابر قطب شاہی اور اس کے نواح۔
۲۔ دوسرا ،، قلعہ گولکنڈہ اور اس کے محلات۔
۳۔ تیسرا ،، چار مینار۔ مکہ مسجد۔ جامع مسجد اور اس کے نواح۔
۴۔ چوتھا ،، سرور نگر۔ سلطان نگر۔ منصور آباد۔ حیات نگر اور موسیٰ بوریو۔
۵۔ پانچواں دورہ قلعہ قدیم تا قلعہ گولکنڈہ۔ مسجد میاں مشک۔ حمام۔ اور دیگر آثار۔

اس اجلاس نے اس بات پر بھی غور کیا کہ مملکت آصفیہ کے آثار قدیمہ۔ مقابر۔ منادر اور قبور وغیرہ کی حفاظت سے متعلق اقدام ہونا چاہیے۔ بعض آثار فوری توجہ کے مستحق ہیں۔ مثال کے طور پر فی الحال گلبرگہ میں اسمٰعیل مخ اور سیف الدین غوری کے قبور کی حفاظت اور حیدرآباد میں خیرات خاں، منصور خاں۔ اور بہادر دل خاں کی قبور کی نشان دہی اور حفاظت ہونی چاہیے اور مناسب کتبے ان سب پر لگنے ضروری ہیں۔ اس کے متعلق یہ طے ہوا کہ محکمہ آثار قدیمہ کو توجہ دلائی جائے۔ اگر محکمہ مذکور اس کے لئے آمادہ نہیں ہے تو محکمہ کی اجازت سے ادارے کا شعبہ تاریخ اس کا انتظام کرے۔

اردو امتحانات کا | جلسہ عطائے اسناد و انعامات ۱۹۴۳ء

جلسہ تقسیم اسناد و انعامات ۱۹۴۳ء ٹاؤن ہال باغ عامہ میں بصدارت جنرل والا شان شہزادہ ڈاکٹر معظم جاہ بہادر بتاریخ ۲۲ مارچ ۱۹۴۳ء مطابق ۲۰ اردی بہشت ۱۳۵۲ف بروز جمعہ شام کے ۵ بجے منعقد ہوگا۔ جس میں جملہ کامیاب امیدواروں کو شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ اپنے دست مبارک سے اسناد و انعامات تقسیم فرمائیں گی۔

اردو امتحانات کے مرکزوں کے معتمدین سے توقع ہے کہ ان کے مرکز سے جو امیدواران ذکور اس جلسہ میں شریک ہو کر خود سند حاصل کرنا چاہتے ہوں ان کی فہرست بہ تفصیل امتحان وغیرہ ۱۲ مارچ مطابق ۸ اردی بہشت سے پہلے ارسال کی جائے گی۔ اگر کوئی امیدوار اس جلسہ کی شرکت کے لئے حاضر نہ ہوسکتا ہو تو معتمد صاحب خود تشریف لائیں یا کسی معتبر نمائندہ کو منتخب کر کے جلسہ میں شرکت کے لئے روانہ کریں تاکہ مرکز کی جملہ اسناد شہزادی صاحبہ موصوفہ کے دست مبارک سے جلسے ہی میں دی جائیں۔

اگر کسی مرکز سے جلسے میں کوئی بھی امیدوار شریک نہ ہو تو اسناد اور انعامات کی روانگی میں تعویق عمل میں آئے گی۔ کوشش کی جائے کہ ہر مرکز کے زیادہ سے زیادہ امیدوار شریک ہو کر سند حاصل کریں۔ ان کے نہ آنے کی صورت میں معتمد صاحب ضرور تشریف لائیں۔

معتمد صاحب یا مرکز کے کسی ایک نمائندہ کے قیام و طعام کا انتظام منجانب ادارہ کیا جائے گا۔

[illegible]

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible] ہے۔
[illegible] جناب [illegible] کی
سرپرستی میں [illegible]
حاصل کریں گے جس طرح محکمۂ تعلیمات میں حاصل
[illegible] تھی۔
معتمد صاحب نے ۱۹۴۳ء کے لئے ادارہ کا موازنہ پیش
کیا جو بعض ردوبدل و ترمیم منظور ہوا۔
۴۔ شعبہ جات ادارہ میں تبدیلی سے متعلق مجلس معتمدین
شعبہ جات کی سفارشات شریک ایجنڈا تھیں لیکن ان کو آئندہ جلسہ
کے لئے ملتوی کیا گیا۔
۵۔ اراضی قلعۂ گولکنڈہ پر تاریخی نمائش گھر کی تعمیر کے کام کے
آغاز اور حصول رقم کے لئے نواب زین یار جنگ بہادر کے مشورہ
سے ایک فنڈ کھولنے کی منظوری دی گئی۔
۶۔ ۱۹۴۳ء کے لئے کسی رفیق ادارہ کا انتخاب عمل میں
نہیں آیا۔
۷۔ مولوی سید محمد اعظم صاحب نے مجلس انتظامی کی شرکت
کے سلسلے میں جس معذرت اور استعفاء کا اپنے خط میں ذکر
کیا تھا اس کے متعلق طے پایا کہ کسی موقع مناسب پر غور کیا جائے گا۔
۸۔ ادارے کے جلسۂ تقسیم اسناد و انعامات ۱۹۴۳ء
کے انعقاد کے لئے ۲۲ر مارچ کی تاریخ مقرر کی گئی اور طے پایا کہ
شہزادۂ والاشان ڈاکٹر نواب معظم جاہ بہادر سے صدارت کی
اور شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ سے تقسیم اسناد کی استدعا
کی جائے۔
۹۔ ادارے کے شعبۂ تاریخ و امتحانات کی جانب سے
حسب ذیل کتابیں اشاعت کی سفارش کے ساتھ پیش ہوئیں۔

۱۔ تاریخ سیلمیات از عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی۔
۲۔ حیات مہر چند از مولوی اکبر الدین صاحب صدیقی ایم اے۔
۳۔ آل والوں کی تاریخ از مولوی مراد علی صاحب طالع [illegible]۔
۴۔ ہندوستانی قومیت کا مسئلہ از ڈاکٹر [illegible] پی ایچ ڈی۔
اول الذکر تین کتابوں کی اشاعت کی منظوری دی گئی
اور آخری کتاب کی نسبت طے پایا کہ مولوی سید علی اکبر صاحب کی
رائے کے بعد شائع کی جائے۔
۱۰۔ ادارہ کی حسب ذیل نئی شاخوں کے قیام کی توثیق
عمل میں آئی۔
۱۔ ننگر کرنول۔ ۲۔ کریم نگر۔ ۳۔ [illegible] نظام الدین۔ ۴۔ الیٹ محل (برار)
۵۔ کھام گاؤں (برار)۔
۱۱۔ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی صدر شعبۂ اردو علیگڑھ
کی یہ تحریک معتمد ادارہ نے پیش کی کہ حیدرآباد میں ادارہ کی جانب
سے اساتذہ و ارباب اردو کا ایک ایسا اجتماع منعقد کیا جائے
جس میں قدیم و جدید دکن کی اردو خدمات کا جائزہ لیا جائے۔
اس سلسلہ میں مولوی آل احمد صاحب سرور ایم اے استاد اردو
علی گڑھ کا مرسلہ خاکہ و نظام العمل پڑھ کر سنایا گیا۔ کافی غور و خوض
کے بعد طے پایا کہ یہ اجتماع ادارے کی جانب سے ماہ دسمبر میں
کیا جائے اور اس سلسلہ میں ایک وفد صدر اعظم بہادر سے ملاقات
کرے تاکہ وہ اس اجتماع کی سرپرستی فرمائیں۔ اس کے انتظامات
کے لئے حسب ذیل اصحاب کی ایک کمیٹی منتخب کی گئی تاکہ صدر اعظم بہادر
کی سرپرستی حاصل کرنے کے بعد انتظامات کا آغاز کرے۔
۱۔ نواب لیاقت جنگ بہادر۔ ۲۔ نواب زین یار جنگ بہادر
۳۔ مولوی سید علی اکبر صاحب۔ ۴۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب
قادری زور۔

۱۲. شعبۂ تاریخ کی مجلس انتظامی نے نواب علی یاور جنگ بہادر کی صدارت میں اپنا سالانہ جلسہ منعقد کرنے کی جو تجویز کی تھی اس کے انعقاد کی منظوری دی گئی۔

دیوان زادہ

شاہ ظہور الدین حاتم دہلی کے پہلے اردو شاعر اور استاد الاساتذہ تھے۔ چنانچہ مرزا رفیع سودا اور عبدالحی تاباں جیسے متعدد شعرا انہی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے تقریباً سو سال کی عمر پائی اور دہلی میں اردو شاعری کے آغاز و ارتقا و اصلاح میں بڑا حصہ لیا۔ اپنے ستر سالہ عہد شاعری میں انھوں نے اردو زبان اور شعر و سخن کے کئی ارتقائی مدارج دیکھے اور ان کی تعمیر میں آخر وقت تک مصروف رہے۔ انھوں نے کئی دیوان مرتب کئے تھے لیکن آخر عمر میں ان سب دواوین کا انتخاب خود بنفس نفیس کیا تھا اور اس اپنی پوری عمر کی کمائی کا نچوڑ "دیوان زادہ" کی شکل میں چھوڑ گئے۔

دیوان زادہ کا اصل نسخہ جو خود شاہ حاتم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہے جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے اپنے قیام یورپ کے زمانہ میں نقل کرلیا تھا۔ اور یورپ سے واپسی کے بعد دہلی کے اس مشہور شاعر پر ان کا ۱۰ صفحات کا ایک طویل مضمون ہندستانی اکیڈیمی کے ترجمان "ہندستانی" میں شائع ہوچکا ہے۔ اور اس زمانے سے ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے دیوان زادہ کی طباعت کا کام بھی شروع ہوچکا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف کی گوناگوں مصروفیات کے باعث رکا رہا۔ اب یہ کتاب چھپ چکی ہے اور غالباً آئندہ ماہ میں شائع ہوجائے گی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے ڈیڑھ سو صفحات کا ایک بسیط مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے جس میں شاہ حاتم کے حالات اور کلام اور ان کے زمانہ کی ادبی تاریخ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

تاریخ سیاسیات

یہ کتاب دکن کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے استاد تاریخ و سیاسیات مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی کی تالیف ہے جو ادارے کی جانب سے زیر طبع ہے۔ توقع ہے کہ یہ بھی آئندہ ماہ تک شائع ہوجائے۔ صدیقی صاحب کی اور کتابیں "تاریخ گولکنڈہ" "مقدمۂ تاریخ دکن" اور "اعظم الامرا ارسطو جاہ" بھی اس سے قبل ادارے کی طرف سے شائع ہوکر تاریخ دکن کی معلومات میں مفید اضافے کا باعث بن چکی ہیں۔

یہ تاریخ سیاسیات بھی ایک ضخیم کتاب ہے۔ اور اس کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ عہد حاضر تک سیاسیات نے کیا کیا مدارج طے کئے اور مختلف ممالک اور قوموں نے اس کے ارتقا میں کیا کیا حصہ لیا۔ اس کا مطالعہ ہر تعلیم یافتہ کے افادہ کا باعث ہوگا۔

یورپ جنگ سے پہلے

پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی ایم اے (آکسن) بیرسٹر لا کی پر از معلومات کتاب ہے جو کئی ماہ سے زیر طبع ہے۔ چند ہفتوں میں یہ بھی شائع ہوجائے گی۔ اس میں بعض نہایت مفید اور معلومات آفریں تصاویر بھی شریک ہیں۔

پروفیسر ہارون خاں صاحب نہ صرف تاریخ بلکہ سیاسیات اور بین قومی قانون کے بڑے ماہر ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے جنگ سے قبل کے یورپ کے چشم دید حالات اور معاملات نہایت دلاویز پیرائے میں بیان کئے ہیں۔

آبگینۂ شعر

اردو شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والوں میں یہ خبر نہایت مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ دکن کی مشہور شاعر خاتون محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر کا پہلا مجموعہ کلام مرتب ہو چکا ہے۔

محترمہ موصوفہ سے ادارے کے شعبۂ نسواں نے اوائل ۱۹۴۳ء میں خواہش کی تھی کہ وہ اپنے کلام کا مجموعہ مرتب فرمائیں۔ خوشی کی بات ہے کہ کئی بار کے تقاضے کے بعد اب محترمہ نے انتخاب و ترتیب کا کام مکمل کر لیا ہے۔ اور اب یہ مجموعہ اس قابل ہو گیا ہے کہ ادارے کی طرف سے شائع کیا جائے۔ محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ عہد حاضر میں حیدرآباد کی واحد خاتون ہیں جن کا کلام ہندوستان کے مختلف علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس آبگینۂ شعر کی اشاعت سے توقع ہے کہ جدید اردو شاعری میں ایک شائستہ اور حلاوت آمیز کلام کا اضافہ ہوگا۔

سب رس کا خاص نمبر

اپریل کا شمارہ خاص ہوگا جس کے لئے ان اصحاب کے مضامین حاصل کئے گئے ہیں جو ادبی بصیرت رکھتے ہیں۔ اس شمارے کا ایک حصہ اردو ادب سے متعلق ہے۔ اردو زبان اپنے پیچھے ایک ارتقائی پس منظر رکھتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کے ادبی رجحانات ارتقائی منازل طے کر رہے ہیں۔ ایک ایسے موقع پر جب کہ اردو ادب "آرٹ" کی حیثیت سے دو مختلف نقطۂ نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ اور نہ صرف ہمارے ادیبوں کے احساس اور شعور میں ایک ہمہ گیر تغیر پیدا ہو گیا ہے بلکہ ادب کے مختلف پہلوؤں پر تنقید بھی زیادہ شدت کے ساتھ ہو رہی ہے، سب رس کی یہ کوشش امید ہے کہ پسند کی جائے گی۔

اس شمارے کا ایک حصہ شاعر مشرق اقبال کے لئے مختص کیا گیا ہے۔ آج سے پانچ سال پہلے اپریل میں اقبال نے وفات پائی تھی۔ اس طرح ہم ان کی پائیدار یاد اور ان کے ساتھ اپنی ذہنی وابستگی کی تجدید کریں گے۔ سب رس کے اس شمارے کو اعلیٰ حالی مدیر صاحبزادہ میکش نے مرتب کیا ہے۔

بمبئی میں اردو امتحانات

تعلیم بالغاں سے دلچسپی رکھنے والے اس خبر سے خوش ہوں گے کہ بمبئی کی مشہور انجمن اسلام نے ادارے کے اردو امتحانات کا کام پورے جوش اور انہماک سے شروع کر دیا ہے۔ بمبئی اور اس کے نواح کے اصحاب اس بارے میں معتمد صاحب انجمن اسلام سے معلومات حاصل فرما سکتے ہیں اور ان پڑھوں کو پڑھا لکھا بنانے کے کام میں ان کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو ۱۹۴۳ء میں

مرتبہ خواجہ حمید الدین بی اے مہتمم

ادارۂ ادبیات اردو۔ ادارے کی مختلف مجلسوں، شعبوں اور شاخوں کی خدمت اردو زبان و ادب کا مجمل تذکرہ ہے جو (۱۰۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس سرگزشت کے مطالعہ سے ادارۂ ادبیات اردو کی سرگرمیوں اور اس کی خدمات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

یہ تذکرہ ادارے کی شاخوں اور جملہ ارکان کی خدمت میں تحفتہً پیش کیا جائے گا۔ عوام کے لئے اس کی قیمت بہت ہی قلیل یعنی (۸ر) رکھی گئی ہے۔

ادب زندگی کی تنقید ہے

بعض لکھنے والے

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی
ابوظفر عبدالواحد ایم اے
میر حسن ایم اے
مخدوم محی الدین ایم اے
سید اشفاق حسین ایم اے
بلبیر پرشاد بھٹناگر ایم اے
محمد عمر مہاجر ایم اے
خواجہ حمید الدین بی اے
وغیرہ

شاعر

حضرت علی اختر
سید محمد اکبر وفاقانی بی اے ایل ایل بی
ظہیر الدین بابر ایم اے
جمیل احمد فاروقی بی ایس سی
نظر حیدر آبادی
رفعت لئیق
وغیرہ

کہانیاں

رشید قریشی ایم اے۔ افضل عابدی۔ محبوب حسین جگر

(بعض مضامین)

ادب کا مقصد
ترقی پسند ادب
اردو ادب کے جدید رجحانات
اردو ادب اور ہندو سماج
اردو افسانے
اردو ترجمے
اردو ڈراما
اردو اور ظرافت

اقبال
اقبال کی شاعری کے بنیادی خیالات
اقبال شاعر یا مفکر؟
اقبال اور سماج
اقبال کا فلسفۂ خودی

مرتبہ۔ صاحبزادہ میکش

قیمت ایک روپیہ

نوٹ:- یہ خاص نمبر سالانہ خریداروں کو بلا قیمت دیا جائے گا۔

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	روپے	آنے	نام کتاب	صفحات	روپے	آنے
[illegible]	۸۰	۰	۸	سحر کا جادو ...	۴۸	۰	۴
[illegible]	۹۳	۰	۸	طبیعیاتی کائنات ...	۹۸	۰	۸
[illegible]	۴۰	۰	۴	متاع سخن ...	۱۲۳	۰	۱۲
[illegible]	۳۳۰	۳	۸	کیف سخن ...	۱۲۲	۰	۱۲
[illegible]	۱۶۰	۱	۰	بادہ سخن ...	۱۲۷	۰	۱۲
[illegible] ...	۱۲۰	۰	۱۲	سراج سخن ...	۱۵۴	۰	۱۲
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴	ایمان سخن ...	۱۴۰	۰	۱۲
سر سید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲	فیض سخن ...	۱۴۴	۰	۱۲
میر سالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	" دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰
محبت کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰
اقبال نمبر ...	۱۶۸	۱	۴	نذر ولی ...	۲۴۸	۲	۸
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰	گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	۰
شعرا کے عشائیے	۲۳۰	۲	۱۲	مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	من کی دنیا	۱۴۵	۱	۰
دادا بھائی ...	۱۶	۰	۲	مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	۰	محرم نامہ ...	۱۱۲	۱	۰
ارسطو جاہ ...	۶۵	۰	۶	نذر دکن ...	۱۵۴	۱	[illegible]
عماد الملک ...	۴۰	۰	۶	روح غالب	۲۴۰	۲	۸
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۵	عاصمہ ...	۲۰۰	۱	۴
" دوسری کتاب	۵۶	۰	۵	دفتری معلومات ...	۵۶	۰	۶
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۰	۱۲
فن تقریر ...	۹۲	۰	۸	نمود زندگی ...	۲۱۶	۲	۸
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	۰	۱۲
ہندستانی تمدن ...	۳۴۰	۳	۸	میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸
پودوں کی کہانی	۸۰	۰	۱۰	بلقان ...	۳۲	۰	۳
مرقا ...	۱۰۰	۱	۰	خطابیات ...	۱۱۳	۰	۱۲
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	۶	علم خانہ داری ...	۱۵۰	۱	۰
رسائل طبیہ ...	۳۱۲	۲	۸	چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۸	۱	۸
سنگ گوہریں ...	۴۰	۰	۴	انوار ...	۱۹۸	۱	۸
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۹	۱	۴	کشمش نانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	[illegible]
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	۴	کارساں دتاسی ...	۱۲۸	۱	۴
ہوش کے ناخن ...	۹۴	۱	۰	رات کا بھولا ...	۱۹۸	۱	۴
یوسف منظری قید فرنگ میں	۸۹	۱	۰	[illegible] ...	۳۲	۰	۴
شاد اقبال ...	۱۷۹	۲	۸	[illegible]	[illegible]		
آریائی زبانیں ...	۱۰۳	۱	۰	ادارہ شعر ۱۹۴۲ء میں	۴۰۰		
نظام علی خاں ...	۳۲	۰	۴	ناصر الدولہ ...	۳۲		
تذکرہ اردو مخطوطات متداول	۳۹۹	۵	۰	افضل الدولہ	۳۲		
عرب اور عربستان ...	۵۶	۰	۱۰	فوائد میر محبوب علی خاں	۳۲		

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
چندہ بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
ایک پرچے کی قیمت (۸؍)

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی
خواجہ حمید الدین بی اے

جلد (۷) — بابت اپریل ۱۹۴۴ء — شمارہ (۴)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اُردو کی کہانی

(شمالی ہند کا دور)

شمالی ہند میں اُردو ادب و شعر کی ابتدا اور فارسی کے ترک کرنے کا سبب میر نے شاعرانہ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے ۔

خوگر نہیں کچھ یونہی ہم ریختہ گوئی کے — معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

زوال گولکنڈہ کے بعد دکن کے جو اُردو شاعر شمال گئے ان کی تعداد میں (جیسے جیسے اُردو کے تذکرے دستیاب ہوتے جا رہے ہیں) اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔ ایک مصحفی ہی کے تذکرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکن کے چودہ پندرہ اردو شاعر دہلی گئے تھے جہاں انہوں نے قدر و مقبولیت حاصل کی۔ تذکرۂ اعظم الدولہ سرور سے بھی اس بارے میں اچھا مواد حاصل ہوتا ہے ۔

مصحفی کے تذکرۂ ہندی میں شمال کے تیس کے قریب ایسے شاعروں کے نام ملتے ہیں جنھوں نے دکن کا سفر کیا تھا ۔

یہ تو شاعروں کا ذکر تھا ۔ اس زمانے میں دکن کی بہت سی اُردو کتابیں بھی شمال پہنچیں۔ چنانچہ شاہانِ اودھ کے کتب خانوں میں دکن کی معتدبہ اُردو قلمی کتابیں جمع ہو گئی تھیں ۔ "اسپرنگر" کا کیٹلاگ ان کے تذکروں سے معمور ہے ۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ دکن کے اردو ادب نے شمال میں کس درجہ مقبولیت حاصل کر لی تھی ۔ اس کی شہادت اس طرح سے بھی ملتی ہے کہ یورپ کے مختلف کتب خانوں میں جو قدیم دکنی مخطوطے محفوظ کر لئے گئے ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کے کاتب شمالی ہند کے باشندے تھے اور جنھوں نے محمد شاہ کے اوائل عہد میں دکن کی ان اردو کتابوں کو نقل کیا تھا ۔

قدیم تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کی مجلسوں میں دکن کے اُردو اشعار دلچسپی سے سنے جاتے تھے اور دکنی شاعروں کی آؤ بھگت ہوتی تھی ۔ ولی نے تین دفعہ سے زیادہ دہلی کا سفر کیا اور پھر بھی جی نہیں بھرا ۔

دہلی کے شاعر ولی کی غزلوں کی تقلید میں غزلیں کہتے اور انہی کے شعروں سے اپنے مشاعروں کے لئے مصرع طرح حاصل کرتے تھے ۔ اگرچہ اب تک شمال کے اس زمانہ کے اردو شاعروں کے کلام عام طور پر دستیاب نہیں ہوئے ہیں تاہم دیوان زادۂ حاتم سے اس کے ثبوت ملتے ہیں ۔ دیوان زادہ اس عہد کی تنہا محفوظ یادگار ہے ۔ اس کا نفیس اصلی نسخہ انڈیا آفس میں موجود ہے ۔ اور اس کو نقل اور مرتب کر کے ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے ۔

دیوان زادہ کے دیباچہ میں حاتم نے ولی کی استادی کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ میں انہی کی طرز میں لکھتا ہوں ۔ اس کے علاوہ اپنی غزلوں میں ولی کی استادی کا ذکر کرتے ہیں ۔ ان کے اس انتخاب کلام میں بھی تیرہ غزلیں ایسی ہیں جن پر انہوں نے صراحت کر دی ہے کہ یہ ولی کی زمین اور تقلید میں لکھی گئی ہیں ۔ بعض شعروں میں وہ ولی سے مخاطب بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ولی کی موجودگی ہی میں لکھے گئے ہیں ۔

تذکرۂ قاسم میں ولی کی تعریف کرنے کے بعد اس زمانہ کے ایک شاعر کا مصرعہ اپنے خیالات کی شہادت کے طور پر نقل کیا گیا ہے۔ لکھا ہے کہ "پیر خاں کہترین کہ خدایش بیامرزد بسیار بہ موقع و بجا گفتہ کہ ۔

ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں"

اس زمانہ کی ایک اور تصنیف "تذکرۂ بے جگر" ہے جس کا خود مصنف کا لکھا ہوا مخطوطہ انڈیا آفس میں موجود ہے، ولی کی نسبت لکھا ہے ۔

"در حقیقت کسے کہ اسپ در میدان ہندی دوانید آن بود
فی الواقع شخصے کہ آب رفتہ باز در جوئے این زبان ہندی
رسانید، ہمان بود۔ چون در سنہ اثنا جلوس محمد شاہی
دیوان او بہ دہلی رسید موزوں طبعان بلند فکر و عالی

کاطلاں ہم عصر مثل حاتم و آبرو و فغاں وغیرہ بہ
تتبع زبانش پیرو ہم زبان شدند"
یک اور تذکرہ "طبقات سخن" میں آبرو کے ذکر میں لکھا ہے
"چوں دیوان ہندی شاہ ولی اللہ گجراتی بہ عصر
محمد شاہ بہ دہلی رسید تتبع آن شدند"
مصحفی نے اپنے تذکرۂ ہندی میں حاتم کا قول نقل کیا ہے جس سے دلی میں اُردو ادب کے آغاز پر روشنی پڑتی ہے ۔ حاتم کے ذکر میں لکھتے ہیں ۔

"روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سنہ دوم فردوس آرام گاہ
دیوان ولی در شاہجہاں آباد آمدہ و اشعارش بر زبان خورد
و بزرگ جاری گشتہ ۔ با دو سہ کس کہ مراد از ناجی و مضمون
آبرو باشد بنائے شعر ہندی را با ایہام گوئی نہادہ داد معنی
یابی و تلاش مضامین تازہ می دادیم"

ولی کے علاوہ دکن کے جن اُردو شاعروں کے کلام نے دلی میں شہرت حاصل کی ان میں فقیر اللہ آزاد اور فراقی بھی شامل ہیں ۔ میر حسن اپنے تذکرہ کے آغاز میں یہ لکھنے کے بعد کہ "باید دانست کہ ریختہ اول از زبان دکنی است" فقیر اللہ آزاد کا حال لکھتے ہیں اور پھر اس کی شاعری کی تعریف یوں کرتے ہیں ۔

"ہمراہ فراقی دکنی در شاہجہاں آباد آمدہ بود طبع موزونے
داشت و بسیار بہ فصاحت می زد خدا ایش بیامرزد"

غرض ان اسباب اور حالات کے نتیجہ کے طور پر شمالی ہند اور خاص کر دہلی میں اردو ادب کا آغاز ہوا ۔ اور فارسی کا اثر کم ہونے لگا ۔ چونکہ دکن کے اردو کلام کے اثر سے ابتدا ہوئی تھی اس لئے اول اول دکنی طرز کی پیروی کی گئی ۔ اس کے خلاف لکھنے والے کی شاعری غلط سمجھی جاتی تھی ۔ چنانچہ اس آغازی دور کے ایک مشہور شاعر شاہ مبارک آبرو نے اس کے متعلق جو نصیحت کی تھی اس کو حاتم نے اپنے دیوان زادہ کے دیباچہ میں نقل کیا ہے ۔

وقت جن کا ریختہ کی شاعری میں صرف ہے
ان سے کہتا ہوں بوجھو حرف میرا ژرف ہے
جو کہ لائے ریختہ میں فارسی کے فعل و حرف
لغو ہیں گے فعل اس کے ریختہ میں حرف ہے

لیکن شعرائے دہلی کا یہ اسلوب عرصہ تک قائم نہیں رہ سکا ۔ دکنی طرز کی پیروی ان کے لئے غیر فطری تھی ۔ اس میں بھی اظہار خیال کے لئے انہیں تکلف اور تصنع سے کام لینا پڑتا تھا ۔ اب انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنے روزمرہ میں فارسی اجزا کی آمیزش کرکے شعر لکھیں ۔ اگرچہ پہلے پہل بعض شعرائے اس کی مخالفت بھی کی مگر یہ تحریک کامیاب ہو گئی اور بہت جلد اردوئے معلی کی زبان میں شعر و شاعری ہونے لگی ۔ اس رجحان کا آغاز مرزا مظہر جان جاناں نے کیا اور اس کی ترقی عہد ناسخ تک جاری رہی ۔ حاتم نے اس تبدیلی کا ذکر اپنے دیوان زادہ کے دیباچہ میں کیا ہے اور چونکہ وہ دہلی میں اردو شاعری کے آغازی اور اصلاحی دونوں رجحانوں کی ترویج و ارتقاء کے وقت زندہ تھے اس لئے ان کا بیان اس بارے میں زیادہ دلچسپ اور مستند ہے ۔ وہ لکھتے ہیں : ۔

"دریں ولا ایں ترییت طلب از دہ دوازدہ سال
اکثر الفاظ را از نظر انداختہ لسان عربی و فارسی
کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد و روزمرۂ
دہلی کہ میرزایان ہند و فصیح گویان رند در
محاورہ دارند منظور داشتہ سوائے آن زبان
ہر دیار تا بہ ہندوی کہ آن را بھاکا گویند
موقوف نمودہ فقط روزمرہ کہ عام فہم و خاص
پسند بودہ اختیار کردہ"

پھر قدیم وجدید لفظوں کی فہرست لکھنے کے بعد کہتے
ہیں "دیوان زادہ میں قدیم یعنی دکنی طرز کے اشعار میں نے نہیں
درج کئے ہیں۔ اگر کوئی مل جائیں تو مجھے معاف کیجئے" لیکن اب
تذکروں سے حاتم کی قدیم طرز کی نظمیں بھی دستیاب ہوگئی ہیں۔
حمد و نعت پیران کی ایک نظم تذکرۂ گلشن گفتار میں منقول ہے۔
اس کے چند شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں تاکہ ظاہر ہوسکے کہ
دہلی کی ابتدائی اردو شاعری کس رنگ کی تھی اور اس کے ساتھ
ہی دیوان زادہ کی ایک نظم کے چند شعر بھی پیش کئے جاتے ہیں۔
جو ثابت کریں گے کہ لسانی تبدیلی کے رجحان نے دہلی کے ابتدائی
ادب کے اسلوب کو کس قدر بدل دیا حاتم کی ابتدائی شاعری
کا نمونہ یہ ہے:-

الٰہی داغ سیں دل کوں جلادے — برہ کی آگ مجھ تن میں لگادے
جلا جیوں شمع بھڑی اس ناتواں کوں — شرر لبریز کر ہر استخواں کوں
فنا کر عشق میں یہ جان بےتاب — کہ جیوں آتش میں گھٹ جاتا ہے سیماب
کہوں اب آپ سیں یکبار رجاؤں — پیمبر کی صفت کرنے کو دھاؤں
رکھے ہیں جس کے دروازے پہ پیشانی — سعادت جان دربانی کا عاصا
مسیحا ناک گھس تج آستاں پر — داغ اپنا چڑھایا آسماں پر
اگر تر سدرہ تھے ہر پیر جبریل — کیا علم حقیقت خوب تحصیل
نبی کی آل پر سے وار جانا — اسی بارہ پلے میں پار جانا

دلی کی یہ وہ طرز شاعری تھی جو حاتم کے آخری زمانہ
میں متروک ہوگئی تھی اور جس طرز کے کلام کا انتخاب انھوں نے
دیوان زادہ میں نہیں کیا۔ یہاں ہم دیوان زادہ کی ایک
نظم سے چند شعر پیش کرتے ہیں:—

کیا بیاں کیجئے نیرنگی اوضاع جہاں — کہ بیک چشم زدن ہوگیا عالم زیر و زبر
جن کے ہاتھی تھے سواری کو سو ان کے نہیں پاؤں — پھرے ہیں جوتے کو محتاج پڑے سرگرداں
نعمتیں جن کو میسر تھیں ہمیشہ ہر وقت — روز پھرتے ہیں پہا قوت کو اپنے حیراں

جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے اس لسانی تبدیلی کو
ابتدا میں بعض حضرات نے پسند نہیں کیا۔ تذکرۂ مخزن نکات
میں قائم نے اس کے متعلق اپنے خیالات اس طرح ظاہر کئے ہیں۔

"برشناسائے سلوک سخن مخفی و محتجب نیست کہ
از عہد عبداللہ قطب شاہ گرفتہ تا زمانۂ بہادشاہ
اول کسانے کہ شعر ریختہ گفتہ اند نستی کلام
ایں ہا بسیار مربوط و معقول است۔ ہر چند
اکثر الفاظ غیر مانوس گوش مردم مستعمل ایشاں
است لیکن چونکہ موافق زبان دکن راست و
درست است پیش ہمہ کس راہ بدو دارد"

قائم کے اس بیان کے سلسلے میں ان کا یہ اردو شعر غالباً
دلچسپی سے سنا جائے گا کہ

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ — اک بات لچر سی بہ زبان دکنی تھی

شمالی ہند کے شعرا کے طبقہ سوم یعنی میر، سودا اور سوز
وغیرہ کے ذکر سے پہلے قائم لکھتے ہیں۔

"مخفی و محتجب نماند کہ آنچہ الحال اشعار و احوال
شعرائے متاخرین نوشتہ می آید۔ طرز کلام ایشاں
نہ بروبہ شعر فارسی است۔ چنانچہ جمیع صنایع
شعری قرار دادہ اساتذۂ اسلاف است بکار
می برند و اکثرے از ترکیبات فرس کہ موافق
محاورۂ اردوئے معلی مانوس گوش می نمایند
جواز البیان می دانند۔ الا ترجمۂ زبان مغل
بہ ریختہ کردن مقبوح است۔ چہ دریں
صورت صحت زباں یکے از ہر دو نمی ماند"

گر قائم اور ان کے ہم خیالوں کے اعتراض کے باوجود شمالی
ہند کا اردو ادب فارسی سے متاثر ہوتا گیا۔ یہ رجحان اس لئے

ہی کامیاب ہو گیا کہ اس کے طرز دار مظہر جان جاناں، میر درد سودا اور درد و سوز جیسے بلند مرتبہ شاعر تھے۔

شمالی ہند کا اُردو دور تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے پہلا حصہ اس ابتدائی عہد پر مشتمل ہے جس میں حاتم، مظہر، مضمون، آبرو اور تاجی وغیرہ نے فارسی چھوڑ کر اُردو میں لکھنا شروع کیا۔ ان میں سوائے حاتم، مظہر اور آبرو کے دوسروں کو زیادہ شہرت نصیب نہ ہوئی اور اس عہد کے شاعروں کے کلام کے مجموعے بھی بہت کم دستیاب ہوتے ہیں۔

شمالی ہند کے اردو ادب کا دوسرا دور اُن اکابر پر مشتمل ہے جنھوں نے اُردو شعر و سخن کو معراج کمال پر پہنچا دیا اور آخر کار دلی کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ پہنچے اور وہاں اردو کی فضا پھیلائی۔ ان شعرا میں میر تقی میر، مرزا رفیع سودا اشرف علی خاں فغاں، محمد میر سوز، قیام الدین قائم اور میر درد خاص کر قابل ذکر ہیں۔ ان سبھوں نے مختلف اصناف سخن میں کلام لکھا اور اردو کو بہت وسیع اور مقبول بنا دیا۔

شمالی ہند میں اُردو کا تیسرا دور میر حسن، مصحفی، انشا حسرت، جرأت، رنگین اور ناسخ جیسے اساتذۂ سخن پر مشتمل ہے ان میں سے اکثروں نے میر اور سودا کی قائم کی ہوئی روایتوں میں اپنی اپنی بساط کے مطابق وسعت دی اور بعضوں نے ایسا کلام بھی لکھا جو ادب کے سبک اور ظریفانہ پہلو کو اجاگر کرنے کا باعث ہوا۔ ان میں انشا، رنگین اور جرأت کا نام سب سے نمایاں ہے۔

یہ ایک مختصر کہانی تھی شمالی ہند کے اردو ادب کی۔ اس موضوع پر بڑی بڑی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں اس لئے کہ اس دور کے شعرا میں متعدد ایسے گزرے ہیں جن میں سے ہر ایک مستقل اور جداگانہ کتاب کا موضوع بن سکتا ہے۔

سید محی الدین قادری زور

میر محمد مومن:۔ عہد محمد قلی قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ میں پیشوائے سلطنت اور وزیر مطلق تھے۔ دنیوی عروج کے علاوہ ان کی مذہبی سیادت و فضیلت بھی بہت مشہور ہے۔ انھوں نے ہزار ہا روپے کے صرفے سے ایک دائرہ بنایا تھا جس میں خاک کربلائے معلی بچھا دی تھی۔ اور یہ دائرہ اب تک "دائرہ میر محمد مومن" کے نام سے حیدر آباد میں مشہور و معروف۔ میر محمد مومن صاحب اعلی پایہ کے فارسی شاعر بھی تھے اور حیدر آباد آنے سے قبل شاہ ایران کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ ان کے نہایت تفصیلی اور تحقیقی حالات زندگی اس کتاب میں جناب ڈاکٹر زور صاحب نے اپنے دلچسپ اور مقبول عام اسلوب میں تحریر فرمائے ہیں۔ تقریباً تین سو صفحات مع تصاویر قیمت عاں۔

سب رس کتاب گھر رفعت منزل خیرت آباد سے طلب فرمایئے۔

اُردو کی کہانی

(اورنگ آبادی دَور)

سرزمینِ اورنگ آباد تقریباً ڈیڑھ دو صدی تک علم و ادب کا گہوارہ رہ چکی ہے ۔ اس مردم خیز خطے نے ایسے بلند پایہ شاعر پیدا کئے جن کی شہرت دکن سے باہر سارے ہندوستان میں پھیل گئی ۔ جب دکن پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا تو اورنگ زیب کو دکن کا صوبہ دار بنا کر بھیجا گیا اور اس نے اورنگ آباد ہی کو اپنا مرکز حکومت قرار دیا ۔ شاہجہاں کی وفات کے بعد جب اورنگ زیب عالمگیر نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو دہلی کی بجائے اورنگ آباد سلطنتِ مغلیہ کا دارالحکومت قرار پایا ۔ سیاسی نقطۂ نظر سے اورنگ آباد کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی اور سارے ہندوستان کی نظریں اس طرف اٹھنے لگیں ۔ ہندوستان کے امراء، علماء، شعرا اور شائقین جن کو سلطنتِ مغلیہ سے تعلق تھا اورنگ آباد چلے آئے اور یہیں مستقل بود و باش اختیار کی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ آباد علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا مرکز بن گیا ۔ علم و ادب کی محفلیں گرم ہونے لگیں ۔ فارسی اور اردو کے شعرا کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور گھر گھر شعر و سخن کے چرچے ہونے لگے ۔ چنانچہ اس خاک پاک سے بڑے بڑے نامور شعرا پیدا ہوئے اور انھوں نے وہ لازوال شہرت حاصل کی کہ آسمانِ شاعری پر آفتاب بن کر چمکے ۔ یہی زمانہ دراصل اورنگ آباد کے شباب کا زمانہ تھا ۔

اس دور میں اورنگ آباد نے اردو علم و ادب کے نشو و نما میں جو حصہ لیا ہے وہ تاریخ ادب اردو کا ایک درخشاں باب ہے ۔ بابائے ریختہ ولی اورنگ آبادی اور استاد تغزل حضرت شاہ سراج اورنگ آبادی اس دور کی پیداوار ہیں ۔ ان کے علاوہ کئی ایسے شاعر ہیں جو اردو شاعری میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے لیکن حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ اورنگ آباد کے عالموں اور شاعروں کا اب تک کوئی مبسوط تذکرہ نہیں لکھا گیا ۔ البتہ شعرائے اردو کے تذکروں میں ان کے چیدہ چیدہ حالات ملتے ہیں ۔ اب تک تاریخ ادب اردو کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن کسی میں بھی اس دور کے متعلق کافی معلومات یکجا نہیں کی گئیں ۔ آج سے کوئی پندرہ سولہ سال قبل حیدرآباد کے ایک خاموش اردو خدمت گزار مولوی سردار علی صاحب نے اس کمی کو محسوس کر کے "تذکرۂ شعرائے اورنگ آباد" کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس میں اورنگ آباد کے قدیم اور مشہور شاعروں کے مختصر حالات اور نمونۂ کلام درج ہے ۔ یہ تذکرہ اگرچہ مختصر ہے لیکن کافی محنت اور تحقیق کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ کوئی نوجوان ہمت اس کام کو اپنے ذمے لے اور اورنگ آباد نے اردو زبان اور شعر و سخن کی جو گراں بہا خدمات انجام دی ہیں ان سب کو یکجا کر کے ایک مبسوط تذکرہ ترتیب دے ۔ یہ کام بہت اہم ہے اور تاریخ ادب اُردو میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا ۔

اب ہم یہاں اورنگ آباد کے چند شاعروں کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے پیش کرتے ہیں ۔

وَلی | ولی اردو شاعری کے دور متوسط کا سب سے بڑا شاعر ہے ۔ تاریخ ادب اُردو میں ولی کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہی وہ پہلا شاعر ہے جس نے شمالی ہند میں اُردو شاعری کو روشناس کرایا اور اپنے کلام کے اثر سے وہاں کے شاعروں کو فارسی کی طرف سے ہٹا کر ریختہ گوئی کی طرف مائل کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم اور بابائے ریختہ کہا جاتا ہے ۔ شاہ مبارک آبرو نے جو اپنے زمانے میں ریختہ کے مسلم الثبوت شاعر تھے ولی کی کرامت کا اس طرح اعتراف کیا ہے ؎ آبرو شعر ہے ترا اعجاز پر ولی کا سخن کرامت ہے

ولی کی شاعری کی عظمت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آج تک اُردو شاعروں کے جتنے بھی تذکرے لکھے گئے ان سب میں ولی کا ذکر صفِ اولین میں کیا گیا ہے ۔ اور جملہ تذکرہ نگاروں نے ولی کی بے انتہا تعریفیں کی ہیں اور قدرت اللہ خاں قاسم نے تو مجموعۂ نغز میں پیرخاں کمترین کا

بقیہ مضمون صفحہ ۳۸ ۔ ملاحظہ فرمائیے ۔

اس کے دل و دماغ پر، اس کی قوت فکر اور قوت عمل، اس کے ذہنی رجحانات اور جمالیاتی ذوق پر بھی پڑتا ہے اور ادب اور اس کے موضوعات اور میلانات انداز بیان اور لغت بھی جو بہرحال انسان ہی کے ذہن کی تخلیق ہوتے ہیں بدلنے لگتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ انگریزوں کے دربار سے اندر سبھا ہی نکلی مسدس حالی کیوں نہیں نکلی یا اکبر جیسا طنز نگار بہادر شاہ ظفر کے زمانہ میں کیوں نہ پیدا ہوا۔ زمانہ جامد نہیں ہے وہ بدلتا رہتا ہے اور آرٹ، سماج کے پودے کی ایک ڈالی ہے۔ آج ہمارے ملک میں بھی تغیرات ہوتے چلے جارہے ہیں۔ زندگی میں جو انقلابات رونما ہو رہے ہیں ان کے ساتھ ادب کی نئی قدریں قائم کی جارہی ہیں۔ ادب کا مفہوم بدل رہا ہے۔ اس کے فرائض اور حقوق کی از سر نو جانچ ہو رہی ہے اور اس کی کوشش کی جارہی ہے کہ ادب کو سوسائٹی اور اس کے کلچر میں وہی جگہ دی جائے جس کا وہ مستحق ہے۔ جب آرٹ یا ادب پر گفتگو ہوتی ہے تو بعض لوگ اس ربط اور تعلق کو بھول جاتے ہیں جو آرٹ اور سماج میں ہے۔ سماجی تقاضوں کو نظر انداز کر کے جو ادیب اپنی ایسی ذاتی خواہشوں کا نغمۂ بے ہنگام الاپتے ہیں جو سماجی خواہشوں سے ہم آہنگ نہیں ہے تو وہ نہیں جانتے کہ کتنے بڑے سماجی جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

بعض ادیب اپنے طبقاتی تعصب کی بنا پر دانستہ یا نادانستہ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ ادیب آزاد ہے وہ جو چاہے لکھ سکتا ہے جیسا چاہے لکھ سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے۔ وہ انسانوں سے بلند و بالا ہے وہ آدمی نہیں دیوتا ہے سماجی ذمہ داریوں اور فرائض کا بار اس کے مقدس اور نازک کندھوں پر ڈالنا ادب کی ہتک کرنا اور ادیب کی انفرادی آزادی کا خون کرنا ہے۔ ایسے لوگ نہ جانے کیا ہوتے ہیں جو زندگی سے بے تعلق ہو کر خود ساختہ چار دیواری میں بیٹھے خود ہی ہنس لیتے ہیں رو لیتے ہیں اچھلتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دنیا کو ان پر انگلی اٹھانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو شاعر ہیں ادیب ہیں جو چاہے کر سکتے ہیں۔ ان بزرگوں کی نظر میں آرٹ اور زندگی ایک بے مقصد چٹان ہے جس میں نہ نمو ہے اور نہ بالیدگی۔ کاش تاریخ اور انسانی تجربہ ان کے اس ادعا کی تائید کر سکتا ہے۔

کبھی انسان نے طلسماتی حکایتوں، دیو، پریوں کے افسانوں اور ایسے فرضی قصوں سے اپنے جذبۂ حیرت کی تسکین کی جن کا وقوع اس دنیائے آب و گل میں ناممکن ہے۔ کبھی اس نے رزمیہ اور بزمیہ واقعات سے تو کبھی گل و بلبل کے پردے میں حسن و عشق کے تذکروں سے بھوک اور جنسی میلانات کی تشفی کی پستی اور ادبار کے زمانے میں اس نے جان صاحب اور جعفر زٹلی کے کلام سے بھی حظ حاصل کیا۔ مفید ہو یا مضر ہر دور میں کسی نہ کسی مقصد ہی کے تحت ادب پیدا ہوتا گیا۔ مقاصد کا معین کرنے والا انسان ہوتا ہے اور انسان اپنی سماجی ضرورتوں کے دباؤ سے مقاصد کا تعین کرتا ہے آج کل ہمارا ادبی ذوق بڑی تیزی سے بدلتا جارہا ہے۔ ادب محض دل بہلاوے کی چیز نہیں سا دل بہلاوے کے علاوہ اس کا کچھ اور مقصد بھی ہے وہ اب محض حسن و عشق کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ان کا محاکمہ کرتا اور ان کو حل کرتا ہے بہتر بننے کی خواہش ہر انسان میں موجود ہوتی ہے ہم یہ جو گرد رہیاں ہیں وہ کسی مرض کی طرح چمٹی ہوئی ہیں جیسے تندرستی ایک فطری امر ہے اور بیماری غیر فطری۔ اس طرح ذہنی اور سماجی صحت بھی فطری بات ہے۔ ہم ذہنی اور اخلاقی پستی سے اس طرح مطمئن نہیں ہو سکتے جیسے کوئی مریض اپنے مرض سے مطمئن نہیں ہوتا۔ اخلاقیات اور ادبیات کا مشن جدا جدا نہیں۔ ہاں طرز بیان جدا ہے۔ اخلاقیات نے استدلال کا راستہ اختیار کیا ہے تو ادبیات نے کیفیاتی اور حسن کا راستہ۔ انسانیت بیماریوں کو ختم کر کے صحت یاب ہونے کے لئے بے چین ہے۔ اب یہ ادیب کا کام ہے کہ وہ انسانیت

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سماج کو ترقی کے تقاضوں کو نظر انداز کرنا اور ذاتی اغراض پر جمہوری اغراض کی بھینٹ چڑھانا ہی مین آرٹ اور خالص ادب تصور کرتے ہیں ایسے ادیبوں کی مثال ان مکڑیوں کی سی ہے جو اپنے ہی پیٹ کے لعاب سے اپنے اطراف ایک جال بناتی ہیں اور لعاب ختم ہونے پر اس خود پسندی کے جال میں پھنس کر بے بسی کے عالم میں جان دیتی ہیں۔ حالانکہ ادب ایک ایسا شہد خالص ہے جو کہ زندگی کے چمن کے ہر پھول کا رس موجود ہو اور یہی ترقی پسند ادب ہے۔ اغراض و مقاصد کے دائروں کی تنگی اور وسعت کے تصادم نے ہماری زبان اور ادب کو دلچسپ تحریکوں سے روشناس کرایا ہے۔ ادب ایک ایسے دوراہے سے گزر رہا ہے جہاں ماضی اور مستقبل کی تاریکی تو تیں برسرپیکار ہیں۔ ایک طرف خود پرستی، خود نمائی اور خود غرضی مستقبل کی طرف پیٹھ کئے ترقی کا راستہ روکنے کی بے سود کوشش کر رہی ہیں تو دوسری طرف زندگی تاریخ کی بے پناہ ارتقائی قوتوں کے ساتھ رکاوٹوں کو روندتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ ایک طرف ماضی ہے تو دوسری طرف مستقبل آپ جانتے ہیں کہ فتح ہمیشہ مستقبل کی رہی ہے۔

رجعت اور ترقی کی جنگ کوئی نئی جنگ نہیں ہے۔ سماج کا ارتقاء انہیں انسداد کی باہمی آویزش کا رہین منت رہا ہے۔ انسانوں کے ابتدائی شعور سے لے کر آج تک ان کے خیالات ان کی خواہشات، ان کے احساسات ان کے جمالیاتی ذوق اور ان کے وجدان میں جو بھی تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ اسی جد وجہد کی نشانیاں ہیں جو انسانوں نے اپنے ماحول پر فتح پانے کے لئے کی ہیں۔ قدیم اور جدید کے مبہم تصادم سے پیدا ہونے والے شعلۂ حیات کو اپنے سینے میں دبائے ہوئے زندگی کا جلوس ابد کے راستوں پر ازل سے رواں دواں ہے اس ہر آن بدلتی رہنے والی دنیا میں ثبات و قرار اور کسی شئے مطلق کی تلاش کرنا اندھیرے کرے میں ایک ایسی کالی بلی کی تلاش کرنا ہے جو وہاں موجود نہیں ہے۔ اس لئے وہی ادب ترقی پسند ادب کہلایا جا سکتا ہے جو تاریخی ارتقائی قوتوں کا ہم نوا سماجی ترقی کا دلدادہ ہوتے ہوئے فنی محاسن سے آراستہ ہو۔

ہماری سماجی زندگی کئی شعبوں میں بٹی ہوئی ہے مگر ادب کا جس شعبے سے تعلق ہے وہ تہذیب یا کلچر ہے جب ہم ادب کے ذریعہ سماج کی مدد کرنا کہتے ہیں تو اس سے مراد تہذیب یا کلچر کی ترقی میں مدد ہوتی ہے۔

خود تہذیب یا کلچر آسمان سے ٹپکی ہوئی چیز نہیں ہے بلکہ وہ ہمیشہ انسانوں ہی کے بنائے ہوئے سماجی نظام کا نچوڑ یا حاصل ہوا کرتا ہے۔ کسی شخص کے خیالات اور احساسات اس کی طرز زندگی کے ہمیشہ تابع ہوا کرتے ہیں اور طرز زندگی وسائل معاش کی تابع ہوتی ہے۔ ایسے ہی مجموعی حیثیت سے کسی سماج کے ان احساسات اور خیالات کا اظہار جو اس کے ادب، مذہب، فلسفہ میں ہوا کرتا ہے اس طریقے پر منحصر ہے جو سماج نے اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لئے ضروری اشیاء کی پیدائش تقسیم اور ان کے مبادلے کے لئے جاری کی ہے۔ یہ بات اس زمانے میں تو بہت آسانی سے ہماری سمجھ میں آجاتی ہے مگر قدیم قبائلی زندگی اور زرعی تہذیبوں کے عہد میں اس حقیقت پر توہمات کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ صنعتی سرمایہ داری کے تحت پیدائش دولت کے تعلقات کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں نے ادب اور آرٹ کے مسئلے کو بھی بے حد پیچیدہ اور گراں بنا دیا ہے۔ بجائے اس کے کہ ادب بہ حیثیت مجموعی سارے سماج کا ورثہ ہوتا، ایک مخصوص طبقہ کا استحقاق بن کر رہ گیا ہے جو فراغت نصیب اور صاحب اقتدار ہے جب سے ادب نے سماج سے ناتا توڑ کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنالی ہے اس نے اپنا وہ اصلی مقام چھوڑ دیا جہاں پہنچ کر

ادب دودھیری ہو جاتا ہے جب ہم خوش حال طبقے کے ادب کو پس ماندہ غریب عوام کی فردیات' احساسات اور خیالات کے
ساتھ ملا کر دیکھتے ہیں تو ہمارے ادب کا بیشتر حصہ ایک بے وقت کی راگنی اور ایک بے جوڑ پیوند معلوم ہونے لگتا ہے۔ کیا ستم ظریفی
ہے کہ ایک سوسائٹی خود کو تہذیب یافتہ بھی کہتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک بڑی تعداد کو تہذیب سے محروم بھی رکھتی ہے۔ دولت کی
دیوالی میں افلاس کا یہ بھیانک نظارہ بڑا عبرت ناک ہے۔ اسی تضاد کا نتیجہ ترقی پسند ادب کی تحریک ہے جو یورپ' امریکہ کے اور ملکوں
کی طرح ہندوستانی ادب میں بھی جاری ہے۔ یورپ کے ترقی پسند ادیب نے ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کی داغ بیل ڈالی
جس کا مقصد فاشزم کی بڑھتی ہوئی سامراجی قوتوں کا روکنا اور انسانوں کے حقوق کی حفاظت کرنا تھا۔ مگر چونکہ سماجی حق تلفیاں
اور بے انصافیاں اس عالمگیر سرمایہ دار عہد میں کسی خاص ملک اور قوم کا عارضہ نہیں رہیں۔ اس لئے ترقی پسندی کا ادبی جہاد
دنیا کے ہر ترقی یافتہ زمانے میں شروع ہوا۔ چنانچہ اب دنیا کے سارے ترقی پسند ادیب دشمن ترقی اور دشمن عوام خبیث قوتوں کے
مقابلہ میں صف آرا اور سینہ سپر ہیں۔ انگلستان کے ممتاز ترقی پسند ادیب رالف فاکس اور کرسٹافر کاڈول نے ہسپانوی عوام کی
آزادی کے لئے فرانکو کی فوج سے لڑتے ہوئے سرزمین ہسپانیہ میں اپنی جانیں دیں۔ خود ہسپانیہ کے ترقی پسند شاعر فیدریکو گارسیا لورکا اور
لورکا کے خون کو دنیا کے عوام نہیں بھول سکتے ہیں۔

ترقی پسند ادب اپنا تاریخی فرض ادا کر رہا ہے۔ اس جہانِ گزراں میں کوئی ادب بھی جاودانی ہونے کی توقع نہیں کر سکتا۔
آج کا ادب بھی کل پرانا اور فرسودہ ہو جائے گا۔ مگر مستقبل کا نقاد اقبالؔ' جوشؔ' ٹیگورؔ' نذر السلام اور منشی پریم چند کو پڑھ کر
بیسویں صدی کے ہندوستان اس کے تمدن اس کی بے چینیوں اور رجحانات کا پتہ لگائے گا اور دیکھے گا کہ ان شاعروں اور ادیبوں نے انسانی
مفاد کو پیش نظر رکھنے میں کہاں تک اپنے فرائض انجام دئے ہیں۔

ہمارے ادب کی پیدائش اور ترقی کا زمانہ صوفیوں اور فقیروں کے عروج اور جاگیرداری نظام کے زوال کا زمانہ تھا۔ اس لئے اس کے
اندر وہ سب باتیں آگئیں جن میں زندگی سے مقابلہ اور کسی نصب العین کے لئے اٹھ کھڑے ہونے کی جدوجہد کی روح مفقود ہوتی ہے۔
آج البتہ اردو ادب بڑی بڑی تبدیلیوں سے ہم آغوش ہے شبلیؔ' حالیؔ' سرسیدؔ' آزادؔ' نذیر احمد سب نے پرانے ادب کے کھوکھلے پن
کو محسوس کیا تھا اور اس کے خالص جمالیاتی اور ادب برائے ادب کے نظریے کے مہمل اور بے معنی ہونے پر بڑی دلیری اور جوش سے اظہار
خیال کیا تھا۔ مگر اب تو زمانہ بہت بدل گیا ہے اور بڑی تیزی سے بدلتا چلا جا رہا ہے۔ ہمارے نوجوان ترقی پسند ادیب بھی ان حالات سے
غیر متاثر نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ سارے مصنفین زندگی کے جدلیاتی فلسفہ سے واقف ہیں اور اس مستقبل سے بھی بے خبر نہیں ہیں جو سماج
کے موروثی تضاد سے جنم لینے والا ہے۔ میں نے اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان نے پچھلے بیس برس میں بڑے تغیرات اور انقلابات
دیکھے ہیں۔ آزادی کے لئے عمومی تحریکوں نے ادب کو بھی کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے اس کا اندازہ آج کل کے ترقی پسند ادب سے بخوبی
ہو سکتا ہے۔ نئے ادب میں ہماری سماج کے صدیوں کے وہ ناسور بے نقاب نظر آئیں گے' جنھیں ہمارے اجداد نے کچھ تو بے علمی سے
اور شرم و حیا کے مارے چھپائے رکھا تھا۔ اب تو یہی نہیں ہے کہ مرض کی تشخیص بھی ہو چکی ہے بلکہ اس کا نسخہ بھی تجویز کر دیا گیا ہے۔ وہ
بچہ جو ایک زمانے سے زندگی کے بطن میں گردش کر رہا تھا تاریخی دائیہ جنگ کے ہاتھوں معرض وجود میں آنے کے لئے بے چین ہے جو لوگ

اب بھی ماضی ہی کے ساتھ چمٹے رہنا چاہتے ہیں وہ ماضی ہی کے ساتھ ختم بھی ہو جائیں گے۔ انسانیت کی بقا کے لئے یہ ضروری ہے کہ دنیا نئے سماجی طریقوں کے ساتھ اپنی تجدید کرے ورنہ اس کا ختم ہوجانا یقینی ہے۔ اس لئے تمام مصنفین کا یہ فرض ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ ماضی کے نظام زندگی سامراج فاشزم یا اسی طرح کے پرانے عطائی نسخوں کی تائید کریں، وہ بیمار اور مصیبت زدہ نوع انسانی کے لئے معقول اور صحت بخش طریقوں کے اختیار کرنے میں مدد کریں۔ کیونکہ انسان کی تخلیقی قوتوں کا اظہار کرنے والے ہمیشہ مصنفین ہی رہا کئے ہیں۔ ایک نئی دنیا بنانے کے لئے پرانی دنیا کا ختم ہوجانا ضروری ہے۔ اس سے پہلے کہ فرسودہ سماج کی گرتی ہوئی دیوار گر کر ہمیں بھی دبو چ لے اور کام تمام کردے، یہ اچھا ہے کہ اس گرتی ہوئی دیوار کو پہلے ہی منہدم کردیا جائے اور اسی وقت ادب برائے ادب کا فلسفہ بھی منہدم ہوجائے گا اور ادب کسی مخصوص فراغت نصیب طبقے کی جاگیر نہیں رہے گا بلکہ نوع انسانی کا ورثہ بن جائے گا۔ ادب پھر ایک بار دنیا کے ادب عالیہ کی طرح انسان کی اپنے ماحول پر فتح پانے کے لئے جدوجہد کا مظہر بن جائے گا۔

خوش قسمتی سے ہمارا ترقی پسند ادب بھی اس تعمیری خدمت کے انجام دینے میں معروف ہے۔

مخدوم محی الدین

ہمارا ادب

(ایک طائرانہ نظر)

ادب زندگی کی طرح ایک متحرک حقیقت ہے اور اس میں حیات انسانی کی طرح محسوس کرنے اور اثر قبول کرنے کی قوتیں ہیں۔ اس لئے ماحول کی تبدیلی اور زندگی کی حقیقی ضرورتوں اور عصری تقاضوں کے ساتھ اس کے محرکات اور اس کے اقدار کا بدلنا بھی ناگزیر ہے۔ جس طرح نظام زندگی کے مختلف شعبے بے شمار عوامل سے متاثر ہوتے ہیں اسی طرح ادب کو بھی مختلف عوامل کے اثرات شعوری طور پر قبول کرنے پڑتے ہیں۔ ہر وہ تحریک جو ہمارے دل و دماغ میں جگہ پا سکتی ہے، براہ راست یا بالواسطہ ادب میں داخل ہو جاتی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہر دور میں اپنے ماحول کا ساتھ دیا ہے۔ اس کی توہم پرستی، مذہبی جنون اور طلسماتی تحیر کا دور، اس کی ادبی تفریح اور دماغی تعیش کا دور، اس کے بازاری اور ہوس کارانہ عشق کا دور، ان سب کے پیچھے ایک تہذیبی اور معاشرتی پس منظر کام کرتا رہا ہے۔ انسانی تہذیب اور سماجی تقاضوں سے ادب کو علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ بدقسمتی سے ہماری تاریخیں زیادہ تر نصابی ضرورتوں کی تکمیل، تحقیقی شوق کی تسکین یا ایک فرض کی پابجائی کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ مورخ یا تو اپنے عہد کو جانبدارانہ رنگ میں پیش کرتا ہے یا پھر ماضی سے غلط نتائج اخذ کرتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تاریخوں کی تقریباً تمام کتابیں بادشاہوں اور راجاؤں کی داستانیں ہیں۔ ان کے صفحوں پر ہمیں عوام کی زندگی کے تہذیبی اور معاشرتی نقوش بہت کم ملتے ہیں۔ خوش حالی یا بدحالی کا تصور، تغیر ایوان سے پیدا کیا جاتا ہے حالانکہ تاریخ کے بنانے والے وہ عوام ہوتے ہیں جن کے گہواروں میں تہذیب پلتی اور نشوونما پاتی ہے۔ تاریخ ادب اُردو کا قصہ بھی ہم تک زیادہ تر اسی رنگ میں آیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اُردو ادب کے اولین کارنامے درباروں کی سرپرستی میں سرانجام پائے ہیں اور ان میں جگہ جگہ درباداری کے مصنوعی احساسات نظر آتے ہیں لیکن حقیقی ادب اپنے حقیقی ماحول کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ داخلی زندگی کی نمائش میں وہ کوئی بہروپ بھرے لیکن خارجی زندگی سے اس کے ذہنی ربط کی عریانی کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتی ہے۔ سودا جیسا خود پسند شاعر بھی تمام نہاد صوفیا کے تسلط کو گوارا نہیں کرتا اور اس کے خلاف ایک طنز لطیف کے طور پر کہتا ہے ؎

پوچھے ہے مریدوں سے وہ ہر صبح کو اٹھ کر | ہے آج کدھر اس کی شب روز کہاں ہے
تحقیق ہوا عرس،.... تو کر داڑھی کو کنگھی | لے خیل مریداں گئے وہ بزم جہاں ہے
ڈھولک جو لگی بجنے تو واں سب کو ہوا وجد | کودے ہے کوئی اور کوئی نعرہ زناں ہے

یہ اپنی بد دماغی کے باوجود جب اپنے بوسیدہ گھر کی لفظی تصویر اتارتا ہے تو اس میں ہمیں اس زمانے کے عوام کی بے مائیگی ایک عریاں حقیقت کے طور پر دکھائی دینے لگتی ہے۔ یا پھر مرغ بازوں کے متعلق اس کی ہجو، اس زمانہ کی معاشرت کا پردہ چاک کر دیتی ہے۔ غالب کی زبان جب قصیدہ خوانی سے تھک جاتی ہے تو وہ "گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو" جیسے استعاروں میں اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا ہے۔ بہرحال ہوائی قلابازیوں سے ٹھوس حقائق پر پردہ نہیں پڑ سکتا۔ بہرحال جو ادب اپنے آپ میں اب بھی زندگی کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ وہی ہے جس کا ماحول پر تطابق ہو سکے۔ ان تبرکات کو چھوڑیئے، جن کو "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو" کہہ کر ہم بوسہ دیتے ہیں۔ عقیدت مندی یا ماضی پرستی بہت سے معائب کو چھپا دیتی ہے۔ غالب اگر اپنے عہد سے زیادہ، موجودہ زمانے میں اپنے لئے بلند مقام رکھتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے مستقبل کی پیش رس میں مصنوعی شاعرانہ ماحول سے روگردانی کی۔ یقیناً نظیر اکبرآبادی کا کلام نصاب کی کتابوں سے ہٹ کر بھی اس لئے پڑھا جاتا ہے کہ اس نے شعری زمین کے لئے آسمان سے تارے نہیں توڑے بلکہ اپنے لئے اپنے پیش و پس سے موضوع چنے۔ غرض ادب، عوامی تہذیب اور اس کے ارتقاء کا مظہر ہوتا ہے۔

اُردو ادب پر جو مصنوعی رنگ چڑھ گیا تھا اس کو دور کرنے کی کوشش بہت پہلے سے شروع ہو گئی تھی۔ میر حسن، انیس، نظیر نے قدیم ڈگر سے ہٹ کر

نئی [illegible] زندگی کے عامل کے طور پر

استعمال کیا اس نے شاعری کے رخ کو خارجی حقیقتوں کی طرف پھیرا اور اس طرح اس نے جن کیفیات اور احساسات کی ترجمانی کی وہ اس کے اصول کا انعکاسی تاثر ہیں لیکن جرأت، انیس، نظیر کے اس بدلے ہوئے اسلوب نگارش اور خیال آفرینی کے نئے سانچے، حالات کی نامساعدت میں غرق ہو گئے ان کے رجحان نے باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار نہیں کی بلکہ ان کا شعر و فکر کا سرمایہ، اردو ادب کے مستقبل کی اولین بنیاد کے طور پر رہ گیا۔ انہوں نے دور کے آنے والوں کے لئے مشعل روشن کی لیکن ان کے ساتھ والے اس روشنی میں صحیح منزل کی جستجو نہ کر سکے۔

دہلی کے لکھنؤ کی تعطل کی وجہ سے ایک عام ذہنی انحطاط کا دور رہا اور یہ دور اس وقت ختم ہوا جب ۱۸۵۷ء کے نشتر نے غفلت اور واماندگی کے مواد فاسد کو نکال دیا۔ ہندوستانیوں کے شعور اور احساس میں ایک تازہ روح کروٹیں لینے لگی۔ جدید اور قدیم تہذیبوں میں ایک عبرت آفریں تصادم ہوا جس سے منجمد ماحول میں ایک ہلچل سی پیدا ہوئی۔ سیاسی بیداری نے ادب کے پیش پا افتادہ گھسے پٹے موضوعات پر تجدید زندگی کا پرچم کھولا، معاشرتی زندگی کا انقلاب ایک دھماکے کی صورت میں نمودار ہوا۔ ایک طرف مغربی اثرات اور دوسری طرف مشرقی تہذیب کے تحفظ کے جذبے نے انتہا پسند نقاط نظر پیدا کر دئے۔ بعضوں کو جدید روشنی میں آنکھوں کو چندھیا دینے والی چیز بھیانک معلوم ہونے لگی اور بعضوں نے یہ خیال کیا کہ اس روشنی سے آنکھیں پھوٹ جائیں گی۔ غرض یہ کہ یہ کشمکش مستقبل کو بنانے میں بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ اسی دور میں بعض حقیقت پسند ادیبوں نے حقیقی ماحول میں زندگی کے تقاضوں کی طرف نظر ڈالی اور کمزوریوں کی اصلاح اور صحیح منزل کی تلاش میں آگے بڑھے۔ ان مصلحین میں سرسید احمد خاں کا نام سرفہرست ہے جنہوں نے اپنی ہمہ گیر توجہ سے اصلاحی اقدام اور اصلاح کے لئے ایک ماحول تیار کیا۔ ادبی اصلاح کی تحریک حالی اور آزاد نے شروع کی۔

حالی نے ادب کی حقیقت کو بدلتے ہوئے ماحول کی روشنی میں سوچا اور اس سے اہل ملک کو بھی واقف کرانے کی کوشش کی۔ مقدمۂ شعر و شاعری میں ادب کے محرکات اس کے اثرات اور اس کے مقاصد پر انہوں نے جو تنقیدی بحث کی ہے،......... اسی کے سہارے اردو ادب کے جدید رجحان نے پہلی انگڑائی لی۔ حالی خود شاعر و ادیب کی حیثیت سے اردو ادب کے عبوری دور کے طرح انداز ہیں۔ انہوں نے شاعری کو صناعی کی بجائے اظہار حقیقت کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی۔ غرض یہ کہ حالی نے اصول اور عمل کے ذریعے اردو ادب کو حقائق نگاری کی طرف پھیر دیا۔ خوش قسمتی سے اس تحریک کو آگے بڑھانے میں شبلی، اسمٰعیل میرٹھی، نذیر احمد، محسن الملک اور ذکاء اللہ جیسے مخلص رفیق کار مل گئے۔ ان کے اشتراک عمل اور خلوص نے اس تحریک کو سارے ہندوستان میں پھیلا دیا اور فکر و نظر میں ایک تبدیلی پیدا کر دی اور اردو ادب میں سب سے پہلے غایت اور مقصد کے تحت واقعیت پسندی اور حقیقت نگاری کا رجحان پیدا ہوا۔ لیکن اردو ادب کا یہ عبوری دور جسے اصلاحی دور کہنا چاہئے جس تیزی سے شروع ہوا تھا، اسی تیزی سے اس کے خلاف ایک رد عمل بھی شروع ہوا ایک طرف جدید رجحانات کا یہ دھارا بڑھ رہا تھا اور دوسری طرف رجعت پسندی کا اندھیرا بھی گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اس زمانے میں بھی داغ، امیر مینائی، جلال لکھنوی وغیرہ شاعروں کی رونق بڑھا رہے تھے ان کے ساتھ بہت سے لوگ لکیر پیٹنے میں مصروف تھے۔

حالی کی متوازی خط پر اکبر الہ آبادی کے جراحت پاش قہقہے بھی اس تہذیب پر طنز کی کنکریں پھینک رہے تھے جس کو زندگی قبول کر رہی تھی۔ غرض یہ کہ تصورات کے اس ہجوم میں تبدیلی اور تغیر کے یہ نقوش صرف اپنی جگہ ابھر کے رہ گئے اور عام رجحان ان کے دائرے میں نہ آسکا۔ سرسید، حالی اور شبلی کی تحریریں، نذیر احمد کے افسانے آزاد اور اسمٰعیل میرٹھی کی نظمیں، ایک آنے والے دور کی نقیب ضرور بنیں لیکن حال کی فرسودگی پر ان کا کوئی دیرپا اثر نہیں پڑا۔ اردو ادب کا یہ دور دراصل بے ادبی اور تقادر کی دوسری کڑی تھی جس کو ماضی اور مستقبل کی درمیانی کڑی کہنا چاہئے۔ رجعت پسندی کے رد عمل کے باوجود تغیر کا یہ رجحان فنا نہیں ہو گیا بلکہ وہ اپنی تیز گامی کے لئے خاموشی سے تازگی حاصل کرتا رہا۔ چنانچہ بہت جلد اس ترقی کے آثار پھر رونما ہونے لگے۔ سرشار، شرر، مرزا محمد ہادی رسوا، منشی سجاد حسین وغیرہ کی وجہ سے اردو ادب کے جدید رجحانات نے پھر ایک انگڑائی لی اور یہ انگڑائی ایک مسلسل بیداری اپنے ساتھ لائی۔ لیکن ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک ہمارا ادب ایک بڑے دائرے کے اندر چھوٹے چھوٹے دائروں میں گھومتا رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلوب اور انداز فکر کا بدلتا ہوا رجحان ضرور پیدا ہو گیا تھا لیکن یہ سب کچھ قدیم طرز اور قدیم تخیل کی بدلی ہوئی شکلیں تھیں۔ ایک ایسا انقلابی دور ابھی نہیں آیا تھا جو ماضی کے خیال کو حال کے تقاضوں سے نکال دے۔ اقبال سب سے پہلا شاعر ہے جس نے ظاہر کے حصار سے اپنے ذہنی اور فکری پیکر کو نکالنا

[illegible] کے مقصد کو پیش کیا۔ اقبال نے بھی اسی دور میں زندگی لی لیکن اس کی تعلیم کا نظریہ بین الاقوامی تھا۔ یہ مجاہد ہمالیہ کو چیر کر آگے نکل گیا۔ اس نے جغرافیائی حد بندیوں سے [illegible] پیش کیا۔ [illegible] کو مقصد بنایا اور اس طرح اس نے کوشش کی کہ اسی کی مدد سے ایک نیا تصور حیات پیدا ہو جو بلند تر مستقبل کی تعمیر کے [illegible] کا احیا پیش نظر دیا۔ اسلام کا وہ مبلغ نہیں تھا بلکہ اس نے فرقہ پرستی کے ادنیٰ جذبات سے ہٹ کر انسانیت کے پیکر میں وہ [illegible] جو جمہور کو مطمئن کر سکتی ہے۔ اسلام کا فلسفۂ حیات محبت، عمل اور یقین ہے۔ وہ نسل اور رنگ کے قلعوں کو ڈھاتا ہے۔ [illegible] امتیازات اور غربت کو خود غرضی اور محرومی کے تصادم سے بچاتا ہے۔ اقبال نے اسی پیام کو دہرایا۔ اس نے کہا "اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو" اقبال کے اس نعرے کی گونج میں ہمیں وہی آواز ملتی ہے جو آج "مفادات کی ٹکر" میں دبے اور کچلے انداز سے بلند ہو رہی ہے۔ حالی اور اس کے ہم عصر ادیبوں نے اردو ادب کے کھنڈروں کی بنیادوں کو ہلا دیا تھا لیکن اقبال نے ایک نئے مزے کی کیفیت پیدا کر دی اور ان ہی کھنڈروں پر ایک تعمیر نو کا پرچم کھول دیا۔ اقبال کے مجاہدانہ نعروں اور اس کی قلندرانہ خود اعتمادی اور اس کی شاہین پرواز نے ہمارے نوجوانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ جنہوں نے غالب کی اس آرزو کو جو اس نے "کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے" کی صورت میں ظاہر کی تھی اقبال کے کلام میں صورت پذیر ہوتے دیکھا۔ ہمارے ادب نے غیر شعوری طور پر اس بیدار حوصلۂ احساس اور زندہ سلیقۂ اظہار کو قبول کیا جو اقبال کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح اقبال کی آفریدہ بجلیوں میں زوجوانوں کا خون حیات دھلتا گیا۔ رجعت پسندی کے ایڑیاں رگڑتے ہوئے ڈھانچے میں جو چند سانس سسک رہی تھیں اب ان سے زندگی کی کوئی توقع نہیں رہی۔ ان کے مقصد اور ان کی تخلیقی صلاحیت نے جمالیاتی تسکین کے توسط سے موجودہ سماجی کش مکش کا حل دریافت کرنے کی کوشش کی۔ ان کے دلوں کی یہی دھڑکنیں تعمیر جن کے ہاتھوں ہمارے موجودہ دور کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ سائنس نے سرمایہ داری کے سہارے عمرانی نشو و نما کی اجارہ داری حاصل کر لی اور طبقاتی کش مکش کا چھپا ہوا احساس نمایاں ہونے لگا۔

آرٹ کی طرح سائنس بھی سماج کی پیداوار ہوتا ہے وہ صرف تجربہ خانے کی مشغولیت نہیں بلکہ فطرت کے موافقات پر قابو پانے کی ایک مسلسل کوشش کا نام ہے۔ اس کی ابتدا انسانی بقا اور ترقی کے آلۂ کار کی حیثیت سے ہوئی اس طرح انسانی احتیاج نے انسانوں کو ہر قدم پر سائنس کا غلام بنا دیا۔ لیکن جب سرمایہ دار نظام نے صنعتی مستقبل کو اپنے ہاتھ میں لے کر اسے خود غرضانہ خواہشوں کی تکمیل کے لئے استعمال کرنا شروع کیا تو اس کے خلاف ایک عام ردِ عمل شروع ہوا۔ عوام نے دیکھا کہ سائنس کا مقصد انسانی بہبودی سے زیادہ منافع کی وہ مقدار ہے جو سرمایہ دار طبقہ کو ملتا ہے۔ غرض یہ کہ تخریبی طاقتوں نے سائنس کے بنیادی مقصد کو مسخ کر دیا اور اس طرح وہ خلیج وسیع ہو گئی جو جاگیرداری نظام کے درشت ہاتھوں سے کھودی گئی تھی۔ خوش حالی کے اجارہ داروں اور محرومی کے شکوہ سنجوں کے درمیان جو ناخوش گوار تصادم ہوا، اس میں سائنس کی اس بے راہ روی کا بڑا حصہ ہے۔ ہمارے ادیبوں نے دیکھا کہ دنیا کو سکون اسی وقت مل سکتا ہے جب کہ رنگ، نسل اور امارت کے ان گراں بار پتھروں کو راستے سے ہٹا دیا جائے جو سرمایہ داری نے ایک نمائشی تمدن کی پرداخت میں سنگ میل کے طور پر گاڑھ دئے ہیں۔

اسی احساس سے ہمارے عوامی ادب کی ابتدا ہوتی ہے۔

اس آخری دور میں پریم چند کی ادبی قیادت نے سادہ پُرکار انداز میں نئے رجحانات کو مستقل طور پر آگے بڑھانے کے لئے اقبال کا ساتھ دیا۔ اقبال نے اگر اپنے شعروں سے دلوں کو گرمایا تو منشی پریم چند نے اپنے ناولوں اور قصوں سے ایک حرارت پیدا کی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ یورپ مختلف سیاسی، معاشی اور معاشرتی تحریکوں کا جولاں گاہ بن گیا تھا۔ اور صنعتی ملکوں میں مزدوروں اور سرمایہ داروں میں

اُردو میں افسانے

کسی زمانے میں افسانہ نگاری کا مقصد تخیل کے لئے عشرت بہم پہنچانا تھا۔ زندگی کے اقدار کے بدلنے کے لئے ساتھ ساتھ یہ مقصد بھی بدل گیا ہے۔ اب ہمارے کھانے پینے کے طریقے اور سوچنے اور محسوس کرنے کے سانچے سب کچھ بدل گئے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کا جن باتوں میں جی لگتا تھا اب وہ باتیں زیادہ دیر تک ہم کو متوجہ نہیں رکھ سکتیں۔ جن مشغلوں میں وہ دن رات ڈوبے رہتے تھے۔ وہ ہمارے لئے بےکیف ہیں۔ اگلا زمانہ تخلیق محض کا معصوم زمانہ تھا۔ آج ہر چیز کی علت ہر بات کی منطق اور ہر فعل کی ایک نفسیات ہوتی ہے۔ یہ تجزیہ اور تنقید کا دور ہے۔ اب کوئی ایسی بات ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہوتی جس کا تجزیہ نہ کیا جاسکے۔ اور جس پر کوئی تنقید نہ کی جاسکے۔ افسانے کو بھی کسی نہ کسی طرح اسی میزان منطق پر اترنا ہے۔ نفسیاتی افسانہ بھی اسی جدید رجحان کی پیداوار ہے۔ اس میں واقعات سے زیادہ اہم وہ نفسیاتی محرکات ہوتی ہیں جن سے کوئی ماجرا ترتیب پاتا ہے۔ ہماری زبان میں افسانوں کی اس صنف پر ابھی ابھی توجہ کی جانے لگی ہے۔

قاضی عبدالغفار صاحب کی تصنیف لیلیٰ کے خطوط اُردو کے نفسیاتی افسانوں کے لئے نشانِ راہ ہے۔ اس کی ترتیب ان نفسیاتی عناصر سے ہوتی ہے جو لیلیٰ کے کردار کو بتاتے ہیں۔ لیلیٰ ایک بازاری عورت ہے۔ معاشرت کے ہر پہلو پر اور خصوصاً مرد کی ہوس رانی پر اس کی نفسیات میں ایک عجیب تلاطم پیدا ہوجاتا ہے۔ لیلیٰ ایک دانشمند لڑکی کے روپ میں پیش کی گئی ہے جو زندگی کی ٹھوکروں پر قہقہے لگا کر اپنے آنسو چھپاتی ہے۔ اپنے ہیجان نفس پر وہ بےحسی کا پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی ہے۔ کہیں اس کی یہ کوشش کامیاب ہوتی ہے اور کہیں جذبات ابل پڑتے ہیں۔ مجنوں کی ڈائری اسی مصنف کا دوسرا نفسیاتی افسانہ ہے۔ مجنوں عہد حاضر کا ایک کم زور دل نوجوان ہے جو جذبات کے تیز دھارے پہ بہتا ہے۔ سنبھلنے کی کوشش کرتا ہے اور سنبھلنے نہیں پاتا۔ اس کے کردار میں بھی وہی ہیجان اور ذہنی انتشار پایا جاتا ہے جس پر لیلیٰ تو قابو پالیتی تھی لیکن جو خود اس کو بے قابو کردیتا ہے۔

پروفیسر مجیب کا افسانہ "باغی" صرف تین افراد کی نفسی کیفیتوں سے بنتا ہے۔ بڑے بابو اس قصے کا مرکزی کردار ہے۔ اس کی طبیعت میں عجیب صبر آزما سکون ہے۔ جو انسان کو تنہائی میں ملا کرتا ہے اور اس کی ہستی کو باعظمت بنادیتا ہے۔ دوسرا کردار ٹکٹ بابو کا ہے۔ یہ ایک پراگندہ دل نوجوان ہے۔ جس کے نزدیک ہر معمولی واقعہ غیر معمولی ہوتا ہے۔ قصے کا ماحول آبادی سے بہت دور ایک ویران ریلوے اسٹیشن کا ہے۔ جہاں ہفتوں میں ایک آدھ بار اکادکا مسافر گاڑی سے اترتا ہے۔ اسٹیشن سے قریب ایک آم کا کنج ہے۔ آم کا کنج اس قصے کی روح رواں ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ آموں کے کنج کے آہنگ خاموش ہیں اور بڑے بابو کی روح میں کوئی ربط پنہاں ہے۔

مجیب کے آموں کے کنج میں اور ہارڈی کے The return of the Native کے Egdonheath کی چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں میں بڑی مشابہت ہے۔ نقادوں کا خیال ہے کہ ہارڈی کی یہ جھاڑیاں مشیت کی طاقت اور انسان کی تقدیر نظر آنے لگتی ہیں۔ آموں کے کنج سے بھی مصنف نے یہی تاثر پیدا کیا ہے۔ افسانہ ماحول کی اس خاموشی پر ختم ہوجاتا ہے، جس کو بڑے بابو کے سکون اور آموں کے کنج نے ایک حقیقت محکم کی حیثیت بخش دی ہے۔

نفسیاتی افسانے لکھنے والوں میں مجنوں گورکھپوری کا نام بھلایا نہیں جا سکتا۔ افسانے کے متعلق ان کا اپنا خیال ہے کہ اس کو پڑھنے والوں کو اپنی ہی بنی یا بگڑی صورتیں نظر آتی ہیں۔ فنونِ لطیفہ کی اصل غایت اس کے نزدیک یہ ہے کہ حقیقت کو بلا کم و کاست اس طرح پیش کر دیا جائے کہ دنیا اس حقیقت کو سمجھ سکے۔ اور اس کی متحمل ہو سکے۔ انہوں نے خود لکھا ہے کہ اپنے افسانوں کو وہ قصداً اور التزاماً غایتی بناتے ہیں۔ محبت ان کے افسانے کا خاص موضوع ہے۔ اس موضوع کے انتخاب کے محرکات خود ان کی زبان سے یہ ہیں کہ "میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو نظر کے سامنے رکھتا ہوں اور مشاہدہ اور مطالعے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ زندگی کی تلخ ترین حقیقت محبت ہے جو اور حقیقتوں پر محیط ہے۔" مجنوں گورکھپوری کے افسانوں میں قنوطیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ شوپنہار کا فلسفہ کہ انسان مجبورِ محض ہے جو ایک اندھی مشیت کے جبر میں رہتا ہے اور اسی جبر سے جیتا ہے، ان کے افسانوں میں بھی جاری و ساری نظر آتا ہے مجنوں کے افسانوں کے کردار قنوطیت اور الم پسندی کے باوجود زندہ کردار معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں زندگی کا احساس بہت شدید ہوتا ہے۔ زندگی کے مصائب کو بھی وہ اتنی ہی شدت سے محسوس کرتے ہیں لیکن ان کی قنوطیت اور غم پسندی غمِ حیات کو ناگزیر سمجھ کر گوارا کر لیتی ہے۔ اسی فنی کیفیت سے مجنوں کے افسانے بنتے ہیں اور ان کو اردو افسانے میں ایک مستقل مقام دیتے ہیں۔

نوجوان ادیبوں میں کرشن چندر کے نفسیاتی افسانے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں "دو فرلانگ لانبی سڑک" کرشن چندر کا ایک مختصر افسانہ ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار نچلے متوسط طبقے کا ایک دفتری نوجوان ہے۔ یہ اسی ذہنی کشمکش کا شکار ہے جو اس طبقے کی تقدیر ہے۔ "دو فرلانگ لانبی سڑک" دراصل تہذیب کے مسلسل چکر کے لئے ایک استعارہ ہے۔ اس سڑک کے دیکھتے رہنے سے نوجوان کے دل میں عجیب غریب تلاطم پیدا ہوتا ہے اور اس پر دیوانگی کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ افسانے کا پہلا تاثر جن الفاظ سے شروع ہوتا ہے اس کو مصنف کی زبان سے سنئے۔

"کچہریوں سے لے کر لا کالج تک بس یہی کوئی دو فرلانگ لانبی سڑک ہوگی ہر روز مجھے اسی سڑک پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی پیدل کبھی سیکل پر۔ سڑک کے دو رویہ شیشم کے سوکھے سوکھے اداس سے تناور درخت کھردرے تنے اور ٹہنیوں پر گدھوں کے جھنڈ سڑک صاف سیدھی اور سخت ہے۔ متواتر نو سال سے اسی پر چل رہا ہوں نہ اس میں کوئی گڑھا دیکھا ہے نہ شگاف۔ سخت سخت پتھروں کو کوٹ کوٹ کر بنائی گئی ہے۔ اب اس پر تارکول بچھی ہے جس کی بو گرمیوں میں طبیعت کو پریشان کر دیتی ہے۔"

نو سال کی طویل مدت میں اس سڑک پر اس نے جو مناظر اور کرشمے دیکھے ہیں ان سے اس کی روح اکتا چلی ہے۔ اس سڑک پر چلتے رہنا اس کو اپنی تقدیر کا ایک جبر معلوم ہوتا ہے۔ اس کی روح اس جبر کو توڑ دینا چاہتی ہے۔ قصے کے اختتام پر یہ تاثر شدید ہو جاتا ہے مصنف نے اس تاثر کو نوجوان کے الفاظ میں یوں ظاہر کیا ہے۔

"انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر اس سڑک کو ڈائنا میٹ لگا کر اڑا دیا جائے تو پھر کیا ہو۔ ایک بلند دھماکے کے ساتھ اس کے ٹکڑے فضا میں پرواز کرتے نظر آئیں گے۔ مجھے اس وقت کتنی مسرت حاصل ہوگی اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی اس کی سطح پر چلتے چلتے میں پاگل سا ہو جاتا ہوں۔ چاہتا ہوں۔ کہ اسی دم کپڑے پھاڑ کر ننگا سڑک پر ناچنے لگوں اور چلا چلا کر کہوں میں انسان نہیں ہوں میں پاگل ہوں مجھے پاگل خانے کی غلامی بخش دو۔ میں ان سڑکوں کی آزادی نہیں چاہتا۔"

کرشن چندر کا ایک اور طویل نفسیاتی افسانہ "زندگی کی موڑ پر" ہے۔ مصنف نے افسانہ شروع کرنے سے پہلے اقبال کا مصرع "منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی" لکھا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار شہر کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان پرکاش ہے جس پر انتشار اور سراسیمگی سی طاری رہتی ہے۔ تہذیب کا ستایا ہوا انسان صدیوں سے سکون کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے۔ "زندگی کی موڑ پر" میں بھی کچھ ایسی ہی جستجو اور سرگردانی کے نقوش ملتے ہیں۔ پورے افسانے میں ایک عجیب اور لطیف مزاح کا رنگ جھلکتا ہے۔ لیکن اس مزاح اور طنز کی مسکراہٹوں میں بہت سے آنسو چھپے ہوئے ہیں۔ پرکاش ایک لالۂ صحرائی ہے جس کو تہذیب کے مظالم نے کملا دیا ہے اور اس کو منزل سے دور کر دیا ہے۔ پورا افسانہ پرکاش کی اس نفسیاتی کیفیت سے مرتب ہوتا ہے اسی سلسلے میں مصنف نے متوسط طبقے کی شادی پر بھی طنز کیا ہے پرکاش کی نفسیات میں ایک طرح کا طنز شامل ہے اور زندگی کے تلخ تجربوں نے اس کو یہ طنزیاتی زاویۂ نگاہ عطا کیا ہے۔ طنز کی عادت اس کی طبیعت میں اس قدر سرایت کر چکی ہے کہ وہ اپنے رشتے کی بہن پرکاش وتی کی شادی پر جو اس کی یعنی (پرکاش وتی کی مرضی کے خلاف ہو رہی ہے) اس کے منہ پر طنز کرنے نہیں چوکتا۔ اس منظر کو مصنف کی زبان سے سنئے۔

"پرکاش وتی دوسری منزل میں ایک کمرے کے کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ پرکاش کا خیال تھا کہ وہ بہت سی لڑکیوں میں گھری ہوگی اور اس سے دو چار میٹھی میٹھی گالیاں سننے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ لیکن حسن اتفاق سے وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ پرکاش بہت خوش ہوا۔ اس نے پرکاش وتی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی حنائی انگلیوں کو زور زور سے ملنے لگا۔ لیکن پرکاش وتی بولی نہیں۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سے پرکاش وتی کی تھوڑی کو اور اونچا کیا اور کہنے لگا۔ سنتی ہو بہن جان تمہارا بھائی تمہیں بدھائی دینے آیا ہے اور تم ہو کہ اپنی آنکھوں میں آنسو روکے بیٹھی ہو۔ اور پرکاش وتی اپنی آنکھوں میں سچ مچ آنسو روکے بیٹھی تھی۔ یہ بات سنتے ہی وہ ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ پرکاش بولا تو تو کہتی تھی میں بی اے پاس کر کے نوکری کروں گی یا کہانیاں لکھوں گی اور شاعری کروں گی اب بتا یہاں تو تجھے کسی نے گیارھویں جماعت سے آگے نہیں پڑھایا اور تو تو شاید فلم ایکٹریس بننا چاہتی تھی اب وہ اداکاری کے ولولے کہاں گئے۔ تیرے وہ سونے کے تمغے جو تو نے بہلاوہ یالہ میں ناچ ناچ کر حاصل کئے تھے اب کہاں ہیں؟ پرکاش وتی نے رو کر کہا۔ اس لئے تم مجھے جلانے آئے ہو۔ کیا میں اب تم سے بھی ہمدردی کی امید نہ رکھوں۔ پرکاش چپ رہا اور چند لمحوں تک آنسوؤں کی ان ندیوں کی طرف تکتا رہا جو اپنی روانی میں زندگی کے پورے نہ ہونے والے سپنوں کو بہلئے جا رہی تھیں۔

اس افسانے میں پرکاش کے جذبات اور اس کی نفسی کیفیات کہیں بلند آہنگ ہیں تو کہیں اس میں کچھ سرگوشیاں بھی چھپی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ شادی کے بعد آخر شب میں سونے والوں کی رنگا رنگ کیفیتیں اپنے معنی کے اظہار کے لئے شرمندۂ الفاظ نہیں ہیں۔ ایک طرف پرکاش کے اپنے جذبات کا طوفان تھا جس نے اس کو رات بھر بے چین رکھا اور دوسری طرف سونے والوں کی وہ بے حسی جو تقدیر کے شاکر انسانوں پر مسلط ہو جاتی ہے۔ اس طویل افسانے میں کرشن چندر نے پرکاش کے کردار کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔ یہ قصہ پرکاش کی نفسیاتی کیفیتوں سے بنتا ہے اور اس کی نفسیاتی کیفیت ہی پر ختم ہوتا ہے۔ یہ ہماری زبان کے

جدید افسانوں کا ایک مختصر خاکہ ہے ۔ نفسیاتی افسانہ اور معاشرتی یا تخیلی افسانوں میں صرف یہ فرق ہے کہ جہاں معاشرتی افسانوں میں ذہنی میلانات اور کیفیات پس منظر میں رہتی ہیں اور قصے سے نفسیات کے بہت سے پہلو اخذ ہوتے ہیں۔ نفسیاتی افسانے میں واقعات کسی نہ کسی نفسیات کے زیرِ اثر بنتے ہیں۔ یہ نفسیات پورے قصے پر حاوی ہوتی ہے ۔ افسانہ نگار اپنے کرداروں کی کسی نہ کسی مخصوص ذہنی کیفیت اور احساس سے قصہ تیار کرتا ہے اور اسی کو قصے کے ارتقاء اور انجام کا ذمہ دار قرار دیتا ہے ۔ اسی ترتیب اور تجزیے کو آپ چاہیں تو افسانے کی داخلیت بھی کہہ سکتے ہیں ۔

محمد عمر مہاجر

رات کا بھولا اور دیگر افسانے ۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ۔ ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو، فارسی مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے ۔ جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فنِ افسانہ پر مستند کتابیں مثلاً دنیائے افسانہ اور کردار افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ اس کتاب کا ٹائٹل ملک کے بلند پایہ حسن کار مسٹر عبدالقیوم نے بنایا ہے۔ طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے ۔
صفحات ۱۶۸ قیمت عہ

محبت کی چھاؤں ۔ مرزا ظفرالحسن بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے ۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں ۔ ہر فسانہ میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کارفرما ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے ۔ چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد عہ

من کی دنیا ۔ حیدرآباد کے نوجوان افسانہ نگار رشید قریشی ایم اے کے افسانوں کا نفیس مجموعہ ہے ۔ افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں کتاب بہت دلچسپ اور اندازِ بیان نہایت شگفتہ ہے ۔

ہر فسانہ رعنائی خیال اور رنگینیٔ بیان کا بہترین نمونہ ہے ۔ اردو کے نئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور ترقی پسند نظریوں کے پرستاران افسانوں کے مطالعہ سے ضرور محظوظ ہوں گے ۔ جو اصحاب اردو کے جدید ترین افسانوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ اس نوجوان مصنف کے ان پُرکیف افسانوں سے ضرور لطف اندوز ہوں گے ۔ صفحات (۱۶۰) قیمت مجلد عہ

ہوش کے ناخن ۔ اس ڈرامے کو جامعۂ عثمانیہ کے دو بہترین انشاء پرداز میر حسن صاحب ایم اے اور مخدوم محی الدین صاحب ایم اے نے نہایت ہی محنت اور توجہ سے لکھا ہے ۔ اس میں حیدرآباد کی سماجی زندگی کو دل آویز و دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے یوں تو یہ ایک انگریزی ڈرامے سے ماخوذ ہے لیکن اس طرح اپنا کر پیش کیا گیا ہے یوں تو یہ ایک انگریزی ڈرامے سے ماخوذ ہے لیکن اس طرح اپنا کر پیش کیا گیا ہے کہ بجائے خود تصنیف ہو گیا ہے ۔ زبان سلیس مذاق لطیف اور اندازِ بیان نہایت ہی شگفتہ ہے ۔ تعداد صفحات (۹۴) قیمت عہ ۔

اُردو ڈراما

ڈراما ادبیات کا ایک نہایت اہم اور دلچسپ جزو ہے اور زندگی کی ترجمانی کے اعتبار سے ادب کا کوئی دوسرا شعبہ اس کو نہیں پہنچتا۔ اس کے دو اہم پہلو ہیں ایک تمثیلی دوسرا ادبی۔ تمثیلی پہلو نہایت قدیم ہے کسی واقعہ کی ہو بہو نقل اتارنا یا سوانگ بھرنا ہمیشہ دلچسپی اور توجہ کا باعث رہا ہے چنانچہ کم سن بچوں کا اپنے کھیلوں میں مختلف کرداروں کی نقالی کرنا اسی مشابہت پسندی کا نتیجہ ہے اسی وجہ سے غالب نے دنیا کو "بازیچۂ اطفال" اور شکسپیر نے "اسٹیج" قرار دیا ہے۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ تمثیل کا آغاز مذہبی رسم و رواج کے زیر سایہ ہوا ہے کیونکہ عوام کی مذہبی عقیدت نے اپنے اکابروں اور دیوی دیوتاؤں کی مقدس زندگی اور ان کے نیک عمل کو تمثیلی انداز میں پیش ہوتا ہوا دیکھنا ضروری گردانا۔ "رام لیلا" اس کی بڑی اچھی اور اچھوتی مثال ہے۔ اس قسم کے کھیل تماشوں کی مقبولیت کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ ہر چھوٹی بڑی تقریب کے ساتھ ان کی نمائش لازمی تھی۔ رفتہ رفتہ یہی کھیل تماشے ادبی صورت اختیار کرنے لگے اور ان میں خصوصیات بھی پیدا ہونے لگیں۔ ابتداً ان ڈراموں کا موضوع مذہبی معتقدات اور ان میں خاص طور پر دیوتاؤں کی معرکہ آرائیاں ان کے معجزات اور ان کے عشق و محبت کی داستانوں کو پیش کیا جاتا تھا اور ان میں رقص و سرود کو کوئی جگہ حاصل نہیں تھی۔ بعد کو فطرت انسانی تنوع پسندی اور جدت طرازی نے اس میں ناچ اور گانے کو بھی داخل کر دیا۔ بدھ مت کے پیشواؤں نے سب سے پہلے ڈرامے کی افادیت کو پہچانا اور اس کو اپنے عقائد کے پرچار کا ذریعہ بنایا چنانچہ راجاؤں کی سرپرستی سے تھوڑے ہی دنوں میں سارے ہندوستان میں بدھ مت کی دھوم مچ گئی اور بدھ مت عقائد اس طرح پھیل گئے جیسے بن میں آگ پھیلتی ہے۔ ڈرامے کی اس کامرانی نے عوام کا دل موہ لیا لیکن جب ہندو مت کے نئی زمانہ ردعمل سے بدھ مت کو زوال ہوا تو ڈرامے کو بھی پس پشت ڈال دیا گیا۔ اس کے علاوہ بیرونی حملہ آوروں کی یلغاروں نے بھی اہل ہند کو ڈرامے کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہ دیا اس کے یہ معنی نہیں کہ ڈراما بالکلیہ فنا ہو گیا کیونکہ عوام نے اس کو اپنے روزگار کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ "ناٹک منڈلیاں" اسی پیشہ ورانہ مقصد کے تحت قائم ہوئیں جو گاؤں گاؤں پھرتی تھیں۔ ان "منڈلیوں" کے کارندوں نے روپیہ کمانے کی فکر میں عوام کے مذاق کی آسودگی کے لئے مبتذل اور گندہ خیالات کی نمائش کی جس کی وجہ سے مذہبی پیشواؤں نے ان ڈراموں کو اخلاق سوز اور خلاف مذہب قرار دیا مگر یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں اس صنف کے اچھوتے اور نادر نمونے نہ پائے جاتے ہوں خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان نے بھی کالیداس کا سا عہد آفریں ڈراما نگار پیدا کیا جس کی ٹکر کے ڈراما نگار دنیا میں بہت کم پیدا ہوئے ہیں لیکن اُردو میں ڈرامے کی طرف بہت دیر میں توجہ کی گئی اس لئے اُردو ڈراما ابھی طفولیت ہی کے دور میں ہے۔ اسلامی بادشاہوں کے زوال کے موقع پر جب عیش و عشرت کی محفلیں اور لطف و تفریح کے مختلف اسباب پیدا ہو گئے تو ڈرامے کو بھی عیش رانوں نے تفریحی غایت کی تکمیل کے لئے چنا۔ کہا جاتا ہے کہ فرخ سیر خاندان مغلیہ کے "شاہ شطرنج" کے حکم سے نواز نامی ایک شخص نے ایک ڈراما تیار کیا جس کا سلیس اردو میں فورٹ ولیم کالج کے مشہور مترجم مرزا کاظم علی جوان نے ۱۸۰۱ء میں ترجمہ کیا ہے۔ واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ ڈراموں اور جلسوں کے بڑے دلدادہ تھے چنانچہ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے کئی ایک ڈرامے اور جلسے تیار کئے مگر ادب میں ان کا کوئی مستقل درجہ نہیں ہے لیکن اس دور کی نہایت اہم اور اَن مٹ یادگار۔ امانت کی "اندر سبھا" ہے۔ اندر سبھا کا پلاٹ یا بیرنگ ہندی دیومالا اور اسلامی روایات کے خوش گوار سنجوگ سے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ اُردو زبان کا سب سے زیادہ مقبول اور مشہور ڈراما ہے جس کا ترجمہ مشرق و مغرب کی متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے اور انڈیا آفس میں اس کے کم و بیش ۴۸ نسخے ہیں۔

اور خالص امانت ہی اُردو ڈرامے کے باوا آدم ہیں۔

اندرسبھا کے کردار دیو، پری اور اسی قسم کی مافوق فطرت ہستیاں تھیں جب پہلے پہل ان آسمانی کرداروں کو اسٹیج پر پیش کیا گیا تو عوام نے بے حد پسند کیا اس کی مقبولیت سے دوسرے ڈراما نگاروں کو بھی اس نہج پر ڈراما نگاری کا شوق ہوا لیکن جس طرح جھوٹے سکے ٹکسال میں نہیں چل سکتے اسی طرح ان حضرات کی "مصنوعی مخلوق" بھی فنا ہو گئی یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ یہ سارے ڈرامے نظم میں لکھے جاتے تھے یعنی مکالمے میں قافیہ پیمائی کی جاتی تھی یہ قدیم طرز کے ڈراموں کی نہایت اہم خصوصیت ہے اس کے علاوہ اس دور کے ڈراما نگاروں نے اپنے ڈراموں میں عوام کے مذاق کو بطور خاص ملحوظ رکھا جس کی وجہ سے ان میں سوقیانہ مذاق، فحش خیالات اور بھونڈی زبان داخل ہوگئی۔ مرزا ہادی رسوا لکھنوی نے اپنی کتاب "مرقع لیلیٰ مجنوں" میں ڈرامے کو اسٹیج پر دیکھ کر ذیل کے تاثرات سپرد قلم کئے ہیں۔

"حیران تھا کہ یہ کس شہر کی بولی ہے جو ان لوگوں کی زبان سے سنتا ہوں۔ سمجھ میں تو آتی ہے مگر اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ ایک شفیق سے معلوم ہوا کہ یہ نظم و نثر دہلی اور لکھنؤ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ بمبئی کے مچھلی بازار کی بول چال ہے۔ میں نے دل میں کہا شکر خدا کا ان جہلات کو ہماری زبان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

رسوا کی رائے کی تصدیق اس دور کے تمام ڈراموں سے ہوتی ہے اس کے علاوہ قدیم ڈراموں کا ایک اور نقص یہ ہے کہ ان کے پلاٹ بیشتر غیر ملکی قصوں اور روایتوں سے گھڑے جاتے تھے اور لطف یہ کہ ڈراما نگار ان ملکوں کی معاشرت اور تہذیب تو ایک طرف ان کے محل وقوع سے بھی قطعاً ناواقف ہوتے تھے اور ملکی آداب و معاشرت کی بے محل ٹھونس ٹھانس سے ڈرامے کو مضحکہ خیز بنا دیتے تھے۔ اس کے ساتھ عشق و محبت کے فرسودہ واقعات بڑے بھونڈے طریقے سے شریک کردئے جاتے تھے جس کی وجہ سے ڈراما اثر آفریں ہونے کی بجائے تکلفات اور تصنعات کا گورکھ دھندہ بن کر رہ جاتا تھا۔ گویا بظاہر ڈراما سب کچھ تو ہوتا تھا مگر روح مفقود ہوتی تھی۔ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، نل دمن، ہیر رانجھا، اسی دور کی پیداوار ہیں۔ اس کے بعد بعض ڈراما نگاروں نے حسن و عشق سے ہٹ کر سماجی یا موضوعی ڈرامے لکھنے کی کوشش کی جن میں دنیا کی دو رنگی، آسمان کی کج روی یا کسی اصلاحی اور اخلاقی خیال کو ڈرامائی روپ میں پیش کیا گیا اس ذیل میں قابل ذکر ڈرامے "چلتی دنیا" "کایا پلٹ" "دو رنگی دنیا" "حسن کا بازار" "پاپ کا گناہ" وغیرہ ہیں لیکن یہ سب قدیم لکیر کے پیٹنے والے تھے اور قدیم طرز کی جکڑبندیوں سے سرمو انحراف کرنے کو مہاپاپ اور مکروہ جانتے تھے۔ اس دور میں اردو ڈراما بندھے ٹکے اصولوں میں ہی جکڑا رہا۔ تاہم بعض ڈراما نگاروں نے زبان اور ادب کی بھی خاصی خدمت کی ہے ان میں قابل ذکر رونق بنارسی، حافظ محمد عبداللہ، مرزا نظیر بیگ، احسن لکھنوی، بیتاب، ادب علی اعظم اور حشر کاشمیری وغیرہ ہیں۔ حشر کاشمیری نے تو اُردو ڈرامے کی اتنی خدمت کی ہے کہ وہ عوام میں ہندوستان کے شکسپیر کے نام سے مشہور ہیں۔ لیکن ایک بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ڈراما نگار کاروباری نقطۂ نظر سے ڈرامے لکھنے پر مجبور تھے کیونکہ ناٹک کمپنیاں انہی ڈراموں کو پیش کرتی تھیں جو عوام پسند ہوں ان سے ہٹ کر اگر بالفرض کوشش کی بھی جاتی تو ان کا چلنا غیر یقینی تھا۔ تاہم حشر نے بعض ڈراموں میں مقفیٰ اور مسجع عبارت آرائی کی جگہ سیدھی سادی زبان میں معاشی اور معاشرتی مسائل داخل کئے ہیں اس کے علاوہ انھوں نے شکسپیر کے کئی ڈراموں کو اُردو کے قالب میں منتقل کیا ہے

جس کی وجہ سے زندگی میں دولت کی دیوی نے ان کو گلے لگایا بلکہ شہرت کے دربار میں بھی پہنچا دیا۔

طرز جدید کے احیاء سے پہلے قدیم وضع کی ناٹک کمپنیوں کا سرسری خاکہ اور ان کی خدمات کا اجمالی تذکرہ بھی ضروری ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں متعدد ناٹک کمپنیاں قائم ہوئیں اور انھوں نے مختلف ڈراما نگاروں کی ذہنی فتوحات کی نمائش کی۔ ان کمپنیوں میں ایک کے علاوہ نیشنل تھیٹریکل کمپنی، لائٹ آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی، الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کے علاوہ حیدرآباد دکن کے ڈرامٹک کلب دارالسلام، والی منڈی وغیرہ بھی ہیں۔ مگر ان ناٹک کمپنیوں کے اداکار غیر تعلیم یافتہ تھے اور ان میں عورتوں کا پارٹ بازاری اور پیشہ ور عورتیں کرتی تھیں جس کی وجہ سے بہتیری سماجی برائیاں تھیٹر میں داخل ہو گئیں اور مہذب طبقے نے اس کو "برائیوں کا گھر" اور اداکاری کو ادنیٰ پیشہ قرار دیا۔ اس کے علاوہ ایک اور نقص یہ بھی تھا کہ خود مالک کمپنی، اداکار، آموز اور بیشتر ڈراما نگار اداکاری سے قطعاً ناواقف تھے۔

ان خرابیوں اور مصائبات کی وجہ سے اُردو ڈراما بالکل ابتدائی حالت ہی میں تھا۔ لیکن جب انگریزی زبان ملک میں پھیلنے لگی، اور انگریزی دانوں نے مغربی ڈراموں کا اردو ڈراموں سے موازنہ کیا تو ان کو اپنی زبان کی تہی دامنی نے ڈرامے کی اصلاح پر آمادہ کیا اور طرز جدید کے پیش روؤں میں جن میں ذکر کے قابل مولانا ظفر علی خاں، مرزا رسوا، محمد عمر نور الٰہی وغیرہ ہیں۔ اس کی طرف توجہ کی مگر ان حضرات نے صرف زبان و بیان کی نزاکتوں کا خیال رکھا اور ڈرامے کے فنی پہلو کو نظر انداز کر دیا لیکن طرز جدید کے پیروؤں نے اس کمی کو محسوس کر کے اس کو دور کرنے کی قابل قدر کوشش کی۔ اس دور میں بعض چوٹی کے ڈراما نگار پیدا ہوئے ان میں اشتیاق حسین قریشی، عبدالماجد دریابادی، دتاتریہ کیفی، فضل حق قریشی، مجیب، ڈاکٹر عابد حسین، امتیاز علی تاج، شاہد احمد، فضل الرحمٰن، یلدرم وغیرہ خاص طور پر ممتاز ہیں۔

ان حضرات کے بیشتر ڈرامے انگریزی اور دوسری زبانوں سے ماخوذ ہیں لیکن ایک خصوصیت ان میں قابل ذکر یہ ہے کہ انھوں نے غیر ملکی کردار اور معاشرت کو اس طرح اپنا لیا ہے کہ اُردو کے قالب میں ان کو اجنبی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ویسے موجودہ دور ترجمے ہی کا دور ہے۔ دنیا کی زبانیں یونہی دوسری زبانوں کے سہارے سے اپنی زبانوں کو مالا مال کرتی ہیں۔ "اردو ڈراما" اب روز بروز تعلیم یافتہ طبقوں میں مقبول ہوتا جا رہا ہے۔

حیدرآباد میں مختلف انجمنیں ڈراموں کی خدمت کر رہی ہیں اور ان کو تعلیم یافتہ طبقے میں ڈرامے کا مذاق پیدا کرنے میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ ان میں بزم تمثیل، انجمن ترقی ڈراما اور سٹی کالج، نظام کالج، عثمانیہ کالج، اورنگ آباد کالج کی انجمنیں کافی مشہور ہیں۔ ان انجمنوں نے کئی ایک ڈراما نگار اور اچھے اداکار پیدا کئے ہیں جن میں میر حسن، مخدوم محی الدین، اکبر وفاقانی، ثریا عنت اللہ بیگ، ظفر الحسن اور غلام محمد خاں وغیرہ کے نام یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

علاوہ ازیں اب اُردو رسائل میں ڈرامے بکثرت شائع ہو رہے ہیں جو بلاشبہ ایک نیک فال ہے۔ نیز عوام کے مذاق کو بدلنے میں بولتی فلموں کا بڑا حصہ ہے اور خاص طور پر نیو تھیٹر، بمبئی ٹاکیز اور منروا مووی ٹون نے ہماری زبان اور ڈرامے کی قابل قدر کوشش کی ہے اور ریڈیو کی ایجاد سے اُردو ڈراما نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ اب آئے دن دلچسپ ڈرامے نشر گاہوں سے نشر کئے جا رہے ہیں۔ یہ ڈرامے سامعین کی دلچسپی کے نقطۂ نظر سے لکھے جاتے ہیں اور خوشی کی بات ہے اُردو کے ادیب اس نئے میدان میں اپنے قلم کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ صاحبزادہ میکش کے نشریاتی ڈرامے ادارۂ ادبیات اُردو کی جانب سے شائع ہو چکے ہیں اور فضل حق قریشی نے بھی اپنے نشری ڈراموں کا مجموعہ پیش کیا ہے۔ بہرحال اُردو ڈرامے کا مستقبل نہایت شاندار ہے۔ ہم کسی دوسری صحبت میں ڈرامے کے اقسام اور اس کے افادی پہلو پر روشنی ڈالیں گے۔

میر عزیز الحق

اُردو ترجمے

ہر ایک زبان کو جلد جلد ترقی کرنے اور زمانے کی رفتار کا ساتھ دینے کے لئے قدیم اور وسیع زبانوں کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُردو لکھنے اور بولنے والوں کی وسعت نظر اور بے تعصبی کی بدولت یہ راستے ہماری زبان کے لئے ہمیشہ کھلے رہے ہیں۔ چنانچہ سنسکرت اور پراکرت کا دودھ اُردو نے ایک عرصہ تک پیا اور جب غلبہ و دنیا فارسی کو عروج ہوا تو اس کے اثرات بھی اُردو نے جی کھول کر قبول کئے۔

عام طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اُردو زبان میں ترجمے کے دو دور گزرے ہیں۔ ایک دور ابتدائی ہے جب کہ اولاً فارسی اور عربی کے اور بعد کو سنسکرت کے ترجمے ہوئے۔ قدیم دکنی ادب کا بیشتر حصہ اُس زمانہ کی مقبول اور مروجہ فارسی تصانیف کے ترجموں پر مشتمل ہے۔ اُردو لکھنے اور بولنے والوں کی فارسی دانی اور ترجموں کی وجہ سے جو فائدے اس زبان کو ہوئے اُن سے سب واقف ہیں۔ بے شمار الفاظ، ترکیبیں تشبیہوں اور استعاروں کا اضافہ ہوا۔ شعر اور نثر کے نئے نئے سانچے اور اسالیب اُردو ادب کی رونق کا باعث ہوئے۔

مغربی تصانیف کے اُردو ترجموں کی ابتدا اُس وقت سے ہوئی جب کہ مختلف مغربی قوموں نے ہندوستان میں تھوڑی بہت قوت حاصل کرلی۔ اس سلسلے میں اولین قابل ذکر کوششیں عیسائی پادریوں کی ہیں جنھوں نے وقتاً فوقتاً انجیل کے مختلف حصوں کے ترجمے کرائے اب تک جو مواد مل سکا ہے، اُس سے پتہ چلتا ہے کہ انجیل کا ترجمہ پہلی دفعہ ہندستانی زبان میں بنجمن شولز نے ۱۷۴۸ء میں کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار پر آنے تک اُردو یعنی ہندستانی کو ہندوستان کی عام زبان کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ ۱۸۰۰ء میں حکومت نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا جہاں نو عمر انگریزوں کو ہندستانی اور مشرقی علوم سکھانا منظور تھا۔ تعلیمی ضروریات کے تحت اُردو ادبیات کی تلاش ہوئی۔ اس کا سارا ذخیرہ شعر و شاعری پر مشتمل تھا۔ اس لئے ادبی کتابوں کی تالیف اور ترجمہ کے لئے ایک محکمہ قائم کیا گیا۔ اس سررشتہ میں اخلاقی قصوں اور بعض تاریخی کتابوں کا ترجمہ قدیم مشرقی زبانوں یعنی عربی اور سنسکرت سے کیا گیا۔ دوسرے علوم یا سائنس پر کوئی کتاب اِس عہد میں تیار نہیں ہوئی۔

شمالی ہند میں اُردو نثر کی باضابطہ ابتدا انگریزی اثر کی بنا پر ہوئی لیکن ابتداءً اس پر انگریزی زبان و ادب کا اثر کم پڑا اور جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے فورٹ ولیم میں کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ اُردو میں نہیں ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ دیسی لکھنے والے انگریزی نہیں جانتے تھے۔ فورٹ ولیم کے کسی اہم کام کا ذکر مغربی زبانوں سے ترجموں کے سلسلے میں کیا جاسکتا ہے تو صرف اُس انگریزی لغت کا جس کا ایک حصہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے ۱۷۹۶ء میں چھپوایا۔ فورٹ ولیم کالج اس لغت کی اشاعت کے چار سال بعد قائم ہوا لیکن چونکہ گلکرسٹ اس کالج کی روح رواں تھے اس لئے ہم نے ان کے کام کا ذکر اس سلسلے میں کردیا۔

مرزا فطرت نے ولؔ ہنٹر کی مدد سے ۱۸۱۹ء میں انجیل کے عہد جدید کا ترجمہ شائع کیا۔ باور کیا جاتا ہے کہ یہ ترجمہ یونانی زبان سے کیا گیا۔ ۱۸۰۸ء میں کنٹر نے اپنی لغت شائع کی اس کے بعد ۱۸۱۱ء میں کپتان ٹامس روک ROCK نے لغتِ جہازرانی چھپوائی جس میں جہازرانی کی اصطلاحوں کے علاوہ ایسے الفاظ کا اُردو ترجمہ بھی درج ہے جو کمانداروں کو جنگ کے میدان اور بارکس میں کام آسکتے ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ایک عرصے بعد یعنی ۱۸۴۲ء کی لکھی ہوئی ایک کتاب دستیاب ہوئی ہے جس کا نام "مجموعۂ گنج" ہے اور جو کلکتہ اسکول بک سوسائٹی پریس میں چھپی ہے (تفصیل کے لئے اکتوبر ۱۹۲۲ء کا معارف ملاحظہ فرمائیے) یہ کتاب چونکہ اولین ترجموں میں سے ہے اور کم یاب ہے اس لئے اس کی خصوصیات کے بارے میں کچھ عرض کردینا ضروری ہے۔ "مجموعۂ گنج" کی عبارت میں قدامت پائی جاتی ہے۔ جملوں کی ترکیب پر انگریزی اثر نمایاں ہے۔ بعض ایسے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں جو عرصہ ہوا متروک ہو چکے ہیں۔ "نے" کے غلط استعمال اور جملہ کی ترکیب کی اجنبیت کی ایک مثال یہ جملہ ہے "کمپنی کے سوا کوئی آدمی پوست کا کھیت کرنے اور افیون مول لینے نہیں سکتا مگر کمپنی کے حکم سے"۔

اُس زمانے میں اُردو ترجمے کا دوسرا اہم مرکز شہر حیدرآباد دکن تھا۔

حیدرآباد کے امیر کبیر نواب فخرالدین خاں شمس الامرائے ثانی بڑے علم دوست تھے۔ نواب صاحب موصوف نے اپنے اطراف علما کا ایک گروہ جمع کر لیا تھا جن میں سے اکثر تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا کام کرتے تھے۔

نواب فخرالدین خاں کو ریاضیات اور علم ہیئت سے خاص شغف تھا۔ اپنی علم دوستی اور علمی دلچسپی کی وجہ سے انہوں نے اپنے زمانے میں بہت سے مستند اور اعلیٰ پایہ ترجمے اپنے سنگی چھاپہ خانے میں چھپوائے۔

نواب شمس الامرا کی کتابوں کی زبان سادہ سلیس اور عام فہم ہے۔ اُن کے مترجموں کو اپنے موضوعوں پر پورا پورا عبور حاصل تھا۔ ستۂ شمسیہ اس مرکز کی بہترین یادگار ہے۔

اس دور میں اُردو ترجموں کا تیسرا اور آخری مرکز لکھنؤ تھا۔ شاہان اودھ نے لکھنؤ میں جدید مغربی علوم و فنون کی بعض کتابوں کے ترجمے کرائے جو مطبع سلطانی میں چھپ کر شائع ہوئے۔ سید کمال الدین حیدر لکھنوی نے جدید علوم پر انتیس (۲۹) رسالوں کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا جو کیمیا، برق، مقناطیس، طبیعیات، ہیئت، علم المناظر، علم آب، علم ہوا، علم حرارت وغیرہ سے متعلق ہیں۔

ان کے مقابلے میں شمالی ہند کے ترجموں کی زبان پر عربیت حاوی نظر آتی ہے۔

ترجموں کے ابتدائی دور میں یعنی ۱۸۰۰ء سے ۱۸۴۲ء تک جو اجتماعی کوششیں ہوئیں ان کا ذکر ہو چکا۔ انفرادی کوششوں میں یہ کتابیں قابلِ ذکر ہیں:۔

ایلیمنٹس آف جنرل ہسٹری کا ترجمہ ۱۸۲۹ء
تاریخ انگلینڈ " " ۱۸۱۸ء
تاریخ روم " " ۱۸۴۱ء
تاریخ ملک چین " " ۱۸۴۱ء
بنیان کی پلگرمس پروگرس " " ۱۸۳۸ء
جانسن کا ریلیس مترجمہ سید محمد میر ۱۸۲۵ء

اس کے علاوہ "داؤد کی زبور" "گے کے فیبلز" اور "خلاصۂ علم الارض" ان تین کتابوں کا تعلق بھی اسی دور سے ہے۔

مغربی تصانیف کے اُردو تراجم کا دوسرا دور ۱۸۴۲ء میں شروع ہوا۔ اس دور کا پہلا اہم مرکز دہلی کالج تھا۔ پچھلے دور میں جن مرکزوں کا ذکر کیا گیا ان کی کوششیں اس قدر وسیع پیمانے پر اور اس درجہ منظم نہیں تھیں جتنی کہ دہلی کالج کی تھیں۔ اس کالج کے ارباب نے ترجمہ کی مشکلات کو حل کرنے کی غرض سے بعض مفید اصول پہلی دفعہ مرتب کئے۔ اور نصابی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے مختلف علوم اور سائنس کی اعلیٰ قسم کی کتابیں اُردو میں منتقل کیں۔ اس سے پہلے صرف ابتدائی کتابوں کے ترجمے شائع ہوئے تھے۔ ترجمہ کے بارے میں جو اصول بنائے گئے تھے ان میں سے بعض یہ ہیں۔

مترادف لفظ اُردو میں نہ ملے تو اصل لفظ استعمال کیا جائے۔

اُردو لفظ ملے تو وہی استعمال کیا جائے۔

سائنس کی کتابوں کا ترجمہ چونکہ انگریزی ہی سے کیا جائے گا اس لئے انگریزی لفظ کا اُردو میں استعمال ناگزیر ہے۔

انگریزی کا جملے میں اگر کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ ہو جس سے اہلِ ہند ناواقف ہوں تو مترجم کو چاہئے کہ حاشیہ یا متن میں مختصر طور پر اس کی تشریح کر دے۔

ترجمہ لفظی نہ ہو بلکہ اُردو میں مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔ دہلی کالج سے خدا جانے کُل کتنی کتابیں شائع ہوئیں۔ اس وقت تک ان میں سے صرف (۳۰) کا پتہ چلا ہے۔ اس کے علاوہ چھے ایسی کتابوں کے نام معلوم ہوئے ہیں جو زیرِ ترجمہ تھیں۔

دہلی کالج کے ترجمے ان علوم سے متعلق ہیں۔ تاریخ انگلستان، الجبرا، علم ہیئت، کیمیا، قانون مال، معاشیات، میکانیات طبعی جغرافیہ، مساحت طبیعیات، صرف و نحو انگریزی، مقناطیس جراحی، حرکیات اور سکونیات، سکون سیالات، علم المناظر حرارت، علم آب، برق، ریاضی، طب، فلسفہ، نباتیات، حفظان صحت، عضویات، معدنیات۔

انیسویں صدی میں اُردو ترجمہ کا آخری ادارہ سائنٹفک سوسائٹی تھی۔ جب سرسید کو یقین ہو گیا کہ جس وقت تک ملک میں جدید علوم کی اشاعت نہ ہو اُس وقت تک ہندوستانیوں کی بھلائی کی تمام تدبیریں فضول ہیں تو انہوں نے اُردو میں مغربی تصانیف اور علوم کا ترجمہ کرانے کی غرض سے ایک انجمن قائم کی۔ سرسید نے ترجمہ کے کام کو انگریزی زبان کی اشاعت سے زیادہ ضروری سمجھا اس لئے کہ ہندوستان کی آبادی کے ایک حصے کو اس سے نفرت تھی تو دوسرا حصہ اس کو صرف ملازمت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ ان دونوں کے دلوں پر انگریزی تعلیم کا نقش بٹھانے کے لئے کچھ کتابوں کو اُردو میں منتقل کرنا ضروری تھا۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ اس سوسائٹی کا اصلی مقصد انگریزوں اور ہندوستانیوں میں میل جول پیدا کرنا تھا۔

سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کا اعلان سرسید نے ۱۸۶۴ء میں کیا۔ کچھ ہی عرصے میں ارکان کی تعداد کثیر ہو گئی۔ غازی پور میں ترجمہ کا کام باضابطہ طور پر شروع کر دیا گیا۔ بعد میں سوسائٹی علی گڑھ میں منتقل ہو گئی تو وہاں سرسید نے اس کے لئے تیس ہزار روپے کے صرفہ سے ایک عمارت تیار کروائی۔ تقریباً پانسو روپے کے تنخواہ دار مترجمین اور دوسرے ملازمین سوسائٹی کے کام پر متعین کئے گئے تھے۔ اس زمانہ کے انگریزی جرائد میں جو اعلیٰ پایہ کے مضامین چھپتے تھے ان کے ترجمے سوسائٹی کے رسالے "انسٹیٹیوٹ گزٹ" میں شائع کئے جاتے تھے۔ اس سوسائٹی نے تقریباً چالیس چھوٹی بڑی علمی اور تاریخی کتابیں اُردو میں ترجمہ کرائیں۔ اس کی توجہ زیادہ تر تاریخ، سوانح، جغرافیہ، سیاسیات اور معاشیات تک محدود رہی۔

یوں تو سوسائٹی کے تمام ترجمے کامیاب کہے جا سکتے ہیں لیکن خاص طور پر معاشی اصطلاحات کے ترجموں میں بڑے سلیقے سے کام لیا گیا۔ اسی وجہ سے ان میں بعضوں نے یا تو اپنی اصلی حالت میں یا تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اُردو زبان میں مستقل جگہ حاصل کر لی۔

سائنٹفک سوسائٹی کی مطبوعات بالعموم عام فہم ہیں اور ان میں ترجمہ پن کم پایا جاتا ہے۔ ۱۸۴۲ء سے ۱۸۷۷ء تک انفرادی کوششیں بھی زیادہ تر تاریخ اور سوانح تک محدود رہیں۔ علمی کتابوں کے ترجمے بہت کم شائع ہوئے۔ (DEFOE) ڈیفو کی رابنسن کروسو کا ترجمہ "بزرگ رابنسن کروسو" کے نام سے اور پادری ویکفیلڈ" کے نام سے ویکار آف ویکفیلڈ کا ترجمہ بھی اسی دور میں چھپا۔

یہ تھا ۱۸۰۱ء سے ۱۸۷۷ء تک کے اردو ترجموں کا نہایت اجمالی ذکر۔

اس کے بعد کی تاریخ ترجموں کی نوعیت اور وسعت دونوں کے لحاظ سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔

میر حسن

اطلاع:- رسالہ نہ ملنے کی اطلاع ہر انگریزی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک دفتر کو کر دی جائے۔ مہینہ ختم ہونے پر رسالے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ نئے سال کا چندہ تقسیم کنندہ سے باضابطہ مطبوعہ رسید حاصل کر کے عنایت فرمائیے۔

اُردو ادب اور ہندو سماج

علمائے لسان کے ایک پروفیسر مسٹر فیڈ ش کا قول ہے کہ غیر زبان جو کسی قوم کو سیکھنی پڑتی ہے محفوظ نہیں رہتی بلکہ اس کی اپنی زبان کے اثر سے متاثر ہو جاتی ہے بالکل یہی صورت مسلمانوں کی آمد کے بعد اس ملک میں پیش آئی۔ ہندوستان پر محمود غزنوی کے حملے دھواں دھار بادل یکا یک آندھیوں کی طرح تھے اور اگرچہ پنجاب پر آل غزنوی تقریباً پونے دو سو سال تک حکومت کرتے رہے لیکن باوجود اس امر کے کہ اس طویل عرصے میں اجنبیوں اور ملکیوں کے باہمی تبادلۂ خیالات کی بدولت ایک نئی زبان کا تشکیل پا جانا ممکن تھا چونکہ یہ زمانہ امن چین کا نہ تھا کوئی نئی زبان وجود میں نہ آسکی اور اسی لئے جب تک حضرت مسعود سعد سلمان کا ہندی دیوان دستیاب نہ ہو جائے اس نظریے کی مقبولیت میں فرق نہیں آسکتا کہ شہاب الدین محمد غوری کے ہندوستان میں قدم جمانے کے بعد ہندی نو واردوں کی فارسی سے مخلوط ہو کر ایک نئی زبان بن گئی یعنی ترکوں اور مغلوں نے عربی، ترکی اور عجمی الفاظ کے جو دانے گنگا جمنا کی زرخیز وادی میں بکھیرے انہیں اس خطہ کی زبان کھڑی بولی نے اپنے وسیع اور کشادہ دامن میں جگہ دی اور یہ ہندی میں فارسی مخلوط کرنے والے خود اہل ہند تھے چنانچہ حصول علم، ضروریات زندگی اور تہذیب اور شائستگی کے جانے کے خیال سے ہندوؤں نے فارسی سیکھنی شروع کی اور جب متواتر مطالعہ کی بدولت خود استاد ہو گئے تو انہوں نے ایسے فارسی الفاظ سے جن کے ہم معنی یہاں موجود تھے ملکی زبان کو مالا مال کرنا شروع کر دیا اور یہ بالکل صحیح طریقۂ عمل تھا لیکن احساس کمتری سے یا اظہار فضیلت و مشیخت کی خاطر جب غیر زبان کے الفاظ کا استعمال فیشن میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر اس کی روک تھام مشکل ہو جاتی ہے اور ایسے متعدد الفاظ جن کے ہم معنی اپنی زبان میں دستیاب ہو سکتے ہیں یا جن کا مفہوم ذرا سے الٹ پھیر کے بعد بآسانی ادا کیا جا سکتا ہے، زبان میں جگہ پا لیتے ہیں جو نامناسب ہے مگر فارسی اور ہندی کے اسی نامناسب اختلاط کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ نہ صرف کھڑی بولی میں مترادفات کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا بلکہ ہندی الفاظ کی دل نشینی، اور اثر اور فارسی اور عربی الفاظ کی شان و شوکت نے حکمران قوم کو بھی اس کی طرف بیش از بیش متوجہ کرنا شروع کر دیا اب اس نے سینوں سے نکل کر سفینوں میں جگہ پائی اور اس نیک کام میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے یعنی جس طرح ہندوؤں نے فارسی میں دستگاہ کامل حاصل کی تھی اسی طرح اردو میں بھی خاصا ملکہ بہم پہنچایا اور اسی لئے سر سپرو کے ان الفاظ کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "اردو زبان ہندو اور مسلمان دونوں کو اپنے آباؤ اجداد سے ایک مشترکہ و مقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے جو ناقابل تقسیم ہے"۔

غرض کہ یہ خیال کہ ہندوؤں کو اُردو سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے، جیسا کہ احاطۂ مدراس اور بمبئی کے بعض مقامات میں عوام کے اسے مسلمانی کے نام موسوم کرنے سے ظاہر ہوتا ہے غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اُردو زبان اسی ملک میں بنی اور اسی ملک والوں نے جن میں ہندو شریک غالب تھے اس کے بنانے کا کام انجام دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو علم و ادب کے ہر شعبے میں اس کے روز ابتدا سے ہندو اور مسلمان دونوں دوش بدوش کام کرتے نظر آتے ہیں چنانچہ اسی وقت سے جب دکھنی نے شمال میں پہنچ کر دلی والوں کو اپنی زبان کی طرف متوجہ کیا اور وہ خان آرزو، شاہ حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں کے ہاتھوں پروان چڑھنے لگی۔ چند ہندو شعرا مثلاً ٹیک چند بہار جو خان آرزو سے مشورۂ سخن کرتے تھے رام نرائن موزوں آبادی جو حضرت شیخ علی حزیں کے شاگرد تھے اور سینا رام عمدہ اور شیو سنگھ ظہور نے جنہیں انعام اللہ یقین سے شرف تلمذ حاصل تھا اُردو کے چمنستان سخن کی آبیاری کی طرف توجہ مبذول کی اور جب مرکز شاعری دہلی سے لکھنؤ منتقل ہو گیا تو گلشن چند مجروح

شاگردِ مرزا مظہر، رام جس مغموم اور موتی لال جیقت اور صاحب رائے فریاد شاگردانِ میر سوز نے آتشِ سخن سے لوگوں کے دلوں کو گرما دیا
کردیا۔ اس زمانے میں سرب سکھ دیوانہ ایک نہایت پرگو اور بڑا شاعر گزرا ہے چنانچہ علی ابراہیم خاں خلیل اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ فارسی میں بھی اس کے دو دیوان تھے اور لکھنؤ کے مرزا جعفر علی حسرت اور میر حیدر علی حیدر اس کے شاگردوں میں سے ہیں اس کے بعد چھنو لال طرب اور موجی رام موجی شاگردانِ مصحفی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ پھر نسیم لکھنوی کا زمانہ آتا ہے جنھوں نے گلستانِ نظم کو بڑی ترو تازگی بخشی۔ ان کی مثنوی گلزارِ نسیم کا شہرہ آج ہندوستان بھر میں ہے چنانچہ پنڈت چکبست لکھنوی دیباچۂ گلزارِ نسیم میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے چرچے تھے لہٰذا خود بھی اس کوچے میں قدم رکھا اور چونکہ یہ مثنوی گلہائے مضامین سے پر تھی اس لئے نام گلزارِ نسیم تجویز کیا۔ واقعی اس گلزار کا کیا کہنا ع سینچا تھا جس کو خونِ جگر سے وہ باغ تھا۔ ابھی تک مثنوی کے رنگ میں یکتائی کا سہرا میر حسن کے سر تھا، اب گلزارِ نسیم کے پھولوں کی مہک عوام کے دماغوں میں بس گئی جواہرِ سخن کے پرکھنے والے جان گئے کہ مثنوی کیا کہی ہے موتی پرو دئے ہیں۔ نسیم کو بھی شہرتِ علم کا خلعت نصیب ہوا اور بقائے دوام کے دربار میں میر حسن کے برابر کرسی ملی۔
اس کے بعد بشمبر ناتھ صابر اور دیا شنکر نگار وغیرہم نے سخن دانی کا مذاق قائم رکھا اور جب انگریزی ادب کے اثر کے تحت اردو نے کروٹ بدلی اور جدید رنگ کی شاعری کا آغاز ہوا تو بھی ہندو اپنے حصے کی خدمت کی طرف سے غافل نہیں رہے بلکہ جوالا پرشاد برق، نوبت رائے نظر، درگا سہائے سرور، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، سورج نرائن مہر اور برج نرائن چکبست نے اس میدان میں بھی اشہبِ قلم کو اس طرح جولاں کیا ہے کہ ہر شخص کو ان کے کمالِ فن کی داد دینی پڑتی ہے چنانچہ برق کی مثنوی صبحِ بہار کے سر سید مرحوم بے حد مداح تھے۔
نظر کے متعلق مرزا محمد عسکری لکھتے ہیں کہ لکھنؤ کا گلشنِ شاعری اس بلبلِ خوش الحان کے اٹھ جانے سے سونا ہو گیا اور سرور کی نسبت تو یہ کہنا بجا ہے کہ انھیں فنا فی الشعر کا درجہ حاصل تھا ان کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت وطنیت، جذبات نگاری اور درد و اثر کا امتزاج ہے۔ کیفی، حضرت آزاد اور مولانا حالی کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں اور نیچرل شاعری میں آپ نے ایک جدت یہ داخل کی ہے کہ خشک موضوع میں رنگین بیانی کی چاشنی ملا دیتے ہیں۔ بہرحال آپکے رشحاتِ قلم آپ کے ایک پختہ مغز اور کہنہ مشق شاعر ہونے کا کافی ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ مہر گیتا اور رامائن کا منظوم ترجمہ کرنے کی وجہ سے مشہور ہیں اور پنڈت چکبست ایک قومی شاعر تھے ان کے کلام میں ہمیں حب الوطنی، درسِ عمل اور آزادی کے نغمے سنائی دیتے ہیں اور قدم قدم پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر غلامی کا داغ مٹانے کے لئے بے تاب ہے۔

مذکورۂ بالا شعرا کے علاوہ موجودہ زمانے کے اور متعدد شاعر مثلاً تلوک چند محروم، جگت موہن لال رواں، گم نام سکندرآبادی اور برق دہلوی وغیرہ کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔ لیکن بخوفِ طوالت ان کا ذکر حذف کیا جاتا ہے اور اب ہم ہندو نثر نگاروں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کیونکہ اس میدان میں بھی ہندوؤں کی خدمات کچھ کم قابلِ قدر نہیں ہیں چنانچہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد جس نے اردو نثر نگاری کی بڑی ہمت افزائی کی، امن، افسوس، طپش اور حیدری وغیرہ نے جب اپنی تصانیف سے اردو کو مالا مال کیا تو بینی نرائن جہاں اور بہال چند لاہوری نے بھی چار گلشن اور مذہبِ عشق لکھ کر اس نیک کام میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ اس کے بعد اردو کی ترقی کی دوسری تحریک دلی میں نمودار ہوئی جہاں دہلی کالج سے متعلق ایک مجلس ترجمہ قائم تھی۔ یہ مجلس کالج کے طلبہ کے لئے انگریزی سے اردو میں درسی کتابوں کے ترجمے کا کام انجام دیتی تھی اور اس مجلس کے لئے پروفیسر رام چندر نے جو بعد میں عیسائی ہو گئے تھے تذکرۃ الکاملین، اصولِ علم

ہیئت اور مصائب ہند کا رنامی جیسی کتابیں لکھیں۔ اس کے بعد آزاد، حالی، نذیر احمد اور ذکاء اللہ کا زمانہ آتا ہے اور ماسٹر پیارے لال آشوب اس عہد میں ہندوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن اس زمانے سے کچھ عرصہ پیشتر افق نثر اردو پر ایک ایسا روشن ستارہ طلوع ہو چکا تھا جس کی ضیاء قیامت تک دلدادگان اردو کے دلوں کو گرمی پہنچاتی رہے گی یہ ستارہ پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کی ذات بابرکات تھی جنہوں نے اردو نثر میں نئی روشیں نکالیں۔ سرشار کی تصانیف میں فسانۂ آزاد، سیر کہسار، جام سرشار، کامنی اور خدائی فوجدار بہت مشہور ہیں۔ لیکن اول الذکر کتاب ان کا شاہکار ہے۔ انہوں نے کچھ عرصے تک دبدبۂ آصفیہ کی ادارت کا کام بھی کیا تھا نیز تین انگریزی کتابوں کا ترجمہ اردو میں کیا جن میں سے ایک کا نام "شمس الضحیٰ" ہے۔ سرشار حقیقی معنوں میں آزاد مزاج اور ایک خوش فکر شاعر تھے۔ اسی کے ساتھ وہ ایک زبردست جرنلسٹ ایک مشہور مصنف اردو کے نامور ناول نگار اور ایک خاص طرز کے موجد بھی تھے۔ لیکن ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اردو ناول کو انگریزی طرز پر لکھنے کا فخر انہیں کو حاصل ہے اور ان ہی کے طرز نگارش کی ان کے بعد منشی جوالا پرشاد برق نے ایک حد تک تقلید کرتے ہوئے نہ صرف اکثر بنگالی ناولوں کے ترجمے اس طرز میں کئے بلکہ شکسپیر کے بعض ڈراموں کا بھی ترجمہ کیا کیونکہ ہندوستان میں اس زمانے میں ڈراموں کی مانگ بڑھ رہی تھی اور ہندوؤں میں صرف طالب بنارسی اور بیتاب دہلوی اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دے رہے تھے۔ لیکن بیتاب ڈراما نویسی میں برق سے آگے ہی رہے اور اگرچہ ان کی زبان میں ہندی اور سنسکرت الفاظ فارسی اور عربی الفاظ کے پہلو بہ پہلو بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں اور کانوں پر بھی گراں گزرتے ہیں لیکن انہیں ڈراما نویسی کے فن میں مہارت حاصل ہے۔ بیتاب کے بعد اردو کا تنازعہ بڑھتا جا رہا ہے۔ بعض سنجیدہ پڑھے لکھے ہندو اردو علم و ادب کی خدمت میں منہمک نظر آتے ہیں۔ چنانچہ پریم چند، کیفی، منوہر لال زتشی اور دیا نرائن نگم اور سدرشن کے نام بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے ہے یہ میدان قصہ گوئی کے شہسوار ہیں اور ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی دیہاتوں کے ہو بہو نقشے اور یہاں کے کسانوں کے من و عن واقعات نہایت عمدہ طریقے سے اپنے ناولوں میں بیان کئے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ انسانی جذبات اور نفسیات کے پورے ماہر ہیں اور چونکہ عبارت میں آمد اور زور ہوتا ہے اور مبالغہ کو یہ پاس نہیں آنے دیتے اس لئے تحریر تاثیر کا طلسم بن جاتی ہے۔ پریم چند کو افسانہ نگاری کے فن میں بھی کمال حاصل ہے چنانچہ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو کر قبولیت عام کا شرف حاصل کر چکے ہیں۔ کیفی فارسی اور انگریزی کے فاضل اہل ہندی کے پورے ماہر اور قدرے عربی اور سنسکرت سے بھی واقف ہیں۔ اردو معلیٰ آپ کی مادری زبان ہے اور آپ کی ذات میں اسلامی تہذیب اور قدیم ہندو مسلم مودت کے نمایاں آثار نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ ایک اچھے نقاد اور پہلے شخص ہیں جس نے اردو میں ڈرامے کے موضوع پر مضمون لکھا آج کل آپ کے مضامین کا مجموعہ طبع ہو گیا ہے اور نثر میں عورت اور اس کی تعلیم، چراغ ہدایت، ہنستا نا اور پریم دیوی اور ڈراموں میں راج دلاری اور مرادی داد آپ کی تصانیف سے ہیں۔ پنڈت منوہر لال زتشی ایک اچھے ادیب اور بلند پایہ نقاد ہیں۔ منشی دیا نرائن نگم اپنے موقر رسالے "زمانہ" کی وجہ سے مشہور ہیں جس کا اجرا ۱۹۰۳ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس رسالے میں جو مضامین خود ان کے قلم سے نکلتے ہیں وہ نہایت جچے تلے اور غیر جانبدارانہ ہوتے ہیں۔ مہاشے سدرشن پنجاب کے ایک مشہور افسانہ نگار ہیں لیکن آپ میں وہ استادی اور فنی کمال موجود نہیں جو خاص پریم چند کا حصہ ہے البتہ ان کی چند خصوصیات کم تر درجے میں ضرور موجود ہیں۔

اب تک میں نے ان چند ہندو بزرگوں کے نام لئے ہیں جنھوں نے اپنی دماغی کاوشوں سے اردو علم و ادب کے دامن کو وسیع کرنے کی امکانی کوششیں کی ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ ان چند با ثروت ہندو اصحاب کا ذکر بھی ضروری ہے جنھوں نے شعراء اور ادیبوں کی سرپرستی فرما کر اردو کی بالواسطہ خدمت انجام دی تھی چنانچہ مہاراجہ شتاب رائے عظیم آبادی اس سلسلے کی پہلی کڑی ہیں انھوں نے حضرت اشرف علی فغاں کے پٹنہ آنے پر ان کی بڑی خاطر و مدارات کی اور ان کے بیٹے نے جو راجہ تخلص کرتے تھے میر ضیاء الدین ضیا کی سرپرستی فرمائی۔ اقلیم سخن کے بادشاہ میر تقی میر کی مہاراجہ ناگر مل اور

راجہ سوج مل نسیگھ دن دستگیری کی۔ اور کے مہاراجہ شمبو دھان سنگھ نے تصویر اور تشنہ شاگردان ذوق اور مجروح اور سالک شاگردان غالب کی بڑی قدر کی اور مملکت حیدرآباد کے مشہور وزیر مہاراجہ چندو لال شاداں اور مہاراجہ کشن پرشاد شاد نے مختلف ادیبوں اور شاعروں کی اعانت میں جو دلچسپی دکھائی وہ روز قیامت تک ان کی اُردو دوستی کی شاہد رہے گی۔

غرض کہ ان تمام باتوں سے ہندوؤں کی اُردو دوستی مسلم ہے لیکن افسوس ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل و عقد نے اپنے ہندو منشیوں کو ہندی رسم الخط میں لکھنے کا حکم دے کر ایک بڑا زہریلا بیج بویا اور غدر کے بعد راجہ شیو پرشاد اور بھارتیندو ہریش چند ہندی کے فروغ کی تحریک سے اپنے دامن کو وابستہ کر کے اردو کے درپئے آزار ہو گئے اگرچہ لطف کی بات یہ ہے کہ اول الذکر ایک اردو کتاب کے مصنف اور ثانی الذکر اردو کے اچھے شاعر تھے۔ بات دراصل یہ تھی کہ غدر کے بعد ہندوؤں میں انگریزی کے انصاف پسندی کے اعتقاد نے قومیت اور وطنیت کے جذبے کی تخلیق کی اور میک مولر اور اینی بیزانٹ کی تحریروں نے جن میں انہیں ان کے شاندار ماضی کی یاد دلائی جاتی تھی اس جذبے کو اور ابھار دیا۔ اور سرسوتی وہ شخص تھا جس نے مقدس قدامت کا واسطہ دے کر اسے بالکل مستحکم کر دیا۔ اب ہندو سماج کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اُردو کو جسے وہ غلطی سے مسلمانوں کی زبان سمجھ بیٹھے تھے بالکل مٹا دیا جائے چنانچہ سب سے پہلے اس تحریک کا بیج بہار میں بویا گیا مگر اس کے یو۔ پی میں پھوٹے اور اگرچہ سرسید نے اس کی مخالفت کی لیکن لفٹنٹ گورنر سر میکڈانلڈ کی کوششوں سے آخر ہندی سرکاری زبان قرار دے دی گئی اور اس کے بعد ہندوؤں کی مذہبی تحریکات شدھی اور سنگھٹن نے جن کا مقصد ہندوؤں کی تنظیم اور تقویت اور ہندو مذہب کی تبلیغ تھا ہندی کی تحریک کو اور آگے بڑھایا۔ ایک زمانہ تھا کہ نظیر اکبرآبادی نے ہولی، بسنت اور دیوالی پر نظمیں لکھی تھیں اور ہندو شعراء اپنے رسم و رواج اور تہوارات اور معتقدات کو تو خیر نظم کرتے ہی جیسا کہ ان کی سماجی نظموں اور طالب اور بیتاب کے ڈراموں سے ظاہر ہے لیکن انہوں نے نعتیہ نظمیں بھی لکھ کر باہمی رواداری کی مثال قائم کی تھی۔ مگر اب یہ حالت ہو گئی کہ ہندی ادیب عربی فارسی الفاظ کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر خارج کرنے اور ان کی جگہ سنسکرت کے تت سم یعنی اصلی الفاظ کو دینے لگے اور جب اس جھگڑے نے زور پکڑا تو آخر کار انڈین نیشنل کانگریس نے یہ قرارداد منظور کی کہ ہندوستان کی زبان ہندوستانی ہو گی جس سے شمالی ہند کے عوام کی بول چال کی زبان مراد تھی لیکن بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے ناگپور کے اجلاس کے موقع پر گاندھی جی نے اسے ہندی ہندوستانی بنا دیا اور ان کے بعد یہ ہندی یا ہندوستانی کی شکل بدل کر آخر کار خالی ہندی رہ گئی ہے جیسا کہ رسالہ ہنس کی تحریروں سے جو ہندی ساہتیہ سمیلن کا پرچہ ہے اور مختلف کانگریسی لیڈروں کی تقریروں سے ظاہر ہے لیکن یہاں ایک یہ امر قابل غور ہے کہ فی زمانہ ہندی میں بھی ادب کافی مقدار میں موجود ہے اور اب ہندی اور اُردو بالکل مختلف زبانیں بن چکی ہیں جس کی وجہ سے رستم اور بھیم جیسے پہلوان بھی اب انہیں ایک دوسرے کے قریب لانے میں ناکامیاب رہیں گے البتہ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ با ہمت اشخاص کا جن کے دلوں میں کچھ قومی درد موجود ہے، یہ کام ہونا چاہئے کہ وہ دونوں زبانوں کے الفاظ کا جائزہ لے کر ایسے الفاظ معلوم کریں جنھیں ان دونوں کا مشترک سرمایہ قرار دیا جا سکے تاکہ اس بنیاد پر ایک نئی قومی زبان تعمیر کی جائے۔

بلبیر پرشاد بھٹناگر

اُردو اور ظرافت

ظرافت صحت مند زندگی کی علامت ہے اس لئے کوئی ادب ظرافت نگاری سے خالی نہیں ہوتا۔ مغرب کی متمدن زندگی میں سنجیدہ ظرافت کا ایک خاص مقام ہے اس لئے ان کے ادب میں نہ صرف ظرافت نگاری کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے بلکہ اصولوں اور ضابطوں کے ذریعے مذاق اور پھکڑ پن میں امتیاز بھی قائم کردیا گیا ہے۔ اردو ادب میں بہ حیثیت مجموعی مزاحیہ ادب بہت کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ظرافت کا قدیم اسلوب ہمارے سنجیدہ معیار پر پورا نہیں اترتا۔ اس کے علاوہ ایک زمانے تک ناسازگار ماحول نے ہمارے ادیبوں پر قنوطیت کا رنگ غالب کردیا تھا۔ یاس انگیزی اور تشکیک ان کے آرٹ کے بنیادی عناصر بن گئے تھے۔ اردو کے بعض قدیم قصوں میں قدیم انداز کی ظرافت ملتی ہے۔ داستان امیر حمزہ، قصۂ حاتم طائی، فسانۂ عجائب، قصہ چہار درویش وغیرہ میں کہیں کہیں ہنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ادب اُردو کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ظرافت کے ایک مخصوص طرز کو ریختی کے ذریعے سب سے پہلے پیش کیا گیا۔ یہ کہنا مشکل ہے ریختی کو ظرافت کہا جاسکتا ہے یا نہیں بہرحال یہ شاعری ایک غیر فطری آواز ہوتی تھی۔ شاعر اپنے آپ کو عورت سمجھ کر اپنی گفتگو بیان کرتا تھا۔ ممکن ہے اس دیوانے پن پر اس وقت کا معیار پسند مسکرا دیتا ہو۔ ظرافت کی ایک قسم ہمیں قدیم زمانے میں زٹل کے نام سے ملتی ہے جس کے لئے جعفر زٹلی کا نام اب تک مشہور ہے۔ جعفر زٹلی ایک پیشہ ور شاعر تھا جس نے اپنی اس قسم کی شاعری کو ذریعۂ روزگار بنا لیا تھا۔ ظرافت کی ایک اور شکل اس زمانے میں ایہام گوئی تھی۔ یہ ایک لفظی صنعت تھی جس میں ذو معنی الفاظ استعمال کئے جاتے تھے ؎

اب دین ہوا زمانہ سازی — آفاق تمام دھر رہا ہے

شاہ حاتم سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ظرافت کی حقیقی روح کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ ریختی، زٹل اور ایہام گوئی سے ہٹ کر انھوں نے ظریفانہ رنگ میں شعر کہے لیکن ظرافت کے حقیقی مقام کے تعاقب میں وہ بہت پیچھے رہ گئے اور ؎

حق میں عاشق کے تجھ سیاں کا بچن — تند ہے، خشکہ ہے، شکر ہے

جیسے اشعار ان کی بیاض میں ملتے ہیں۔

سودا کا نام قدیم ظرافت نگاروں میں سرفہرست لکھا جاسکتا ہے لیکن سودا کی ظرافت کی بنیاد "ہجو" تھی۔ ہجو سے ہٹ کر ظرافت میں ان کا کوئی مقام نہیں۔ ان کے ہجویہ کلام کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کی ہر نظم کو قبولیت عامہ کی سند مل جاتی تھی۔ سودا کے اس رنگ نے مُدّت تک دیرپا اثر ڈالا اور ہجو اردو شاعری میں ایک مستقل ظریفانہ صنف کے طور پر داخل ہوگئی۔ لیکن جہاں تک ان کی ہجویہ نظموں کا تعلق ہے، ان کو شخصیات کی تلخی نے بے مزا بنا دیا ہے۔ وہ فتح کے غرور میں اس قدر پست ہو جاتے ہیں کہ ان کو اپنا شاعرانہ مقام بھی یاد نہیں رہتا۔ بہرحال شخصیات کے داخلی اور تنگ دائرے سے بھی جب ان کی نگاہیں خارجی ماحول پر پڑتی ہیں تو ان کی شوخی اپنے لئے فطری ماحول پاکر خوب چمکتی ہے۔ اپنے مشہور گھوڑے کی رفتار کا اندازہ ان کے اس شعر سے لگائیے ؎

پیچھے اسے لگا کر تا ہووے یہ رواں — یا بادبان باندھ، پون کے دو اختیار
کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ — کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار

میر قنوطیت کا امام ہے۔ اس کے ہر شعر میں حزن و ملال کروٹیں لیتا دکھائی دیتا ہے لیکن آنسوؤں کی اس برسات میں کبھی کبھی وہ قہقہے کی بجلی بھی چمکا دیتا تھا۔ مرغ بازوں کے بارے میں وہ کہتے ہیں ؎

آدمی جو بڑے کہاتے ہیں — مرغ مارے بغل میں آتے ہیں
ان نے پر جھاڑے یہ پھڑکنے لگے — ان نے کی نوک یہ کڑکنے لگے
مرغ کی ایک پرفشانی ہے — ان کی صد رنگ بدزبانی ہے

ظرافت کی یہ بنیادیں اگرچہ بہتر مستقبل کی ضمانت نہیں تاہم ان سے اصلاح اور نشوونما کی ایک توقع ضرور تھی لیکن بعد کو ماحول نے اسے اس کے برعکس کردیا۔ ابتذال اور پھکڑپن کی گرم بازاری ہوگئی۔ ممکن ہے یہ اس معاشرت کا نتیجہ ہو جس سے اُردو ادب گزر رہا تھا۔ شاعرانہ نوک جھونک شخصی مخالفت، خودبینی، ان سب عیبوں نے دماغی توازن کو بگاڑ دیا اور ظرافت سے سنجیدگی کا عنصر بالکل غائب ہوگیا، جرأت، مصحفی، انشاؔ اور رنگین یہ سب باہمی نقلی پیکار میں الجھ گئے اور زندگی اور ادب کی بجائے ان پر ذاتیات کا رنگ چڑھ گیا۔ جرأت ظریف بھی تھے اور ستم ظریف بھی۔ انشاء بن کر انہوں نے جو کچھ کیا وہ سب کو معلوم ہے لیکن ان کی ظرافت اور ستم ظریفی، دونوں کا تعلق محض ان کی داخلی زندگی سے ہے۔ ادب میں انہوں نے اس کے کوئی دیرپا نقوش نہیں چھوڑے انشاؔ کی ظرافت اور ان کی زندگی کا انجام ایک افسانے کے رنگ میں اُردو ادب کے ہر متعلم کو معلوم ہے۔ لیکن ان کی ظرافت بھی ان کی ادبی تخلیق سے زیادہ ان کی زندگی کے واقعات اور لطیفوں میں ہے۔ جہاں انہوں نے ظرافت کے رنگ میں شعر کی طرف رخ کیا ہے وہاں وہ کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔

اُردو ادب کی ابتداء سے لے کر اس دور تک ظرافت سے منہ چڑانے کا کام لیا گیا یا پھر اس کے ذریعے دل کی بھڑاس نکالی گئی، زندہ دلی کا اجتماعی تصور، اس انفرادی تسکین کے مقابلے میں نشوونما نہ پاسکا۔ لیکن بہت جلد ہمیں نظیر اکبرآبادی کا نام ملتا ہے جس نے ادب سے ذاتی تسکین کے مقصد کو خارج کرنے کی کوشش کی اور سماجی ضمیر کے بیدار کرنے کے لئے اردو میں عوامی شاعری کی بنیاد ڈالی۔ ایک حقیقی ماحول سے جہاں زندگی اپنے اصلی روپ میں بے نقاب ہوتی ہے زندہ دلی کو خارج نہیں کیا جاسکتا ؎

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے	یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے	ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے

بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

ظرافت کی یہی سنجیدگی ہے جو دلوں کو گدگداتی ہے۔ اس کے بعد غالبؔ کو آپ حالیؔ کے لفظوں میں "حیوانِ ظریف" کہہ لیجئے تو کہہ لیجئے لیکن ان کی ظرافت بھی، ایک سنجیدگی سے کم نہیں معلوم ہوتی اس لئے اس کو ظرافت نگاروں کی صف میں کھڑا کرنا ستم ظریفی ہوگا۔

اس کے بعد تک ہمیں کوئی ایسا مزاحیہ نقش نہیں ملتا جس پر نگاہیں رک سکیں تا آنکہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے زندگی کی طرح ادب میں ایک انقلاب پیدا کیا۔ ادب کی دوسری صنفوں کی طرح ظرافت اور مزاح کا رنگ بھی نئے سانچوں میں ڈھلنے لگا۔ قدیم انداز ظرافت کے برخلاف اب یہ سمجھا جانے لگا کہ ظرافت، زندگی کی ایک طنزیہ تنقید ہوتی ہے۔ ظرافت نگار یا مزاحیہ نگار کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ سرکس کے مسخرے کی طرح قلابازی لگائے یا کرزدعورت کی طرح دشمن کے سامنے ناچنے لگے بلکہ وہ منہ بگاڑے بغیر ایک ایسا منتر پڑھتا ہے جس کے اثر کو غیر شعوری طور پر انسانی ذوق قبول کرلے۔ ادبی ظرافت کا مقصد ذاتی طمانیت یا تماشاگری نہیں بلکہ وہ زندگی اور سماج کی کمزوری تک رسائی اور اس پر ایک خوش گوار تنقید کا نام ہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ اب مزاح اور ظرافت کا مفہوم طنز لطیف ہے۔ غرض خودبینی، حسد اور شخصی مخالفت کی بجائے ایک وسیع النظری اور نیک نیتی ہی ظرافت کو اس کے صحیح مقام پر پیش کرسکتی ہے۔ میرے ایک دوست نے صحیح کہا ہے کہ:-

"ظریف وہی ہے جو ہنستا ہنساتا ہو تو یہ نہ محسوس ہو کہ وہ جان بوجھ کر ہمارے شعور اور احساس پر کوئی وار کر رہا ہے اس کا ہنسنا ہنسانا خندۂ بے محل نہ معلوم ہو، اس کی ظرافت دلوں میں یہ احساس پیدا کردے کہ زندگی ایک خندۂ مسلسل نہ سہی لیکن زندگی کے بے شمار آنسوؤں کو

مسکراہٹوں میں جذب تو کیا جاسکتا ہے۔

جدید ادب کے دو جھیدیں میں محمد حسین آزاد کی تحریروں سے جدید طرز ظرافت کی ابتدائی جھلکیاں نظر آتی ہیں تذکرۂ آب حیات میں ان کے مخصوص رنگ نے جہاں شاعروں کی زندگی کے ظریفانہ رخ کو پیش کیا ہے وہاں ایک سنجیدہ ظرافت انگڑائی لیتی ہوئی دکھائی دیتی ہے حالی بھی ایک سنجیدہ معنا کی ہلکی مسکراہٹ بن کر کہیں کہیں نمودار ہوتے ہیں لیکن ان کی یہ لہر ایک تیز رفتار بجلی سے زیادہ نہیں جو بہت جلد غائب ہوجاتی ہے۔ اکبر الہ آبادی کو البتہ ہم جدید مزاحیہ ادب کے نقیب کی حیثیت سے پیش کرسکتے ہیں۔ ان کے کلام میں لطیف طنز کا ایک سیلاب ہے، جو اپنی شوخیوں اور رنگینیوں کو لئے آگے بڑھ رہا ہے اور جیسا کہ میں ایک دفعہ کہہ چکا ہوں "انہوں نے سماج کو اس طرح ہنسایا کہ دل رونے لگا"

خدمت قومی میں بارے جاں نثاری ہوگئی	اس قدر میں کھا گیا اتنا کہ نکلی تن سے جاں
یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں	مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
علمی مباحثے ہوں ذرا آکے پاس لیٹ	بی بی گر پروٹ ہوں تو بھی گو پروٹ
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں	ہم ایسی سب کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں

ایسے ہزاروں شعر ہیں جن کو دو دھاری تلوار کہنا چاہئے۔ یہ تبسم کے ساتھ ہونٹوں پر لہراتے ہیں اور دل کی دھڑکن بن کر آنکھ سے آنسو ٹپکاتے ہیں۔ اکبر کی ظرافت کا یہ اعجاز ہے۔

نثری مزاحیہ ادب کا حقیقی دور نذیر احمد سے شروع ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں کے اسلوب میں ایک سنجیدہ بے تکلفی ہے۔ وہ تلخ حقائق پرسے مسکراتے ہوئے نقاب اٹھاتے ہیں اور اس طرح اٹھاتے ہیں کہ دیکھنے والے مسکراتے مسکراتے اپنی صورت اپنے آئینے میں دیکھ لیں۔ ان کی تحریر کونین کی گولی ہوتی ہے۔

"باورچی خانے یا اصطبل میں یا گھنٹے آدھ گھنٹے کھڑے کھڑے داڑھی مونچھ سنوار آہستہ سے عمامے کو ذرا اور جمالیا، چغے کے دامن سمیٹے اور بڑے مقطع بن کر ہاتھ باندھے نیچے نظریں کئے ڈرتے ڈرتے دبے پاؤں کوٹھی کی طرف بڑھے۔ خدمت گار اور اردلی، چپراسیوں نے تو احاطے کے باہر ہی تاڑ لیا تھا۔ کوٹھی کے پاس آتے دیکھ ادھر ادھر کو ٹل گئے۔ تھوڑی دیر زینے کے نیچے ٹھٹکے کہ کوئی آدمی نظر آئے تو اوپر چڑھنے کا قصد کریں۔ چلنے کی باتوں کی اور چیزوں کے رکھنے اٹھانے کی آوازیں ہیں کہ چلی آتی ہیں۔ مگر کوئی آدمی نظر نہیں آتا آخر ناچار ستون کی آڑ میں جوتیاں اتار ہمت کرکے بے بلائے اوپر پہنچے۔ کرسی نہیں، مونڈھا نہیں، فرش نہیں کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں۔ لوٹ چلیں۔ پھر خیال آتا ہے کہ الیلہ ہو لوٹتے کو صاحب اندر آئینوں میں سے دیکھ لیں، شرمندگی کے ٹالنے کو وہیں تھوڑی سی جگہ میں ٹہلنا شروع کیا۔ اتنے میں باورچی خانے کی طرف سے ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا۔ جی خوش ہوا کہ اس سے صاحب اور اردلی کے لوگوں کا حال معلوم ہوگا۔ وہ لپک کر دوسرے دروازے سے اندر گھس گیا اور ادھر کو رخ بھی نہ کیا غرض کوئی آدھ گھنٹے اسی طرح کھڑے سوکھا کئے۔ بارے خدا خدا کرکے ایک چپراسی اندر سے چٹھی لئے نمودار ہوا۔ کیا کریں اپنی غرض کے لئے گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے۔ حیا اور عزت کو بالائے طاق رکھ کر آپ منہ پھوڑ کر اس کو متوجہ کیا، کیوں جمعدار کچھ طاقات کا بھی ڈھنگ نظر آتا ہے۔ بس اس کو ڈپٹی کلکٹری کا ادب سمجھو یا شکایت کا ڈر۔ مگر میں جانتا ہوں ادب اور ڈر تو خاک نہیں۔ صرف اسی بات کا لحاظ کہ ٹھہر کی

فوجداری پر ہے"۔ خدا جانے کب موقع آپڑے۔ چاروناچار اچھتا ہوا اسلام کرکے جیسے کوئی مکھی اڑاتا ہے اس کو کہنا پڑا کہ آج [illegible]"۔

نذیر احمد کے بعد اُردو ادب میں سنجیدہ ظرافت اور مزاح نگاری کے کوئی ایسے نقوش نظر نہیں آتے جن کو نمایاں کہا جاسکے البتہ جب اودھ پنچ اخبار نکلنا شروع ہوا تو اردو ادب میں مزاح نگاری نے ایک مستقل صنف کی حیثیت اختیار کرلی۔ اکبر الہ آبادی کی نظمیں اور منشی سجاد حسین کے مزاحیہ مضمون اسی اخبار کے واسطے مقبول ہوئے۔

اُردو مزاحیہ ادب کے جدید دور میں رشید احمد صدیقی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ ان کو مزاحیہ نگار سے زیادہ طنز نگار کہنا درست ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں طنز یہ تنقیدی مزاح کے معیار کو برقرار رکھ سکتی ہے رشید احمد اپنے مطالعہ، مشاہدے اور ذوق نظر کے باعث موجودہ مسائل پر اس طرح طنز کرتے ہیں کہ شوخی اور سنجیدگی کا ایک خوش گوار امتزاج ہو جاتا ہے۔ واقعاتی تسلسل یا اپنے مرکزی تخیل کے گرد گھومنے کی بجائے وہ اپنے خیالات کے مختلف مسائل اور زندگی کی تصویر کے مختلف پہلوؤں کو مربوط انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ تنوع کے ذریعے غایت کی طرف پڑھنے والوں کی توجہ کو پھیر لیتے ہیں۔ ان کی تحریر کے پیچھے واقعاتی پس منظر کام کرتے ہیں۔ وہ صرف ہنساتے نہیں بلکہ اپنے پختہ اسلوب کے ذریعے دعوتِ فکر و نظر بھی دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں پر آرنلڈ کا وہ مشہور قول صادق آتا ہے کہ ادب زندگی کی تنقید ہے۔

رشید احمد کے بعد ہم پطرس کا نام لے سکتے ہیں۔ یہ آواز کی دنیا میں اب کچھ اس طرح گم ہیں کہ ان کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ان کی خاموشی سے اُردو ادب ایک ممتاز ظریف ادیب سے محروم ہوگیا۔ ان کے بعض مزاحیہ مضمون ظرافت کے بہترین نمونے کہے جاسکتے ہیں۔ پطرس کو میں ایک لحاظ سے رشید احمد پر ترجیح دوں گا۔ پطرس پیچیدہ راہوں پر نہیں لے جاتے اور نہ پیشانی پر شکنیں لاتے وہ اپنی بے ساختگی سے ہنسی کو متعدی بنا دیتے ہیں۔ لیکن مسائل تک پہنچنے میں وہ رشید احمد کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

اور ایک ادیب کا نام میں بغیر جھجکے لوں گا۔ یہ ادیب خاموشی سے کام کر رہا ہے۔ محمد فضل الرحمٰن کے ڈرامے آپ پڑھیے ان میں جگہ جگہ طنز لطیف اور شستہ ظرافت کے ایسے نمونے ملیں گے جن کو اُردو کے مزاحیہ ادب میں بلند مقام دیا جاسکتا ہے۔ وہ سماجی کمزوریوں پر ہنستے ہوئے اور ہنساتے ہوئے وار کرتے ہیں۔ مکالموں میں بعض وقت وہ لفظوں کے الٹ پھیر سے بلند طنز کا اس طرح کام لیتے ہیں، سنجیدگی، ظرافت اور ظرافت سنجیدگی معلوم ہونے لگتی ہے اور پڑھنے والا سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ وہ ہنسے یا غور کرے۔

ان ادیبوں کے علاوہ برگشتہ (سید محمد اکبر وفا قانی) ناکارہ حیدرآبادی، شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی کا شمار بھی مزاحیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ بھی مزاح نگار کہے جاسکتے ہیں۔ برگشتہ اور ناکارہ .... ظرافت کے بعض اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔ شوکت تھانوی تو مزاح نگار کی حیثیت ہی سے مشہور ہیں ان کی "سودیشی ریل" ہمیشہ چلتی رہے گی۔ عظیم بیگ چغتائی کو ان کی بلا نویسی نے مشہور تو کردیا لیکن دوڑ کے شوق میں وہ اپنی چال کو نبا ہ نہ سکے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کو میں ماضی کی آواز کہوں گا۔ وہ ماضی کے سہارے جیتے ہیں اور ان پر ان کی زبان اور اسلوب اس قدر چھایا ہوا ہے کہ جدید ادب کے تنقیدی اصول کی طرف وہ توجہ نہیں کرتے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ واقعاتی کشش اور اسلوب کے بے ساختہ پن سے ہنسا ضرور دیتے ہیں۔ ان سب ادیبوں سے الگ ملّا رموزی نے "گلابی اُردو" کے نام سے مزاح نگاری کا ایک طرز اختیار کیا۔ یہ "ایجا دبندہ" اپنے نئے پن کے باعث کچھ دنوں تک تمسخر کا سامان فراہم کرتی رہی لیکن ذوق کی پاکیزگی نے اس کی پذیرائی نہیں کی۔ اب کچھ دنوں سے ہم نوجوان بیدی کو بھی ایک اچھے طنز نگار کی

حیثیت ... ہے ہیں۔ یہ اُن کی ابتداء ہے اسلئے ان کے متعلق فی الوقت کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی لیکن ان کی ... اٹھان بتاتی ہے کہ وہ ایک بلند مستقبل کے مالک ہوں گے۔ ظرافت چونکہ ایک فطری چیز ہے اس لئے سنجیدگی کے پُرسکون سمندر میں بھی بعض وقت ظرافت کی لہریں اٹھتی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کے وہ شعر جن میں اکبرالہ آبادی کے قہقہوں کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔ معصومہ راشدالخیری کی "نانی عشو"، خواجہ حسن نظامی کی بعض تحریریں امتیاز علی تاج کا "چچا چھکن" ان سب میں ظرافت اور طنز کے بعض اچھے نمونے ہیں۔

اُردو مزاحیہ ادب کا یہ ذخیرہ حوصلہ افزا نہیں۔ لیکن جب ہم ہندوستان کی قنوطیت پسندی اور یاس انگیزی پر غور کرتے ہیں تو ایک مضبوط محاذ کے خلاف یہ چند حملے بھی ہمیں غنیمت معلوم ہوتے ہیں۔ پہلے تو اس حزن اور یاس کے دبیز پردوں کو چاک کرنا ہے جس کے پیچھے ہماری افسردہ زندگی پل رہی ہے جب آنسو سوکھ جائیں گے تو ہونٹوں پر تبسم کی لہریں خود اٹھیں گی اور ہمارے ادیب یہ محسوس کریں گے کہ زندگی صرف آنسو نہیں ہے۔

میکش

گریہ و تبسم ۔ صاحبزادہ میکش کی نظموں اور غزلوں کا بہترین مجموعہ ہے۔ جناب میکش حیدرآباد کے نوجوان شعراء میں ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں اور ان کا کلام بہت مقبول ہے۔ عالی جناب ڈاکٹر نذر صاحب کا دیباچۂ عمومی اور جناب پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

صفحات (۱۹۲) طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر سنہری نام قیمت دو روپے

انوار ۔ حضرت علی اختر حیدرآبادی کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ علی اختر صاحب ہندوستان کے چوٹی کے شاعروں میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پُرگو شاعر ہیں بلکہ حیات اور شباب پر اُن کی نظر بہت وسیع ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شعر اُن کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہے۔ موجودہ زمانے میں سوائے جوش کے کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں۔ اس مجموعے کی اشاعت سے اُردو شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا ہے۔

صفحات (۱۲۸) قیمت ۸؍

نمود زندگی ۔ جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے جو نہایت سلیقہ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں ۱۰۱ نظمیں ۱۷ غزلیں اور ۵ رباعیات ہیں۔ سید علی منظور صاحب حیدرآباد کے پختہ مشق مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی شاعری کے قدردان دور دور پھیلے ہوئے ہیں اُردو کا کوئی مشہور و مستند رسالہ ایسا نہیں جس میں آئے دن ان کی غزلیں اور نظمیں نہ چھپتی ہوں اور پھر یہ نظمیں ایک رسالے سے دوسرے رسالے میں نقل کی جاتی ہیں۔ علی منظور صاحب عہد حاضر کے ان چند کامیاب شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں زندگی کی صحیح ترجمانی کی اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی۔

صفحات ۲۱۲ قیمت ۸؍

[illegible]

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی ! — نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

عجب بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی — نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

سینے جگر کے درد کا چارہ کب آئے گا — یک بار ہو گیا ہے دوبارہ کب آئے گا

تیلی ہاری نین جھروکے میں بیٹھ کر — پل پل ہو جھانکتی ہے پیارا کب آئے گا

اس مشتری جبیں کا مجھے غم ہوا زحل — طالع مرے کا نیک ستارہ کب آئے گا

ملا ولی سراج کے تذکرہ کے بعد چند اور مشہور شاعروں کے مختصر حالات اور نمونہ کلام کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ تاکہ اس دور کی خصوصیات پر روشنی پڑ سکے۔

محرم | محمد ماہ نام محرم تخلص، نواب شجاعت خاں صوبہ دار کے فرزند تھے۔ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ خوش فکر اور خوش مذاق تھے اس لئے تھوڑی مدت میں شعر گوئی میں نام پیدا کیا۔ فارسی شعر بھی کہتے تھے۔ ۱۱۶۰ھ میں انتقال کیا۔ نمونۂ کلام ؎

نزاکت بس کہ رکھتا ہے وہ دلدار جہاں آرا — صفائی آئینہ ہے یار اس کے عکس عالی کا

بہار آوے تو بلبل کو قفس میں قید مت کرنا — تو ایسا ظلم اس بیکس پہ اے صیاد مت کرنا

ایہا | میر بخشی عاشق علی خاں ایہا خوش حال خاں قاقشال کے نواسے تھے۔ نانا کے انتقال کے بعد منصب و خطاب خانی سے سرفراز ہوئے طبیعت شوخ پائی تھی۔ فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ تاریخ گوئی میں بہت اچھی مہارت تھی۔ ۱۱۸۱ھ میں انتقال ہوا۔ ان کا ایک شعر بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے ؎

طبیب عشق سیں پوچھا زلیخا نے علاج اپنا — کہا تجھ پر بھلا ہے سورۂ یوسف کا دم کرنا

داؤد | مرزا داؤد نام تھا اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ ولی کے شاگرد تھے اس لئے ان کے کلام میں ولی کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ چنانچہ داؤد نے بعض اشعار میں ولی اورنگ آبادی کا ذکر کیا ہے مثلاً ؎ کہتے ہیں سب اہل سخن اس شعر کو سن کر — تجھ طبع میں داؤد ولی کا اثر آیا

بعد از ولی ہوئے ہیں کئی شاعر و لیکن — داؤد شعر تیرا مشہور ہے دکن میں

داؤد اپنے کو ولی کا جانشین سمجھتے تھے اور اس کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎ حق نے بعد از ولی تجھے داؤد — صوبۂ شاعری بحال کیا

لچھمی نارائن شفیق نے اپنے تذکرہ چمنستان شعرا میں ان کے حالات اور وفات کا قطعۂ تاریخ لکھا ہے جس سے ۱۱۶۸ھ نکلتی ہے۔ قطعہ یہ ہے ؎

گو برفتہ میرزا داؤد از فانی جہاں — بلبل گلزار معنی طوطی رنگین بیان

مصرع تاریخ خوش گفت ہاتف — از غم آباد جہاں بگزشت چوں تیر از کماں

ایک چھوٹا سا قلمی دیوان یادگار چھوڑا ہے جس میں تقریباً پانچ سو اشعار ہیں یہ نسخہ ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں ؎ احوال چشم یار سے پوچھ — حقیقت درد کی بیمار سے پوچھ

ناتواں مجھ کو جوں ہلال کیا — اس صنم کے خیال ابرو نے

قانون شفا نطق میں ہے یار کے موجود — اے دل نہ ہو محتاج طبیباں کے دوا کا

عاجز | عارف الدین خاں عاجز اورنگ آباد کے مشاہیر شعرا سے ہیں۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کی ایک مثنوی "لعل و گوہر" بہت مشہور ہے ان کا اردو دیوان سنگلاخ زمینوں اور مشکل مضامین کی وجہ سے مشہور ہے۔ آخری عمر میں ناندیڑ میں مقیم تھے کہ ۱۱۸۰ھ میں وفات پائی۔ اور وہیں مدفون ہوئے۔ انھوں نے خود ہی اپنے نام عارف الدین خاں عاجز سے اپنی تاریخ وفات نکالی تھی۔ وہ نہایت ظریف الطبع اور بذلہ سنج تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎ چمن میں جا کے وہ رنگیں ادا جب مسکراتا ہے — گلوں سے رنگ اڑ کر لالہ سا جنگل کو جاتا ہے

ہمارا اشک خونیں یاد میں گلرو کے بہہ بہہ کر — نگہ کو رشتۂ تسبیح یاقوتی بناتا ہے !

عاشق وحشی کی گر تصویر کھینچا چاہئے — اول اس کے پاؤں میں زنجیر کھینچا چاہئے

کمتر | مرزا مغل کمتر اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں تربیت پائی۔ فارسی اور اُردو میں شعر کہتے تھے۔ سراج اورنگ آبادی سے تلمذ تھا ۱۱۸۵ھ میں انتقال کیا۔
نمونۂ کلام کے لئے صرف دو شعر پیش کئے جاتے ہیں ؎ ذرا تو لگ گلے ساقی ہے موسم بے حجابی کا
کہ جاری فیض بارش سیں ہوا چشمہ گلابی کا
مجھے اس بات پر کمتر تعجب سخت آتا ہے
مرے رونے پہ ہنسنا قہقہہ کر کر گلابی کا

عشرت | خواجہ ابو البرکات خاں عشرت اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد شعر و سخن کی طرف توجہ کی۔ طبیعت موزوں اور فکر رسا پائی تھی تھوڑے دن میں چمک گئے اور مشہور شعرا میں شمار ہونے لگا۔ سراج اورنگ آبادی کے شاگرد تھے ۱۱۸۶ھ میں بمقام اورنگ آباد انتقال کیا۔ ان کے چند شعر یہ ہیں ؎
گلشن دل میں اگر سرو خراماں گزرے
رشک خوبی سے گلستاں میں طوفان گزرے
کیا ہوا حاصل تمہیں توڑے سے اس مغلس کا دل
ہاتھ آتا زر اگر تم توڑتے نرگس کا دل

سامی | سید غلام قادر سامی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ علم و فضل اور شعر و سخن کا ذوق پیدا کیا اور قادر الکلام شاعر بن گئے۔ تمام شہر میں ان کے کلام کی دھوم تھی شاگردوں کا حلقہ بھی وسیع تھا۔ درویش صفت اور با اخلاق بزرگ تھے۔ متعدد امرا ان کے معتقد اور شاگرد تھے ۱۱۹۶ھ میں انتقال کیا اور اورنگ آباد میں دفن ہوئے۔ ان کے دیوان کے متعلق تذکرۂ محبوب الزمن جلد اول میں عبد الجبار ملکاپوری نے لکھا ہے۔ "آپ کا دیوان و قصۂ سرو شمشاد میرے کتب خانۂ نوادر میں موجود تھا ۱۳۲۶ھ کی طغیانی میں کتب خانہ کے ساتھ تہ آب تلف ہوگیا۔ کتب خانۂ آصفیہ و کتب خانۂ سالار جنگ میں دیوان و قصہ کو تلاش کیا نہیں پایا"

حسن اتفاق سے ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں سرو شمشاد کا قصہ محفوظ ہوگیا ہے۔ اس کے آغاز کے دو شعر یہ ہیں ؎
کیا یک تازہ جشن بادشاہی
درخشاں شب کو نور صبح گاہی
ہزاروں شمع اور قندیل روشن
زمین و آسمان گلزار و گلشن

اب ایسے شاعروں کو پیش کیا جاتا ہے جو ۱۲۰۰ھ کے بعد بھی زندہ تھے۔ ان میں سے چند مشہور یہ ہیں۔

جناب موہن لال اورنگ آباد میں پیدا ہوئے کھتری قوم سے تعلق تھا بہت اچھے خوش نویس اور انشا پرداز تھے۔ فارسی اُردو میں شعر کہتے تھے ۱۲۰۲ھ میں وفات پائی نمونۂ کلام یہ ہے ؎
آب آنکھوں سے کم ہوا رو رو
چشمۂ آفتاب کی سوگند
دل سے وسواس دور کر آ مل
مجھ کو تیرے جناب کی سوگند

نثار | مرزا محمد خان نام وزارت خاں خطاب۔ نثار تخلص تھا۔ ابتدائے سن شعور سے شعر کہنا شروع کیا اردو، فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ سراج اورنگ آبادی سے اصلاح لیتے تھے ۱۲۱۲ھ میں انتقال کیا۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎ نہ ہوتے شور رونے سے مرے آنسو اگر جاری
نہ صحرا سبز ہو جاتا نہ دریا جوش میں آتا
کیا آتیں چڑھا کر آتا ہے شوخ ہم پر
یہ بانکپن کی طرزیں کس نے سکھائیاں ہیں
بس کہ روتا ہوں تری یاد میں آ گھر میں
مردم چشم مرا مردم دریائی ہے

شفیق | لچھمی نارائن شفیق لالہ منسارام کے فرزند تھے۔ ۲ صفر ۱۱۵۸ھ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کی طرح تصنیف و تالیف اور شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق پیدا کیا تھا۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اردو میں صاحب اور فارسی میں شفیق تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں مثلاً چمنستان شعرا، شام غریباں، گل رعنا، ماثر آصفی اور بساط الغنائم لکھیں۔ پہلی تین کتابوں میں شاعروں کے تذکرے ہیں۔ ۱۲۱۴ھ میں وفات پائی۔

تمنا | اسد علی خاں تمنا اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ آصف جاہ ثانی کے ساتھ حیدر آباد چلے آئے۔ کلیات کے علاوہ دو کتابیں تذکرۂ گل عجائب اور مقالات الغرائب مرتب کیں۔ گل عجائب اردو شاعروں کا تذکرہ ہے جو انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ ۱۲۰۳ھ میں وفات پائی۔

یہ تھی اورنگ آبادی دور کے شاعروں کی مختصر کہانی۔ اگر اس دور کے شاعروں پر کوئی قلم اٹھائے تو ایک مبسوط تذکرہ مرتب ہو سکتا ہے۔

خواجہ حمید الدین

قسمت

لڑکپن اور بچپن کے کھلنڈرے دن گزار کر نجمہ جب کچھ ہوش سنبھالنے لگی تب اسے اپنی ہمجولیوں کو سمجھنے اور اپنے اردگرد کے حالات کو ان کے اصل روپ میں دیکھنے کی سدھ بدھ ہوئی۔ تو وہ تو جیسے کھوئی گئی۔ جو نجمہ دن بھر کھیل کود میں مگن رہتی تھی، اب کسی تنہا مقام میں سب سے الگ تھلگ بیٹھی کچھ سوچا کرتی۔ اس کی ماں تاڑ گئی تھی کہ نجمہ کے دل پر یہ کیسی خود فراموشیاں اپنا اثر ڈال رہی ہیں۔ لیکن نجمہ جیسی لاڈلی بیٹی کو وہ کس طرح سمجھا سکتی تھی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے نجمہ کو کام کاج میں لگے رہنے اور کھیلنے کودنے کے لئے کہتی۔ لیکن نجمہ جیسے بہری ہو۔ سب کچھ سنتی اور اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوتی۔ آپ جانئے لڑکیوں کے دل کنول کی طرح پاک اور کومل ہوتے ہیں اور سوچنا۔ اف ... یہ سوچنا تو جیسے تند و تیز آندھی کی طرح دل و دماغ کی ساری فضا کو متزلزل کر دیتا ہے۔ مگر کوئی نجمہ کے دل سے پوچھتا کہ وہ آخر کس سوچ میں گم ہے۔ اس نے ابھی دنیا کو دیکھا ہی کیا ہے!! ۔ آپ شاید اسے نہ جانتے ہوں لیکن مجھے اس کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ وہ میرے پڑوس میں رہتی تھی اور جب وہ ننھی سی بچی تھی اس وقت سے ہمارے گھر میں اس کا آنا جانا تھا۔ وہ گھنٹوں ہمارے پاس کھیلتی، باتیں کرتی رہتی۔ توفیق میرا ایک بھانجا تھا۔ وہ بھی اس کا ہم سن تھا۔ نجمہ اور توفیق ایک دوسرے کے بڑے گہرے دوست بن گئے اور ہر کھیل میں دونوں کا ساتھ ہونا ضروری ہو گیا۔ بچپن کا یہ معصوم دلی تعلق۔ کسی کے لئے بھی قابل اعتراض نہ تھا ــ ہوتا بھی کیوں؟ ۔ توفیق کو اس کے ماں باپ نے بلا لیا تو وہ بادل ناخواستہ ہمارے ہاں سے چلا گیا۔ نجمہ کو اس کے چلے جانے کا بڑا دکھ تھا۔ لیکن توفیق کو روکے رکھنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ مجبوری کے اس احساس نے اس کے دل پر ایسا گہرا اثر چھوڑا کہ وہ الہڑ اور کھلنڈری لڑکی سے ایک بے جان مورت میں بدل گئی اور اپنے آپ ہی سوچتے رہنے کو زندگی کی اصل غایت سمجھنے لگی۔ میں بھی اس کی اس تبدیلی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی ماں سے میں نے ایک دن کہا "دیکھئے! نجمہ گہرے پانی کی طرف بڑھتی جا رہی ہے آپ اسے سنبھالئے"۔ اس کی ماں نے مایوس لہجہ میں کہا۔ "بھائی میں تو اپنی سی کر کے ہار گئی۔ وہ تو مانتی ہی نہیں۔ بس جب دیکھو سوچتی رہتی ہے۔ ٹہلتی رہتی ہے ..... نہ اُسے کھانے پینے کا ہوش ہے اور نہ کپڑوں کی سدھ۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میری نجمہ کا کیا ہوگا"۔ اتنا کہہ کر وہ رو پڑیں مجھے بھی بڑا دکھ ہوا۔ میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں نجمہ سمجھدار بچی ہے۔ آج نہیں تو کل ضرور اپنے بھلے برے کو جان لے گی۔ بہتر ہے کہ آپ اسے اپنے حال پر چھوڑ دیں"۔ نجمہ کے باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ ایک شاعر تھے۔ نجمہ کو اس کی حساس طبیعت اپنے باپ ہی سے ورثے میں ملی تھی۔ شاعر باپ نے اپنی بیوی اور بیٹی کے لئے مال و دولت نہیں چھوڑا صرف انہیں چھوڑ گیا۔ نجمہ کی ماں محنت مزدوری سے اپنا اور اپنی بچی کا پیٹ پالتی تھی۔ نجمہ اپنی سہیلیوں کو زرق برق کپڑے پہنے ہوئے دیکھتی۔ ان کے قیمتی کھلونے دیکھتی اور اس کا دل اندر ہی اندر اپنی کم مائیگی پر آنسو بہاتا۔ وہ اپنی ماں سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن ماں کی مجبور بے کسی اس کی زبان بند کر دیتی۔ وہ اپنی ماں سے لپٹ کر رونے لگتی ــ مجھے چند دن بعد کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے ان دونوں ماں بیٹیوں سے مجھے ایک گونہ دلچسپی پیدا ہو چلی ہے اور کچھ نہیں تو میں اس المیہ کا تماشائی بننا چاہتا تھا، جو قسمت ان کی زندگی کے واقعات سے تیار کر رہی تھی۔ میں حتیٰ المقدور ان کی مشکلوں کو دور کرتا اور نجمہ کی تعلیم کے اخراجات بھی میں نے اپنے ذمہ لے لئے تھے۔ نجمہ اس عرصے میں پھر اپنی دنیا میں واپس چلی آئی۔ وہ ہنسنے بولنے لگی تھی۔ سہیلیوں کے ساتھ سیر و تفریح بھی کرتی۔ لیکن میں دیکھتا تھا کہ غریبی کے احساس سے بعض وقت اس کی روح کے ہر تار میں جھنکار اٹھتی ــ اور اس کی آنکھوں میں درد و غم کے آنسو چھلکنے لگتے۔ میں نے اسے کئی دفعہ سمجھایا کہ وہ مجھے اپنا ہمدرد سمجھے۔ اپنا عزیز سمجھے۔ اپنی جو ضرورت ہو مجھ سے بیان کرے لیکن اس نے کبھی اپنی طرف سے پہل نہیں کی۔ وقت گزرتا گیا۔ ہماری زندگیوں میں کوئی خاص انقلاب یا کوئی قابلِ ذکر تبدیلی نہیں ہوئی۔ ہاں اتنی بات ضرور ہوئی کہ نجمہ اب بچی نہ رہی۔ حسن و شباب کی بہاروں میں وہ ایک نورس کلی کی طرح جھوم رہی تھی ــ کہ اسی زمانے میں توفیق آیا۔

وہ بھی اب اونچا پورا جوان تھا.... توفیق نے نجمہ سے ملنے کی کوشش کی۔ لیکن نجمہ ہمیشہ اس سے کتراتی رہی۔ توفیق نجمہ کی اس بے اعتنائی
اور سرد مہری پر پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔ وہی نجمہ جس نے بچپن کی سہانی گھڑیوں کو اس کے ساتھ کھیل کود میں گزارا اب ایسی بدل گئی کہ
بات کرنے کی بھی روادار نہیں ہوتی۔ وہ اس تبدیلی کے اسباب سوچنے لگتا۔ لیکن وہ سوائے اس کے کچھ اور نہ سمجھ سکتا کہ نجمہ اب بہت حسین ہو گئی ہے
بہت بڑی ہو گئی ہے۔ بس اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ نجمہ کی ماں نے ایک دن ادھر ادھر کی باتوں کے بعد نجمہ کی شادی کا ذکر چھیڑا۔
کہنے لگیں "کوئی اچھا لڑکا نظر میں ہو تو نجمہ کا خیال رکھو"۔ تھوڑی دیر بعد اس نے رکتے رکتے کہا "توفیق اچھا لڑکا ہے۔ نجمہ کو شاید وہ پسند بھی
کرتا ہے"۔ نجمہ کی ماں سے یہ جملہ سن کر میں عجیب کشمکش میں پڑ گیا۔ انھیں کیا خبر تھی کہ ان کے کہنے سے پہلے ہی میں نے یہ ذکر چھیڑ دیا تھا۔
اور توفیق کے ماں باپ نے سرے سے انکاری جواب دیا تھا۔ ان کا توفیق لائق اور دولتمند ماں باپ کا بیٹا تھا۔ وہ کسی غریب خاندان سے
کس طرح ناتا جوڑ سکتے تھے۔ میں بات کو اس طرح ٹال گیا "آپ توفیق کے بارے میں اتنا اچھا خیال رکھتی ہیں۔ اور وہ ہے بھی اچھا لڑکا۔
لیکن آپ کو شاید معلوم نہیں کہ شادی اس کے ماں باپ کی مرضی کے بغیر نہ ہو گی اور اس کے ماں باپ نے تو شاید کوئی لڑکی ڈھونڈ رکھی ہو گی۔
نجمہ کی ماں جیسے ایک دم بجھ سی گئیں۔ مایوس نظروں سے مجھے دیکھا اور چلی گئیں۔ دوسرے ہی دن توفیق کو کسی ضروری کام کے لئے اس کے
ماں باپ نے بلا بھیجا اور اس کے بعد توفیق کے خط سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ ضروری کام اس کی شادی ہے، جو ایک متمول گھرانے میں طے پائی ہے۔
توفیق نے صرف اپنی شادی کی اطلاع دی تھی۔ میں چاہتا تھا وہ اس شادی سے اپنی نارضامندی ظاہر کرتا۔ وہ مجھے کچھ کرنے کے لئے کہتا۔ میں نے
اس کے لئے کیسے کیسے منصوبے سوچ رکھے تھے۔ میں نے نجمہ کے دل میں اس کے لئے کتنی جگہ پیدا کر دی تھی۔ اس کی کیسی کیسی تعریفیں کی میں نے۔
کیسا طلسم میں نے باندھا تھا، اور یہ توفیق تو بڑا ہی سنگدل نکلا۔ میں نے حتی الامکان اس خبر کو نجمہ سے چھپانے کی کوشش کی۔ لیکن گھر والوں
میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں تو نجمہ کے کان میں بھی اس کی بھنک پڑ گئی۔ ایک دن نجمہ کی ماں میرے پاس آئیں۔ کہنے لگیں "کچھ نجمہ کی بھی خبر ہے
آپ کو"۔ اور انھوں نے جو نجمہ کا حال سنانا شروع کیا ہے تو میں تو سر تھام کر بیٹھ گیا۔ کہہ رہی تھیں "چند دن سے پھر وہی پرانی سوچتے رہنے کی عادت
شروع ہو گئی ہے اور اب تو اس کا اثر ایسا گہرا نظر آ رہا ہے کہ اس کی صحت کے لالے پڑ گئے ہیں کونے میں بیٹھی آنکھیں بند کئے رہتی ہے۔ کبھی
کچھ کھا لیا تو کھا لیا نہیں تو ویسی ہی پڑ کر سو رہی۔ اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ کبھی ہنسنے لگتی ہے تو کبھی رو پڑتی ہے۔" "تو پھر اب
آپ نے کیا سوچا ہے"؟ میں نے دھیمے لہجہ میں پوچھا۔ کہنے لگیں "سوچا کیا ہے۔ یہی کہ اب میں خود زہر کھا کر سو رہوں۔ نجمہ کی ایسی حالت
اب مجھ سے تو نہیں دیکھی جاتی۔" میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ذرا ایک بار توفیق کے ماں باپ سے مل آتا ہوں۔ پھر اس کے بعد
کوئی نہ کوئی ترکیب سوچ نکالیں گے"۔ میں توفیق کے ماں باپ سے مل کر کیا کرتا؟ وہ تو دولت کے پجاری تھے انھیں دلوں کی نزاکتوں کا کیوں کر
خیال ہوتا اور وہ میری بات کیوں ماننے چلے۔ پھر میں نے سوچا نجمہ کے علاج کا بہانہ خوب رہے گا۔ اس طرح وہ نجمہ کو دیکھ بھی لیں گے اور ممکن ہے
نجمہ کی صورت اس کی قسمت بنا دے۔ توفیق کے ماں باپ کا دل پسیج جائے۔ میں نے نجمہ کی ماں سے بڑی مشکل سے نجمہ کو اپنے ساتھ لے جانے کی
اجازت لی اور ہم دونوں شہر روانہ ہو گئے۔ راستے میں میں نے نجمہ کو زندگی کی تلخیوں اور زمانے کے نشیب و فراز سے واقف کرانے کی کوشش کی۔ لیکن
مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ اس مسئلے کو مجھ سے بہتر سمجھ چکی ہے اور اب وہ میری باتوں کو اس طرح سن رہی ہے جیسے کوئی استاد بچہ کا آموختہ سنتا ہے۔
میں نے یہ رنگ دیکھا تو دوسرا ہی ذکر چھیڑ دیا۔ نجمہ نے تھوڑی دیر بعد اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سو گئی۔ جب ہم شہر پہنچے تو میں نے اپنے ایک عزیز کے
ہاں ٹھیرنا مناسب سمجھا اور دوسرے دن توفیق کے ماں باپ سے ملنے کے لئے گیا۔ توفیق کے گھر میں خاصی چہل پہل تھی۔ شادی کی ابتدائی

بڑے تپاک سے ملاقات کی۔ ایک علیحدہ کمرے میں مجھے بٹھایا اور تھوڑی دیر بعد وہ خود بھی میرے پاس آکر بیٹھ گئے۔ میں بڑی مشکل میں تھا کہ جس مقصد کی تکمیل کے لئے میں آیا تھا اسے کس پہلو سے چھیڑوں کہ خود انھوں نے اس مسئلہ سے متعلق بات چیت شروع کی۔ کہنے لگے "توفیق کی قسمت بڑی اچھی ہے جو اسے ایسا اچھا سسرال ملا ہے"۔ میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا "لیکن کیا توفیق بھی اس شادی کو پسند کرتا ہے"۔ توفیق کے والد نے ایک زوردار قہقہہ لگایا "آپ پسند کی پوچھ رہے ہیں۔ ارے وہ تو پھولا نہیں سما رہا ہے۔ اسی کے اصرار سے تو شادی اتنی جلد قرار پا گئی"۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے نجمہ کے ساتھ میں بھی کسی گہرے سمندر میں غرق ہوا جا رہا ہوں۔ میں نے اب زیادہ گفتگو مناسب نہ سمجھی اور باہر نکل کر توفیق کو ڈھونڈنے لگا۔ توفیق اپنے چند دوستوں کے ساتھ ہنسی دل لگی میں لگا ہوا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ گھر والوں کی خیریت پوچھی۔ دبے دبے لفظوں میں نجمہ کے بارے میں بھی پوچھا۔ "وہ کیسی ہے شادی میں آ رہی ہے یا نہیں"؟ میں نے جواب دیا "ابھی سے تمہیں مبارکباد دینے کو کہا ہے"۔ "ماموں جان" توفیق کہنے لگا "آپ اسے اپنے ساتھ لے آئے ہوتے۔ یہاں شادی کی دلچسپیوں میں دل لگی رہتی"۔ "ہاں" میں نے اس طرح غصہ سے دانت پیستے ہوئے کہا کہ توفیق ہکا بکا رہ گیا۔ اپنے گھر آکر میں نے نوجوانوں کے بارے میں ایسی خراب رائے قائم کرلی کہ مجھے توفیق جیسے بھانجے کا ماموں ہونے پر شرمندگی سی تھی۔ نجمہ سے میں نے کہا کہ وہ خود کیوں نہ توفیق سے مل لے۔ وہ اس زور سے ہنس پڑی کہ میں سہم کر رہ گیا۔ وہ مسلسل ہنستی رہی اور آخر میرے سامنے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے سنا جیسے کوئی سسکیاں بھر رہا ہے۔ تڑپا دینے والی، دل میں چبھنے والی سسکیاں! میرا بھی دل بھر آیا اور میں صحن میں ٹہلنے لگا۔

دوسرے ہی دن ہم گاؤں کو چلے آئے۔ توفیق کی شادی ہوگئی لیکن ہم میں سے کوئی بھی شریک نہ ہوا۔ جس دن توفیق کی شادی ہوئی اس دن نجمہ کی حالت بڑی خراب رہی۔ مجھے تو ڈر ہو رہا تھا کہ کہیں وہ بالکل ہی پاگل نہ ہو جائے۔ میں نے وہ دن بڑی پریشانی کی حالت میں کاٹا۔ نجمہ کو جس شکل سے میں نے سنبھالا ہے اس سے میرا دل ہی اچھی طرح واقف ہے۔ دو تین دن بعد نجمہ کی طبیعت کچھ سنبھلنے لگی لیکن اس کے خیالات کی دنیا میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔ وہ دولت کو اتنی اہمیت دینے لگی کہ ہر قربانی پر اسے حاصل کرنے پر تیار ہو گئی۔ اس نے مجھ سے کئی دفعہ بڑی بڑی رقمیں مانگ لیں۔ وہ محلہ کی بچیوں کو پڑھانے لگی۔ وہ امیر گھرانوں کی عورتوں سے سلوائی کے لئے کپڑے مانگ لاتی۔ غرض جب بھی میں نے اسے دیکھا روپیہ کمانے ہی کی دھن میں سرگرداں دیکھا۔ ایک دن تو نجمہ کی ماں نے یہ خبر بھی سنائی کہ "شہر کے ایک بوڑھے کروڑپتی سیٹھ گاؤں میں آئے ہوئے ہیں کسی جوان لڑکی سے شادی کرنے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں اور نجمہ تُل گئی ہے کہ اس بوڑھے سیٹھ سے شادی کرلے گی"۔ نجمہ کو میں نے سمجھایا۔ جان پہچان کے سارے لوگوں نے سمجھایا لیکن نجمہ اپنی ہٹ سے باز نہ آئی اور جن لوگوں نے یہ نسبت ٹھہرائی تھی انھوں نے نجمہ کی مرضی پاکر بات چیت طے کروا دی۔ ہم سب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ بوڑھے سیٹھ صاحب دولہا بن کر آئے اور نجمہ کو پچاس ہزار روپے مہر پر اپنی دلہن بنا لیا۔ شادی میں ہم سب شریک تھے۔ لیکن اس طرح جیسے کسی کی میت میں شریک ہوں۔ مجھے تو صاف نظر آرہا تھا کہ اس عروسی لباس میں نجمہ نہیں اس کی لاش چھپی ہوئی ہے۔ دوسرے دن میں نے نجمہ کو دیکھا تو سونے اور جواہرات میں لدی ہوئی بیٹھی تھی۔ سیٹھ صاحب نے دل کھول کر زیورات دئے تھے۔ اور نجمہ سچ مچ دیوی بن گئی تھی۔ "کیسی ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ خلاف توقع نجمہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں اسے دلاسا دیتا کھڑا رہا کہ اتنے میں دروازے پر ڈاکیہ نے آواز دی۔ میں نے اپنے نام کا خط وصول کیا۔ خط پڑھ چکا تو میرے ہاتھ لرزنے لگے اور میرے دل پر جیسے کسی نے ایک زور کا گھونسہ لگا دیا۔ توفیق کا خط تھا۔ اور اس نے لکھا تھا کہ اس کے خسر ہمارے گاؤں میں ٹھیرے ہوئے ہیں اور وہ ان کے ساتھ چند دن گزارنے کے لئے اپنی بیوی کے ساتھ آرہا ہے۔ توفیق کے خسر! نجمہ کے دولہا!! خط میرے ہاتھ میں تھا اور میں جیسے ساری فضا میں گھوم رہا تھا۔ مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ نجمہ میرے قریب آئی اور اس نے میرے ہاتھ سے خط لے لیا۔ نجمہ کے دیوانہ وار قہقہوں کی گونج نے مجھے چونکا دیا "نجمہ! نجمہ!!" میں پکارنے لگا لیکن نجمہ کا گھر میں پتہ نہ تھا۔ البتہ اس کے قہقہوں کی آواز باہر کی طرف سنائی دیتی رہی اور یہ آواز آہستہ آہستہ مدھم ہوتی گئی۔ میں دیوار کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا کہ میں کہاں ہوں، کس حال میں ہوں۔ اور قسمت ایک مجبور اور بے سہارا کمزور لڑکی کے ساتھ کس بے دردی سے پیش آرہی ہے۔

رشید قریشی

پتنی

اس نے کبھی مجھے اپنے نام سے نہیں پکارا۔ گجری رنگ محل ہو کر آئی تو ایکناتھ بھائی کو مسٹر سے مخاطب کرنے لگی۔ پتاشہ بھی پڑھ لکھ کر بھی اپنے پتی گوبند سے مگر پینے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر اس ریکھا کو کیا ہو گیا۔ وہ ہمیشہ خاموش ہی رہتی ہے! بہت دیر تک نہ جانے کیا سوچتی رہتی وہ ——

ایکادسی کے روز سدھیر بھیا آئے تو ان کی پتنی کوسلیا کو دیکھ کر مجھے رشک ہونے لگا۔ سچ پوچھئے تو زندگی یہ ہے۔ زندہ دلی اسی کا نام ہے۔ کوسلیا ٹینس کھیلتی ہے سیکل چڑھ جاتی ہے اور ہنسی مذاق میں تو سارے مدن پورہ میں اس کا جواب نہیں۔ چلتی پون ہے جیسے مگر مگ سے لپک گئی ہو۔ اسی لئے تو سدھیر بھیا کی زندگی اتنی مسرت بخش اور پرسکون ہے۔

اور ایک یہ ہے کہ میرے پیر دھو دھو کر حیران ہے ہش۔ مجھے یہ نہیں چاہئے۔ پتنی شریک حیات ہوتی ہے۔ اس کا بھی کوئی مقام ہے۔ آزادی خودداری اور اعتماد نفس۔ یہ سب کچھ چاہئے اس میں۔ کم از کم میں تو یہی چاہتا ہوں۔ یہ بھگوان سمجھ کر پتی کی پوجا کرنا اور اس کے پیر دھونا مجھے پسند نہیں۔ اس سے صنف نازک کی توہین ہوتی ہے۔ اس کی خودداری مجروح ہو جاتی ہے اور پھر وہ شریک حیات باقی نہیں رہتی۔ ایک کنیز بن جاتی ہے۔ کنیز۔ کون ہے وہ جو تعلیم پا کر بھی اپنی پتنی کے ساتھ کنیز کا سا برتاؤ کرنا پسند کرے گا۔ کوئی نہیں۔ اگر نطشے کے فلسفے نے کسی کے دماغ سے لطافت اور حسن کی صلاحیت سلب کر لی ہے تو کیا ہوا۔ ایسے کتنے ہوں گے؟ عورت کو نطشے کی آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ نطشے قاتل آرٹ تھا۔ اپنی جنم بھومی ہی کا دشمن تھا وہ۔ ان سلونی صورتوں کو تو ٹیگور کی سی حسن شناس نظروں سے دیکھنا چاہئے۔ شاعر اور مصور بن کر صنف نازک کے حسن میں لطافت کی رنگینیاں بھر دینی چاہئے۔ مگر یہ کیا۔ اس ریکھا کا تو کوئی مقام ہی نہیں۔ سمجھتی ہے بس یہی اس کا بھگوان ہوں۔ دیوانی عورت ایسا نہیں ہے۔ وہ زمانہ گیا۔ اب مساوات کا دور دورہ ہے۔ اب تو ایسا نہ کر۔ تو اور میں — دونوں میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں۔ برابر برابر کے ہیں۔ نہیں مانتی ریکھا۔ وہی پرانی بات — یہ تو احمق پن ہے۔ بیہودگی۔

وہ میری باتوں پر فلسفی کی طرح غور کرتی شاعر کی طرح سوچتی اور یہ سب کچھ کر کے ایک جاہل اور غبی لڑکی کی طرح بھلا دیتی۔ میں تنگ آ چکا — سدھیر بھائی لوٹتے ہوئے سمجھا گئے۔ ان کی کوسلیا نے تو اپنی سہیلیوں میں یہ بھی کہہ دیا کہ "ریحون نے سونے کے پنجرے میں چڑیا پال رکھی ہے۔" میں یہ کیسے سن سکتا ہوں — کوسلیا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ریکھا اپنے آپ سے۔ اس سنہری پنجرے میں قید ہے۔ میں نے پنجرے کے کواڑ ہمیشہ کے لئے کھلے رکھے۔ میں نے پنجرا ابھی نہیں بنوایا اس کے لئے۔ یہ اپنے آپ قید ہے۔ عورت محدود ہو جاتی ہے تو اس کا دل اور اس کا دماغ دونوں غلام ہو جاتے ہیں۔

ریکھا اڑ تو سہی۔ دیکھ تو آزاد فضاؤں میں زندگی کا سمندر کس طرح ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اری پگلی زندگی افسانہ ہے، اپنے کردار کو آگے بڑھا۔ اوج پر لا اسے، تاکہ اس افسانوی زندگی کا کوئی ایک پہلو ہی نظروں کو لبھا سکے۔

وہ ان باتوں کو نہیں سمجھتی اور نہ ایسی باتیں سننا چاہتی ہے — بھارت دیس کی ایک گرہستی پتنی ہونے پر ہی اسے ناز ہے۔ اب بھلا اسے سمجھائے تو کون؟ میں نے ہزار بار کہا، لاکھ لاکھ کوشش کی کہ ریکھا یہ زندگی نہیں ہے،

یہ سب کچھ گرہستی سے مس دہوئی۔ اسے بس میرے پیر دھونا آتا ہے اور وہ مجھے بھگوان کا اوتار ہی سمجھتی ہے۔

ایک دن مجھے یوں محسوس ہوا کہ مسلسل بارش کی وجہ سے پتھر کی سل گھس گئی ہے۔ میں برآمدے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا "مسز سدھیر نے آل انڈیا اوپن ٹینس کا چیمپین شپ جیت لیا" میرے دل میں خیال ہو رہا تھا کہ ایک ہماری پتنی بھی ہے۔ میں ریکھا کی قدامت پسندی پر دل ہی دل میں کوفت کھا رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں میرے پاس آئی۔ مجھے کیا معلوم کہ آج سے نئی زندگی کا سنگ بنیاد پڑنے والا ہے میں اسی طرح اخبار پڑھتا رہا۔ وہ نرم نرم ہاتھ کانوں کے پیچھے سے گزر کر میری آنکھوں پر ڈھک گئے۔ میں خوشی سے اچھل پڑا۔ ریکھا۔ اس نے للچائی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا —— گھومتی رہی —— میں نے کہا چلو ریکھا بغیچہ میں گھوم آئیں۔ بڑی پُر لطف تھی آزادی کی پہلی شام —— پھر تو ہمارا پتنگ اڑنے لگا۔ اونچا اور اونچا —— بعض اوقات وہ اس قدر اونچا اڑتا کہ مجھ میں سنبھالنے کی طاقت نہ رہتی۔

وہ سینما گئی۔ اکیلی ہی۔ مگر میرے دل میں ایسا خیال کیوں آتا ہے؟ اسے من مانی کرنے کا حق ہے۔ آزاد ہے وہ بھی میری طرح —— میرا دل مان گیا۔ شام وہ دیر سے آئی لیکن میں نے اپنی جدید اشتراکیت نہیں چھوڑی۔ ریکھا بہت خوش ہے۔ اب وہ میرے پیر دھونے اور مجھے بھگوان سمجھنے والی ریکھا نہیں۔ وہ اب مسز جیون ہے۔ ایک آزاد خیال خود دار اور باعزت خاتون۔

ایک روز ریکھا اور میں اپنے بغیچہ میں گھوم رہے تھے کہ سدھیر بھائی آتے ہوئے دکھائی دئے۔ انتہائی پریشان —— جیسے کسی کو قتل کر کے آئے ہوں۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا "سدھیر بھائی۔ بھائی صاحب ——" انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بیری کی کانٹے والی کھدیان کے بیچوں بیچ وہ چپ چاپ کھڑے تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی مجسمہ اپنی ناکام محبت کے جذبے میں ڈوبا ہوا ہے۔ آنکھوں میں سرخی لہرا رہی تھی چہرہ تمتا رہا تھا اور سر کے بال رونگٹوں کی طرح کھڑے تھے —— "کیوں بھائی سدھیر —— کیا ہوا بھائی؟" سدھیر کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ اس نے کہا "جیون میرا گھر لٹ گیا" —— "گھر لٹ گیا؟" "ہاں کوسلیا کا پتہ نہیں ہے" "تو گئی کہاں" —— "جانے کدھر۔ معلوم تو کیا ہوتا" —— سدھیر نے روتے ہوئے کہا "کرن کو جانتے ہو تم" میں سمجھ گیا۔ "تو یہ ہوا کیسے"۔ ریکھا ہنس پڑی —— اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا چلو ڈیر جیون آج سدھیر کو سینما کی سیر کرائیں ——

میرے پیر زمین سے اکھڑ گئے —— قریب کی کانٹی نے مجھے چاروں طرف سے جکڑ لیا —— میں نے کہا ریکھا دیوی تم میرے پیر دھو —— مجھے بھگوان کا اوتار سمجھو —— اور وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی —— میری پتنی!

افضل عابدی

من کی بیتا ۔ محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ ایم اے نے اس کتاب میں متوسط طبقہ کی خواتین کی معاشرتی اور اخلاقی کمزوریوں کو بے نقاب کر کے زندگی کی تلخیوں سے کامیاب مقابلہ کرنے کے طریقے پیش کئے ہیں۔ یہ کتاب بہت ہی دلچسپ پیرایہ میں لکھی گئی ہے خواتین اور خصوصاً موجودہ تعلیم یافتہ خواتین کے لئے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ اس کا ہر گھر میں ہر وقت موجود رہنا ضروری ہے۔ صفحات (۸۰) قیمت مجلد ۸/

سینے ٹوریم

عشرت کو سینے ٹوریم میں آئے ہوئے چھ مہینے گزر چکے تھے، اس طویل مدت میں اس کے مرض نے بھی دوسرے درجے سے تیسرے درجہ میں ترقی پالی تھی جب سے وہ یہاں آیا تھا اس کی دنیا ہی بدل چکی تھی، حسرت نصیب اور تھکی ہوئی دنیا جس کا مستقبل ایک اندھیرے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ مگر کبھی کبھی جب وہ مس آرلی کو دیکھ پاتا تو اس کی آنکھوں میں ایسی چمک پیدا ہوتی جیسے اس کی موت سے ساری دنیا تاباں ہو جائے گی اور اس کی اندھیری زندگی میں نور کی ایک کرن جگمگا اٹھے گی۔ مگر وہ پھر یوں خاموش ہو جاتا جیسے دو عالم کا سکوت ہی اس کی تقدیر ہو۔

اس کے سینے ٹوریم آنے کی داستان بھی کتنی دلچسپ ہے اور کتنی دکھ بھری۔ وہ پوست و استخواں ہی تھا مگر اس کی شخصیت میں جیسے ارسطو و افلاطون چھپے ہوں۔ جامعہ میں اس کی قابلیت اور ساتھ ہی خرابی صحت سے متاثر ہو کر ڈاکٹر فریشی کہتے تھے کہ عشرت (KEATS) کیٹس کی طرح جواں مرگی کا داغ دے گا۔ فلسفہ کے پروفیسر نے عشرت سے متاثر یہ کہا کہ روسو کی طرح علمی نہ ہو۔ ہاں اگر چاہتے ہو تو اس کا علاج اور کا علم اختیار کرو تاکہ تمہاری مخفی طاقتیں اجاگر ہو کر علم و ادب کا بیش بہا خزانہ ہو جائیں۔ مگر عشرت کتابوں میں دفن گھلتا ہی گیا۔ اس کی گرتی ہوئی زندگی کو سہارا دینے کے لئے طبیبوں نے بھی علاج تجویز کیا کہ وہ بیاہا جائے وہ صحت پائے گا اس کی تقدیر بدلے گی اور دنیا بدلے گی۔ توقع بھی یہی تھی کہ وہ رفیعہ کے ساتھ نباہ جنم لے گا۔ رفیعہ میں یہ اعجاز تھا کہ اس کی شہابی آنکھیں اور وہ رخسار جیسے دو گلاب کھلے ہوں، یہ سب اس کی درماندگی اور بجھے ہوئے پن کو ختم کر دیں گے مگر اس کی زندگی میں بہار نہ آسکی اور وہ خاندان والوں کے مشورے سے سینے ٹوریم بھجوا دیا گیا۔

سینے ٹوریم میں وہ تنہا کہاں تھا؟ اس کے کئی ہم نصیب ایک برے حال میں پناہ گزیں موت اور زیست کی کش مکش میں مبتلا تھے۔ اس کے آتے ہی تیسرے روز کشور نے اس ناتوانی میں اپنی آخری سانس لی کہ اس کے ختم ہو جانے پر بھی ڈاکٹر نے نبض ڈھونڈی کہ کہیں وہ آہستہ آہستہ ہی حرکت نہ کر رہی ہو۔ اس کے ختم ہو جانے پر اس کی بہن سوشیلا نے منع کرنے کے باوجود کتنا کہرام نہ مچایا تھا جب کہ کشور ہی اس کے مستقبل کا نگران تھا۔ کشور کے ختم ہونے پر اب کون باقی رہا تھا جو اسے راستہ بتلاتا اور منزل دکھاتا۔

اپنے وارڈ میں کئی ساتھیوں کو دیکھ کر اس کا جی یوں بیٹھ جاتا کہ وہ کل کی بجائے آج ہی مرجانا چاہتا ہے۔ اس کو یوں محسوس ہوتا جیسے یہ سینے ٹوریم صحت کے لئے نہیں بلکہ آنے والی موت سے مقابلے کی تیاری کے لئے بنایا گیا ہو۔ اس کی کھانسی کے دورے اور بڑھ جاتے، اتنے بڑھ جاتے جیسے اس کے گلے میں کھانسی کا پھندا پڑ گیا ہو۔ ایسے میں مس آرلی کی تیمارداری کچھ سکون بخشتی ۔۔۔ وہ مس آرلی سے مخاطب ہو کر کہتا کہ "نرس بہتر یہی ہے کہ تم اس مریض کی جانب زیادہ توجہ کرو جس کی کچھ امید ہے۔ میں تو مہمان ہوں نہ جانے کون سا لمحہ" وہ مسکرا کر یوں جواب دیتی کہ "وہ مریض تم ہی ہو"۔ آرلی کی توجہ اور خدمت گزاری میں وہ ایک معمہ پا رہا تھا۔ جس کو وہ کوشش کے باوجود بھی حل نہیں کر سکتا تھا۔ سارے وارڈ میں یہی مشہور تھا کہ اس سسٹر کا دماغ ساتویں آسمان پر ہے اور وہ ہواؤں میں اڑتی ہے۔ اتنی بدمزاج نرس جس نے کل رشید کو اس قدر سخت ڈانٹ پلوائی کہ اگر وہ بار بار اپنی شکایت نرس سے کہتا رہے تو سینے ٹوریم سے نکال دیا جائے گا۔ حالانکہ رشید زندگی کی آخری منزل میں تھا۔ سخت تکلیف کے باعث کہہ اٹھتا تھا کہ پسلیاں ترخ رہی ہیں، ٹوٹی جا رہی ہیں۔ شش میں یوں تڑک اٹھ رہی ہے جیسے بچھو ڈنک پر ڈنک لگاتے جا رہے ہیں۔ مگر وہ بے پرواہ بنی ناول پڑھتی یا

کرمشیاں ہی صرف دیتی۔

عشرت سینے ٹوریم میں کیا آیا وہ کہیں سے کہیں پہونچ گئی۔ جب کبھی عشرت کو کھانسی کے پھندے پڑ رہے ہوتے ہڈیاں چٹ چٹا [illegible] وہ مضطربانہ دوڑتی ہوئی آکر دوا کا ایک خوراک دیتی یا آرام سے سلانے کی کوشش کرتی۔ سارے وارڈ کو چھوڑ کر عشرت کے قریب وہ یوں ہوتی کہ خود اپنا پتہ بھول گئی تھی۔ عشرت کے ایک بازو ولیم پڑا ہوا تھا جو ایک سال سے سینے ٹوریم میں تھا وہ جب کبھی اپنا ٹمپریچر مانگتا تو آرلی بائے سے کہہ کر آگے بڑھ جاتی۔ مگر عشرت کی حرارت وہ کئی بار لینے سے بھی اکتاتی نہ تھی۔ ولیم نے ایک روز عشرت سے کہہ ہی دیا کہ آرلی کے سیب وانار سے تمہارے چہرے پر خون دوڑ رہا ہے۔ مگر آرلی میں بھی ہر لمحہ ایک نئی بہار آرہی ہے۔ وہ جب تمہارے قریب آتی ہے تو مجسم بہار بن کر آتی ہے۔ اس کا رواں رواں مست ہوا جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں چاندنی جوت در آتی ہے اور تم بھی اس کے انار وسیب سے ——"

عشرت بے معنی ہنسی ہنس کر ولیم کو جواب دینا چاہتا تھا مگر ولیم پر سانپ سا لوٹ جاتا کہ اس کا وجود کئی مریضوں کو بد سے بدتر بنائے جا رہا ہے —— آرلی یہ چاہتی تھی کہ عشرت بھلا چنگا ہو جائے —— وہ آرلی کی دنیا کا محور بنا ہوا یوں گھوم رہا تھا جیسے اس کی زندگی کے دن پھر جانے والے ہیں۔ آرلی عشرت کے قریب محض اس لئے ہوئی جا رہی تھی کہ وہ ایک غیر معمولی مریض تھا۔ ایسا مریض اس سے پیشتر سینے ٹوریم میں کبھی نہ آیا۔ جو درد اور کرب کے انتہائی عالم میں بھی چیختا چلاتا نہ تھا بلکہ اپنی مٹھیاں بھینچتا ہوا پیر اکڑایا ہوا ہونٹ سکیڑ کر درد وغم کو شکست دینا چاہتا تھا۔ کھانسی کے سخت حملوں میں بھی اپنی آپ مدد کر لیتا مگر نرس کو نہیں پکارتا۔ جب کبھی لے پر آتا ہے تو اقبال کا کلام گنگنا لیتا یا دریچے میں سے ان میدانوں کو دیکھتا جہاں صبح وشام دق کے مریض کھلی ہوا لینے کے لئے قدم قدم لنگڑاتے لنگڑاتے یا پہیے دار کرسیوں پر گھوم رہے ہوں۔ اس کی آنکھوں میں اس کی شخصیت میں ایک طلسم تھا جس میں وہ گرفتار ہوئی جا رہی تھی۔ اس سینے ٹوریم کی دنیا میں اس کے لئے خواں کے سوا اور دھرا ہی کیا تھا —— تمام ڈاکٹر یہی ڈاکٹر یا مریض ہی مریض —— ڈاکٹر تو تمام نرسوں کے دوست تھے —— آرلی، آلمیڈا، مائیکل، روزالی اور تمام —— اس لئے آرلی ان ڈاکٹروں سے ناامید تھی۔ ایک مرتبہ اس کی زندگی میں صبح طلوع ہوئی تھی جب کہ شمالی ہند کے طبی کالج کے لڑکے عملی تعلیم حاصل کرنے سینے ٹوریم آئے تھے۔ ان میں کلیم نے آرلی کو مسحور کر رکھا تھا۔ جب تک کلیم سینے ٹوریم میں رہا آرلی کو دوجہاں حاصل تھے اور جب وہ چلا گیا یہ طلسم بھی ٹوٹ گیا۔ اب اس کی دنیا میں مرتے ہوئے جسموں کی کراہ، کھانسی کا وہ شور جیسے رہٹ چل رہے ہوں۔ خر خر کھڑ کھڑ —— آق۔ آہ، اوہ —— سسکیاں، آہیں، ٹوٹتی ہوئی سانسیں، چھوٹتی ہوئی نبضیں —— پتھرائی ہوئی آنکھیں۔ ٹھنڈے جسم اور بسورتے ہوئے چہرے۔ ان کے سوا اور دھرا ہی کیا تھا ——" وہ ان کو دیکھتے دیکھتے اس قدر برہم ہو چکی تھی کہ اس کو قرار نہ تھا۔ جب عشرت سینے ٹوریم آیا وہ اپنے میں آپ آتی گئی اور اس کے قریب سے قریب تر ہونے لگی ادھر آرلی میں یہ تبدیلیاں ہوئیں اور ادھر عشرت میں ایک انقلاب آیا۔ آرلی کے دلنشین خطوط میں اس کو رفیعہ جھلکتی دکھائی دی۔ آرلی کی مرمریں بانہیں ان پر نیلی رگیں، بھرے ہوئے بازو، یاقوت جیسے لب، چہرہ کے دلنشیں نقوش یہ سب رفیعہ میں رچے نظر آئے جس نے اپنا گہنا پاتا بیچ کر عشرت کو سینے ٹوریم بھیجا تھا۔ وہ آرلی کے حسن وجمال کے سہارے آگے بڑھنے لگا۔ گو کبھی کبھی وہ یہ سوچنے لگتا کہ آرلی کی گفتگو اور اس کا عمل اپنے اندر ایک معنی لئے ہوئے ہیں

یہاں آکر وہ رک جاتا اور انہیں تلاش کرنا شروع کرتا ۔ اس لمحہ اس پر بحرانی عالم طاری ہو جاتا۔ کھانسی، سسکیاں، کراہ یہ سب اسے علاقہ چھٹنے گر آرلی آکر نجات دلاتی ۔ آرلی کی اس نجات دہندگی سے وہ یہ سمجھ بیٹھتا کہ وہ اپنا فرض ادا کر رہی ہے ۔ اس کے علاوہ جب کبھی رات میں آرلی کی ڈیوٹی رہتی اس کا ساتھی ڈاکٹر اس کو یوں دیکھتا جیسے وہ آرلی کو کائنات کے رموز و نکات سمجھانا چاہتا ہے ۔ ایک مرتبہ آرلی نے بھی اس سے کہا تھا کہ سینے ٹوریم میں اکثر جوان عمر جوان سال مریض ہی آتے ہیں نہ جانے گھل گھل کر مرنے والے یہ نوجوان ہی کیوں ہوتے ہیں ۔ اس مرض سے اس کو سخت نفرت ہے ۔ وہ اس کو ہندوستان کی خوش قسمتی سمجھتی ہے کہ لیڈی لنلتھگو ہندوستان کو ایک بڑے دشمن سے نجات دلا رہی ہیں ۔ ہزاروں دلہنوں کا سہاگ، ہزاروں معصوموں کے باپ یہ سب برقرار و زندہ رہیں گے"۔ جب وہ ان معنوں کو سمجھ جاتا تو آرلی اس کے لئے کوئی دشوار معمہ نہ رہتی۔ وہ آرلی کے سہارے ہی بڑھتا رہا ـــــ بڑھتا رہا!

ایک صبح وہ بہت مسرور تھا ۔ غالب اور داغ کی غزلیں گنگناتا ہوا مسکرا پڑتا تھا ۔ اس کی رقصاں مسرت اور سرور دیکھ کر آرلی شاداں شاداں چلی آئی ـــ اور یہ یقین لے کر آئی کہ آج اپنے دل کی تمام کیفیتیں اور سارے راز عشرت کو سنا دیگی ۔ آرلی کو دیکھتے ہی قہقہہ اور خندہ میں بے خود عشرت پکار اٹھا "سسٹر آرلی آج میری رفیعہ آرہی ہے ـــ تم جیسی ہی شکیل، خوبصورت، دلفریب اور مہ پارا ـــ پیاری گڑیا"ـــ آرلی کی آنکھوں میں دھندسا چھا گیا ۔ رخساروں پر کھلے ہوئے گلاب چند لمحوں کا روپ دھار گئے ـــ چاند سے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور دو جہاں لرز کر منہدم ہوتے دکھائی دئے ۔ وہ ایک مجسمہ بنی عشرت کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی ـــ آنکھوں میں آنسو بھر آئے ـــ لیکن نہ جانے اس کے کیا سمائی کہ دوسرے ہی لمحہ وہ تھرما میٹر اور چارٹ لئے تمام مریضوں کی حرارت لینے لگی ۔ عشرت پر سکتہ سا ہو گیا ـــ وہ رفیعہ آنے کے بعد بھلا چنگا سینے ٹوریم سے چلا گیا ۔

سینے ٹوریم کی فضا میں دوائیاں، انجکشن، اسٹریچر، پہیے دار کرسیاں، بیڈ پان، مریض، ان کی کراہیں، سسکیاں یہ سب آرلی کو ایک افسانہ سناتے ہیں ۔ ولیم نے ایک روز آرلی سے پوچھا ـــ " وارڈ بائے کہتا تھا کہ دق کے مریضوں کی روحیں شیطان بن کر ستاتی ہیں" آرلی نے گردن ہلا کر اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا ـــ " صرف مردوں کی نہیں بلکہ زندوں کی روحیں بھی" وہ یوں سہم کر آگے بڑھی کہ ولیم بھی خوفزدہ ہو گیا ـــ اس نے اپنی حالت کا جائزہ لیا ۔ بنیان ہٹا کر اپنی پسلیاں گنیں، پوست و استخواں کو باہم دگر دیکھا ـــ اور خود کو زندہ بھوت سمجھا ـــ اور یہ سمجھا کہ اسی کو دیکھ کر آرلی خوفزدہ ہو گئی ـــ حالانکہ وہ عشرت کا بھوت تھا ـــ بیچارہ ولیم کیا خوب سمجھا ـــ آرلی کو عشرت کا زندہ بھوت ڈرا رہا تھا، وہ سراسیمہ بنی، خیالوں میں الجھی نہ جانے آگے کدھر بڑھ رہی تھی ـــ سینے ٹوریم میں رہ کر وہ سینے ٹوریم کے باہر ایک زندہ بھوت سے کھیل رہی تھی ۔

محبوب حسین جگر

اطلاع: ـــ نئے سال کا چندہ روانہ کر کے شکریہ کا موقعہ عطا کیجئے ۔ مطبوعہ رسید کے بغیر چندہ نہ دیجئے ۔ اضلاع کے خریداروں کے نام رسالہ بذریعہ وی پی بھیجا جا رہا ہے ۔ وقت پر وی پی حاصل فرمائیں

مہتمم

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(illegible)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(illegible)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

شاعرِ مشرق کی یاد

اقبال کو گزرے ہوئے چھ سال ہوتے ہیں۔ اس عرصے میں اس کے بلند افکار سے بقدرِ فہم استفادہ کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اس کا تصورِ حیات ایک متحرک اور ارتقائی زندگی کی تخلیق تھا اس لئے اگر اس کے پیام نے اپنی کشش سے انسانیت کو اپنی طرف کھینچا ہو تو تعجب کی بات نہیں۔ وہ ادب کا نہیں مرکز تھا جس میں حیات آفرین تازگی ہو۔ اقبال کی ادبی تخلیق حال کو سنوارتے ہوئے ایک بلند تر مستقبل کی تعمیر کے لئے تھی۔ نقطہ رسی اور تصور سازی کے اس تغیر پذیر دور میں جبکہ زندگی اپنے لئے ایک صحت بخش راستہ ڈھونڈ رہی ہے، اقبال کا آرٹ ہمیں ایک روشن شمع کی طرح دکھائی دیتا ہے۔

اقبال ایک ارتقائی شاعر تھا۔ اس کی مسلسل فکری تبدیلیاں بتاتی ہیں کہ وہ اپنے ذہنی و روحانی تسکین کے لئے ہر لحظہ وسیع تر ماحول ڈھونڈ رہا تھا ہے۔ وہ تقلیدی اثر اس کے کلام پر بہت دن تک نہیں رہ سکا جو داغ زدہ ماحول کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد اس کی منظر پرستی اور اس کا احساس وطنیت بھی زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکا اور رفتہ رفتہ اس کی فکر و نظر نے اس کی ذہنی بلندی اور اس کی ذہنی وسعت کو اسلام کے توسط سے ساری انسانیت پر محیط کر دیا اور یہیں ہمیں اس کی شخصیت اور اس کا آرٹ اپنے اصلی روپ میں دکھائی دیتا ہے۔

اقبال نے اس آرٹ سے بیزاری کا اظہار کیا ہے جس میں بہزاد کے حسن کا جادو شیروں کو سلا دیتا ہے۔ آرٹ افیونی کا خواب بیداری نہیں، اور نہ ایسی نامعلوم منزل ہے جہاں سے کسی راہرو کا پلٹ آنا ممکن نہ ہو۔ اس کے نزدیک آرٹ منزل نہیں بلکہ منزل تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ آرٹ بجائے خود حسن ہے جس کی حرارت دلوں میں ایک ولولہ، ایک جستجو اور ایک خواہش پیدا کرے۔ اس کے نزدیک آرٹ کا مقصد ایک مسلسل حرکت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حسن کار ایک بلند پرواز شہباز کی طرح فلک پیمائی کر سکتا ہے لیکن اسے اتنا اختیار ہونا چاہیے کہ وہ اپنے شکار کے نیچے اتر سکے۔ آرٹ خارج کا تابع نہیں بلکہ اس کا ناقد اور حسن کار کے حقیقی جذبات کا مظہر ہے۔ اس نے ایک مقام پر بتایا ہے کہ آرٹ آزادی کا حصہ ہے۔ غلامانہ ذہنیت اس سے گریز اور فرار کا کام لیتی ہے۔ غلاموں کے الفاظ تماشائیوں کے لئے جاذبِ نظر ہوتے ہیں لیکن آزاد قوموں کے حسن کارانہ نقوش اربابِ نظر کو معنی کی گہرائیوں میں لے جاتے ہیں۔ حسن خود ہم میں موجود ہے لیکن غلام فکر حسن کو فطرت سے مستعار لے کر اس کی نقل اتارتی ہے۔
غرض یہ کہ اقبال کے نزدیک آرٹ ایک اظہار ہے جو اپنے خواہش کی تخلیق اور حقیقت کو متشکل کرتا ہے۔

اقبال کا آرٹ، شہنائی کا دھیما نغمہ نہیں بلکہ ایک بانگِ درا ہے۔ وہ لوری نہیں بلکہ ایک پیامِ بیداری ہے۔ وہ بے لفظوں کا کفن نہیں بلکہ حرکت و حیات کا ایک پرچم ہے۔ اس کی بلند خیالی، اس کی وسعتِ نظر، اس کی حسن کارانہ صداقت اور اس کا خلوصِ اظہار ان سب کا ایک ہی مقصد تھا کہ وہ انسانیت کو اس کے صحیح مقام پر دیکھے۔ ایک ایسے زمانے میں جب کہ دنیا نظر فریب تصورات کے ہجوم میں انسانیت کے لئے ایسے مقام کو ڈھونڈ رہی ہے جہاں مجاور قبروں کی تقسیم میں لاشوں کو روندتے ہوئے نہ گزریں۔ اقبال کا کلام اور اس کا پیام ہماری صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔ آج چھ سال کے بعد بھی ہماری عقیدت مندی، اس کا خراجِ تحسین ادا کرنے میں اسی طرح فخر محسوس کر رہی ہے اور ہمارا استقبالِ تعمیرِ نو میں مدد لینے کے لئے اس کے پیام سے بنیادیں مانگ رہا ہے۔

میکش

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ایک جز ہے۔ اسی لئے کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی نبی کو لوگوں نے شاعر سمجھ لیا۔ اور بعض شاعر اگر نبی نہیں تو کم از کم متنبی ہو گئے۔ حضرت اقبال کو فطرت نے یہ ملکہ غیر معمولی مقدار میں ودیعت کیا۔ شروع میں انھوں نے کسی قدر تقلیدی اور رواتی شاعری بھی کی اور ایک زمانہ ان پر ایسا بھی آیا کہ ان کو خیال پیدا ہوا کہ ان کی قوم شاعری سے سست عمل ہو گئی ہے لہذا بہتر ہو اگر شاعری کی شراب کی کشید اس قوم کے لئے بند کر دی جائے اور کوئی علمی اور عملی کام کیا جائے۔ اپنے دوست سر عبدالقادر کے سامنے انھوں نے اس ارادے کا اظہار کیا۔ یہ اسی زمانہ کا مصرع ہے۔

کہ کام جو کر رہی ہیں قومیں، انھیں مذاق سخن نہیں ہے

سر عبدالقادر اور سر آرنلڈ نے ان کو یقین دلایا کہ تمھاری شاعری وہ شاعری نہیں ہے جو عمل کی منافی ہو۔ بلکہ اس کے ذریعہ سے تم قوم کے اندر زبردست قوت عمل پیدا کر سکتے ہو۔

اس کے بعد حضرت اقبال نے ترک شاعری کا خیال چھوڑ کر شاعری سے وہ کام لینا شروع کیا جو اردو فارسی شاعری کی تاریخ میں کسی دوسرے شاعر نے نہیں لیا۔ شاعری کی جو عام کیفیت اقبال سے پہلے تھی۔ اس کا نقشہ کھینچنا یہاں مقصود نہیں ہوس پرستی قافیہ پیمائی زبان کا چٹخارہ عام شاعری کا سرمایہ تھا۔ حالی نے دوسری روش اختیار کی تو شاعروں نے کہنا شروع کیا کہ یہ شاعر نہیں واعظ ہے۔ اسی طرح مدت دراز تک شاعروں نے اقبال کو بھی شاعر نہیں سمجھا جس زمانہ میں میں طالب علم تھا اقبال کی مشہور نظمیں شمع و شاعر شکوہ اور جواب شکوہ شائع ہوئیں۔ میرے سامنے انھوں نے اس امر کا نہایت افسوس ظاہر کیا کہ ہماری قوم کے نقاد کسی نظم کی نفسیات پر تنقید کرنا نہیں جانتے۔ اپنی نظموں پر جب کبھی کوئی تنقید دیکھتا ہوں تو اس میں یہی ہوتا ہے کہ فلاں لفظ کو دہلی یا لکھنؤ والے مذکر باندھتے ہیں۔ اقبال نے مونث باندھا۔ فلاں محاورہ ٹکسالی نہیں ہے۔ فلاں مصرع میں پہلوئے ذم بھی نکلتا ہے۔ کوئی خدا کا بندہ یہ نہیں کہتا کہ یہ نظم تاثیر کے لحاظ سے کیا ہے۔ اس کا نظریۂ حیات کیا ہے۔ فقط حضرت اکبر الہ آبادی نے ان کو لکھا کہ میں آپ کی نظم شمع و شاعر کو پڑھتا نہیں بلکہ اس کی تلاوت کرتا ہوں۔ اور سوتا ہوں تو اس کو اپنے تکیہ کے نیچے رکھتا ہوں۔ جب اقبال کی شاعری رفتہ رفتہ مقبول خاص و عام ہو گئی۔ اس وقت بھی بعض مشہور شاعر اقبال کو شاعر نہیں سمجھتے تھے اور بعض ایسے شعرا اب بھی موجود ہیں اگر کبھی داد دینے میں فراخدلی برتتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ بھائی اس کو حکیم کہو علامہ کہو مصلح کہو لیکن شاعر نہ کہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی شاعری کو اور متقدمین اور متاخرین میں اپنے جیسوں کی شاعری کو معیار قرار دے لیا ہے۔ اور اقبال ان کو اس معیار پر کم عیار معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت اقبال کی بلند نظری کا تقاضا کہ انھوں نے ایسے لوگوں سے کبھی الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے لبوں پر بھی غالباً وہی مصرعہ آتا ہو گا جو حضرت مسیح کی بابت انجیل میں مرقوم ہے کہ انھوں نے اپنے ایذا رسانوں کی نسبت فرمایا کہ اے خدا انھیں معاف کر کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ حضرت اقبال کے ہاں شاعری کا مقصد اور اس کا معیار اس قدر مختلف ہو گیا تھا کہ یہ لوگ اقبال کو شاعر نہیں سمجھتے تھے اور اقبال ان کو شاعر نہیں سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ ایک شاعر نے اپنا دیوان میرے پاس بھیجا ہے۔

یہ مشہور آدمی ہیں میں نے شروع سے آخر تک مختلف نظموں پر نظر دوڑائی۔ کہ خدا کا بندہ کہیں بھول کر کوئی شعر کہہ جائے لیکن دیکھ کہ تمام دیوان میں ایک شعر بھی نہیں نکلا حضرت اقبال نے شاعری کا معیار اتنا بلند کر دیا کہ ان کے سامنے اور ان کے بعد بھی اب روایتی غزل گوئی اور قافیہ پیمائی لوگوں کی نظروں میں نہیں جچتی۔ اگرچہ حضرت اقبال کے اثر اور ان کی ہر دلعزیزی نے اردو شاعری میں ان کی نقالی کا ایک طوفان بےتمیزی بھی پیدا ہو گیا ہے۔ جس اخبار یا رسالے کو اٹھاؤ ایک یا دو نظمیں ایسی ضرور مل جائیں گی جن میں کسی نہ کسی صاحب نے اقبال بننے کی کوشش فرمائی ہے۔ ان نظموں کا معیار اکثر بہت پست ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی ہوس پرستی کے تغزل کے مقابلہ میں یہ بھی غنیمت معلوم ہوتی ہیں۔ حضرت اقبال کی شعر گوئی میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ کبھی فرمائشی نظم نہیں لکھ سکتے تھے۔ ابتدا میں وہ ایک مشاعروں میں شریک ہوئے اس کے بعد تمام عمر کبھی کسی مشاعرے میں شریک ہونے کی خواہش ان کے دل میں پیدا نہیں ہوئی۔ لوگ ان کی طبیعت کے اس انداز سے خوب واقف ہو گئے تھے۔ لاہور میں بڑے بڑے معرکے کے مشاعرے ہوتے تھے۔ لیکن کبھی کوئی شخص حضرت اقبال کو مدعو کرنے کی بھی جرأت نہیں کرتا تھا۔ مشاعروں میں شعر پڑھنا تو درکنار احباب کی صحبتوں میں بھی وہ کبھی کبھار اپنی مرضی سے کوئی شعر یا نظم سنا دیں تو سنا دیں ورنہ نہ وہ عام طور پر شعر سناتے تھے۔ اور نہ ان کی طبیعت کو جاننے والے ان سے شعر سنانے کی درخواست کرتے تھے۔ جب وہ حیدرآباد تشریف لائے تو ایک مشہور شاعر نے ان کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ مقصد یہ تھا کہ اپنا کلام سناؤں گا اور ان کا کلام سنوں گا۔ اس بے چارے نے اپنا سر پیٹ لیا۔ لیکن حضرت اقبال نے ایک شعر سے بھی ان کی دعوت کی قیمت ادا نہ کی۔ اور اس سے زیادہ صدمہ اس شاعر کو اس بات کا ہوا کہ حضرت اقبال نے بھی اس سے فرمائش کی کہ حضرت کچھ اپنا کلام سنائیے۔ یہی حال ایک بڑے امیر کبیر کی محفل میں ہوا جس نے بہت سے امیروں اور قافیہ پیماؤں کو ان سے ملنے کے لئے جمع کیا تھا۔ حضرت اقبال نے اس شرط پر دعوت قبول فرمائی کہ میں شعر نہیں پڑھوں گا۔
ایک دفعہ مجھ سے فرماتے تھے کہ میں نے کبھی شعر کی خاطر شعر نہیں کہا۔ جب تک خاص کیفیت خود بخود پیدا نہ ہو میں شعر نہیں کہتا میں آورد سے شعر کہنے کا قائل نہیں ہوں۔ ایک مرتبہ دنیاوی حیثیت سے ایک بہت بلند ہستی کا نزول اجلال علی گڑھ میں ہوا۔ یونیورسٹی کی طرف سے ایک مقتدر بزرگ لاہور تشریف لائے اور علی گڑھ کے ارباب حل و عقد کی طرف سے گزارش کی کہ یہ ایک بڑا اہم موقع ہے۔ آپ علی گڑھ تشریف لائیے اور ایک نظم پڑھ دیجئے۔ دن بھر وہ صاحب ان کی منت سماجت کرتے رہے کوئی بھی اور شاعر ہوتا تو اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا لیکن اقبال تھے کہ بالکل ٹس سے مس نہ ہوئے یا آخر جب تنگ آ گئے تو غالباً ٹالنے کے لئے یہ فرمایا کہ اچھا بھئی آج رات میں حسب موقع اور حسب حال اگر کچھ اشعار موزوں ہو گئے تو کل تمہارے ساتھ علی گڑھ چلوں گا۔ دوسرے روز وہ صاحب ان کے حکمت کدہ پر پھر کچھ امید لے کر حاضر ہوئے میں بھی ان کے ہمراہ تھا پوچھا۔ فرمائیے کہ کچھ الہام ہوا یا نہیں۔ جواب ملا کہ کل رات میں جلد ہی بستر پر اس خیال سے لیٹ گیا اور حقہ پاس رکھوا لیا کہ کچھ شعر اس موقع کے مناسب نازل ہوں لیکن شعر بھی عجیب چیز ہے۔ بلانے سے نہیں آتا۔ بن بلائے آ جاتا ہے۔ آپ کی مطلوبہ نظم کا ایک شعر بھی نازل نہیں ہوا۔ مگر ایک موضوع کی نظم خود بہ خود موزوں ہونے لگی اور بن بلائے

تھا پہ بیک کی حوالے ہو گئے تمسخر سے فرمانے لگے کہ اب تم ہی گراؤ۔ چلے جاؤ اور میری طرف سے ایک نظم پڑھ دو۔ میں نے عرض کیا کہ کہاں آپ کی نظم کہاں میری نظم۔ وہی ہیں اگر اعتراض گناہ کبیرہ ہے تو ابہام میں اختراع بھی اس سے کم نہیں اور دوسرے یہ بات ہے کہ یہ جاں ایسا اس موقع کے لئے کوئی نظم نہیں۔ فرمانے لگے ریل میں لکھ لینا۔ ریل کی حرکت شعر گوئی کے لئے بہت موزوں ہوتی ہے۔ شعر بھی ایک حرکت ہے۔ یہ دونوں حرکتیں اکثر اوقات ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ غرض یہ ہے کہ وہ اپنی جگہ بیٹھے اور نظم لکھی ان کے شعر کہنے کے متعلق مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ شعر گوئی سے بے بہرہ لوگ اکثر شاعروں سے پوچھا کرتے ہیں کہ آپ شعر کیسے کہتے ہیں خیالات کہاں سے آ جاتے ہیں۔ شعر کی زمین اور ردیف و قافیہ کا انتخاب آپ کس طرح کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت اقبال سے بھی ایک صاحب نے دریافت فرمایا انھوں نے اس سوال کا ایک نہایت لطیف جواب دیا۔ کہ فطرت کے اندر ہر تخلیق فصل جیسی ہے۔ انسان کچھ پیدا کر سکتا ہے ایک خاص نوعیت کے جذبہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ مجھ کو جذبۂ شعر بھی ایک جنسی جذبہ معلوم ہوتا ہے اس کی تحریک بھی اسی طرح سے یک بیک پیدا ہو کر ناقابل اور لذت آفرین معلوم ہوتی ہے اور یہ محض تشبیہ نہیں ہے کہ شاعر اپنے اشعار کو مصنف اپنی تصنیف کو اور فن کار اپنی پیداوار کو اپنی اولاد سمجھتا ہے۔ شاعر جس احساس کو آمد کہتے ہیں حضرت اقبال نے اس کی ایسی دلکش تشریح کی کہ اس کی تمام نفسیات کو دو فقروں میں ادا کر دیا۔

جب حضرت اقبال نے بار بار یہ سنا کہ اکثر نقادان فن کہتے ہیں کہ جو شاعر شعر کو علم و حکمت یا پیغام عمل کے لئے ایک واسطہ بناتا ہے وہ اصل شاعر نہیں اور اصل شاعر وہ ہے جو کوئی خاص مقصد نہ رکھتا ہو اور کسی خاص نظریۂ حیات کی تلقین نہ کرے۔ بلکہ زندگی کی تمام وادیوں میں گھومتا پھرے اور اپنے تاثرات کو موزوں کلام میں تبدیل کرتا رہے۔ ہر فن لطیف بے غرض اور بے مقصود ہونا چاہیے اور حسن بیان آپ ہی اپنا مقصد ہے۔ جب دیکھا کہ اکثر لوگ یوں ہی سمجھتے ہیں تو انھوں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ :-

شعر کجا و من کجا فکر سخن بہانہ ایست

سوئے قطار مے کشم ناقۂ بے زمام را

ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ خدا اس شخص کو نہ بخشے جو مجھ پر شاعری کی تہمت لگائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسی شاعری میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ فقط شاعری نہیں اور شعر ایک ایسی شراب کا پیمانہ ہے جو شاعری نہیں۔

مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم

ورائے شاعری چیزے دگر ہست

لیکن کیا ضروری ہے کہ ہم شاعری کے متعلق یہ انداز بیان اختیار کریں کہ وہ حقیقی شعر جو روح کی گہرائیوں میں ڈوب جائے اور زندگی کی حقیقتوں میں غوطہ لگائے اس کی نسبت ہم یہ کہہ دیں کہ یہ فقط شاعری نہیں۔ یہ کیوں نہ کہیں کہ اصل شاعری یہی ہے اور جو اس معیار پر صحیح نہ اترے وہ شاعری نہیں ورزش سخن ہے، قافیہ پیمائی ہے ہوس پکی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اقبال شاعر یا مفکر؟

اقبال کو رخصت ہوئے تقریباً پچیس سال ہوتے ہیں۔ اس قلیل عرصہ میں ہندوستان کے گوشے گوشے سے اقبال کی عظمت کا اعتراف کیا جا چکا ہے۔ عقیدت کی یہ داستان بے پایاں ہے اور کیوں نہ ہو ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے　　بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اقبال نے یہ شعر کمال کے بارے میں کہا تھا۔ کمال یہ ہے کہ جو کچھ اس نے کسی اور کے بارے میں کہا وہ خود اس پر صادق آتا ہے۔

آج کل ہر ایک دوسرے کو یہ منوانے کی کوشش کر رہا ہے کہ اقبال فلسفی شاعر تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ نہیں اقبال پہلے شاعر تھا اور پھر فلسفی۔ کوئی بتلاتا ہے کہ وہ فلسفی پہلے تھا اور شاعر پیچھے۔ القصہ جیسے منہ ویسی بات۔ آئیے اسی زاویۂ نگاہ سے اقبال کا ذکر خیر ہے۔ (مجھے جو کچھ کہنا ہے بے دھڑک کہوں گا۔ آنکھیں چار نہ ہوں تو مروت کا ہے کی۔ آپ کو ناگوار معلوم ہوگا تو زیادہ سے زیادہ آپ اپنے ریڈیو سیٹ کی سوئی کسی اور طرف گھما دیں گے۔ اس سے ذرا بڑی نقصان ہوگا نہ اقبال کا)

میرے اور غالباً بہتوں کے نزدیک اقبال بہت بڑا شاعر ہے۔ اس میں کسی کو کلام نہیں۔ ساری بحث اس پر ہے کہ وہ فلسفی تھا یا نہ تھا۔ میں عرض کروں گا کہ وہ فلسفی نہیں تھا۔ فلسفی نہ شاعر ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ فلسفہ اور شعر طاؤس و مار ہیں جن میں دوستی کبھی تھی اور نہ رہے گی۔ خود اقبال نے بارہا مختلف طریقوں سے جتایا ہے کہ وہ فلسفی نہیں ہے۔ اس لئے کہ فلسفی ہنگامۂ حیات سے دور رہنے کے باعث زندگی کی قدروں سے اسی طرح ناآشنا رہتا ہے جس طرح ایک ریاضی داں ہندسی شکلوں سے کاغذ سیاہ کرکے پھولا نہیں سماتا اور سمجھتا ہے کہ زندگی کی ساری لذت اسے حاصل ہے۔ فلسفہ زندگی سے علیحدگی اور بے تعلقی کا نام ہے ؎

انجام خرد ہے بے حضوری　　ہے فلسفہ زندگی سے دوری

اس قسم کی صاف گوئی کے نمونے اقبال کے کلام میں آپ کو جابجا ملیں گے۔ ان کھلے بیانات کے ہوتے کیا یہ زبردستی نہیں کہ اسے جبراً فلسفی بنانے کے لئے دھوم دھام کے مقالے لکھے جائیں۔ یہ اور بات ہے کہ فلسفے سے اسے سدا دلچسپی رہی۔ فلسفہ کا اس نے گہرا مطالعہ کیا۔ لیکن کیا فلسفہ پڑھنے یا پڑھانے سے کوئی فلسفی ہوتا ہے۔ فلسفہ شاعر کی نظر میں گہرائی پیدا کر سکتا ہے لیکن شاعر نہیں بنا سکتا۔ جس طرح فن عروض جاننے سے کوئی ناشاعر کبھی شاعر نہیں بنا۔ بقول اقبال فلسفہ جس طرح زندگی سے دوری کی علامت ہے۔ رمزی عروض دانی شاعری سے دوری کی علامت ہے۔

عروض کا یہ حوالہ میں نے بے سبب نہیں دیا۔ فلسفے کی خشک عقلیت اور استادانہ قسم کی شاعری سے جو عروض کے کانٹوں پر تلتی ہے، اقبال کو سدا نفرت رہی۔ بہت دنوں کی بات ہے۔ اقبال کی مثنوی بے خودی چھپ رہی تھی یا چھپ کر نکل چکی تھی۔ اس زمانہ میں مجھے سنک سوار ہوئی کہ اقبال کا اسی طرح مراسلتی شاگرد بنوں جس طرح وہ خود استاد داغ کے شاگرد رہے۔ کاش برائے نام ہی مجھے یہ شرف حاصل ہوتا لیکن اقبال نے جواباً جو کچھ مجھے لکھا اس سے کم از کم یہ شرف تو مجھے حاصل ہوا کہ میں نے اقبال کو پہچانا چند

الفاظ اس خط کے یہاں اس لئے دہرا رہا ہوں کہ ان سے شعر و شاعری کے بارے میں اقبال کے تصور کا آپ کو صحیح اندازہ ہو سکتا تھا۔

"عزیزمن۔ آپ کا خط ابھی ملا ہے جو حسن ظن آپ نے میرے بارے میں فرمایا ہے اس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ آپ کو اگر فن سیکھنا مقصود ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کا انتخاب ٹھیک نہیں۔ شاعری کے دو جز اہم ہیں۔ زبان اور مضمون۔ زبان مجھ سے بہتر جاننے والے دکن میں موجود ہیں اور مضمون آفرینی ایسی شئے نہیں کہ سکھائی جا سکے۔ یہ ایک قدرتی عطیہ ہے۔ استاد شاگرد کی کوئی مدد اس امر خاص میں نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ فن شاعری میں مجھے خود کوئی درک نہیں اور اگر میں نے اشعار کو خیالات کا ذریعہ بنایا ہے تو اس سے نمائش فن نہیں۔ میں مسلمانوں اور ان کے نبی کی محبت دل میں رکھتا ہوں اور اسی کو سرمایۂ نجات جانتا ہوں۔ یہی محبت کبھی کبھی اشعار کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور بیدرد لوگ ان اشعار کو عروض و قافیے کے معیار پر پرکھتے ہیں۔ یہ چیز آپ کے سامنے حاضر ہے لیکن اس سے متاثر ہونے کے لئے صحبت کی ضرورت ہے تاہم خطوط کے ذریعے سے جو کچھ میں آپ کے لئے کر سکتا ہوں اس کے لئے حاضر ہوں۔ آپ کبھی کبھی خط لکھا کریں۔ جواب میں انشاء اللہ کبھی دریغ نہ ہوگا۔"

آپ کا مخلص۔ محمد اقبال۔ لاہور ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۸ء

افسوس کہ یہ سلسلہ کچھ ہی دنوں جاری رہا اور بڑی بدقسمتی یہ کہ سوائے اس خط کے اور چند ایک خطوط جو اقبال نے مجھے لکھے تھے میں نے گنوا دیئے۔

بہرحال اس عبارت سے آپ نے اتنا ضرور محسوس کیا ہوگا کہ اقبال عروض کی ترازو میں تلنے والے شاعروں کی صف میں نہیں آتا۔ تاہم وہ بہت بڑا شاعر تھا۔ ایسا شاعر جس نے شاعری کے زاویے اور زندگی کے نظریے بدل دیئے۔ وہ ایک ایسی شاعری کا علمبردار ہے جو سمندر کی طرح بیکراں اور ہر آن نئے روپ بدلتی ہے۔ اقبال نے ایک جگہ زندگی کی بیکرانی کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کی شاعری پر بھی وہ کہا پورا اترتا ہے میں کسی قدر تصرف کے ساتھ اقبال کا ایک شعر پیش کرتا ہوں ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے شاعری ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے شاعری

اس قسم کی شاعری اور ایسی شاعری کرنے والا عام شاعروں سے الگ تیور رکھتا ہے۔ اوروں کی طرح ذی روح وہ بھی ہے لیکن اس کی روح اپنے لئے نت نئے میدان اور وسیع تر آسمان تلاش کرتی رہتی ہے۔ جس کے آگے ستاروں کی دنیا پھیکی پڑ جاتی ہے جس کے کارواں در کارواں خیالات کے آگے چرخ نیلی فام کی فضا دھندلی پڑ جاتی ہے جس کی جبین نیاز میں سجدے تڑپتے ہیں تو بہتیرے بے نیاز اور نیازمند قسم کے علامہ آنکھیں مل مل کر دیکھتے ہیں لیکن پھر بھی خاک دکھائی نہیں دیتا کہ اقبال کی جبین نیاز میں سجدے کیسے تڑپتے رہے جو شاعر جبریل کو صید زبوں سمجھتا ہے فلسفے اور عروض کی کمند میں کوئی کیوں کر پھانسے

پہل اقبال فلسفیوں اور فن دانوں کی چلا گمک سے بلند و بالا انسان تھا۔ کیا کسی کا ایک بہت بڑا شاعر ہونا کافی نہیں کہ زبردستی اسے فلسفی بنانے کی کوشش کی جائے اس معنی میں وہ فلسفی ضرور تھا کہ حیات اور حقائق حیات کے بارے میں وہ اپنا ایک خاص مسلک اور منفرد زاویۂ نگاہ رکھتا تھا۔ اس کے زاویۂ نگاہ سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی تیز نگاہی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ ہر بڑا شاعر اس معنی میں اپنا زاویۂ نگاہ۔ یا پیام۔ یا فلسفۂ حیات رکھتا ہے۔ آنریبل غلام محمد نے ابھی حال میں حیدرآباد کی "بزم اقبال" کے یوم اقبال کے موقع پر ایک بات پتے کی کہی جس سے میرے خیال کو تقویت ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اقبال اور براؤننگ کا فلسفۂ حیات اصلاً ایک ہے۔ دونوں دعوت عمل دیتے ہیں۔ لیکن انگریزی ادب کے کسی متوازن دماغ طالب علم سے پوچھئے کہ براؤننگ اس اعتبار سے فلسفی کہا جا سکتا ہے جیسا کہ ہندوستان والے اقبال کو بنا رہے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ہر فلسفی اپنا ایک الگ دور اور کا انظام فکر رکھتا ہے آئیے اس نگاہ سے دیکھیں کہ وہ چیز جس نے بہتوں کو مغالطے میں ڈال دیا ہے کیا سچ مچ وہی ہے جسے اصطلاحی معنی میں فلسفہ کہتے ہیں۔ کیا اقبال کا فلسفۂ حیات اپنے اندر وہ پہنائیت رکھتا ہے کہ اسے برگساں ہیگل اور نطشے کے قبیل کا انسان کہہ سکیں۔ یہ تھا تو پھر ان فلاسفہ کی طرح اس نے نثر کو اپنے خیالات کے اظہار اور اشاعت کا واحد ذریعہ کیوں نہیں بنایا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں نظم کی بجائے نثر ہی اس کے خیالات کے پرچار کا بہتر ذریعہ ثابت ہوتی۔ اس نے رومی کے ہاتھ پر کیوں غائبانہ بیعت کی اور رومی کی طرح شعر و شاعری کی دنیا میں کیوں پناہ لی۔ ظاہر ہے کہ وہ خود برگزیدہ شاعر تھا۔ دنیائے آب و گل کے کمیڑوں اور فلسفے کے الجھیڑوں میں خود کو الجھانا نہیں چاہتا تھا جہاں کہیں اس نے الجھنے کی کوشش کی وہ نہ فلسفی ہی رہا نہ شاعر۔

آئیے اس کے پیام کا جسے فلسفہ یا پیام کہنے کی بجائے اس کی تعلیمات کہنا زیادہ مناسب ہے ایک سرسری تجزیہ کریں۔ اس کی تعلیم کا لب لباب ہے۔ خودی یہ خودی اس کا اپنا تراشا ہوا لفظ ہے۔ جس کی معنویت کے آگے اس لفظ کا لغوی تصور ایک سرے سے غائب ہو گیا۔ اقبال جس خودی کی تلقین کرتا ہے وہ پندار اور رعونت کے منافی ہے۔ اس سے مراد وہ خود اعتمادی وہ عزت اور تعمیر نفس ہے جس سے فرد کی قیمت اور ساکھ بڑھتی ہے۔ ہر فرد جب باعزت اور جری ہے تو یہی چیز پوری قوم کی رگ و پے میں دوڑ جاتی ہے۔ خود کہتا ہے

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات — یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ — زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا

گوہر شبنم آنسو یہ سب کیا ہیں وہی فرد یا قطرے کی خودی کے مختلف مظاہر جن سے دل کائنات دھڑک رہا ہے۔ زندگی کا اتھاہ سمندر اسی ایک بوند پانی میں بند ہے۔ یہی چیز رائی کو پربت بناتی ہے اور اسی کی کمی سے پربت رائی کا دانہ بن جاتا ہے۔

اپنی تعلیمات کے اس بنیادی تصور کو واضح اور خاطر نشین بنانے کے لئے اقبال نے رسول عربی کی تعلیم اور فلسفۂ اسلام کا سہارا لیا ہے اور پیروی کے تو وہ اتنے معتقد ہیں کہ ان کے آگے فلاسفۂ مغرب کو وہ خاطر میں نہیں لاتے۔ حالانکہ مغرب کی

علمی مذاقوں سے بھی انھیں کچھ کم فیض نہیں ملا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہوئی کہ اقبال کے شاعرانہ تصورات میں جسے بہتیرے فلسفہ سمجھے ہوئے ہیں کہیں بھی وہ ایچ اور انوکھا پن نہیں جسے ایک الگ نظامِ فکر کے تحت مربوط کیا جا سکے اور جس کے متعلق یہ کہہ سکیں کہ یہ اقبال کا فلسفہ ہے۔ فلسفۂ اسلام کے بنیادی اصولوں کو جو ٹھاٹھ کر ان کے اپنے انداز میں بیان کر دینے سے یہ فلسفۂ اقبال کا اپنا فلسفہ نہیں کہا جا سکتا۔ کیا قرآن کے زبان پہلوی میں اترنے کے بعد قرآن کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیا مولوی معنوی کے قرآن کا فلسفہ کلامِ پاک کا محتاج نہیں؟ پھر وہ فلسفہ جسے لوگ اقبال کا فلسفہ کہتے ہیں کیا سچ مچ اقبال کا فلسفہ ہے؟ اقبال زیادہ سے زیادہ فلسفۂ اسلام کا مفسر ہے کیا ایک مفسر کو فلسفی کہا جا سکتا ہے۔ اسلام سے اقبال کو عشق تھا۔ کیا عاشق فلسفی ہوتا ہے؟ اسلام کا فلسفہ اس کا فلسفہ ہے۔ اس کا اپنا فلسفہ کیا ہے وہی عشق ؎

عشق مری لے میں ہے عشق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو میری رگ و پے میں ہے

ابوظفر عبدالواحد

اقبال کا نقشِ آخر

فسردہ سا جہانِ آب و گل ہے — یہ منظر شام کا عاشق کا دل ہے
شفق کی آخری کرنیں درخشاں — مہر کی گل فشانی ہے نمایاں
حسیں پرچھائیاں گم ہو رہی ہیں — اندھیرے میں وہ خود کو کھو رہی ہیں
اندھیرا ڈرتے ڈرتے چھا رہا ہے — کوئی پر درد لے میں گا رہا ہے
ستارے ہچکچاتے آ رہے ہیں — ابھی آنے ہوئے شرار رہے ہیں
پرندے شور برپا کر رہے ہیں — فضا کو زیر و بالا کر رہے ہیں
موذن کی صدا بھی آ رہی ہے — دلوں پر بے خودی سی چھا رہی ہے
سرِ مغرب در مسجد پہ ہم ہیں — فضا مغموم ہم صرف الم ہیں
نشانِ شاعرِ مشرق یہاں ہے — کہ جس کا نطق خالق کی زباں ہے
کہ جس کا ہر نفس گویا عبادت — کہ جس کا ہر سخن گویا شریعت
خدا سے جس نے کی تھی ہم کلامی — وہ رازِ خودشناسی کا پیامی
وہ جس کی زندگی علم و ادب تھی — وہ جس کی بندگی تسلیمِ رب تھی
جہاں میں واقفِ اسرارِ فطرت — زمیں پر رازدانِ رب عزت
زمانے کے جو تیور جانتا تھا — جو صبح و شام کو پہچانتا تھا
سکھایا جس نے رازِ زندگانی — خودی ہے آدمیت کی نشانی
برہمن زادۂ فرزندِ توحید — قضائے لم یزل ہے جس کی امید
اسی تودے کے نیچے کھو گیا ہے — یہیں اقبال تھک کر سو گیا ہے
[illegible]

اقبال اور سماج

سماج یا معاشرہ زندگی کا اتنا وسیع ادارہ ہے کہ فرد کی ساری ذہنی اور عملی کارکردگی اس کے اندر سما جاتی ہے۔ مذہب، سیاست، تعلیم و تربیت، ادب اور فنونِ لطیفہ حتیٰ کہ طرزِ فکر بھی اسی کے مختلف شعبے ہیں۔ شاعر بھی یوں تو اور افراد کی طرح اپنے زمانے کے سماج کی پیداوار ہوتا ہے لیکن ہر بڑا شاعر اس پر کچھ نہ کچھ اثرات بھی چھوڑ جاتا ہے۔

ہندوستانی شاعری کوئی سو سال پہلے تک زندگی سے اگر پوری طرح بے تعلق نہیں تھی تو کم سے کم اس کی توجہ تمام تر زندگی کے چند خاص پہلوؤں کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل تھی۔ مغربی اثرات نے ہندوستانی زندگی میں جہاں نئے نئے تاثرات کو منعکس کیا وہیں ادب اور شاعری کو بھی حیات کے مسائل سے دوچار کر دیا۔ اس کے سب سے پہلے اثرات ہم جانتے ہیں کہ حالی کے کلام میں نمایاں ہوئے۔ حالی کے بعد اکبر سب سے بڑا شاعر پیدا ہوا جس کی شاعری تمام تر حیات سے پیدا ہوئی اور حیات ہی کو مرکز بنائے رہی۔ لیکن موجودہ زمانہ میں ہماری شاعری زندگی اور موت کی کشمکش کے اہم مسائل سے جیسی گتھ گئی ہے ویسی کبھی نہیں گتھی تھی۔ اور یہ ہم سب جانتے ہیں کہ اس کا باعث بڑی حد تک اقبال تھے۔

اقبال کی شاعری اپنے اطراف کی ساری تحریکات اور اس سے آگے اکثر عالمی تحریکات کا مخزن بن گئی ہے۔ یہ دور تخریب اور تعمیر کی کشمکش کا عبوری دور ہے۔ اور اسی نے اقبال کو بھی پیدا کیا۔ اقبال کے مجتہد ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور اس کا ثبوت ان کے صفحات میں جگہ جگہ ملتا ہے۔

اقبال نے موجودہ سماجی نظام کے گہرے مطالعے کے بعد جن کوتاہیوں کا مشاہدہ کیا ان کو ظاہر کرنے اور ان کا حل بتلانے میں انھوں نے پیغمبرانہ شان دکھا دی جیسا کہ کہتے ہیں ؎

در دیدۂ معنی نگراں حضرت اقبال — پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

ان کی فکر نے زندگی کے کسی اہم پہلو کو نہیں چھوڑا۔ اسی لئے ان کی تعلیمات ہماری زندگی کا نصب العین بن گئی ہیں۔ وہ حقیقت میں انسانیت کے شاعر تھے۔ اور یہ جذبہ ان کو قومیت کے ابتدائی احساس کے زمانہ میں بھی برابر بے چین کر رہا تھا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں انھوں نے یہ شعر بھی کہے تھے ؎

آنکھ میری اور کے غم میں سرشک آباد ہو — امتیازِ ملت و آئیں سے دل آزاد ہو

بستۂ رنگِ خصوصیت نہ ہو میری زباں — نوعِ انساں قوم ہو میری وطن میرا جہاں

اس میں شک نہیں کہ اسلامی فلسفہ اور زندگی کا انھوں نے وسیع اور گہرا مطالعہ کیا تھا جس کا رنگ ان کے کلام میں جابجا نمایاں ہے۔ لیکن اس سے ان کے رتبہ میں کوئی فرق اسی طرح نہیں آسکتا جس طرح ملٹن کے رتبہ میں عیسائیت کی وجہ سے یا کالی داس کے رتبہ میں ہندوویت کی وجہ سے نہیں آسکا۔

یہ وسیع تر انسانی ہمدردی کا شدید جذبہ ہی تھا جو ان کو ایسے زمانہ میں بھی جب دنیا قومیت رنگ نسل جیسی مصنوعی قیدوں میں جکڑی ہوئی خوش خوش تھی اور یہ نظام عصبیت کا مذہب بن گیا تھا انھوں نے اجتہادی شان دکھادی۔ اور اس سلج اور اس کے سارے نظام کی بنیاد ہلادی۔

لیکن جتنی تخریبی تنقیدیں انھوں نے کیں ان سے زیادہ تعمیری راہیں بھی بتلادیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جلد یا دیر میں ان کے پیش کردہ سماجی نظام کو آزمانے تیار ہوجائے گا۔

اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ ان کا خودی کا فلسفہ ہے جس کو انھوں نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کا یہ اٹل عقیدہ تھا کہ انسان اپنے ذاتی وجود کو سمجھے بغیر کسی چیز کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتا۔ وہ آسمان سے تارے توڑ لائے۔ زمین کے ساتوں طبق کھنگال ڈالے لیکن جب تک وہ ذات سے بے خبر ہے اس کا ہر فعل غلط پڑے گا۔ کیونکہ یہ وجود کائنات کی بنیاد ہے۔ اسی لئے خودی کی تربیت پر وہ سب سے زیادہ زور دیتے ہیں یہ گویا جوہر ہے اور دنیا کی ساری چیزیں عرض۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف — کہ مشت خاک میں پیدا ہو آتش ہمہ سوز

خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب — خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر

نہنگ زندہ ہے موج محیط میں آزاد — نہنگ مردہ کو موج سراب بھی زنجیر

خودی کو انسانی کمال کا نقطۂ آخر تصور کرکے زندگی کی ساری چہل پہل میں انھیں اسی کی نمود و نمائش نظر آتی ہے۔ اور جس چیز میں خودی کی نمائش نہ ہو اسے وہ درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ جیسا کہ کہتے ہیں ؎

حیات و موت نہیں التفات کے لائق — فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر — وائے صورت گری و شاعری و نقاشی

خودی کے بعد قوموں کی زندگی میں یقین کا درجہ ہے۔ یہ وہ شمع ہدایت ہے جس کے سامنے ساری تاریکیاں کافور ہوجاتی ہیں اور منزل مقصود صاف نظر آنے لگتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

یقین افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے — یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

قوموں کی زندگی میں عمل کی جو اہمیت ہے وہ بھی اقبال کی نظر سے کبھی اوجھل نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ عمل کے بغیر وجود بے حس ہے اور بے عمل وجود سے جیسی شدید نفرت اقبال کو تھی کسی اور کو کم ہوگی۔ ان کا یہ مشہور شعر ہے ؎

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم — جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ایک اور مقام پر کہتے ہیں ؎

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا — روشن شرر تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

اسی لئے اقبال فطرتاً صوفی ہونے کے باوجود پابند خانقاہ تصوف کو بدعت سمجھتے تھے۔ ایک نظم میں صوفی کو مخاطب کرکے کہتے ہیں ؎

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سماج کا ایک اہم رکن عورت ہے، جو مغربی سماج اور مشرقی ذہنیت پر عجیب عجیب صورتوں سے چھائی ہوئی ہے۔ اقبال نے سماج میں عورت کی اصل حیثیت آزادی اور تعلیم ہر مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے اس میں شک نہیں کہ یہاں انھوں نے نہایت احتیاط سے کام لیا ہے۔ پھر بھی ان کا نقطۂ نظر پوشیدہ نہیں ہے۔ عورت کی آزادی کا جو مفہوم یورپ نے سمجھا ہے اسے وہ سماج کے حق میں مہلک تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور — کہ مرد سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں

ایک شعر میں وہ مغرب کے حکماء سے سوال کرتے ہیں۔

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال — مرد بے کار و زن تہی آغوش

سماج کی تعمیر میں عورت کا حصہ مرد سے کسی طرح کم نہیں ہے لیکن وہ بہرحال عورت کو مرد پر منحصر سمجھتے ہیں جہاں اس بنیادی تصور میں خلل آئے سماج کی پوری عمارت لڑکھڑا جاتی ہے۔ ان کے اشعار ہیں۔

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی — نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا — اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

عورتوں کی تعلیم و تربیت کے وہ دل سے حامی ہیں لیکن ایسی تعلیم جو یورپ کی طرح عورت کو مرد بنا دے اسے وہ سماج کے حق میں موت تصور کرتے ہیں۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن — کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

ادب شاعری اور سارے فنونِ لطیفہ کو اقبال اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس میں خودی کا جذبہ کس حد تک نمایاں ہے۔ اور وہ خودی کے نشو و نما میں کتنی مدد دے سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر ....

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات — نہ کر سکیں تو سراسر فسون و افسانہ

ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی — خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

"جواب شکوہ" اقبال کی ابتدائی اہم نظموں میں سے ہے۔ لیکن سماجی اصلاح سے متعلق اس میں ان کے خیالات کا نچوڑ موجود ہے۔ اس نظم میں اقبال نے وہ تمام برائیاں تفصیل سے گنائی ہیں جو ہماری معاشرت میں گھر کر چکی ہیں اور ہمارے ذہنوں اور اخلاقی حالت کو بگاڑنے میں بڑا دخل رکھتی ہیں۔ سب سے پہلی چیز جو کسی قوم کی غلامی اور پستی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے وہ اس کی باطل پرستی ہے۔ فرقہ بندیاں اور مناقشات اسی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ تن آسانی ایک اور منحوس خصلت ہے جو ہم میں پیدا ہو گئی ہے۔ خود داری خلوص اور ایثار کی اچھی صفتیں ہم سے زمانہ ہوا رخصت ہو چکی ہیں۔ مذہب سے بیگانگی

[illegible]

اقبال اور اُن کا فلسفۂ خودی

اقبال بحیثیت شاعر کے نہ صرف ادبی دنیا میں بلکہ ساری اسلامی دنیا میں مشہور ہیں مگر وہ صرف شاعر نہ تھے۔ وہ ایک ایسے بڑے آدمی تھے کہ ان جیسا صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ بڑا آدمی وہی ہوتا ہے جس کا دل اور دماغ بڑا ہو۔ ان کا دل ایسے جذبات اور کیفیات کا حامل تھا جن کی بے انتہا وسعتوں میں رسمی شعر و شاعری استعارات اور تشبیہات مثل ان تنکوں کے ہیں جو کسی سمندر کے لب ساحل پائے جاتے ہیں۔ ان کا دماغ ویسا ہی تھا جو دنیا کے کسی بڑے سے بڑے مفکر کا ہو سکتا ہے۔ فکر و عمل کا تعلق دماغ سے اور جذبات اور احساسات کا تعلق دل سے ہے۔ اقبال نے اپنے دل و دماغ کی محنت و کاوش کو ایک خاص اسلوب اور دلکش پیرایہ میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ صرف اسلامی تعلیمات کے پیامبر ہی نہیں تھے، بلکہ ایک ایسے شاعر تھے جن کا پیامِ عمل ساری دنیا کے لئے اور انسانیت کے لئے مایۂ ناز ہو سکتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

اقبال کی ابتدائی شاعری سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا آغاز غزل گوئی اور رسمی شاعری سے ہوا مگر چونکہ وہ شاعرانہ بصارت کے ساتھ حکیمانہ بصیرت بھی رکھتے تھے، جدید فلسفہ اور اس کے عمل پیہم کی تعلیم اور تاثرات نے ان کے قلب اور دماغ میں ایک غیر معمولی ہیجان پیدا کر دیا اسلامی تعلیمات اور قرآنی حکمت سے ان کو ایک خاص شغف تھا۔ نفس انسانی کی عزت اور عظمت جو انھیں قرآنی تعلیم اور پیغمبر اسلام کی پیروی میں نظر آئی اس کی مثال اسلام کے کسی مبلغ اور شاعر کسی حکیم اور مفکر کے خیالات میں نہیں پائی جا سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری کا ماحصل وہ پیامِ عمل اور حسنِ عمل ہے جس کا ماخذ اسلام ہے اسلام کی ترجمانی ان کا مقصد حیات بن گیا تھا۔ تاہم یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ وہ ایک فرقہ پرست شاعر تھے۔ ان کا پیامِ عمل ان کے اعلیٰ مطمح نظر کا تابع تھا۔ ان کا مقصد نوع انسانی کو ایک اعلیٰ اور بلند مقام تک پہنچانا تھا۔ اور اس کے حصول کا ان کی نظر میں ایک ہی راستہ تھا۔ وہ اسلام کی شاہراہ علم ہے۔ اس لئے ان کا پیام عمل مسلمانوں کے لئے مخصوص نظر آتا ہے وہ ملت اسلامیہ کو ایک تازہ ولولہ بخشتے ہوئے اور انسانیت کو ایک نئی حیات کا راستہ دکھلاتے اور غلاموں کو درس خودی دیتے نظر آتے ہیں۔ وہ کشمکشِ حیات میں مردانہ وار مقابلہ کرنے کو زندگی سمجھتے ہیں۔ عمل پیہم اور انقلاب ان کی زبان میں زندگی کا دوسرا نام ہے۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی — روحِ امم کی حیات کشمکشِ زندگی

جو بات انسان کے دل سے نکلتی ہے وہ دوسرے پر اثر کرتی ہے۔ اقبال غیر معمولی طور پر متاثر دل رکھتے تھے اس لئے ان کے کلام میں بھی غیر معمولی اثر آفرینی اور ایمانی قوت نظر آتی ہے۔ اقبال کا سب سے بڑا پیام انسانیت کو یہ ہے کہ وہ اپنی "خودی" کی تربیت کرے اور اپنی خودی کو سمجھے۔ ذات اور ملت کی عزت اور وقار کا دار و مدار خودی کی صحیح تربیت اور پرورش پر ہے۔

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف — کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ پر سود

خودی کی تربیت کی بدولت انسان تمام دنیا ہی کو نہیں بلکہ ساری کائنات کو مسخر کر سکتا ہے۔

خودی ہے زندہ تو ہے فقر میں شہنشاہی — نہیں ہے طغرل و سنجر سے کم شکوہ فقیر
جس بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار — شمشیر کی مانند ہے برندہ و براق
اس کی نگہ شوق میں ہوتی ہے نمودار — ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے جو قوت اشراق

اس فلسفۂ خودی کا سرچشمہ استغنا ہے یہ وہ استغنا نہیں ہے جو فقر اور تصوف کی اصطلاح میں ترک دنیا کہلاتا ہے۔ ترک دنیا کی تعلیم اور اس کے تصور سے اقبال کو سخت نفرت ہے ان کے نزدیک انسانیت کے اعلیٰ ترین رتبہ تک پہنچنا "خودی" کو پالنا اور خوددار بننا ہے انسان کائنات کا خلاصہ ہے۔ وہ ایک ایسی جامع ہستی ہے جس میں جمادی نباتی حیوانی اور ملکوتی عناصر پائے جاتے ہیں۔ یہ سب خودی میں پوشیدہ بھی ہیں اور ظاہر بھی خودی انسان کا ازلی اور ابدی عنصر ہے۔ چونکہ ازلی اور ابدی حقیقت فانی نہیں ہے اس لئے خودی بھی مثل نباتات اور حیوانات کے فانی نہیں ہے۔ خودی کا غیر فانی عنصر یا پہلو روحانی اور ملکوتی ہے اور وہی اصل وحقیقت انسان ہے اس کی تربیت پر اسلامی تعلیمات کا دار و مدار ہے۔ جب انسان خودی کی تربیت سے غافل اور اپنے اصلی مرکز سے دور ہو جاتا ہے تو حیوانیت کے قعر ذلت میں گر جاتا ہے۔

"خودی" کے ارفع واعلیٰ منزل تک پہنچنے کا راستہ اقبال کے نزدیک وہ نہیں ہے جو ترک دنیا و روحانی سہاروں کے جمود و سکون کے عالم میں پایا جاتا ہے۔ تسخیر عالم اور عمل پیہم اور کشمکش حیات کے منازل طے کرنے کے بعد خودی کی آخری منزل تک انسان پہنچ سکتا ہے) خدا شناسی اور خدا پرستی کی یہی منزل ہے۔ اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے کہ آسمان وزمین عالم وما فی العالم سب کچھ انسان کے لئے ہے کیونکہ وہ خلاصۂ کائنات ہے انسان خلیفۃ اللہ ہے خودی کی منزل پر پہونچنے کے بعد انسان نیابت الٰہی کے منصب ومقام کا اہل ہو سکتا ہے۔

تسخیر عالم سے مراد اقبال کے نزدیک وہ علمی اور عملی فتوحات نہیں ہیں جن کی بدولت مغربی دنیا قدرتی طاقتوں پر قابو پا کر اپنی آسائش دولت وثروت کے بڑھانے کی فکر میں پیہم کوششیں کر رہی ہے اور انھیں کوششوں کی بدولت بجائے حقیقی ترقی کے حیوانیت کے قعر ذلت میں گر رہی ہے۔ دنیا کی یہ تباہی دراصل عقل انسانی کی اس کارکردگی کا نتیجہ ہے جو محبت اخوت ہمدردی اور عشق الٰہی سے بری ہے۔ اقبال اس عقل سے جو عشق سے مبرا ہو نفرت کرتے ہیں۔

عقل خود بیں غافل از بہبود غیر — سود خود بیند نہ بیند سود غیر

پیغمبر یا شارع جو حامل وحی الٰہی اور اسرار خودی اور رموز توحید کا معلم ہے ایسی خودی کو مٹانے کا حکم دیتا ہے جو خود غرضی پر مبنی ہو۔ شارع کی تعلیم کی رو سے اسرار خودی کا عالم وہی ہے جس کی ہمدردی تمام موجودات کو گھیرے جو دوسرے کے سود و بہبود کو اپنا سود و بہبود جانے ایسا ہی شخص نائب اللہ ہو سکتا ہے اس لئے عقل بغیر عشق کی رہنمائی کے انسان کے راستے کو روشن نہیں کر سکتی۔ انسان کو نائب اللہ کے درجہ تک پہنچنے کے لئے توانائی حاصل کرنا چاہیے ایسی توانائی عمل پیہم

اور عمل کی کشش کے بغیر حاصل کرنا ممکن نہیں جو محض قدرت کی طاقتوں کو دریافت کرنے میں مشغول اور ان طاقتوں سے پیدا کام لینے میں مصروف ہو اور خودی سے غافل ہو وہ کافر ہے. مومن وہ ہے جو ایک طرف تو کائنات اور اس کی طاقتوں پر قابو رکھے اور دوسری طرف اپنے نفس پر بھی اتنی ہی قدرت رکھتا ہو.

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے　　　مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اقبال نے خودی پر یہ سارا زور اس لئے دیا ہے کہ انسان اپنی ذات کو سمجھنے کی کوشش کرے کہ خودی کے ذریعہ خدا تک پہنچنا ممکن ہے. خدا کی ذات اپنی صفات سے ظاہر ہے وہ رحمن و رحیم بھی ہے اور قہار و جبار بھی ہے اسی طرح انسان جو صفات الٰہیہ کا مظہر ہے متضاد صفات کا جامع ہو سکتا ہے. وہ کریم و رحیم کا مظہر بھی ہے اور جباریت اور قہاریت کا اظہار بھی کر سکتا ہے صفاتِ الٰہیہ کے صحیح امتزاج اور اعتدال کے ساتھ ظاہر کرنے میں ہی حقیقی انسانیت یا خودی کے اسرار مضمر ہیں.

قہاری و جباری قدوسی و جبروت　　　یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

انسان اس بحر بیکراں کا ایک قطرہ ہے جسے ہم خدا کہتے ہیں اگر قطرہ اپنی ذات کے تمام اسرار و رموز کو نہ پا جائے اور خود اپنی ہستی کی عظمت کو نہ جانے تو وہ ذات خدا کے ناپیدا کنار سمندر کی حقیقت کو سمجھنے سے بھی قاصر رہے گا. انسان خدا کی ذات کا پرتو ہے. دوسرے الفاظ میں خدا اپنے شیون و صفات کے ساتھ انسان میں جلوہ گر ہے. پس اگر انسان اپنی حقیقت کو جان لے یا " خودی " کے راز کو پالے تو وہ خدا کو بھی پا سکتا ہے. جس کے جمال و جلال کے ظہور کا ذریعہ خود اس کی ہستی ہے. دریا اور قطرے کی تمثیل دوسرے مذاہب کی روحانی تعلیمات میں بھی پائی جاتی ہے مگر ان مذاہب نے انسانی شخصیت کو اتنا حقیر و ذلیل کر دیا ہے کہ گویا وہ کائنات میں کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی. اقبال انسانیت کے اس نظریے کے سخت مخالف ہیں تو وہ مانتے ہیں کہ انسان بندگی کے مقام پر ایک حد تک مجبور ضرور ہے لیکن وہ عملی قوت سے یکسر محروم نہیں.

اقبال انفرادیت کے علم بردار ہیں اور انسان کو یہ پیام دیتے ہیں کہ وہ اپنی ہستی کی قدر و قیمت کو پہچانے اور اپنے وجود پر غور کرے اپنے امکانات کو معلوم کرے اور اپنی شخصیت کے وقار کو کم نہ کرے اگر اس راہ میں فطرت حائل ہو تو اسے بھی مسخر کرے. اقبال کے نزدیک خودی کی موت انسان کی موت ہے اگر وہ اپنی ذات کو فراموش کر دیتا ہے تو ساری کائنات سے غافل ہو جاتا ہے.

صوفیوں اور دوسرے روحانی مسلکوں پر چلنے والوں کے نزدیک خدا جوئی کا راستہ خودی سے پیدا ہوتا ہے گر اس کے ساتھ ترک دنیا اور ما سوا اللہ سے غفلت لازمی ہے برخلاف ان کے اقبال کہتے ہیں کہ خودی سے خدا تک پہونچنے کی قدرت پر تصرف اور کائنات کی تسخیر ضروری ہے (سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ جَمِيعًا) چنانچہ اقبال کہتے ہیں.

ہر چیز ہے محو خود نمائی　　　ہر ذرہ شہید کبریائی
بے ذوق نمو زندگی موت　　　تعمیر خودی میں ہے خدائی

قرآن پاک کی تعلیم کی رو سے معرفت کے دو سرچشمے ہیں: آفاق اور انفس۔ آفاق کے علم سے آسمان و زمین کی تمام موجودات کا علم مراد ہے۔ نفس کا علم وہ ہے جو عبد و معبود کے رشتۂ باطنی کو روشن کرتا ہے۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث "العلم علمان، علم الابدان و علم الادیان" کلام الٰہی کی بہترین تفسیر ہے۔ علم الابدان میں وہ سارے علوم آجاتے ہیں جن کا تعلق طبیعیات اور خارجی موجودات سے ہے۔ علم الادیان سے مراد وہ علوم ہیں جو معرفت حق اور معرفت عبد، خداشناسی اور خودشناسی، تربیت خودی اور تہذیب نفس کے منازل طے کرنے کے لئے درکار ہیں۔ اگر اکمل غیر جانبدارانہ نظر سے بھی دیکھا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ یوں تو دوسرے مذاہب خصوصاً آبائی مذاہب میں عرفانی معلومات کے دفتر ہیں مگر دنیا کی سب سے بڑی اور آخری تبلیغ ہی ایسی جامع ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ ماسوا اللہ کی معرفت کی تاکید کرتی ہے جس میں معرفت الٰہی کے خزائن ہیں اور ساتھ ہی تربیت خودی کی تفصیلات۔ طہارت و تقویٰ، حقوق العباد اور حقوق اللہ تصرف اور تسخیر عالم سے کی جیسی جامع تعلیم درکار ہے۔ ارسطو اور افلاطون، سینا اور فارابی کے جامد اور ساکن فلسفہ میں وہ اثرات نہیں جو خودی کو ابھار سکیں اور نہ دورِ حاضر کی مغربی تعلیم اور فلسفہ کے متحرک اثرات اور تاریخ انسانی کو انسانیت کی منزل تک پہنچا سکتے ہیں۔

اقبال کا پیام عمل ان کا فلسفۂ حیات اور شاعرانہ اثر آفرینی اور گرم گفتاری جدید پیرائے میں ایسی تحریک حیات کی حکیمانہ تاویل ہے جس کی تبلیغ کی ابتدا تیرہ سو برس پہلے ہوئی تھی۔

ولایت، بادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

لطیف النسا بیگم

نذر اقبال :- شاعر مشرق علامہ اقبال کے شایان شان ایک کتاب نذر اقبال ادارۂ ادبیات اردو کی طرف شایع ہو چکی ہے جس میں بہترین مضمونوں اور نظموں کے علاوہ متعدد نئے مضامین، تصاویر اور نظمیں ہیں۔ اور ان کے سوا اب تک اردو رسائل وغیرہ میں حضرت اقبال پر جو بہترین ادب شایع ہوا ہے ان کے منتخبات بھی اسی نذر اقبال میں شریک ہیں۔

قیمت [illegible]۔ سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہے۔

ادارے کی خبریں

ادارے کا نیا ہال | ادارے کے دفتر اور اس کے شعبوں کا قیام کئی سال سے اس کی موجودہ عمارت (جو دراصل اس کے معتمد اعزازی ڈاکٹر زور صاحب کا رہائشی مکان ہے) عرصہ سے ناکافی ثابت ہو رہی ہے۔ ابتدا میں ادارہ کا دفتر ڈاکٹر صاحب موصوف کے مکان کے ایک کمرے سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ پورے مکان پر حاوی ہو گیا اور ڈاکٹر صاحب کو نیچے کی منزل اور ادارے کے لئے چھوڑ کر اوپر کے حصے میں منتقل ہونا پڑا۔ بعد کو یہ پورا مکان بھی ناکافی ثابت ہوا اور کتب خانہ اور دوسرے تاریخی و ادبی آثار ایک گودام کی طرح بھر گئے۔ اور دیمک سے متاثر ہونے لگے۔ ادارے نے اپنے لئے ایک خاص عمارت حاصل کرنے یا تعمیر کرنے کی کارروائی کئی سال قبل سے شروع کر رکھی ہے اور نواب ڈاکٹر مہدی یار جنگ بہادر اور نواب زین یار جنگ بہادر کی ممتاز صدارت و نائب صدارت میں ادارے کی مجلس عمارت نے فراہمی عمارت کی مہم شروع بھی کر دی ہے لیکن اب تک اس سلسلہ میں جو منزلیں طے ہوئی ہیں ان سے اندازہ ہوا کہ ابھی چار پانچ سال تک ادارے کو ایک شایان شان ذاتی عمارت سے محروم رہنا پڑے گا۔ اس لئے جناب ڈاکٹر زور صاحب معتمد اعزازی نے سات ہزار روپے کے اپنے ذاتی صرفہ سے موجودہ عمارت ادارہ کے محاذی ایک ہال تعمیر کرا دیا جس کا نقشہ ملک کے ایک مشہور و باکمال ماہر تعمیر مولوی فیاض الدین صاحب ارکیٹکٹ نے تیار کیا اور جس کی تعمیر ادارے کے ایک مخلص رفیق مولوی مرزا اصامن علی صاحب خازنی صفوی کی ذاتی دلچسپی اور شبانہ روز انہماک کی وجہ سے بہت جلد اور بڑی آسانی کے ساتھ تکمیل کو پہنچ گئی۔

اس ہال میں فی الحال شعبہ مخزن علوم و فنون (یعنی اردو انسائیکلوپیڈیا) اور دار المطالعہ اور دفتر سب رس منتقل کیا گیا ہے۔

ادارے کے کتب خانے میں جو رسائل و اخبار وصول ہوتے ہیں ان سے اب تک صرف ارباب ادارہ ہی استفادہ کر سکتے تھے۔ ضرورت تھی کہ اس کی افادیت کو عام کیا جائے اور دوسرے علم دوستوں کے لئے بھی استفادہ کا موقع فراہم کیا جائے۔ ادارہ کا دفتر جس مقام پر واقع ہے اس کے اطراف و اکناف تین چار میل کے حلقے میں کوئی دار المطالعہ یا کتب خانۂ عام موجود نہیں اور اس حصے (خیریت آباد، سماجی گوڑہ، جوبلی ہل، پنجہ گٹہ، بیگم پیٹھ، امیر پیٹھ) میں شہر حیدرآباد کے اکثر و بیشتر علم دوست اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب قیام پذیر ہیں نیز خود شہر میں جو دار المطالعہ یا کتب خانے موجود ہیں ان میں سے کسی میں اتنے رسائل و اخبار نہیں آتے جتنے ادارۂ ادبیات اردو میں آتے ہیں اس لئے دور و دراز کے شائقین مطالعہ کے استفادہ کے لئے بھی ضرور تھا کہ ایک دار المطالعہ عامہ کی ضرورت تھی۔ مسرت کا مقام ہے کہ اس ہال کی تعمیر سے ادارے کی یہ دیرینہ تمنا پوری ہو گئی۔

دار المطالعہ کا افتتاح | بتاریخ ۲۲ مارچ ۱۹۴۳ء روز جمعہ صبح گیارہ بجے ادارے کے فاضل صدر عالی جناب آنریبل ڈاکٹر نواب مہدی یار جنگ بہادر نے اپنے دست مبارک سے ادارے کے دار المطالعہ عام کا افتتاح فرمایا۔ اس تقریب میں ادارے کے مختلف شعبہ جات اور شاخہائے اضلاع کے نمائندے اور دیگر علم دوست اصحاب نے بھی شرکت فرمائی جن میں بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

نواب معین نواز جنگ بہادر معتمد سیاسیات و صاحب حکومت، پروفیسر حسین علی خاں صاحب پرووسٹ جامعہ عثمانیہ، نواب زین یار جنگ بہادر چیف ارکیٹکٹ، نواب ہوش یار جنگ بہادر معتمد تعمیرات سرکار عالی، میر احمد علی خاں صاحب ایم اے بیرسٹر ناظم عدالت خفیفہ، ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب ایم اے ڈی فل مہتمم کتب خانۂ آصفیہ،

نواب مرزا سعیف علی خاں صاحب جاگیردار، پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی، مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار اعد، مولوی فیض محمد صاحب صدیقی ایم ایڈ، مولوی بادشاہ حسین صاحب، مولوی کاظم حسین صاحب بی اے، مولوی عبدالحفیظ صاحب صدیقی بی ایس سی، ایل ایل بی، مولوی مراد علی صاحب طالع، مولوی میر حسن علی صاحب دیکالپد، محمد حسین خاں صاحب نظام آباد، غلام حسن صدیقی صاحب پرلی، اشرف الملک صاحب فیضی پربھنی، معین الدین صاحب صدیقی جولہ نظام الدین، محمد علی خاں قلی بھسم جاگیر۔

افتتاح کے بعد معتمد صاحب ادارہ نے نواب مرمہدی یار جنگ بہادر کو پھول پہنائے اور عکس کشی پر یہ تقریب سعید اختتام کو پہونچی۔ اور یہ نیا ہال آباد ہوگیا۔ مولوی فیاض الدین صاحب نے اس کا نقشہ بنانے میں ایسی خوش ذوقی اور ماہرانہ پرکاری سے کام لیا ہے کہ جو شخص اسکو دیکھتا ہے تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مولوی احسان علی صاحب غازی نے اس کی تعمیر وتکمیل میں جو دلچسپی لی وہ ایک سچے علم دوست اور رفیق ادارہ ہی سے ظہور پذیر ہوسکتی تھی۔ ادارۂ ادبیات اردو ان دونوں اصحاب کا ہمیشہ شکرگزار رہے گا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر زور صاحب نے جنگ کے اس ہولناک زمانہ میں اشیائے تعمیر کی گرانی کے باوجود ادارے کے لئے جس ایثار اور فراخدلی کا ثبوت دیا ہے وہ دوسرے ارباب علم و ادب کیلئے ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔

دارالمطالعہ کے قواعد

۱۔ فی الحال دارالمطالعہ کے اوقات سہ پہر میں ۳ تا ۶ قرار دیے گئے ہیں۔

۲۔ دارالمطالعہ میں بیڑی سگریٹ وغیرہ پینے کی ممانعت ہے۔

۳۔ دارالمطالعہ میں کسی قسم کا شور و غل اور بحث مباحثہ کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ کیونکہ اس سے دوسرے ناظرین کے مطالعے میں خلل واقع ہوتا ہے۔

۴۔ ہر ناظر کے لئے ضرورت ہے کہ دارالمطالعہ میں داخل ہوتے وقت رجسٹر ناظرین میں اپنا نام لکھکر دستخط کرے۔

۵۔ دارالمطالعہ میں کسی ناظر کو اپنی کتابیں وغیرہ لانے کی اجازت نہیں ہے البتہ نوٹ لینے کے لئے بہ اجازت نگران کار سادہ کاغذ ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔

۶۔ کتابیں اور مجلدات سلف پر ان کا نام اور نشان لکھ کر مطالعے کے لئے طلب کی جانی چاہئیں۔

نوٹ:۔ الماریوں وغیرہ کا انتظام ہونے تک کتابوں کے مطالعے کے طریقے کو ملتوی رکھا گیا ہے۔

دارالمطالعہ میں جو رسائل اور اخبارات بغرض مطالعہ رکھے گئے ہیں ان کی فہرست آویزاں ہے۔

اردو رسائل

ادارے کے اس دارالمطالعے میں حسب ذیل رسائل موجود رہتے ہیں۔

آج کل	دہلی	جدید اردو	کلکتہ
ادب لطیف	لاہور	جیت	حیدرآباد
ادبی دنیا	لاہور	حسن خیال	۔
ارشاد	حیدرآباد	حکیم دکن	۔
البیان	امرتسر	حور	لاہور
آغاز	سکندرآباد	حیدرآباد ٹیچر	حیدرآباد
ایشیا	بمبئی	خیابان	۔
برہان	دہلی	زمانہ	کانپور
بچوں کا باغ	دہلی	ساقی	دہلی
بچوں کا سب رس	حیدرآباد	سائنس	حیدرآباد
پیام ادب	۔	سب رس	
پیغام حق	لاہور	سہاگ	لاہور
تصویر	رامپور	سیاست	حیدرآباد

[illegible]

نے معزز مہمانوں کا استقبال کیا۔

حاضرین میں افواج باقاعدہ سرکار عالی کے اکثر و بیشتر اعلیٰ عہدہ داروں کے علاوہ حسب ذیل اصحاب خاص کر قابل ذکر ہیں۔

نواب معین نواز جنگ بہادر معتمد سیاسیات و باب حکومت، نواب مہدی نواز جنگ بہادر معتمد صنعت و حرفت، نواب شہید یار جنگ بہادر، مولوی سید محمد اعظم صاحب ناظم تعلیمات، مولوی سید علی اکبر صاحب پرنسپل نظام کالج، مولوی غلام یزدانی صاحب او، بی، ای، پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی، ڈاکٹر سید حسین صاحب مسجل جامعہ عثمانیہ، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب، مولوی ظہیر الدین احمد صاحب صدر محاسب سرکار عالی، مولوی رکن الدین احمد صاحب، ڈاکٹر راحت اللہ خاں مہتمم کتب خانۂ آصفیہ، مولوی غلام قادر صاحب پرنسپل دار العلوم، پروفیسر محمد علی خاں صاحب، مولوی محمد عالم صاحب، پروفیسر لطیف احمد صاحب فاروقی، مولوی حبیب احمد صاحب فاروقی، مولوی محمد اعظم صاحب لکچرار، مولوی سید محمد صاحب لکچرار، مولوی ابو ظفر صاحب لکچرار، مولوی مرزا ضامن علی صاحب غازی، نواب مرزا سیف علی خاں صاحب، نواب میر سعادت علی صاحب رضوی، مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی، مولوی فیض محمد صاحب، مولوی بادشاہ حسین صاحب، مولوی کاظم حسین صاحب وغیرہ

نشر کا انتظام

جلسے کی کارروائی نشرگاہ عالی حیدر آباد کی جانب سے راست ٹاؤن ہال باغ عامہ سے نشر کی گئی اور ممالک محروسہ کے علاوہ دوسرے مقامات کے علم دوستوں نے بھی گھر بیٹھے ٹاؤن ہال کی تقریریں اور خطبے سنے۔ ساتھ ہی ادارے کی تاریخ اور شعبوں کی تفصیلات بھی نشر کی گئیں۔ جس کے لئے نشرگاہ سرکار عالی کا منجانب ادارہ شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

عصرانہ

تقسیم اسناد کے بعد شہزادۂ والاشان اور شہزادی صاحبہ اور دیگر مہمانان بلدہ و اضلاع کی ایک پر تکلف عصرانے سے ضیافت کی گئی جو ٹاؤن ہال کے بالاخانے پر مرتب کی گئی تھی۔ تقریباً شام کے سات بجے یہ دلچسپ علمی صحبت اختتام کو پہنچی۔

خیر مقدم و روداد اردو امتحانات ۱۹۴۳ء

(یہ روداد اس جلسۂ عطائے اسناد میں سنائی گئی جو ۲۴ مارچ ۱۹۴۴ء کو بصدارت جنرل عالیشان شہزادہ ڈاکٹر اعظم جاہ بہادر بمقام ٹاؤن ہال باغ عامہ حیدرآباد منعقد ہوا۔)

حضرت شہزادۂ والاشان۔ جنابہ شہزادی صاحبہ اور معزز حاضرین جلسہ۔

ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ اردو امتحانات کے صدر کی حیثیت سے آج اس چوتھے جلسۂ تقسیم اسناد و انعامات میں آپ سب خواتین و حضرات کا بڑی مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں۔ گزشتہ جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت حضرت شہزادہ جنرل والاشان ڈاکٹر اعظم جاہ بہادر ہز ہائی نس پرنس آف برار نے فرمائی تھی اور اسناد و انعامات علیا حضرت ہز ہائی نس شہزادی درشہوار نے اپنے دست مبارک سے تقسیم فرمائے تھے۔ آج ہمیں اپنی اس خوش بختی پر ناز ہے کہ دودمان آصفی کا ایک اور چشم و چراغ شہزادۂ جنرل والاشان ڈاکٹر نواب معظم جاہ بہادر اس جلسہ کی صدارت فرما رہے ہیں اور علیا حضرت شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ اپنے دست مبارک سے کامیاب امیدواروں کو اسناد اور انعامات تقسیم فرمائیں گی۔

حضرت شہزادۂ والاشان ڈاکٹر معظم جاہ بہادر کو علم و ادب خصوصاً اردو ادب سے جو دلچسپی ہے اس کا تعارف میرے لئے غیر ضروری ہے۔ ہندوستان کی ادبی دنیا اور حیدرآباد کا ہر تعلیم یافتہ شخص حضرت شجیع کے کلام سے محظوظ ہوتا ہے اور بلند پایہ رسائل و جرائد ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں کہ اپنے صفحات کو شہزادۂ والاشان کے کلام سے زرین بنائیں۔ عہد حاضر میں حضرت شجیع نے اردو کے باکمال شعرا کی جو سرپرستی فرمائی ہے اس کو تاریخ ادب اردو بھول نہ سکے گی اور خود شہزادۂ والاشان کا اسم مبارک اردو کے باکمال شعرا کی فہرست میں کبھی محو نہ ہو سکے گا۔ یہ سرزمین حیدرآباد کی خوش قسمتی ہے کہ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم آصف جاہ سابع سلطان الشعرا خلد اللہ ملکہ کے اس چشم و چراغ نے اردو شاعری کی محفلوں کو جگمگا دیا ہے۔

حضرت شہزادۂ والاشان کے ساتھ ہم حضرت شہزادی صاحبہ کی خدمت میں بھی ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں کہ آج کے جلسہ میں رونق افروز ہو کر ہماری عزت افزائی فرمائی جہاں شہزادۂ والاشان اپنے شعر و سخن کے ذوق اور آرائش بلدہ اور غریبوں کے آرام و آسائش کے کاموں کی وجہ سے شہرت حاصل فرما چکے ہیں شہزادی ممدوحہ مختلف اصلاحی اور معاشرتی رفاہ کے کاموں میں رہنمائی فرماتی رہتی ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں خواتین و اطفال کی طبی امداد کے لئے جو انجمن قائم ہوئی ہے وہ شہزادی صاحبہ ہی کی رہبری میں بڑی کامیابی کے ساتھ طبقۂ نسواں کے فلاح و بہبود کا کام انجام دے رہی ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو کی زندگی کا یہ چودھواں سال ہے اور یہ ادارہ اپنے قابل صدر آنریبل ڈاکٹر نواب سر مہدی یار جنگ بہادر کی عالمانہ رہنمائی میں اردو ادب۔ تاریخ دکن اور تعلیم بالغاں کی جو خدمات انجام دے رہا ہے ان کے روشناس کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اس امر کا اظہار میرے لئے موجب مسرت ہے کہ اس ادارے کا ایک شعبہ جو تعلیم بالغاں کے کام کو اپنے طور پر آگے بڑھا رہا ہے اور

[illegible]

[illegible] مرتب اور شائع کرائی گئی ہیں جن میں سے ایک "معلم بالغاں" ہے جس کو ڈاکٹر احسن صاحب ایم اے ڈی ٹی پرنسپل صاحب موصوف کی نگرانی میں ان لوگوں کے لئے تصنیف کیا ہے جو خواں پڑھے لکھے بنانے کی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں۔ یہ اردو میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے اور توقع ہے کہ جہاں جہاں اردو کی تعلیم بالغاں کا کام ہو رہا ہے یہ کتاب ایک مفید رہنما ثابت ہوگی۔

مولوی سجاد مرزا صاحب نے شعبہ اردو امتحانات کے لئے اپنی نگرانی میں ایک اور ضروری کتاب "رفیق اردو داں" مولوی مرزا صمصام اللہ بیگ صاحب سے مرتب کرائی ہے جو نہایت ہی دیدہ زیب اور باتصویر شائع ہو رہی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ اردو لکھنا پڑھنا سیکھ چکے ہیں وہ اپنی فرصت کے اوقات میں مطالعہ جاری رکھ کر پڑھنے لکھنے کی دولت میں اضافہ کر سکیں۔ ایسی کتاب کی بھی بے حد ضرورت تھی ورنہ اندیشہ تھا کہ جو لوگ امتحان اردو دانی میں کامیاب ہوئے ہیں وہ پھر ایسے ہی کے ساتھ جہاں سے چلے تھے وہیں واپس نہ آ جائیں۔ اس کتاب میں نہ صرف دلچسپ قصے اور کہانیاں شریک کی گئی ہیں بلکہ ایک معمولی انسان کے لئے جو معلومات ضروری ہیں ان کو بھی دلچسپ پیرایہ میں درج کیا گیا ہے۔ ادارہ کوشش کرے گا کہ آئندہ اس قسم کی مزید کتابیں شائع کرے۔

سنہ ۱۹۴۳ء میں ادارے نے اردو دانی کا دو بار امتحان لیا۔ پہلا امتحان ماہ اگست میں لیا گیا جس میں ۹۰۵ امیدواروں نے شرکت کی لیکن ۷۴۸ حاضر رہے جن میں سے ۶۳۲ کامیاب ہوئے۔

دوسرا امتحان ماہ ڈسمبر میں لیا گیا جس میں ۹۰۰ امیدواروں نے شرکت کی لیکن بوقت امتحان ۶۹۰ حاضر رہے اور اس کا نتیجہ بہت اچھا نکلا یعنی ۶۲۳ امیدوار کامیاب ہوئے۔ اس طرح سنہ ۱۹۴۳ء میں گویا (۱۲۵۵) ان پڑھ آدمی پڑھے لکھے بنائے گئے اور یہ تعداد تو ان لوگوں کی ہے جنہوں نے امتحان میں شرکت کی درخواست دی ان کے علاوہ سیکڑوں آدمی ایسے بھی ہیں جنہوں نے پڑھنا لکھنا سیکھا، نصاب کی تکمیل کی، لیکن شرکت کی فیس داخل نہ کر سکنے یا علالت یا ملازمت کی مجبوریوں کی وجہ سے شرکت کا ارادہ نہ کر سکے۔ جن لوگوں نے اردو دانی کا امتحان کامیاب کر لیا تھا ان میں سے اکثروں کی یہ خواہش تھی کہ اپنی فرصت کے اوقات میں پڑھنا لکھنا جاری رکھیں اور اس کی خاطر کوئی امتحان مقرر کیا جائے چنانچہ سنہ ۱۹۴۲ء میں اردو زبان دانی کا ایک امتحان پہلی بار لیا گیا تھا اور گزشتہ سال اس کا دوسرا امتحان منعقد ہوا۔ اور اس میں چار سو امیدواروں نے شرکت کی درخواست دی جن میں سے تین سو پینتیس شریک اور ۲۰۱ کامیاب ہوئے۔

ان دو امتحانوں کے علاوہ بقیہ امتحانوں کے شرکا اور کامیاب امیدواروں کی تفصیل یہ ہے۔

	نام امتحان	شریک	حاضر	کامیاب
۱.	اردو عالم	۲۵۶	۲۱۳	۱۰۰
۲.	اردو فاضل	۳۱	۲۷	۱۷
۳.	خوش نویسی	۱۷	۱۳	۷

ساتھ ہی یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نتیجۂ کامیابی کا فی صد بھی واضح کر دیا جائے جو نقشۂ ذیل سے ظاہر ہوگا۔

	نام امتحان	حاضر	کامیاب	نتیجہ فیصد
۱.	اردو دانی	۱۴۳۸	۱۲۵۵	۸۷
۲.	اردو زبان دانی	۳۳۵	۲۰۱	۶۰
۳.	اردو عالم	۲۱۳	۱۰۰	۴۷
۴.	اردو فاضل	۲۷	۱۷	۶۳
۵.	خوش نویسی	۱۳	۷	۵۰

یہاں اس امر کی وضاحت غیر ضروری ہے کہ ان اردو امتحانات میں ہر مذہب و ملت اور طبقے کے امیدوار شریک ہوتے ہیں [illegible] اس سال امتحان اردو عالم میں ایک ہندو امیدوار بی۔ وی گوپال راؤ بہ حیثیت مجموعی اول آئے ہیں۔ اسی طرح متعدد غیر مسلم امیدواروں نے امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی ہے جن کو تعریفی انعامات بھی عطا کیے جائیں گے۔

اردو امتحانوں کے چار سالہ نتائج اور دیگر تفصیلات ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے ایک کتاب "[illegible]" [illegible] میں شائع ہو چکی ہے اس لئے اس بارے میں مزید وضاحت میرے لئے غیر ضروری ہے۔ البتہ میں اپنے اس مختصر مقدمہ کو ختم کرنے سے قبل اس واقعہ کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ شعبۂ امتحانات نے ان امتحانوں کی فیس بہت ہی کم یعنی اردو دانی کے لئے ایک روپیہ۔ اردو زبان دانی کے لئے دو روپے اور اسی طرح آخری بڑے امتحانات یعنی اردو فاضل کے لئے سات روپے مقرر کی ہے اور اس سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ سب امتحانوں ہی کے انتظامات پر صرف ہو جاتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس مفید تحریک کو زیادہ قوی بنانے کے لئے علم دوست اصحاب اس شعبے کا ہاتھ بٹائیں اور غریب اَن پڑھوں کے لئے مفت کتابیں فراہم کرنے اور امتیاز سے کامیاب ہونے والوں کے لئے انعامات اور تمغوں کی رقمیں عطا فرمائیں۔ اس مد میں سال حال تین اصحاب نے پچاس پچاس روپے عطا فرمائے ہیں جن کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی علیگڑھ۔

مولوی عبد المجید صدیقی صاحب استاد تاریخ جامعہ عثمانیہ۔

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔

جو اصحاب بلدہ اور اضلاع میں امتحانوں کو مقبول بنانے اور تعلیم بالغاں کو وسعت دینے میں خاموشی کے ساتھ ادارے کا ہاتھ بٹا رہے ہیں ان سب کا نام بنام شکریہ میں خوشی سے ادا کرتا اگر بے جا طوالت اور آپ کی سمع خراشی کا خوف نہ ہوتا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ مخلص خدمت گزار نام ونمود اور اظہار تشکر کی پروا کئے بغیر کام کر رہے ہیں۔ البتہ صرف دو اصحاب کا نام لینا ضروری سمجھتا ہوں جن کے نام اور کام ادارۂ ادبیات اردو کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان میں سے ایک کرنل نذیر الاسلام خاں صاحب ہیں جنھوں نے افواج سرکار عالی میں اردو امتحانات کو رائج کرنے میں ادارے کی مدد کی اور ہماری افواج کے علم دوست اور صاحب کمال کمانڈر جنرل سید احمد العیدروس کے بہبودی فوج کے کاموں میں اضافہ کا باعث ہوئے۔

دوسرے صاحب جن کا مجھے خاص طور پر ذکر کرنا ہے مولوی عارف الدین حسن صاحب ڈیویژن افسر اورنگ آباد ہیں جو کئی سال تعلیم بالغاں کے کام میں ادارے کا ہاتھ بٹانے میں شبانہ روز مصروف ہیں۔

سالہائے ماسبق کی طرح سال زیر رپورٹ میں بھی شعبۂ امتحانات کے ہر کام میں ادارۂ ادبیات اردو کے بانی اور قابل اور جوشیلے معتمد ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے بیش قیمت امداد فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شعبے نے جو کچھ کامیابی حاصل کی ہے اس کا سہرا زور صاحب کے سر ہے۔

اب میں آپ سب صاحبوں اور خاص کر شہزادۂ والا شان اور شہزادی صاحبہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اپنی شرکت سے اس جلسہ کو افتخار کا موقع بخشا اور اردو کی خدمت کرنے والوں کی ہمت افزائی کی۔

سید علی اکبر

تقریر آنریبل ڈاکٹر نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر ادارہ

شہزادہ والاشان جنرل ڈاکٹر نواب معظم جاہ بہادر۔ شہزادی صاحبہ، خواتین و حضرات!

ادارۂ ادبیات اردو کی زندگی کے تیرہ سال ختم ہو چکے۔ اب اس نے چودھویں سال میں قدم رکھا ہے، اور خدا کا شکر ہے کہ اس کی ترقی کی رفتار بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اس ادارے کے یوں تو بارہ شعبے ہیں لیکن ان میں سے پانچ کے کام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۔ سب سے پہلا کام جس میں ادارے نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے تاریخ دکن کی خدمت ہے۔ ملک میں تاریخ کا ذوق عام کرنے کے لیے ادارے نے اب تک یوں تو کئی کتابیں شائع کی ہیں لیکن ان میں سلاطین آصفی کے سوانح حیات کا سلسلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اب تک چھ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اور حضرت آصف جاہ اول سے لے کر غفراں مکاں نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس تک جملہ آصف جاہی سلاطین کے حالات باتصویر چھوٹی چھوٹی کتابوں میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔

قطب شاہی عہد کے سلاطین اور امرا پر بھی ادارے نے ایک کئی کتابیں شائع کیں اور تاریخ دکن کی تحقیقات کے لیے بڑا اچھا ذخیرہ فراہم کر لیا ہے جس سے استفادہ کے لیے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ قلعہ گولکنڈہ میں کٹورہ حوض کے کنارے ادارے کو تقریباً سات ایکڑ زمین پٹہ پر حاصل ہو گئی ہے جس پر تاریخی مخزن اور طلبہ و محققین تاریخ کی رہائش گاہ کی عمارتوں کا نقشہ نواب زین یار جنگ بہادر تیار کر رہے ہیں اور توقع ہے کہ سال حال ان کی تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا۔

۲۔ دوسرا کام ادارے کا کتب خانہ ہے۔ جس میں پندرہ سو سے زیادہ قلمی اور بارہ ہزار مطبوعہ کتب جمع ہو چکی ہیں اور قلمی نوادر کے تذکرے کی پہلی جلد اسی سال چھپ بھی چکی ہے جس میں ۵۰۰ مخطوطات کی تفصیلات درج ہیں۔ کتابوں کے علاوہ تقریباً سو رسائل و جرائد بھی ادارے میں پابندی کے ساتھ آتے ہیں۔

ادارے کے کتب خانہ سے کتابیں مطالعہ کے لیے باہر نہیں دی جاتیں البتہ اس کے اراکین وہیں بیٹھ کر ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اب تک عمارت ناکافی ہونے کے باعث زیادہ اصحاب ان سے استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔ اب ادارے کے معتمد ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اپنے ذاتی صرفہ سے دار المطالعہ کے لیے ایک ہال بنایا ہے جو ابھی تکمیل کو پہنچا ہے اور جس کا میں نے آج ہی بڑی مسرت کے ساتھ افتتاح کیا ہے اس ہال کی وجہ سے محققین اور مطالعہ کرنے والوں کو بڑی سہولت حاصل ہو گئی ہے اور توقع ہے کہ اب زیادہ سے زیادہ اصحاب ادارے کے علمی ذخیرے سے استفادہ کر سکیں گے۔

۳۔ ادارے کا تیسرا اہم کام مخزن علوم و فنون یعنی اردو انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب و اشاعت ہے۔ یہ کام بڑا صبر آزما اور محنت طلب تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ پہلی جلد مرتب ہو کر دار الطبع سرکار عالی میں بغرض طباعت روانہ ہو چکی ہے۔

۴۔ ادارے کا چوتھا کام مختلف موضوعوں پر مفید کتب اور رسالہ سب رس کی اشاعت سے متعلق ہے۔ گزشتہ سال باوجود مختلف ہنگامی مشکلات کے ادارے نے بارہ کتابیں شائع کیں جن میں سے بعض مثلاً ہندوستانی تمدن از ڈاکٹر ٹوپا طبیعیاتی کائنات

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

خطبۂ صدارت

شہزادہ والاشان جنرل ڈاکٹر معظم جاہ بہادر

اردو زبان و ادب اور خاص کر شعر و سخن سے مجھے جو دلچسپی ہے اس کی بنا پر مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ حیدرآباد میں جہاں حضرت اقدس و اعلیٰ کی سرپرستی میں جامعہ عثمانیہ سرکاری طور پر علمی خدمات انجام دے رہی ہے وہیں ادارۂ ادبیات اردو کے نام سے یہ خانگی ادارہ بھی ملک کی زبان، تاریخ اور تمدن کی حفاظت و ترقی کے لئے گزشتہ تیرہ سال سے کوشش کر رہا ہے۔

اس ادارہ نے نہ صرف جدید و قدیم شاعروں کے کلام اور مکتوبات کے اچھے مجموعے اور انتخابات شائع کئے بلکہ ملکی مشاہیر ادب کے آثار کی حفاظت کا کام بھی کیا۔ مجھے یہ معلوم کر کے بھی بہت مسرت ہوئی کہ اس ادارہ نے ملک میں تاریخ کا ایک اچھا ذوق پیدا کر دیا ہے۔ خصوصاً سلاطین آصفیہ کے سبق آموز حالات زندگی شائع کر کے ملکی تاریخ کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہ ادارہ مختلف علوم و فنون مثلاً تاریخ، سائنس، تنقید اور تعلیم سے متعلق بھی متعدد و مفید کتابیں شائع کر چکا ہے۔ اس ادارہ کا ایک نمایاں کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے ایک مخزن علوم و فنون مرتب کی جس کی پہلی جلد زیر طبع ہے۔

یہ سب کام ایسے اہم اور مفید ہیں جن کے لئے ادارہ کے بانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مبارک باد کے مستحق ہیں۔ لیکن میرے نزدیک اس ادارے کی سب سے زیادہ قابل تعریف کوشش تعلیم بالغان کی مہم ہے۔ ہمارے ملک میں جہاں تعلیم کا اوسط افسوس ناک حد تک کم ہے۔ غریب اور ان پڑھ لوگوں کو پڑھا لکھا بنانا نہایت ضروری ہے۔ پرنسس اور میرے لئے یہ امر بھی باعث مسرت ہے کہ ادارہ کے اردو امتحانات میں مردوں کے علاوہ ہر مذہب و ملت کی خواتین بھی شریک ہوتی ہیں۔ اور اس طرح تعلیمی ذوق روز بروز پھیلتا جا رہا ہے۔

توقع ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو اپنے پرجوش کارکنوں کی بدولت روز افزوں ترقی کرے گا۔ اور ملک کے علمی و تمدنی ارتقاء میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے گا۔

سرپرستی

یہ خبر علمی حلقوں میں بڑی مسرت سے سنی جائے گی کہ شہزادۂ والاشان نے ازراہ علم دوستی ادارے کی سرپرستی قبول فرما کر ایک ہزار روپیہ بھی عطا فرمائے ہیں۔ (ادارہ)

اداریۂ روزنامۂ رہبرِ دکن

(ادارۂ ادبیاتِ اردو کا جلسۂ تقسیمِ اسناد)

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا جلسۂ تقسیمِ اسناد اس مرتبہ شہزادۂ والا شان حضرت معظم جاہ بہادر کی صدارت میں باغِ عامہ ٹاؤن ہال میں بڑی شان سے منعقد ہوا اور اسناد اور انعامات کی تقسیم شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ کے مبارک ہاتھوں سے عمل میں آئی۔ اس کی علمی سرگرمیاں ماشاء اللہ اب اتنی بڑھ گئی ہیں کہ ملک کے ہر گوشہ میں ان کا اعتراف کیا جا رہا ہے انھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر عزم راسخ و سعیٔ پیہم موجود ہو تو غیر سرکاری کوششیں بھی علمی و فنی میدان میں بہت ہی نمایاں نتائج حاصل کر سکتی ہیں۔ اس ادارہ نے جس کی ابتدا کچھ زیادہ شاندار نہ تھی، اردو کی خدمت کو اپنی فکر و کاوش کا مرکز بنایا اور ابتداءً چند پرانی اور غیر مطبوعہ تاریخی و ادبی کتابیں نئے طریق پر مرتب کر کے شائع کرنی شروع کیں۔ مگر ذوقِ خدمتِ زبان نے خدمت کا موقع دیا اور خدمت نے ذوقِ خدمت کو بڑھانا شروع کیا اور اس طرح میدانِ عمل وسیع سے وسیع تر ہونے لگا۔ اب یکے بعد دیگرے قابلِ قدر کتابیں بھی نکلنے لگیں اور ایک ادبی رسالہ بھی شائع ہونے لگا اور اس کے باوجود اس نے ایک طرف تو اردو زبان میں "مخزنِ علوم و فنون" کی تدوین و ترتیب شروع کر دی اور دوسری طرف ناخواندگی کے خلاف مختلف امتحانی نصاب مرتب کر کے ایک جہاد شروع کر دیا اور سارے ممالکِ محروسہ میں امتحانی مراکز قائم کر دیے۔ اس طرح ملک میں ہر سمت اردو زبان میں اسناد حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو گیا اور مرد اور عورتیں کثیر تعداد میں بلا لحاظِ مذہب و ملت ان امتحانوں میں شریک ہونے اور اسناد حاصل کرنے لگیں۔ حتیٰ کہ اس جلسۂ تقسیمِ اسناد میں ۲۰۷۰ اسناد اور ۲۰۰ انعامات تقسیم ہوئے۔

شہزادۂ والا شان حضرت معظم جاہ بہادر نے جو اردو زبان و ادب کا ایک پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں اور اردو شعر و سخن کا بہت اچھا ملکہ اپنے فاضلانہ خطبۂ صدارت میں اس ادارہ کی سرگرمیوں کو نہایت ہی جامع طور پر ظاہر فرمایا ہے۔ ارشاد ہوا کہ

> "اس ادارہ نے نہ صرف جدید و قدیم شاعروں کے کلام اور مکتوبات کے اچھے مجموعے اور انتخابات شائع کئے بلکہ مشاہیرِ ادب کے آثار کی حفاظت کا کام بھی کیا۔ مجھے یہ معلوم کر کے بھی بہت مسرت ہوئی کہ اس ادارے نے ملک میں تاریخ کا ایک اچھا ذوق پیدا کر دیا ہے۔ خصوصاً سلاطینِ آصفیہ کے سبق آموز حالاتِ زندگی شائع کر کے ملکی تاریخ کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہ ادارہ مختلف علوم و فنون مثلاً تاریخ، سائنس، تنقید اور تعلیم سے متعلق بھی متعدد مفید کتابیں شائع کر چکا ہے۔ اس ادارہ کا ایک نمایاں کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے ایک مخزنِ علوم و فنون مرتب کی جس کی پہلی جلد زیرِ طبع ہے۔
>
> یہ سب کام بڑے اہم اور مفید ہیں جن کے لئے ادارہ کے بانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مبارک باد کے مستحق ہیں لیکن میرے نزدیک اس ادارہ کی سب سے زیادہ قابلِ تعریف کوشش تعلیمِ بالغاں کی مہم ہے۔"

ادارۂ ادبیاتِ اردو اپنی ان ساری کوششوں کے لئے یقیناً مستحقِ مبارک باد ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس کا دائرۂ افادیت انشاء اللہ روز بروز وسیع تر ہوتا جائے گا۔

(از رہبرِ دکن بابت ۲۹ مارچ ۱۹۴۴ء)

اداریہ روزنامہ صبح دکن

ادارۂ ادبیات اردو

ادارۂ ادبیات حیدرآباد میں ایک عرصے سے علم و ادب کی خاموش خدمت انجام دے رہا ہے۔ دکنی مخطوطات اور حیدرآباد کی باکمال شخصیتوں کی سوانح حیات کو شائع کر کے اس نے حیدرآباد کے کلچر تہذیب اور تمدن کو محفوظ کرنے میں بہت بڑی مدد دی۔

اس ادارے کے ۲۲ مارچ سنہ [illegible] کے جلسۂ تقسیم اسناد میں ڈاکٹر شہزادہ والا شان نواب معظم جاہ بہادر نے جو تقریر فرمائی اس میں آپ نے ادارے کی علمی خدمات کو بہت سراہا اور خصوصاً اس ادارے نے تعلیم بالغان کے سلسلے میں جو قدم اٹھایا ہے اس کے متعلق شہزادہ والا شان نے فرمایا کہ:

"میرے نزدیک اس ادارے کی سب سے زیادہ قابل تعریف کوشش تعلیم بالغان کی مہم ہے۔ ہمارے ملک میں جہاں تعلیم کا اوسط افسوس ناک حد تک کم ہے غریب اور ان پڑھ لوگوں کو پڑھا لکھا بنانا نہایت ضروری ہے"

ادارے کے یہ امتحانات چار سال سے برابر منعقد کئے جا رہے ہیں اور ادارے کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے امتحانات کو دیگر صوبوں مثلاً میسور اور بمبئی وغیرہ میں بھی پسند کیا جا رہا ہے۔

اس ادارے کی سرگرمی صرف اردو امتحانات کی حد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس نے بعض بڑی عمدہ کتابیں بھی تعلیم بالغان اور اردو امتحانات کے نصاب کے لئے شائع کی ہیں۔ عوام کو تعلیم دلانے کی ساری ذمہ داری حکومت ہی پر عائد نہیں ہوتی بلکہ ملک کے بعض بااثر لوگوں کو بھی اس مہم میں کافی دلچسپی لینی چاہیے۔ دوسرے ممالک میں محض خانگی ادارے ہی کئی مفید اور کارآمد اسکیمیں چلاتے ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو ایک بالکل خانگی ادارہ ہے جو ابتدا میں صرف اپنے ہی بل بوتے پر کھڑا ہوا تھا لیکن آج اس کی وسیع سرگرمیاں اہل ملک سے خراج تحسین وصول کر رہی ہیں۔ اس خصوص میں پرنس معظم جاہ بہادر نے فرمایا کہ:

"جہاں حضرت اقدس و اعلیٰ کی سرپرستی میں جامعہ عثمانیہ سرکاری طور پر علمی خدمات انجام دے رہی ہے وہیں ادارۂ ادبیات اردو کے نام سے یہ خانگی ادارہ بھی ملک کی زبان تاریخ اور تمدن کی حفاظت و ترقی کے لئے گزشتہ تین سال سے کوشش کر رہا ہے۔"

حیدرآباد میں جہاں کی تعلیم کا اوسط بہت ہی پست ہے وہاں ایسے اداروں کی سرگرمی یقیناً اس ملک کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ اردو کی اشاعت و ترویج کا بھی یہ امتحانات ایک بہترین ذریعہ ہیں۔ اردو کو اگر قومی زبان بننا ہے تو اسے پہلے عوام کی زبان ہونے کا موقع ملنا چاہیے۔ کیونکہ اگر محض تعلیم یافتہ حضرات ہی اردو لکھ پڑھ سکیں تو وہ زبان کبھی قبول عام کا درجہ حاصل نہیں کرے گی۔ اس کے لئے بہترین ذریعہ یہی تھا کہ بجائے حکومت پر بوجھ ڈالنے کے خود خانگی طور پر اردو امتحانات مقرر کئے جائیں۔ بہت کم ادارے ایسے ہیں جو خالص علمی کام انجام

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اداریہ روزنامہ پیام

(ادارۂ ادبیات اردو)

گزشتہ ہفتہ ادارۂ ادبیات اردو کا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا جس میں شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ نے اسناد و انعامات تقسیم فرمائے۔ تقریباً ہر سال ہم اس ادارہ کی جد و جہد کے نتائج اس کی سالانہ رپورٹوں سے اخذ کر کے پیش کرتے رہے ہیں۔ کم و بیش ۱۴ سال کی جد و جہد نے اس ادارہ کو ملک میں اردو ادبیات کا ایک اہم مرکز بنا دیا ہے۔

چند سال کی ابتدائی کوششوں کے بعد ڈاکٹر زورؔ کی رہنمائی میں ادارہ نے تصنیف و تالیف کے میدان میں دکن کی تاریخ اردو اور قدیم علوم کے متعلق اپنی قابل قدر اشاعتوں کے ذریعہ سے ایک ایسی نمایاں حیثیت حاصل کر لی ہے جس کی بنا پر وہ اب اپنی عملی صلاحیتوں سے قومی زبان کی ترویج و اشاعت کے وسیع تر میدان میں بہت موثر اور مفید کام کر رہا ہے۔ چنانچہ تعلیم بالغان کے سلسلہ میں ادارہ نے اردو امتحانات کا ایک ایسا سلسلہ شروع کیا ہے جو اس وقت تمام ملک پر حاوی ہے۔ ان امتحانات کے ذریعہ اردو زبان کی مقبولیت میں اضافہ کیا جا رہا ہے، لیکن ان امتحانات کا ایک قابل ذکر اور نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ بغیر کسی پروپگنڈے کے ملک کی غیر مسلم آبادی کے افراد بھی شوق کے ساتھ ان امتحانات میں شریک ہو کر اور کامیابی کی اسناد حاصل کر کے اس حقیقت کو ثابت کر رہے ہیں کہ سیاسی تفریق اور تنگ نظری کی بناء پر اردو زبان کی کتنی ہی مخالفت کی جائے لیکن وہ درحقیقت ملک کی عام زبان ہے۔

ادارہ کی روداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو دانی، اردو زبان دانی، اردو عالم، اردو فاضل اور خوش نویسی کے امتحانات کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ ان کے مراکز اب ممالک محروسہ کے باہر بمبئی، مدراس، صوبہ متوسط اور میسور میں بھی قائم ہو گئے ہیں۔ امتحانات کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۴۳ء میں ادارہ کے ان امتحانات میں ۱۱۳۵۰ امیدوار شریک ہوئے جن میں سے ۱۲۵۵ کامیاب ہوئے یعنی سال بھر میں تقریباً ۱۹ سو ناخواندہ اشخاص نے اردو زبان میں تعلیم حاصل کی۔ اس تعداد میں مسلم و غیر مسلم دونوں شامل ہیں۔ چنانچہ ادارہ کی رپورٹ میں خاص طور پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ

"ان اردو امتحانات میں ہر مذہب و ملت اور طبقے کے امیدوار شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس سال امتحان اردو عالم میں ایک ہندو امیدوار بی وی گوپال راؤ بحیثیت مجموعی اول آئے۔ اسی طرح متعدد غیر مسلم امیدواروں نے امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی ہے۔"

گویا یہ جواب ہے ان لوگوں کے دعویٰ کا جو اپنی تنگ نظری یا فرقہ واری تعصب کی بنا پر اردو زبان کو محض مسلمانوں کی زبان قرار دیتے ہیں، اور جن کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ ملک کی قومی وحدت کے لئے کسی ایک زبان کو جو عام طور پر مقبول ہو قومی زبان قرار دینا ضروری ہے۔ حکومت سرکار عالی نے جب فارسی کے بجائے اردو کو اپنی دفتری زبان قرار دیا اور اس کو جامعہ عثمانیہ میں واسطہ تعلیم بنایا تو اس نے اس فیصلہ میں یقیناً کسی قسم کی فرقہ واری عصبیت کارفرما نہ تھی بلکہ صرف یہ مدبرانہ تصور اثر انداز تھا کہ وحدت ملی و وحدت لسانی

[illegible]

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے
[illegible]	۸۰	۰	[illegible]
[illegible]	۹۳	۰	[illegible]
نظام الملک [illegible]	۴۰	۰	۴
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۶
ریڈیو [illegible]	۱۹۰	۱	[illegible]
ارمغان [illegible]	۱۲۰	۰	۱۲
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴
سر سید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲
سر سالار جنگ ...	۴۸	۰	۶
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴
محبت کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴
اقبال نمبر ...	۱۶۸	۱	۴
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۴
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸
دادا بھائی ...	۱۶	۰	۲
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	۰
ارسطو جاہ ...	۶۵	۰	۶
عماد الملک ...	۴۰	۰	۶
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۵
〃 دوسری کتاب	۵۶	۰	۵
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴
فن تقریر ...	۹۲	۰	۸
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰
ہندستانی تمدن ...	۳۴۰	۳	۸
پودوں کی کہانی ...	۸۰	۰	۱۰
مہ لقا ...	۱۰۰	۱	۰
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	۶
رسائل طبیہ ...	۳۱۲	۲	۸
سلک گوہریں ...	۴۰	۰	۴
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۶	۱	۴
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	۴
ہوش کے ناخن ...	۹۴	۱	۰
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹	۱	۰
شاد اقبال ...	۱۷۶	۲	۸
آریائی زبانیں ...	۱۰۴	۱	۰
نظام علی خاں ...	۳۲	۰	۴
تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰
عرب اور عربستان ...	۵۶	۰	۱۰

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے
سحر کا جادو ...	۴۸	۰	[illegible]
طبیعیاتی کائنات ...	۹۸	۰	۸
متاع سخن	۱۲۴	۰	۱۲
کیف سخن ...	۱۲۲	۰	۱۲
بادۂ سخن ...	۱۲۷	۰	۱۲
سراج سخن ...	۱۵۴	۰	۱۲
ایمان سخن ...	۱۲۰	۰	۱۲
فیض سخن ...	۱۴۴	۰	۱۲
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰
〃 دوم (۵۰) 〃	۴۳۲	۵	۰
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰
نذر ولی ...	۲۴۸	۲	۸
گریہ وتبسم ...	۱۹۲	۲	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰
من کی دنیا ...	۱۳۵	۱	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸
محرم نامہ ...	۱۱۲	۱	۰
نذر دکن ...	۱۵۴	۱	۴
روح غالب ...	۲۴۰	۲	۸
عاصم ...	۲۰۰	۱	۴
دفتری معلومات ...	۵۶	۰	۶
آبدوزکشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲
نمود زندگی ...	۲۱۶	[illegible]	۸
سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	۰	۱۲
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸
بلقان	۳۲	۰	۳
خطابیات ...	۱۱۳	۰	۱۲
علم خانہ داری ...	۱۵۰	۱	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸
انوار	[illegible]	[illegible]	۸
کشمکش ثانی (۴) تصاویر	[illegible]	[illegible]	[illegible]
گارساں دتاسی ...	۱۲۸	[illegible]	[illegible]
رات کا بھولا ...	۱۶۸	[illegible]	[illegible]
مظفر جاہ ...	۳۴	۰	[illegible]
بلاغت ...	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ادارہ سنہ ۱۹۴۲ء میں	۲۰۰	۰	۸
ناصر الدولہ	۳۲	[illegible]	[illegible]
افضل الدولہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]
نواب میر محبوب علی	[illegible]	[illegible]	[illegible]

(ماہ نامہ)

سب رس

طلبہ اور بچوں کے لئے

۱۹۴۴ع

(۵) ۶



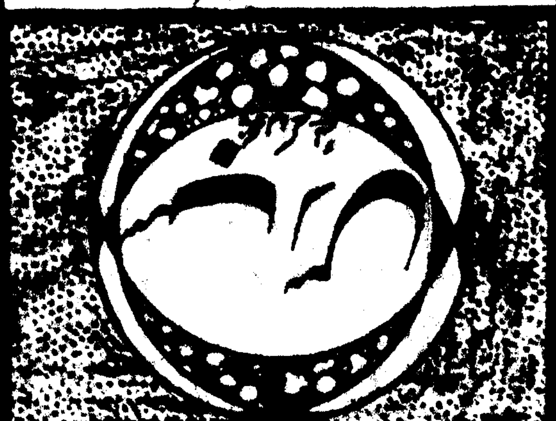
ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

[illegible]

٧	[illegible]	[illegible]	[illegible]
٦	[illegible]	[illegible]	[illegible]
٥	[illegible]	[illegible]	١١
٤	[illegible]	[illegible]	١٠
٣	[illegible]	[illegible]	[illegible]
٢	[illegible]	[illegible]	[illegible]
١	[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]

(٦) [illegible]	[illegible]	(٧) [illegible]
[illegible]		[illegible]
	[illegible]	

آپ کی ہماری باتیں

ہمیں افسوس ہے کہ یہ شمارہ وقت پر شائع نہ ہو سکا۔ وجہ یہ ہے کہ جولائی کا مہینہ بڑا مصروفیت کا گزرا ہے۔ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ اس مہینے ادارۂ ادبیات اردو کی زیر سرپرستی کل ہند اردو کانگریس منعقد ہوئی تھی جس میں ہندوستان کے اکثر مشاہیر نے شرکت کی۔ اس کے اجلاس ٹاؤن ہال باغ عامہ میں منعقد ہوئے انتظامات شاندار پیمانے پر کئے گئے تھے۔ مندوبین اور مہمانوں کے قیام و طعام کا قصر بشیر باغ میں انتظام تھا۔ مہمانوں کے لئے جس عمدگی اور سلیقہ سے انتظام کیا گیا تھا۔ اس کی تعریف بیان سے باہر ہے۔ بہرحال باہر والے حیدرآباد سے اچھے تاثرات لئے ہوئے واپس ہوئے۔ کانگریس کو شاندار پیمانہ پر منعقد کرنے اور کامیاب بنانے میں نواب زین یار جنگ بہادر اور ڈاکٹر زور صاحب کی کوشش لائق صد مبارک باد ہیں۔

اس کانگریس کے کل نو اجلاس منعقد ہوئے جن میں اردو کے مختلف مسائل زیر بحث رہے حیدرآباد میں یہ کانگریس اپنی نوعیت کی پہلی تھی۔ مشاہیر اُردو کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں یک جا جمع ہونے کا بہت کم موقع ملتا ہے لیکن اس کانگریس کی ایک بڑی خصوصیت یہ رہی کہ ہر زاویۂ خیال کے لوگ اس میں شریک تھے۔ جن مقاصد کے تحت اس کانگریس کا انعقاد ہوا ہے خدا کرے کہ اس میں کامیابی ہو۔ حیدرآباد نے اُردو کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ اردو کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ ہم کو چاہئے کہ ان کی قدر کریں اور اردو کے پھلنے پھولنے اور ترقی کے لئے خود بھی کوشش کریں اور ان لوگوں کی بھی ہمت افزائی کریں جو اس کام میں مصروف ہیں۔

آپ ستمبر کے پرچے کا انتظار نہ کیجئے۔ اکتوبر میں ہم ایک خاص نمبر شائع کر رہے ہیں جس کے لئے اچھے اچھے مضامین اور نظمیں درکار ہیں۔ اس میں نہ صرف مضامین اور نظمیں شامل رہیں گی بلکہ اور بھی دلچسپیاں ہوں گی۔ مضامین وغیرہ جلد بھیجنے کی کوشش کیجئے۔

معین الدین احمد انصاری

کہانی



میاں موٹو کے اصل نام سے تو ہم بھی واقف نہیں لیکن عام طور پر یہ اسی نام سے مشہور تھے اس لئے کہ یہ بے حد موٹے تھے۔ ان کے والد کا تعلق اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تھا لیکن زمانہ ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہتا۔ ان کے والد بہت ضعیف ہو چلے تھے۔ آمدنی بھی پہلے کی سی نہ تھی۔ اب موٹے میاں ہی ان کی زندگی کا سہارا تھے۔ موٹے میاں جیسا نام سے ظاہر ہے بے حد موٹے تھے۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ بس یہی چودہ پندرہ کے لگ بھگ ہوگی۔ بے چارے موٹے ہونے کی وجہ سے بڑے شرمندہ ہوتے۔ جس گلی کوچے سے گزرتے دو چار شریر لڑکے ان کے ساتھ ہو جاتے اور طرح طرح سے ستاتے اور فقرے کستے سچ پوچھئے تو میاں موٹو تھے ہی ایسے گر کیا کیا جائے قدرت میں کس کو دخل ہے! ان کی شکل وصورت بڑی دلچسپ تھی، سیاہ رنگ، گال ربر کی گیند، چھوٹی چھوٹی آنکھیں موٹے موٹے ہونٹ، موٹی سی بدوضع ناک، اگر یہ دور سے آتے ہوئے نظر آتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مست ہاتھی جھومتا چلا آرہا ہے۔ پڑھنے کے لئے انھیں مکتب بھیجا گیا لیکن لڑکوں کی شرارت نے بہت جلد انھیں مکتب چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ کوئی صحبت ایسی نہ ہوتی جس میں بے چارے ستائے نہ جاتے۔ ایک دن کا دلچسپ قصہ یہ ہے کہ ان کے کپڑوں پر سیاہ روشنائی گر گئی اور وہ دن تھے گرمیوں کے۔ کسی شریر کو خوب مذاق ہاتھ آیا ایک دوست نے دریافت کیا "موٹے میاں تمہارے کپڑے سیاہ کیسے ہوگئے؟" دوسرے ساتھی نے کہا "گرمی کے دن ہیں، موٹے میاں کو پسینہ نکلا ہوگا" موٹے میاں مجبور تھے کیا کرتے اپنا سا منہ لے کر وہاں سے چل دیئے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے انھیں ملازمت کی سوجھی دوسرے دن علی الصبح اٹھے سفید صاف انگرکھا پہنا اور چل کھڑے ہوئے۔ جس دفتر اور جس کچہری سے گزرتے دریافت کرلیتے لیکن ہر جگہ انھیں ایک قہقہے

کے ساتھ صاف جواب مل جاتا۔ دن بھر مارے مارے پھرا کئے لیکن ناکامی ہی رہی ایک دن معلوم نہیں کیا خیال آیا تیر و کمان لے کر جنگل کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ وہاں جا کر نشانے کی خوب مشق کرنے لگے۔ اب ہر روز ان کا یہی کام ہوتا۔ باوجود موٹے ہونے کے محنت سے کبھی جی نہ چراتے تھے اور ہر چیز کو سیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اسی وجہ سے چند ہی دنوں میں بڑا اچھا نشانہ ہو گیا۔ موٹے میاں طبیعت کے بڑے شریف اور رحم دل تھے۔ ایک دفعہ جنگل میں ایک بڈھے شخص کو ایک سانپ نے بُری طرح لپیٹ

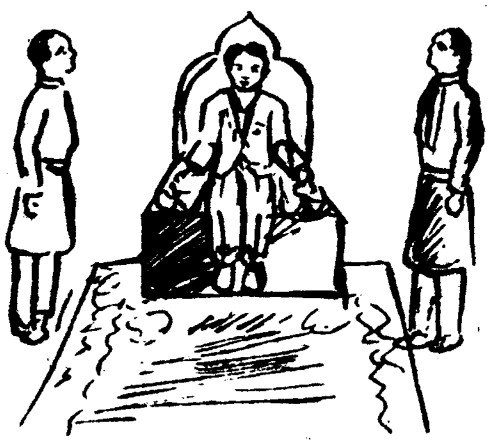


لیا۔ بڈھا بے چارا مجبور تھا۔ موٹے میاں سے یہ نہ دیکھا گیا سانپ پر ایسے کمال سے تیر چلائی کہ وہ وہیں تڑپتا رہ گیا اور بوڑھے کی جان بچ گئی۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور دعا دی کہ تیرا نشانہ آگے چل کر اور اچھا ہو اور تو دنیا کا بڑا آدمی بن جائے، اس واقعہ کے بعد موٹے میاں بے حد مشہور ہو گئے۔ ہر ایک ان کے نشانے کی تعریف کرنے لگا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن بادشاہ نے انھیں طلب کیا۔ بادشاہ ان کے نشانے سے بے حد خوش ہوا اور انھیں تنخواہ مقرر کر دی اور ان کا نام "زبردست خاں" رکھ دیا۔ اب یہ ہنسی خوشی رہنے لگے لیکن یہ خاموش بیٹھنے والے آدمی نہ تھے اور ترقی کرنے والا آدمی کبھی خاموش نہیں بیٹھتا۔ زبردست خاں چاہتے تھے کہ ان کا نام ساری دنیا میں مشہور ہو جائے چند ہی دن بعد یہ ہوا کہ ایک دوسرے ملک کے بادشاہ نے یہ اعلان کیا کہ جو سب سے اچھا تیر چلائے گا اسے شاہزادی بیاہی جائے گی۔ اس مقابلہ میں بڑے بڑے شاہزادے بہترین تیر انداز اور خوبصورت نوجوان شریک ہوئے۔ زبردست خاں سے نہ رہا گیا وہ بھی اس مقابلہ میں شریک ہو گئے۔ شہزادی سے بیاہنے کے لئے تین شرطیں مقرر تھیں۔ پہلی شرط یہ تھی کہ ایک خوبصورت لڑکے کے ہاتھ پر ایک سیب رکھ دیا گیا تھا اسے تیر کا نشانہ بنانا تھا۔ دوسری یہ تھی کہ ایک اور سیب کو دوسرے ہاتھ پر رکھا گیا تھا۔ تیسری اور سب سے مشکل شرط یہ تھی کہ اسی کے سر پر ایک اور سیب رکھ دیا گیا تھا اور اس سیب پر تیر چلانا تھا لیکن ان سب کے لئے شرط یہ تھی کہ

اس ہو کہ کا کوئی نقصان نہ ہو۔ پہلی دو شرطوں کو تو اکثروں نے پورا کر لیا لیکن آخری مقابلہ کے لئے کسی کی ہمت نہ ہوئی۔ جب زبردست خاں کی باری آئی تو انھوں نے ایسے کمال سے سر پر رکھے ہوئے سیب کو نشانہ بنایا کہ ہر طرف سے واہ واہ ہونے لگی۔ بادشاہ اور شاہزادی زبردست خاں کی شکل و صورت دیکھ کر خوش نہ ہوئے لیکن بادشاہ اپنے وعدہ سے مجبور تھا۔ بہت جلد شہزادی کی شادی زبردست خاں سے ہو گئی۔ لیکن چند ہی دنوں میں زبردست خاں نے یہ



ثابت کر دکھایا کہ اچھی سیرت اور اچھے اخلاق اچھی صورت سے زیادہ اچھے ہوتے ہیں بادشاہ اور شاہزادی دونوں اس سے بے حد خوش تھے۔ بادشاہ اب ضعیف ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی سلطنت زبردست خاں کے حوالے کر دی اور اسے "زبردست جنگ" "زبردست الدولہ" کے خطاب سے سرفراز کیا۔ بڑی دھوم دھام سے زبردست جنگ تخت نشین ہوئے اس وقت انھوں نے اپنی رعایا کو مخاطب کرکے اپنی کہانی سنائی اور کہا کہ جو کام محنت، کوشش اور جد و جہد سے کیا جائے اس کا نتیجہ ہمیشہ اچھا ہی ہوتا ہے۔



بلقیس (علی گڑھ)

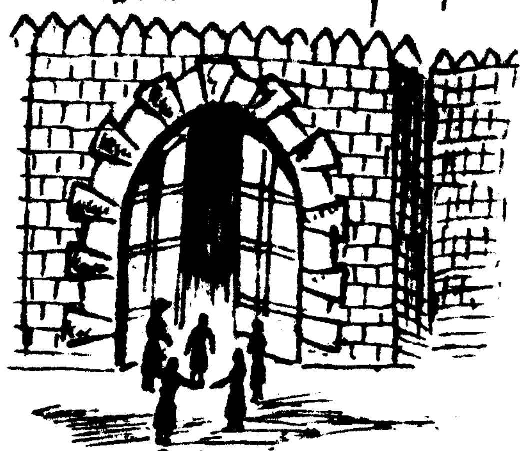
عرب اور عربستان ۔ شعبۂ ادبیات اطفال کی طرف سے یہ نئی باتصویر کتاب شائع کی گئی ہے۔ محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے نے نہایت دلچسپ، سلیس انداز میں مرتب کیا ہے۔ تقریباً ہر صفحہ پر تصویر دی گئی ہے۔ صفحات ۵۶ قیمت صرف ۱۰/

غرور اور عاجزی

سسلی کا ایک بادشاہ رابرٹ گزرا ہے۔ یہ بہت مشہور اور جوانمرد بادشاہ تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بے حد مغرور اور جلد باز تھا۔ اس کے غرور کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے کبھی خدا کے سامنے سر تک نہ جھکایا۔ ایک دفعہ وہ محل میں تھا کہ گرجا سے شام کی عبادت کی آوازیں آنے لگیں اس میں سے کچھ لفظ اس کی سمجھ میں نہ آئے جو لاطینی زبان کے تھے کیونکہ اس کو اپنی جنگجوئی اور لہو و لعب سے اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ غیر زبانیں سیکھتا۔ قریب ہی ایک پادری کھڑا تھا بادشاہ نے اس سے ان الفاظ کا مطلب پوچھا پادری نے کہا اس کے معنی یہ ہیں کہ "خدا نے طاقتور کو اپنی جگہ سے گرا دیا اور فرماں برداروں کو عروج پر پہنچایا" اس پر رابرٹ نے کہا کہ "مجھے اس عہدے سے گرانا آسان کام نہیں" پادری نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش ہو گیا۔

موسم کسی قدر گرم تھا۔ بادشاہ اپنے کام سے تھک گیا تھا اس لئے وہ سو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ نیند سے بیدار ہوا۔ گرمی کی تاب نہ لا کر اس نے کمرے کی کھڑکیاں کھولیں تاکہ ہوا آسکے۔ اسے یہ دیکھ کر سخت پریشانی ہوئی کہ قریبی گرجا بالکل سنسان تھا اور صرف ایک ضعیف عورت جو بہری بھی تھی فرش اٹھانے میں مشغول تھی۔ بادشاہ نے دریافت حال کے لئے اس کو پکارا۔ بہری نے کچھ جواب نہ دیا۔ یہ زور زور سے پکارتا رہا مگر کوئی کامیابی نہ ہوئی آخر کو وہ خود اس کی طرف کو چلا۔ جونہی اس عورت نے بادشاہ کو اپنی طرف آتے دیکھا چور چور کہہ کر بھاگنے لگی باہر ہی روپوش ہو گئی اور جیسے ہی بادشاہ گرجا میں داخل ہوا اس نے باہر سے دروازہ بند کر دیا اب رابرٹ گرجا میں محصور تھا۔ رابرٹ نے چاروں طرف نظر دوڑائی ہر طرف سناٹا اور ہو کا عالم تھا۔ اتنے میں بادشاہ کی نظر اپنے آپ پر پڑی اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس کا لباس فاخرہ تاج شاہی ہیروں کی جگمگاتی انگوٹھیاں سب کی سب غائب تھیں اور وہ سادہ لباس میں ملبوس تھا۔ غصہ، شرمندگی اور حیرت سے رابرٹ کا چہرہ سفید ہو گیا۔ وہ چلایا "بغاوت! بغاوت!! میری فوج باغیوں کی بوٹیاں بوٹیاں کر دے گی۔ یہ کیا ہے؟ دروازہ کھولو۔ اپنے بادشاہ کے لئے دروازہ کھولو" آواز آئی

[illegible]۔ تم بدمعاش ہو"۔ رابرٹ خاموش رہا" تم چاہتے ہو کہ بادشاہ کا واسطہ دے کر دروازہ
کھلوا لو۔ [illegible] ڈاکو ہیں سامان لوٹنے کے لئے چھپے رہے اور اب بادشاہ کا واسطہ دے کر دروازہ کھلواتے
[illegible] بھی خاموش رہا آخر مجبور ہو کر بادشاہ نے دروازہ پر ٹھوکر لگائی اور دو تین ٹھوکروں کے بعد دروازہ
کھل گیا۔ رابرٹ نے اپنے محل کا رخ کیا۔ جب اس نے محل میں داخل ہونا چاہا تو دربان نے روکا اور پوچھا کہ
وہ کیا چاہتا ہے۔ بادشاہ نے غصے سے دربان کو بازو ہٹایا اور اندر داخل ہونا چاہا۔ دربان نے ساتھیوں
کو پکارا اور ان کی امداد سے بادشاہ کو گرفتار کر لیا۔ بادشاہ نے کہا" تم لوگوں کی جان کی خیر نہیں جانتے ہو



میں کون ہوں" دربان نے طنزاً کہا" جی کیوں نہیں
آپ پاگلوں کے بادشاہ اور احمقوں کے سردار ہیں۔
شہنشاہیت رگ رگ سے ٹپک کر اس کا اعلان
کر رہی ہے"۔ اتنے میں محافظ دستے کا سردار بھی
آگیا جو یہ گڑبڑ سنتے ہی وردی پہنتا ہوا آگیا۔
اس کے ہاتھ میں آئینہ تھا جس میں دیکھ کر وہ اپنی
ٹوپی درست کر رہا تھا بادشاہ نے سردار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا" کیپٹن فرانک ویلا کیا تم سب پاگل ہو گئے
ہو۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ باغی مجھ کو پہچانتے بھی نہیں۔ سامنے سے ہٹ جاؤ اور مجھے اپنے کمرے میں جانے دو"
یہ کہتے ہوئے بادشاہ اندر داخل ہونا چاہا۔ کیپٹن فرانک ویلا نے آگے بڑھ کر روکا اور اس کو پکڑ لیا۔
اس جدوجہد میں بادشاہ کی نظر آئینے میں پڑی۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ لباس کے
ساتھ ساتھ اس کی صورت بھی بدل گئی ہے۔ بادشاہ چلایا کہ" مجھ پر جادو کر دیا گیا ہے۔ میں بدل گیا ہوں"
یہ خبر کسی طرح بادشاہ تک پہنچی۔ بادشاہ نے رابرٹ کو طلب کیا بادشاہ کے حضور میں پہنچایا گیا بادشاہ اور درباری
رابرٹ کی مضحکہ خیز حالت دیکھ کر ہنسنے لگے۔ تخت پر رابرٹ کے ویسا ہی ایک دوسرا شخص بیٹھا تھا جو چہرے
سے رحمدل معلوم ہوتا تھا۔ رابرٹ نے بادشاہ پر حملہ کیا اور کہا کہ وہ دغاباز اور بدکردار ہے۔ رابرٹ کے اس جملے پر
تمام درباری ہنس پڑے۔ یہ نیا بادشاہ ایک فرشتہ تھا جو نہیں چاہتا تھا کہ اس کا فرشتہ پن کسی کو معلوم ہو۔

اس لئے وہ خاموش رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد رابرٹ سے کہا کہ چونکہ تم پاگل ہو اور خود کو بادشاہ سمجھتے ہو اور حقیقت میں تم بیوقوفوں کے بادشاہ ہو اس لئے تم کو ایک عصا اور تاج دیا جاتا ہے تم درباری مسخروں کے ساتھ رہنا (اگلے زمانے میں دستور تھا کہ ہر بادشاہ کے دربار میں مسخرے رہتے جو طرح طرح کی بذلہ سنجی سے بادشاہوں کو خوش کیا کرتے) اس کے بعد تاج اور عصا منگوا کر رابرٹ کی رسم تاجپوشی ادا کی گئی اس طرح رابرٹ کو رہتے ہوئے دو سال کا عرصہ گزر گیا اور رابرٹ برابر بادشاہ کا ساتھ دیتا رہا مگر ہر وقت غم و غصہ کی مورت اور درباریوں کے مذاق کا سامان بن کر۔

کچھ عرصہ تک بادشاہ رابرٹ سے پوچھتا رہا کہ کیا وہ بادشاہ ہے اور رابرٹ جواب دیتا کہ وہ بادشاہ ہے۔ اس جواب پر دربار میں قہقہہ بلند ہوتا جس کو رابرٹ برداشت نہ کر سکتا تھا اس لئے کچھ دن بعد وہ اس سوال پر خاموش رہنے لگا۔

اس عرصے میں ہر شخص بادشاہ سے خوش تھا۔ محاصل کم کر دیئے گئے تھے۔ محنت زیادہ نہ لی جاتی تھی۔ آدھا دن صنعت اور محنت مزدوری اور آدھا دن صحت کی حفاظت میں صرف کیا جاتا۔ بادشاہ جہاں کہیں جاتا اس کو دعائیں دی جاتیں جن کو سن کر رابرٹ ہکا بکا رہ جاتا۔

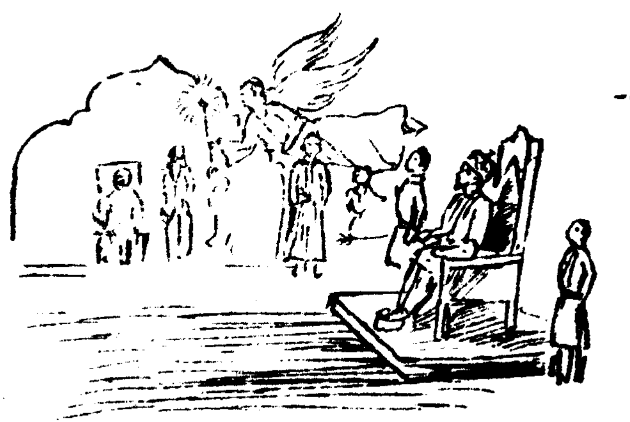
اس واقعہ کے دو سال بعد بادشاہ نے اعلان کیا کہ وہ اپنے بھائیوں سے ملنے کے لئے روم کو جائے گا۔ اس کے ساتھ تمام درباری زرق برق پوشاک پہنے ہوئے تھے اور رابرٹ ایک مضحکہ خیز لباس میں ملبوس تھا۔ اور اس کے ساتھ ایک بندر تھا۔ جب بادشاہ جانے لگا تو تمام لوگ کاروبار چھوڑ کر باہر نکل آئے تاکہ بادشاہ کو ایک نظر دیکھ لیں۔

جب رابرٹ اپنے بندر کو لئے ہوئے گزرنے لگا تو تمام لوگوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ اکثر لوگ متعجب تھے کہ ایسا رحم دل بادشاہ اس شخص (رابرٹ) پر کیوں خفا ہے؟

جب بادشاہ کے بھائیوں سے بادشاہ کی ملاقات ہوئی تو وہ اسی محبت سے ملے جو بھائیوں میں ہوتی ہے۔ رابرٹ کا خیال تھا کہ جب بادشاہ اس کے بھائیوں سے ملے گا تو یہ سحر ٹوٹ جائے گا اور اصل حقیقت واضح ہو جائے گی کیونکہ اس کا ایک بھائی بڑا پادری تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کے بھائی بھی بادشاہ

رابرٹ ہی سمجھتے ہیں تو پہلی دفعہ اس کے غرور کا زور ٹوٹا اور اس کے دل میں عجز و انکسار کا جذبہ پیدا ہوا۔

ٹھیک اسی وقت جب کہ دو سال قبل رابرٹ نے شام کی عبادت کے وقت پادری سے چند الفاظ کا مطلب پوچھا تھا اور یہ سن کر کہ ان کا مطلب "خدا طاقتور کو زوال اور عاجز کو عروج دیتا ہے" اس نے کہا تھا کہ اس کو کوئی قوت گرا نہیں سکتی۔ پھر وہی الفاظ سنائی دئے۔ اب رابرٹ سے برداشت نہ ہوسکا اور فوراً آبدیدہ ہوکر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر دعا کرنے لگا۔ اہل دربار اس کی اس حرکت سے متعجب تھے۔ جب دعا ختم ہوگئی تو بادشاہ نے رابرٹ کو آزاد کرنے کا قصد کیا۔ دربار برخاست کرکے بادشاہ نے رابرٹ کو طلب کیا۔ رابرٹ آیا۔ وہ مسخرے کے لباس میں ملبوس تھا۔ وہ بادشاہ سے دور کھڑا ہوگیا۔ اس کے ساتھ اس کا بندر بھی تھا جو اس سے ذرا دور بیٹھا تھا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ کیا وہ ابھی بادشاہ ہے۔ رابرٹ نے جواب دیا کہ اب وہ صرف ایک مسخرہ ہے۔ اب بادشاہ نے رابرٹ کا نام لے کر اس سے دریافت کیا کہ کیا وہ واقعی بیوقوف تھا۔ اپنا نام سن کر رابرٹ ہکا بکا ہوگیا بادشاہ نے اپنا ہاتھ رابرٹ کے سر پر پھیرا رابرٹ نے ایک بجلی کی لہر اپنے سارے بدن میں دوڑتی ہوئی محسوس کی اور اس کی صورت اپنی اصلی حالت پر آگئی تھی۔ رابرٹ نے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا۔ بادشاہ نے کہا کہ وہ کسی شکریہ کا مستحق نہیں ہے اور شکریہ کی مستحق تو "خداوند قدوس" کی ذات عالی صفات ہے یہ کہہ کر وہ بھی رابرٹ کے بازو دوزانو ہوکر بیٹھ گیا اور اس سے دعا کرنے کے لئے کہا۔



تھوڑی دیر تک دونوں دعا میں مصروف رہے۔

کچھ دیر بعد جب رابرٹ نے سر اٹھایا تو وہ تنہا تھا اور بادشاہ غائب۔ اب رابرٹ کو علم ہوا کہ بادشاہ جادوگر نہیں بلکہ فرشتہ تھا اور وہ بھی رحمت کا۔

اب رابرٹ پھر بادشاہ تھا۔ لیکن وہ اگلا سا بادشاہ نہیں۔ اس کا غرور کافور ہوچکا تھا۔ جلد بازی مٹ چکی تھی۔ بے رحمی رحم سے بدل چکی تھی اور

وہ ہر وقت اور ہر کام میں خداوند قدوس کی مدد کا ملتجی رہتا۔

عرصے تک حکومت کرنے کے بعد رابرٹ انتقال کر گیا۔ لیکن اپنی موت سے قبل اس نے اپنی یہ کہانی امراء اور درباریوں کو سنائی تاکہ اس کی یہ سرگزشت تاریخ میں محفوظ رہے اور آئندہ آنے والی نسلیں اس سے سبق حاصل کریں۔

شریف النسا بیگم

حکیم لقمان

حضرت لقمان داؤد علیہ السلام کے زمانے میں بڑے مشہور حکیم تھے۔ قدرتِ کاملہ نے انہیں انتہائی عقل و حکمت عطا کی تھی۔ وہ ہمیشہ عقل مندی کی باتیں لوگوں کو سکھاتے تھے۔ حضرت لقمان کی عمدہ نصیحتیں دنیا میں مشہور و معروف ہیں۔ مگر یہاں صرف وہی نصیحتیں لکھی جاتی ہیں جو انہوں نے اپنے فرزند کو کی ہیں۔

۱۔ لقمان نے ایک دفعہ اپنے فرزند کو یہ نصیحت کی کہ اے میرے پیارے لڑکے! خدا کا شریک ہرگز کسی کو نہ بنانا۔ شرک بڑی بے انصافی ہے اور یقین کر کہ تمام پوشیدہ چیزوں کو وہ جانتا ہے۔ اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر بھی کہیں پتھر یا آسمان یا زمین میں چھپی ہوئی ہو خدا اس کو حاضر کر سکتا ہے۔

۲۔ اے فرزند! ہمیشہ لوگوں کو نیک باتیں سکھا اور برائی سے منع کیا کر اور مصیبت کے وقت صبر اختیار کر۔ بس یہی کام ہمت کے ہیں۔

۳۔ اے فرزند! دنیا غرور اور گھمنڈ کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ چلتے وقت ہمیشہ متوسط چال چلا کر اور بات آہستہ کیا کر۔ کیونکہ بڑی سے بڑی آواز گدھوں کی ہے۔

۴۔ اے فرزند! تو یہ کرنا چاہتا ہے تو گناہ اور ظلم سے توبہ کر اور سننا چاہتا ہے تو خدا کی تعریف اور مظلوموں کی پکار کو سن۔

۵۔ اے فرزند! علم ایک ایسا ہتھیار ہے کہ جدھر جاؤ فتح ہو سکتی ہے اور اس کے ذریعے وہ تونگری حاصل کر جس کو فنا نہیں اور وہ زندگی تلاش کر جس میں تغیر نہیں۔

پیارے بچو! عقلمند آدمی دنیا سے جاتا ہے مگر اس کی عمدہ باتیں یادگار رہ جاتی ہیں۔ سچ ہے کہ والدین کو فرزند کے لائق ہونے سے بڑھ کر کوئی خوشی نہیں ہو سکتی۔ خوش قسمت ہیں وہ والدین جنہوں نے اپنی اولاد کی اچھی تربیت کی اور مبارک ہے وہ اولاد جنہوں نے اپنے والدین کی زندگی میں کمال حاصل کیا۔ **سید مراد علی طالع**

سعدیؒ کی نصیحت

حضرت سعدیؒ یہ نصیحت فرماتے ہیں کہ غرور کبھی نہ کرنا چاہئے۔ عقلمند لوگ کبھی تکبر نہیں کرتے کیونکہ یہ بہت بری چیز ہے اور جاہلوں کا شیوہ ہے۔ خدا کی نیک مخلوق کبھی تکبر کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔ یہ ایک ایسا فعل ہے جس سے انسان ذلیل اور بدنام ہو جاتا ہے۔ تکبر اور گھمنڈ کرنے والا انسان کبھی ترقی کے زینے طے نہیں کرسکتا بلکہ اس کو ذلت اٹھانی پڑتی ہے۔

ہمیں تکبر کی کئی مثالیں ملیں گی جس کے باعث کئی لوگ ذلیل و خوار ثابت ہوئے۔ شیطان ہی کی مثال پیش نظر رکھئے کہ اس نے تکبر ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف گیا اور اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے سے دور کردیا۔ وہ ہمیشہ کے لئے خدا کی رحمت اور مہربانی سے محروم کر دیا گیا۔ ہمیشہ لوگ اس پر لعنت بھیجتے رہیں گے۔

انسان کو بہکانے والا اور اس میں برے خیالات، اور عادتیں شیطان ہی پیدا کرتا ہے اسی وجہ انسان ہر جگہ ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ ان ہی بری خصلتوں میں ایک خصلت "تکبر" بھی ہے۔ تکبر سے انسان اپنے آپ کو بڑا اور اعلیٰ مرتبہ والا سمجھتا ہے اور اپنے جیسے دوسرے بندوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ جو اس کی بدقسمتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک امیر، غریب، بادشاہ اور فقیر میں کوئی فرق و امتیاز نہیں اور اگر کوئی امیر کوئی غریب سے اپنے آپ کو ممتاز سمجھے تو وہ متکبر سمجھا جائے گا۔ البتہ اگر ان میں امتیاز ہوسکتا ہے تو صرف علم سے ہوسکتا ہے اور یہی شیخ سعدیؒ بھی فرماتے ہیں۔

چونکہ علم تکبر کو دور کرنے کا ایک ذریعہ ہے اس لئے حضرت سعدیؒ نے علم کی اہمیت اور ضرورت کے متعلق بھی یہ نصیحت فرمائی ہے کہ تحصیل علم کے لئے ہر وقت جدوجہد کیا کرو حتیٰ کہ اس قدر محنت اٹھاؤ کہ جسم پر گوشت پوست کا نام و نشان تک باقی نہ رہے کیونکہ علم ہی کو ہر شئے پر خدا اور رسولؐ نے ترجیح دی اور یہ خدا تک پہونچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ علم کا حاصل کرنا ہمارے مذہب میں ضروری قرار دیا گیا ہے اور اگر

کوئی استعداد رکھتا ہے تو اس کو دن رات تحصیل علم کی دھن ہونی چاہئے۔ ایک حدیث سے بھی اس مسئلہ پر اور زور دیا گیا ہے کہ علم اگر تمہارے شہر میں نہ بھی ہو تو تم کو سمندر پار جانے میں بھی تامل نہ کرنا چاہیے گو کہ علم کا بازار ہمیشہ اور ہر جگہ گرم رہتا ہے اور آخرت تک رہے گا۔ علم کوئی ایسی شئے نہیں کہ جس کی آگ بجھادی جائے کیونکہ ایسا کوئی وقت نہیں آئے گا جس میں علم کی کوئی نہ کوئی قدر نہ کرے۔ علم کی کوئی آخری منزل نہیں۔ جتنا علم حاصل کیا جائے گا اس کا نتیجہ بہشت ہوگا۔ اس لئے عقلمند ہر وقت ان برائیوں سے دور رہنے کے لئے جہاں تک ممکن ہو علم کی تحصیل میں سرگرم رہتا ہے۔ ہر عقلمند کو یہی چاہئے کہ وہ علم کے زیر سایہ پرورش پائے اور صحیح علم حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھے۔ علم کے حاصل کرنے میں غفلت نہ برتے۔ بغیر حصول علم کے انسان اپنی دنیا اور عاقبت درست نہیں کرسکتا۔ بے علمی سے ملک وملت کا تو کجا اپنے گھر کا بھی انتظام درست نہ رہ سکے گا۔

علم کی فضیلت کا ثبوت ہمیں اس سے بہ آسانی مل سکتا ہے کہ اگر آپ ایک جاہل کو جاہل کہیں تو وہ خفا ہو جائے گا۔ حالانکہ اس کی اصلیت کہی جارہی ہے اور اگر اس کو عالم کہا جائے تو وہ خوش ہو جائے گا۔ غرض کہ انسان علم ہی کی بدولت عقلمند اور عالم کہلا سکتا ہے اور ایک عالم ہی جاہل کی نسبت برائیوں سے زیادہ پرہیز کرسکتا ہے۔

میر مظفر علی خاں

حیدرآباد۔ اس کتاب میں عوام اور بچوں کے لئے شہر اور ریاست حیدرآباد کے ضروری حالات سادہ اور سلیس زبان میں درج کئے گئے ہیں۔ اس کے کئی ابواب ہیں جن میں آب وہوا، پہاڑ، دریا پیداوار، تاریخ، طرز معاشرت، صنعتیں، زبانیں، طرز حکومت، آثار قدیمہ اور ذرائع حمل ونقل کو خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی مرتبہ رفیعہ سلطانہ صاحبہ بی اے جامعہ عثمانیہ ہیں جن کو انشا پردازی کا خاص ذوق ہے قیمت ۱۰/



سکہ



دنیا روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو آج سے دو ہزار برس قبل نہ تھیں۔ دنیا میں آئے دن ایک نہ ایک ایجاد ہوتی رہتی ہے۔ آج کل ہم لوگ جو زندگی بسر کر رہے ہیں اور جس کو سمجھتے ہیں کہ نہایت متمدن اور تہذیب یافتہ ہے۔ لیکن وہ زمانہ کچھ دور نہیں جب کہ آئندہ تہذیب اور تمدن ہمارے زمانے کو وحشت اور جہالت کا زمانہ خیال کرے گی۔

سکہ جو ہماری زندگی کا لازمی جزہے اور ہماری تاریخ میں اپنے رواج کی خاص اہمیت رکھتا ہے آج سے ۵ ہزار برس قبل جب کہ تہذیب اور تمدن کے علم بردار چینی تھے سکہ کا وجود تھا۔ اس وقت تک دنیا کی تمام تہذیب یافتہ اقوام ایک چیز کے بدلہ میں دوسری چیز لیتی اور دیتی تھیں مثلاً ہمارے پاس غلہ ہے اور آپ کے پاس کپڑا، ہم کو کپڑے کی ضرورت ہے اور آپ کو غلہ کی اس وقت کے تمدن کے لحاظ سے میں آپ کو غلہ دوں گا اور آپ مجھے کپڑا۔ جب اس سے زیادہ ترقی ہوئی تو چند چیزیں مخصوص کرلی گئیں۔ مثلاً سونا، چاندی، تانبا اور یہ بھی قرار دیا گیا تھا کہ تانبے کا اتنا ٹکڑا دو سیر گیہوں اور چار سیر جو کے برابر ہے۔

سکہ کی ایجاد کا سہرا چینیوں کے سر ہے۔ دنیا میں سب سے پہلے چین میں ٹکسال قائم ہوئی کہا جاتا ہے کہ چینیوں نے چمڑا بھی بطور سکہ استعمال کیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ چک اور بنک اہلِ چین کی اختراع ہے۔ چین میں سب سے پہلے بنک قائم ہوا اور نوٹ کا بھی رواج ہوا۔ چین کے بعد جاپان میں سکوں اور نوٹوں کا رواج ہوا۔

مصر میں باوجود اس قدر تہذیب اور تمدن کے سکوں کا رواج بہت دنوں بعد ہوا۔ غالباً مصر میں ۵۵۰ ق م میں سکوں کا رواج ہوا اور [illegible] ق م کے سکے اہلِ بابل کے پائے گئے۔

۳۵۰ ق م میں یونان میں سکوں اور بنکوں کا رواج جاری تھا۔ ۲۷۰ ق م روم کے باشندوں نے سب سے پہلے چاندی کا سکہ جاری کیا۔ اور اس کے کوئی نصف صدی بعد سونے کا سکہ نافذ ہوا عرب میں

زمانہ جاہلیت اور اسلام میں کوئی خاص سکہ نہ تھا۔ رومی اور ایرانی سکوں سے یہاں لین دین ہوتا [illegible]
مسلمانوں میں سب سے پہلے [illegible]ھ میں عبدالملک بن مروان نے حجاج ابن یوسف کو سکہ کی جاری [illegible] حکم دیا۔ [illegible]ھ میں چاندی کا سکہ (درہم) عراق میں جاری ہوا۔ [illegible]ھ میں مختلف مقامات پر سکے تیار ہونے لگے اس زمانے کا درہم خالص چاندی کا تھا۔ ایک طرف اللہ احد اللہ الصمد اور دوسری طرف سنہ ضرب اور ٹکسال کا نام ہوتا تھا۔ [illegible]ھ میں عبدالملک نے دینار یعنی سونے کا سکہ جاری کیا۔

بنی اُمیہ کے عہد خلافت میں کوفہ، بصرہ، دمشق، کرمان آرمینیہ، آفریقہ، اندلس اور بخارا میں ٹکسالیں تھیں ان ٹکسالوں میں جو سکے بنتے تھے ان میں سنہ ضرب اور دارالضرب ہوتا تھا۔ بعض میں قرآن کی مختصر آیتیں ہوتی تھیں اور بعض میں صرف بسم اللہ لکھا ہوتا تھا۔ سب سے پہلے مسلمان حکمرانوں میں سے مہدی نے اپنا نام کندہ کروایا۔ یہ سکہ ۱۴۶ھ ہجری کا تھا۔

دنیا میں زیادہ تر چاندی اور تانبے کے سکے رائج ہوئے لیکن انگلستان اور جاپان میں قدیم زمانے میں لوہے کے سکے استعمال ہوتے تھے۔ نکل کے سکے سب سے پہلے بلجیم میں تیار ہوئے۔ پھر جرمنی اور امریکہ میں ڈھلے۔ شاہ جہاں کے زمانے کی اشرفی بہت مشہور ہے جس کا وزن ½ ۲ سیر اور موٹائی ½ انچ ہوتی تھی۔ اس میں خالص سونا استعمال ہوتا تھا۔ جب کبھی بادشاہ لڑائی سے واپس ہوتا اور سالگرہ کے دن یا جب کبھی بادشاہ خوش ہوتا تو سپہ سالاروں اور امراء کو عنایت کرتا تھا۔ یہ اشرفی میں نے نمائش ثقافتِ اسلامیہ میں جو سالار جنگ بہادر کی ڈیوڑھی میں ہوئی تھی دیکھی ہے۔

سید شاہ مصباح الدین حسین

کشمش نانی ۔ یہ کتاب بھی ادارہ کے شعبۂ اطفال کی طرف سے بچوں کے لئے بطور خاص شائع کرائی گئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف مولوی شجاع احمد صاحب قائد نے اس کتاب میں پرانی طرز کی کہانیوں کو نئے انداز میں لکھا ہے جو دلچسپ بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔ اس میں کئی دیدہ زیب تصویریں بھی ہیں جن سے کتاب کی زینت بڑھ گئی ہے صفحات ۸۸ قیمت ۱۰/

بے گناہ جمیلہ

گزشتہ زمانے میں ایک بادشاہ قطب شمالی کے کسی حصہ پر حکمران تھا۔ جہاں کی زمین ہمیشہ برف کی سفید چادر اوڑھی ہوئی رہتی ہے۔ اس بادشاہ کو ایک بیٹی تھی جس کا نام "جمیلہ" تھا یہ بہت خوبصورت تھی اور ماں باپ کی بڑی چہیتی تھی۔ لیکن چند ہی روز بعد اس کی ماں مرگئی۔ بادشاہ اپنی بیوی کے انتقال پر بہت دنوں تک رنجیدہ رہا۔ آخرکار اس سے لڑکی کی حالت دیکھی نہ گئی اس لئے اس کو دوسری شادی مجبوراً کرنا پڑا۔

دوسری رانی بھی خوبصورت تھی اپنے حسنِ وجمال کا ثانی نہ رکھتی تھی اس کے پاس ایک آئینہ تھا جس کے ذریعہ دنیا کے تمام حالات معلوم کرسکتی تھی۔ اس آئینہ کو اس نے ایک جادوگر سے حاصل کیا تھا۔ چند سال بعد جب جمیلہ سمجھ دار ہوگئی اور اس کا حسن ہر دیکھنے والے کو خوش کرنے لگا تو ایک روز رانی صبح خوابِ راحت سے بیدار ہوئی اور آئینہ سے دریافت کیا کہ دنیا میں سب سے زیادہ کون خوبصورت ہے۔ تو معلوم ہوا کہ دنیا میں جمیلہ اپنے حسن وجمال کا ثانی نہیں رکھتی ہے۔ بس یہ معلوم ہوتے ہی اس کے سینے میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور جمیلہ کے قتل کے درپے ہوئی۔

بادشاہ اس کیفیت سے آگاہ نہ تھا۔ ایک روز جب کہ بادشاہ شکار کو گیا تھا رانی نے جمیلہ کو چند ملازمین کے ذریعے ایک خوفناک جنگل میں بھجوادیا۔ شام کے وقت جنگل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی اور جمیلہ کا قدم خوف سے آگے نہ بڑھتا تھا۔ اتفاق سے اس کو ایک جھونپڑی نظر آئی۔ جھونپڑی کے قریب جاکر اس نے آواز دی۔ لیکن جب جواب نہ ملا تو اندر داخل ہوئی۔ اس جھونپڑی کے اندر سات چھوٹے پلنگ تھے اور ایک چھوٹی میز پر سات روٹیاں اور سات پانی سے بھرے ہوئے کوزے رکھے تھے۔ جمیلہ کچھ کھانے کے بعد تھکان کی وجہ ایک پلنگ پر سوگئی۔ یہ جھونپڑی سات چھوٹے آدمیوں کی تھی، جن کی صورت کچھ عجیب وغریب تھی یعنی ان کا قد تقریباً چار فٹ اور ڈاڑھی تین فٹ تھی۔ جب ان ساتوں نے اپنی جھونپڑی میں جمیلہ کو سوتے دیکھا تو بہت پریشان ہوئے۔ آخرکار وہ اس کے قریب آئے دیکھتے ہی حسن وجمال کی تاب نہ لاسکے۔ بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا "کس قدر حسین ہے" اس آواز سے جمیلہ بیدار ہوئی اور ان لوگوں کو دیکھ کر بہت پریشان ہوئی۔ لیکن ان لوگوں نے اس کی زبانی

اس کے حالات سننے تو بہت تسلی دی اور اس کو یہیں رہنے کے لئے مجبور کیا۔

اب جمیلہ وہاں بے خوف و خطر اپنی زندگی بسر کر رہی تھی ادھر حاسد رانی کو یہ بھی گوارا نہ ہوا کیونکہ وہ آئینہ کے ذریعہ سب کچھ معلوم کر سکتی تھی۔ ایک دن رانی مالن کے بھیس میں اس جھونپڑی پر پہنچی جب کہ وہ ساتوں آدمی نہ تھے ایک سیب جمیلہ کو کھانے کے لئے دیا جس میں کچھ زہر بھر دیا گیا تھا۔ جمیلہ اس کو کھاتے ہی زمین پر گری اور بے ہوش ہوگئی۔ رانی یہ دیکھ کر چلتی بنی جب وہ ساتوں آدمی آئے جمیلہ کو اس حالت میں دیکھ کر بہت پریشان ہوگئے اور سمجھے کہ وہ مرگئی۔ اس لئے اس کو ایک کانچ کے صندوق میں رکھ کر ایک پہاڑی پر رکھ آئے جہاں سے ایک راستہ جاتا تھا۔

اتفاق سے ادھر ایک شہزادہ شکار کھیلتے کھیلتے آنکلا۔ اس لڑکی کو صندوق میں مردہ سمجھ کر بہت افسوس کیا۔ اپنے دل میں کہا "کاش یہ زندہ ہوتی تو میں اس کے ساتھ شادی کرتا۔ اب اس نے اپنے ملازمین کو حکم دیا کہ اس لاش کو ساتھ لے چلیں کیونکہ وہ اس لاش کو باغ میں دفن کروانا چاہتا تھا۔

جب ملازمین نے اس صندوق کو اٹھا لیا تو ان میں سے ایک کا پیر برف کی وجہ سے پھسل گیا اور صندوق زمین پر گر پڑا۔ جوں ہی صندوق گرا جمیلہ کے منہ میں سے وہ زہریلا ٹکڑا گر پڑا جو اس کے بدن میں اثر کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جمیلہ کو ہوش آیا۔ اب شہزادے کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی فوراً اپنے مکان لایا اور اس کی تیمارداری کی اور کامل شفا ہونے کے بعد اس سے شادی کرلی۔

ادھر اس حاسد رانی نے جب یہ دیکھا کہ جمیلہ ایک رانی ہوگئی ہے تو چونکہ اب وہ اس کا کچھ بگاڑ نہ سکتی تھی، اس کے سینے میں حسد کی آگ اتنی بھڑکی کہ وہ تاب نہ لاسکی اور یکایک مرگئی۔

محمد عبدالحمید شاد

اشوک اعظم۔ یہ کتاب مجلس ادبیات اطفال کی طرف سے طلبہ اور عوام کے لئے سلیس اور سادہ زبان میں لکھائی گئی ہے۔ محترمہ سیدہ مہدی جعفری صاحبہ بی اے عثمانیہ نے ہندوستان کے اس مشہور فرماں روا کے حالاتِ زندگی اور کارنامے دلچسپ پیرائے میں قلمبند کئے ہیں۔ کتاب باتصویر ہے۔ قیمت ۸ر

سب رس کتاب گھر سے منگوائیے

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت		
من کی بیتا ...	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب ...	۹۴	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴	۰
سر سید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲	۰
سر سالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر ...	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادابھائی ...	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ ...	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک ...	۴۰	۰	۲	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۵	۰
" " دوسری کتاب	۵۶	۰	۵	۰
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر ...	۹۲	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	۰
ہندستانی تمدن ...	۳۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی ...	۸۰	۰	۱۰	۰
مہ لقا ...	۱۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	۶	۰
رسایل طبیہ ...	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن ...	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹	۱	۰	۰
شاد اقبال ...	۱۷۶	۲	۸	۰
آریائی زبانیں ...	۱۰۴	۱	۰	۰
نظام علی خاں ...	۳۲	۰	۴	۰
تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰	۰
عرب اور عربستان ...	۵۶	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	قیمت		
سحر کا جادو ..	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
طبیعیاتی کائنات ...	۹۸	[illegible]	[illegible]	[illegible]
مقام سخن ...	۱۲۴	[illegible]	[illegible]	[illegible]
کیف سخن ...	۱۲۴	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible] سخن ...	۲۲۷	۰	۱۲	۰
معراج سخن ...	۱۵۲	۰	۱۲	۰
بیان سخن ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
نبض سخن ...	۱۴۴	۰	۱۲	۰
رقم سخن جلد اول (۵۵ تصاویر)	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰)	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰	۰
[illegible] ...	۲۳۸	۲	۸	۰
[illegible] ...	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا ...	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
مصور نامہ ...	۱۱۲	۲	۰	۰
[illegible] دکن ...	۱۵۴	۱	۴	۰
روح غالب ...	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصم ...	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات ...	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی ...	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
[illegible] ...	۳۲	۰	۳	۰
[illegible] ...	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری ...	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار ...	۹۸	۱	۸	۰
کشش ثانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
[illegible] ...	۱۲۸	۱	۴	۰
[illegible] کا بھولا ...	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ ...	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت ...	۵۹	۰	۸	۰
ادارہ سنہ ۱۹۴۲ء میں	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ ...	۳۲	۰	۴	۰
افضل الدولہ ...	۳۲	۰	۴	۰
نواب میر محبوب علی خاں	۳۴	۰	۴	۰

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
ہندراج سکسینہ ایم ایس سی

سب رس

۱۳۰۹
... آنے
... ایک روپیہ ... آنے

جلد ۷ | بابت ماہ نومبر ۱۹۴۳ء | شمارہ ۱۱

فریحہ[1] کے نام

اے نازشِ خاندانِ فریحہ — اے نور و سرور و شادمانی
اے غنچۂ نورِ مس و دل آویز — جو تیرا پیار جاودانی
کھیلے ترے رُخ و جبیں پر — ایمان و یقین کی ضو فشانی
ہو تیرے لئے بام و دراں — فردوسِ نشاط و کامرانی

دے تجھ کو فطرت امینِ اسرار
صورت گرِ جلوۂ معانی

جو تجھ کو سنا رہی ہے دنیا — میں نے بھی سنا ہے یہ فسانہ
طفلی کے وہ پُرسکون دن رات — وہ نور و نشاط کا زمانہ
آتا تھا مجھے بھی شکلِ انجم — دنیا کے دھوئیں میں جگمگانا
فطرت نے مجھے عطا کیا تھا — پھولوں کی طرح سے مسکرانا
ہر سانس لٹا رہا تھا میں بھی — اک نور و سرور کا خزانا
ہنستی ہوئی عطر بیز راتیں — وہ چاند کا لوریاں سنانا
گاتی ہوئی دل نواز صبحیں — خورشید کا آ کے وہ جگانا

اب میں ہوں اور اک بجھا ہوا دل
اللہ رے گردشِ زمانہ

بیٹی یہ تجلیاں رہیں نہ ہوں گی — کچھ اور ہے رسم و راہِ دوراں
عشرت کے یہ دلپذیر اجزا — ہو جائیں گے خود بخود پریشاں
ہستی کا نہیں مقام کوئی — اک موج ہے مضطرب و گریزاں
اک اور زمانہ آ رہا ہے — ہیں جس میں کشاکشیں نمایاں

تجھ کو بھی اسی سے ہے گزرنا — طفلی ہے تری [illegible]
گہوارہ ہے عزیب عصرِ حاضر — ہے اس کی کشش [illegible]
عشرت سے ہے زندگی کا پہلو — بیگانۂ سوز و سازِ پنہاں
مردوں کا ضمیر تنگ و تاریک — بے نور و ضیا حیات خوباں
اک خوابِ طویل علم و دانش — اک جہل بسیطِ عقل و عرفاں
وہ فکر ہے نگر حقیقت آگاہ — تو ہے جس فکر کی شمعِ رخشاں

فطرت میں ہو گر یقینِ محکم
ہوتی ہے رہِ حیات آساں

تو راہ سے آشنا نہیں گر — کام آ نہ سکے گی تیز گامی
طوفان کا راز اور کیا ہے — موجوں کی یہی سبک خرامی
انکار ہے موت زندگی کا — ایماں کا صلہ بلند نامی
ہے مادرِ کائنات عورت — اک ہستی سرمد و گرامی
یہ راز کہیں نہ بھول جانا — رہ جائے گی زندگی میں خامی
آزادی سیر اس چمن میں — ہے قلب و نگاہ کی غلامی
عرفانِ حیات اور کچھ ہے — کہتی ہے خرد کی ناتمامی
دل چاہیے بیش و کم سے آزاد — ہے رازِ سرورِ تشنہ کامی
اس بزم میں ہے [illegible] — اندیشۂ خوب و خوش کلامی

ہو جنس کو تیری رشک جس پر
تو پائے وہ ہستی گرامی

علی اختر

---

[1] میر حسن صاحب کی چہار سالہ دختر کا نام

ضروری اطلاع — جو مضامین نظم و نثر سب رس میں اشاعت کے لئے وصول ہوتے ہیں۔ انھیں مجلس ادارت میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ [illegible] مضامین کو سلسلہ وار شایع کیا جاتا ہے۔ ناقابلِ اشاعت مضامین واپس نہیں کئے جاتے۔ مضمون نگار اصحاب ان کی اپنے پاس نقلیں رکھیں۔

جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا [illegible] ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے۔

شمس الامراء کے سائنسی کارنامے

شمس الامراء کے کارناموں پر روشنی ڈالنے سے پہلے [illegible] کہ خاندان پائیگاہ آصف جاہی امراء میں [illegible] ممتاز رہا ہے۔ جاگیرات و مناصب کے علاوہ شاہی خاندان کی لڑکیاں اس خاندان کے امراء سے بیاہی گئیں۔ [illegible] افراد سپہ سالاری کے علاوہ وزارت کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے اور خطابات و دیگر مراسم شاہی سے سرفراز ہوئے۔ چنانچہ اس خاندان کے کئی امراء کو شمس الامراء کا خطاب ملا۔ امیر کبیر نواب محمد فخر الدین خاں شمس الامراء ثانی ۱۱۹۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۹ھ میں انتقال کیا۔ یہ سب سے پہلا امیر پائیگاہ ہیں جن کی علم دوستی، علم پروری اور ادب نوازی آج تک مشہور ہے۔ وہ اپنے ذوقِ علم و فضل میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے اطراف علماء کا ایک گروہ جمع کر لیا تھا جو تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے۔ اس عہد کے ایک مشہور مصنف خواجہ غلام حسین خاں المخاطب بہ خان زماں خاں نے اپنی تاریخ گلزارِ آصفیہ میں ان کے علم و فضل اور علمی دلچسپیوں کے متعلق لکھا ہے۔

"آں فرخیل امرائے نامدار امیر ریاست صاحبِ شان و شوکت و شکوہ .... صاحب تصانیف علوم حکمت علی الخصوص در علم ریاضی کہ عبارت از ہندسہ و ہیئت باشد و نیز در علم جر ثقیل رسالہ ہائے مرتب تصنیف فرمودہ شمسیہ کہ مشہور آفاق اند۔ در نفس الامر علم ریاضی را آں قدر سہل و آساں تر نمودہ کہ مبتدی و مدرک توجہ بطرف تحصیل مقاصد و مطالب بلند آں بدل پسند [illegible] اگر در علم سیا [illegible] ہندسہ [illegible] و ادا [illegible] تحریر علم فرزانہ و دیدۂ علم حساب [illegible] تصنیف [illegible] کہ [illegible] علم طبیعی [illegible] مرتب [illegible] و اداکہ [illegible] فہم آید [illegible] ہا و عالمین ما [illegible] ہی و بیدہ [illegible] جہان بہشتانے بے پایاں [illegible] کہ کشادہ"[1]

یہ شمس الامراء ہیں جنھوں نے حکمت، ہندسہ، ریاضی وغیرہ میں سب سے پہلے دفعہ اردو میں کتابیں لکھوائیں اور خود تصنیف کیں۔ چونکہ نواب موصوف کو علوم ریاضی و ہیئت سے خاص شغف تھا اس لئے زیادہ تر ان ہی علوم سے متعلق کتابیں فرانسیسی اور انگریزی زبانوں سے ترجمے کرا کے اپنے سنگی چھاپخانہ میں چھپوائیں۔ یہی نہیں بلکہ ذاتی تحقیق اور کاوش کے لئے انھوں نے ایک رصدگاہ جہاں نما تعمیر کرائی تھی۔

اس مقالہ کی تیاری کے سلسلے میں ہمیں حسب ذیل کتابوں کا پتہ چلا جو ان کی زیر سرپرستی لکھائی گئیں۔

(۱) ترجمہ شرح چغمینی قلمی کتابت قریب ۱۲۴۸ھ
(۲) اصول علم حساب مطبوعہ ۱۲۵۲ھ
(۳) رسالہ مختصر جر ثقیل۔
(۴) رسالہ کسورات اعشاریہ مطبوعہ ۱۲۴۸ھ
(۵) علم جر ثقیل (ستہ شمسیہ جلد اول) مطبوعہ ۱۲۵۶ھ
(۶) علم ہیئت (" دوم) " "
(۷) علم آب (" سوم) " "
(۸) علم ہوا (" چہارم) " "
(۹) علم مناظر (" پنجم) " "
(۱۰) علم برق (" ششم) " "

---

[1] گلزار آصفیہ صفحہ (۲۰۸)

(۱۱) رسالہ علم و اعمال کرے کے بیان میں مطبوعہ [illegible]

(۱۲) منتخب البصر (قدوہ نما) [illegible]

(۱۳) کمسٹری کا مختصر رسالہ ” [illegible]ھ

(۱۴) رسالہ مفتاح الافلاک ” ۱۲۶۰ھ

(۱۵) رسالہ کیمسٹری ” ۱۲۶۱ھ

(۱۶) خلاصۃ الادویہ ” ۱۲۶۲ھ

(۱۷) نافع الامراض ” ۱۲۶۲ھ

(۱۸) ترکیب ادویہ ” ۱۲۶۲ھ

(۱۹) رسالہ حیوانات مطلق ” ۱۲۶۴ھ

(۲۰) مرقع تصویرات حیوانات ” ۱۲۶۶ھ

نواب فخر الدین خاں نے خود بھی کئی کتابیں لکھیں مگر ان کی اردو کتابوں کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ان ہی کی ہیں۔ اس لئے کہ دیباچہ میں بجائے اپنے نام کے صرف یہ لکھدیا ہے کہ "مصنف اس کتاب کا یہ کہتا ہے" البتہ فارسی کتابوں میں اپنے نام کی صراحت کردی ہے۔ مثلاً کتاب "شمس الہندسہ" مطبوعہ ۱۲۴۱ھ کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"می گوید مولف این رسالہ محمد فخر الدین خان المخاطب شمس الامراء .... "کہ کتاب اقلیدس" اگرچہ حاوی جمیع اصول ہندسیہ است از قت براہین وتطویل دلائیش مبتدی را بہرہ وافی .... نمی داد .... نسخہ عجب از تالیفات موسی کالر کہ در زبان فرانسیسی .... بود .... دیدم کہ در آں کتاب اعمال اصول اشکال .... قریب الفہم کہ از آں کارہائے اعمال بہ آسانی می برآیند مرقوم بودند لہٰذا .... آں کتاب را از زبان فرانسیسی بہ زبان فارسی مرقوم نمودہ شد تا در رہ ندگان موجب

یادگار [illegible]

.... مذکورہ بالا عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ نواب صاحب مرحوم بھی مصنف تھے اور فرانسیسی زبان پر کافی عبور رکھتا۔ فارسی میں ایک سے زیادہ کتابیں لکھیں اور ضرور ہے کہ یہ اردو کتابیں بھی ان ہی کی تصنیفات ہوں۔

ان کے فرزند محمد رفیع الدین خاں عمدۃ الملک شمس الامراء ثالث ۱۲۲۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۹۳ھ میں انتقال کیا۔ ذوقِ علم وفضل اور شوقِ تصنیف وتالیف اپنے والد سے ورثہ میں ملا تھا۔ چنانچہ مطبع شمس الامراء میں جو کتابیں چھپیں وہ زیادہ تر ان ہی کی فرمائش اور دلچسپی کی وجہ سے لکھی گئی تھیں۔ بعض کتابوں میں صراحت کردی گئی ہے کہ صاحبزادہ نواب محمد رفیع الدین خاں عمدۃ الملک بہادر کی فرمائش پر لکھی گئیں۔

شمس الامراء ثانی نے اپنی فارسی کتاب "شمس الہندسہ" میں اپنے فرزند کی نکالی ہوئی شکلوں کو بھی جگہ دی اور اس کے دیباچہ میں اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

"چند اشکال مستخرجہ برخوردار محمد رفیع الدین خاں در آخر مقالہائے متعلقہ آنہا بہ تفصیل مرقوم ساختہ۔"

انھوں نے زیادہ تر علم ہندسہ اور علم حساب پر اردو میں کتابیں لکھیں جن کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہوگئے۔ اردو زبان میں اول اول سائنسی موضوعوں پر تصنیف وتالیف کرنے اور دوسروں سے لکھوانے کی وجہ سے عہد حاضر میں نواب رفیع الدین خاں کی شخصیت کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ انھوں نے علوم وفنون کو اردو میں منتقل کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ان کی چند کتابوں کے نام جو ابھی معلوم ہوسکے یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) رسالہ علم ہندسہ مطبوعہ ۱۲۵۱ھ (۲) رفیع الحساب مطبوعہ ۱۲۵[illegible]

(۳) تکملہ رفیع الحساب مطبوعہ ۱۲۵[illegible] (۴) رفیع البصر [illegible]

[illegible] مصنفہ ۱۲۲۲ (۹۹) منتخب الترکیب مطبوعہ [illegible]
[illegible] مطبوعہ [illegible]۔

ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ ان کی کئی قلمی کتابیں بھی
[illegible] کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں جو اب تک زیور طبع سے
آراستہ نہیں ہوئیں۔

شمس الامراء کے تیسرے فرزند نواب محمد بدر الدین خاں
بہادر معظم الملک تیز نے جو عنفوان شباب ہی میں انتقال کر گئے
ان کے متعلق کتب خانہ آصفیہ کا مصنف لکھتا ہے:

"اگر فضائل علمی از حکمت و ریاضی وغیرہ بہ ارقام آرد
دفتر بے پایاں باید"

انھیں شعر و شاعری کا بھی بہت اچھا ذوق تھا۔ اپنی یادگار
میں ایک دیوان چھوڑا ہے۔ باوجود کاوش کے آپ کی کسی حکمیاتی کتاب
کا پتہ نہ چل سکا۔ البتہ ایک قلمی اردو نسخہ "انوار بدریہ" دستیاب ہوا جو
نواب بدر الدین خاں کی فرمائش پر کسی کتاب سے ترجمہ کیا گیا
تھا۔ شاید ان کی جواں مرگی کی وجہ سے یہ رسالہ چھپ نہ سکا۔
اس میں اقلیدس کی نسبتوں کے متعلق کافی معلومات درج ہیں۔
یہ رسالہ شاہ علی ساکن قلعہ ادھونی کا تصنیف کردہ ہے
جو ۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے ختم پر سنہ کتابت درج ہے۔

"اختتام تحریر فی التاریخ بست و چہارم رمضان المبارک
سنہ ۱۲۵۱ھ"

کتاب کا آغاز مصنف کے حسب ذیل دیباچے سے ہوتا ہے۔

"حسب فرمائش بدر الدین خاں بہادر
جاننا چاہیے کہ وے نسبتیں جو اقلیدس میں مذکور
ہیں اگرچہ کثرت فوائد میں بہبود کل عروس ہیں لیکن
معانی میں باوجود ترکیت ایسے قلیل الاستعمال کہ ان کا
سمجھنا مبتدیوں کو نہایت دشوار بلکہ منتہیوں کو
بھی اس لیے ان کو اس فدوی بہ مقدار شاہ علی
ساکن قلعہ ادھونی نے زبان ہندی میں بعبارت
سلیس حسا شاء غددی ترجمہ کیا تا فوائد سے ان کے
خاص و عام متمتع ہوں اور موسوم بانوار بدریہ کر کے
بطریق تحفہ خدمت بابرکت میں نواب معلی القاب
ثریا رفعت و گردوں قباب معظم الملک معظم الدولہ
محمد بدر الدین خاں بہادر ابن مستطاب امیر کبیر
شمس الامراء محمد فخر الدین خاں بہادر کی گزرانا
باللہ التوفیق و بہ نستعین"

چالیس سرخیوں کے تحت نسبتوں کی تعریفات حسا شاء درج ہیں چند
سرخیاں یہ ہیں۔

"تعریف مقادیر متجانسہ، تعریف نسبت عظمیٰ، تعریف اعداد متناسبہ
وغیرہ وغیرہ بعنوان "تعریف مقادیر متناسبہ" جو بحث صفحہ (۴ تا ۹) کی گئی
ہے اس کا اختتام حسب ذیل عبارت پر ہوتا ہے۔

"اگر اول و ثالث کو چار مرتبہ مضاعف کریں اور ثانی و رابع کو
دو تو حاصل آٹھ اور بارہ اور آٹھ اور بارہ ہوں گے۔ پس جیسا اول
ثانی سے ایک ربع کم ہوگا ویسا ہی ثالث رابع سے۔ وقس علی ہذا الترتیب"

$\frac{۹}{۱۲}$ $\frac{۳}{۱۵}$ $\frac{۴}{۸}$ $\frac{۲}{۱}$

$\frac{۹}{۱۲}$ $\frac{۳}{۱۲}$ $\frac{۴}{۸}$ $\frac{۲}{۸}$

$\frac{۹}{۱۲}$ $\frac{۳}{۹}$ $\frac{۴}{۸}$ $\frac{۲}{۹}$

اس کتاب میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ قدیم اردو ہے
عربی الفاظ اور ترکیبیں جگہ جگہ ملتی ہیں۔

۱ے کتب خانہ آصفیہ صفحہ (۱۴۹۱) [illegible] نسخہ نواب ظہیر یار جنگ بہادر کے
کتب خانہ میں موجود ہے

جن میں شمس الامراء کے دور میں علم دانوں کو بڑھاوا ملا تھا
انجام پائیں ماہتاب آپ اپنی نظیر ہیں۔ اردو زبان کی تاریخ میں یہ دور
بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے پہلے سائنس، ریاضی،
ہیئت اور دیگر جدید علوم و فنون سے متعلق ایسی منظم کوشش کبھی
نہیں کی گئی۔ باوجود تحقیق اور تلاش کہ اس سے قبل کی کسی تصنیف
یا ترجمہ کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ شمس الامراء کے تراجم اردو میں
سائنسی ادب کے اولین کارنامے ہیں۔ ان کی اہمیت اس وجہ
سے بھی بہت زیادہ ہے کہ سب کے سب مستند اور اعلیٰ پایہ کے
ہیں۔ تعجب ہے کہ یہ ترجمے حال حال تک گوشۂ گمنامی میں پڑے
رہتے تھے۔ ان کی شہرت حیدرآباد سے باہر بہت کم ہوئی، اور
خود حیدرآباد میں موجودہ زمانہ کے علماء اور بالخصوص ریاضی
دانوں اور سائنس دانوں میں بہت کم ایسے ہوں گے جو ان
کتابوں سے پوری پوری واقفیت رکھتے ہوں۔

نواب فخرالدین خاں شمس الامراء کا علمی شغف اس
درجہ تھا کہ وہ حیدرآباد سے باہر کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے بھی
واقف تھے اور اس زمانہ میں جتنے اردو، فارسی یا انگریزی
اخبار چھپتے تھے وہ ان سب کو منگواتے اور ان کے سالانہ فائل مجلد
کرا کر رکھتے تھے۔ چنانچہ نواب ظہیر یار جنگ بہادر کے کتبخانہ میں
ان کی اکثر جلدیں محفوظ ہیں۔

ان کے مذاق کی اگر کوئی کتاب ہندوستان کے کسی گوشے
میں بھی چھپتی تو وہ اس کے متعلق معلومات حاصل کرتے اور اپنی
کتابوں کی ترتیب کے وقت ایسی جملہ کتابیں ان کے پیش نظر تھیں۔
ان کو جدید ترین علوم و فنون سے گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے
"ستہ شمسیہ" کے رسالوں کو انگریزی رسالوں سے جو لندن میں
چھپتے تھے منگوا کر اردو میں ترجمہ کرایا۔ اس زمانے میں شمالی ہند
میں بھی اس قسم کی کوششیں کی گئیں لیکن تعجب ہے کہ وہاں

کے علماء دکن کے ترجموں سے ناواقف ہے۔

شمس الامراء نے انگریزی اصطلاحات کے ترجمے کرائے
تھے لیکن شمالی ہند کے ترجموں میں زیادہ تر انگریزی اصطلاحات
ہی مستعمل تھیں مثلاً ایٹم کا ترجمہ یہاں "کمشا" کیا گیا اور وہاں
انگریزی اصطلاح ہی مستعمل رہی۔ اسی طرح کئی اصطلاحیں ہیں
جن کا یہاں ترجمہ ہوا اور وہاں اصل اصطلاح ہی استعمال
کیجاتی تھی۔

نواب شمس الامراء نے جو کتابیں شائع کیں ان کی زبان
سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ برخلاف اس کے شمالی ہند کے ترجموں
کی زبان اور انداز بیان اس قدر آسان اور عام فہم نہیں۔ شمال
کی زبان پر عربی کا اثر زیادہ تھا اس لئے وہاں کے مترجمین نے
ہیڈرواسٹیٹکس اور اوپٹکس کا ترجمہ علی الترتیب علم الماء اور
علم الانظار کیا اور دکن میں علم آب اور علم انعکاس کیا گیا تھا۔

اب ہم اس دور کی ان کتابوں پر جو ہمیں مختلف کتب خانوں
سے دستیاب ہوئیں تفصیلی روشنی ڈالیں گے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ
اردو زبان میں علمی اور حکمیاتی کتابوں کی تصنیف و تالیف کا کام آج
سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے شروع ہو چکا تھا۔

ترجمہ شرح چغمنی | اوراق ۱۸۹ سطر ۱۰۔ تقطیع ۹×۶ انچ۔
خط نستعلیق — منتخبات سرخی میں

متعدد رنگین نقشے بھی شامل ہیں۔ مرتب شاہ علی متوطن اودھ (؟)
سنہ تصنیف قریب ۱۲۴۱ھ۔

علم ہیئت کی مشہور فارسی کتاب شرح چغمنی کا یہ ایک سادہ
اردو ترجمہ ہے جس کو شاہ علی متوطن اودھ نے نواب شمس الامراء
کی سرپرستی میں ۱۲۴۱ھ کے قریبی زمانہ میں مرتب کیا۔ مترجم نے
اپنا اور کتاب کا نام دیباچہ میں اس طرح لکھا ہے۔
"اس ذرہ بے مقدار شاہ علی متوطن اودھ نے

[illegible] کی حد [illegible] ایک ہیجان اور کنجل ظاہر ہوا ہے۔ زبان ہندی میں یہ عبارت ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس امر فقیر شمس الامرا کو اس نے کتابوں سے مسائل اصل میں تقسیم تا امیر کی امداد ضعیف کی قوت سے تبدیل ہ

اس سے قبل مصنف نے مادری زبان میں تعلیم دینے کے فوائد بیان کئے ہیں۔ وہ اس سلسلہ میں لکھتا ہے :۔

"دانایان معنی گار اور عاقلان تجربہ کار پر پوشیدہ نہیں کہ جس قوم میں زبان مروج سے جو فن [illegible] تعلیم پاتا ہے۔ صاحب زبان نہایت آسانی کے ساتھ اس فن کا فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ بہ نسبت دوسری زبان کے مدت قلیل میں حاصل اور کامل ہوتا ہے۔ کیونکہ جو مدت وہاں معرفت الفاظ میں جاتی ہے۔ یہاں وہ تحصیل معانی میں کام آتی ہے۔"

اس کے بعد نواب شمس الامرا کے مساعی کا تذکرہ کیا ہے کہ انھوں نے کس طرح ذاتی توجہ سے فنون ریاضی اور علوم طبعی کو یورپین زبانوں سے اردو و فارسی میں منتقل کیا۔ اور اس سلسلہ میں رغبت دلائی ہے کہ ہمیں بھی ان کے اس فیض کو عام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

یہ نسخہ غالباً خود مصنف کا مکتوبہ ہے کیونکہ اس میں جگہ جگہ حاشیہ پر اصلاحیں، تشریحیں اور اضافے درج ہیں۔ تعجب ہے کہ آخر میں کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ یہ قلمی نسخہ زیور طبع سے آراستہ ہوا تھا یا نہیں۔

یہ کتاب بالکل اسی تدریسی طرز پر لکھی گئی ہے جو شمس الامرا کی دوسری مطبوعات کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی شاگرد کے سوالات اور استاد کے جوابات، درمیان میں نہایت اچھے رنگین نقشے بھی مسئلہ کی وضاحت کے لئے اتارے گئے ہیں۔ عبارت کے نمونے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :۔

آغاز :۔

"سبحان اللہ جس کی قدرت کاملہ کا نمونہ یہ ہے کہ اجرام علویہ اور اجسام سفلیہ کو عدم سے وجود میں لایا اور ان کے فعل و انفعال سے انواع و اقسام کے مصنوع ایک سے ایک بہتر سطح زمین پر بنایا۔"

اختتام :۔

"ان کے نزدیک سال قمریہ اصطلاحیہ اور شمسیہ حقیقیہ میں تفاوت دس یوم گیارہ ساعت بارہ دقیقے ہے اور موافق ثابائی دس یوم گیارہ ساعت کسرہ کم [illegible] ایک دقیقہ تین خمس دقایق ساعت سے اور موافق بطلیموس دس یوم گیارہ ساعت تین خمس ساعت ہے۔"

اس کے بعد حسب ذیل سرخیاں قائم کر کے فارسی عبارتیں لکھی گئی ہیں۔

(۱) ترکیب برآمدن روز ماہ نو۔ (۲) حساب دانستن قمر کہ در کدام برج است۔ (۳) حساب قمر در عقرب۔

یہ نسخہ ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

اصول علم حساب

علم حساب کا ایک ابتدائی رسالہ ہے جو ۶/۸ ۱/۲ کی تقطیع پر (۵۰) صفحات میں شائع کیا گیا ہے۔ اس رسالہ کے آخر میں اعداد و لوگارتم کا ایک جدول ہے جو (۱۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس رسالہ کے سرورق پر حسب ذیل عبارت مندرج ہے۔

"اصول علم حساب ہندی زبان میں"

اہل فرنگ کے دستور پر نوآموزوں کے لئے بیچ عہد نواب ملک

بنام نامی حضرت آصف جاہ مظفر الملک نظام الملک نظام الدولہ فتح جنگ
میر فرخندہ علی خاں بہادر بالا اہتمام کپتان [illegible] خانی سرکار نواب
امیر کبیر شمس الامراء بہادر کے شہر فرخندہ بنیاد حیدر آباد میں بیچ
سنہ ۱۲۵۲ہجر کے چھپا۔

ابتدا میں ایک فہرست درج کی گئی ہے جس کا عنوان حساب کے اعمال کی فہرست ہندی زبان میں" رکھا گیا ہے۔ اس کے تحت (۴۰) ہر خیال درج ہیں جن سے اس رسالہ میں بحث کی گئی ہے۔

اس رسالہ کا ایک دوسرا ایڈیشن کتب خانہ جامعہ عثمانیہ سے دستیاب ہوا۔ جس کا نمبر ($\frac{511}{110}$) ہے۔ یہ رسالہ ۶/۴ کی تقطیع پر (۲۱) سال بعد یعنی ۱۸۵۵ء میں کلکتہ اسکول بک سوسائٹی پریس" میں چھپا۔ صفحات کی تعداد (۸۰) ہے۔ اس کے سرورق پر حسب ذیل عبارت درج ہے۔

"اصول علم حساب اردو زبان میں اہل فرنگ کے
دستور پر نو سکھوں کے لئے"

اس کے نیچے عبارت بالا کا انگریزی ترجمہ ہے۔ پہلے ایڈیشن کے سرورق پر "ہندی زبان میں" اور اس ایڈیشن کے سرورق پر "اردو زبان میں" درج ہے۔ نیز پہلے ایڈیشن میں فہرست سے پہلے "تنبیہ" کی سرخی کے تحت حسب ذیل عبارت لکھی ہوئی ہے۔

تنبیہ

"اس کتاب میں اختصار کے لئے کئی علامتیں مقرر کی گئیں تاکہ سیکھنے والوں کو مفید ہو۔

+ جمع کی علامت − تفریق کی علامت × ضرب کی علامت
÷ تقسیم کی علامت : تناسب کی علامت = مساوات کی علامت"

اس دوسرے ایڈیشن میں یہی عبارت فہرست سے پہلے کے صفحہ پر درج کی گئی ہے اور "حساب کے اعمال کی فہرست" کے نیچے بھی "ہندی زبان میں" کی بجائے "اردو زبان میں" لکھا ہوا ہے۔ ہر صفحہ کی پیشانی پر کتاب کی سرخیوں کے نام اردو اور انگریزی میں لکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً جمع مرکب (Compound Addition) قانون ثلاثی (Rule of Three) وغیرہ۔

یہ رسالہ فورٹ ولیم کالج کے اردو ٹائپ میں چھپا ہے۔ کتاب کے آغاز میں علم حساب کی ان الفاظ میں تعریف کی گئی ہے:

"حساب وہ علم ہے کہ جس سے مجہول عددوں کے
نکالنے اور حاصل کرنے کا حال عدد معلوم خاص سے
باسانی جانا جائے"

ابتدائی دو صفحات میں اعداد کی اشکال ان کے لکھنے کا طریقہ اور مراتب کے تعین کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اور ۱، ۲، ۳ ہندسے لکھ کر یہ بتایا ہے کہ ان کو ارقام کہتے ہیں۔ فہرست کے مطابق ایک ایک موضوع کو لیکر اس کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے مثلاً ایک عنوان ہے "جمع کا عمل" جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سب سے پہلے جمع کی تعریف اور جمع کرنے کا طریقہ بتلایا گیا ہے بعض عمل کے دو دو تین تین طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ پھر یہ معلوم کرنے کے لئے کہ جمع کا عمل صحیح ہے یا غلط جمع کے امتحان کا طریقہ سمجھایا گیا ہے۔ اور بطریق سوال جواب ہر عمل کی تین تین چار چار مثالیں دی گئی ہیں۔ یہی طریقہ تمام عنوانات مثلاً تفریق، ضرب اور قسمت (تقسیم کے معنی میں استعمال ہوا ہے) وغیرہ میں اختیار کیا گیا ہے۔

(باقی آئندہ)

خواجہ حمید الدین

پیشے کا انتخاب اور نفسیات

پیشہ انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ کسب معاش کا اہم ذریعہ ہونے کی وجہ سے ہر فرد کو پیشے کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ موجودہ دور میں زندگی کی کشمکش بڑھتی جا رہی ہے اور ہر فرد پر معاشی ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھ رہا ہے۔ ان معاشی تبدیلیوں نے پیشے کی اقتصادی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ پیشے کی اہمیت صرف اقتصادی ہی نہیں بلکہ تمدنی اور اخلاقی بھی ہے۔ ہم اپنے پیشے کے فرائض ادا کرنے میں جو وقت صرف کرتے ہیں اس کا اثر ہماری ذہنی اور عملی دلچسپیوں پر پڑتا ہے۔ ہماری سیرت کا عام رنگ اور ہمارا نظریۂ حیات بڑی حد تک اسی کام کی بدولت معین ہو جاتا ہے۔ ہم پیشہ افراد کی گفتگو، خیالات اور عادتیں ہمیں متاثر کرتی ہیں۔ پیشے کے ان دور رس اثرات اور اس کی اہمیت کو پروفیسر آشپرانگر نے یوں ظاہر کیا ہے "پیشہ انسان کے لئے نوشتۂ تقدیر بن جاتا ہے۔ چند سال کے عرصے میں وہ انسان کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے اور اس کی سیرت کی تشکیل کرتا ہے۔ پیشہ ہی ہمارا نہیں ہوتا بلکہ ہم بھی پیشے کے ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ گوشہ ہے جہاں سے انسان دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے"

پیشے کے انتخاب کی ضرورت تمدن کے ابتدائی مدارج میں سماج کی ساخت بالکل سادہ تھی بچے اپنے والدین اور بزرگوں کے ساتھ روزمرہ کے کام اور سماجی مشاغل میں حصہ لے کر ضروری معلومات حاصل کیا کرتے تھے۔ سادہ قوانین، ضابطۂ معاشرت، مذہبی معلومات اور رسوم و رواج سے متعلق تمام امور اسی طرح "تعلیم باعمل" کے ذریعہ سیکھ لیتے تھے۔ تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ معاشرہ زیادہ پیچیدہ ہوتا گیا اور سماجی زندگی میں اگلی سی سادگی باقی نہ رہی۔ غیر رسمی تعلیم و تربیت جو والدین اور بزرگوں کے ساتھ کاروبار میں شرکت کی وجہ سے حاصل ہوتی تھی وہ نئی ضروریات زندگی کے لئے اکتفا نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے باضابطہ اور رسمی تعلیم و تربیت کی ضرورت واقع ہوئی۔ طبعی علوم اور تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ ایجادات کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا، جس نے زندگی کے تمام شعبوں کو متاثر کیا۔ کارکردگی کی اہمیت بڑھ گئی اور تقسیم کار کو مفید اور ضروری تسلیم کیا گیا۔ ان حالات میں پیشے کے انتخاب کا مسئلہ نہایت اہم اور ناگزیر ہو گیا۔

غلط طریقۂ انتخاب یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہم اپنی زندگی کے بعض نہایت اہم مسائل پر بہت کم غور و فکر کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک مسئلہ پیشے کے انتخاب کا ہے۔ ہم اس اہم مرحلے کو بالکل سرسری توجہ سے طے کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ وہ عام بے اطمینانی ہے جو اکثر افراد اپنی پیشہ ورانہ زندگی سے ظاہر کرتے ہیں۔ عمر رسیدہ افراد سے پوچھئے تو انہیں بھی یقین نہیں کہ جو پیشہ انھوں نے اختیار کیا تھا وہ ان کے لئے موزوں تھا۔ وکیل صاحب اپنی ناکامی کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں "کاش میں ڈاکٹر ہوتا" ڈاکٹر صاحب اپنے پیشے کی پریشانیوں سے اکتا کر کہتے ہیں "ملازمت کے زمرے میں داخل ہوتا تو مقررہ اوقات میں مقررہ کام انجام دے کر اپنی زندگی آرام و اطمینان سے گزارتا" ملازمین سے پوچھئے تو وہ پابندیوں اور ترقی کے محدود مواقع کا ذکر کر کے آزاد

پیشوں کے پہلوؤں کو صراحت سے بیان کریں گے۔ بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہر شخص چاہتا ہے کہ کاش وہ کچھ اور ہوتا مگر وہ ہوتا جو ہے۔ اس پریشانی پر ہمیں متعجب نہ ہونا چاہئے کیونکہ پیشے میں داخل ہونے سے پہلے یہ غور نہیں کیا جاتا کہ فرد کو پیشے سے کوئی مناسبت ہے بھی یا نہیں۔

عام غلط فہمیاں بعض غلط فہمیاں اس قدر عام ہو گئی ہیں کہ ان کی وجہ سے پیشے کے انتخاب کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں ہو پاتا۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ تمام افراد مساوی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ مساوات کا یہ دل خوش کن تخیل صحیح نہیں۔ نفسیات کے جدید ترین شعبے "انفرادی اختلافات" نے ثابت کر دیا ہے کہ افراد کی صلاحیتوں میں بہت سے کیفی اور کمی اختلافات ہوتے ہیں یہ خیال ہرگز درست نہیں کہ ہر انسان میں اتنی عام استعداد ہوتی ہے کہ خواہ کوئی پیشہ اختیار کرے وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ محض لگاتار کوشش اور محنت ہر پیشے میں کامیابی کے لئے کافی ہے بعض بڑی ہستیوں کے سوانح بھی بظاہر اس خیال کی تائید کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر غور اور عام مشاہدے سے واضح ہوتا ہے کہ اگر صرف محنت ہی کامیابی کا راز ہوتی تو ہم اکثر سخت محنت کرنے والوں کو معمولی حالت میں نہ پاتے۔

اس سلسلے کی ایک اور غلط فہمی یہ ہے کہ پُرجوش ارادہ ہی بڑے درجے تک پہنچا دینے کے لئے کافی ہے۔ مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ کسی پیشے میں کامیابی حاصل کرنے کی قابلیت کو محض دلی خواہش سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض نوجوانوں کی خواہش کو بھی پیشے کے انتخاب میں بہت زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ بعض صورتوں میں ایسی خواہش کی نفسی بنیاد غلط پائی گئی ہے۔

نوجوانوں کی غلطیاں پیشے کا انتخاب [illegible]

نوجوان بالعموم جن غلطیوں کا شکار ہوتے ہیں ان کا [illegible] ذکر بیجا نہ ہوگا۔ بعض پیشوں کے متعلق یہ حسن ظن ہوتا ہے کہ وہ منفعت بخش، آرام اور سکون و اطمینان کی زندگی پیش کرتے ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر پیشے میں متعدد معین کام کے خشک مراحل اور تکلیف دہ پہلو ہوتے ہیں جو ایک بیرونی ناظر کو پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیتے پھر کسی کام کو دلچسپ پانا کام کی نوعیت پر ہی منحصر نہیں ہوتا بلکہ شخصی دلچسپی اور رجحانات کو بھی اس میں دخل ہوتا ہے۔ ایک ہی کام زید کو دلچسپ معلوم ہو سکتا ہے جو ممکن ہے بکر کو خشک اور غیر دلچسپ محسوس ہو۔

کبھی نوجوانوں کی نگاہیں غیر معمولی واقعات پر پڑتی ہیں تو آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ کسی بڑے ڈاکٹر کے کامیاب عمل جراحی کی شہرت سن کر یہ خیال کر لینا صحیح نہیں کہ ہر فرد کے لئے ڈاکٹری کا پیشہ اتنی ہی دولت اور شہرت کا باعث ہوگا۔ ہر شخص انجینیر بن کر نظام ساگر جیسا عظیم الشان کارنامہ پیش نہیں کر سکتا۔ صدہا انجینیر اپنی زندگی سڑکوں کی مرمت اور معمولی مکانات کی تعمیر میں صرف کرتے ہیں۔

مروجہ معیار وقعت اور سماجی روایات کے تحت مہذب اور غیر مہذب پیشوں کی تفریق کے باعث بھی اکثر نوجوان ایسے پیشے اختیار کرنے کی طرف مائل ہوتے ہیں کہ ان کا شمار "سفید پوشوں" میں رہے اس طرح اپنے میدان عمل کو تنگ کر لینا نقصان دہ ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص غلہ فروشی میں ایک ڈاکٹر سے زیادہ کمائی اور زیادہ خوش گوار زندگی بسر کر سکے۔

نوجوانوں کی پریشانیاں نوجوانوں پر [illegible]

[illegible] ان کی پریشانی کا سبب چند سوالات [illegible] پیدا ہوسکتے ہیں۔

[illegible] اپنی خوبیوں اور کمزوریوں کے مدنظر مناسب [illegible] ہے؟)

[illegible] خاندانی اور سماجی حالات کے لحاظ سے [illegible]؟

(۳) "ہر پیشے میں مشکلات، پریشانیاں اور مقررہ کام کے خلل داخل ہوتے ہیں۔ اپنی طبیعت کی افتاد کے لحاظ سے ان میں سے کس پیشے میں برداشت کرسکوں گا؟"

ان پریشان کن سوالات کا جواب نہ وہ خود دے سکتا ہے نہ والدین اور نہ اساتذہ۔ بعض بزرگ ذمہ داری کو محسوس کرکے گر بے بسی کو چھپاتے ہوئے یوں ٹال دیتے ہیں کہ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے تمہیں خود اپنے لئے اپنا پیشہ منتخب کرلینا چاہئے۔ خود اعتمادی کی تلقین تو اچھی چیز ہے اگر آپ سے ایک ڈوبتا ہوا شخص مدد مانگے اور آپ اس سے کہیں کہ "اپنی جان کی حفاظت آپ ہی کرنی چاہئے، ہمت کرکے دریا میں ہاتھ مارو اور کنارے کے کسی موزوں حصے تک پہنچ جاؤ" تو یہ رہبری یا ہمدردی نہ ہوگی۔ پھر اپنی نفسی کیفیات کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے۔ بعض عمر رسیدہ افراد بھی تو اپنے آپ کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ پھر ایک خام کار نوجوان سے معرفت نفس کی ایسی توقع کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے۔

بہرحال بے چارہ پریشان حال نوجوان کسی رہبر کے نہ ملنے سے صحیح مشورے سے مایوس ہوکر اپنے مستقبل کو اتفاقات کے حوالے کردیتا ہے یا مروجہ روایتی طریقوں کو [illegible] کرکے قبول کرلیتا ہے۔

مروجہ طریقے ہمارے ملک کا ایک مروجہ طریقہ تو یہ ہے کہ آبائی پیشہ اختیار کرلیا جائے، اس طرح بعضوں کا پیشہ تو گہوارے ہی میں متعین ہوجاتا ہے۔ دھنی کا بیٹا درزی، سنار کا بیٹا سنار اور بڑھئی کا بیٹا بڑھئی۔

حالانکہ مغربی ممالک پر نظر ڈالئے تو بعض دھنیوں، نائیوں اور لوہاروں کے بیٹوں نے بڑے بڑے درجوں تک رسائی حاصل کی اور ملک کی بڑی سے بڑی خدمت انجام دی۔ ہمارے ملک میں آبائی پیشہ ہونا بھی ذاتی صلاحیت کے فقدان کے باوجود صداقت کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نوجوانوں کے لئے ان کے والدین اور بزرگ پیشے کا انتخاب کردیتے ہیں۔ بہت سے نوجوان جو پولیس اور فوج میں داخل ہوکر کامیاب ہوسکتے تھے، اس لئے ایسا نہ کرسکے کہ ان کے والدین کو یہ گوارہ نہ تھا کہ ان کے لڑکے وردی پہنیں۔ اس طرح والدین کا مشورہ بعض وقت ان کی رغبت یا نفرت پر منحصر ہوتا ہے۔ یا پھر متذکرہ بالا غلط خیالات پر۔

نوجوانوں کی زندگی کے اس اہم مرحلے کی گتھی کو سلجھانا ایک بڑی انسانی خدمت ہے۔ اس خصوص میں اہل مغرب نے جو طریقے اختیار کئے ہیں وہ ہمارے لئے مشعل ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔

مغربی ممالک میں پیشہ نمائی مغربی ممالک میں پیشے کے انتخاب میں نفسیات پیشہ نمائی سے مدد لی جاتی ہے۔ نفسیات کا یہ جدید شعبہ صنعتی نفسیات اور تعلیمی نفسیات کے امتزاج سے ایک مشترک شعبے کی حیثیت سے وجود میں آیا۔ پیشہ نما ماہرین نوجوانوں کی ذہنی آزمائش، مخصوص صلاحیتوں کی آزمائش، سماجی اخلاقی اور جذباتی آزمائشوں

کے بعد ان کے تعلیمی اور معاشی حالات پر غور کرکے ماہرانہ مشورہ دیتے ہیں۔

ذہنی آزمائش | اس مشورے میں ذہانت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ذہنی آزمائش کے ذریعہ نوجوان کا ذہنی خارج قسمت معلوم کیا جاتا ہے۔ یہ آزمائش کئی سوالات پر مشتمل ہوتی ہے جو مختلف عمروں کے لحاظ سے مرتب کئے گئے ہیں۔ صحیح جوابات کی نشان دہی سے ذہنی عمر معلوم کی جاتی ہے۔ کسی فرد کی ذہنی عمر کو اس کی تاریخی عمر پر تقسیم کرنے سے ذہنی عمر کو اس کی تاریخی عمر پر تقسیم کرنے سے ذہنی خارج قسمت حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ایک دس سالہ لڑکا سوالات کے ایسے صحیح جواب دے کہ اس کی ذہنی عمر بارہ سال حاصل ہو تو اس کا ذہنی خارج قسمت $\frac{۱۲}{۱۰}$ یا ۱۲۰ (جب کہ ۱۰۰ اوسط قرار دیا جائے) ہوگا۔

مختلف پیشوں کی تحلیل کی گئی ہے اور یہ معلوم کیا گیا ہے کہ ہر پیشے میں کامیاب ہونے کے لئے کم از کم کس قدر ذہنی خارج قسمت (ذ۔خ۔ق) ضروری ہے۔ مثلاً میکانیکل انجینیرنگ کے لئے ذ۔خ۔ق ۱۱۰ ہونا چاہئے اور اہلکاری کے لئے ۹۰ کافی ہے۔ ان اعداد سے یوں رہبری کی جاتی ہے کہ جس نوجوان کا ذ۔خ۔ق ۱۱۰ سے کم ہو اسے میکانیکل انجینیرنگ کا پیشہ اختیار کرنے سے منع کیا جاتا ہے کیونکہ اس پیشے کے فرائض ادا کرنے میں زیادہ ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جس کا ذ۔خ۔ق ۹۰ سے زیادہ ہو اس کو اہلکار بننے کا مشورہ نہیں دیا جاتا کیونکہ اس کی ذہانت کے لحاظ سے وہ اعلیٰ تر سطح کا کام کرسکتا ہے۔

..........جس طرح کمتر ذہانت کا آدمی اعلیٰ تر پیشے کے فرائض اچھی طرح انجام نہیں دے سکتا۔ اسی طرح بہتر ذہانت کا آدمی کمتر سطح کے پیشے کے فرائض سے اکتا جاتا ہے اور بڑی بے دلی سے کام کو انجام دیتا ہے۔

اس کے علاوہ ذہنی خارج قسمت معلوم کرنے سے وہ سطح معلوم ہو جاتی ہے جس پر کوئی فرد پہنچ سکتا ہے۔ ذیل کے جدول سے اس کا اندازہ ہوگا۔

ذہنی خارج قسمت	پیشہ ورانہ سطح
۵۰ تا ۶۰	ادنیٰ مزدوری یا سادہ کام
۶۰ تا ۷۰	بازگشتی کام جس میں مہارت درکار ہو۔
۷۰ " ۸۰	ادنیٰ مہارتی بازگشتی کام
۸۰ " ۹۰	نیم مہارتی۔ اہلکارانہ (معمولی)
۹۰ " ۱۱۰	مہارتی۔ اہلکارانہ (خصوصی) ٹکنیکل
۱۱۰ " ۱۲۵	اعلیٰ ٹکنیکل۔ اعلیٰ اہلکارانہ۔ انتظامی
۱۲۵ " ۱۴۰	پروفشنل اور اعلیٰ انتظامی
۱۴۰ سے زیادہ	اعلیٰ پروفشنل اور نظم و نسق

اس جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوائے ان افراد کے جن کا ذ۔خ۔ق ۵۰ سے بھی کم ہو یعنی جن کی عقل ایک ۵ سالہ لڑکے سے بھی کم ہو کسی کو بھی روزگار کے مواقع سے مایوس نہ ہونا چاہئے۔

مخصوص صلاحیتیں | ذہنی خارج قسمت سے تو وہ بلند سطح معلوم ہوتی ہے جہاں تک فرد پہنچ سکتا ہے۔ مگر یہ معلوم کرنے کے لئے کہ فرد کس میدان عمل کے لئے موزوں ہے مخصوص صلاحیتوں کی آزمائش کی جاتی ہے۔ ایسی متعدد معیاری آزمائشیں مرتب ہوچکی ہیں مثلاً میکانی صلاحیت کی آزمائش۔ اشکال کے تعلقات سمجھنے کی آزمائش۔ موسیقی کی صلاحیت کی آزمائش۔ اہلکارانہ

... وغیرہ وغیرہ۔
... فرد کی اخلاقی سماجی اور جذباتی
... کے لئے آزمائشیں مرتب
... کہ ان میں استعمال کی جاسکیں۔
... مقامی معلومات شامل ہیں۔ علاوہ ازیں
... نہیں اس لئے پیشہ نما ماہر سوال بند
کے ذریعہ والدین اساتذہ اور ساتھیوں سے کچھ معلومات حاصل
کرتا ہے۔ بالآخر بالمشافہ گفتگو سے بھی اپنی رائے قائم کرتا ہے۔

اس سارے مواد کو یک جا جمع کیا جاتا ہے تعلیمی کیفیت اور طبی معائنے کی رپورٹ بھی پیش نظر رہتی ہے۔ اس طرح نوجوانوں کا ایک مکمل نفسی مرقع حاصل کرنے کے بعد پیشہ نما ماہر ایک ماہرانہ مشورہ دیتا ہے۔

حبیب احمد

تعلیم کا مسئلہ

از ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی
پتہ نیسواسو عثمانیہ - قیمت عہ

ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے پروفیسر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب کی ایک جدید کتاب "تعلیم کا مسئلہ" شائع ہوئی ہے جس میں حسب ذیل عنوانات پر مفید اور ضروری معلومات درج ہیں:۔

(۱) تعلیم و تربیت کا مقصد (۲) تعلیم کی مدت (۳) موجودہ نظام تعلیم کے مدت (۳) موجودہ نظام تعلیم کے نتائج و نقائص (۴) اعلیٰ تعلیم کا صحیح نصب العین (۵) علم کی وحدت (۶) انسانی وحدت کی تعلیم (۷) ایمان اور علم (۸) ابتدائی اور ثانوی تعلیم (۹) اعلیٰ تعلیم (۱۰) تعلیمی منزلیں اور نصاب (۱۱) جامعہ کے شعبہ جات (۱۲) طالب علم اور عملی سیاسیات۔

ملنے کا پتہ۔ سب رس کتاب گھر خیرت آباد۔

نغمہ

نغمہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ماضی کی دلچسپ اور رنگین ساعتیں فنا کی وادی میں گم ہوجائیں ــــ وقت خواہ کتنی ہی تیزی سے کیوں نہ گزر جائے گزران رنگین ساعتوں کی یاد ہمیشہ قلب پر مترنم گیت بن کر رہتی ہے۔

نغمہ کی ابتداء اس وقت ہوتی ہے جب محبت کے طوفانی سمندر میں سکون کی سی کیفیت پیدا ہوجائے ــــ خواہ وہ سکون نتیجہ ہو کامیابی کا یا انتہائی افسردگی اور مایوسی کا ــــ اس وقت جب روح کے لطیف جام میں سکون کی شراب ختم ہوجائے۔ نغمے کے دھیمے دھیمے شیریں راگ سنائی دیتے ہیں۔

نغمہ ان نازک ساعتوں میں پیدا ہوتا ہے جب دوشیزۂ بہار مضامینِ محبت سے گنگنانے لگے ــــ وہ نوجوان قلب میں اس وقت پرورش پاتا ہے جب ماہِ حسن و فاشعار اپنے آپ کو محبت کے سپرد کردے...

....

نغمہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ وہ محبت کرنے والے کی مایوس آنکھوں سے اشکوں میں تحلیل ہوکر بہنے لگے۔! انسانی زندگی گو بالآخر غموں کی پُرپیچ اور کٹھن راہوں کو طے کرتی ہوئی اپنی منزل کو پہنچ جاتی ہے مگر کبھی بھی وہ نغمہ اور ترنم سے محروم نہیں رہتی۔

نغمہ.... ترنم.... روح.... انسانی زندگی.... مصائب آلام
.... نغمہ.... ترنم..........

افضل صدیقی

صاحبانِ انقلاب

صبحدم جب نور و تاریکی تھے گرمِ اختلاط — اٹھ رہی تھی آسماں سے ماہ و انجم کی بساط
رات کے دوشیزہ لمحے صبح کا منہ چوم کر! — اک نئی دنیا کو جاتے تھے خوشی میں جھوم کر!
ایک عالم پر تھا طاری نیم بیداری کا خواب — تھا ابھی اوڑھے ہوئے کہرے کی چادر آفتاب
زندگی احساسِ نو کے موڑ پر گاتی ہوئی! — آسمانوں سے نسیمِ خوش گوار آتی ہوئی!
جیسے جیسے چلتے جاتے تھے سہانے پن کے تیر — کھنچتی جاتی تھی گل و غنچہ پہ سونے کی لکیر!
جا رہا تھا میں بھی اس عالم میں بستی سے ادہر — رات کی مانند، صبحِ نو سے نظریں پھیر کر!
یادِ ماضی، فکرِ مستقبل میں، چہرہ زرد سا — نیند سے آنکھیں تھیں بوجھل، سر میں ہلکا درد سا

زندگی جب موت ہو، یہ جام لے کر کیا کروں
فطرتِ فیاض کا انعام لے کر کیا کروں
اب مٹے منظر سے کیا، جب مٹ چکا نظروں کا جوش
اب نہ سرشاری کی طاقت ہے نہ بیداری کا ہوش

ہاں تو میں بھی جا رہا تھا دور بستی سے ادہر — اس طرف! یعنی جہاں ہیں کچھ "خداوندوں" کے گھر
وہ خداوندانِ گیتی، وہ معزز سود خوار! — صاحبانِ دولت و زر، حاکمانِ ذی وقار!
عشرت و راحت کے خوگر، لعنتوں کے رازداں — رحمتِ یزداں کے مرکز، شیطنت کے پاسباں
دیدۂ احساس خوابیدہ، وہ دن ہو یا کہ رات — پتھروں کی مورتیں، اک چلتا پھرتا سومنات!

ہاں تو اے ہمدم، انھیں کے پاس جانا تھا مجھے — چند معصوموں کی تقدیریں بنانا تھا مجھے!
اپنی خودداری کے ہاتھوں آج خود بسمل تھا میں — اپنا خنجر، اپنی گردن، آپ ہی قاتل تھا میں!
جم گئی تھیں پپڑیاں ہونٹوں پہ، چہرہ تھا اداس — رفتہ رفتہ آ گیا اک قصر کی پھاٹک کے پاس
دیکھتا کیا ہوں کہ کچھ خدام ہیں سرگرمِ کار — اپنے آقا کے نمونے، بدکلام و بدشعار!
میرا گھبرایا ہوا چہرہ نظر کیوں دیکھتے! — موٹروں کو پونچھنے والے، ادہر کیوں دیکھتے
پیٹیاں باندھے کمر میں، ناز فرماتے رہے — مسکراتے جھومتے، آتے رہے جاتے رہے!

سچ بتانا! کیا یہی ہیں "صاحبانِ انقلاب"؟
اس طرف آئیں! کدھر ہیں طالبانِ انقلاب!!

نظر (حیدرآبادی)

[illegible]

بھول جا

"ہم عشق کا اظہار کرکے زبان کے [illegible] ہوتے
جنہوں نے اپنا خلوت کا اظہار کیا ہے۔ خود اس [illegible]
انسان سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ان کی نظر میں کتنی وسعت ہے"

میں چاہتا تھا کہ تمہارے والد کی موت کا دکھ بھلانے کے لئے تمہارا دل بہلاؤں۔ بہت سوچا، پر سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں تمہیں کیونکر بہلاؤں کیسے شانتی دوں؟

کیا تمہیں کچھ یاد ہے کہ میں نے دیر تک چپ رہنے اور کچھ سوچتے رہنے کے بعد تمہیں کیا کہا تھا؟ نہ بھلائی جانے والی مجھے اچھی طرح یاد ہوگا۔ لیکن تم نہیں جانتیں کہ اس کا انجام کیا ہوا؟

لو میں بتائے دیتا ہوں، پر خدا کے لئے اس پوتر بندھن پر شبہ کرنا جو ہمیں باندھے ہوئے تھا اور جس کا نام میں اپنی زبان پر نہیں لا سکتا۔

میری غربت نے دنیا میں میرے لئے کوئی ٹھکانہ نہ چھوڑا۔ میں جانتا تھا کہ اپنے اور تمہارے تعلقات پر کبھی بھی پردہ نہ رہ سکے گا لیکن میں نے اپنی دانست میں اسے نبھا لیا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ تم میرے لئے اپنا جیون، اپنا سکھ، اپنی امنگیں، اپنی تمنائیں یہاں تک کہ اپنا کہلا سکنے والا سبھی کچھ مجھ پر نچھاور کرنے کو تیار ہو۔ لیکن میرے لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ میں اپنی خوشی کے لئے تمہارا جیون ناش کر دوں، تمہاری امنگوں پر پانی پھیر دوں اور تمہیں گرہستی کے قابل بھی نہ رکھوں۔

آہ میں نے اس دن کتنا جھوٹ بولا تھا۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور میں تم سے کہہ رہا تھا۔



"میں ایک خوش حال اور امیر زمیندار کا لڑکا ہوں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں"۔ وہی میٹھی باتیں آج میری زندگی کا اندر ہی اندر خاتمہ کئے دے رہی ہیں۔ یہ کچھ آج ہی کی بات نہیں اس وقت بھی جب میں تم سے جھوٹ اور سفید جھوٹ کہہ رہا تھا اس کے خیال ہی سے میری سانس باہر نکل رہی تھی۔

مجھے تمہاری وہ نظریں بھی یاد ہیں جن سے تم نے مجھے اس وقت دیکھا تھا۔ اس کی چوٹ کے گھاؤ میں آج بھی کسک اٹھتی ہے۔ من میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ حالانکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس وقت انجان بن کر اپنی آنکھیں نیچی کر لی تھیں۔

چلتے ہوئے میں نے یہ بھی کہا تھا۔
"کل انگورہ جا رہا ہوں فصل پکنے تک لوٹ نہیں سکوں گا"
"تمہیں کچھ پتا بھی ہے مجھ پر کیا بیتی؟
شاید تم نے کبھی سوچا ہی نہ ہو!
میں بھی بتانا نہیں چاہتا!

آنسو اور آہیں..... تمہاری یاد! لیکن یہ سن کر تو مجھے بہت ہی مسرت ہوئی کہ تم اب ایک سکھی اور امیر زمیندار کی جیون ساتھی ہو اور سکھی بھی ہو۔

میری آنکھیں جو آج ڈبڈبائی ہوئی ہیں تمہیں ہنستا دیکھ کر ہنس سکتی ہیں۔ تم مجھے بھول گئی ہوں گی! "ضرور ہی! پیاری زہرہ! تمہیں اپنے شوہر کو اپنانا ہوگا کیونکہ تمہارا پیار تمہارا سب کچھ وہی ہے۔ اس کی خوشی میں تمہاری خوشی ہے"

(ہندی سے ترجمہ) **وحید یوسف زئی**

[illegible]

ہر طرف رنگ برنگ گل و برگ بکھرے ہوئے تھے اور ان پر خوش الحان چڑیاں بیٹھی نغمے الاپ رہی تھیں۔ مسافر
ہوا قلعہ کے اندر داخل ہوا۔ قلعہ اس قدر روشن تھا کہ مسافر کی آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔ وہ قلعہ سے
گزر گیا۔ جہاں پہنچ کر اس نے اپنے آپ کو ایک بڑے سے دالان میں پایا جس میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ جن کے
بیچ میں شہنشاہ جہانگیر جلوہ افروز تھے۔ وہ بار بار مڑتے اُدھر گھورتے ان کی پرجلال نگاہ ایک [illegible]
پیچھے ایک مرمریں دیوار پر آویزاں تھی۔ شہنشاہ کے جاہ و جلال کو دیکھ کر مسافر کانپ گیا اور آہستہ سے دروازے [illegible]
ہوا باہر نکلا۔ سامنے اُسے ایک دوسرا محل نظر پڑا۔ مسافر ایک اور چمن میں سے گزرتا ہوا اس محل میں داخل ہوا۔ محل کے درمیان
میں سے ایک نہر بہہ رہی تھی۔ جس میں ایک طرف بہت سی لڑکیاں نہا رہی تھیں۔ نہانے کے بعد کوئی گلاب کے فوارے کے نیچے
کھڑی ہو جاتی تو کوئی عطر کے۔ غرض کہ ان کے میٹھے قہقہوں سے سارا محل گونج رہا تھا۔ مسافر اور آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ سامنے
ایک زرق برق پردہ پڑا ہے۔ جس میں لعل و زمرد جھلملا رہے ہیں۔ مسافر نے آہستہ سے اُسے اٹھا لیا اس کے آگے ایک بڑا سا کمرہ تھا
جس کی مرمریں دیواروں پر چھوٹے چھوٹے آئینے جڑے ہوئے تھے اور اس کے بیچ میں ایک بڑا سا شیشے کا چراغ آویزاں تھا جس کا عکس
دیواروں پر پڑنے سے معلوم ہوتا کہ ہر طرف ایک چھوٹا سا چراغ ٹمٹما رہا ہے۔

کمرے کے درمیان ایک تخت پر نورجہاں بیٹھی تھی۔ یہ اس کا سنگھار خانہ تھا۔ بہت سی سہیلیاں اس کے سنگھار
میں مصروف تھیں۔ کوئی اس کے لانبے لانبے سیاہ بالوں میں موتی پرو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے تاروں بھرا دوشالہ
نورجہاں کو اوڑھا دیا ہے۔ اس کی لاجواب پوشاک پر ہیرے اور یاقوت لگے تھے۔ کوئی سہیلی اس کی پوشاک پر عطر اور
گلاب پاشی کر رہی تھی، جس کی بھینی بھینی خوش بو سے سارا محل معطر ہو رہا تھا۔ کوئی سہیلی چنور ہلا رہی تھی تو کوئی سونے کا
پنکھا جھل رہی تھی۔ بعض سہیلیاں ملکہ کے آگے بیٹھی اس کی دلجوئی کا سامان کر رہی تھیں۔ کوئی ستار لئے ہوئے پُرسُریلے نغمے
گا رہی تھی تو کوئی پچیسی اور چوسر میں شہزادی کا دل بہلا رہی تھی۔ ہر لمحہ شہزادی کا شیریں قہقہہ سنائی دیتا اور وہ جیتنے کے
کوئی خوبصورت ہار یا پاس سے کوئی بیش بہا خلعت ان کی طرف پھینک دیتی۔

"با ادب با ملاحظہ ہوشیار" کی شاندار صدا نے سب کو چونکا دیا۔ سہیلیاں ادب سے ہاتھ باندھے کھڑی ہو گئیں۔
ملکہ نورجہاں بھی مسکراتی ہوئی آہستہ سے شہنشاہ کے استقبال کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے میٹھے چہرے کی مسکراہٹ
کو دیکھ کر شہنشاہ جہانگیر کچھ دیر کے لئے سلطنت کے پریشان کن مسئلہ کو بھول گیا۔

شہنشاہ اور ملکہ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے ایک مرمریں تخت پر بیٹھ گئے۔ ان کے آگے زمین
پر سفید اور سیاہ مرمر کی شطرنج بنی تھی۔ بہت ساری لڑکیاں مہروں کے بجائے اس بساط پر کھڑی تھیں۔ شہنشاہ اور ملکہ
دونوں کبھی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے کبھی شہنشاہ اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کوئی چال سوچنے لگتا اور کبھی ملکہ کی
جبینِ ناز پر شکنیں پڑ جاتیں۔ لڑکیوں کو ادھر ادھر ہٹایا جاتا۔ کچھ دیر بعد ملکہ کے شیریں قہقہے سے جہاں پناہ کی شکست کا پتہ چلا
شہنشاہ مسکراتا ہوا اگرچہ دل ناخواستہ اٹھ کر اپنے تختِ طاؤس پر دربارِ خاص میں [illegible]

[illegible] ہی سہیلیوں کے ساتھ باغ میں چلی گئی۔

[illegible] عالم برپا ہو گیا تھا۔ ظلِ جہاں پناہ کے تیر نے کسی راہگیر کو ہلاک کر دیا تھا اب شاہ جہانگیر کو [illegible] محل پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے ایک عام دربار کا حکم دیا۔

[illegible] ایک حسین سے پردہ کے پیچھے دربار عام میں کھڑی تھی اور شہنشاہ جہانگیر اپنے اسی تخت پر جلوہ افروز تھا اس [illegible] ایک حیران آویزاں تھی!

جہانگیر کے [illegible] عجیب وقت آن پڑا تھا۔ اس کا پُرجلال چہرا انصاف اور محبت کی زبردست کشمکش کا آئینہ دار تھا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ انصاف نے فتح پائی کیونکہ معاً جہانگیر کا چہرہ رنج و الم کی ایک تصویر بن گیا۔ جہانگیر ایک شوہر کی حیثیت سے نہیں بلکہ جہانگیر عادل کی حیثیت سے تخت پر بیٹھا تھا اور اس کے آگے اس کی عزیز از جان ملکہ نورجہاں ایک مجرم کی حیثیت سے کھڑی تھی۔ سارے دربار میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی جس میں شہنشاہ کی زبردست آواز گونج گئی۔ "خون کے بدلے خون یہی جہانگیری عدل ہے"! لوگ دربار میں اس حکم سے تھرّا اٹھے۔ مگر جہانگیر کی ابرو پر نہ بل تھا نہ شکن حالانکہ یہ وہی نورجہاں تھی جس کی پیشانی نازک پر ذرا سی گرہ پڑ جاتی تو جہانگیر بے چین ہو جاتا۔ واہ! کیا انصاف کیا تھا جہانگیر عادل نے! ملکہ نورجہاں کے قتل کا حکم دے دیا تھا! مگر سب درباریوں نے ہاتھ جوڑ کر شہنشاہ سے عرض کی کہ:۔

ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص   قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن

ملکہ نورجہاں رہا کر دی گئی۔ شہنشاہ نے دربار کو برخاست کیا اور آہستہ آہستہ سر جھکائے حرم کی طرف گیا جہاں نورجہاں اپنے تخت پر کسی سوچ میں غرق بیٹھی تھی۔

شہنشاہ جہانگیر نے آہستہ سے جھک کر ملکہ کے خوبصورت نازک پیروں کو چوم لیا اور کہا:۔

'تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من!'

ملکہ مسکرائی۔ اس نے شہنشاہ کو اپنے پیروں پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ میرے سرتاج ایک مغل بادشاہ کا باوقار سر کسی کے آگے بھی خم نہیں ہوتا۔ میری ملکہ! جہانگیر نے مسکرا کر جواب دیا۔ محبت اور حسن کے دربار میں شہنشاہوں کے سر بھی جھک جاتے ہیں!"

مسافر وہیں کھڑا دونوں کی باتیں سن کر مسکرا رہا تھا۔ اتنے میں شہنشاہ کی نگاہِ پُرجلال اس پر پڑی۔ مسافر بھاگنے کے لئے راہ ڈھونڈنے لگا۔ اس کی گھبراہٹ کو دیکھ کر جہاں پناہ کے چہرے پر ایک مسکراہٹ کھیل گئی۔ انھوں نے جیب سے کچھ جواہرات نکالے اور مسافر کی طرف پھینک دیے۔ مسافر اپنی گھبراہٹ اور پریشانی سب کچھ بھول گیا۔ وہ جلدی سے دوزانو ہو کر جواہرات بٹورنے لگا۔ اسے کسی نے زور سے ایک لات ماری۔ مسافر بلبلا اٹھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے آگے ایک سپاہی کھڑا ہے۔ مسافر نے اس کی کوئی پروا نہ کی جواہرات بٹورنے لگا۔ سپاہی کی ایک اور لات نے بے چارے مسافر کو حقیقت کی دنیا میں پہنچا دیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے دکھتے ہوئے کندھے پر گٹھڑی اٹھائی اور چپکے سے چل کھڑا ہوا۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

حیدرآباد کی نئی آبادی

(ڈاکٹر [illegible] صاحب [illegible] نے آج سے چار سال قبل یہ تقریر حیدرآباد ریڈیو سے نشر فرمائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے حیدرآباد کی معاشی زندگی کے ایک اہم پہلو پر عالمانہ نظر ڈالی ہے اور اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ چونکہ یہ تقریر اپنے موضوع کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے اس لئے ہم اسے سب رس میں شائع کر رہے ہیں)

بیسویں صدی کے ان پچھلے چالیس سال میں شہر حیدرآباد کیا سے کیا ہوگیا۔ سرکاری اور خانگی عمارتیں کتنی تیار ہوئیں شہر کی ہر سمت نئی نئی کتنی آبادیاں بسائی گئیں۔ یہ سب ایسے امور ہیں جن سے عام طور پر حیدرآباد کا ہر باشندہ واقف ہے۔ اس مختصر تقریر میں مجھے ان نئی آبادیوں کا محض ذکر کرنا مقصود نہیں۔ میں کوشش یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اقتصادی نقطۂ نظر سے ان کی طرف توجہ دلاؤں اور اگر ممکن ہو تو اس کا اندازہ کرنے کی کوشش کروں کہ یہ آبادیاں کن اثرات کے تحت وجود میں آئیں اور ان کے وجود سے ہماری سماج پر کیا اثرات پڑ رہے ہیں اور آئندہ پڑیں گے۔

حیدرآباد کی نئی آبادیوں کے وجود میں آنے کے خاص اسباب کا ذکر کرنے سے قبل تین چار ایسی عام سماجی قوتوں کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا جن کی ہر سماج تابع رہتی ہے۔

سب سے پہلے یہ امر قابل لحاظ ہے کہ بنی نوع انسان کی سماجی دنیا کے آغاز ہی سے بستیاں ہر وقت آباد اور برباد ہوتی رہی ہیں۔ ہر نئی آبادی کے ساتھ کوئی نہ کوئی پرانی آبادی اجڑتی رہی۔ دنیا کے چند خطے ایسے بھی ہیں جہاں تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ ایک بار نہیں سات سات مرتبہ یہاں نئی آبادیاں قائم ہوئیں۔ اپنے عروج کو پہنچیں اور برباد ہوگئیں۔ بقول شاعر کے ع

سیکڑوں شہر بسائے کئی ویران کئے۔

حیدرآباد کی آبادی کا یکایک پھیلنا اس پرانی دنیا کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ دنیا کے تقریباً ہر ملک کی تاریخ میں ایسے بہت سے دور پائے جائیں گے جن میں شوق تعمیر و وسعت آبادی نے چند ہی سال میں نئے نئے شہر آباد کر دئے۔ چنانچہ دکن میں بھی ابتداً ہندو راجاؤں نے اور بعد کو مسلمان بادشاہوں اور امرا نے کئی خوبصورت عمارتیں بنائیں جو اب تک ان کے عہد کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ اس حقیقت کو بھی جانتے ہیں کہ اسلامی سماج میں شوق تعمیر خاص طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ اسپین سے چین تک اور بخارا سے جاوا تک جہاں کہیں مسلمان رہے بسے وہاں انھوں نے نہ صرف مساجد اور خانقاہیں بنائیں بلکہ سرائیں اور محلات بھی کھڑا کئے۔ دوسرے ممالک کی طرح مغل بہمنی اور قطب شاہی اور آصفی عہد میں حیدرآباد کے مسلمانوں نے سیکڑوں عمارتیں تعمیر کیں جن میں سے کئی ایسی ہیں جو اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔

دوسرا قابل لحاظ امر یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کی نئی نئی ایجادات نے دنیا کے ہر طبقہ کی زندگی میں اس قدر سرعت کے ساتھ انقلابات پیدا کر دئے ہیں کہ گزشتہ تیس چالیس سال کی طرز زندگی پر بھی پوری طرح عمل پیرا رہنا ہمارے لئے غیر ضروری بلکہ ایک حد تک نا ممکن ہوگیا ہے۔ مثلاً گنجان بستیوں میں رہنا اس لئے لازمی تھا کہ حمل و نقل میں آسانی ہو، وقت پر ایک دوسرے

کا مدد کر سکیں اور آپس میں رابطہ قائم رہے۔ بائیسکل، موٹر، ٹیلیفون کی بدولت دور دور کے لوگ [illegible]
ہیں۔ ریڈیو کی بدولت جنگل میں بھی رہ کر دنیا بھر کی روزانہ خبریں اور موسیقی پروگرام اور تقریریں سننے کا موقع ملتا ہے۔
سمت کی سڑکوں نے موٹروں کی آمد و رفت کو اور بھی آسان کر دیا۔ یہ سب اور ایسی متعدد ایجادات بنی نوع انسان کی طرز معاشرت
پر اس قدر موثر ہیں کہ دنیا بھر میں لوگ گنجان بستیوں کو چھوڑ کر دور دور کشادہ مقامات پر سکونت اختیار کر رہے ہیں۔

شہر نیویارک میں ہزاروں لوگ ایسے ہیں جو دریائے ہڈسن کے اس پار رہتے بستے ہیں اور ہر روز موٹر کو جہاز پر سوار کر کے شہر نیویارک میں اپنے کاروبار کے لئے داخل ہوتے ہیں۔ لندن میں لاکھوں آدمی ریل کے ذریعہ اپنے مکانات سے کارخانو اور دفاتر کو آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان عظیم الشان شہروں کے علاوہ بھی شاید کوئی ایسا شہر ہو جس کی گنجان آبادی گزشتہ پچاس سال میں کشادہ میدانوں میں منتقل نہ ہوئی ہو۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ حیدرآباد کی آبادی کے پھیلنے میں یہ عالمگیر اثرات بھی شامل تھے۔

یہاں تک تو میں نے ان اقتصادی قوتوں کا ذکر کیا جو حیدرآباد کے باشندوں کو عام طور پر نئے نئے مکانات بنانے کے لئے اور نئی نئی بستیاں آباد کرنے کی طرف مائل کرتے آئے ہیں۔ بے شک یہ قوتیں ایسی ہیں جن کے خلاف عمل کرنا یا ان سے موثر نہ ہونا انسان کے لئے غیر ممکن ہے۔ باوجود اس کے یہ بھی ضرور ہے کہ صرف ان عام اثر قوتوں کی بنا پر حیدرآباد کی آبادی اس قلیل مدت میں اس قدر نہ پھیل سکتی اگر یہاں کوئی خاص وجوہ بھی آبادی کو پھیلنے کی ترغیب دینے کے لئے نہ ہوتے۔

ان خاص وجوہ میں پہلا نمبر ۱۹۰۸ء کی طغیانی کو دینا چاہئے جس میں ہزاروں گھر مسمار ہو گئے اور ہزاروں غریب اور متوسط درجہ کے لوگ خانہ برباد ہو گئے۔ اس حادثہ نے شاید پہلی مرتبہ حیدرآباد کے باشندوں کو مستقلانہ طور پر شہر کے باہر بسنے کی ترغیب دی۔ خود حکومت نے بھی کئی انسدادی تدابیر کیں اور جدید تعمیر کے کام کے لئے ایک محکمہ آرائش بلدہ قائم کیا۔ مدارالمہام وقت نواب سالار جنگ بہادر ثالث کی تحریک پر حضرت اقدس و اعلیٰ نے آرائش بلدہ کی اسکیم کو شرف منظوری بخشا جس کی وجہ سے غلیظ مکانوں کی جگہ اچھے مکانات بنائے گئے۔ سڑکیں کشادہ کی گئیں اور شہریوں کے لئے پارک اور چمن بھی لگائے گئے۔

آبادی کے منتقل ہونے کی ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ حیدرآباد میں چند سال تک متواتر طاعون اس شدت سے آیا کہ شہر چھوڑ کر باہر بسنا ہر امیر غریب کے لئے لازم ہو گیا۔ جنگ عظیم کی وجہ سے اس زمانہ میں تعمیر گرانی ہے۔ کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ پریشانی کے باعث اس ابتدائی زمانہ میں سلیقہ سے مکان بنانا [illegible] یہ بھی نہ خیال کیا گیا کہ مکان کی ساخت مضبوط اور دیرپا بھی ہے یا نہیں۔ اس لئے آرام و آسائش و دیرپائی و حسن کاری اس زمانہ کے بنے ہوئے مکانات میں عموماً بہت کم پائی جاتی ہے۔ اس صدی کے تیسرے دور میں یعنی جنگ عظیم کے چند سال بعد حالات کسی قدر بدلے طاعون اور انفلوئنزا جیسے آفات سماوی اس دہے میں مثل سابق شدت سے درپیش نہ آئے۔ اختتام جنگ کی وجہ ہر چیز ارزاں ہو گئی۔ اس لئے تعمیر امکنہ کی طرف از سر نو توجہ ہونے لگی۔ سکون کی زندگی اور سیر کرنے والوں کو [illegible]

[illegible] کی قسمت کے مطابق کے تحت جو مکانات بنائے گئے ان میں سے اکثر میں کوئی [illegible]
[illegible] ۔ جوبلی ہلز کا پہلا مکان "منجارہ ہیون" اسی تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ ہمارے [illegible]
[illegible] مکان بنانے کی بہت سی جدتیں پیدا کیں۔ سب سے پہلے انھوں نے مقام ہی ایسا [illegible] بلند
[illegible] کوئی مکان تھا ہی نہیں۔ دوسرے انھوں نے مکان کی چھت اور دیواریں ایسی بنائیں کہ پورا
[illegible] کی شکل اختیار کرلیا۔ "منجارہ ہیون" کی تعمیر کے بعد جوبلی ہلس پر جدت طرازی کا ایک بے پناہ سیلاب
آگیا۔ کوئی [illegible] سے مکان ڈھونڈ لایا کسی نے جرمنی میں مزدوروں کے لئے جو نئے مکانات بنائے جارہے تھے ان کے
نمونے کو دیکھ کر تعمیر شروع کی۔ کسی نے ستارے نا ہشت پہلو مکان بنا کر قسمت کی حسن کاری کا مقابلہ کیا۔

[illegible] کر اس دور نے نئے نئے گل کھلائے۔ محکمۂ آرائش بلدہ نے لال ٹیکری اور ماں صاحب کے تالاب کے تحت
تعمیرات کے پہلو کی ترقی میں جو تیاریاں کی ہیں ان کی طرف کسی نے توجہ نہ کی اور ان دس سال میں کم از کم دو ایسے محلے
میں تعمیر کئے جن کا آباد ہونا دس سال قبل ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ ایک تو منجارہ پہاڑیوں پر اور دوسرے حیدر گوڑہ کے
نشیب میں: اول الذکر اونچے مقام پر متمول لوگوں نے یکے بعد دیگر مکانات بنانا شروع کئے اور جن کی ہمت یا رسائی
وہاں تک نہ ہوسکی ان متوسط درجہ کے لوگوں نے حیدر گوڑہ کے مرطوب نشیب میں اس کثرت سے مکانات بنا ڈالے
کہ چند ہی سال میں محکمۂ آرائش بلدہ کا کام یہاں بھی از سر نو آغاز کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

اب اس کثرت تعمیر کے معاشی پہلو پر غور کیجئے۔ اراضیات خریدنا، ان پر مکانات بنانا اور مکانات کو کرایہ پر دینا،
یہ بھی سرمایہ کا ایک بڑا مصرف ہے۔ کوئی اپنے پس انداز کو تجارت میں لگا کر منافع کماتا ہے۔ کوئی صنعت میں کوئی بنک
میں رکھوا کر، کوئی مکان بنا کر۔ اگر معاشی اصول پر مکانات بنانے میں رقم صرف کی جائے تو بے شک فائدہ ہوتا ہے۔ فرض
کیجئے کسی نے بارہ ہزار کا مکان بنایا اور اس کا کرایہ پچاس روپے آتا ہے۔ تو معنی یہ ہوئے کہ مالک مکان کو پانچ
فی صد منافع ملتا رہا۔ اگر یہ شخص بنک میں یہ رقم دو سال کے وعدہ پر رکھ دیتا تو بھی اس سے بہت زیادہ فائدہ
دیتا۔ اسی طرح مکان کی مالیت پچیس ہزار ہو اور اس سے ایک سو روپے کرایہ ملے یا پچاس ہزار کے مکان سے
دو سو روپے کرایہ ملے تو دونوں صورتوں میں تخمیناً اسی پانچ فی صد حساب سے منافع ملتا ہے۔ لیکن بہت کم ایسے
مکان ہیں جن کی مالیت کے مطابق انھیں متواتر کرایہ دار میسر ہوتے ہیں۔ خانگی مکانات کی کثرت کا ایک اور سبب
بھی تھا۔

گزشتہ پچاس سال میں بلکہ سالار جنگ اول کے زمانہ سے آج تک سرکاری دفاتر اور ادارہ جات کی تعداد
روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ لیکن ان ادارہ جات کے لئے شہر حیدرآباد میں عمارتیں بہت کم تیار ہوئیں اور ہر نئے
دفتر کے لئے ایک خانگی مکان کرایہ پر لیا جانے لگا۔ سیکڑوں مکانات کی مالیت مشخص کی جاکر پانچ فی صد
کے حساب سے سرکار کرایہ ادا کرنے لگی اور سرکاری ضرورت کے مدنظر خانگی مکانات کے بھی کرائے بڑھ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

نواب مہدی نواز جنگ بہادر

بلکہ ان مکانوں میں اسی پر ہٹانے لگے کہ سرکاری ضروریات کے لئے کرایہ پر دیدیئے جائیں گے اور اگر ...
... کی طرح پر کرایہ پر دیدیئے جائیں گے۔

عام تجربہ ہے کہ کوئی مکان ابتدائی تخمینہ کے اندر تیار نہیں ہوتا۔ جس کسی نے خود مکان بنایا ہو یا ... کو مکان بناتے دیکھا ہو اس کی گواہی دے گا کہ دس ہزار کا مواز نہ بنایا گیا تھا۔ مکان تیار ہوتے ہوتے ... ہو گئے۔ نیتیجۃً دہلی میں بھی اکثر کا یہی تجربہ رہا اور وہ لوگ جن کی پوری پونجی دس ہزار ہی تھی وہ ... کر کے مقروض ہو گئے۔ باپ دادا کی متروکہ جائداد اور خاندانی زیورات رہن ہو گئے۔ اصل اور سود کی ادائیگی میں دن کا چین اور رات کی نیند جاتی رہی۔

ابتدائی تخمینہ سے تجاوز کیا جا کر جس قدر بڑا مکان بنایا گیا اسی قدر کرایہ دار فراہم کرنے میں دقت ہونا فطری تھا۔ بارہ ہزار کے مکان کے لئے پچاس روپیہ ماہانہ کرایہ ٹھیرا لیکن ایسا مکان سرکار کے علاوہ وہی شخص کرایہ پر لے سکتا ہے جس کی آمدنی پچاس سے دس گنی یعنی پانچ سو روپے ہو۔ یہ اور بات ہے کہ جوار کی روٹی کھا کر یا ایک چاول کا دانہ سونچھ میں لگا کر باہر نکلنے والوں کے متعدد دیکھتے تو ایسے آج بھی دو سو روپے ماہانہ کما کر پچاس روپے ماہانہ کے مکان میں رہتے ہیں۔ لیکن سرکار کے مقررہ اصول کے مطابق آمدنی کا دسواں حصہ کرایہ مکان کے لئے موزوں ہے۔ اس اصول کے مدنظر ملاحظہ فرمایئے ہمارے ملک میں پانچ سو روپے ماہانہ کی آمدنی والے کتنے لوگ ہیں۔ اور اگر ان سب کو نکال دیکھئے جن کے ذاتی مکانات ہیں تو پانچ لاکھ کی آبادی میں شاید ہی سو دو سو ایسے غریب الوطن نظر آئیں گے جن کو پچاس روپے کرایہ کے مکان کی ضرورت ہو۔ پھر اس طبقے کے ہزار روپے آمدنی والے یعنی ایسے اشخاص جو پچیس ہزار کے مکان کے لئے ایک سو روپے کرایہ آسانی سے دے سکتے ہوں، ان کی تعداد اور بھی کم ہوگی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے ملک میں سکونت کے مکان پر پچیس ہزار روپے صرف کرنا فائدہ مند نہیں ہے اس لئے کہ بجز سرکاری ضروریات کے بہت کم ایسے لوگ ہیں جو ایسے کرایہ پر لے سکیں۔

اب رہا یہ کہ خود کی سکونت کے لئے مکان استعمال کیا جائے۔ کرایہ پر دینے کے بجائے اگر مالک مکان خود مکان میں رہے تو معاشی نقطۂ نظر سے اس کے یہی معنی ہوئے کہ وہ خود اس کا کرایہ ادا کر رہا ہے۔ پانچ سو روپے کی آمدنی والے کو پچاس روپے بطور کرایہ ادا کرنا یا خود کی آمدنی والے کو پچاس روپے بطور کرایہ ادا کرنا یا خود بارہ ہزار کا مکان بنا کر اس میں رہنا سزاوار ہے۔ لیکن اگر یہی شخص پچاس ہزار کے مکان میں رہتا ہے خواہ وہ اس کا ذاتی مکان کیوں نہ ہو تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ دو سو روپے کرایہ ادا کر رہا ہے کیونکہ اگر یہی پچاس ہزار روپے وہ بینک میں رکھتا تو اسے دو سو روپے ماہانہ آمدنی ہو جاتی۔

محکمہ آرائش بلدہ نے جو نئے مکانات بنائے ہیں ان میں اسی اصول کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ دس روپے کی آمدنی والے کے لئے ایک روپیہ کرایہ سزاوار ہے۔ اس کے لئے مکان ڈھائی سو کا چاہئے۔ تیس روپے کی آمدنی والے کے لئے تین روپے

[illegible] کی اہمیت کا مکان چاہئے اور سو روپے آمدنی والے کے لئے ڈھائی ہزار کا مکان موزوں ہے۔ محکمۂ مذکور نے [illegible] کی رقم اور آمدنی کا اندازہ لگا کر تین درجوں کے مکانات بنائے۔ ہر ایک [illegible] متوسط طبقے کے آدمی کے لئے [illegible] ہوسکتے ہوں۔

[illegible] آباد میں جتنی لال بیٹھ بھی انہیں اصول کے تحت بسایا گیا۔ کاش حیدرآباد کے متمول اصحاب کا شوق تعمیر بھی [illegible] اختیار کرتا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔

البتہ پچیس سال کے متواتر تجربے کے بعد گزشتہ چند سال سے مکان بنانے والوں میں کچھ سلیقہ پایا جانے لگا ہے۔ ایک جرمن آرکیٹکٹ نے حیدرآباد میں دو تین ہی سال رہ کر اپنی مہر حیدرآباد کی طرز تعمیر پر لگادی اور حال ہی میں دو چار نوجوان ملکی آرکیٹکٹ نے مذاق تعمیر میں بہت کچھ اصلاح کی ہے لیکن ان اصحاب کو اب بھی ایسی ایسی فرمائشات سے سابقہ پڑتا ہے کہ وہ فنی اصول سے ہٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ہمارے گرم ملک میں بڑے بڑے کشادہ دالان نہایت موزوں ہوتے ہیں لیکن "جرمن فیشن" کے دلدادہ چھوٹے چھوٹے کمرے ہی پسند کرتے ہیں۔ ہمارے مکانات میں گرد، بارش، کیڑے پتنگے، سانپ، بچھو ان سب سے حفاظت چاہئے لیکن سمنٹ کانکریٹ کی جالیاں ایکا خوش نما بنائی جانے لگی ہیں کہ گرد، بارش، کیڑے پتنگے تو کجا پرند بھی ان میں سے داخل ہو کر گھونسلے بنا سکتے ہیں اور چوہے، بلیاں بھی مدعو ہوسکتی ہیں۔

سچ پوچھئے تو میں اس تعمیر کے اثرات کے (ہمارے سماج پر پڑ رہے ہیں اور آئندہ پڑیں گے) بارے میں زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ کچھ تو اس لئے کہ آپ کے کھانے کا وقت آپہنچا اور کچھ اس لئے کہ گھر ملو مسئلوں کے متعلق سوچ بچار کرنا ضروری بھی ہے اور خطرناک بھی۔ چونکہ کمزوری ہے میں نے اس موضوع پر تقریر کرنا قبول کیا۔ خطرناک ہونے کی وجہ سے تقریر کو یہیں پر ختم کرتا ہوں۔

ستاروں کے باشندوں کو یا متقدمین کو آپ جو چاہیں کہیں۔ آپ سے جواب طلبی نہ کی جائے گی۔ لیکن ساتھیوں کی فراست اور دور اندیشی پر لمحہ بھر بھی بدگمانی کیجئے تو آپ گردن زدنی کا حکم لگا دیں گے۔ اگر میں اس گناہ کا مرتکب ہوا ہوں تو معذرت چاہی جاتی ہے۔

امیر علی ہاشم

حیدرآباد ۔ اس کتاب میں عوام اور بچوں کے لئے شہر اور ریاست حیدرآباد کے ضروری حالات سادہ اور سلیس زبان میں درج کئے گئے ہیں۔ اس کے کئی ابواب ہیں جن میں آب و ہوا، پہاڑ، دریا، پیداوار، تاریخ، طرز معاشرت، صنعتیں، زبانیں، طرز حکومت، آثار قدیمہ اور ذرائع حمل و نقل کو خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی مرتبہ رفیعہ سلطانہ صاحبہ بی اے۔ جامعہ عثمانیہ ہیں جن کو انشا پردازی کا خاص ذوق ہے۔ قیمت ۱/

اشوک اعظم ۔ یہ کتاب مجلس ادبیات اطفال کی طرف سے طلبہ اور عوام کے لئے سلیس اور سادہ زبان میں لکھائی گئی ہے۔ محترمہ سیدہ مہدی جعفری صاحبہ بی اے (عثمانیہ) نے ہندوستان کے اس مشہور فرمانروا کے حالات زندگی اور کارنامے دلچسپ پیرائے میں قلمبند کئے ہیں۔ کتاب باتصویر ہے۔ قیمت ۸/

آگ

سادھو سنتوں کے میل جول سے بُرے بھی اچھے ہو جاتے ہیں۔ مگر پیاگ کی بدقسمتی تھی کہ اس پر اس کا الٹا ہی اثر ہوا۔ اسے گانجے، چرس اور بھنگ کا چسکا پڑ گیا۔ جس کا پھل یہ ملا کہ ایک محنتی اور جفاکش نوجوان سے وہ نکما اور نشہ باز بن بیٹھا۔ زندگی کے کارزار میں یہ آرام کہاں۔ کسی درخت کے نیچے دھونی جل رہی ہے۔ ایک لمبی جٹا والے مہاتما بیٹھے ہوئے ہیں۔ چیلے انہیں گھیرے بیٹھے ہیں اور تھوڑی تھوڑی دیر سے چرس کے دم لگ رہے ہیں۔ وقفہ وقفہ سے بھجن بھی ہو جاتے ہیں۔ مزدوری میں یہ عیش و عشرت کہاں۔ چلم بھرنا پیاگ کا کام تھا۔ چیلوں کو آخرت میں جنت کی امید تھی۔ لیکن پیاگ کو دنیا میں بھی پھل ملتا تھا۔ چلم پر پہلا حق اس کا ہوتا۔ مہاتماؤں کی پاک زبان سے بھگوان کی حمد و ثنا سنتے ہوئے وہ خوشی سے مست ہو جاتا۔ اس پر غشی کی حالت چھا جاتی اور وہ راگ اور رنگ سے بھری ہوئی ایک اور ہی دنیا میں پہنچ جاتا۔ اس کی بیوی رات کے دس گیارہ بجے اسے بلانے آتی تو پیاگ کو بہت برا معلوم ہوتا۔ اسے دنیا کانٹوں سے بھرے ہوئے جنگل سی دکھائی دیتی۔ لیکن گھر پہنچنے کے بعد جب اسے معلوم ہوتا کہ ابھی چولہا نہیں جلا ہے اور چنے چبینے کی کچھ فکر کرنی ہے۔ وہ ذات کا "بھر" تھا۔ گاؤں کی چوکیداری اس کی میراث تھی۔ دو روپے اور کچھ آنے تنخواہ ملتی تھی۔ وردی اور صافہ مفت۔ کام تھا، ہفتہ میں ایک دن تھانہ جانا، وہاں افسروں کے دروازوں پر جھاڑو دینا، اصطبل صاف کرنا اور لکڑی چیرنا۔ پیاگ خون کے گھونٹ پی پی کر یہ کام کرتا۔ کیونکہ جسمانی محنت اور روحانی اذیت دونوں کے لحاظ سے یہ نوکری اسے مہنگی پڑتی تھی۔ آنسو یوں پونچھتے کہ چوکیداری میں اگر کوئی کام تھا تو اتنا ہی۔ لیکن مہینہ میں چار دن کے لئے دو روپے اور کچھ آنے کم نہ تھے۔ پھر گاؤں میں بھی بڑے آدمیوں پر نہیں تو نیچوں پر رعب تھا۔ تنخواہ گویا وظیفہ ہو چکی تھی۔ اور جب سے مہاتماؤں کی صحبت نصیب ہوئی وہ پیاگ کے جیب خرچ کے مد میں آگئی۔ تارک الدنیا سنیاسی بن جانے کا شوق اور بڑھتا ہی گیا۔ ان سنت سنگوں کی صحبت میں آنے سے پہلے وہ گاؤں میں مزدوری کرتا تھا۔ رکمن لکڑیاں توڑ کر بازار لے جاتی۔ پیاگ کبھی "آرا" چلاتا، کبھی ہل جوتتا۔ کبھی "پور" ہانکتا۔ جو کام سامنے آجائے اس میں جت جاتا تھا۔ وہ ہنس مکھ، زندہ دل، خلیق اور جفاکش آدمی تھا۔ اور ایسا آدمی کبھی بھوکوں نہیں مرتا۔ اس پر لطف یہ کہ کسی کام کے لئے نہیں نہ کرتا۔ کسی نے کچھ کہا اور وہ "اچھا بھیا" کہہ کر دوڑتا۔ گاؤں میں اس کی عزت تھی اس کے اس سلوک کی وجہ سے قحط پڑ جانے پر بھی دو تین سال اسے کچھ زیادہ مصیبت نہیں اٹھانی پڑی۔ دونوں عالم کی تو اسے فکر ہی نہ تھی یہ طاقت تو مہاتماؤں کو بھی نہ نصیب ہوئی تھی۔ مہاتماؤں کے دروازوں پر بیلوں کی تین تین جوڑیاں بندھی تھیں تو پیاگ کس گنتی میں تھا۔ ہاں جو کی دال روٹی میں شبہ نہیں تھا، لیکن اب یہ بھی روز بروز کم ہوتی جاتی تھی۔ اس پر آفت یہ تھی کہ رکمن بھی کئی سبب سے اتنی شوہر پرست، اتنی فرمانبردار اور اتنی محنتی نہ رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں پریشان کن خیالات پیدا ہو چلے تھے۔ ادھر پیاگ کو بس یہی فکر تھی کہ کوئی نامعلوم قوت اسے زندگی کے بکھیڑوں سے نجات دلا دے، اور وہ اطمینان سے بھگوان کے بھجن اور سادھوؤں کی خدمت میں مست ہو جائے۔

ایک دن رکمن بازار سے لکڑیاں بیچ کر لوٹی تو پیاگ نے کہا۔ "لا کچھ پیسے مجھے دیدے .... دم لگا آؤں۔"

رکمن منہ پھیر کر بولی "دم لگانے کی ایسی چاٹ ہے تو کام کیوں نہیں کرتے کیا آج کل کوئی بابا نہیں ہیں۔ جا کر چلم بھرو۔"

پیاگ نے تیوری چڑھا کر کہا۔ "بھلا چاہتی ہے تو پیسے دیدے۔ ورنہ اس طرح تنگ کرے گی تو ایک دن کہیں نکل جاؤں گا۔ تب روئے گی۔ رکمن انگوٹھا دکھا کر بولی "روئے میری بلا۔ تم رہتے بھی ہو تو کون سونے کا قلعہ بنا دیتے ہو۔ اب بھی چھاتی پھاڑتی ہوں تب بھی چھاتی پھاڑوں گی۔" "تو اب یہی فیصلہ ہے؟" "ہاں ہاں! کہہ تو دیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

"گہنے بنوانے کے لئے پیسے ہیں اور میں چار پیسے مانگتا ہوں تو یوں جواب دیتی ہے۔" رکمن تنک کر بولی "گہنے بنواتی ہوں تو

تم ... کیوں بیٹھی ہے۔ تم نے تو چیل کا چھلا بھی نہیں بنوایا۔ اتنا بھی نہیں دیکھا جاتا۔"

پیاگ ... دن گھر نہ آیا تو رکمین کو فکر ہوئی۔ گاؤں بھر چھان آئی۔ چڑیا کسی اڈے پر نہ ملی۔ اس دن اس نے کچھ کھایا نہیں۔ رات کو لیٹی بھی تو بہت دیر تک آنکھ نہ لگی۔ ڈر ہو رہا تھا کہیں پیاگ نے سچ مچ کچھ کر تو نہیں لیا۔ اس نے خیال کیا۔ ... سویرے اٹھ کر ... چھان ڈالوں گی۔ کسی سادھو سنت کے ساتھ ہوگا۔ جا کر تھانے میں رپورٹ کر دوں گی۔

ابھی تڑکا ہی تھا کہ رکمین تھانے چلنے کو تیار ہوگئی۔ کواڑ بند کر کے نکلنی ہی تھی کہ پیاگ آتا ہوا دکھائی دیا۔ لیکن وہ اکیلا نہ تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک عورت بھی تھی۔ اس کی چھینٹ کی ساڑی، رنگی ہوئی چادر، لمبا گھونگٹ اور شرمیلی چال دیکھ کر رکمین کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ وہ ایک لمحہ ہکی بکی سی کھڑی رہی۔ پھر بڑھ کر عورت کو دونوں ہاتھوں کے بیچ میں لے لیا۔ اور اسے اس طرح آہستہ آہستہ گھر کے اندر لے چلی جیسے کوئی مریض زندگی سے ناامید ہو کر زہر کے گھونٹ پی رہا ہو۔

جب پڑوسیوں کی بھیڑ چھٹ گئی تو رکمین نے پیاگ سے پوچھا۔ "اسے کہاں سے لا دیئے؟"

پیاگ نے ہنس کر کہا "گھر سے بھاگی جاتی تھی۔ مجھے راستے میں مل گئی۔ گھر کا کام دھندا کرے گی۔ پڑی رہے گی۔"

"معلوم ہوتا ہے مجھ سے تمہارا جی بھر گیا"۔ پیاگ نے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "دھوت پگلی" اسے تیری خدمت کرنے لایا ہوں"

"نئی کے آگے پرانی کو کون پوچھتا ہے"۔

"چل۔ دل جس سے ملے وہی نئی ہے اور جس سے نہ ملے وہی پرانی۔ لا کچھ پیسے ہوں تو دیدے۔ تین دن دم نہیں لگایا۔ پیر سیدھے نہیں پڑتے۔ ہاں دیکھ دو چار دن اس بیچاری کو کھلا پلا دے۔ پھر یہ آپ ہی کام کرنے لگے گی"۔ رکمین نے پورا روپیہ لا کر پیاگ کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ دوسری مرتبہ مانگنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔

پیاگ میں اور چاہے کوئی گن ہو یا نہ ہو لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ہمدرد ضرور تھا اور اس نے لاپرواہی کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ ایک ماہ تک کسی قسم کا لڑائی جھگڑا نہ ہوا۔ رکمین اپنی ساری چوکڑیاں بھول گئی تھی۔ بڑے تڑکے اٹھتی۔ کبھی لکڑیاں توڑ کر، کبھی چارا کاٹ کر، کبھی اپلے پاتھ کر بازار لے جاتی۔ وہاں جو کچھ ملتا اس کا آدھا تو پیاگ کے ہتھے چڑھتا اور آدھے میں گھر کا خرچ نکل جاتا۔ وہ اپنی سوتن کو کوئی کام نہ کرنے دیتی۔ پڑوسیوں سے کہتی، "بہن سوتن ہے تو کیا۔ ہے تو ابھی کل کی آئی ہوئی۔ دو چار مہینے بھی آرام سے نہ رہے گی تو کیا یاد کرے گی۔ میں تو کام کرنے کو ہوں ہی"۔ گاؤں بھر میں رکمین کے نیک برتاؤ کے چرچے ہوتے تھے۔ لیکن من چلا اور گھاگھ پیاگ سب کچھ سمجھتا اور اپنے ارادوں کی کامیابی پر خوش ہوتا تھا۔

ایک دن اس عورت نے کہا۔ "بہن اب تو گھر میں بیٹھے بیٹھے جی اکتا گیا ہے، مجھے بھی کوئی کام دلا دو"۔

رکمین نے تشفی بخش آواز میں کہا۔ "کیا میرے منہ میں کالک لگوانے پر تلی ہو۔ گھر ہی کا کام کئے جاؤ۔ باہر کے لئے تو میں ہوں ہی"۔

سوتن کا نام کوشلیا تھا، جو بگڑ کر سلیا ہو گیا تھا۔ اس وقت تو سلیا نے کچھ جواب نہ دیا۔ لیکن یہ لونڈیوں سی حالت اب اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔ وہ دن بھر گھر کا کام کرتے کرتے مرے کوئی نہیں پوچھتا۔ رکمین باہر سے چار پیسے لاتی ہے تو گھر کی مالک بنی ہوئی ہے۔ اب سلیا بھی مزدوری کرے گی اور مالک پن کا گھمنڈ توڑ دے گی۔ پیاگ پیسوں کا یار ہے۔ یہ بات اس سے اب چھپی نہ تھی۔ جب رکمین چارا لے کر بازار چلی گئی تو وہ دروازہ پر ٹٹی لگا کر اور گاؤں کا رنگ ڈھنگ دیکھنے کے لئے نکل پڑی۔ گاؤں میں برہمن، ٹھاکر، کائستھ، بنئے سبھی تھے۔ سلیا نے بے بسی اور مجبوری کا کچھ ایسا ڈھونگ رچایا کہ

ساری عورتیں اس پر مہربان ہوگئیں۔ کسی نے چاول دیا، کسی نے دال، کسی نے کچھ۔ نئی بہو کی آؤ بھگت کون نہ کرتا۔ پہلے ہی دن میں سلیا کو معلوم ہوگیا کہ گاؤں میں کوئی پسنہارا نہیں ہے اور وہ اس کمی کو پورا کر سکتی ہے۔ وہ یہاں سے گھر لوٹی تو دھان کے سر پر گیہوں سے بھری ہوئی ایک ٹوکری تھی۔

پیاگ لے بجھات ہی سے چکی کی آواز سنی تو رکمین سے پوچھا "آج تو سلیا ابھی سے پیسنے لگی۔" رکمین بازار سے آٹا لایا کرتی تھی۔ اناج اور آٹے کے بھاؤ میں کوئی زیادہ فرق نہ تھا اسے خیال ہوا کہ سلیا اتنے سویرے کیا پیس رہی ہے۔ اٹھ کر چکی والی کوٹھری میں گئی تو دیکھا سلیا اندھیرے میں بیٹھی کچھ پیس رہی ہے۔ اس نے جا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ٹوکری اٹھا کر بولی "تجھے کس نے پیسنے کو کہا ہے، کس کا اناج پیس رہی ہے؟"

سلیا تیز ہو کر بولی "تم جا کر آرام سے سوتی کیوں نہیں۔ میں پیستی ہوں تو تمہارا کیا بگڑتا ہے۔ چکی کی گھر گھر بھی نہیں سنی جاتی۔ لاؤ۔ ٹوکری دے دو۔ بیٹھے بیٹھے کب تک کھاؤں گی۔ دو مہینے تو ہو گئے۔" "میں نے تو تجھ سے کچھ نہیں کہا۔" "تم کہو چاہے نہ کہو اپنا دھرم بھی تو کچھ ہے۔" "تو ابھی یہاں کے آدمیوں کو نہیں جانتی۔ آٹا پساتے تو سب کو اچھا لگتا ہے۔ پیسے دیتے روتے ہیں۔ کس کا گیہوں ہے۔ میں سویرے اس کے سر پٹک آؤں گی۔" سلیا نے رکمین کے ہاتھ سے ٹوکری چھین لی۔ اور بولی "پیسے کیوں نہ دیں گے۔ کچھ بیگار کرتی ہوں؟" "تو نہ مانے گی۔" "تمہاری لونڈی بن کر نہ رہوں گی۔" یہ تکرار سن کر پیاگ بھی آ پہنچا اور رکمین سے بولا "کام کرتی ہے تو کرنے کیوں نہیں دیتی۔ اب کیا زندگی بھر دلہن ہی بنی رہے گی۔ ہو تو گئے دو مہینے۔" "تم کیا جانو۔ ناک تو میری نہ کٹے گی۔" سلیا بول اٹھی۔ "تو کیا کوئی بٹھا کر کھلاتا ہے۔ چوکا برتن، جھاڑو داڑو، روٹی پانی، پیسنا کوٹنا یہ کون کرتا ہے۔ پانی کھینچتے کھینچتے میرے ہاتھوں میں گٹھے پڑ گئے۔ مجھ سے اب یہ سارا کام نہ ہوگا۔" پیاگ نے کہا۔ "تو تو ہی بازار جایا کر۔ گھر کا کام رہنے دے رکمین کر لے گی۔" رکمین بات کاٹ کر بولی "ایسی بات منہ سے نکالتے شرم نہیں آتی۔ تین دن کی دلہن بازار میں گھومے گی تو دنیا کیا کہے گی؟"

سلیا نے بے چین ہو کر کہا "کیا کہے گی دنیا۔ کیا کوئی عیب کرنے جاتی ہوں" سلیا کی جیت ہوگئی۔ رکمین کے ہاتھ سے اختیار نکل گیا۔ سلیا کی مختاری ہوگئی جوان عورت تھی۔ گیہوں پیس کر اٹھی تو اوروں کے ساتھ گھاس چھیلنے چلی گئی اور اتنی گھاس چھیلی کہ سب دنگ رہ گئیں۔ گٹھا اٹھائے نہ اٹھتا تھا۔ جن مردوں کو گھاس چھیلنے کا بڑا زعم تھا ان سے بھی اس نے بازی مار لی۔ یہ گٹھا بارہ آنے کو بکا۔ سلیا نے آٹا، چاول، دال، تیل، نمک، ترکاری اور مسالہ سب کچھ لیا اور چار آنے بچا لئے۔ رکمین نے سمجھ رکھا تھا کہ سلیا بازار سے دو چار آنے پیسے لے کر لوٹے گی تو اسے ڈانٹوں گی اور دوسرے دن سے پھر خود بازار جانے لگوں گی۔ پھر سے میری حکومت ہو جائے گی۔ لیکن جب یہ سارے سامان دیکھے تو آنکھیں کھل گئیں۔ پیاگ کھانے بیٹھا تو مسالے دار ترکاری کی تعریف کرنے لگا۔ مہینوں سے ایسی مزیدار چیز نصیب نہ ہوئی تھی۔ بہت خوش ہوا۔ کھانا کھا کر وہ باہر جانے لگا تو سلیا دروازے میں کھڑی تھی۔ بولا "آج کتنے پیسے ملے۔" "بارہ آنے ملے تھے۔" "سب خرچ کر ڈالے کچھ بچے ہوں تو مجھے دیدے۔" سلیا نے بچے ہوئے چار آنے پیسے دیدئے۔ پیاگ پیسے کھنکھناتا ہوا بولا "تو نے آج مالا مال کر دیا۔ رکمین تو دو چار پیسوں میں ٹال دیتی تھی۔" "مجھے گاڑ کر رکھنا تھوڑا ہی ہے۔ پیسہ کھانے پینے کے لئے ہے کہ گاڑنے کے لئے۔" "اب تو ہی بازار جایا کر رکمین گھر کا کام کرے گی۔"

رکمین اور سلیا میں جنگ چھڑ گئی۔ سلیا پیاگ پر اپنا قابو حاصل کرنے کے لئے جان توڑ کر محنت کرتی۔ پھر رات ہی سے اس کی

... گئی۔ دن نکلتے ہی گھاس لانے چلی جاتی۔ اور ذرا دیر ستا کر پھر بازار کی راہ لیتی۔ وہاں سے لوٹ کر بھی ... بیٹھی رہتی۔ کبھی کڑیاں توڑتی۔ رکمن اس کے کام میں برابر عیب نکالتی اور جب موقع ملتا تو گوبر بٹورکر اپنے ... میں ڈال دیتی۔ پیاگ کے دونوں ہاتھوں میں لڈو تھے۔ دونوں بیویاں اسے زیادہ سے زیادہ پیسے دینے لگیں اور ... اسے اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے دن رات کوشش کرتی رہتیں۔ لیکن سلیا کچھ اس مضبوطی سے جم کر بیٹھ گئی تھی کہ ... یہاں تک کہ ایک دن فریقین میں کھلم کھلا ٹھن گئی۔ ایک دن سلیا گھاس لے کر لوٹی تو پسینے میں تر تھی۔ پھاگن کا مہینہ تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ اس نے سوچا نہا کر بازار جاؤں گی۔ گھاس دروازہ ہی پر رکھ کر وہ تالاب پر نہانے چلی گئی۔ رکمن نے تھوڑی سی گھاس نکال کر پڑوس کے گھر میں چھپا دی اور گٹھے کو ڈھیلا کر کے برابر کر دیا۔ سلیا نہا کر لوٹی تو گھاس کم معلوم ہوئی۔ رکمن سے پوچھا اس نے کہا ”میں نہیں جانتی“ سلیا نے گالیاں دینی شروع کیں ”جس نے میری گھاس چھوئی ہو اس کے جسم میں کیڑے پڑیں۔ اس کے باپ اور بھائی مر جائیں۔ اس کی آنکھیں پھوٹ جائیں۔“ رکمن کچھ دیر تک تو ضبط کئے بیٹھی رہی۔ آخر خون میں ابال آ ہی گیا جھلا کر اٹھی اور سلیا کے دو تین طمانچے لگا دئے۔ سلیا چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ سارا محلہ جمع ہو گیا۔ سلیا کی خوبصورتی اور کام کاج سب ہی کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ وہ سب سے زیادہ گھاس کیوں چھیلتی ہے؟ سب سے زیادہ لکڑیاں کیوں لاتی ہے؟ اتنے سویرے کیوں اٹھتی ہے؟ اتنے پیسے کیوں لاتی ہے؟ ان باتوں نے اسے اپنے پڑوسیوں کی نظروں میں حقیر کر دیا تھا۔ سب اسی کو برا بھلا کہنے لگیں۔ مٹھی بھر گھاس کے لئے اتنا اودھم مچا ڈالا۔ اتنی گھاس تو آدمی جھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ گھاس نہ ہوئی سونا ہوا۔ تجھے تو سوچنا چاہئے تھا کہ اگر کسی نے لے بھی لیا ہے تو گاؤں گھر ہی کا۔ باہر کا کوئی چور تو آیا نہیں۔ تو نے اتنی گالیاں دیں تو کس کو دیں۔ پڑوسیوں ہی کو تو۔

اتفاق سے پیاگ اس روز تھانے گیا ہوا تھا۔ شام کو تھکا ماندہ لوٹا تو سلیا سے بولا — ”لا کچھ پیسے دیدے دم لگا آؤں تھک کر چور ہو گیا ہوں۔“ سلیا اسے دیکھتے ہی ہائے ہائے کر کے رونے لگی۔ پیاگ نے گھبرا کر پوچھا — ”کیا ہوا، کیوں روتی ہے؟ کہیں پتہ تو نہیں چل گیا۔ شوہر کے گھر سے کوئی آدمی تو نہیں آیا۔“

”اب اس گھر میں میرا رہنا نہ ہوگا۔ اپنے گھر جاؤں گی۔“ ”ارے کچھ منہ سے تو بول ہوا کیا۔ گاؤں میں کس نے گالی دی ہے۔ گھر پھونک دوں اس کا۔ چالان کروا دوں۔“

سلیا نے رو رو کر ساری کتھا کہہ سنائی۔ پیاگ پر آج تھانے میں خوب مار پڑی تھی۔ جھلایا ہوا تھا۔ یہ کتھا سنی تو تن بدن میں آگ ہی لگ گئی۔ رکمن پانی بھرنے گئی۔ وہ ابھی گھڑا ابھی نہ رکھنے پائی تھی کہ پیاگ اس پر ٹوٹ پڑا۔ اور مارتے مارتے بیدم کر دیا۔ وہ مار کا جواب گالیوں سے دیتی تھی۔ اور پیاگ ہر ایک گالی پر اور بھی جھلا جھلا کر مارتا تھا۔ یہاں تک کہ رکمن کے گھٹنے پھوٹ گئے۔ چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ سلیا بیچ بیچ میں کہتی جاتی تھی — ”واہ رے تیرا دیدہ — واہ رے تیری زبان۔ ایسی تو عورت ہی نہیں دیکھی۔ عورت کاہے کو ڈائن ہے۔ ذرا بھی منہ میں لگام نہیں۔“ لیکن رکمن اس کی باتوں کو جیسے سنتی ہی نہ تھی۔ اس کی ساری طاقت پیاگ کو کوسنے میں لگی ہوئی تھی پیاگ مارتے مارتے تھک گیا مگر رکمن کی زبان نہ تھکی بس یہی رٹ لگی ہوئی تھی ”تو مر جا۔ تیری مٹی نکلے۔ تجھے بھوانی کھائیں۔ تجھے مرگی آوے“ پیاگ رہ رہ کر غصہ میں تلملا اٹھتا اور آکر دو چار لاتیں جما دیتا۔ لیکن رکمن کو اب غالباً چوٹ ہی نہ لگتی تھی۔ وہ جگہ سے ہلتی بھی نہ تھی۔ سر کے بال کھولے زمین پر بیٹھی انھیں منتروں کا پاٹھ کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اب غصہ نہ تھا۔ صرف ایک قسم کی ہراسانی تھی۔ اس کی ساری روح بے بسی کی آگ میں جل رہی تھی۔

اندھیرا ہوا تو رکمن اٹھ کر ایک طرف نکل گئی۔ جیسے آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار نکل جاتی ہے۔ سلیا پک رہی تھی۔ اس نے اسے

جانتے دیکھا بھی لیکن کچھ پوچھا نہیں۔ دروازہ پر پیاگ بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ اس نے بھی کچھ نہ کہا۔

جب فصل پکنے لگی تو ڈیڑھ دو مہینے تک پیاگ کو کھیتوں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی۔ اسے کسانوں سے [illegible] ہل پیچھے کچھ اناج بندھا ہوا تھا۔ ماگھ ہی میں وہ کھیتوں کے بیچ میں تھوڑی سی زمین صاف کرکے ایک منڈھوا ڈال لیتا تھا اور رات کو کھا پی کر آگ چلم تمباکو اور چرس لئے ہوئے اسی منڈھوے میں پڑا رہتا تھا۔ جیت کے ختم تک اس کا یہی دستور رہتا۔ آج کل وہی دن تھے۔ فصل پکی ہوئی تیار کھڑی تھی۔ دو چار دن میں کٹائی شروع ہونے والی تھی۔ پیاگ نے دس بجے رات تک رکمن کی راہ دیکھی پھر یہ سمجھ کر کہ شاید کسی پڑوسن کے گھر سو رہی ہوگی اس نے کھا پی کر اپنی لاٹھی اٹھائی اور سلیا سے بولا۔ "کواڑ بند کرلے۔ اگر رکمن آئے تو کھول دینا اور سمجھا بجھا کر تھوڑا بہت کھلا دینا۔ تیری وجہ سے آج اتنا طوفان ہوگیا۔ مجھے نہ جانے اتنا غصہ کیسے آگیا۔ میں نے اسے کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہ چھوا تھا۔ کہیں کسی کنویں میں گر نہ پڑی ہو۔ کل آفت آجائے گی۔ سلیا بولی۔ "نہ جانے وہ آتی کہ نہیں۔ میں اکیلی کیسے رہوں گی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔" "تو گھر میں کون رہے گا۔ سونا گھر پا کر کوئی لوٹا تھالی اٹھا لے جائے تو؟ ڈر کس بات کا ہے۔ پھر رکمن تو آتی ہی ہوگی۔" سلیا نے اندر سے ٹٹی بند کرلی۔ پیاگ کھیتوں کی طرف چلا۔ چرس کی ترنگ میں یہ بھجن گاتا جاتا تھا۔

"ٹھگنی کیا نیناں چمکاوے

کدو کاٹ مردنگ بنائے	نیبو کاٹ منجیرا
پانچ تروئی منگل گائیں	ناچے بالم کھیرا
روپا پہن کے روپ دکھائے	سونا پہن رجھائے
گلے ڈال تلسی کی مالا	تین لوک برماوے

ٹھگنی کیا نیناں چمکاوے"

ٹھکانے پر پہونچتے ہی اچانک اس نے دیکھا کہ سامنے کھیت میں کسی نے آگ لگائی۔ ایک پل میں شعلے دہک اٹھے۔ اس نے چلا کر پکارا۔ "کون ہے وہاں۔ ارے یہ کون آگ جلاتا ہے۔"

دہکتی ہوئی آگ نے اپنے لپکتے ہوئے تیز شعلوں کی زبانی جواب دیا۔ اب پیاگ کو معلوم ہوا کہ اس کے منڈھوے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس کی چھاتی دھڑکنے لگی۔ اس منڈھوے میں آگ لگنا روئی کے ڈھیر میں آگ لگنا تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ منڈھوے میں چاروں طرف ایک ہاتھ ہٹ کر پکی ہوئی فصل کی چادریں سی بچھی ہوئی تھیں۔ رات میں بھی ان کا سنہرا رنگ جھلک رہا تھا۔ آگ کی ایک لپیٹ صرف ایک ذرا سی چنگاری سارے کھیتوں کو بھسم کردے گی۔ سارا گاؤں تباہ ہو جائے گا۔ انھیں کھیتوں سے ملے ہوئے دوسرے گاؤں کے کھیت بھی تھے وہ بھی جل اٹھیں گے۔ اوہ! لپٹیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اب سوچنے کا وقت نہ تھا۔ پیاگ نے اپنا اپلا اور چلم وہیں پٹک دیا اور کندھے پر لاٹھی رکھ کر بے تحاشا منڈھوے کی طرف دوڑا۔ مینڈوں سے جانے میں چکر تھا اس لئے وہ کھیتوں میں سے ہوکر بھاگا جارہا تھا۔ پل پل میں آگ بھڑکتی جاتی تھی اور پیاگ کے پاؤں اور بھی تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ کوئی تیز گھوڑا بھی اس وقت اسے پا نہ سکتا۔ اپنی تیزی پر اسے خود تعجب ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا پاؤں زمین پر پڑتے ہی نہیں۔ اس کی آنکھیں منڈھوے پر لگی ہوئی تھیں۔ دائیں بائیں اسے اور کچھ نہ سوجھتا تھا۔ بدحواسی نے اس کے پیروں میں پر لگا دئے تھے۔ نہ دم پھولتا تھا نہ پاؤں تھکتے تھے۔ تین چار فرلانگ اس نے دو منٹ میں طے کرلئے اور منڈھوے کے پاس جا پہونچا۔ منڈھوے کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ کس نے یہ کام کیا ہے؟ یہ سوچنے کا موقع نہ تھا۔ اسے کھوجنے کی

تباہ ہو [illegible] پیاگ سا کہاں رکیمن پر تھا گر یہ غصہ کا وقت نہ تھا۔ آگ کی لپٹیں شریر بچوں کی طرح ٹھٹھا مارتی اچھلتی کودتی کبھی [illegible] کبھی بائیں طرف۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لپیٹ اب کھیت تک پہونچی اب پہونچی۔ لپیٹیں غصہ سے کیا [illegible] بڑھتیں اور ناکام ہوکر دوسری مرتبہ بھر دگنی طاقت سے لپکتی تھیں۔ آگ کیسے بجھے! لاٹھی سے پیٹ کر بجھانے کا خیال تھا۔ [illegible] بڑی بیوقوفی کی بات تھی۔ پھر کیا ہوا فصل جل گئی تو پھر وہ کسی کو منہ نہ دکھا سکے گا۔ آہ! گاؤں میں کہرام مچ جائے گا۔ تباہی پھیل جائے گی۔ اس نے زیادہ نہیں سوچا گنواروں کو سوچنا نہیں آتا۔ پیاگ نے لاٹھی سنبھالی زور سے ایک چھلانگ لگا کر آگ کے اندر منڈھوے کے دروازے پر جا پہونچا۔ جلتا ہوا منڈھوا اپنی لاٹھی پر اٹھایا اور سر پر لئے چھوٹے سب سے چوڑی میڈ پر گاؤں کی طرف بھاگا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے کوئی آگ کا گولا ہوا میں اڑتا چلا جارہا ہے۔ پھوس کی جلتی ہوئی دھجیاں اس کے اوپر گر رہی تھیں۔ لیکن اسے اس کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ ایک بار ایک موٹی سی لکڑی منڈھوے سے الگ ہوکر اس کے ہاتھ پر گری۔ سارا ہاتھ جھلس گیا۔ اس پر بھی اس کے پاؤں پل بھر نہیں رکے۔ ہاتھ میں ذرا بھی ہچک نہ ہوئی۔ ہاتھوں کا ہلنا کھیتی کا تباہ ہونا تھا۔ پیاگ کو خود اپنی کوئی فکر نہ تھی۔ اگر ڈر تھا تو یہی کہ منڈھوے کا وہ حصہ جہاں لاٹھی کا کنڈا ڈال کر اس نے اسے اٹھایا تھا نہ جل جائے کیونکہ سوراخ کے پھیلتے ہی منڈھوا اس کے اوپر آگرے گا۔ آگ کے شعلے اسے بھسم کر ڈالیں گے۔ پیاگ یہ جانتا تھا اور ہوا کی چال سے اڑا جاتا تھا۔ چار فرلانگ کی دوڑ ہے۔ موت آگ کی صورت میں پیاگ کے سر پر کھیل رہی ہے اور گاؤں کی فصل پر۔ اس کی دوڑ میں اتنی تیزی ہے کہ شعلوں کا منہ پیچھے کو پھر گیا ہے اور ان کی دہکنے والی قوت ہوا کے تیز جھونکوں سے لڑنے میں ختم ہو رہی ہے۔ نہیں تو اب تک بیچ میں آگ پہونچ گئی ہوتی اور آہ وزاری مچ گئی ہوتی۔ ایک فرلانگ تو نکل گیا۔ پیاگ کی ہمت نے ہار نہیں مانی۔ وہ دوسرا فرلانگ بھی پورا ہوگیا۔ دیکھنا پیاگ دو فرلانگ کی اور کسر ہے۔ پاؤں ذرا بھی سست نہ ہوں۔ شعلے لاٹھی کے کنڈے پر پہونچے اور تمہاری زندگی کا خاتمہ ہے۔ مرنے کے بعد بھی تمہیں گالیاں ملیں گی تم قیامت تک آہوں کی آگ میں جلتے رہوگے۔ بس ایک منٹ اور! اب صرف دو کھیت اور رہ گئے ہیں۔ تباہی۔ لاٹھی کا کنڈا اوپر نکل گیا۔ منڈھوا نیچے کھسک رہا ہے۔ اب کوئی امید نہیں۔ پیاگ جان چھوڑ کر دوڑ رہا ہے۔ وہ کنارے کا کھیت آپہونچا۔ اب صرف دو سکنڈ کا اور معاملہ ہے۔ فتح و کامیابی کا دروازہ سامنے بیس ہاتھ پر ہے۔ ادھر جنت ہے ادھر دوزخ .... مگر وہ منڈھوا کھسکتا ہوا پیاگ کے سر پر آپہونچا۔ وہ اب بھی اسے پھینک کر اپنی جان بچا سکتا ہے لیکن اسے جان کی پرواہ نہیں۔ وہ اس جلتی ہوئی آگ کو سر پر لئے بھاگا جارہا ہے۔ وہ اس کے پاؤں لڑکھڑائے! ہائے! اب یہ آگ اور زندگی کا کھیل نہیں دیکھا جاتا۔

یکایک ایک عورت سامنے کے درخت کے نیچے سے دوڑتی ہوئی پیاگ کے پاس پہونچی۔ یہ رکیمن تھی۔ اس نے فوراً پیاگ کے سامنے آکر گردن جھکائی۔ اور جلتے ہوئے منڈھوے کے نیچے پہونچ کر اسے دونوں ہاتھوں پر لے لیا۔ اسی دم پیاگ بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ اس کا سارا منہ جھلس گیا تھا۔

رکیمن اس آگ کے الاؤ کو لئے ہوئے ایک سکنڈ میں کھیت کے کنارے پر آپہونچی مگر اتنی دیر میں اس کے ہاتھ جل گئے۔ منہ جل گیا اور کپڑوں میں آگ لگ گئی اس میں اب اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ منڈھوے کے باہر نکل آتی۔ وہ منڈھوے کو لئے ہوئے گر پڑی۔ اس کے بعد کچھ دیر تک منڈھوا ہلتا رہا۔ رکیمن ہاتھ پاؤں پھینکتی رہی۔ پھر آگ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مفہومِ آزادی

مفہوم غیر فہم کی تفہیم کیا کریں ! خالی ہوں جن کے ہاتھ وہ تقسیم کیا کریں

نیرنگِ اصطلاح میں الجھا ہو ضمیر مطلب نگار خانۂ الفاظ میں اسیر

بانگِ رحیل کیوں نہ قیادت پہ بار ہو احساسِ فرض، فرض کو جب ناگوار ہو

میری نظر میں قابلِ تحسیں ہیں وہ دماغ روشن ہیں جن کی فکر سے امید کے چراغ

کیا کم ہے یہ کہ، کشمکشِ بیش وکم تو ہے اعزاز و سربلندی کا باقی بھرم تو ہے

اوروں سے آج مانگ رہے ہیں ہمارے ہاتھ وہ حق جو ساتھ لائے ہیں اپنے جنم کے ساتھ!

دھن کی پیش رفت میں یاں انتشار ہے اور شانتی کی دیوی سمندر کے پار ہے

دورِ جدید مضحکۂ اضطراب ہے خود انقلاب منتظرِ انقلاب ہے

ہمت شکن نہیں، یہ حوادث، یہ مرحلے !

ناداں ! یہ ہیں طلسمِ سیاست کے زلزلے !

بشیر النساء بیگم بشیر

خوشی کے آنسو

شیشہ ایک پتھر سے ٹکرا کر چور چور ہوگیا' اور کارڈ تیل میں تر بتر ہوگیا تھا' بے چارہ لڑکا جس کا سن تخمیناً بارہ سال ہوگا مسلسل رو رہا تھا' دو ایک تماشائی اُسے گھیرے کھڑے تھے' میں جو دفعتاً باہر نکلا اُن محاصرہ کئے ہوئے ایک خضر صورت سے دریافت کیا
"حضرت! کیا تماشا ہو رہا ہے یہ"؟
آپ نے اپنی ریش مبارک کو چپکے سے کھجلاتے ہوئے فرمایا "سیکل سے ٹکر ہوگئی ہے"۔
"اور آپ تماشا دیکھ رہے ہیں" میں نے طنزاً مولانا کو ڈانٹ کر پوچھا' "کدھر گیا وہ سیکل والا"۔
ان میں سے ایک نے کہا "وہ تو چلتا بنا"
افسوس لڑکے کی حالت قابل رحم تھی' شیشہ کے ایک ٹکڑے سے اس کی انگلی زخمی ہوگئی تھی'
"ادھر آنا" میں نے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر کہا "اٹھاؤ اس تیل کے کارڈ کو رونے سے حاصل؟"
لڑکے نے ہچکی لیتے ہوئے کہا' اب تو رحمت آپا خوب مارے گی' دو روز سے گھر میں تیل کی ایک بوند بھی نہیں تم اپنے آنسو تو پونچھ ڈالو' میں اس کا بندوبست کئے دیتا ہوں' میں اسے اپنے گھر لے آیا۔
"تمہارا مکان یہاں کہاں ہے" میں نے لڑکے سے دریافت کیا'
"بازو والی گلی کے موڑ پر"
"اچھا یہ تو بتاؤ تمہارے والد کہاں ملازم ہیں؟" جواب حسرتناک ملا
"اللہ میاں کے پاس" ماں تو ایک ڈیوڑھی میں پڑھانے جاتی ہے"
تیل آنے پر میں نے لڑکے کے حوالے کیا۔ لیکن حیرت تو اس امر کی رہی کہ لڑکا یک لخت تیل لینے سے انکار کر گیا۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "میاں' اسے اپنے گھر لے جاؤ" — اور اس تیل کے معاوضہ میں سمجھو۔ جو گر گیا" وہ انکار کی صورت میں سر ہلاتے رہا۔ میرے زیادہ اصرار پر اس نے کہا "رحمت آپا مارے گی"!
میں نے کہا' "ارے بابا! — مار پڑے گی تو کہنا مت کہ بوتل ٹوٹ گئی تھی"

"جھوٹ بولنا پڑے گا"۔
"اس میں جھوٹ کی کیا بات ہے' مار سے تو بچ جاؤ گے"
"مار تو مجھ پر کسی صورت میں پڑے گی' سچ بولوں یا جھوٹ"
میں اس گفتگو پر حیران ہوگیا' "خیر بابا! تمہاری مرضی یہ تیل تو لے جاؤ"
"رحمت آپا سے پوچھ کر آؤں گا" لڑکا پھر وہی رٹ لگاتا ہوا اور چلتا بنا' میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ پانچ دس منٹ گزر گئے۔ لڑکا نہ آیا۔ ملازم کو میں نے لڑکے کی خبر لینے کے لئے بھیجا — وہ آکر کہنے لگا' لڑکے پر بُری طرح مار پڑی ہے۔ وہ باہر کھڑا رو رہا ہے' میں نے ملازم کو دوبارہ لڑکے کے بلانے کے لئے روانہ کیا تب بھی مایوسی ہوئی "عجیب لڑکا ہے" چونکہ مجھے لڑکے سے ایک قسم کی ہمدردی پیدا ہو چلی تھی۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اس کے گھر پہونچ کر راضی کروں' لڑکا تو مجھے آتا دیکھ کر اندر بھاگ گیا' ہم اس کے مکان کے دروازے پر پہونچ کر ایک لمحہ کے لئے خاموش کھڑا رہا۔ معمولی مختصر سا کھپریل کا مکان' لڑکے کا نام بھی مجھے معلوم نہ تھا۔ زنجیر کھٹکھٹانے پر آواز آئی — "جمیل دیکھ تو سہی کون آئے ہیں" کون ہیں آپ؟
"آپ کا ہمسایہ' پڑوسی"—
"کیا چاہتے ہیں آپ" وہی نسوانی آواز آئی۔
"غالباً آپ اس لڑکے کی آپا ہیں۔ دیکھئے تو آپ کے بھائی نے جو بوتل توڑ ڈالی ہے یہ اس کا قصور نہیں محض سیکل کی ٹکر ہو جانے سے یہ حادثہ پیش آیا ہے۔
آواز آئی۔ "آپ کی اس ہمدردی کا شکریہ!"
"شکریہ تو تیل لینے کی صورت میں قبول کیا جائے گا" میں نے جواب دیا' کوئی جواب نہ آنے پر میں اپنے گھر چلا آیا اور ملازم کے ذریعہ تیل بھجوا دیا۔

اس واقعہ کو کچھ دن گزر گئے' مجھے یاد نہیں' کسی کا مجھے شکریہ قبول کرنا پڑا تھا۔ میں مکان تبدیل کرکے ایک دوسرے محلہ میں مقیم تھا — اتفاق کی بات ہے ایک دن میں اپنی آنکھوں کا

[illegible] ہسپتال پہونچا، اپنے کام سے فارغ ہو کر باہر نکلا ــ کسی نے مجھے پکارا ــ مڑ کر دیکھا وہی میرا پڑوسی لڑکا تھا۔

" ارے جمیل! تم [illegible] ہو، کیسے آنا ہوا یہاں؟"

" ماں بیمار ہے" دوائی لینے آیا تھا"

" تمہاری رحمت آپا تو اچھی ہیں نا؟ اب بھی وہ کبھی کبھی تمہیں پیٹتی ہوں گی"

" جی ہاں" لڑکا بولا " ایک دفعہ رحمت آپا نے پھر مجھ پیٹا تھا ــ"

" بوتل توڑ ڈالی ہوگی تم نے"

" ہاں، ماں کی دوائی لا رہا تھا" وہ ایک ہوائی جہاز سر پر منڈلا رہے تھے، میں جو اوپر دیکھنے لگا گر ہو گئی"

" تب تو تم بڑے خراب آدمی ہو"

" آپ بھی یہی کہتے ہیں" اس نے کچھ افسردہ لہجہ میں کہا،

" اور کیا؟ اس طرح روز بوتلیں توڑ دیا کرتے ہو۔ جانتے ہو کتنی قیمت ہوتی ہے ان کی"

" رحمت آپا کہتی تھیں، چار چار آنے میں ایک آتی ہے"

" اس سے بھی زیادہ ــ اب احتیاط کرنا"

لڑکا تعمیل کی صورت میں سر ہلایا۔ مجھے جلدی تھی " اپنی رحمت آپا کو سلام کہنا" لڑکے سے میں نے کہا اور رخصت ہوا ــــ

جانے لڑکے کو میرے دفتر کا پتہ کیسے معلوم ہو گیا۔ شاید میرے سابقہ مکان دار نے بتلایا ہوگا۔ ایک دن وہ میرے پاس آ پہونچا ــ

" ارے جمیل!" میں نے تعجب سے دریافت کیا۔

لڑکا رونے لگا ــ

کیا ہوا تمہیں، ــ رحمت آپا نے مارا ہوگا، توڑ دی ہوگی کوئی بوتل۔

" نہیں" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولا ــ " ماں چل بسی"

" ارے کب؟"

" چار دن ہوئے"

" افسوس!" تمہاری آپا کا کیا حال ہے"

" کچھ نہ پوچھئے" کھانا پانی حرام ہو گیا ہے۔ زمین کا بچھونا ہو گئی ہے، آنکھوں سے رات دن آنسوؤں کی جھڑی لگی رہتی ہے"

" آہ ــ بیچاری ــ تم نے مجھے اس کی اطلاع کیوں نہ دی۔ شاید تمہ نہ معلوم ہوگا"

" جی ہاں، اب میں آپ کے مکان دار سے پتہ پوچھ کر یہاں تک چلا آیا"

لڑکے کو ہمراہ لئے فوراً اس کے گھر پہونچا۔ لڑکا میری آمد کی اطلاع کروانے اندر چلا گیا۔ مکان پر ایک قسم کی اداسی اور موت کی سی خاموشی طاری تھی اور اس فضا سے متاثر ہو کر میرا دل بھی افسردہ ہو چلا تھا۔ قریب سے مجھے سسکیوں کی آواز سنائی دی ــ لڑکی پردے کے قریب کھڑی رو رہی تھی۔ تعزیتی طور پر میں نے چند تسکین و صبر کے جملے ادا کئے۔ اس کا آدھے سے زیادہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ پردہ کی آڑ سے نظر آرہا تھا ــــ

میں نے کہا " رحمت! صبر و شکر سے کام لو ــ موت یقینی اور برحق ہے۔ خدا پر بھروسہ رکھو اور راضی برضا رہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اپنی والدہ کی بے وقت موت سے بے حد صدمہ گزرا ــ مجھے تم سے پوری پوری ہمدردی ہے ــ تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ جمیل تو میرا اپنا بھائی ہے ــ تم بلا پس و پیش اپنی ضرورت کا مجھ سے اظہار کیا کرنا ــ آخر میں تمہارا ہمسایہ ہوں۔ اور ہمسایہ کو ایک دوسرے پر پورے پورے حقوق حاصل ہیں

میں ہفتہ میں دو ایک مرتبہ اس کے گھر جاتا ــ کچھ سلائی اور پڑھائی کا کام رحمت کو مل گیا تھا۔ اب وہ قدرے سکون کی زندگی بسر کر رہی تھی۔

کچھ دنوں کے لئے میں اپنی والدہ کی علالت کے سلسلہ میں وطن چلا گیا تھا اور وہاں ایک ہفتہ گزار کر اپنے مستقر پہونچ گیا۔ دفتر کے چپراسی سے معلوم ہوا کہ جمیل ایک دو مرتبہ مجھ سے ملنے کے لئے آ کر گیا اور جب میں دفتر برخاست کر رہا تھا وہ آ پہونچا ــ

" اچھے تو ہو جمیل" میں نے خیریت دریافت کی۔

" ہاں ــ آپا نے آپ کو پوچھا ہے"

" کل چھٹی کا دن ہے، حاضر ہوں گا"

پہلی مرتبہ مجھے مکان کے اندر بلایا گیا ــ معمولی مختصر سا مکان، جس میں دیوان خانہ ہے نہ حمام، ایک چھوٹا سا دالان ــ جس کا کچھ حصہ باورچی خانہ کے لئے وقف کیا گیا تھا۔ صحن بہت چھوٹا ــــ

ہوا ہے ۔۔۔ مکان قرینہ سے سجا ہوا صاف ستھرا تھا۔ چٹائی
بچھی ہوئی دری اور اس پر پڑی ہوئی سفید چادر پر جمیل نے
لا بٹھایا اور خود باہر چلا گیا۔
"یہ جمیل کہاں چل دئے"۔۔۔
"بازار گیا ہے" پردے سے آواز آئی ۔۔۔ اس اثناء میں جمیل آگیا
"ارے میاں! یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے"۔۔۔ میں نے اپنے متعلق
کچھ اہتمام دیکھ کر کہا۔
رحمت آپا کہتی ہیں "کہ آپ کچھ کھائے بغیر یہاں سے نہیں جاسکتے"
"بھئی، تم اپنی رحمت آپا سے کہہ دینا، اس کی کیا ضرورت ہے" اب
مجھے جمیل کے بجائے رحمت سے یہ جواب ملا۔
"اور اس کی کیا ضرورت ہے کہ آپ خواہ مخواہ کے ہمارے لئے
تکلیف اٹھائے جاتے ہیں"
"ہمدردی کے معنی اگر تکلیف کے ہیں ۔۔۔ تو ایسی ہمدردی سے
باز آیا"۔۔۔ دو بڑی بڑی ہنستی ہوئیں آنکھیں، دفعتہً میری
نظروں نے پردہ کی آڑ میں ایک حسین مسکراتا ہوا چہرہ دیکھا۔
اف خدا! میری نظریں ٹھٹک کر رہ گئیں ۔۔۔ غیر ارادی
طور پر میرے منہ سے آہ نکل کر رہ گئی

جب میں رحمت کی دعوت کھا کر اپنے گھر روانہ ہوا،
میرے پیر ایک شرابی کی مانند لڑکھڑانے لگے، دل حسین
فضاؤں میں پرواز کر رہا تھا، اور آنکھوں میں ایک قسم
کی کیف آور خوشی ناچنے لگی، اب میں رحمت کی محبت کے حسین و
جمیل خواب دیکھ رہا تھا۔

ایک دن مجھے رحمت کی چٹھی ملی۔ کسی ضروری مشورہ
کے لئے اپنے گھر بلایا تھا۔ وہ تنہا تھی اور جمیل اسکول جاچکا تھا۔
وہ تو پردہ کی آڑ میں ہو گئی ۔۔۔ اور میں دری پر بیٹھ گیا "رحمت"
میں نے کہا اب جب کہ جمیل گھر پر موجود نہیں، مرا یہاں آنا کچھ
مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

"یہی تو مشورہ طلب کرنے کے لئے میں نے آپ کو تکلیف دی ہے"
بچہ ایک قریبی عزیز کل مجھ سے ملنے آئے تھے [illegible]
میں یہاں تنہا اور اکیلی پڑی رہتی ہوں زمانہ اچھا نہیں ہے
"پھر" میں کسی اور خیال سے چونک پڑا۔
"وہ کہتے ہیں، میں ان کے ساتھ وطن چلی جاؤں"۔
"اوہ! ۔۔۔ میری زبان سے نکلا "ٹھیک تو ہے"۔۔۔
"آپ بھی یہی مشورہ دیتے ہیں؟"
میرا مشورہ بھلا کیا وزن اور وقعت رکھ سکتا ہے۔ میں آپ کا
کوئی عزیز تو نہیں ۔۔۔ ایک اجنبی ہمسایہ ۔۔۔
"ایسی باتیں نہ کیجئے، مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے"
"جمیل کیا کہتا ہے اس بارے میں"۔۔۔
"وہ تو ایک منٹ کے لئے بھی راضی نہیں"۔۔۔ کل رات کہہ
رہا تھا میں تو فرید بھیا کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گا" نادان
کہیں کا، فرید بھیا تو کوئی اس کے بزرگ خاندان تو نہیں؟
"بزرگ خاندان ہو کر کونسے تیر مارے۔ باپ کو مر کر چار سال
ہوئے کسی نے ہمارے سروں پر شفقت کا ہاتھ رکھا تھا؟
جواب ماں کے چلے جانے سے اس تنہائی اور بیچارگی کا احساس
ہونے لگا ہے۔ سنئے! ہمارے لئے اس دنیا میں کوئی نہیں،
ماں باپ کے ساتھ ساتھ سارے عزیز و اقارب مر گئے" جملہ
کے اختتام پر اس کی آواز بھرائی۔
"رحمت" میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ نم آلود پلکوں کے
ساتھ تقریباً میرے سامنے تھی۔ اپنے آنسوؤں کو اس طرح
رائیگاں صرف نہ کرو ۔۔۔ "مجھے تمہیں اس طرح غمزدہ اور
پریشان دیکھ کر بڑی روحی تکلیف ہوتی ہے ۔۔۔ وعدہ
کرتا ہوں ۔۔۔ تم میری عزیز ترین دوست ہوئیں تھیں ۔۔۔ اپنی
زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا ہوں"۔
"آپ ۔۔۔ آپ ۔۔ اس کے لب تھرائے" شدتِ جذبات
سے وہ کانپ اٹھی۔
"آہ ۔۔۔ آپ کتنے اچھے ہیں، وہ صرف اتنا کہہ سکی"۔۔۔

[illegible] کے لئے [illegible] ——— خیالات کا حسین سہارا
[illegible] گھر پہونچا اور ساری رات پُرلطف خیالوں ———
[illegible] خوابوں میں گذری ———

ان دنوں گھر پر میری شادی کے تذکرے ہو رہے تھے۔ والد چاہتے تھے کہ لڑکی تعلیم یافتہ اور مالدار ہو ——— اور یہ صفات ان کی اپنی بھتیجی میں موجود تھے ——— والدہ کا خیال تھا کہ اپنی بہن کی لڑکی کو بہو بنائے جو ایک معمولی خاندان کی ——— معمولی پڑھی لکھی تھی ——— اسی کشمکش میں دو ایک مہینے گزر گئے ——— دونوں میں سے کوئی ایک بھی نتیجہ پر نہ پہونچ سکے بالآخر اس کا انتخاب میرے فیصلہ پر چھوڑ دیا گیا ——— اب میری آزمائش کا بڑا نازک وقت آپڑا ——— "فرض اور محبت" دو ایک دن میرے عجیب کشمکش میں گزرے ——— آخر کار رحمت کی محبت غالب آگئی۔ بہت جلد میں نے اپنے ارادے کا اظہار والدین سے کر دیا جس کو دونوں نے خوشی خوشی منظور کر لیا۔

ادھر یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ ان حالات سے رحمت قطعاً ناواقف تھی۔ ایک دن علی الصباح میں اس کے گھر پہونچا۔ اس حرکت پر مجھے سخت ندامت رہی کہ میں بلا کسی اطلاع بے تحاشا اندر داخل ہو گیا، وہ ہنوز بستر راحت پر دراز تھی، بیتابانہ میں اس کی طرف بڑھا "رحمت! پیاری رحمت آج سے تم میری ہو، صرف میری! دنیا کی کوئی بڑی سی طاقت بھی ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکتی۔ آج سے تمہیں اس کلفت بھری درد انگیز زندگی کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ اس غم خانہ کو مسرت کی دیوی جلد سے جلد تمہیں اپنی آغوش میں لینے کے لئے تڑپ رہی ہے۔ خوشیاں تم پر نثار ہونے کے لئے مضطرب ہیں"

رحمت، حسرت و مسرت کی درمیانی حالت میں مرمریں مجسمہ بنی کھڑی تھی، لیکن بہت جلد اس کی حیرت مسرت میں بدل گئی "ارے! کھڑی کیا ہو، جلد سے جلد سفر کی تیاریاں شروع کر دو ——— آج رات ہی کی ٹرین سے ہم وطن جا رہے ہیں، وہاں ہمیں عروسی لباس میں دیکھنے کے لئے والدین، نہایت بے تابی کے ساتھ منتظر ہیں" ——— وہ مسکرائی، جس طرح گلاب کی کلی نسیم صبح کے جانفزا جھونکوں سے مسکرا دیتی ہے۔ اس کی بڑی بڑی کیف آلود آنکھوں میں محبت آمیز جذبہ امنڈ آیا، اور دو انمول آبدار موتی دفعتہً ان آنکھوں میں نمودار ہو گئے ——— یہ "خوشی کے آنسو" اس کے جذباتِ محبت کے بڑی حد تک آئینہ دار تھے

صابر کوسگوی

تصحیح:۔ سب رس بابت اکتوبر [illegible] کے صفحہ (۱۲) پر مرزا ادیب کا ایک افسانہ "جائے پناہ" شائع ہوا ہے۔ افسانہ کے ختم پر مرزا ادیب کے نام کی بجائے سہواً مظفر حسین اظہر شائع ہوگیا ہے، براہِ کرم قارئین اس کی تصحیح فرمالیں

اڈیٹر

رات کا بھولا اور دیگر افسانے:۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے۔ ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو، فارسی، عربی مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں۔ مثلاً دنیائے افسانہ اور کردار افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ اس کتاب کا ٹائٹیل ملک کے بلند پایہ حسن کار مسٹر عبدالقیوم نے بنایا ہے۔ طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات (۱۶۸) قیمت عہ

[illegible]

[illegible] ایک [illegible] آپ کھو رہے ہیں [illegible] گولکنڈے کے ولی عہد کو کس چیز کی کمی ہے۔ حسن، شعر، شباب سب ہی [illegible] اور کیا چاہئے ظل اللہ۔

محمد قلی۔ وجہی یہ سب ہمارے درد کا مداوا نہیں۔ یہ ساری چیزیں ہماری نظر میں ہیچ ہیں اگر کوئی ہم سے "چچلم" میں ایک گھنٹہ گزارنے کے عوض یہ ساری راحتیں لے لے تو ہم خوشی دے دینے تیار ہیں۔ ایرانی یا افغانی حسن ہمارے لئے جاذب توجہ نہیں ہوسکتا وجہی۔

وجہی۔ ظل اللہ۔ ظل اللہ۔ آپ یہ کیا فرما رہے ہیں چچلم کی دیہاتی فضا گولکنڈے کے ولی عہد کے لائق نہیں۔ نہیں ظل اللہ۔

محمد قلی۔ سونے چاندی کی چمک نے تمہاری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ وجہی تمہاری آنکھیں اس حسن کو نہیں دیکھ سکتیں جو چچلم کے طول و عرض میں بکھرا ہوا ہے۔ "چچلم" آہ "چچلم" میرے خوابوں کا مندر کیا اب میرے لئے صرف اس کی یاد ہی باقی رہ جائے گی۔ نہیں یہ نہیں ہوسکتا ——

وجہی۔ جہاں پناہ!

محمد قلی۔ خاموش وجہی! ہم جائیں گے ہم چچلم ضرور جائیں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ابا جان ہمیں اس محل میں مقید کر کے رنگین کھلونے دل بہلائی کے لئے دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خوش ہیں۔ (بجلی کی کڑک! بادل کی گرج طوفانی ہواؤں کا شور)

محمد قلی۔ کوئی ہے۔ (قدموں کی آواز)

خادم۔ ارشاد۔ عالی جاہ!

محمد قلی۔ جاؤ ہمارا گھوڑا تیار کرو۔ ہم ابھی وقت جائیں گے جاؤ جلدی کرو ——

وجہی۔ حضور اس طوفان میں۔

محمد قلی۔ ہاں وجہی اسی طوفان میں —— طوفان و تلاطم ہمارا راستہ نہیں روک سکتے۔ ہمیں جانے دو۔ ہٹ جاؤ ہمارے راستے سے ہمیں جانے دو ——

(قدموں کی آواز)

—— دوسرا ایکٹ ——

(ظل اللہ۔ ظل اللہ۔ آواز قریب سے دور ہوتی ہوئی گزر جائے)

[طوفان و باد و باراں گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز قریب سے دور ہوتی گزر جائے طوفان باد و باراں اس کے ساتھ موسیقی بھی جاری رہے]

۱ کسی نے کہا ہے ؎
شمس و قمر کی روشنی دیر و حرم میں ہو تو کیا
مجھ کو تو تم پسند ہو اپنی نظر کو کیا کروں

۲ محبت کا دیوتا اندھا ہوتا ہے۔

۱ اسی لئے تیر چلاتے وقت مقامات اور مراتب کا لحاظ نہیں کرتا۔

۲ کہاں گولکنڈے کا ولی عہد کہاں چچلم کی رقاصہ۔

۱ لیکن جانتے ہو کوئی کام ....

۲ ہاں کوئی کام مشیت ایزدی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

۱ ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔

۲ نہ معلوم اس ملاپ میں کیا مصلحت ہے

۱ تم گولکنڈے کے ولی عہد کا دیدار بھی دیکھ چکے اب ادھر آؤ۔

۲ یہاں چچلم میں۔

۱ ولی عہد کے خوابوں کی جنت ہے یہ۔

۲ دیکھو وہ بھاگ متی اور اس کی خادمہ سندر۔

بھاگ متی۔ دیکھ رہی ہو سندر! کیسی طوفانی بارش ہے۔ موسیٰ ندی کو دیکھو کسی بپتا کی ماری سندری کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھ بن گئی ہے۔ آنسو ٹپکا اور بھو دنیا ڈوبی۔

سندر۔ نہیں دیوی! موسیٰ ندی چچلم کے پاپ دھو رہی ہے۔

بھاگ متی۔ نہیں معلوم سندر! یہ پاپ دھو رہی ہے یا اس کا سیلاب چچلم کو غرق کر کے رہے گا۔

سندر۔ نہیں دیوی چچلم کے بھاگ بھاگ متی سے وابستہ ہیں۔ وہ ڈوب نہیں سکتا۔ کون جانے آئندہ یہ کیا ہونے والا ہے (گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز دور سے)

دیوی دیکھئے! وہاں ...... اس طرف ..... وہ ایک سوار۔ ہاں وہی دیکھئے ادھر ہی آرہا ہے۔ اگر میری آنکھیں دھوکہ نہیں دے رہی ہیں تو میں سمجھتی ہوں اپنے ہی شاہزادے کا گھوڑا ہے۔

بھاگ متی۔ کیا کہا سندر؟ شاہزادے کا گھوڑا۔ پاگل تو نہیں ہو گئی۔ وہ بھلا اس طوفان میں چچلم آئیں گے۔ گولکنڈے کا شاہزادہ اور چچلم میں۔ قسمت کے کھیل بھی کیسے نرالے ہیں۔ (گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز قریب آجائے)

سندر۔ نہیں دیوی میری آنکھیں مجھے دھوکہ نہیں دے سکتیں۔ وہ ہمارے شاہزادے ہی ہیں اور ادھر آرہے ہیں۔

وہ چھپ کے اپنے احاطے میں آ گئے۔ شاہزادے
بھاگ متی ! سندر دروازہ کھول جلدی۔
(قدموں کی آواز میں جیسے کوئی آرہا ہے چند لمحے)
بھاگ متی ! جہاں پناہ - آپ - اس وقت یہاں ! - میں کوئی خواب تو نہیں دیکھتی -
محمد قلی - نہیں بھاگ متی یہ خواب نہیں حقیقت ہے - خواب کہہ کر ہماری لذت نظر کو کبھی تو کم نہ کرو
بھاگ متی ہائے آئی سندر - ٹھیک ہے۔ جہاں پناہ یہ خلعت بھیگ گئی ہے - آپ ذرا یہ تن پوش ---
محمد قلی بھاگ متی تمھیں ہمارا اتنا خیال -
بھاگ متی ! کنیز ہوں جہاں پناہ ---
محمد قلی - اچھا - لاؤ - (الیس منظر موسیقی چند لمحے)
بھاگ متی جہاں پناہ بھاگ متی کے بھاگ جاگ گئے جو آپ نے اس جھونپڑے کو رونق بخشی ...... لیکن ......
محمد قلی - لیکن کیا بھاگ متی ! تم کہتے کہتے رک کیوں گئیں کہو کیا کہنا چاہتی ہو -
بھاگ متی ! ظل اللہ ! میں سمجھتی ہوں میرے بھاگ جاگے ہیں منقریب سونے کے لئے - آپ میری زندگی پر شہاب ثاقب کی طرح چمک کر غائب ہو جائیں گے اور میری زندگی کو ہمیشہ کے لئے تاریک کر جائیں گے۔ بادشاہ سلامت ! اس وقت میں ایک سپنا دیکھ رہی ہوں خوش گوار جس سے مجھے جلد بیدار ہونا پڑے گا اس وقت میرے پاس کچھ نہ ہوگا سوائے چند حسین یادوں کے۔ آپ جب بادشاہ ہو جائیں گے - امور سلطنت میں منہمک ہو کر یہ بھی بھول جائیں گے کہ آپ بھاگ متی نام کی کسی ہستی کو پیار کرتے تھے۔
محمد قلی ! نہیں بھاگ متی ! یہ سپنا اس وقت حقیقت بن جائے گا - ہماری محبت کی ہم ایک دائمی یادگار بنائیں گے - تاکہ ہمارے بعد بھی آنے والی نسلیں ہماری پریم کہانی کو گاہ گاہ یاد کیا کریں - "پریم" فانی نہیں "امر" ہوتا ہے بھاگ متی - یقین ہے زمانہ کا بے رحم ہاتھ ہماری اس یادگار کو فنا نہیں کر سکے گا۔
بھاگ متی ! - آپ کس قسم کی یادگار بنائیں گے جہاں پناہ !
محمد قلی ہم تمھیں اپنی محبت سے غیر فانی بنا دیں گے بھاگ متی ! مادی روحانی دونوں طریقوں سے ہماری شاعری کا باعث تم ہو - لہٰذا جب تک اُردو زبان زندہ رہے گی - تم بھی زندہ رہو گی - اس وقت کا تصور کرو جب تمھارا ایک عظیم الشان خوبصورت شہر بن جائے گا جس میں ہر طرف علم و فضل کے چشمے بہیں گے - دیکھ لینا ہمارا بسایا ہوا یہ شہر جس کی بنیاد محبت پر ہے مستقبل میں ہندوستان کے لئے "مشعل راہ" ثابت ہوگا - یہاں امن اور شانتی، اتحاد و اتفاق کی سوتیں پھوٹیں گی - ادب و زبان تہذیب و ثقافت کی تعمیر ہوگی - یہ ہندوستان کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ کریگا۔

تیسرا ایکٹ

ع ۱ - اتنی گڑ بڑ کیوں ہے۔
ع ۲ - جانتے ہیں ! آج محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی کا دن ہے۔
ع ۱ - بھاگ نگر کے بانی کی تخت نشینی۔
ع ۲ - وہ ہو گیا داد و دہش ہے۔
ع ۱ - تب ہی تو جشن لے دولت کی زیادتی کے لئے گولکنڈہ کا انتقال کیا ہے۔
ع ۲ - وہ دیکھو آسمانی چتر کے نیچے بادشاہ کی سواری نظر آرہی ہے۔
ع ۱ - خاموش ! نگاہ روبرو -
ایک آواز ! - ادب سے نگاہ روبرو جہاں پناہ تشریف لاتے ہیں -
وجہی ! جہاں پناہ ! جان کی امان پاؤں تو ایک بات عرض کرنے کی جرأت کروں !
محمد قلی ! تمھیں امان ہے وجہی ! کہو کیا کہنا چاہتے ہو ---
وجہی ! جہاں پناہ ! گولکنڈہ کے تخت کو آپ نے اپنے قدم میمنت لزوم سے جو شرف بخشا ہے - بندہ اس کی خوشی میں چند اشعار سنانے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے۔
محمد قلی ! ہم خوش ہوئے وجہی شروع کرو۔
وجہی (تحت اللفظ شاعرانہ انداز میں پڑھتا ہے)

کتنے پادشاہی کیا نیں ہے یوں
کہ کرتا ہے اب قطب شاہ جیوں
بباشہ کے انصاف سے یوں دکن
کر بستا ہے پانی سے جوں پھول بن
شہی جوں کئے شاہ عالی جناب
نہ دارا کیا وو نہ افراسیاب

شہنشہ هذی قطب شاہ تو
شہاں سب تمارے کہ ہے ماو تو
ترا عدل ایسا ہوا ہے جگ ہار
کہ آگ اور پانی رہے ایک ٹھار
محمد قطب شہ ترا ناؤں ہے
ہما سو ترے پاؤں کا چھاؤں ہے
تو گیانی تو دانی تو داتا رہے
تو فاضل تو کامل تو اوتار ہے
تو ایسا سخی ہے ترے دھرم سے
دریا لائے کف ہنوز پر شرم سے

محمد قلی ! وجہی ہمیں تم پر رشک آتا ہے۔ کوئی ہے۔ (حاضر جہاں پناہ) جاؤ وجہی کو سونے میں تولو۔ اچھا اب دربار برخواست کیا جاتا ہے۔ وجہی تم ابھی ٹھیر و۔ ما بدولت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

وجہی ! ارشاد عالی جاہ !

محمد قلی ! دیکھو وجہی ! اب ہم خود مختار ہو گئے ہم اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں۔ ہم بھاگ متی کو گولکنڈہ کی ملکہ بنانا چاہتے ہیں۔

وجہی ! بہت مناسب ہے حضور ! اگر آپ اجازت دیں تو ایک نذر پیش کرنے کی جرأت کروں۔

محمد قلی ! تمہیں اجازت ہے وجہی ! پیش کرو کیا پیش کرنا چاہتے ہو ——

وجہی ! جہاں پناہ آپ کی محبت کی یادگار ہیں۔ ایک مثنوی "قطب مشتری" لکھی ہے۔ وہ میں اس وقت حضور کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

محمد قلی ! بہت خوب ! نہایت اچھی ! وجہی اس کے ساتھ تم نے اپنا نام بھی زندۂ جاوید کر دیا۔ یہ اپنے زمانے اور زندگی کی ترجمان ہے۔ وجہی اسے تم نے جس زبان میں لکھا ہے معلوم ہوتا ہے ایک دن یہ زبان سارے ہندوستان پر چھا جائے گی۔

—— چوتھا ایکٹ ——

[فلمی ریکارڈ لگایا جائے 'آیا بسنت سکھی برہا کا انت سکھی بن بن میں چھائی بہار]

(اس کے بعد مختلف پرندوں کو ئل پپیہے وغیرہ کی پکار کا صوتی اثر پیش کیا جائے)

ع۱ بسنت آگیا

ع۲ ہاں بسنت آگیا۔ محمد قلی کی جیون پھلواری میں بسنت آگیا۔

ع۱ دیکھو شاہی محل میں بسنت منائی جا رہی ہے

ع۲ یہ قطب شاہی دور کی خصوصیت ہے۔ تیوہار ایسے ہیں جن میں بلا اختلاف مذہب و ملت سب حصہ لے سکتے ہیں۔

بھاگ متی ! اب معزز ملکہ حیدر محل ہے۔

ع۲ دیکھو جہاں پناہ اور ملکہ حیدر آباد فرخندہ بنیاد کے نئے محل کو طور میں داخل ہو رہے ہیں

(نقیبوں کی آوازیں دور سے آتی ہیں)

سندر (دوڑی ہوئی آکر) ملکہ جہاں پناہ تشریف لا رہے ہیں اور آپ یہاں ——

بھاگ متی ! ہاں سندر موسیٰ کی روانی نے مجھے اپنے معمار کے ساتھ آج سے تین سو سال آگے پہونچا دیا گیا۔ میں سوچ رہی تھی اب سے دو تین سو سال بعد یہ نو تعمیر شہر کتنا بدل جائے گا۔ کیا اس وقت ہماری پریم کہانی یاد رہے گی۔ سندر ! جو اس شہر کی بنیاد کا باعث ہوئی۔

سندر - پریم کی یہ کہانی بھلائی نہیں جا سکتی ملکہ۔ وہ دیکھئے جہاں پناہ تشریف لا چکے ہیں۔

(نقیبوں کی صدا بہ قریب آجاتی ہیں اس کے بعد قدموں کی آواز)

محمد قلی - ملکہ دیکھو ہم نے بسنت کی تقریب میں آج ہی یہ نظم کہی ہے۔ ہم اسے شاہی مطرب سے سننا چاہتے ہیں۔ کوئی ہے ——

(دو قدم آنے کی آواز)

ملازم - خداوند !

محمد قلی - شاہی مطرب کو حاضر کرو ——

(قدموں کی آواز گیا جیسے کوئی جا رہا ہے)

محمد قلی - ملکہ آج ہم بہت خوش ہیں - یہ ہماری پہلی بسنت ہے۔ ہماری جیون پھلواری کی پہلی بسنت۔

ملازم - خداوند شاہی مطرب حکم کا منتظر ہے

محمد قلی - اجازت ہے شروع کرو ——

مطرب کا گانا۔

بسنت کا پھول کھلیا ہے سو جیوں یاقوت رمانی
کرو مل کر سہیلیاں سب بسنت کے تائیں جہانی
نزاکت شعر کے فن میں خدا بخشا ہے تو تج کوں
معانی شعر تیرا ہے کہ یا ہے شعر خاقانی

(گانا فیڈ آؤٹ ہو جائے اور اس کے بعد روشن چوکی وغیرہ کی آوازیں شروع ہو کر پس منظر میں ہو جائیں)

ع۱ آج سارے بھاگ نگر میں دوہری خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔

ع۲ ایک بسنت دوسرے بادشاہ کی شخصی مسرت

ع۱ یہ ماحول اسی طرح شاداں و فرحاں رہے گا

ع۲ یہاں ہمیشہ امن و چین، اتحاد و اتفاق کی فضا قائم رہے گی۔

——(جھنکارہ)——

رفیعہ سلطانہ (عثمانیہ)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تنقید و تبصرہ

یہ دنیا ہے از نجم الدین صاحب شکیب۔ حجم ۱۶۲ صفحے قیمت عہ ناشر - کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنو۔

جناب نجم الدین شکیب نے ناول "یہ دنیا ہے" نہیں لکھا بلکہ زندگی کی مختلف پیچ پیچ راہوں کے چند نشانات دکھائے ہیں۔ روح محلوں کی رنگیلی دنیا، عورت کے مختلف روپ، سرمایہ دار کی بوالہوسی، مزدور کی غیرت، قسمت کے کھیل، تدبیر کی بے بسی، لیڈری کی اصلیت، مذہب کا جنون، طوائف کا دکھ اور سماج کے گندے رستے اور ناسور سبھی اس تصویر میں آپ ابھرا دیکھیں گے۔ اس کے کردار تخیلی نہیں بلکہ موجودہ دور کے زندہ کردار ہیں۔ ہر گناہ کی تفصیل موجود ہے۔ لیکن پڑھ کر گناہ سے رغبت نہیں نفرت محسوس ہوتی ہے۔ یہی ایک لکھنے والے کا کمال ہے۔ لاکھوں گناہ کرنے والا محوری کردار اپنے ضمیر کی وجہ پاکباز ہی رہا

زبان ستھری ہے، طرز بیان دلچسپ۔ بعض جملے تو نہایت نفیس و نازک ہیں۔ "گناہ اتنا نیچا نہیں جتنے گناہگار کے آنسو اونچے۔" اور "مذہب روح کی آواز نہیں جسم کا لباس بن گیا ہے۔" کہیں کہیں بے ربطی بھی ضرور ہے۔ اگر قابل مصنف نے کتاب کے مختلف باب قائم کئے ہوتے تو بہتر تھا۔ کہانی کی ابتدا اور عروج نہایت شاندار ہیں۔ لیکن خاتمہ کمزور ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ آخری حصہ نہایت جلدی میں لکھا گیا ہے۔ اختتام بھی ابتدا کا سا ہوتا تو ناول زیادہ موثر ہوتا۔ کیونکہ ناظر پر آخری حصہ ہی زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ شکیب آئندہ اس سے بہتر لکھ سکیں گے۔ ان کی یہ دنیا تو کافی کامیاب ہے۔

وہاں از مرزا سرفراز علی بی اے (عثمانیہ) ایچ۔ ڈپ۔ ایڈ (ڈبلن) حجم ۲۰۰ صفحے قیمت عہ - ناشر - کتاب خانہ انجمن ترقی اردو عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

مرزا صاحب کے بارہ مختصر اور نہایت مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ سب مختلف پرچوں شہاب، نگار، داستان گو، مجلہ عثمانیہ اور مجلہ طیلسانین میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مرزا صاحب کے طالب علمی کے افسانے ہیں۔ اس لئے بار بار خامکاری کا احساس ہوتا ہے۔ طرز بیان شگفتہ اور پلاٹ میں اکثر جان ہے۔ لیکن افسانوں کو اچھی طرح بنایا نہیں گیا۔ خصوصاً ہر افسانہ کا اختتام نہایت کمزور ہے۔ "دیار مغرب" اس مجموعے میں نہایت دلچسپ ہے۔ "اور غلط فہمی" باوجود مختصر ہونے کے نہایت حسین ہے محاورہ کی غلطیاں زیادہ ہیں۔ مرزا صاحب اگر اب لکھیں تو یقیناً ان افسانوں سے کہیں زیادہ بہتر لکھ سکیں گے۔

اتحادی افسانے از جناب حکیم مظفر حسین اظہر دہلوی۔ حجم ۲۰۶ صفحے قیمت عہ۔

ناشر - شاعری کالج۔ اندرون لوہاری دروازہ انارکلی۔ حلقہ (۳۹) لاہور۔ یہ اتحادی افسانے موجودہ اتحادیوں کے متعلق افسانے ہیں جو جنگ عالمگیر لڑ رہے ہیں۔ بلکہ ہندو مسلم اتحاد کی سیدھی سادھی پرانی کہانیاں ہیں۔ طرز بیان بغیر عشق و محبت کے بھی دلچسپ بنایا جا سکتا تھا۔ بچوں کے لئے یہ قصے مفید تاریخی مطالعہ ثابت ہوں گے۔ اظہر صاحب ہندو مسلمانوں کو ان کی پرانی دوستی کی یاد دلا رہے ہیں۔ لیکن پیرایہ دلچسپ ہوتا تو بہتر تھا۔

انقلاب از ڈاکٹر اعظم کریوی۔ حجم ۱۷۲ صفحے۔ قیمت عہر ناشر - کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنو۔

ڈاکٹر اعظم کریوی نے اپنے بارہ ایسے مختصر افسانوں کو یکجا کیا ہے جن کا محوری خیال "انقلاب" ہے۔ ڈاکٹر صاحب اردو افسانہ نویس کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں۔ پریم چند کے انداز پر لکھنے والوں میں اب سب سے آگے ہیں۔ ہندوستانی تہذیب ان کے ہر افسانہ میں سانس لیتی ہے۔ موجودہ ترقی انھیں پسند نہیں کیونکہ یہ ہمیں زیادہ سے زیادہ خود بیں اور زر پرست بنا رہی ہے۔ وہ بصیرت کھو کر بصارت لینا نہیں چاہتے۔ آنکھیں اندھی رہیں لیکن دل روشن۔ یہی حقیقی کامیابی ہے۔ مادہ پرست تہذیب نے کونسا انقلاب پیدا کیا ہے؟

وہ اپنے ہر افسانہ میں اسی کی تفسیر کرتے ہیں۔ سرورق عنوان کی اچھی تشریح کرتا ہے "دن کی روشنی میں" زیرِ نظر مجموعہ کا سب سے اچھا افسانہ ہے۔ زبان بے عیب ہے۔

لینن | ترجمہ تمنائی۔ حجم ۴۰ صفحے۔ قیمت ۸/
ناشر:۔ نیا سنسار کتاب گھر۔ بانکی پور۔ پٹنہ

اسٹالین کی نظروں میں لینن کا کیا مقام ہے؟ وہ اس کتابچہ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔ لینن کی زندگی نے روس کو کیونکر زندہ کیا اور مر کر بھی وہ کیسے زندہ ہے؟ اسٹالین نے اپنے مختلف مضامین میں اس کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ بڑے آدمیوں کی زندگی کا مطالعہ پڑھنے والوں کے کردار پر نامحسوس لیکن تعمیری اثر ڈالتا ہے۔ نئے ادب کے ترقی پسند عنصر کو سمجھنے کے لئے تو لینن کا سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ "لینن انقلاب کا تخلیق کار" اس مجموعہ کا سب سے بہتر مضمون ہے۔ لیکن یہ کتابچہ لینن کے مکمل حالات پر روشنی نہیں ڈالتا۔ صرف اس کے کردار کے چند پہلو روشن کرتا ہے۔

سرگذشت حاتم | مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ۔ حجم ۱۲۸ صفحے۔ قیمت عاں
ناشر:۔ سب رس۔ کتاب گھر۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن۔

ڈاکٹر صاحب نے دہلی کے پہلے اردو شاعر اور استاد الشعرا شاہ ظہور الدین حاتم کے حالاتِ زندگی نہایت تحقیق و تفصیل سے لکھے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کے کلام پر ذمہ دارانہ تبصرہ کیا ہے۔ حاتم، سودا اور تاباں جیسے اساتذہ کے استاد تھے۔ نظم و غزل دونوں میں ملکہ حاصل تھا۔ اُن کا یہ شعر اردو شاعری کے ایامِ طفلی میں کہا گیا تھا ؎

برس میں وہ کبھی برسے ہے، یہ برسوں سے برسے ہے
مقابل مت کرو باراں سے میری چشم گریاں کو

اردو شاعری کے ان محسنوں کو زمانہ نے اگر بھلایا نہیں تو ان کے شایانِ شان یاد بھی نہیں رکھا۔ ضرورت ہے کہ ان کے حالات روشنی میں لائے جائیں۔ حاتم کو ان کا یہ تذکرہ یقیناً حیاتِ نو بخشے گا۔

نمود و راز | مصنفہ محترمہ آنسہ محمودہ رضویہ۔ دیدہ [illegible]
حجم ۲۰۹ صفحے۔ قیمت عاں
مقام اشاعت:۔ دارالاشاعت انجمن ترقی اردو۔ کراچی۔

"نمود و راز" آنسہ محمودہ رضویہ صاحبہ کراچی کے لکھے ہوئے چند مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے بھی موصوفہ نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ طرزِ بیان کو دلکش و حسین بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن فارسی ترکیبوں کا بے جا استعمال ضرور کھٹکتا ہے۔ افسانوں میں حقیقت سے زیادہ تصور سے کام لیا گیا ہے۔ ہم رضویہ صاحبہ سے آئندہ اس سے بہتر کی امید رکھتے ہیں۔ کراچی سے نسوانی ادب کی یہ پہلی شعاعیں ہیں۔ اس حیثیت سے موصوفہ کے افسانے قابلِ تعریف ضرور ہیں۔

گھی شکر | از جناب محمد شفیع الدین نیر
حجم ۵۱ صفحے۔ قیمت ۶/ مقام اشاعت:۔ جامعہ ملیہ (دہلی)

اس کتاب میں نیر صاحب نے بچوں کے لئے سادہ و منظوم معمّے لکھے ہیں۔ ہر نظم "میں کیا ہوں بتلاؤ تم پھر گھی و شکر کھاؤ تم" سے شروع ہوتی ہے۔ بچے نظم پڑھ کر خود ہی پہیلی بوجھ سکتے ہیں۔ ایسی نظمیں بچوں کو بہت زیادہ پسند ہوتی ہیں۔ جس میں انھیں اپنی عقل سے بھی کام لینا پڑے۔ کتاب کے آخر میں ہر نظم کا حل تصویروں کی شکل میں موجود ہے۔ 'مور' اور 'کتاب' والی نظمیں تو بے حد اچھی ہیں۔ یہ بچوں کو گھی شکر سے تو کیا چاکلیٹ اور ٹافی سے بھی بڑھ کر پسند آئیں گی۔ امید کہ نیر صاحب آئندہ بھی بچوں کے لئے اس قسم کا ادب مہیا کرتے رہیں گے۔

نئی کہانیاں | از جناب محمد شفیع الدین نیر
حجم ۶۴ صفحے۔ قیمت ۹/ سرورق رنگین۔ طباعت اچھی۔
مقام اشاعت۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ۔ دہلی

بچوں کے محبوب شاعر جناب نیر نے ننھے بچوں کے لئے نہایت اچھی منظوم کہانیاں لکھی ہیں۔ زبان آسان ہے۔ تصویروں سے جابجا نظموں کی تشریح بھی کی گئی ہے "کہانی ہے یہ موٹر کی" اور "ضدی بچہ" تو نہایت پیاری نظمیں ہیں۔ یہ کہانیاں صرف

کہانیاں [illegible] بچوں کے لئے معلومات کا دلچسپ ذخیرہ بھی ہیں۔
کچھ [illegible] مبارک باد ہے کہ اس نے ننھے بچوں کے لئے اس
قسم کی نہایت عمدہ کتابیں شائع کی ہیں۔ ہمارے ہندوستانی
بچوں کو اس قسم کے پاکیزہ اور آسان ادب کی بہت ضرورت
ہے۔ یہ کتاب بچے ضرور پسند کریں گے۔

لالۂ زارِ داغ | مرتبہ نزہت جہاں صاحبہ

حجم ۳۲ صفحے۔ قیمت ۸ر مقام اشاعت:۔ خاتون کتاب گھر
اُردو بازار۔ دہلی۔

محترمہ نزہت جہاں صاحبہ نے فصیح الملک استاد داغ
دہلوی کے کلام سے پسندیدہ دو سو مصرعے اور تین سو اشعار کا
انتخاب کیا ہے۔ کافی اچھا انتخاب ہے۔ گو بعض جگہ معمولی اشعار
کو بھی جگہ دی گئی ہے۔

ایک شاعر کے سو شعر | از میر جہانگیر علی خاں صاحب قدسی

لکچرار فارسی انٹر کالج گلبرگہ۔

حجم ۳۲ صفحے۔ قیمت درج نہیں۔ مقام اشاعت:۔ مکتبہ
علیہ نیر گلشن۔ حیدرآباد دکن۔

یہ سو شعر جناب جہانگیر علی خاں صاحب قدسی کے کلام کا انتخاب
ہیں۔ موصوف نے خود ہی منتخب کئے ہیں۔ بہتر ہوتا اگر کوئی اور
سخن فہم یہ کام کرتا۔ کیونکہ شاعر کو اپنا ہر شعر اچھا لگتا ہے۔
اکثر آپ نے پامال مضامین باندھے ہیں۔ بعض تو بہت اچھے
بھی موجود ہیں۔ مثلاً ؎

دل اگر ہے تو بہت داغ ہیں اہلوں کے
کیا کمی اب کونکلوں کی جو گلستاں رکھے

شمع کا بھی عجب عالم ہے　　اپنے رونے پہ آپ ہنستی ہے
بچوں کا لندن | از آغا محمد اشرف، ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

اس کتاب میں وہ مضامین اور قصے شامل ہیں جو لندن
کی نشرگاہ سے آغا محمد اشرف صاحب نے موقع بہ موقع نشر کئے تھے
اس زمانہ میں وہ لندن والے چچا کے لقب سے بی بی سی کا پروگرام
سننے والے بچوں میں بہت معروف و مقبول ہو چکے تھے۔ ان کا

اسلوب بیان بہت سادہ اور رواں ہے۔ ان کے جو مضامین
اس مجموعے میں شریک ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی شخص
لکھ نہیں رہا ہے بلکہ باتیں کر رہا ہے۔ یہ مضامین اگرچہ زیادہ تر
وقتی حیثیت رکھتے ہیں لیکن جس شگفتگی سے لکھے گئے ہیں ان کی
بناء پر یقین ہے کہ یہ ہر زمانہ میں شوق سے پڑھے جائیں گے۔

عبد الحق اکیڈمی کی بچوں کی کتابیں

بڑی خوشی
کی بات ہے کہ اس اثناء میں اردو میں بچوں کے ادب کی طرف
خاص طور پر توجہ کی جا رہی ہے۔ جامعہ ملیہ اور ادارۂ ادبیات اُردو
کی جانب سے اس قسم کی جو کتابیں چھپتی رہتی ہیں ان کا تذکرہ
اس سے قبل کیا جا چکا ہے اب عبد الحق اکیڈمی حیدرآباد کی
جانب سے بھی بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی بارہ کتابیں شائع ہوئی
ہیں جن کے مصنف مولوی شجاع احمد صاحب تائب ہیں۔

شجاع احمد صاحب کو بچوں کی زبان اور نفسیات پر
اچھا عبور حاصل ہے ان کی دو کتابیں کشمش نانی اور باتیں
اس سے قبل ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے بھی چھپ کر
بچوں میں بہت مقبول ہو چکی ہیں۔ اس وقت ان کی جو بارہ
چھوٹی چھوٹی کتابیں پیش نظر ہیں ان کے عنوان یہ ہیں:۔
کھٹی میٹھی بیتیاں، رابنسن کروسو۔ لاڈلا اکبر، پڑوسن، عید،
چھو منتر کا دھاگا، کپڑے، چھتری فوج، سادہ زندگی،
دستر خوان، جنگ کے بعد کیا ہوگا، سمندری جہاز۔

یہ سب رسالے مکالمے کے انداز میں لکھے گئے ہیں
اور ان کی زبان واسلوب دلچسپ اور شگفتہ ہے جو لوگ
بچوں کے ادب کے متلاشی ہیں وہ ان کو قدر کی نگاہ
سے دیکھیں گے۔

فیصلہ کن جنگیں | از محمود خاں صاحب محمود۔ ناشر:۔
ملک بک ڈپو لاہور۔

اس کتاب کے مصنف تاریخ سلطنت خداداد اور تاریخ
جنوبی ہند ....

کے مصنف کی حیثیت سے اردو کی دنیا میں معروف ہیں اور تاریخ کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے ہندوستان کی آٹھ ایسی لڑائیوں کا حال بیان کیا ہے جنھوں نے ہندوستان کی قسمت پر اثر ڈالا سب سے پہلے تھانیسر کی لڑائی کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو ۱۱۹۲ء میں دریائے سرستی کے کنارے پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان لڑی گئی تھی۔ اس کے بعد پانی پت کی لڑائی کا حال لکھا ہے جو ۱۵۲٦ء میں ظہیرالدین بابر اور ابراہیم لودھی کے درمیان ہوئی تھی۔ اس جنگ کے چودہ سال بعد قنوج کی لڑائی ہوئی اور پھر پانی پت کی دوسری لڑائی کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح تالی کوٹا، پلاسی، پانی پت کی تیسری لڑائی اور سرنگا پٹم کی لڑائیوں پر بھی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں بعض نقشے بھی ہیں اور آخر میں ایک ضمیمہ بھی شریک ہے۔ کتاب کی ترتیب اور حوالوں وغیرہ کے اندراجات کی بناء پر یہ کوشش تاریخ ہند سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے قابل داد ہے اور توقع ہے کہ مصنف ایسی تاریخی کتابوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے اور جنگوں کے بعد ان تحریکات اور واقعات کی طرف توجہ کریں گے جنھوں نے ہندوستان کی سماجی اور تمدنی دنیا میں انقلاب پیدا کیا اور جن کے باعث یہ ملک تہذیب تمدن کی منزلیں طے کرتا گیا۔

ہمارے ہندوستانی مسلمان | مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین۔ ناشر:- اقبال اکیڈیمی - لاہور۔

یہ اصل میں ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جس کے مصنف بنگال کے ایک سویلین عہدہ دار ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر ہیں۔ اور اس میں مسلمانوں کے سیاسی نظریوں اور انگریزوں کے عہد میں ان کی بے چینی کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن چونکہ ایک انگریز عہدہ دار کے قلم سے لکھی گئی ہے اس لئے ممکن ہے اس میں بعض امور مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے ناپسندیدہ ہوں تاہم اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کی مسلسل جد وجہد اور ذہنی کشمکش کا پتہ چلتا ہے اور بعض ایسی باتیں بھی منظر عام پر آتی ہیں جو اب تک تاریخی کتابوں میں شائع نہیں ہوسکیں۔ سیاست سے دلچسپی رکھنے والے اس کے مطالعہ سے کافی مستفید ہوسکتے ہیں۔

کمپنی کی حکومت | از باری۔ ناشر مکتبۂ اردو لاہور۔

یہ کتاب ہندوستان کی سیاسی اور تمدنی تاریخ میں ایک مفید اضافہ ہے اور اس وقت تک اس کے تین ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ اس میں مغلوں کی سلطنت کے آخری دور سے لے کر ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام تک جو واقعات پیش آئے ان پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ نظر ڈالی گئی ہے۔ جو لوگ ہندوستان کی سیاسی جد وجہد کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے اس کتاب میں نہایت اہم اور ضروری تاریخی معلومات یکجا کردی گئی ہیں۔

دستور الفصاحت | از حکیم سید احمد علی خاں یکتا لکھنوی۔ مطبوعہ ہندوستان پریس رامپور۔

کتاب خانۂ ریاست رامپور کی جانب سے جو مفید سلسلۂ مطبوعات شروع ہوا ہے اس کی یہ چوتھی کڑی ہے اور اس میں یکتا لکھنوی کی کتاب دستور الفصاحت کا وہ حصہ شائع کیا گیا ہے جو اردو شعرا کے تذکرے کے طور پر قلمبند کیا گیا تھا۔ اس کتاب کے متعلق اس کے مرتب مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتاب خانۂ رامپور نے جو دیباچہ قلمبند کیا ہے وہ بجائے خود ایک جداگانہ کتاب ہے اور ۱۱۷ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں مرتب نے اردو کے تمام تذکروں پر ایک عالمانہ تبصرہ کیا ہے۔ اور بعض امور میں ایسی تحقیق و تفتیش سے کام لیا ہے کہ ان کے اعلیٰ علمی ذوق کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ میری رائے میں ان کا یہ دیباچہ اس قابل ہے کہ اس کو علحدہ کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔

اشارہ | مرتبہ تمنائی۔ ناشر۔ نیا سنسار پٹنہ۔

یہ بہار کے شعرائے اردو کے منتخب کلام کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو مرقع سخن کی طرز پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں بھی تقریباً پچیس شعرا کے مختصر سے حالات اور کلام کے

نونہ شامل ہیں۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سرزمین [illegible] صاحبان فکر و نظر پیدا کر رہی ہے اور [illegible] کی شاعری کا نشو و نما عمدگی سے ہو رہا ہے۔ دوسرے صوبوں میں بھی اگر ایسے ہی مجموعے مرتب ہو سکیں تو اردو ادب کی تاریخ اور اس کے جدید رجحانات کی نسبت مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

اس مجموعے کے مرتب تمنائی صاحب ہیں۔ انھوں نے اس کی ترتیب اور کلام کے انتخاب اور شعرا کے تعارف میں جس اعلیٰ ادبی ذوق کا ثبوت دیا ہے اس کی بنا پر یقین ہے کہ وہ بہار کے اردو ادب کے متعلق اردو دنیا کو اسی طرح واقف کرتے رہیں گے اور ہمارے ادبی ذخیرہ میں اضافہ کا باعث ہوں گے۔ "ق"

Modern Islam in India پروفیسر Wilfred Cantwell Smith کی انگریزی تالیف ہے جسے منزوا ایجنٹ فناپ نے انار کلی۔ لاہور سے شائع کیا ہے۔ کتاب چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ و کتابت اعلیٰ اور قیمت دس روپے سکہ کلدار ہے، جو کسی قدر زیادہ ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ آئے دن بہت سی اردو اور انگریزی کتابیں مسلمانان ہند کے تمدنی، تعلیمی اور سیاسی مسائل سے متعلق شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن بہت کم ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں جو تعصب، کوتاہ نظری، ذہنی انتشار اور فقدان معلومات سے پاک ہوں۔ چنانچہ ایک عرصے سے ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس میں مسلمانان ہند کی زندگی کے ہر پہلو پر عمرانی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہو۔ اس کو خود مسلمان علما نے محسوس نہیں کیا بلکہ لاہور کے کرسچین کالج کے تاریخ اسلام کے پروفیسر W.C. Smith نے اس اہم علمی خدمت کو نہایت ہی ذمہ داری اور حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی کے اہم ترین شعبوں کا خالص عمرانی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا ہے۔ مولف کا تنقیدی معیار اتنا بلند اور قابل قدر ہے کہ اگر ہمارے علماء اور نقاد، تمدنی، تعلیمی اور سیاسی مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے "معیاری" تسلیم کریں تو یہ ملک اور قوم کے حق میں نہایت مفید اور سود مند ثابت ہوگا۔

اصل کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں قابل مولف نے انیسویں صدی کی ابتداء سے لے کر آج تک مسلمانان ہند میں جتنے بھی رہنما اور مشاہیر گزرے ہیں اور ان بلند مرتبہ شخصیتوں کی وجہ سے جو تحریکیں مسلمانوں میں چلی ہیں ان کے تمدنی، سیاسی افکارات اور تصورات اور ان تحریکوں کے نتائج پر .... سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اور بالخصوص عصر جدید کے ملت اسلامیہ ہند کے معمار سر سید احمد خاں اور اقبال کے اثرات جو یہاں کے مسلمانوں پر پڑے ہیں انھیں نہایت ہی جامع اور واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

کتاب کے پہلے حصے میں کتاب کے نہایت ہی دلچسپ ابواب وہ ہیں جو اقبال کی تعلیمات اور اس کے اثرات سے متعلق مختص ہیں۔ مولف نے اقبال کے افکارات پر نہایت ہی عالمانہ نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے اور تنقید عالیہ کا وہ نمونہ پیش کیا ہے جو شاید ہی ہماری زبان میں کہیں پایا جائے۔ اقبال فلسفی سے زیادہ ایک شاعر تھے۔ اسی لئے مولف کو اقبال کی شاعرانہ عظمت سے ذرا بھی انکار نہیں اگر اختلاف ہے تو اس کے پیام اور افکارات سے، لیکن یہ اختلاف تعصب اور لاعلمی کی بنا پر نہیں بلکہ خالص عالمانہ ہے۔

اسی لئے مولف نے اقبال کے ترقی پسند رجحانات اور رجعت پسند خیالات کا تجزیہ کرنے میں انتہائی ہوشمندی سے کام لیا ہے اور بے جا جذبات کو کہیں دخل نہیں۔ دوسرے حصے میں مسلمانان ہند کی سیاسی جد و جہد اور کشمکش پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مسلمانوں کے موجودہ سیاسی مقصد "پاکستان" اور اس کے عواقب اور مضرات پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بہر حال کتاب اس قابل ہے کہ ہر ہندوستانی خواہ وہ مسلمان ہو یا اور کوئی ضرور اس کا مطالعہ کرے۔ "ر۔ و۔ ع"

(ایک [illegible] دوست کے نام)

تیرے اِس گریۂ پیہم سے بھلا کیا ہوگا؟
اشکِ غم آتشِ احساس بجھانے سے رہے!
نوجوانی کے سسکتے ہوئے پیاسے ارماں!
سینۂ زیست میں طوفان اٹھانے سے رہے!

تجھ کو معلوم ہے؟ اس غمکدۂ ہستی میں
زندگانی کبھی ہم رنگِ تمنا بھی ہوئی
قلبِ انساں کی تمناؤں کی رنگین بہار
ان خزاں بار فضاؤں کو گوارا بھی ہوئی؟

یہ جہاں ہاں یہ اندھیروں کا پُراسرار جہاں
آج تک جل نہ سکے جس میں مسرت کے چراغ!
تیری آزردہ و افسردہ تمناؤں کو
کس طرح دے گا بھلا فرصتِ تکمیلِ فراغ؟

مجھ کو دیکھ عمر کی اس خواب فزا منزل میں
کتنے ارمانوں کا دم گھونٹ کے بیدار ہوں میں
بل نہ آیا کبھی پیشانیٔ ناداری پر!!
پے بہ پے کے حوادث کا بھی سرشار ہوں میں

کتنے طوفان مری کشتیٔ خودداری کو —
انتقامانہ تحکم سے بلاتے ہی رہے!
کتنے سرمایہ پرستی کے سبک سیر خیال
تند خوئی کو مری وجد میں لاتے ہی رہے

لیکن اے دوست زمانے کا محل سوز نظام
مجھ کو پابندِ قوانینِ سکوں کر نہ سکا!
صرصرِ تلخیٔ ایام کی سوگند کبھی
میں نے احساس کی قندیل کو بجھنے نہ دیا

زندگی جبر نہیں روح جو بیدار رہے
تیرگی شعلۂ خورشید سے جل جاتی ہے
عسرت و نکبت و آلام کی سنگین چٹان
گرمیٔ سعیٔ مسلسل سے پگھل جاتی ہے

کھیل کچھ اور یونہی ظلمت آلام سے کھیل
اب کوئی دم میں ابھرنے ہی کو ہے ماہِ تمام
آ رہی ہے افقِ شرق سے لیلائے حیات
اپنے ہاتھوں میں لئے بادۂ گلفام کا جام

لطیف ساجد

ادارے کی خبریں

تعلیم بالغاں و امتحانات میسور
تاریخ [illegible] اگست ۱۹۴۴ء روز یکشنبہ دن کے دس بجے

مجلس تعلیم بالغاں و امتحانات کا اجلاس جناب عبدالقادر صاحب سروری پروفیسر اردو جامعہ میسور کے مکان پر منعقد ہوا۔ حسب ذیل حضرات تشریف لائے تھے۔

۱۔ جناب حاجی عبدالغفور صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی وائس پرنسپل گورنمنٹ ٹریننگ کالج میسور (صدر)

۲۔ جناب پی عبدالقدوس صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی مددگار مدرس گورنمنٹ ٹریننگ کالج میسور ۳۔ جناب مولوی رکن الدین صاحب سالک اردو و فارسی معلم مہاراجہ ہائی اسکول میسور۔ ۴۔ جناب میر مرتضیٰ حسین صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی صدر مدرس اردو پریکٹسنگ مڈل اسکول میسور۔ ۵۔ جناب عبدالقادر صاحب سروری ایم۔ اے۔ ایل ایل بی۔ پروفیسر اردو جامعہ میسور۔ ۶۔ افضل العلماء سید عبدالحکیم صاحب معلم اردو و فارسی مہاراجہ ہائی اسکول میسور معتمد۔

کارروائی کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

جناب عبدالقادر صاحب سروری نے ادارہ کے اغراض و مقاصد اور شعبۂ تعلیم بالغاں و امتحانات کا لائحہ عمل منظورہ مجلس انتظامی پڑھ کر سنایا جو باتفاق آرا منظور کیا گیا۔ لائحہ عمل یہ ہے :۔

۱۔ عوام میں ان پڑھوں کی تعلیم کا چرچا کرنا اور اس بات کا احساس پیدا کرنا۔

۲۔ شبینہ مدارس قائم کر کے یا دوسری طرح ان پڑھوں کی تعلیم کا انتظام کرنا۔

۳۔ بالغوں کی تعلیم کی تحریکات میں اعانت کرنا۔

۴۔ پڑھے لکھے نوجوانوں کو ان پڑھوں کی تعلیم کے لئے رضاکارانہ طور پر آمادہ کرنا۔

۵۔ میسور اسٹیٹ لٹریری کونسل اور ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کے امتحانات کے لئے لوگوں کو تیار کرنا۔

اس لائحہ عمل کو روبہ عمل لانے کے لئے مختلف تجاویز پیش کی گئیں بالآخر طے پایا کہ :۔

۱۔ مجلس میسور اسٹیٹ لٹریری کونسل کے مدارس کا معائنہ کرے اور جس طرح کی مدد کی ضرورت ہو اس کا انتظام کرے۔

۲۔ میسور اسٹیٹ لٹریری کونسل کے فارغ التحصیلوں کو ادارہ کے امتحان زبان دانی کے لئے تیار کرے۔

۳۔ اپنے گھروں کو تعلیم یافتہ بنانے کی تحریک کو آگے بڑھانے میں پر زور حصہ لے اور ہر رکن اس میں حصہ لے (جناب میر مرتضیٰ حسین صاحب نے خاص طور پر اس کا ذمہ لیا ہے)

۴۔ طے پایا کہ جو لوگ اپنے علمی و ادبی ذوق کو بڑھانے کے لئے ادارہ کے دوسرے امتحانات میں بیٹھنا چاہیں ان کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

۵۔ طے پایا کہ جو لوگ جامعہ مدراس کے اردو امتحانات کے لئے تیاری کرنا چاہیں ان کی بھی مدد کی جائے۔

۶۔ اردو ٹائپ کے مختلف نمونوں کا معائنہ کیا گیا اور طے پایا کہ علم طباعت کیلئے جہاں تک ہو سکے۔ دارالطبع حیدرآباد کا جدید عثمانیہ ٹائپ استعمال کیا جائے تو بہتر ہوگا اور اگر ممکن ہو تو ادارہ کی طرف سے ایک مطبع میسور میں قائم کیا جائے۔

۷۔ طے پایا کہ مسٹر کی کرشنا مورتی ایم اے لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج میسور کو اس شعبہ کی رکنیت کے لئے منتخب کیا جائے۔

بارہ بجے دوپہر کے قریب مجلس برخاست ہوئی۔

شاخ ادارۂ ادبیات اردو ناگپور
تاریخ [illegible] ستمبر ۱۹۴۴ء

ادارۂ ادبیات اردو شاخ ناگپور کی مجلس نظما کا ایک اہم جلسہ زیر صدارت مولوی عبدالستار صاحب فاروقی مدیر الفاروق کامٹی دفتر الفاروق میں چار بجے دن میں منعقد ہوا۔ جلسہ میں شامل

حکیمی، نعیم انصاری، شاہد الہاشمی، عبدالستار اشرفی، صدیق اختر اور منشی ایثقرب علی صاحبان اراکین ادارہ شریک تھے۔ مندرجہ ذیل تجاویز کافی بحث و تمحیص کے بعد منظور کی گئیں۔

۱۔ ادارۂ ادبیات اردو شاخ ناگپور کے قیام کے سلسلے میں اب تک جو خط و کتابت اور کام ہوا ہے اس کا جائزہ لیا گیا۔ اور طے پایا کہ مرکزی دفتر کے سکرٹری ڈاکٹر زور صاحب کا خط آتے ہی فوراً جلسہ طلب کیا جائے۔

۲۔ تعلیم بالغان کی اسکیم کے پیش نظر جو شبینہ مدارس جاری کئے جانے والے ہیں اس کے ابتدائی انتظامات شروع کر دیئے گئے۔ اور عید کے بعد اس سلسلہ کا پہلا شبینہ مدرسہ ناگپور کے کسی وسطی محلہ میں کھولا جائے۔

۳۔ ادارے کے شعبۂ تالیف و تصنیف کی تحریک کے مطابق صوبہ متوسط و برار کے نوجوان ترقی پسند اور منتخب شعراء کا ایک اجمالی تذکرہ بنام "سی پی کے سوتی" شائع کیا جائے جس میں ان کا منتخب کلام مع حالات زندگی اور تصاویر ہونگی۔

اس سلسلے میں مراسلت کی اجازت دی گئی اور تمام رفقا نے ایک ساتھ روزہ افطار کرکے جلسے کو برخاست کیا۔

قیام ہندی

اردو امتحانات سنہ ۱۹۴۴ء

نمبر سلسلہ	نام امتحان	شریک	حاضر	کامیاب: اول	کامیاب: دوم	کامیاب: سوم	جملہ	فیصد کامیابی	شریک: اناث	شریک: ذکور	شریک: مسلم	شریک: غیر مسلم
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳
۱	اردو فاضل	۳۰	۲۴	۰	۸	۹	۱۷	۶۶	۵	۲۵	۳۰	۰
۲	اردو عالم	۱۸۸	۱۴۳	۲	۱۲	۷۴	۸۸	۶۱	۵۶	۱۳۲	۱۷۲	۱۶
۳	اردو زباندانی	۴۶۷	۳۸۱	۴	۷۸	۱۳۸	۲۲۰	۷۱	۹۰	۳۷۷	۳۹۵	۷۲
۴	خوشنویسی	۹	۷	۰	۰	۳	۳	۴۳	۲	۷	۹	۰
		شریک	حاضر	کامیاب بجز امتیاز		کامیاب	جملہ	فیصد کامیابی	اناث	ذکور	مسلم	غیر مسلم
۵	اردو دانی	۸۲۲	۶۲۹	۹۴		۳۷۲	۴۶۶	۷۲	۱۴۱	۶۸۱	۶۹۳	۱۲۹

شعبۂ نسواں

حزب نسواں کی مجلس عاملہ کا اجلاس بتاریخ ۱۰ر جولائی ۱۹۴۳ء م ۷ر محرم ۱۳۶۲ھ [illegible] ساڑھے دو بجے منعقد ہوا۔ حسب ذیل اراکین شریک تھے۔

محترمہ [illegible] بیگم صاحبہ صدر۔ محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر شریک معتمد۔ محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ۔ محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ۔ محترمہ [illegible] بیگم صاحبہ اور [illegible] سکینہ بیگم صاحبہ۔

رابعہ بیگم صاحبہ۔ سعید النساء بیگم صاحبہ اور عظمت النساء بیگم صاحبہ (منزل بیگم) نے شرکت سے معذرت چاہی۔

اجلاس کا آغاز سابقہ روئداد کی توثیق سے کیا گیا۔ اس کے بعد اس کے متعلق امور پر جو عمل ہوا تھا اس کی وضاحت حسب ذیل کی گئی۔

(۱) (الف) شعبہ کی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لئے نظامت تعلیمات سے درخواست کی گئی کہ وہ رقم جو اب تک ادارہ کو دیجاتی تھی اب شعبہ کے نام بحال کی جائے۔ نیز حکومت دکن سے کافی رقم شعبہ کو مدارس کے قیام کے لئے دلوانے کی بھی درخواست کی گئی۔ معتمد نے بالمشافہ ناظم صاحب سے ملکر شعبہ کے کاموں پر روشنی ڈالی اور اس کی دشواریوں سے روشناس کرایا۔ ناظم صاحب نے شعبہ کے کاموں سے اپنی دلچسپی کا اظہار فرماتے ہوئے درخواست پر غور کرنے کا وعدہ فرمایا۔

(۲) مدرسہ کے نصاب کے متعلق معتمد نے ناظم صاحب سے گفتگو کی تھی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔

(۳) بزم ادب کا دوسرا جلسہ اقبال پر جیسا کہ طے پایا تھا۔ ۷ ذیقعدہ (نومبر ۱۹۴۳ء) میں بمقام محبوبیہ اسکول منعقد ہوا جس میں بیگم صاحبہ نواب ولی الدولہ بہادر و مادر بیگم صاحبہ نواب ظہیر یار جنگ بہادر نے بھی شرکت فرمائی۔

(اس جلسہ کی تفصیلی رپورٹ سب رس بابت جنوری ۱۹۴۳ء میں شائع ہو چکی ہے)

(۴) معتمد و شریک معتمد میں تقسیم کار کا مسئلہ ہنوز طے نہ پاسکا۔ اس ضمن میں شعبہ کے لئے قواعد و ضوابط کی شدید ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے معتمد نے ایسے قواعد مرتب کرکے آئندہ اجلاس پر منظوری پیش کرنے کا ذمہ لیا۔ اس کے بعد حسب ذیل امور زیر بحث رہے۔

(۱) شعبہ کے مصارف میں مزید اضافہ (۲) قیام مدرسۂ اطفال سرکاری بمقام اوٹکیش (۳) امتحانات ادارہ (۴) اردو کانگریس (۵) بزم ادب (۶) قرارداد تعزیت (۷) دیگر امور۔

طے پایا کہ تاوقتیکہ سرکاری امداد نظامت تعلیمات سے جاری نہ ہوجائے مدارس کے لئے کوئی اضافہ منظور نہیں ہوسکتا۔

(۲) یہ خبر بڑی خوشی سے سنی گئی کہ اوٹکیش میں سرکاری طور پر ایک مدرسہ اطفال کا قیام عمل میں آیا ہے یہ گویا ہماری سہ سالہ کوششوں اور جد و جہد کا ثمر ہے۔ ہم نے خود اپنے مدرسہ اطفال کو سرکار میں لے لینے کی خواہش کی تھی لیکن اب جبکہ ایک سرکاری مدرسہ قائم ہو چکا ہے ہم اپنے مدرسہ کو اس میں ضم کردینے آمادہ ہیں۔ چنانچہ کچھ دنوں بعد شعبہ کے مدرسۂ اطفال کو سرکاری مدرسہ میں ضم کردیا جائے گا۔

(۳) امتحانات ادارہ حسب سال گزشتہ مدرسہ فوقانیہ نسواں نامپلی میں بتاریخ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ جولائی منعقد ہوں گے جن کی نگرانی حسب ذیل خواتین کے ذمہ کی گئی۔

۱۸ر جولائی۔ رابعہ بیگم صاحبہ۔ سعید النساء بیگم صاحبہ۔ تہنیت النساء بیگم صاحبہ

۱۹ر " عظمت النساء بیگم صاحبہ۔ بلقیس بانو صاحبہ۔ سکینہ بیگم صاحبہ

۲۰ر " بشیر النساء بیگم صاحبہ۔ تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ۔ سعید النساء بیگم صاحبہ

(۴) اردو کانگریس کے سلسلہ میں معتمد نے ارکان شعبہ سے درخواست کی

کہ انگلش کے اجلاسوں میں زنانہ انتظامات میں مدد کریں
جس کا ارکان حاضر نے وعدہ کیا۔

(۵) بزم ادب کے تیسرے جلسہ کے لئے میر تقی میر کا انتخاب کرتے ہوئے جہاں بانو بیگم صاحبہ نے شعبان کے آخری عشرہ میں اس کو پیش کرنے کا وعدہ کیا۔

(۶) فخر قوم و سرمایۂ ملت بہادر یار جنگ بہادر کی وفات سے اردو زبان کو جو ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے اس کو محسوس کرتے ہوئے شعبہ کی طرف سے حسب ذیل قرار داد تعزیت پیش کی گئی جس کو اراکین نے ایستادہ ہو کر منظور کیا اور جس کی ایک نقل مرحوم کی بیگم صاحبہ کے یہاں روانہ کی گئی۔

قرار داد تعزیت

اراکین شعبۂ نسواں ملک و زبان اردو کے بے مثل و نامور خطیب نواب بہادر یار جنگ بہادر کی بے وقت رحلت پر اپنے دلی جذبات الم کا اظہار کرتے ہیں نیز ادارہ کے لئے اس سانحۂ عظیم کو ایک ناقابل تلافی نقصان تصور کرتے ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ہم سب ارکان شعبۂ بیگم صاحبہ نواب بہادر یار جنگ بہادر کی خدمت میں گہرے رنج و الم کے ساتھ اپنی مخلصانہ تعزیت پیش کرتے ہیں۔ شریک غم

رابعہ بیگم، جہاں بانو بیگم، بشیر النساء بیگم، لطیف النساء بیگم، صاحبہ بیگم، تصدق فاطمہ بیگم، بلقیس بانو بیگم، سیدالنساء بیگم، تہنیت النساء بیگم، عظمت النساء بیگم، سکینہ بیگم۔

۱۰ جولائی ۱۹۴۴ء

(۷) ادارہ کے امتحانات کو مستند کرنے کے لئے معتمد صاحبہ امتحانات مولوی سید محمد صاحب سے استفسار کرنے کی رائے ہوئی کہ وہ سرکار میں اس کے لئے درخواست کریں۔

شعبۂ نسواں کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ بروز جمعہ بتاریخ ۱۴ آبان ۱۳۵۳ف ادارہ کے دفتر میں صبح ساڑھے دس بجے منعقد ہوا جس میں خواتین موجود تھیں۔

محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ صدر۔ محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ شریک معتمد محترمہ بلقیس بانو بیگم صاحبہ۔ محترمہ محل مولوی عبدالقیوم صاحب۔ محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ۔ محترمہ تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ۔ محترمہ عظمت النساء بیگم اور معتمد شعبہ سکینہ بیگم صاحبہ۔

طے پایا کہ آغاز ۱۳۵۴ف سے شعبہ کے مدرسۂ اطفال کو ہائی مدرسہ میں ضم کر دیا جائے۔

بزم ادب کا جلسہ اس دفعہ مجموعہ بیاسکولی میں کرنے کی بار ہے لہذا یہ تجویز ہوئی کہ لطیف النساء بیگم صاحبہ سے اس بارے میں معتمد ملاقات کر کے ماہ ذیقعدہ کے کسی دن اور تاریخ کا تعین کریں اور اس کے بعد اراکین عاملہ کو اس کی اطلاع کرائیں۔ نظام العمل لطیف النساء بیگم صاحبہ کے صوابدید پر منحصر ہوگا۔

چونکہ اس سے قبل لطیف النساء بیگم نے غالب کو اپنا موضوع قرار دیا تھا اس لئے معتمد نے تحریک کی کہ سعیدہ مظہر صاحبہ کا مضمون غالب جو خاص بچوں کے لئے لکھا گیا ہے اس موقعہ پر سنایا جائے۔ بلقیس بانو صاحبہ نے بھی "غالب کی بزلہ سنجی" پر ایک مضمون دینے کا وعدہ کیا۔ یہ ہر دو اور کچھ مالیوں بھی جن کا معتمد نے ذمہ لیا باجازت لطیف النساء بیگم پیش کئے جائیں گے۔

دستور العمل جب معتمد نے اپنا مرتب کردہ مسودہ پیش کیا۔ ساتھ ہی یہ تجویز بھی پیش کی کہ اگر اراکین ان پر غور کر کے اپنی رائے دینا چاہیں تو ان کو اس کی نقلیں بھجوا دی جائیں۔ تاکہ وہ اس پر

[illegible] صاحبہ نے [illegible] اراکین نے منظور کیا۔ دیگر [illegible] کے متعلق گذشتہ اجلاس کی [illegible] کا حوالہ دیتے ہوئے معتمد نے یہ تحریک پیش کی کہ [illegible] بیگم صاحبہ چونکہ اپنی صحت کی وجہ سے [illegible] مجبور ہیں لہذا انہیں [illegible] کی حیثیت کی خصوصی کے مجلس پر رکھا جائے اور ان کے عوض مجلس عاملہ کے لئے کسی اور کا انتخاب کیا جائے۔

اس کے بعد معتمد نے تحریک کی کہ رکنیت عاملہ کے لئے رفیعہ سلطانہ اور سعیدہ مظہر کے نام منظور کئے جائیں جس کی تصدق فاطمہ بیگم نے تائید کی اور دیگر اراکین نے بخوشی منظور فرمایا۔

دستور العمل کے قاعدہ ۱۲ فقرہ (۱) کے بموجب معتمد نے رائے پیش کی کہ ذیلی مجالس کے لئے حسب ذیل تقسیم مناسب ہوگی۔

مجلس بزم ادب ...... داعی تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ
مجلس تعلیم و ترقی نسواں ...... " سعیدہ مظہر صاحبہ
مجلس ادب نسواں ...... " رفیعہ سلطانہ صاحبہ

جس کو اراکین حاضرہ نے پسند فرمایا۔

اس کے بعد ادارہ کی عمارت کا معائنہ ہوا اور جلسہ برخاست ہوا۔

شاخ پربھنی

معتمد صاحب نے حسب ذیل رپورٹ روانہ کی ہے۔ "چونکہ میرا تبادلہ پربھنی سے کندکور تعلقہ دیکنڈہ ضلع نلگنڈہ ہوگیا ہے۔ اس لئے مجبوراً ایک جلسہ عام کرکے جدید کابینہ ادارۂ ادبیات اردو شاخ پربھنی ترتیب دی گئی جو جلسہ عام میں منظور کی گئی۔"

میں اپنی خدمت معتمدی شاخ پربھنی سے سبکدوش ہوگیا ہوں اور میری بجائے مولوی ناصر بن عبد الحبیب صاحب معتمد شاخ مقرر ہوئے۔ میری تمنا ہے کہ شاخ پربھنی [illegible] روایات کو باقی رکھے اور [illegible] کرے۔ [illegible] سے لیکر [illegible] تک جہاں تک ممکن ہوا میں نے ادارہ کی خدمت انجام دی اور آئندہ بھی جہاں تک ممکن ہوسکے ہر قسم کی امداد و تعاون کے لئے حاضر ہوں اور میری نیک تمنائیں شاخ پربھنی کے ساتھ برابر رہیں گی۔

شاخ پربھنی ۱۳۵۳ف کے لئے حسب ذیل کابینہ منتخب کی گئی ہے۔

جدید کابینہ ۱۳۵۳ف

صدر۔ مولوی جلال الدین صاحب اشک بی اے ایل ایل بی [illegible] پربھنی۔
نائب صدر۔ مولوی مظہر علی خاں صاحب علیگ وکیل ہائیکورٹ پربھنی۔
معتمد۔ ناصر بن عبد الحبیب صاحب اردو فاضل۔
شریک معتمد۔ مولوی اشرف الدین صاحب نعیمی اردو فاضل منشی فاضل
خازن۔ حاجی محمد عبد الکریم صاحب جنرل مرچنٹ پربھنی
کتبخانہ دار۔ مولوی سید کفیلی صاحب اہلکار دفتر آبکاری پربھنی
اراکین انتظامی۔ مولوی شمس الحسن صاحب زبیری صدر مدرس فوقانیہ پربھنی۔ مولوی عبد الرحمن خاں صاحب بی اے اسسٹنٹ رجسٹرار پربھنی مولوی میر محبوب علی [illegible] بی اے ایل ایل بی وکیل ہائیکورٹ۔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب۔ مولوی سید حبیب علی صاحب۔ مولوی سید خورشید حیدر صاحب [illegible]

روئداد جلسہ سالانہ شاخ پربھنی

ادارۂ ادبیات اردو شاخ پربھنی اور بزم رندان (کلب) کا مشترکہ جلسہ سالانہ بتاریخ یکم آذر ۱۳۵۳ف ۹ بجے شام بتقریب سال نو زیر صدارت مولوی مرزا محمد مہدی صاحب اول تعلقدار ضلع پربھنی منعقد ہوا جس میں عہدہ داران مقامی وکلاء علم و ادب سے ذوق رکھنے والے نوجوان اور بکثرت عوام شریک تھے۔ جلسہ کا آغاز پرچم آصفی کی بلندی سے ہوا۔ معتمد ادارۂ ادبیات اردو نے ادارہ کی جانب سے اپنی رپورٹ

اور اللہ ... صد ... بنیادی اصولوں پر مفصل الفاظ میں تبصرہ کیا۔ پروگرام کے مطابق یکے بعد دیگرے تقریریں ہوئیں اور ہر تقریر کے بعد ایک نظم سنائی گئی۔

مولوی محمد جلال الدین صاحب اشک بی اے ایل ایل بی امین کروڑگیری و صدر ادارہ ادبیات اردو بمبئی نے جناب صدر و حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ دعائے سلامتی حضرت اقدس و اعلیٰ و شاہزادگان بلند اقبال و شاہزادیان فرخ فال پر جلسہ کامیاب اختتام ہوا۔

شب کے (۱۰) بجے حسب اعلان مشاعرہ مولوی محمد جلال الدین صاحب اشک کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں کافی تعداد شعراء و سامعین کی شریک بزم مشاعرہ ہوئی۔ طرحی کے بعد غیر طرحی کلام بھی سنایا گیا۔ اور یہ ادبی مجلس دو بجے شب تک نہایت سرگرمی کے ساتھ جاری رہی۔ سامعین بہت محظوظ ہوئے۔ اور شعراء نے خاطر خواہ داد پائی

ناصر انصاری اردو فاضل معتمد

عطیۂ مخطوطات

پروفیسر آصف جاہ کاروانی صاحب مدیر شباب [illegible] کراچی نے سندھ کی اردو شاعری کا ایک قلمی مجموعہ ادارے کو بطور تحفہ ارسال فرمایا ہے۔ اس کتاب میں کئی چھوٹے بڑے اردو و فارسی رسالے بھی شامل ہیں اور اس کے تحقیقی مطالعے کے بعد اس کی تفصیلات تذکرہ اردو مخطوطات جلد دوم میں شائع کی جائیں گی۔ ادارے کی جانب سے جناب پروفیسر کاروانی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ انھوں نے کراچی سے اور بھی قلمی کتب کی فراہمی کا وعدہ فرمایا ہے۔

مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار اردو سٹی کالج نے بھی حسب ذیل قلمی کتب بطور تحفہ کتب خانہ مخطوطات میں داخل کی ہیں۔ جس کے لئے ادارہ ان کا شکرگزار ہے۔

۱۔ شرح تہذیب فارسی۔ ۲۔ پنچھی باچھا اردو۔ ۳۔ گلستان فارسی

۴۔ تاریخ کیمیا اردو۔ ۵۔ قواعد عثمانیہ اردو۔

شعبۂ شعراء و مصنفین میسور

تاریخ ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۳ء دفتر روزنامہ "آزاد" منگل پیٹھ بنگلور میں دن کے ۲ بجے اجلاس منعقد ہوا۔ حسب ذیل عہدہ دار و اراکین حاضر تھے۔

۱۔ صدر جناب غازی صاحب مدیر "فارس"۔ ۲۔ معتمد جناب ڈاکٹر حکیم عبد المنعم خاں صاحب فاضل طب و جراحی کوہلی۔ ۳۔ جناب مولوی حسن [illegible]۔ ۴۔ جناب مولوی عبد الوہاب صاحب ایم اے بار ایٹ لا صدر فورٹ ہائی اسکول بنگلور۔ ۵۔ جناب عبد القادر سروری صاحب پروفیسر اردو مہاراجہ کالج میسور۔

(۱) شعبہ کا لائحہ عمل مرتبہ مجلس انتظامی ادارہ ادبیات اردو میسور منظور ہوا۔

(۲) طے پایا کہ شعبہ کی کارکردگی میں اضافہ کے لئے حسب ذیل عہدہ داروں اور اراکین کو شامل کیا جائے۔

نائب صدر۔ جناب محمد اسمٰعیل صاحب آئل۔ نائب معتمد جناب [illegible] صاحب شوق۔ اراکین جناب عبد الوہاب صاحب ایم اے بار ایٹ لا صدر فورٹ ہائی اسکول بنگلور۔ جناب عبد الرزاق صاحب ایم اے ایل ایل بی (علیگ) مددگار فورٹ ہائی اسکول بنگلور۔ جناب محبوب شریف صاحب بی اے مددگار فورٹ ہائی اسکول۔ جناب منشی محمد ابراہیم صاحب ذاکر۔

(۳) طے پایا کہ عالیجناب رکن الملک سید عبد الواحد صاحب [illegible] کی خدمت میں التماس کی جائے کہ اس شعبہ کی رہنمائی کے لئے اس کی اعزازی رکنیت قبول فرمائیں۔ ساڑھے پانچ بجے جلسہ برخاست ہوا۔

عبد القادر سروری معتمد

اردو دانی کا دوسرا امتحان

معتمد مجلس انتظامی

اردو امتحانات ۱۹۴۳ء کا دوسرا امتحان اردو دانی تاریخ ۴ نومبر ۱۹۴۳ء مطابق ۲۹ دے ۱۳۵۳ف کو بلدہ اضلاع اور بیرون ریاست کے جملہ مرکزوں میں ایک ساتھ لیا جائے گا۔ فیس امتحان اور درخواستیں [illegible] تک دفتر ادارہ پر وصول ہو جانی چاہئیں۔ ہر مرکز [illegible] مقرر

[illegible] شرکت ہوگی۔

مجلس انتظامی کا اجلاس

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا [illegible] اجلاس پنجشنبہ [illegible] ۱۳؍اگست [illegible] شام کو پانچ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا حسب ذیل احباب نے شرکت فرمائی۔

آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر صدر المہام تعمیرات۔
عالیجناب نواب معین نواز جنگ بہادر معتمد سیاسیات باب حکومت۔
مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب۔
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور معتمد ادارہ

آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر نے صدارت فرمائی۔

(۱) گزشتہ اجلاس کی روئداد پڑھ کر سنائی گئی اور اس کی توثیق عمل میں آئی۔

(۲) کل ہند اردو کانگرس کی تفصیلات کی توثیق کی گئی۔

(۳) تاریخ دکن کانفرنس کے کام کی تفصیلات معتمد ادارہ اور مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب نے بیان کیں۔ اور اس کے انتظامات سے متعلق تبادلۂ خیال کیا گیا۔

(۴) آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر کی صدر المہامی کی مسرت میں ادارے کی جانب سے عید الفطر کے بعد ایک عصرانہ کا تصفیہ کیا گیا جس میں ادارے کے ارباب کار اور معتمدین و رفقا کو مدعو کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں طے پایا کہ نواب صاحب معزز سے بعد رمضان تاریخ کا تعین کیا جائے۔

(۵) شعبۂ نسواں کے مدرسہ کو کھانے کے لیئے صدر صاحبہ و معتمد صاحبہ مدرسۂ نسواں کی تحریک و تائید سے اور عالیجناب نواب لیاقت جنگ بہادر نائب صدر کی منظوری کے بعد تین سو روپے کا جو قرض منجانب ادارہ دیا گیا تھا اس کی توثیق کی گئی۔

(۶) ذیلی مجلس اردو امتحانات کی تحریک کہ شعبۂ اردو امتحانات کا نام شعبۂ تعلیم بالغان [illegible] کر دیا جائے پیش ہوئی۔ کافی غور و خوض کے بعد طے پایا کہ نام کی تبدیلی مناسب نہیں ہے۔

(۷) نواب حسین نواز جنگ بہادر نے تحریک پیش کی کہ آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر سے بھی ادارۂ ادبیات اردو کے نائب صدر بننے کی استدعا کی جائے۔ دیگر اراکان نے اس کی تائید کی۔ کافی اصرار کے بعد نواب صاحب نے ادارہ کی نائب صدارت قبول فرمائی۔

(۸) مخزن علوم و فنون یعنی اردو انسائیکلوپیڈیا کے لئے سرکاری امداد کی جو کارروائی کی جا رہی ہے وہ پیش کی گئی اور اس کی توثیق عمل میں آئی۔

(۹) ادارے کی عمارت کا مسئلہ پیش ہوا اور مناسب تصفیہ عمل میں آیا۔

(۱۰) حسب ذیل امور بھی شریک ایجنڈا تھے لیکن آئندہ اجلاس کے لئے ملتوی کئے گئے۔

(۱) ادارہ کے شعبہ جات میں تبدیلی کی ملتوی شدہ کارروائی۔
(۲) نئی شاخوں کے قیام کی توثیق۔
(۳) شعبۂ کتب دیہی کے قیام کا مسئلہ۔
(۴) سرکاری امداد کے شرائط اور ادارے کے دستور کا مسئلہ۔

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا ایک دوسرا اجلاس بتاریخ ۴؍آذر ۱۳۵۲ف مطابق ۱۹؍اکتوبر ۱۹۴۲ء روز پنجشنبہ شام کے ساڑھے پانچ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا حسب ذیل احباب نے شرکت فرمائی۔

عالیجناب آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر صدر المہام تعمیرات۔ صدر
" نواب معین نواز جنگ بہادر معتمد سیاسیات۔
" مولوی سید علی اکبر صاحب پرنسپل نظام کالج۔
" عبدالمجید صدیقی صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ

عالیجناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی مددگار رجسٹریشن۔
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ... معتمد اعزازی

گزشتہ اجلاس کی روئداد سنائی گئی اور جناب صدر نے اس کی توثیق فرمائی۔

(۱) ۔ سالانہ بجٹ کا مرادزہ بعد غور و خوض منظور کیا گیا۔

(۲) ۔ تحریک ڈاکٹر امیر علی صاحب۔

ڈاکٹر امیر علی صاحب کی تحریک پیش ہوئی کہ ادارے کی مجوزہ عمارت میں ایک حصہ ایوان قرآن کے نام سے مختص کیا جائے تاکہ قرآن کے اردو تراجم اس میں محفوظ رہیں جن کے جمع کرنے کے سلسلہ میں تین ہزار روپے کی ضرورت ہوگی یہ کام صاحب موصوف نے شروع کر دیا ہے اور اس کے لئے فی الحال تین سو روپے ادارے سے صاحب موصوف کو دیئے جائیں۔ بعد غور و خوض طے پایا کہ :-

"ڈاکٹر امیر علی صاحب کو قرآن کے اردو تراجم جمع کرنے کے لئے تین سو روپے ایصال کرنے کی اس شرط سے منظوری دی جاتی ہے کہ یہ کتب ادارے کی ملک ہوں گے۔

اگر آئندہ مجلس انتظامی میں صاحب موصوف خود تشریف لائیں تو اس تجویز کی تفصیلات پر گفتگو ہو سکے گی"۔

(۳) مولوی خواجہ حمید الدین صاحب شاہد ایم اے مہتمم ادارہ کی درخواست پیش کی گئی کہ ان کی بازیافت کے سلسلہ میں جس معاہدہ کی شرط لگائی گئی ہے وہ اٹھالی جائے اور مہتمم عرصی سالہ کے بعد جو بازیافت ہوگی اس کا تعین کیا جائے۔ کافی غور و خوض اور تبادلۂ خیال کے بعد مناسب تصفیہ عمل میں آیا۔

(۴) معتمد ادارہ نے ادارے کی جدید اور بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر عملہ میں اضافہ کے لئے جو تجاویز پیش کی تھیں ان پر غور کیا گیا اور طے پایا کہ عملہ ادارہ میں سے جو تین سال کی ملازمت کا معاہدہ لکھ دیں ان کے نام گزشتہ مجلس انتظامی کے فیصلے کے مطابق بیمہ کرایا جائے۔ اس سلسلے میں نئی مدات کی منظوری دی گئیں۔

(۵) ادارے کی نئی شاخوں یعنی شاخ ناگپور و شاخ میسور کے قیام کے جو اجازت نامے معتمد ادارہ نے ارسال کئے تھے ان کی توثیق کی گئی۔

(۶) سرکاری امداد کی شرائط کے بارے میں معتمد نے مجلس انتظامی کو متوجہ کیا۔

طے پایا کہ نواب معین نواز جنگ بہادر، مولوی عبد المجید صدیقی اور معتمد اعزازی ادارہ پر مشتمل ایک ذیلی مجلس اس معاملہ میں غور کر کے ایک یادداشت مرتب کرے تاکہ سرکار میں پیش کی جائے :

(۷) ادارے کی مجوزہ عمارت کے لئے بشیر باغ روڈ پر جس اراضی کا عالیجناب آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر نے انتخاب فرمایا ہے اس کی توثیق کی گئی اور عمارت کے لئے فراہمی رقوم سے متعلق ایک مہم کا آغاز کرنے کا تصفیہ کیا گیا اور اس اپیل کا مسودہ منظور کیا گیا جو عالیجناب نواب زین یار جنگ بہادر اس سلسلہ میں جاری فرما رہے ہیں۔

(۸) چونکہ مذکورہ مسائل کے تصفیوں میں بہت دیر ہو گئی تھی اس لئے پیش نامہ کے حسب ذیل باقی ماندہ امور آئندہ اجلاس کے لئے ملتوی کئے گئے۔

(۱) تحریک مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کہ ادارے کے موجودہ شعبوں میں تبدیلی کی جائے۔
(۲) ادارہ میں شعبۂ کتب دیہی کے قیام کا مسئلہ۔
(۳) شعبۂ نسواں کے دستور اور جدید تنظیم کی منظوری۔

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی
من کی بیلا	۸۰	۰	۸	۰
سرگذشت غالب ...	۹۴	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں	۴۸	۰	۴	۰
سرسید احمد خاں ...	۲۶	۰	۲	۰
سرسالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۳۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر ...	۱۹۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۰	۸	۰
دادا بھائی ...	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ ...	۶۵	۰	[illegible]	۰
عماد الملک ...	۴۰	۰	[illegible]	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۵	۰
دوسری کتاب	۵۶	۰	۵	۰
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر ...	۹۴	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	۰
ہندستانی تمدن ...	۳۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی	۸۰	۰	۱۰	۰
ارتقا ...	۱۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی	۴۸	۰	۶	۰
رسایل طبیہ ...	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۹	۱	۴	۰
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	[illegible]	۰
ہوش کے ناخن ...	۹۴	[illegible]	[illegible]	۰
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹	۱	[illegible]	۰
شاد اقبال ...	۱۷۹	۲	۸	۰
آریائی زبانیں ...	۱۰۴	۱	۰	۰
نظام علی خاں ...	۳۲	۰	۴	۰
تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰	۰
[illegible] اور عربستان ...	۵۶	۰	[illegible]	۰

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی
سحر کا جادو ...	۴۸	۰	۴	۰
طبعیاتی کائنات ...	۹۸	۰	۸	۰
متاع سخن ...	۱۳۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن ...	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادہ سخن ...	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن ...	۱۵۴	۰	۱۲	۰
ایمان سخن ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن ...	۱۳۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
دوم (۵۰)	۳۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی ...	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم ...	۱۹۴	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا ...	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۹	۱	۰	۰
محروم ناصر	۴۱۴	۱	[illegible]	[illegible]
نذر دکن ...	۱۵۴	۱	[illegible]	[illegible]
روح غالب	۲۴۰	۲	[illegible]	[illegible]
[illegible] ...	۲۰۰	۱	[illegible]	[illegible]
دفتری معلومات ...	۵۹	۰	[illegible]	[illegible]
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	[illegible]	[illegible]
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	[illegible]	[illegible]
نمود زندگی ...	۲۱۶	[illegible]	[illegible]	[illegible]
سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	[illegible]	[illegible]	[illegible]
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	[illegible]	[illegible]	[illegible]
بلقان ...	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
خطابیات	۱۱۳	[illegible]	[illegible]	[illegible]
علم خانہ داری	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
چیونٹی (۱۶) تصاویر	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
انوار ...	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
کشمکش [illegible] (۴) تصاویر	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
کارخانہ [illegible] ...	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
رات کا بھولا ...	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
سکندر جاہ ...	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
بلاغت	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ادارہ سفر ۱۹۴۲ء میں	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ناصر الدولہ ...	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
افضل الدولہ ...	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
نواب میر محبوب علی خاں	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
[illegible]

[illegible]

جلد [illegible] | بابت جنوری [illegible] | شمارہ ۱

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

اداریہ

اس شمارے سے سب رس اپنی عمر کے آٹھویں دور
میں داخل ہو رہا ہے اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ زبان اردو
کا یہ جواں سال ماہنامہ اپنی زندگی کے ہر قدم پر اپنے سرپرستوں
اور قدردانوں کی متوقع تمناؤں کا حتی المقدور ساتھ دیتا رہا۔
جس ناسازگار زمانہ میں اس "ہونہار بروا" کی داغ
بیل ڈالی گئی اس کا اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ غیر تو
غیر خود اپنوں کو اس کا یقین نہ تھا کہ حیدرآباد کی اس فضا میں
جو ادبی رسالوں کے لئے خاص طور پر ناساعد سمجھی جانے لگی تھی، اس
نونہال کو پھلنے پھولنے کا موقع نصیب ہوگا اس لئے کہ اس سے
پہلے بھی کئی انفرادی اور اجتماعی کوششیں اس کٹھن راہ میں ہار
مان چکی تھیں اور کئی ادبی ادارے جن کی اٹھان سب رس سے کہیں
زیادہ امید افزا اور جن کی بنیاد کہیں زیادہ مضبوط نظر آتی تھی،
دو چار قدم بھی چلنے نہ پائے تھے کہ تھک کر رہ گئے تھے۔ چنانچہ یہ
کہنا یقیناً خودستائی یا تعلّی نہیں ہے کہ اس سات سال کے پُرآشوب
زمانے میں دکن کے اس رسالے نے جس پابندی اور محنت سے
زبان کی خدمت انجام دی وہ اپنی آپ نظیر ہے جو اصحاب ابتدا
سے سب رس کی زندگی میں دلچسپی لیتے رہے ہیں وہ جانتے ہیں
کہ اس قلیل مدت میں اسے حوادث کے بعض ایسے طوفان آئے
جن کا مقابلہ کچھ آسان کام نہ تھا۔ ابھی وہ اپنی اصلی شان میں طلوع
ہونے بھی نہ پایا تھا کہ جنگ کے خوفناک بادل یورپ کے پُرامن مطلع
کو مکدر کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان سے آگ اور شعلوں
کی بارش ہونے لگی۔ ناممکن تھا کہ مشرق بھی اس خونی سیلاب کی زد میں
نہ آتا اور پھر ہندوستان جو اپنے صنعتی وسائل میں پہلے ہی سے
تہی دست تھا ایسی معاشی الجھنوں سے دوچار ہو گیا جس سے بچنے
کی کوئی سبیل اسے نہ سوجھتی تھی۔
ان غیر معمولی حالات میں دوسری اشیاء کے علاوہ کاغذ کی گرانی
اور کمیابی کا بھی ایک مسئلہ اہل ملک کے سامنے تھا۔ چنانچہ واقعہ ہے

ادبی دنیا کو اس حکم نے کافی [illegible]
گرانی کی وجہ سے [illegible]
گئے۔ پھر اس دور و مصائب میں [illegible]
خیال" کا ایک مطلب ہے جو ایک تفصیل کا متقاضی ہے۔
لیکن سب رس کی یہ زندگی [illegible]
بہی خواہوں کی مرہون منت ہے جنہوں نے [illegible]
صرف اس کی دستگیری کی بلکہ اپنی قدردانی سے اس کا دل بڑھاتے
رہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر ان بزرگان وطن کی ہمدردی و
امداد شامل حال نہ ہوتی تو ادارہ ادبیات اردو کے اس ماہنامہ کو
یہ کامیابی نصیب نہ ہوتی اور یقیناً ادارہ آج بھی ان تمام معاونین
کی قلمی اور روحانی امداد پر بجا طور پر فخر کرتا ہے جن کی بے لوث
محبت اور شفقت اس کے سمند ہمت کو ہر قدم پر تازیانہ کا کام دیتی
رہتی ہے۔
سات سال کے اس عرصہ میں سب رس نے جو ادبی محفلیں
منعقد کیں ان کی اہمیت ارباب علم و فن کی نظروں میں اس وجہ سے
بھی قیمت رکھتی ہے کہ ان مجلسوں میں ملک کے نامور کہنہ مشقوں کے
علاوہ ایسے نوعمر ادیبوں نے بھی حصہ لیا تھا جن کا شمار آجکل کے
اچھے لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ سب رس کے مضامین کی فہرست
پر نظر ڈالئے تو عنوانوں کا تنوع اور سرخیوں کی وسعت اس بات
کا اشارہ کرتی ہے کہ ان نوجوان ادیبوں نے اپنے زور قلم اور تحقیق
اور تلاش سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اگر صحیح طریقہ اختیار کیا جائے
تو ہماری زبان نہ صرف ہر قسم کے خیالات اور جذبات کے بیان کرنے کی
اہلیت رکھتی ہے بلکہ اس میں ایسی ایسی راہیں کھولنے کی صلاحیت
بھی موجود ہے جن پر اضافہ زبان کی نئی نئی بنیادیں ڈالی جاتی
ہیں۔ چنانچہ یہی اس ماہنامہ کا مقصد ہے اور یہی اس کی غرض
بھی۔
اس ضمن میں ہم دو ایک باتیں گوش گزار کر دینا
ضروری سمجھتے ہیں۔ اکثر احباب کو سب رس کی اس حیثیت عملی
پر یہ اعتراض ہے کہ اس کی کوشش میں وہ کسی خاص نقطۂ نظر
کا حامل نہیں رہا ہے اور یہ کہ اسے ہندوستانی کے رسالوں کا [illegible]

[illegible] اصحاب کا [illegible] ... [illegible] تو [illegible] کریں ... [illegible] حال کرلیتا ... [illegible] بھی [illegible] ... [illegible] کی حد بندیاں ہیں ہمیشہ آتا رہے ... [illegible] ... [illegible] آپ بالکل سمجھتے ہیں اس لحاظ سے کوئی ... [illegible] یہ نہیں ہمیں کی خشک علمی یا تحقیقی ... [illegible] جب ہم نہ وہ کرتی ہیں ... [illegible] مثال چند آنکھوں میں ... [illegible] کا تجزیہ کیا اسماعیلیہ مضامین ایک [illegible]

[illegible] ساز کے نے سامان تفریح پیدا کرتے ہیں. بلکہ سب [illegible] ہے کہ وہ [illegible] طبیعت اور ذوق کی [illegible] ذات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے [illegible] سائنس داں بھی ہیں اور ادیب بھی [illegible] ہیں اور فن آموز شاگرد بھی، سرمایہ دار بھی ہیں اور مزدور بھی [illegible] بھی ہیں اور جہلا بھی، غرض کسی کی ہمیشہ [illegible] کہ [illegible] ہر گروہ یہ اندازہ [illegible] مستفید ہو سکے اب یہ بات کہ اس اقدام میں ادارہ کامیاب ہوا بھی ہے یا نہیں، تو اس کا تصفیہ ہم اہل نظر کی آنکھ پر چھوڑ دیتے ہیں.

ادارہ

چاند

(اردو کے مشہور ڈراما نگار محمد فضل الرحمن صاحب کی ایک نظم "چاند" شائع کی جا رہی ہے ان کی بہت کم نظمیں ارباب ذوق تک پہنچی ہیں لیکن ان کی چند نظموں کو پڑھنے یا سننے کا موقع ملا ہے ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ مستقبل میں ایک ایسا شاعر [illegible] ہے جو مقصد یا حقیقت کے اظہار میں آرٹ کے اصلی حسن کو فنا نہیں کرتا بلکہ اپنی فکر و نظر کو شعری لطافت بخشتا ہے)

کروڑوں سال سے تو دیکھتا ہے دنیا کو
زمیں کے بحر و بیاباں کو دشت و دریا کو

یہ دورِ شام و سحر، وقت کا یہ پیمانہ
یہ انقلابِ بہار و خزاں کا افسانہ

یہ سازِ دہر تری انجمن کا اک نغمہ
ترانۂ بزمِ بشر اس چمن کا اک نغمہ

نمودِ معدن و آرائشِ نبات ہوئی
تری ہی آنکھوں کے آگے جواں حیات ہوئی

انہی شعاعوں سے چمکا ہے سینۂ عالم
ہوا ہے مطلعِ انوار دیدۂ آدم

ترے حضور دھڑکتا ہے دلِ سمندر کا
دمکنے لگتا ہے چہرہ فضائے برتر کا

وہ رہروانِ عدم، قافلے وہ ہستی کے
گزرنے والے مسافر زمیں کی پستی کے

[illegible] آنکھوں میں آنکھوں سے پھر نہاں بھی ہوئے
وہ کاروانِ صفت، گردِ کارواں بھی ہوئے

مگر تو بزمِ فلک میں یوں ہی درخشاں ہے
یہ تیری شمعِ تاباں ہمیشہ تاباں ہے

تری نگاہوں میں رنگِ ازل جھلکتا ہے
ابد کا جام ترے ہاتھ میں چھلکتا ہے

کبھی ہلال، کبھی صورتِ مہِ کامل
ہے تیرے راستے میں ارتقا کی ہر منزل

مثال ہے تیرے ہے حال قوموں کا
عروج قوموں کا یا پھر زوال قوموں کا

زندگی بھی ہے گویا روشنی تیری
نظر سے چھپتی ہے لیکن کبھی نہیں بجھتی

اگرچہ پرتوِ خورشید سے ہے نور ترا
ہے قرضِ دام کا جامِ مئے سرور ترا

بلندیوں میں بھی تیرا کوئی مقام نہیں
بہ جرمِ چرخِ بریں کا تو ہم خرام نہیں

زمیں کے پہلو میں تو نے مگر جگہ پائی
مٹا کے دولتِ حسن و متاعِ رعنائی

محمد فضل الرحمن

بی بی

۱۔ دل کی قسمت میں غم لکھا رہا ہے

بی بی کی طبیعت شاید کچھ خراب تھی۔ نرم گدے میں [illegible]
میں وہ کچھ سکڑی پڑی تھی۔ میں نے پوچھا "بھئی بی بی! طبیعت کیسی
ہے؟" "اوہ! آپ ہیں۔ جی ذرا خراب سا ہے" پہلے جو
کی کاہل لڑکی ہے۔ [illegible] سے منہ چھپاتی ہے اور بہانہ بناتی ہے
"جی ذرا خراب ہے" گھنی گھنی پلکوں میں وہ چمکیلی نگاہیں
مسکرا اٹھیں۔ میں کرسی گھسیٹ کر قریب بیٹھ گیا۔ "آخر تمھیں
کیا بیماری ہے۔ بتاؤ تو" "جی۔ ویسے ہی ماندا ہے بیماری
تو کچھ نہیں سردی لگتی ہے" ۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ
پکڑ لیے۔ ٹھنڈی ٹھٹھری نیلی تلیاں مجھے برف لگیں۔ کیسی ٹھنڈی
بجلی تھی یہ۔ میں گھبرا گیا۔ "اور میرے پیر بھی اتنے ہی سرد ہیں"
میں نے اس کے پیروں کو محسوس کیا اور بلا کی ٹھنڈک تھی۔ اس نے
گھبرا کر پیر ہٹا لیے۔ "نہیں نہیں پاؤں نہ چھوئیے" ۔۔۔ میں نے
پوچھا "تم پاتابے کیوں نہیں پہنتیں؟" "جی۔ مجھے دستانوں
اور پاتابوں سے بڑی الجھن ہوتی ہے۔"

"پھر" "پھر کیا۔ بی بی! ابھی اپنے ہاتھوں سے گرم
کر لیے تھے" "تو لاؤ میں گرم کر دوں۔" میں نے دونوں ہاتھ
مضبوطی سے پکڑ لیے۔ ٹھنڈے پالے۔ میری رگ رگ میں سردی
دوڑ گئی۔ کتنی دیر تک میں ان ہاتھوں کو گرماتا رہا۔ اور سوچتا
رہا اس ٹھنڈک میں آگ کدھر دبی ہے جو چپکے چپکے دلوں
کو گرماتی ہے۔ ان سفید نرم ہتھیلیوں کا ہی تو کہیں وہ جادو
نہیں جو دلوں کو یوں نامحسوس طور پر کھینچ لیتا ہے۔ جادو بھری
ٹھنڈک..... "بس بھی کیجیے۔ اب تو ہاتھ گرم ہو گئے۔"
میں چونک گیا۔ "تو پھر لائیے مزدوری!" "کاہے کی؟" "ہاتھ جو گرم
ہو گئے۔" "تو کیا! صرف وقتی طور پر" میرا دل دھڑک اٹھا "تو
لائیے۔ ہمیشہ گرما رہوں" وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ماندا زرد
چہرہ سلونا ہو گیا۔ [illegible] برسات میں کہیں دور [illegible]

ہنس اٹھی۔ "اوہ۔ ہنسو تو سہی۔ [illegible]
ہو سکتی ہیں۔" "بڑا مشکل ہے [illegible]
بھرے تکیوں کے سہارے لیٹ گئی۔ [illegible]
مہندی کی تھیں۔ "ہاں اگر یوں [illegible]
دل میں اگر کوئی چبھن ہو تو"
"ہٹائیے بھی کون [illegible]
[illegible] ضرور ہوں۔ مگر آپ تو ایک [illegible]
ڈاکٹر ہوں۔"
"اور کیا میں ڈاکٹر [illegible] والا اچھا ہوں" "جی!"
"بالکل" "ہوں" "اور سنو۔ ڈاکٹر جی کا بھی [illegible]
اسپیشلسٹ۔ دل کی بیماری جاننے والا۔" "اچھا تو پھر [illegible]
علاج ہوا کرے گا۔ آئے دن طبیعت خراب ہوتی رہتی ہے۔ لیکن
میرا دل تو اچھا بھلا ہے" [illegible]
"یہ تم کیا جانو!" اب اس کے ہاتھ کافی گرم ہو گئے تھے۔
خالہ امی کی آواز آئی۔ میں چائے پینے چلا آیا۔
رات بھر مجھے ٹھنڈی [illegible] آنکھوں کا لمس اپنے ہاتھوں
گردن اور بازوؤں پر محسوس ہوتا رہا۔ ایسے لگا جیسے میرا دہکتا
دل برفیلی قلموں میں جکڑا گیا ہے ۔۔۔ رات بھر میں دہکتے سورج
اور برفیلی چوٹیوں کے خواب دیکھتا رہا۔

(۲)

بی بی بری طرح خفا تھی۔ خالہ امی مسلسل [illegible] سنا رہی
تھیں۔ اور خالو بار بار غصے سے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں
بھی چائے پیتا رہا اور [illegible] کا لطف بھی اٹھاتا رہا۔ خالہ امی کہہ رہی
تھیں۔ "اتنی بڑی ہو گئی۔ سترہ برس یوں گزر گئے لیکن یہ
ڈھنگا پن نہ گیا۔ باوا کو تو کچھ فکر ہی نہیں۔ [illegible] بھی
[illegible] [illegible]
کبھی ہوں یہ [illegible]
ضرور [illegible]
خرابی ہو تو تم جانو۔ پھر یہ [illegible]
[illegible] ۔۔۔

[illegible] کو اپنی [illegible]
[illegible] چمک اٹھیں۔ "ارے!
[illegible] تھی منی؟
[illegible] بھی نہ ہو گی تم سترہ برس کی ہو گی"۔
[illegible] سارا گھر سنبھالا تھا۔
اچھی خاصی [illegible] اور تم بچاری بیکاری
[illegible] کی حماقت [illegible] بیاہ لایا تھا۔
[illegible] بات [illegible] گئی —— خالہ امی فرماتیں۔
[illegible] دیکھ لینا کیسی ماں کا لال ہو گا
[illegible] "اوہ۔ تم [illegible] کر لی [illegible] کا لال
[illegible] —— رانی [illegible] بی بی [illegible] چپ چاپ
[illegible] وہ [illegible] ہوئی اور تیر کی طرح [illegible]
[illegible] برابر [illegible] میں بھی [illegible] پاس
[illegible]

وہ پلنگ پر بیٹھی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ اور چہرہ زیادہ [illegible] تھا، جیسے کوئی اندرونی تکلیف ہو۔ میں نے دیکھا۔ پلکیں اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ میں نے آہستہ سے ہاتھ دبایا۔ اس نے چونک کے آنکھیں کھول دیں۔ ایک لمحہ تک آنکھیں مجھے گھورتی رہیں۔ پھر پلکیں آپ ہی آپ جھک گئیں اور دیر تک جھکی رہیں۔

"رانی! کیا ہو رہا ہے؟" میں نے ہاتھوں کی سردی اپنی گرمی سے [illegible] شروع کی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش میں نے محسوس کی۔

"اوہ رانی۔ بی بی رانی آنکھیں کھول بھی دو۔ یہ کیا حماقت ہے جناب۔ ہم مہمان آئے ہیں۔ اور تم بت بنی بیٹھی ہو۔" اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ہاتھ کھینچ لیا۔ "ہل ——"

"آپ مہمان آئے ہیں۔ بیٹھ جائیے۔ کہیے طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہوں۔ بہت دنوں بعد بھول پڑے۔" فقرہ [illegible] آنکھوں میں زندگی لوٹ آئی۔ میں نے سوچا [illegible] ہو گئی۔

"کیوں رانی! تم خفا کیوں ہو؟" "[illegible]" "خوب! میں رانی کب سے ہو گئی۔ [illegible] بابا پکارا کرتی ہیں۔ رانی بیٹی آپ کو کہاں سے حق حاصل ہو گیا۔" "حق وق ہم نہیں جانتے تم کو پکار لیا، [illegible] صاحب ہم کو۔" "ہشت۔" بڑے صاحب بنے ہیں۔ [illegible] بغیر [illegible] ——"

"یہ کچھ بھی ہو۔ یہ تو بتاؤ تم کو آخر ہوا کیا ہے۔ کیوں خفا تھا۔ [illegible] ہی ہو۔ اور پھر خالہ امی کا [illegible] تمھارا"

"اچھا [illegible] تو بس ایسے ہی بیٹھے بیٹھے ہاتھ دھو کر [illegible] جاتی ہیں۔"

"آخر اس کا سبب بھی تو ہو۔" "کچھ بھی نہیں۔"

"بابا نے جا کو لیٹ کر پیسے نہیں دیئے!" —— "ہوں۔"

"کالج میں سزا ملی تھی!" —— "ہشت۔"

"تمھاری دوستی کو طلاق دے دی!" —— "خدا نہ کرے۔"

"آج پھر طبیعت کس وجہ سے خراب ہے؟" "کوئی نئی بات نہیں۔"

"تو۔ تو .... یقیناً کوئی بات آئی ہے۔ تمھاری شادی ہو گئی!"

"پاگل ہوئے ہیں آپ۔ جانے بھی کیا فضول بات ہے۔"

"فضول کیوں ہے۔ زندگی کی تان اسی پر ٹوٹتی ہے تو کیا؟"

"ہو گا بھی —— اور .... میں تو کسی ڈاکٹر سے شادی کروں گی۔"

"ڈاکٹر کی خصوصیت کیوں؟"

"بھئی اس لئے کہ میں روز روز بیمار ہوا کرتی ہوں۔ اور کوئی ڈاکٹر بھی ٹھیک سے علاج نہیں کرپاتا۔ ایک بیماری کا علاج کروں تو دوسری نئی آ چپکتی ہے۔"

"تو گویا مفت کے ڈاکٹر کے لیے شادی ہو گی؟" "اور کیا۔"

"پھر اپنے دل کا ضرور علاج کرا لینا۔ جو کوئی ضرورت ہے جب ہی تو ہاتھ ٹھنڈے رہتے ہیں۔"

"وہ تو علاج ہو گا۔ جب چاہو جس وقت چاہو۔ ڈاکٹر کے گھر علاج کی کون کمی۔"

"تم شراتی بالکل نہیں بی بی۔" —— "اس لئے کہ آپ شرمیلے ہو گئے ہیں۔"

(۳)

رانی چپکی چپکی سسکیاں بھر رہی تھی۔ چہرہ کا رنگ اڑا اڑا سا تھا۔ گرم پانی کی تھیلیوں پر لیٹی تھی۔ آنسو چہرہ کو پیار کر رہے تھے۔

[illegible] ... کی ... [illegible]
[illegible] ... سے ... کر دی۔
[illegible] ... تھا۔ کہ ان
کا کوئی ظاہر کرتی تھی کہ کسی ...
بھی ... آنکھوں ... جسم ایسی ... زندگی اور
... نہیں ... جلتے ...
... تھے۔ ... آنسو ...
اس بیمار لڑکی سے مجھے ... تھی۔ چپ چپ لیٹی
مجھے تکتی رہی اور پھر ...
"کھیل؟" "ایسے ہی۔ مجھے ... ضرورت نہیں۔ ایسے لگتا
ہے جیسے ... ہو۔" "عجیب بات ہے۔ میری بہت
ساری ... ہیں۔ میں خود عجیب ہوں۔"
"اچھا ... نہ بنو۔ تمہیں کو زیادہ سوچنا نہیں چاہیے۔
میں ڈاکٹر ہوں ... کہہ سکتا ہوں۔"
"تم کب تک ڈاکٹر بنے رہو گے۔ کہیں میں جب تک ختم
نہ ہو جاؤں۔"
"اوہوں ایسا نہیں کہتے۔ بس ذرا سا انتظار درکار ہے۔"
"انتظار! بہت طویل ہوتا ہے انتظار۔" "اب تمہیں کیا تکلیف
ہے؟" "بتا نہیں سکتی۔ بس یہ جانیے کچھ تکلیف ہے۔ لیکن
اب نہیں ہے۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ ہر درد کے بعد میں سو جایا
کرتی ہوں۔" واقعی وہ سو گئی —— زرد زرد کمزور سے چہرہ پر گھنی
پلکیں سو گئیں۔ سیاہ نرم بال بکھر گئے تھے۔ میں نے سلجھا دیے۔
آرام کی نیند سو جائے۔

میں نے ... لحاف اڑھا دیا۔

(۴)

بی بی کی ماں ... جیسی بجا رہی تھی۔ میں نے سیکڑوں دفعہ اسے
ہنسی کی تانوں سے کھیلتے دیکھا تھا۔ لیکن ایسا دکھیا راگ،
دل کی گہرائیوں کو ٹٹولنے والا، سوئے ہوئے خوابوں کو جگانے
والا میں نے کبھی نہیں سنا تھا۔ بہت دیر تک وہ بجاتی رہی۔
بہت دیر تک میں ... ۔ اس ہنسنے کھیلنے والی لڑکی

کہ ... گھن لگ سکتا ہے۔ ... [illegible]
ڈاکٹر ... روز روز نئی بیماریاں ...
... کو ... بیماری ہے ...
لیکن دل کی بیماریوں کا اندمال ...
... کے قصے سنانے آیا تھا۔ اس سے ...
باتیں سننے آیا تھا۔ ... کی ... ۔ میں ... کا
قائل نہیں۔

ننھی روتے روتے خاموش ہو گئی۔ ...
آنچل سے آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ...
گر گر کے تھک گئے تھے۔ میں ... پاس جا کر
بیٹھ گیا۔ وہ سیدھی ہو بیٹھی۔ وہ ...
گفتگو کا موضوع ڈھونڈ رہا تھا۔ "اچھا کس رنگ کا ...
ہے کہ ... رنگ کا وہ ... ہو۔ ... سفید رنگ
تو کوئی رنگ نہ ہوا۔ ... کوئی زندہ رنگ بتاؤ۔" " ...
زرد۔ سرخ۔ سبز ..." "واہ کیا ... ۔ لیکن ...
زرد سی ہو۔ کوئی سا رنگ نہیں کھلتا۔" "یہ کس ... نے
بتایا تمہیں؟" "میں نے خود سمجھ لیا۔" "ارے واہ۔ زرد زرد
چہرہ تمہارا۔ ملاحت کی بات ہی اور ہے۔ کیوں نہیں رنگ سجتا۔
اس کے علاوہ انسان میں کشش ہونی چاہیے۔" "تو مجھ میں
ہے یہ کشش۔ کوئی نئی بیماری؟" "ہے کیوں نہیں۔" "کاہے سے
پیدا ہوتی ہے؟" "مقناطیسی مادہ زیادہ ہونے سے۔ جو لوہے کو
اپنے طرف کھینچ لیتا ہے۔ اور ویسے جسم کا ... کھلتی ہوئی ہو ...
ذرا سرخی آ جائے تو یہ زردی صرف ... کو کھینچ سکتی ہے۔ جبکہ
دلوں کو نہیں۔" "عجیب گورکھ دھندا ہوتا ہے ..." ...
تو کیسی ہیں آپ کی شیلا ... ہماری ہیلن —— اوہ ہاں کیا
نام ہے اس کا جو آپ کی ساتھی ہے۔ ارے وہی ...
میں بھول گئی ہاں وہ ... ۔ پرسوں دیکھا میں نے ...
میں نیلی ساڑھی پہنے ایسی پیاری لگ رہی تھی جی چاہا پیار کر لے ——
"کیا چاہا تمہارا؟" —— "یہی کہ اس کو چھو کر دیکھوں۔ سچ
جو ... شادی ... اس سے ..."

[illegible]
[illegible] کہاں [illegible]
[illegible]
[illegible] تھی کہ اس کا زرد چہرہ کیا ہو گیا۔ گہری آنکھیں [illegible]
[illegible] ایک لمبی سی سانس میں نے [illegible]
[illegible]

[illegible] جلدی جلدی [illegible]
[illegible] اس کی چال [illegible] تھی۔ میں [illegible]
[illegible] کیا ہے

[illegible] زرد رنگ کا [illegible] تھی۔ زعفران زرد، آنکھیں زرد۔ [illegible] زرد زرد چہرہ۔ [illegible] کسی سے کہا اور چاہا انجان گو بن جاؤں کہ اس نے آواز دی "ڈاکٹر صاحب!" کوئی قوت مجھے بلا رہی تھی۔ میں مجبور ہو کر [illegible] کمرے میں گیا۔ [illegible] خوشبو مہکی ہوئی تھی۔ وہ [illegible] گئی۔ [illegible] بٹھایا: واہ یہ کوئی بات ہے کہ آپ ایسے انجان [illegible] میں خیر سے ابھی پورے ڈاکٹر بھی نہیں بنے آپ۔ ایک لمبا چوڑا سال اور باقی ہے۔ مگر ابھی سے جناب اکڑ رہے ہیں۔ جانتے بھی ہیں کون ہوں گی آپ کی مریض ——"

اس نے ایک سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کوئی چیز میرے حلق میں پھنسی ہوئی تھی۔ کوئی انوکھا درد میرے دل میں دھڑک رہا تھا۔ میں سمجھ نہ سکا کہ وہ خوش ہے یا رنجیدہ۔ بال زیادہ سیاہ اور بکھرے ہوئے تھے۔ پلکیں اور زیادہ لرزاں تھیں۔ ہونٹ البتہ خاموش سے تھے۔ اداس اور آنکھیں جانے کیا کہتی تھیں میں سمجھ نہ سکا۔

"اور دیکھئے۔ آپ نے تو جیسے گونگے کا گڑ کھا لیا ہے۔ آج بہت دنوں پر مٹھائی یاد آ گئی۔ کھائیے نا مٹھائی۔ سچ بڑی مزیدار ہے۔ اور لیجئے آپ کا پسندیدہ حلوا سوہن، قلاقند اور ——" "رہنے بھی دو۔" بڑی مشکل سے میں کہہ سکا۔ "مجھے اب مٹھائی پہلے جیسی کچھ پسند نہیں ہے۔" "ہاں ہاں آج کل تو آپ اپنے مریضوں کو شاید کڑوی دوا پلانے لگے ہیں۔ ڈاکٹر جو ہوئے۔"

کہ تم [illegible] —— "بابا کرو [illegible] کے شوق [illegible] سے [illegible] سمجھا [illegible] ہے خیر —— آپ تو کوئی بات نہیں [illegible] —— میں سمجھ نہ سکا وہ کیسے [illegible] طنز ہو کہ تم اظہار خوشی [illegible] بجھے بجھے [illegible]

"اب تو بہت لمبی ہو جاؤں گی کہ جاگیردار [illegible] کا جھگڑا تو نہیں ہے۔ ماضی کو بھلا دینا کیسے [illegible] بھی [illegible]۔ اچھا جائیے چلے جائیے۔ شکریہ آپ کی تحفہ آپ کی [illegible] ہوتا۔ میں نے یونہی روک لیا تھا باتیں کرنے کو۔ اب باتیں ختم ہو گئیں۔ جائیے شاید کوئی انتظار کرتا ہو۔" یہ کہتے کہتے وہ بستر پر گر پڑی۔ آنکھیں کھلی ہوئی [illegible] تھے۔ بال بہت زیادہ بکھر گئے تھے۔ میں اس کے بالوں کو سلجھاتا رہا کتنے خوبصورت بال تھے اور پیشانی۔ میں نے ان ہاتھوں کو تھام لیا۔ بدستور سرد سرد ہاتھ تھے۔ بلکہ ہمیشہ سے زیادہ سرد۔ زندگی خدا جانے کہاں سوئی ہوئی تھی۔ شاید پھر ان ہاتھوں کو گرم کر سکوں۔ میں خود کس قدر جل سے گرم ہو گیا۔ مجھ میں کتنی سوزش تھی۔ اب تو آگ بھڑک اٹھی۔ میں اس کی سرد نرم ہتھیلی، انگلیوں کو محسوس کرتا رہا آہستہ سے دبایا اور چھوڑ دیا۔ میں نے اپنی زندگی آخری بار اس میں منتقل کر دی۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں ان پلکوں کی آڑ میں میری زندگی چھپی تھی۔ کدھر، کہاں! میں یونہی دیکھتا رہا —— اور چلا آیا۔ بغیر مقصد کے۔

(٦)

بی بی بیمار ہے۔ زیست کی امید نہیں۔ تحلیت کی شدت ہے......

میں خدا جانے کیا کیا سنتا رہا۔ میں تو سمجھتا رہا تھا کہ اسے نئی زندگی مل گئی۔ اس کے سب دکھ دور ہو گئے۔ اس نے خود ہی تو کہا تھا کہ اب سے ڈاکٹروں اور ان کی کڑوی دوا کی ضرورت نہیں۔ پھر —— کسی میٹھے شربت کی بجائے وہ

[illegible] تھا زندگی کا زہر [illegible] پھر وہ سخت بگڑ گیا۔ ڈاکٹر [illegible]
بنا تھا۔ کس لئے بنا تھا۔ دل کے چند ٹکڑوں کو جوڑ کر
پھر کہاں گیا مقصد۔ کہ ہر بے جواحترت کا ملال۔ خدایا آخر کیا
وہ ساری [illegible]

میں جب کمرے میں پہنچا تو سفید چادر پر بی بی بے ہوش
لیٹی تھی۔ چہرہ زرد تھا۔ پلکیں نا معلوم تھیں۔ ہاتھ برف سے
بھی ٹھنڈے تھے۔ چہرہ پر سیاہی [illegible] خشک ہوا تھا۔ وہ سخت مجھے
وقت سرکرہ رہتا تھا۔ جاگیردار صاحب پاس کھڑے تھے۔ کسی طرح
جان نکل جانے سے مجھے ان سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ اب
تک ہر چیز پا چکے تھے۔ اب وہ بہت جلد کھو دیں گے۔ تو کیا
میں نہ کھو دوں گا۔

میں تو کبھی کا کھو چکا تھا ——

میں نے دیکھا بھالا۔ بے ہوش بی بی کی رگ رگ کو
میں نے محسوس کیا۔ آج تک کسی بیماری کا بھی اس نے کھلا اظہار
نہیں کیا تھا۔ اب میں سب کچھ جان رہا تھا۔ کمزور پیٹ خود ہی
مشکل چھپ سکا تھا۔ پھولنا پھلنا عذاب ہو گیا۔

آپریشن آخری کوشش تھی۔ میں نے اجازت طلب کی۔
پھر بھی جان بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے میں نے
کام کیا۔

دو گھنٹے بعد بی بی کو جیتی جاگتی بچی پیدا ہوئی۔ میری
آس بندھ گئی۔ شاید ماں بھی زندہ رہ جائے۔ چھ گھنٹے بعد
ہوش آیا۔ میں نے ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے کر گرمانا شروع
کیا۔ ان ہاتھوں میں اب جان نہ تھی۔ میری گرمی لوٹ آئی۔
آنکھیں کھلیں۔ رونق ساری آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔
اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

ڈاکٹر صاحب ہونٹ کھل گئے۔ [illegible]
اچھا کر دیجئے۔ بیماریاں اب ختم ہو چکی ہیں۔ [illegible]
مجھے یقین نہ تھا کہ یہ زندہ رہ سکیں گی۔ ابا صاحب
رو رہے ہیں۔ ڈاکٹر ہو کر۔ جاگیردار صاحب [illegible]
بھی ہے ان کی چاہت قدرت سے لاؤ ڈاکٹر۔

آپ تو ڈاکٹر ہیں نا۔ ذرا [illegible]
گے۔ انہیں چنگا کیا کیجئے۔ [illegible] ڈاکٹر
ڈاکٹر بھیا —— دل کے چند ٹکڑے جوڑنے والے —— ڈاکٹر
ڈاکٹر —— آ

زندگی ختم ہو گئی۔ کشمکش باقی نہ رہی۔ درد کا احساس
ہٹ گیا۔ چہرہ چمک اٹھا۔ ہاتھوں میں جانے کہاں سے
گرمی آ گئی۔ اور ہونٹ مسکرا اٹھے۔ نہ جانے [illegible]
رہائی پا گئے۔

بال بکھر گئے تھے میں نے انہیں سلجھا دیا۔ تکیوں کے
سہارے وہ گدے پر پڑی تھی۔ نازک نازک سی۔ [illegible]
ہو گئے۔ آرام ہی آرام ہے۔ میں نے پلکوں کی آڑ میں
دیکھنا چاہا۔ وہی ابدی نیند تھی۔ میں نے ہاتھوں کو محسوس
کیا۔ بالوں کی نرمی کو چوم لیا اور اسے سفید بے داغ چادر
اڑھا دی۔

پھر میں —— نہ جانے کیوں کر ننھی چند گھنٹوں کی
جان کو اٹھائے سینے سے لگائے چلا آیا۔ اسے اکیلا چھوڑ کر
انتظار کرنے کو۔ بی بی —— !

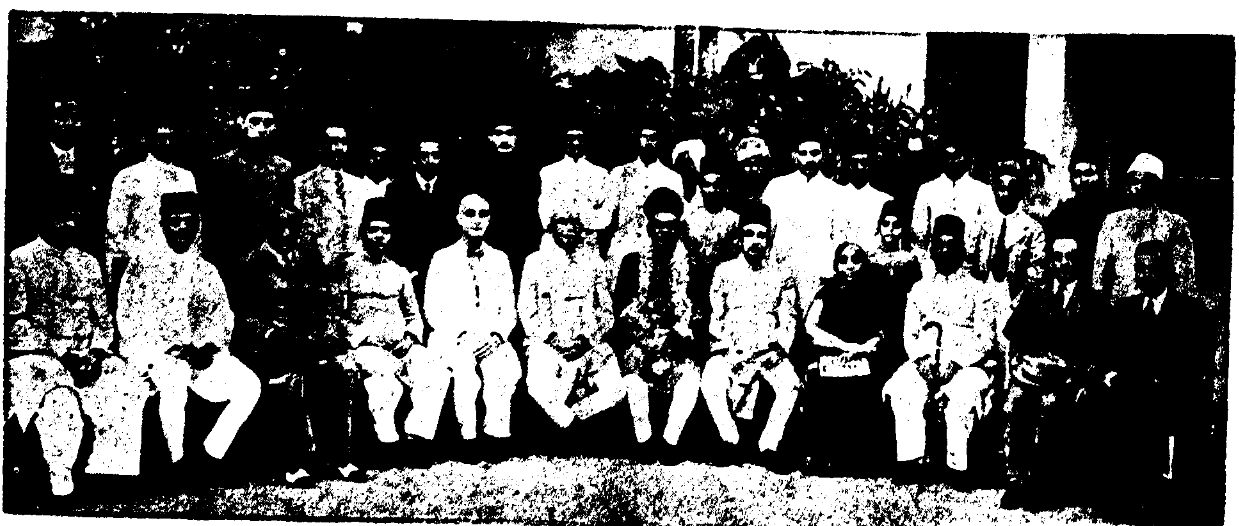
زینت ساجدہ

اطلاع — نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ براہ کرم اپنا چندہ روانہ فرما کر باضابطہ رسید حاصل فرمائیے۔



جلسہ تقسیم اسناد اردو امتحانات ۱۹۴۴ع

جنرل والاشان ڈاکٹر شہزادہ معظم جاہ بہادر نے صدارت فرمائی اور
شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ نے ۱۹۴۳ع کے کامیاب
امیدواران اردو امتحانات کو اسناد اور تمغے تقسیم فرمائے۔



ارباب ادارہ ادبیات اردو

ادارے کے نائب صدر آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر کے عہدہ صدرالمہامی پر فائز ہونے کی
مسرت میں جو عصرانہ ۱۳ اکتوبر ۴۴ع کو دیا گیا تھا اسکا ایک عکس

شمس الامرا کے سائنسی کارنامے

(سلسلہ گزشتہ)

(۱) بیرم جس کو کل بھی کہتے ہیں (۲) چرخ و محور یعنی وہ چہرہ جو اپنے محور کے ساتھ گردش کرے۔ (۳) بکرہ یعنی وہ چرخ جو اپنے محور پر گردش کرے (۴) سطح مائلہ (۵) اسفین جس کو پچر بھی کہتے ہیں (۶) لولب اس کا دوسرا نام اسطوانہ ہے۔

ان آلات کی مدد سے بھاری وزن کی چیزوں کو آسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا سکتے ہیں۔ ان کی مدد کے بغیر انسانی قوت کام نہیں آتی۔ پندرھویں اور سولھویں گفتگو میں بیرم کی تعریف اور اس کے استعمال کے طریقے بتلائے گئے ہیں۔ بیرم کی تین اقسام کو مثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ سترھویں گفتگو میں جر ثقیل کے دوسرے آلے چرخ و محور کا بیان ہے جس کو "اصل قوت دوم جر ثقیل" کہتے ہیں۔ اس قوت کے عمل کو چرخ، ڈول اور رسی کی مثالوں سے سمجھایا گیا ہے۔ اٹھارہویں گفتگو میں بکری کے آلے کا بیان ہے جو جر ثقیل کی تیسری قوت ہے۔ بیسویں گفتگو میں پانچویں قوت کا بیان ہے جو اسفین آلے سے حاصل ہوتی ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ انسان تر میخیں اور حیوانوں کے دانت اسفین کا عمل کرتے ہیں۔ اس قوت سے لکڑی اور پتھر وغیرہ پھوڑنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اور جہاز کے نیچے دکر اسے تھوڑی بلندی پر اٹھا سکتے ہیں۔ اکیسویں گفتگو میں جر ثقیل کی چھٹی قوت کو بیان کیا گیا ہے جو لولب یا اسطوانہ کے آلے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس قوت سے بھاری چیزوں کے اٹھانے اور دبانے کا کام لیا جاتا ہے۔ صحاف اس آلہ کی مدد سے ضخیم کتابوں کو شکنجہ میں دباتے رہیں تاکہ کتاب کی ضخامت دب جائے۔

"فائدہ" کی سرخی کے تحت شاقول کی قوت کا بیان ہے جس کا جر ثقیل سے قریبی تعلق ہے۔ اس قوت سے وقت کے شمار کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے اسی کلیہ کی مدد سے گھڑیال کے لاٹ تیار کئے جاتے ہیں۔

اصل کتاب کے ختم پر گفتگو سے متعلقہ سوالات کی فہرست دی گئی ہے تاکہ استاد شاگردوں سے سوالات کر کے جوابات پوچھے۔ انگریزی کتابوں میں جن سے ترجمہ کیا گیا ہے ایسا نہیں ہوا بلکہ ان کتابوں کے سوالات اور تعریفات کو ایک علحدہ کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس بارے میں کتاب کے ختم پر "پوشیدہ نہ رہے" کی سرخی کے تحت حسب ذیل عبارت درج ہے:

"حکیم ریورنڈ جائس صاحب نے ۱۸۰۰ء میں سات کتابیں علوم ریاضی کی تیار کر کے چھپوائی تھیں ان میں سے چھ کتابیں .... ترجمہ کر کے ستہ شمسیہ نام رکھا گیا اور باقی ساتویں کتاب تعریفات اور سوالات علوم مذکور میں اس واسطے لکھی تھی کہ علوم مذکور کی تحصیل کے بعد شاگردوں سے ہر ہر علم کے امتحان کے لئے سوال کر کے جواب استادوں سے سنے کریں یاد ہے یا نہیں اور ہم نے اس حکیم کے آئین کو بہتر جان کر ساتویں کتاب کا بھی ترجمہ کیا مگر اس میں سے ہر ہر علم کی تعریفات اور کیفیات اور سوالات علحدہ کر کے ہر علم کے رسالے میں اسطور شریک کئے کہ آغاز رسالے میں دیباچہ کے بعد تعریفات اور کیفیات اور آخر رسالے میں سوالات اس کے داخل کرنے میں آئے تا استاد ہر علم کی تعلیم کے بعد اسی کتاب سے شاگردوں سے سوالات کر کے جوابات پوچھے تا دوسری کتاب سے سوالات کی احتیاج نہ ہو۔ تمت بالخیر۔"

کتاب کے آخر میں تین صفحات کا غلط نامہ اور (۴) صفحات میں علم جر ثقیل کے آلوں کی (۳۰) اشکال شریک ہیں جو لیتھو میں چھاپی گئی ہیں۔ ان اشکال پر نمبر درج ہیں اور کتاب میں جہاں جس شکل کا ذکر ہے حاشیہ پر وہی نمبر لکھا ہوا ہے تاکہ پڑھنے والے کو شکل تلاش کرنے میں دشواری نہ ہو۔

اس رسالہ میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ قدیم اردو ہے

حسب ذیل جملوں سے اس کی قدامت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً

"متوجہ طرف تمھاری تعلیم کے ہوتا ہوں۔"

"ساتھ ایسے ہی اعلیٰ مراتب کے متصف ہے۔"

"مسوط کر موسوم ہے۔"

"عرض خدمت رکھتا ہوں۔"

"آپ نے یہ بات پرسوں کے دن فرمائے تھے۔"

اکثر جگہ ایسے الفاظ اور املا کا استعمال کیا گیا ہے جو اب معیاری اردو میں متروک ہو چکے ہیں مثلاً

وہ کی بجائے وے
کو " " تئیں
مٹی " " مائی
کنویں " " کوتے
بحث " " تکرار
کسی کو " " کسو کو
بندھنا " " موندھنا
ان سے " " ون سے

بعض حروف اور الفاظ کا رسم الخط بھی مختلف ہے مثلاً

ٹ ——— تؕ
ڑ ——— رؕ
سننے ——— سنے
فٹ ——— فوٹ
ٹوٹ ——— توٹ

بعض انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ کیا گیا اور بعض کا نہیں کیا گیا بلکہ ان کی اصلی شکلیں اردو میں برقرار رہیں مثلاً

Pudding	پڈین۔
Cork	چوب شولہ۔
Spunge	اسفنج۔
Line of direction	خط راہ۔
Air pump	ایر پنپ۔

علم ہیئت

یہ رسالۂ ستۂ شمسیہ کی دوسری جلد ہے جو (۳۲۴) صفحات پر مشتمل ہے ابتدا میں دیباچہ فہرست وغیرہ کے (۳۱) صفحات اور آخر میں دو صفحات کا غلط نامہ اور (۴) صفحات پر متن سے متعلق (۴) اشکال ہیں جن میں اجرام فلکی مثلاً ثوابت۔ سیارگان۔ بارہ برج اور زمین کی گردش وغیرہ کو بتلایا گیا ہے۔ صفحہ (۲) پر علم ہیئت کے آلات کو تصاویر سے واضح کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی غرض وغایت اور سنہ طباعت سے متعلق اسی صفحہ پر حسب ذیل عبارت درج ہے۔

"دوسری جلد ستۂ شمسیہ کی جو علم ہیئت میں ہے ...... طلبہ کی تعلیم کے واسطے سرکار شمس الامرا بہادر امیر کبیر کے سنگی چھاپے خانہ میں شہر فرخندہ بنیاد حیدرآباد کے درمیان ۱۲۵۵ھ میں مطبوع ہوئی۔"

یہ بھی ریورنڈ جانس صاحب کے انگریزی رسالہ کا اردو ترجمہ ہے جن انگریزی اصطلاحوں کا عربی اور فارسی میں ترجمہ نہ ہو سکا ان کو اسی طرح اردو میں لکھ دیا گیا ہے۔

رسالہ کی ابتدا میں (۳) صفحات کی فہرست ہے جو دیباچہ اور (۲۶) گفتگوؤں پر مشتمل ہے۔ صفحہ (۶) اور (۷) پر علم ہیئت کی (۲۰) اشکال کی تفصیلی فہرست دی گئی ہے۔ دیباچہ کے بعد (۱۶) صفحات میں علم ہیئت کی تعریفات اور بیانات کو درج کیا گیا ہے تاکہ طالب علم اصل کتاب پڑھنے سے قبل انھیں یاد کریں اور کتاب کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ مثلاً ثوابت۔ سیارے۔ نظام شمسی۔ خط استوا۔ حرکت سالانہ۔ زمین۔ الکس۔ گہن۔ عطارد۔ زہرہ۔ مریخ۔ مشتری۔ زحل۔ ہرشل۔ دمدار تارے وغیرہ اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔

"پہلی گفتگو" میں اجرام علوی کے متعلق استاد شاگرد کے سوالات و جوابات درج ہیں۔ اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

" تلمیذ کلاں۔ قبلہ و کعبہ آج کی شب آسمان اس قدر

سادہ اونفاست پاک ہے کہ کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا۔

شاگرد۔ جناب واقعی بجا ہے ہم نے سچ عرض کیا سبب کہ وقت شفق ہی جس قدر چار سو نظر کرتا ہے تارے بیحد نظر آتے ہیں ان کو شمار کرنا دشوار کیونکہ سنا ہوں استادوں نے ان کو شمار کیا ہے۔۔۔۔ اس متعمہ مشکل کی راہ ہدایت مجھ پر روشن فرمائیے۔

استاد ـــــ ابھی نہیں چند روز توقف کرو۔۔۔۔۔۔

بالفعل اس ایک امر کی تعلیم تم کو میری مد نظر ہے۔ سنو جب تم شب کو اوپر بصارت یعنی منتہائے امتداد نظری سر پر کا جس کو آسمان کر تعبیر کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ فقط آنکھ سے دیکھتے ہیں وے نجوم بید جو ہم کو نظر آتے ہیں صرف باصرے کا دھوکا ہے۔۔۔۔۔۔ بدون استعانت دوربین کے ہزار سے زیادہ تارے نہیں نظر آتے۔ پس یہاں سے ثابت ہوا ظاہراً ہم کو جتنے تارے نظر آتے ہیں دراصل وے سب تارے نہیں ہیں بلکہ تخیلہ باصرے کا ہے۔

دوسری گفتگو میں ثوابت کی وجہ تسمیہ۔ شکل۔ اقسام ان کے نام اور محل و قوع کو سمجھایا گیا ہے۔

تیسری گفتگو میں ثوابت اور منطقۃ البروج کی تعریف اور اس کے متعلقات کا ذکر ہے۔ مختلف تاروں کے نام اور ان کی خصوصیات بھی بتلائی گئی ہیں۔ چوتھی گفتگو میں تقویم کے علم سے بحث کی گئی ہے۔ چھٹی گفتگو نظام شمسی کے مسائل پر مبنی ہے جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ آفتاب اپنے مرکز پر قائم ہے اور اس کے اطراف (۷) سیارے اور (۱۸) چاند گردش کرتے ہیں۔ ۵۰۰ ق م میں یونان کے ایک ہیئت داں فیثاغورس نے اس نظام کو دریافت کیا۔ چھٹی گفتگو میں زمین کی شکل گول ثابت کرنے کے لئے مختلف مثالیں دی گئی ہیں۔ زمین کے محور، قطبین اور خط استوا کی تعریفات بیان کی گئی ہیں۔ ساتویں گفتگو میں زمین کی روزانہ گردش کا حال لکھا ہے اور بتلایا ہے کہ زمین اپنے محور پر (۱۰۰۰) میل فی ساعت گھومتی ہے۔ اسی طرح آٹھویں

اور نویں گفتگو میں روز و شب اور زمین کی سالانہ گردش کا بیان ہے۔ بارہویں گفتگو تک موسموں کی کیفیت اختلاف اور اعتدال پر معلومات درج ہیں۔ تیرہویں گفتگو میں سال کبیسہ اور اس کے پہچاننے کا قاعدہ بتلایا گیا ہے۔ چودہویں گفتگو میں چاند کی گردش کا ذکر کر کے سال کو بارہ مہینوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پندرہویں میں خسوف و کسوف۔ سولھویں اور سترہویں میں مد کا حال لکھا گیا ہے۔ اٹھارہویں گفتگو سے لیکر پچیسویں گفتگو تک مختلف سیارے مثلاً عطارد۔ زہرہ مریخ مشتری۔ زحل۔ آفتاب اور دار ستاروں کے متعلق تفصیلی معلومات درج ہیں۔ چھبیسویں گفتگو میں پھر ثوابت کی بحث چھیڑ دی گئی ہے۔ کتاب کے ختم پر سیاروں کی جدولیں دی گئی ہیں جو آستو صاحب کی کتاب "پیا آرا ما" سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں۔

اس رسالے کا اسلوب بیان اور خصوصیات زبان تقریباً وہی ہیں جو پہلے رسالے کے سلسلہ میں بیان ہو چکی ہیں۔ فارسی اور عربی الفاظ کی بہتات ہے۔ مثال کے طور پر ان میں سے چند یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

فارسی الفاظ۔ اندک۔ بنابر۔ درمنولا۔ یہ آئین۔ ہمین ہمہ جا وغیرہ۔

عربی الفاظ۔ مرئی۔ تفحص۔ موہومہ۔ کماہی۔ کماینبغی۔ سریع۔ بطی۔ محتجب وغیرہ۔

متروکات۔ دیکھے۔ کیکے۔ غلطت۔ کسو۔ سرکتے۔ تئیں وغیرہ۔

کواکب کے اقدار کی علامتیں یونانی حروف میں لکھی گئی ہیں۔ یونانی زبان میں الف کو الفا اور ب کو بیتا اور ج کو گیما اور د کو ڈلٹا کہتے ہیں۔ علامتیں یہ ہیں۔

علامت قدر اول کے کوکب کی الفا - α
" " دوم کے " " بیتا - β
" " سوم کے " " گیما - γ
" " چہارم کے " " ڈلٹا - δ

عبارت کا نمونہ ہے۔ "پیش از طلوع آفتاب جب مشرق طرف نظر

آتا ہے ستارۂ صبح کاہی اور جب بعد از غروب آفتاب مغرب طرف دکھلائی دیتا ہے ستارۂ شام کاہی کہلاتا ہے۔ پس جب زہرہ ایک مقام میں ہوتا ہے بشرطیکہ نقطۂ تقاطع پر نہو وے ناظر زمین کی نظر سے بالکل محجوب۔"

رسالہ کیمسٹری تقطیع ۹/۰ ۔ حجم (۲۱۰) صفحات سنہ طباعت ۱۲۶۱ھ ۔ یہ کتاب بھی سوال وجواب کے طریقہ پر لکھی گئی ہے۔ پہلی گفتگو سے لیکر بارہویں گفتگو تک علم کیمسٹری کے مسائل کو سمجھایا گیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ کیمسٹری کا ترجمہ کیمیا نہیں کیا گیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوئی کہ کیمیا کا لفظ اردو میں ایک خاص مفہوم کو ادا کرتا تھا۔ ابتدا میں حمد کے بعد لکھا ہے۔

"دانشوران ذو فہم پر پوشیدہ نہ رہے کہ یہ رسالہ ہے مختصر چند اصول کیمسٹری کے بیان میں کہ اس علم میں ترکیب عناصر کی حقیقت جو زبان فرنگ میں اس کو کیا کہتے ہیں پائی جاتی ہے اور یہ علم بہت عجیب وغریب ہے کہ اس کی تحصیل اہل حکمت کو ضرور اور لازم ہے اور یہ علم اہل فرنگ کی زبان میں مندرج تھا لیکن حال میں ایک رسالہ اس علم کا ہندوستان سے شہر آگرہ کا چھپا ہوا ایسا آیا تھا کہ اس میں ایک صفحہ انگریزی زبان کا اور دوسرا صفحہ اس کے ترجمے کا اردو زبان میں لکھا ہوا تھا اگرچہ دو دوبارہ محتاج چھاپنے کا نہ تھا مگر یہاں طالبوں کے فائدہ کے لئے اس کے اردو ترجمے کو علیحدہ لکھوا کر چھپایا گیا۔"

پہلی گفتگو میں علم کیمیا کی تعریف اور اربعہ عناصر کا بیان ہے۔ دوسری گفتگو میں قوت حرارت اور تھرمامیٹر کی خاصیت بیان کی گئی ہے۔ تیسری گفتگو میں گرمی کا اثر پانی پر بھاپ اور برف کے متعلق معلومات درج ہیں۔ چوتھی گفتگو میں ہوا کا بیان ہے جس میں آکسیجن اور نیٹروجن کے خواص کو سمجھایا گیا ہے۔ پانچویں گفتگو میں جمادات کا ذکر کرتے ہوئے گندھک اور فاسفورس کے خواص تبلائے گئے ہیں۔ چھٹی گفتگو میں کوئلے اور کاربن کا بیان ہے۔ ساتویں اور آٹھویں گفتگو میں فلزات اور دھاتوں کے پگھلانے کے طریقے سمجھائے گئے ہیں۔ نویں گفتگو میں سوڈیم اور پٹاشیم کے خواص کی تشریح کی گئی ہے۔ دسویں گفتگو میں امونیا پٹاس اور سوڈا کی خاصیتیں بیان کی گئی ہیں۔ گیارہویں گفتگو میں خاک اور اس کے متعلقات مثلاً چقماق، چکنی مٹی، چونا اور میگنیشیا کے خواص کو گنایا گیا ہے۔ بارہویں گفتگو میں مختلف ایسڈ اور سالٹ کے خواص اور ان کے بنانے کے طریقے تبلائے گئے ہیں۔

اس کتاب کی زبان اور اسلوب بیان میں وہ سادگی اور روانی نہیں پائی جاتی جو شمس الامرا ہی کی لکھوائی ہوئی ایک کتاب "کیمسٹری کا مختصر رسالہ" میں پائی جاتی ہے۔ بعض الفاظ کا املا اس طرح لکھا گیا ہے مثلاً

تھنڈھا (ٹھنڈا)۔ بھاپھ (بھاپ) چھوٹی (چھوٹی) گرا (گرھا) وغیرہ۔

دکنی اردو کے بعض الفاظ یہ ہیں۔

آدھون۔ آدھا۔ بجاہروار۔ دھڑک۔ وغیرہ

اکثر انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔ انہیں اسی طرح رکھ کر مفہوم سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً ڈیکامپوزیشن۔ الیکٹرسٹی۔ نیٹرک آسڈ۔ تھرمامیٹر۔ کنڈکٹر۔ نان کنڈکٹر (بعض جگہ نن کنڈکٹر بھی لکھا ہے) سپٹن سلٹ۔ میگنیشیا۔ کاسٹک ایرچیپ وغیرہ۔

جن اصطلاحات کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں۔

قوت جاذبہ۔ رغبت	Attraction
جامد	Solid
سیال	Liquid of fluid
ہوائی	Gas
سنگ چقماق	Flint
شعلہ گیر	Inflamable
نشاستہ	Starch
حرارت	Heat

خاک Earth
کشتہ Axide
چونا Lime

نمونۂ عبارت ملاحظہ ہو۔

س۔ آپ نے آگے کہا کہ پانی کا بخار ہوا سے مل جاتا ہے۔ ہوا کیا شئے ہے۔

ج۔ ہوا میں دو چیزیں ہیں آکسیجن اور نیٹروجن۔ آکسیجن پانچواں حصہ ہے۔ اور باقی نیٹروجن ہے۔

س۔ ان دونوں شئے کی تعریف کیجئے۔

ج۔ جب نیٹروجن آکسیجن سے جدا کیا جاوے تو اس میں نہ کوئی جاندار سانس لے سکتا ہے نہ شعلہ جل سکتا ہے نہ پھول کھل سکتا ہے نہ نباتات اُگ سکتی ہے۔ غرض کسی شئے کی زندگی نہیں ہو سکتی اور آکسیجن وہ شئے ہے کہ ضرور ہے واسطے جلنے کے اور دم لینے کے۔"

اصل انگریزی کتاب اور مصنف کا نام نہیں دیا گیا ہے اور اس کی بھی صراحت نہیں کہ ترجمہ کسی ایک شخص نے کیا یا جماعت نے۔ (نمبر ۴۰۵ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ)۔

علم آب یہ کتاب ستہ شمسیہ کی تیسری کڑی ہے جو دیباچہ اور بائیس گفتگوؤں پر مشتمل ہے۔ دیباچہ کے سوا کتاب کا حجم (۳۱۲) صفحات ہے آخر میں چار صفحات کا غلط نامہ اور تین صفحات پر علم آب سے متعلق (۳۶) اشکال درج ہیں۔ دیباچہ میں اس رسالے کی تالیف کا مادہ تاریخ مذکور ہے جو یہ ہے۔

شمس الامراء کی ہے یہ تالیف
۱۲۵۴ھ

ایک سرخی "تعریفات اور کیفیات علم آب" کے تحت بارہ صفحات میں مختلف اصطلاحوں اور آلوں کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ پہلی گفتگو سے لیکر پندرھویں گفتگو تک علم آب کی حقیقت، سیال اجسام کے اوزان، دباؤ اور ان کی حرکت سے متعلق جملہ امور کو سمجھایا گیا ہے۔ سولھویں اور سترھویں گفتگو میں ہیڈرامیٹر اور تیرنے کی کیفیت کا حال درج ہے۔ اٹھارویں گفتگو میں سفن لے آلے کے اعمال کی تشریح کی گئی ہے۔ انیسویں اور بیسویں گفتگوؤں میں آلۂ غوطہ زنی اور اس کے استعمال کے طریقوں اور فوائد کو تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ اکیسویں گفتگو میں پمپ سے پانی کھینچنے کا طریقہ سمجھائے گئے ہیں۔ بائیسویں گفتگو میں زبردستی کے پمپ کا ذکر ہے جس سے فوارے کا کام لیا جاتا ہے۔ آگ بجھانے کے آلہ کا ذکر بھی اسی ضمن میں کیا گیا ہے۔ کنوؤں سے پانی کھینچنے کے لئے رسی کے ڈولوں کی ساخت کا طریقہ بھی واضح کیا گیا ہے۔ پھر زنجیری پمپ کا ذکر ہے جو جہاز کی تہہ سے پانی باہر نکالنے کے کام آتا ہے۔ آخر میں شکنجۂ آب کا ذکر ہے جس کی مدد سے روئی کے گٹھوں کو دباتے ہیں۔ جہازوں میں جب روئی بھری جاتی ہے تو پہلے اس شکنجہ میں اس کو دباتے ہیں جس کی وجہ سے بیس گنا زیادہ روئی بھری جاسکتی ہے۔

اس رسالے میں بھی کم و بیش وہی زبان استعمال کی گئی ہے جو اس سے پہلے کے رسالوں کی ہے۔ جملوں کی ترکیب اور ساخت کی قدامت کی چند مثالیں یہ ہیں۔

"میں تم سے کہا چاہتا تھا"
"چار تکلیل مدور کسی رنگین ہیں!"
"جو جسم کہ اس کا ثقل پانی سے کم ہے"
"کس طرح پانی اعضوں کی حیات کا سبب پڑتا ہے"
"سفوف بارک دیا اور کوئی رنگین شئے کا"
"نے" کا استعمال ملاحظہ ہو:
"ہم نے اپنے استعداد و حوصلے کے موافق سمجھے"
بعض جگہ "نے" کا استعمال ہی نہیں کیا گیا۔ مثلاً
"اور آپ فرمائے تھے"

نقطہ ہ کر" مختلف طریقوں سے جملوں میں لایا گیا ہے۔ جیسے
مجھ سے کر دیکھو گے (مجھے کرتے ہوئے دیکھو گے)
امتحان کر دکھلائیے۔ (امتحان کر کے دکھلائیے)
بعض قدیم الفاظ بھی ملتے ہیں جو اب متروک ہیں مثلاً
ماٹی (مٹی)، قیمت دار (قیمتی)، جاگہ (جگہ)
دوڑنے لاگا (دوڑنے لگا) وسکا (اس کا) وغیرہ۔
کہیں کہیں دکنی الفاظ اور زبان کی جھلک ہے۔
سرکاؤ (ہٹاؤ) ڈھیبا (تودہ) مصمت پنا
(مصمت پن)، دھڑ (جسم)، مانپ (ناپ) کھلتیاں
بند ہوتیاں ہیں (کھلتی اور بند ہوتی ہیں)
انگریزی الفاظ کے املا کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ ہیڈرو اسٹاٹکس کو کہیں ہائے ہوز اور کہیں ہائے حطی سے لکھا ہے۔ بعض انگریزی اصطلاحوں کے ترجمے کئے گئے اور بعض انگریزی تلفظ کے مطابق اردو میں لکھے گئے۔ چند بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔

علم آب	Hydrostatics
علم آب کی ترازو	Hydrostatic Balance
چوسنے کا پمپ	Sucking pump
زبردستی کا پمپ	Force pump
ہیڈرامیٹر	Hydrametre

کتاب کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:-
"علم آب جس کو یونانی زبان میں ہیڈرسٹاٹکس کہتے ہیں۔ علم فلسفی طبیعی کی ایک نوع ہے جو طبیعت اور ثقل اور دباؤ اور حرکت اکثر سیال کی ظاہر کرتا ہے۔"
"کسب کیسا ہی آسان ہو نہیں سمجھنا اس کے عمل میں کچھ خطر نہیں۔ چنانچہ لکھا ہوا دیکھنے میں آیا ہے۔ حکیم اسپالڈین اور اس کا مددگار دو دونوں اپنے بنائے ہوئے آلے میں بیٹھ کر جہاز شکستہ اور ڈوبے ہوئے مال کے نکالنے کے واسطے دو بار دریا کے اندر جا کر نکلے اور دفعہ سوم جو ڈوبے ایک ساعت تک سے جب وقت بہت گزرا اور اوپر کے مددگاروں نے کچھ اشارہ مراجعت کا نہیں پایا آلہ غوطہ لگانی کو اوپر کھینچا دیکھے تو دونوں کی روح پرواز ہو گئی تھی۔"

بعض صفحات کے حاشیہ پر اس سلسلے کی دوسری کتابوں مثلاً جر ثقیل، علم مناظر اور شمس الہندسہ وغیرہ کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔

علم ہوا

رسالہ شمسیہ کی چوتھی کڑی ہے جو دیباچہ کے علاوہ چوبیس گفتگوؤں پر مشتمل ہے۔ اصل کتاب کا حجم (۳۳۵) صفحات ہے۔ آخر میں (۴) صفحات کا غلط نامہ اور پانچ صفحات پر علم آب سے متعلق (۳۴) آلوں کے نقشے دیئے گئے ہیں اور مترجم نے پانچ مختلف قسم کے فواروں کے نقشے بھی ان میں شامل کر دیئے ہیں جو کسی دوسری کتاب سے لئے گئے ہیں۔ چنانچہ صفحہ (۹۵) کے نیچے حسب ذیل عبارت درج ہے۔
"مترجم نے فواروں کے نقشے اور ایک کتاب سے واسطے تفہیم کے داخل کیا۔"
کتاب کی ترتیب کا ڈھنگ وہی ہے جو اس سے پہلی کتاب کا ہے۔ ہوا سے متعلق جملہ امور کو اتنی وضاحت اور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ کوئی بات تشنہ باقی نہیں رہتی جن مسائل سے اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ ان کی چند سرخیاں یہ ہیں۔
کیفیت ہوا۔ ایرپمپ۔ ہوا کا دباؤ۔ ہوا کا منفذ۔ ہوا کی لچک۔ ہوائی بندوق اور آواز، پون، اسٹیم انجن، بارامیٹر، تھرمامیٹر، پیرامیٹر، ہیگرامیٹر اور آلہ بارش پیما وغیرہ۔ جن انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ کیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:-

ہوائی بندوق	Air gun
آلہ ہوا کش	Air pump

انجن بخار **Steam Engine**

ٹھوس پن **Solidity**

آتش پیما **Paerametre**

موسمی ہوا **Monsoon**

بعض الفاظ کا املا اور تلفظ بھی اب سے مختلف ہے۔ مثلاً

جتیا —— جتنا

جانوں —— جانو

بانسلی —— بانسری

سنا —— سننا

بعض الفاظ کی جمع کسی قاعدہ کے مطابق بنائی گئی ہے۔ مثلاً

شاخ سے شاخاں۔

سیخ سے سیخاں وغیرہ۔

وے۔ ووا ور ون سے جگہ جگہ استعمال ہوئے ہیں۔

نے کے استعمال کی دو مثالیں بطور نمونہ پیش کیجاتی ہیں۔

"ہوا کو آپ نے تولی تھی" "حضرت میں اس بات کو خوب سمجھا۔"

بعض مقامات پر اسم کیفیت یا حاصل مصدر کی بجائے مصدر کا استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً

"حضرت کیا کو جنا ہوا سے ہوتا ہے"

"تعجب ہے کہ کو ٹنا اکثر سنے میں کیوں نہیں آتا۔"

انگریزی الفاظ کے املا کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ حسب ذیل الفاظ کو دو طرح سے لکھا گیا ہے۔

اسٹیم انجن۔ اشٹیم انجن

ترامیٹر۔ تھرامیٹر

اس کتاب کی "تیسویں گفتگو" سے تلمیذ اور استاد کے سوال و جواب کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

"استاد۔ اب اپنے بیان کو علم طبیعیات کے آلات کی گفتگو میں تمام کرنے کے واسطے آج تم کو پیرامیٹر اور ہیگرامیٹر کی ترکیب اور عمل دکھاتا ہوں اور کل اس کتاب کو آلہ بارش پیما کے بیان پر تمام کرتا ہوں۔

تلمیذ۔ خوب۔ حضرت پیرامیٹر کی معنی بیان کیجیے۔

استاد۔ یہ لفظ یونانی ہے اور اس کی معنی آتش پیما ہے اور یہ ایک آلہ ہے منجمد چیزوں علی الخصوص معدنیات کے پھیلاؤ کی پیمائش کے واسطے جو بسبب گرمی کے ان کو حاصل ہوتا ہے اور چیزیں کتنی بھی تھوڑی پھیلیں اس آلہ کی استعانت سے تیسویں شکل کی مانند فقط آنکھ سے نظر آویں گی۔"

علم مناظر

یہ کتاب بستہ شمسیہ کی پانچویں جلد ہے اور اس میں علم مناظر سے بحث کی گئی ہے۔ دیباچہ اور تعریفات علم مناظر کے صفحات کے علاوہ کتاب کا حجم (۲۰۰) صفحات ہے۔ آخر میں (۸) صفحات کا غلط نامہ اور متن سے متعلقہ (۴۲) اشکال تحریک ہیں۔ اصل کتاب میں علم متقناطیس کا رسالہ بھی اس کے ساتھ شامل تھا مگر ترجمے میں اس کو علم مناظر سے علحدہ کرکے علم برقک کی جلد کے آخر میں شریک کیا گیا۔ اس کتاب کے سنہ تالیف کے متعلق دیباچہ میں غلام محی الدین کا نکالا ہوا مادہ تاریخ یہ ہے۔

"ایں تالیف شمس الامراء"

۱۲۵۵ھ

دیباچہ کے بعد علم مناظر کی مبادیات اور اصطلاحات کی تشریحیں کی گئی ہیں جس سے کتاب کے سمجھنے میں آسانی پیدا ہوگئی ہے۔ پوری کتاب کو بائیس گفتگوؤں پر تقسیم کیا گیا ہے جن میں علم مناظر کی مختلف شاخوں مثلاً شعاع۔ روشنی۔ آئینہ۔ عینک۔ قوس قزح۔ کلان بین اور دوربین پر تفصیلی معلومات درج ہیں۔ ترجمہ کی خصوصیات وہی ہیں جو اس سے پہلے کی کتابوں کے متعلق بیان کی جا چکی ہیں۔ پیچیدہ سے پیچیدہ علمی مباحث کو سادہ اور سلیس پیرایہ میں ادا کیا گیا ہے۔ ترجمہ اس خوبی سے ادا کیا گیا ہے کہ عبارت میں ترجمہ پن نہیں پایا جاتا۔ جن انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ ہوا وہ حسب ذیل ہیں:۔

قندیل سحری **Magic lantern**

لنتر یا لانتر **Lantern**

منہ دیکھنے کا آئینہ Looking glass
کلاں بین Microscope
منعکس دور بین Reflecting Telescope
موازی شعاعیں Convergent Rays
انقباضی شعاعیں
انبساطی شعاعیں Divergent Rays
منعکس روشنی Reflected Light

بعض الفاظ کو کہیں مذکر اور کہیں مونث استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً :-

شعاع آتی ہے ـــ شعاعیں گرتے ہیں۔
بوڑھے کی آنکھیں ـــ آدمی کے آنکھیں۔

بعض الفاظ کا املا موجودہ املا سے مختلف ہے۔ جیسے
سابون (صابن) لینی (لانی)۔ بڑتا ہے۔
(پڑتا ہے) ہاتی (ہاتھی)۔

عبارت میں جگہ جگہ ایسے الفاظ ملتے ہیں جو اب ہماری زبان میں متروک ہو گئے ہیں مثلاً
کبھو۔ کسو۔ جدی جدی۔ وو۔ وے۔ دکھنے لگی
وغیرہ وغیرہ۔

اگر کسی جملہ میں فاعل جمع ہو تو اس کا فعل بھی جمع لایا گیا ہے اور یہ دکنی زبان کی ایک خصوصیت ہے۔ مثال کے طور پر چند جملے یہاں لکھے جاتے ہیں:-

" یاد رکھو .... کہ تفاوتیں ہوا میں معلوم کرسکتے ہیں برخلاف پانی کے کہ وہاں خوب دریافت نہیں ہوسکتیں ہیں"

" یہ تعریفات تمھارے ہر کام پر آئیں ہیں"

" جس جگہ وو سب شعاعیں بیچ کے خط ملیں گیں"

بعض جگہ "نے" کے استعمال کو ضروری نہیں سمجھا گیا: مثلاً

"کیا حضرت آپ سمجھے ہیں کہ روشنی چار مرتبہ کم ہوئی ہے"

یہ کتاب بھی بطور سوال و جواب کے لکھی گئی ہے۔ پندرھویں گفتگو سے ایک مکالمہ کا اقتباس بطور نمونہ یہاں درج کیا جاتا ہے:-

"تلمیذ خرد۔ حضرت بہتر بندہ ایسا ہی عمل کرے گا لیکن پھر آپ نے ابرو اور مژگاں کا ذکر نہ کیا یہ کس کام پر آتی ہیں۔

استاد .... ابرو بہت آنکھ کو پناہ دیتی ہے جس وقت کہ بہت روشنی آنکھ پر آتی ہے اور کوئی جسم اگر پیشانی پر سے پھسل کر آنکھ پر گرے آنکھ کو مضرت نہیں پہنچنے دیتی ہے اور مژگاں کام کرتی ہیں آنکھ کے پردے کی مانند کس واسطے کہ جب کوئی شخص سوتا ہے وو سنبھالتے ہیں۔ حادثہ روشنی کو یعنی زیادہ روشنی آنکھ میں جانے نہیں دیتی ہیں ...... اور یہ مژگاں ہزاروں صدمات سے آنکھ کو بچاتے ہیں اور جو گرد کہ ہوا میں بھری ہوئی ہے ان کو آنکھوں میں آنے نہیں دیتے ہیں"

علم برقک

سلسلہ شمسیہ کی آخری کڑی ہے جس میں علم برقک۔ گیال وی نیزم اور مقناطیس کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔

یہ کتاب بھی سنہ [illegible]ھ میں تالیف ہوئی۔ جس کا دیباچہ میں حوالہ دیا گیا ہے۔ (۱ تا ۲۰۶) صفحات میں علم برقک پر بحث کی گئی ہے اور آخر میں تین صفحات پر (۳۱) اشکال ہیں۔ (۲۰۷ تا ۲۶۲) صفحات میں گیال وی نیزم کے مسائل سمجھائے گئے ہیں اور ختم پر متعلقہ آلوں کے (۶) نقشے دیئے گئے ہیں۔ (۲۶۳ تا ۳۰۲) صفحات علم مقناطیس کے لئے وقف ہیں اور آخر میں مقناطیس کی قوتوں کو پانچ مختلف اشکال سے واضح کیا گیا ہے۔ (۳۰۳ تا ۳۳۴) صفحات میں سوالات کی فہرستیں درج ہیں۔ کتاب کے ختم پر تینوں رسالوں کے غلط نامے علحدہ علحدہ سرخیوں کے تحت ترتیب دیئے گئے ہیں۔ علم برقک سولہ گفتگوؤں پر، گیال وی نیزم اور علم مقناطیس چار چار گفتگوؤں پر مشتمل ہے۔

(باقی آئندہ)

خواجہ حمید الدین

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کافی تقویت ملی تھی۔ اس کے بیٹے ہمایوں نے جب اسے ہندوستان سے بھاگنا پڑا، ایرانی دربار میں پناہ لی اور جب اسمٰعیل صفوی کے جانشین طہماسپ کی مدد سے دوبارہ ہندوستان آیا تو کہا جاتا ہے کہ اس نے شیعیت پھیلانے کا وعدہ کیا۔ یہ وعدہ بھی پورا نہ ہوا لیکن اکبر کے منظورِ نظر افسروں میں ایک شیعہ افسر ضرور ملتا ہے جو آٹھویں امام کی نسل سے بتایا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ مختلف زمانوں میں جو حوصلہ مند شخصیتیں ایران سے نبرد آزما ہندوستان آئے، ان کے ساتھ بہر حال مذہبی اثرات بھی آتے رہے اور یہی لوگ اپنے ساتھ شیعہ مذہب لے آئے۔ مثلاً نورجہاں انہی مہاجرین میں سے تھی۔ سب سے پہلے بویہی خاندان شیعہ مذہب اپنے ساتھ لایا۔ بنی بویہ نے جب پایۂ تخت بغداد پر قبضہ جما لیا تو سلطان اور خلیفہ دونوں ایک ہی چیز بن گئے اور خلیفہ محض ایک کٹھ پتلی ہو کر رہ گیا۔ لیکن ایک بات ضرور قابلِ ذکر ہے کہ عضد الدولہ نے شیعہ ہونے کے باوجود خطبوں میں سُنّی خلفاء کا نام باقی رکھا۔ مغلوں کے زمانے میں جب ہندوستان کا سرکاری مذہب حنفی ہو گیا تو مغلوں نے دیگر فرقوں کے لئے ان کا شخصی قانون برابر قائم رکھا۔ مغلوں کے بعد شیعوں کا اثر اور بڑھ گیا اور سچ پوچھئے تو خود مغلوں کے زمانے ہی سے شیعہ زور پکڑنے لگے تھے چنانچہ دکن کی دو اسلامی سلطنتوں پر یکے بعد دیگرے شیعہ بادشاہوں نے حکومت کی۔ اورنگ زیب کے تین بھائیوں ہی سے جنھوں نے تختِ شاہی کے لئے اورنگ زیب کا مقابلہ کیا، ایک شیعہ بھی تھا۔ نیز وسط اٹھارویں صدی سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک اودھ کے نواب وزراء نے جو بعد میں بادشاہ کہلانے لگے اسی شیعہ مذہب کی سرپرستی کی۔

مسلمان سلاطین اور اسلامی قانون

جو اسلامی قانون وسط ایشیا سے ہندوستان آیا، اس میں ہندوستانی حالات اور رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ تھوڑی بہت تبدیلیاں ہونے لگیں۔ مثلاً ذمیوں یا غیر مسلم رعایا سے متعلق جو قواعد اور عمل در آمد تھے، ان میں تبدیلی کرنی پڑی کیونکہ وہ ہندوستان میں اپنی اصلی شان کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ جس طرح عام مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے، اسی طرح ذمیوں سے جزیہ کی وصولی اسلامی نظم و نسق کا ایک بڑا عنصر تھا۔ لیکن ہندوستان میں مسلمان سلاطین نے جزیہ وصول کرنے میں کم سے کم توجہ کی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ہندوؤں کے ذاتی معاملات، مثلاً ازدواج، تہنیت، وراثت وغیرہ سے متعلق ان کو آزادی دی گئی کہ اپنی مذہبی کتابوں اور رسم و رواج کے لحاظ سے عمل کریں اور ہندوؤں کو مسلمان قاضی کے سامنے بہت کم لایا گیا۔ البتہ اسلامی حکومت نے تعزیرات اور تعزیری سزاؤں کو اپنے ہاتھ میں رکھا اور اس کے لئے منو کے ضابطہ پر لحاظ نہ کیا جو بذاتِ خود اسلامی قانون سے زیادہ سخت تھا۔ قانونِ معاہدے کے سلسلے میں بھی تمام فرقوں کے لئے یکسانیت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ پھر بھی جیسا کہ مسٹر بلی کا خیال ہے، فریقین ہندو ہوں یا مسلمان یا ایک ہندو اور دوسرا مسلمان، ہر صورت میں ایک ہی حاکمِ عدالت ایک ہی ضابطے کے تحت کارروائی کرتا تھا۔ البتہ زمینوں کے لگان اور ملکیت سے متعلق یہ سوال سر ولیم جونس کے زمانے ہی سے بحث طلب رہا ہے کہ مغلوں نے اس سلسلے میں ہندوؤں کے رسم و رواج اور مسلمانوں کے قانون سے کس طرح فائدہ اٹھایا جو طریقہ بھی مغلیہ کا اس انتظام کی نسبت رہا ہو، یہ امر یقینی ہے کہ ہر مذہب اور فرقے کے زمینداروں کے ساتھ ایک ہی طرح کا برتاؤ تھا۔

یہ دیکھنے کے لئے کہ ہندی مسلمانوں نے شریعت پر کہاں تک عمل کیا اور حنفی معیار پر اسلامی قانون کی کہاں تک پابندی ہوئی، کافی دقتِ نظر کی ضرورت ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس مسئلے کی حد تک ہماری معلومات بھی محدود ہیں۔ مغلوں کے دور میں سلاطین نے رفتہ رفتہ ہندوؤں کے ساتھ قانونی رعایت برتی حتیٰ کہ اکبرِ اعظم نے اپنی ہندو رعایا کو اپنے معاملات کی حد تک کافی آزادی دے دی تھی بلکہ یہ ایک واقعہ ہے کہ اس مغل شہنشاہ نے ایک نیا مذہب ہی تراشا تھا تا کہ تمام ہندوستانیوں

کے لئے مشترک مذہب بن سکے۔ لیکن اس جدت کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ کا مشیر خاص مارا گیا اور خود اکبر سے ناراضگی کا اظہار ہونے لگا اور اسے اپنی موت سے پہلے یہ اعلان کرنا پڑا کہ سلطنت مغلیہ کا سرکاری مذہب شریعت اسلام ہے۔ اور اکبر کے پیروؤں نے تو شریعت کے نفاذ میں سختی سے پابندی کی۔ اس کے باوجود مغلوں کے زوال کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں بھی شریعت پر عمل کرنے کا رجحان رفتہ رفتہ کم ہو گیا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۰۷ء میں عالیہ عدالت کلکتہ کے سامنے یہ ثابت کیا گیا کہ برطانوی حکومت کے قیام سے کافی عرصہ پہلے ہی سے بنگال کے حکام عدالت یہ تسلیم کرتے رہے ہیں کہ مسلمان اور ہندو دونوں سود پر قرضے کا لین دین جاری رکھتے رہے، حالانکہ مسلمانوں کے شرع شریف کی رو سے سود کی ممانعت ہے۔

ملاحظہ ہو مقدمہ میاں خاں بنام بی بی جان۔ ۵ بنگال لا رپورٹ صفحہ (۵۰۰)۔

انگریزی حکومت اور شریعت

ہندوستان میں برطانوی حکومت کی بنیاد ان معاہدات پر رکھی گئی تھی جو انگریزوں نے مغلیہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے ساتھ کئے۔ یہ مغلوں کا آخری زمانہ تھا جب کہ سلطنت کے صوبوں پر مسلمان صوبہ دار مغل شہنشاہ کے وائسرایوں کی حیثیت سے حکومت کرتے تھے۔ انگریزوں نے ان صوبہ داروں سے بنگال، بہار، شمال مغربی صوبے اور کرناٹک حاصل کئے اور ان علاقوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۸۵۷ء تک دہلی کے نام نہاد مقتدر اعلیٰ کے نام سے حکومت کرتی رہی۔ لیکن کمپنی کو ابتداءً ایک "فرمان" کی رو سے صرف دیوانی اور مال کے انتظام کا حق ملا تھا اور فوجداری انتظام کئی سال تک بنگال کے نواب ناظم کے ہاتھ میں رہا اور نظامت عدالت یا فوجداری عدالت عالیہ کلکتہ میں نہیں بلکہ نواب کے مستقر مرشدآباد میں قائم تھی۔ اس فرمان میں، جو ابتداءً ۱۷۶۵ء میں کمپنی کو عطا کیا گیا، اس چیز کی صراحت تھی کہ کمپنی تمام معاملات "شریعت محمدیؐ" اور "سلطنت کے عام قوانین" کے مطابق طے کرے۔ لیکن متعاقب معاہدات یا فرامین میں اس قسم کے تاکیدی الفاظ نہیں ملتے گو ان کی روح میں یہ حکم ضرور موجود تھا اور کمپنی کو رائے عامہ اور تاجدار دہلی کی وجہ سے اس پر ضرور عمل کرنا پڑتا تھا۔ نیز انگریز تاجروں کو مالگزاری وغیرہ وصول کرنے سے اتنی فرصت بھی نہ تھی کہ قانون کی طرف توجہ کرتے۔ اس کا اثر یہ تھا کہ اس وقت تک بھی مسلمانوں کا قانون ملک میں جاری تھا۔ البتہ مسلمانوں نے جن معاملات کی حد تک ہندو شاستر کے احکام روا رکھے تھے، وہ حسب حال جاری رہے۔ چنانچہ ۱۷۷۲ء کے قانون کی ایک دفعہ یہ ہے:۔

> **"In all suits regarding inheritance, succession, marriage and caste, and relegions usages or institutions, the Laws of the Koran with respect to Mohamadans, and those of the Shastras with respect to Gentoos, shall be invariably adhered to."**
>
> **(Regulation II of 1772, by Section 27.)**

ان مخصوص مسائل کو چھوڑ کر وارن ہیسٹنگز کی اسکیم میں شرع پر عمل کرنے سے متعلق کوئی حکم نہیں تھا البتہ کمپنی کی زیر اثر تمام عدالتوں میں، خواہ وہ ابتدائی قسم کی ہوں یا عدالت ہائے مرافعہ، دیوانی اور فوجداری امور میں قانونی مشورے کے لئے مسلمان افسر ضرور موجود ہوتے۔ خاص طور پر فوجداری جرائم کی سزائیں شریعت کی بنا پر دی جاتی تھی، خواہ مجرم کا کوئی بھی مذہب ہو۔ ۱۷۹۰ء میں ناظم کے ہاتھ سے اختیار سماعت چھین لیا گیا اور گو اس تاریخ سے نظام قانون رفتہ رفتہ

[illegible] دیا جانے لگا، پھر بھی مسلمانوں کا عنصر برابر قائم رہا حتیٰ کہ ۱۸۶۲ء میں مجموعہ تعزیرات اور پہلا ضابطہ [illegible] نافذ کیا گیا۔ قانون شہادت ہند بھی ۱۸۷۲ میں نافذ ہوا اور اس طرح شہادت سے متعلق بھی اب انگریزی قانون کا سکہ رائج ہو گیا۔

غرض مغلیہ دور ختم ہوا اور انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہو گئی تو نظرتاً انگریز تاجروں نے اپنے تمدن اور اپنے نقطۂ خیال کو پھیلانے کی کوشش شروع کر دی۔ گو ابتدا میں ان کی حیثیت نائب دیوان اور سرکاری ملازم کی تھی لیکن ان کی طاقت بڑھتی گئی اور آخر میں شاہ انگلستان کے چارٹر کے تحت بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں حکومت قائم کی گئی۔ دیگر علاقوں میں شرع شریف ہی قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب ۱۸۵۷ء کے بعد کمپنی کی حکومت تاج کے ہاتھ میں آگئی تو انگریزی زبان رائج ہوئی اور سرکاری زبان فارسی ختم کر دی گئی۔ اب انگریزی تعلیمی اور ملکی زبان بن گئی۔ ضمناً چند روز تک اردو کی بھی سرپرستی ہوتی رہی لیکن انگریزی سرکاری اور عدالتی زبان قرار پا گئی۔ مرکزی مقننہ کے ذریعے انگلستان کے قوانین یکے بعد دیگرے نافذ ہونے لگے اور مغلیہ قانون برخاست کر دیا گیا اور جس طرح کہ اوپر ذکر کیا گیا، شہادت تعزیرات وغیرہ سے متعلق قوانین نافذ کئے گئے۔ چنانچہ اب برطانوی قانون کا یہ مسئلہ کلیہ بن گیا کہ ملک کے قانون موضوعہ میں کچھ نہ ملے تو برطانوی قانون سے رجوع کرنا چاہئے۔ مسلمانوں کے زمانے میں شرع اسلام کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔

گو یہ صحیح ہے کہ خالص شرع شریف خود مغلیہ دور میں پوری پابندی کے ساتھ نافذ نہ رہ سکا۔ خاص طور پر اس کے تعزیری پہلو کی سختی قانون کے نفاذ میں مانع سمجھی جاتی رہی اور رفتہ رفتہ اسلامی تعزیری احکام نرمی کے پردے میں اپنی اصلیت سے دور جا پڑے لیکن انگریزی دور میں جب مقامی رواجات کی سرپرستی شروع ہوئی تو یہ شرع شریف کے لئے بہت مضر ثابت ہوئی۔ چنانچہ بمبئی، اودھ، پنجاب اور بنگال وغیرہ میں بعض خاص رسوم اور رواجات کی پابندی مسلمانوں میں پائی جانے لگی۔ مغربی ہند کے عجیب و غریب رواجات شرع اسلام کا جزو بنا دئے گئے۔ خوجوں، میمنوں اور شیعیوں کے لئے علٰحدہ علٰحدہ اصول مرتب ہوئے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں میں آپس میں نفاق پیدا ہوا اور ہر جگہ کے مسلمانوں میں الگ الگ رواج بن گئے جن کی سرپرستی کی گئی۔ بعض صورتوں میں تو ایسا بھی ہوا کہ سارے ہندوستان میں کسی فرقے کے زیادہ سے زیادہ سات آٹھ افراد ہوں گے لیکن ان کے لئے بھی ان کا علٰحدہ رواج تسلیم کیا گیا۔ چنانچہ اب ایک مسلم لا کی جگہ چھ مسلم لا پیدا ہو گئے۔ شیعیوں کے لئے ایک، سنیوں کے لئے ایک وغیرہ۔ ہر فرقے کو اس کے نفاذ کا اختیار دیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ انتظام ہوا کہ فریقین کے مذہب کا قانون حاکم عدالت استعمال کرنے لگا۔ اگر کسی مقام کے لوگ اجتماعی طور پر مسلمان ہو جائیں اور ان کی خاص تربیت نہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی قدیم روایات کو بھولتے نہیں اور اسلام کے خلاف بھی اکثر و بیشتر کسی حرکت کو برا نہیں سمجھتے۔ ملابار کے مسلمانوں میں کثرت شوہران کا رواج ہے۔ جیسا کہ ملّا نے لکھا ہے، خود حیدرآباد میں مسلمان دیول جاتے ہیں اور ناریل پھوڑتے ہیں۔ غرض رواجات کی سرپرستی سے شرع اسلام کی یہ انوکھی شان ہو گئی۔ اسی طرح جاگیرات سے متعلق عمل درآمد بھی دلچسپ ہے۔ مغلیہ دور میں بادشاہ بیٹے کو جاگیر دیتا تھا یا واپس لے لیتا تھا۔ انگریزی اثر کے تحت یہ طے ہوا کہ جاگیروں کی وراثت میں اصول یہ رہے گا کہ اولاد اکبر کو زیادہ جائداد ملے گی اور باقی کو حق پرورش۔ قاضی سے اختیار سماعت لے کر منصف کو دیدیا گیا اور منصف خواہ مسلمان ہو یا ہندو یا کوئی اور، مسلمانوں کے

شخصی قانون سے متعلق فیصلہ کرنے لگا۔ اور ظاہر ہے کہ غیر مسلم جب اسلامی قانون کو منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو لغزش اور غلطی کا کافی امکان رہتا ہے۔ چنانچہ ایسے فیصلوں کا اثر یہ ہوا کہ اسلامی تصورات میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ مقدمات کے فیصلے کے لئے آخری عدالت مرافعہ پریوی کونسل قرار دی گئی اور ایک عرصے تک پریوی کونسل کے تمام ارکان انگریز تھے جو شرع شریف کے مسائل پر غور فرما کر آخری اور قطعی فیصلہ صادر کرتے۔ امیر علی پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے پریوی کونسل میں شرکت کی۔ اسلامی قانون پر انگریزوں کی تعبیر و توضیح سے کافی برا اثر پڑا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ خالص شرع شریف سے ہٹ کر ہندی مسلمانوں کے لئے ایک الگ قانون بن گیا جسے "اینگلو محمڈن لا" کہا جانے لگا۔

اینگلو محمڈن لا خالص شرع شریف میں انگریزی اثر کے تحت جو تبدیلی ہوئی، اسے سر رولینڈ ولسن کے الفاظ میں دو قسموں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ تبدیلی ہے جو ارادی طور پر کی گئی اور دوسری وہ جو غیر ارادی طور پر ہوگئی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، اسلامی قانون تعزیرات میں رفتہ رفتہ مختلف اوقات میں تبدیلیاں کی جاتی رہیں اور بالآخر قانون تعزیرات ہند کے نفاذ سے اسلامی قانون کلی طور پر ختم کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ارادی تبدیلی ہے۔ اسی طرح قانون نشان (۵) ۱۸۴۳ء کی رو سے پورے برطانوی ہند میں ادارۂ غلامی برخاست کر دیا گیا۔ قانون نشان (۲۱) ۱۸۵۰ء کے ذریعے تبدیلی مذہب کے لئے یہ سہولت پیدا کی گئی کہ مرتد ہونے کے بعد بھی کوئی شخص وراثت سے محروم نہیں ہوگا۔ ۱۸۷۵ء کے قانون بالغان کے ذریعے بلوغ کی عمر شرع اسلام کے نظریہ سے ہٹ کر علحدہ رکھی گئی اور قانون نشان (۱۰) ۱۸۹۱ء کے ذریعے شادی بیاہ کے لئے بھی خاص عمر مقرر کر دی گئی (Baillie 1. 54.) ٹھیک اسی ارادی طریقے سے پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبے، اور اودھ میں قانون موضوعہ کے ذریعے حق شفعہ کے اسلامی قانون میں بڑی تبدیلی کی گئی۔ بلکہ حق شفعہ سے متعلق دوسرے صوبوں میں بھی عدالتوں کے فیصلے غیر ارادی طور پر اسلامی قانون کو بدلتے گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق شفعہ کا اسلامی اصول کہیں مقامی رواج اور باہمی سمجھوتے کی بنا پر تسلیم کیا جاتا ہے اور کہیں خود مسلمانوں کے معاملات میں بھی قابل قبول نہیں سمجھا جاتا۔

اسلامی قانون میں غیر ارادی طور پر بھی بہت سی تبدیلیاں ہوگئیں۔ سب سے پہلے یہ بات قابل ذکر ہے کہ یورپی تمدن کے تحت ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایسا ماحول پیدا کر دیا گیا کہ خود ان کے لئے اسلامی قانون کے بیشتر اصول کی پابندی گراں ہوگئی۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑا عنصر عدالتیں ہیں جو اپنے فیصلوں کے ذریعے نہایت خاموشی کے ساتھ اسلامی قانون میں تبدیلیوں کا موجب ہوتی گئیں۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کا نظام قانون قرآن شریف اور حدیث پر مبنی ہے اور اجماع، قیاس اور استحسان وغیرہ کے ذریعے اس میں بست و کشاد کی گنجائش رہی ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ قاضیوں کے فیصلے آنے والے معاملات کے لئے ہدایتیں ہوتے تھے لیکن جب قاضیوں کی جگہ ان لوگوں نے مسلمانوں کے معاملات طے کرنے شروع کئے جن کو شرع اسلام کے متعلق مبہم معلومات ہوں یا وہ جن کو اس پر کافی عبور نہ ہو، تو ظاہر ہے کہ زمانے کی رفتار اور غلط نظائر کے انبار میں نص صریح کے اصل مقاصد اور اصل اصول بہت دور جا پڑتے ہیں۔ یہ چیز وقت اور بھی قابل لحاظ اہمیت اختیار کر لیتی ہے جب کہ فیصلہ کرنے والوں کے دل و دماغ بنیادی تبدیلیاں کرنا چاہتے ہوں۔

یوں تو شرع اسلام کے تقریباً ہر شعبے پر انگریزی تعبیر و توضیح، قانون سازی اور نظائر کا کافی اثر پڑا ہے لیکن مشتے نمونہ، نکاح، ولایت، وصیت، ہبہ، وقف اور شفعہ کے مسائل تو لفظوں شخصے اتنے انگریز زدہ ہوگئے کہ آج

یک [illegible] کے سامنے نت نئے نظائر کا انبار ہے اور اصلی اصول جو عرب کی مقدس سرزمین سے نکلے تھے
[illegible] معلوم ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حکام عدالت کا مقصد صرف تعبیر و توضیح ہے اور وہ قانون
[illegible] کرنے میں اسی تعبیر و توضیح سے نظائر میں جو اصول طے پا جاتے ہیں وہ رفتہ رفتہ قانون صریح کا مرتبہ
حاصل کر لیتے ہیں لہٰذا اس [illegible] بسا اوقات غلط قسم کے قانونی اصول بھی بن جاتے ہیں۔ جب ایک مرتبہ کوئی غلط چیز
طے ہو جائے تو وہ برابر دہرائی جاتی ہے اور جب تک صریح قانون سازی کے ذریعے اسے منسوخ نہ کیا جائے، وہ برابر
اہمیت حاصل کرتی جاتی ہے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ ہندوستانی مقننہ کا ہمیشہ یہ رجحان رہا ہے کہ
ہندوؤں اور مسلمانوں کے معاملات میں صریح قانون سازی کم سے کم کی جائے اور اس کے لئے جب تک خود غرض مند
مطالبہ نہ کریں، مسودہ قانون مقننہ سے نہیں منظور ہوتا۔ چنانچہ ان غلط اصولوں کو روکنے کے لئے جو نظائر کے
ذریعے قائم ہو گئے ہیں، بہت کم قانون سازی ہوئی ہے۔ ۱۹۱۳ میں جو قانون وقف پاس ہوا وہ غالباً
اس نوعیت کا پہلا قانون تھا۔

ردِ عمل انگریزی حکومت کے ابتدائی دور میں تو مسلمانوں پر ان کے شخصی قانون کی تبدیلی کا کوئی خاص اثر
نہیں معلوم ہوتا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ انگریزی اثر جو پوشیدہ قوت رکھتا تھا، عام مسلمانوں کی
نظروں سے پس پردہ رہا اور خود علماء جو مسلمانوں کی کم سے کم مذہبی قیادت کا دعویٰ کرتے تھے، وہ بھی اسے محسوس
نہ کر سکے۔ یہ کچھ فطری بات معلوم ہوتی ہے کہ ہر زمانے میں نوجوان اپنے پیشرو بزرگوں پر الزام لگاتے ہیں کہ
موجودہ خرابیاں ان کی کمزوری کا نتیجہ ہیں اور ٹھیک اسی طرح سے پیران کہن سال، نوجوانوں پر الزام لگاتے ہیں
کہ ان کی وجہ سے معاشرے کی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اصل حقیقت کیا ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن اتنا
ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے قانون کی تبدیلی، اس نظام کی تبدیلی جس پر مسلمانوں کو فخر رہا ہے، ہندوستان
میں کچھ انگریزی حکومت کی حکمت عملی کے سبب ہے اور کچھ ہمارے پیشرؤں کی لاپروائی اور بے حسی کے باعث
بہر حال یہی غنیمت ہے کہ بالآخر مسلمانوں کو اپنے قانون کی حفاظت کا خیال پیدا ہو گیا۔ جو خرابیاں نظائر یا عجیب و غریب
قسم کے رسوم اور رواجوں کی پابندی سے پیدا ہو گئی تھیں، ان کو مرکزی مقننہ کے ذریعے دور کرنے کی کوشش شروع
ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں وقف کے متعلق قانون منظور کروایا گیا اور اب وقف علی الاولاد بھی، جسے پریوی کونسل نے
تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا، امیر علی اور دیگر مسلمانوں کی کوششوں سے تسلیم کر لیا گیا۔
اس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب اسلامی قانون پر چاروں طرف سے ضرب پڑنے لگی اور سیاسی وجوہ
سے مسلمان خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگے تو ایک بڑا ردِ عمل شروع ہو گیا۔ وہابی تحریک کا آغاز بھی اسی سے ہوتا ہے۔
اسماعیل شہید جیسے لوگوں کا منشا یہ تھا کہ شریعت قائم رہے۔ ابھی حال میں مسٹر جناح کی کوشش سے "شریعت اپلیکیشن ایکٹ"
پاس ہوا اور وصیت اور تبنیت کو چھوڑ کر جملہ مسائل نکاح، وراثت، مہر، نفقہ وغیرہ میں شریعت کے لحاظ سے عمل شروع ہو گیا۔
۱۹۳۷ء کے اس قانون سے بعض خلاف شرع قوانین، جن میں بمبئی، مدراس، بنگال، آگرہ، آسام، پنجاب، یو۔ پی اور اجمیر کے
قوانین شامل ہیں، منسوخ کر دئے گئے اور جملہ خلاف شرع رسم و رواج بھی منسوخ کئے گئے۔ گو اس قانون سے پوری
اصلاح تو نہ ہو سکتی تھی لیکن بڑی اصلاح کی طرف اسے اچھا اقدام سمجھنا چاہئے۔ چنانچہ وصیت تبنیت سے متعلق
بھی شرع اسلام پر عمل کا امکان رکھا گیا ہے اور اگر کوئی خاندان ناظم ضلع کے پاس اپنے کو رجسٹر کروائے کہ وہ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

تقریب کچھ تو ....!

کیسے ممکن ہے انسان کا خیال کوئی پھٹا پرانا کپڑا تو نہیں جسے اتار کر پھینک دیا جا سکے ـــــ ادب کی حقیقت کیا ہے؟ یہ ایک خیال رہ رہ کر نیش زنی کر رہا تھا!

بات بھی کچھ ایسی ہی تھی ـــــ

عتیق اپنی شادی کی سالگرہ پر مجھے بڑے ہی اصرار سے کھینچ لے گیا، یہ تقریب کچھ بڑے پیمانے پر نہ تھی بلکہ نجی طور پر اور چونکہ میں اپنی معروفیات کی وجہ سے اس کی شادی میں شریک نہ ہو سکا تھا، اس لئے خاص کر میری غیر حاضری کو بھلانے کے لئے دوستانہ طریقے پر ترتیب دی گئی تھی ع

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے!

کھانے کی میز پر صرف عتیق، اس کی بیوی اور میں تھا۔ عتیق اپنی رفیقۂ حیات کی شدید محبت اور گہرے جذبات سے اس قدر مغلوب اور بے خود تھا جیسے کوئی رندِ بدمست! وہ حق بجانب تھا، اس کی بیوی کا رنگ روپ، شوخی، رفتار و گفتار سب ایک کیف اور رس میں ڈوبی ہوئی تھی۔

کھانے پر ادھر ادھر کی گفتگو کے دوران میں کچھ شعر و ادب کی بحث بھی چھڑ گئی ـــــ ادب کی حقیقت کیا ہے؟ اس میں شک نہیں یہ بالکل سرِراہ تھی، لیکن عتیق نے سرور و کیف کے عالم میں اپنی بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا ـــــ ایسی حسین رفیقہ کی معیت میں ادب کا معیار بتانا کون مشکل بات ہے؟ ـــــ اور پھر بڑے ہی کیف و سرور میں ڈوب کر وہ ادب کی تعریف کرنے لگا کسی جذباتی نوجوان کو موہ لینے کے لئے ایک دوشیزہ کو نسے ہتھیار استعمال کرتی ہے؟ سادہ سی بات ہے شوخی، عشوہ و ناز حسنِ سحر انگیز، میٹھے بول اور ناز و انداز! اسی طرح پڑھنے والوں کی دلچسپی کی خاطر شوخی، انوکھا پن، حسن اور تمثیل و تشبیہ اور حسینِ الفاظی ادب کی کنجی ہے! ـــ

عتیق نے یہ سب کچھ یوں ہی کہہ دیا اور بولتے بولتے کیف میں ڈوب گیا، مگر مجھے ایک تازیانہ سا لگ گیا، میں نے سوچا، آخر میں بھی تو بتا سکتا ہوں کہ ادب کی اصلیت کیا ہے؟ معیارِ ادب کیا ہے؟ ـــــ

رات کے دس بج چکے، میں گھر آ گیا تھا، میری بیوی بھی کبھی کی سو چکی تھی، لیکن مجھے نیند نہ آ سکی تھی، نہ آئی، ادب کی حقیقت کیا ہے؟ یہی ایک سوال شریر بچے کی طرح دماغ میں اچھل رہا تھا۔ میں نے بہت غور کیا، کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا، آخر کار میں اٹھا، لیمپ کی بتی بڑھائی اور بیوی کو جگا کر کہا ـــــ "میں ایک نہایت اہم موضوع پر لکھ رہا ہوں، ذرا تھوڑی سی چائے تو بنا دو، گر دیکھو گوارا نہ کرنا!"

میں نے الماری سے دس پانچ کتابیں نکالیں اور لکھنے بیٹھ گیا، مگر آج نہ جیسے دماغ تھک گیا تھا اور قلم تو ایک اڑیل ٹٹو کی طرح ایک سطر بھی لکھنے سے انکار کر رہا تھا، وہ جھنجھلا گیا، کرسی کا سہارا لے کر آنکھیں بند کر لیں اور قلم کے ایک سرے سے سر کھجاتے ہوئے دماغ پر بار ڈالنے لگا، اتنے میں بیگم دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی اور چائے کی پیالی میز پر رکھ کر بازو کے کمرے میں رونے والے بچے کو سمجھانے چلی گئی۔ ـــــ چائے سامنے رکھی تھی .... اور میں بغیر چائے کے لکھ نہیں سکتا تھا .... چائے ہی تو صرف مجھے کام کی توانائی بخشتی ہے اور چائے کے بخارات کے ساتھ میرے خیالات اڑنے لگے۔

(۱) بہترین ادب دبی جذبات کی پکار ہے۔ اس پکار میں دنیا کے دکھ اور ناانصافیوں پر تڑپنے والی روح کا اضطراب ہوتا ہے، دنیا کے رنگ ڈھنگ پر کھل کھلانے والوں کا ترنم رہتا ہے، جرأت و مقاومت کا جوش ہوتا ہے، آج کل کے لکھنے والوں میں آہ اور واہ کی کمی نظر آتی ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ حیاتِ انسانی کا وسیع علم ہی ادب کی کنجی ہے، یہی سبب ہے کہ موجودہ ادبی فضاء میں لہرانے والے سماجی انقلاب کے جھنڈے تلے جمع ہونے کے بجائے اپنی اپنی چھوٹی چھوٹی رنگ برنگی جھنڈیاں لے کر ایک دوسرے سے لڑنے ہی میں مگن ہیں!

تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد یہ خیال پسند نہ آیا اور پھر ایک خیال سوجھا ——

(۲) گوناگوں رنگوں کے اتار چڑھاؤ سے مسرت حاصل کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو مصور کے حقیقی خیال سے واقفیت ممکن نہیں، اسی طرح زندگی میں ہر گھڑی پیش آنے والے واقعات اور زیر و بم کا صحیح اندازہ نہ ہو تو ادب کی حقیقت کا پتہ نہیں چلتا، اور جو اس حقیقت سے ناواقف ہوتا ہے، اسے لکھنے کی اس قدر جلدی ہوتی ہے کہ وہ ہر صفحے کسی نہ کسی پرچے میں اپنی کہانی چھپی ہوئی دیکھنا چاہتا ہے، آج کل تو مختلف طبقوں اور گروہوں کی تصویریں پیش کی جا رہی ہیں، مارکسی خیالات کے زیر اثر مزدوروں کی زندگی کو رنگ دیا جا رہا ہے، بس اسی پر کچھ لکھ دینا چاہئے یہی انسان کا اصل مدعا ہوتا ہے۔

مدعا ہوتا ہے، تتلیوں کی طرح اس خیال سے اس خیال پر اڑ بیٹھے، جاپانی پتلے کی طرح کسی پرانے خیال کو از کار رفتہ سمجھ کر یا محض ہٹ دھرمی یا کھوکھلے انکار کی بنیاد پر سپاہی کے ساتھ ترقی پسندی کا ناچ ناچنے والے اردو کے نام نہاد ادیبوں کو ادب کی حقیقت کیا معلوم؟ اور جب تک اس سے واقف نہ ہوں ان کی تحریر دل کی قدر و قیمت ہی کیا ہے؟

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

پہلے تو مجھے یہ خیال پسند آیا، لیکن نظر ثانی کے بعد میرے مضمون کا لحاظ کرتے ہوئے قطعی ناموزوں معلوم ہوا۔ اس کے بعد ہی ایک اور خیال ابھرا ——

(۳) افسانوی ادب کو پیش کرنے والے غیروں کے بنائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں، انھیں لارنس، شکسپیر ایلیٹ مرغوب ہیں لیکن نذیر احمد، آغا حشر، کالیداس، سرشار سجاد حیدر پسند نہیں۔ غیروں کے بنائے ہوئے اصولوں اور تفسیروں کے سہارے چلنے والے ادب سے حقیقی تشفی ممکن نہیں۔ ادیبوں کے خیالات و الفاظ کو جذب کرنے کے بجائے اپنے ماحول کا جائزہ لے کر غور و فکر کرنا ہی اصل معیار فن ہے۔ اگر ایسی ہی مشقت اور جگرکاوی کی جائے تو کل اقبال، غالب، حالی اور نذیر احمد پیدا ہو سکتے ہیں، ابھی تک ہمارے نئے لکھنے والوں کو ادب کی کنجی نہیں ملی، جس کی وجہ سے ادب کی بظاہر ترقی ہو رہی ہے اور سیلاب امڈا چلا چلا جا رہا ہے لیکن یہ سب بلبلوں اور خس و خاشاک سے زیادہ نہیں ہے ع یہ فراوانی کا تبسم، یہ خس آتش سوار!

میں نے کافی غور کیا مگر ادب کا اصل امتیاز میری سمجھ میں نہ آیا، کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکا، آخر کار میں نے سوچا حالی، آزاد اور نیاز جیسے چند ادیبوں کے خیالات کا مطالعہ کرنے کے بعد شاید کوئی خیال سوجھے، چنانچہ ان کی چند تحریروں کو جستہ جستہ پڑھنے کے بعد ایک نظریہ سوجھا ——

(۴) آج کل افسانوی ادب نے ایک ہلچل مچا دی ہے، ادب اور افسانوی ادب میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہا، ادب کے نام کے ساتھ ہی افسانوی ادب کا تخیل پیدا ہو جاتا ہے، وجہ یہ ہے کہ نوجوان نسل کے دماغ میں ادب کے معنی صرف افسانوی ادب کا تصور —— نہیں غلط فہمی رچ گیا ہے۔ دراصل ہم جسے افسانوی ادب کہتے ہیں وہ ادب کی ایک شاخ ہے، ادب کے معنی اس قدر وسیع ہیں کہ انسانی دل و دماغ کو جن باتوں سے جولانی، امنگ، جوش اور مسرت حاصل ہوتی ہے وہ سب ادب ہے، وہ تحریکات ہیں جن سے دل کے تار بجتے اور ذوقِ صحیح وجد کرتا ہے۔ اور اس ادب کی کنجی مطالعہ کی وسعت، تخیل کی گہرائی اور مشاہدہ اور تجربے کی صداقت ہے۔ اس اہم امتیاز سے عدم واقفیت کی بنا پر آج کے ادب میں —— خصوصاً افسانوی ادب میں اوچھا پن، سطحیت اور جذبات نے قبضہ کر لیا ہے —— اور فن بے روح اور فطرت و ماحول کی نقالی ہو گیا ہے۔

بعد کے لکھنے والوں میں اختر رائے پوری
احتشام حسین اور دوسرے چند ادیبوں کی دو ایک کتابیں
[illegible] ———

وہ ادب صرف فن کے لئے نہیں بلکہ زندگی کے
لئے ہے "فن برائے فن" کی اصطلاح میں آج تک
کچھ سمجھا سمجھانے کا کوئی امکان ہے۔ درحقیقت
"ادب برائے ادب" ایک بے معنی اصطلاح ہے رقص
برائے رقص، گانا برائے گانا، تصویر برائے تصویر، تماشا
برائے تماشا یہ تمام باتیں ایسی ہی ہیں جیسے "حماقت
برائے حماقت"!

فن ایک انسانی عمل ہے، انسان کا کوئی عمل
بغیر مقصد اور افادیت کے ممکن نہیں، زندگی کی راہ پر
چلتے ہوئے انسان کو اچھے اور برے ہر قسم کے تجربات ہوتے
ہیں۔ کسی نہ کسی قسم کی آرزوئیں اس کے دل میں پیدا
ہوتی ہیں ان کی تمناؤں کی مخالفت ہوتی ہے اور اس کے
دل و دماغ میں جوالا پھٹ پڑتا ہے اور اس کے مختلف
بہاؤ ہوتے ہیں، انسانی جذبات کبھی شاعری کی راہ
سے بہہ نکلتے ہیں اور کبھی رقص و سرود، کبھی مصوری
اور کبھی بت تراشی اور کبھی نثر میں! ——— جس زندگی
میں نیچ اونچ ہے، روشنی اور اندھیرا ہے اس کا کھلاڑی
ایک سیدھی راہ پر کیسے چل سکتا ہے، سچا فنکار اپنے
کرداروں کو زندگی کے اسی اتار چڑھاؤ کے ساتھ چلاتا ہے
اور یہی امر بن جاتے ہیں، انسان خدا اور جانور کے درمیان
کی ایک چیز ہے۔ اس کی زندگی میں ایک طوفان اور
تلاطم کا نمایاں ہونا ضروری ہے، یہ اور بات ہے کہ دبے
ہوئے میلانات ابھرنے کے لئے حالات کی سازگاری کے
محتاج ہوتے ہیں۔ ایسی تحریریں جن میں عوام کے
جذبات و احساسات کو پیش کیا جائے اور ان میں
ایسی قوت ہو کہ ہم اونگھنے کے بجائے جاگنے لگیں، بیخودی
کے بجائے ہشیاری طاری ہو جائے اور ان میں حیات بخشی

کی قابلیت ہو ترقی پسندی کے نام سے منسوب کی جا رہی ہیں۔
لیکن سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد یا اس وقت کے ادب کا [illegible]
اس میں دکھائی نہیں دیتا، اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ آج
کے لکھنے والے ادب کی اہم خصوصیت سے ناواقف ہیں۔
وہ یا تو صرف داخلی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں اور ساری
دنیا کو "حلقۂ دامِ خیال" بنا کر پیش کرتے ہیں یا پھر سطح
پر تیرنے والے خس و خاشاک کو جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں
وہ ابھی ناتجربہ کار ہیں، اس میں شک نہیں کہ وہ زندگی
کی تصویر کے لئے کیمرہ لئے کھڑے ہیں مگر ان کی جہل اندوزی
شہرت پسندی یا پھر کوئی اور وجہ ہے کہ کیمرے کا فوکس
ذرا ہل جاتا ہے اور زندگی کی صحیح تصویر ان کے ہاتھ سے
نکل جاتی ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ مشاہدوں اور تجربوں
سے ان کے دلوں میں گداز نہیں پیدا ہوا، فن اور رنگینی
تو ہے مگر ادب میں روح نہیں، زندگی ہے اور نہ بلند مقصد!

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی!

اقبال کے نظریوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک لہر
اور خیال نے میرے دل میں جنم لیا ———

(۶) آج کل ادب میں انسان کی فطری کمزوریوں سے
کھیلنے اور دل و دماغ کو ہوس و جذبات کی تحریص
دلانے والے ناول، عریانی اور بوالہوسی سے آراستہ
افسانے اور معشوق کی زلف و کمر سے مزین شاعری
میں اضافہ ہو رہا ہے۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اس میں شک نہیں کہ حسن و عشق کے بغیر لوچ اور
کشش باقی نہ رہے گی، ادب خشک اور بے رس ہو جائے گا
پھر بھی دنیا کی اصل اور کھلی حقیقتوں کو "خالِ رخِ یار"
اور "زلفِ پیچاں" اور "وصل کی راحتوں" میں
بھلا دینا قرینِ دانشمندی نہیں ہے، پند و نصیحت سے

انسان حقیقت کو نہیں بھول سکتا۔ آرٹ میں جلال اور جمال دونوں ضروری ہیں، کیونکہ ادب کا جسم فنی ہے لیکن اس کی روح بالکل سماجی ہے۔ اس لئے بدلتے ہوئے رجحانات کا خیال کرتے ہوئے اب ہمیں قوم کو "عشق و عاشقی" کے بھنور میں دیکھنا نہیں ہے بلکہ ایسے لوگوں کو پیدا کرنا ہے جن کے جسم فولادی ہوں اور ان کی رگوں میں تیل اور پانی کے بجائے رواں دواں گرم خون ہو ۔۔۔ جسے وقتِ ضرورت گرایا بھی جا سکے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ادیبوں کے دلوں میں گداز پیدا ہو جائے۔ وہ قوم کی تکلیفوں، دکھ درد کو اسی طرح محسوس کریں جیسے کہ ساری قوم محسوس کرتی ہے، خلوص و صداقت ہو۔ ادب اپنے سفینۂ حیات کو زندگی کی ہیجانی لہروں پر سے کھیتا رہے۔ برخلاف اس کے ادھورے جذبات اور کھوکھلے تجربات کے سہارے جو چیز لکھی جائے گی وہ صرف فطرت و ماحول کی نقالی ہوگی اور بالکل بے روح ؏ نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر!

آج کے ادب ۔۔۔۔۔۔ چاہے وہ ترقی پسند ہو یا رجعت پسند ہو، خواہ کوئی اور پسند ۔۔۔۔۔۔ ادب کی امتیازی خصوصیات سے لاعلم ہیں، یہی سبب ہے کہ اس دور میں ایسی مضحکہ خیز اور حیرت انگیز چیزیں پھیلتی جا رہی ہیں، ادب میں فن کاری کو اہمیت حاصل ہے پھر بھی حرکت اور زندگی اس سے زیادہ اہم ہیں، فن زندگی کے تابع ہے، زندگی فن کی محتاج نہیں ہے، جیسے یہ معلوم ہو جائے وہ ادب کے لازوال خزانے پر قابض ہو سکتا ہے۔ اور جب ہمارے ادیب ان چیزوں سے واقف ہو جائیں گے تبھی ہمارا ادب اپنی تابندگی سے دنیا کو خیرہ کر سکتا ہے۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

ان چھے مختلف نظریوں کے بعد میں نے کچھ قدیم فارسی اور عربی کتابوں کو الٹا اور چند انگریزی کتابیں بھی نکالیں، عربی، فارسی کے تذکرے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا۔

(۷) ادب میں گہرائی، رس، صنائع بدائع اور کیف کا وجود خود ادب کا امتیاز ہے۔

ان ساتوں مختلف خیالات کو میں نے خوب اچھی طرح پڑھ لیا، مجھے محسوس ہوا ۔۔۔۔۔۔ سورج کی تیز، صاف اور شفاف روشنی سات رنگوں پر مشتمل ہے اور یہی وجہ ہے کہ بارش کے وقت افق پر قوس قزح اپنے سات رنگوں کو پیش کرتی ہے، کیا عجب ہے کہ یہ سات رنگ بھی ایک قوس قزح ہی ہوں؟ آخر اس کا کونسا رنگ میرے کام آ سکتا ہے، مجھے کس خیال سے اتفاق کرنا چاہئے ۔۔۔

میں نے بے حد سوچا، خوب پڑھا، غور کیا، کتابوں میں یہ پڑھا ہے کہ سورج کی روشنی سات مختلف رنگوں کا نتیجہ ہے، یہ پڑھ لینا اور اصولوں کو یاد کر لینا تو بہت آسان ہے، لیکن سات رنگوں سے ایک رنگ پیدا کرنا بہت مشکل ہے، ہے نا؟

میں بوکھلا اٹھا، میں نے ان ساتوں اصولوں کو کئی مرتبہ پڑھا اور انھیں ایک دوسرے میں سمو دینے کی بے حد کوشش کی، لیکن پھر بھی کسی ایک سفید رنگ کے حاصل ہونے کی توقع نظر نہ آئی!

گھڑی نے رات کے دو بجا دئے۔ معمہ حل کرنے والے کو حل نہیں سوجھتا ہے تو وہ گھبرا کر کاغذ اور قلم پھینک دیتا ہے، یہی کیفیت میری بھی تھی، میں نے اسے ویسے ہی میز پر ڈال دیا اور لیمپ گل کر کے سو رہا۔

صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں کافی روشنی پھیل چکی تھی اور گھڑی آٹھ بجا رہی تھی، جلدی سے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور باورچی خانے میں گھس گیا، رئیس بیٹھی کچھ پکا رہی تھی۔ ناشتہ کھاتے ہوئے اس نے پوچھا ۔۔۔۔۔۔ کچھ پتہ چلا ادب کی حقیقت کا؟

میں نے اسے رات کے سارے ذہنی انتشار اور قلبی ہیجان کی روداد سنائی۔

وہ کہنے لگی ۔۔۔ "صبح اٹھتے ہی میں نے آپ کے سارے خیالات دیکھے،

[illegible] کے نیچے اپنا خیال بھی لکھ دیا"——
[illegible] کر سنانے لگی ——

——ادب کی حقیقت اور غایت کے تعین سے پہلے ہر ادیب کو انسانی زندگی کی وسیع مملکت میں قدم رکھنا چاہئے زندگی کو زندگی ہی سے سیکھنا چاہئے اسے ہر قسم کی معلومات ہوں، غیروں کی بنائی ہوئی پگڈنڈیوں پر چلنے کے بجائے اپنے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی طاقت و توانائی کا اندازہ کرکے اپنی راہ آپ بنانا چاہئے، مطالعہ و مشاہدہ اور تفکر کی گہرائی ضروری ہے!

ہمارے داخلی جذبات کو اجاگر کرکے ان میں ایک الہامی تاثر پیدا کرنے کی صلاحیت ہونا چاہئے، فن کاری سے زیادہ آفاقی اصولوں پر نظر رکھنی چاہئے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جن لوگوں کے لئے ادب پیدا کیا جا رہا ہے ان سے ادیبوں کو انس ہمدردی اور دلی تعلق ہو، اور یہی ادب کا امتیاز ہے! —

ادیب کو انسانی زندگی کا پورا پورا علم اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ سماج کی اصلاح ہو جائے، سماج انتہا بلندی کو پہنچ جائے اور ادیبوں کے دلوں میں ایک اضطراب سا پیدا ہو جائے، ادیبوں کو اسی وقت حقیقت کا پتہ چلے گا جب کہ خود اُن کے دلوں میں ایک بے چینی اور آگ سی پیدا ہو جائے، غیروں کے چبائے ہوئے نوالوں کو چھوڑ کر اپنا لقمہ اسی وقت بنا سکیں گے جب کہ انھیں اپنے اطراف پھیلی ہوئی سماج اور ماحول سے دلی تعلق پیدا ہو۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جس وقت سماج میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے تو ایسے وقت ادیب کے دل میں ایک عجیب رسہ کشی شروع ہو جاتی ہے۔ اس وقت وہ یکایک مطالعہ کرنے لگتا ہے اور خود بخود اس کے خیالات و افکار میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے اور داخلی جذبات کے زیر و بم سے غیر ارادی طور پر وہ فن کی تخلیق کرتا ہے، بسنت رُت میں جس طرح درختوں میں نئی کونپلیں اور نئی نئی پتیاں آتی ہیں اسی طرح فن میں بھی نئی نئی شاخیں نکل آتی ہیں، اس وقت سماج ایک اہم قوت اور سماجی اصلاح ہی ہمہ گیر اصول بن کر اس کے فن میں ظاہر ہونے لگتا ہے، اختر حسین، حیات اللہ، بیدی، اختر انصاری، ندیم قاسمی، ممتاز مفتی کی تحریروں میں حیرت انگیز فنی خوبیاں نہیں ہیں پھر بھی ان کے دلوں کی انتہائی گہرائی میں عوام کی فلاح و بہبود کا ایک اضطراب ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ اُن ادیبوں سے جو صرف فن ہی کو اصل سمجھے ہوئے ہیں زیادہ مقبول ہو رہے ہیں ——

آج کل ادچھا پن، عریانی اور جنسیات سے معمور ادب خس و خاشاک کی طرح بہہ رہا ہے، اس کا سبب یہی ہے کہ لکھنے والے عوام کے خلوص و محبت اور صداقت پر خود غرضی کو ترجیح دے رہے ہیں، اس قسم کے پہاڑی نالے کی طرح تیز دوڑنے والے ادب میں سمندر کی سی گہرائی، سکون اور زندگی کیونکر رہ سکتی ہے؟ اپنے دل، شعور اور دماغ میں انتہائی اضطراب، ہمدردی، احساس اور محبت رکھنے والا ادیب اس طرح لکھے گا کہ اس کی تحریر کا ہر صفحہ، ہر سطر اور ہر جملہ اور ہر لفظ زندگی میں ڈوبا ہوا ہوگا۔ کیونکہ فن کار بحرِ حیات کی طوفانی موجوں اور گرداب سے اپنی کشتی، دل کو لے جاتا ہے، بعض حیرت انگیز قوتوں کے ساتھ وہ محبت و نفرت، ایثار و خود غرضی کی مخالف لہروں پر چھوڑ دیا گیا ہے، اسی لئے انسانی زندگی میں قدم قدم پر کشمکش ہے، اضطراب ہے، لڑائی ہے اور طوفان ہے اور یہی معیارِ فن ہے! ع

ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے

ورنہ چند جملے لکھ لینا یا چند شعر موزوں کر لینا، ادیب اور شاعر ہونے کے لئے کافی نہیں ع

جس پاس عصا ہو اسے موسیٰ نہیں کہتے
ہر ہاتھ کو عاقل یدِ بیضا نہیں کہتے

برجیس کے خیالات سننے کے بعد مجھے محسوس ہوا—
میں ان سات رنگوں سے ایک رنگ حاصل نہ کر سکا لیکن

برجیس نے لسے پالیا۔ ۔ واقعی اپنی بڑائی کی خاطر لکھنے کے بجائے سماج کی فلاح اور بہبود کے لئے لکھنا اور لکھنے والے کے دل میں سماج سے انتہائی محبت اور خلوص کا وجود ہی ادب کی کنجی ہے ۔۔ اور حقیقت ہے کہ جب دل میں گداز نہ پیدا ہو تو فن بے روح ہو جاتا ہے، اگر صرف خارجیت ہی ہو تو "دیدۂ بینا" کی بجائے "لڑکوں کا کھیل" ہی تو رہ جائے گا ۔۔۔۔

اور مجھے اپنی رفیقۂ حیات پر فخر سا محسوس ہونے لگا عتیق کی بیوی کے حسن جمال اور نسوانیت کے دلفریب خط و خال نے میرے اندر جو احساس کمتری پیدا کر دیا تھا وہ برجیس کی اس معنوی خوبی سے کالعدم ہو گیا۔

میں نے سوچا کہ میری بیوی عتیق کی رفیقۂ حیات کی طرح شکیل و جمیل اور حسن دلآویز کا مجسمہ نہیں ہے، اس کی سی شوخی، چنچل پن اس میں نہیں ہے لیکن اس کی فطرت اور ذہانت اس قدر بلند ہے کہ پھر کسی خیال کی تشنگی نہیں رہتی۔ اس سے پہلے بارہا اس نے اپنی فطرت اور سیرت کے محاسن سے مجھے متاثر کیا تھا اور آج تو ایسا محسوس ہوا کہ حسین اور شوخ عورت آنکھوں کے لئے نور و سرور ہو سکتی ہے لیکن رفیقۂ حیات نہیں! اور خارجی خوبیوں سے زیادہ داخلی محاسن رکھنے والی عورت طوفان حیات میں ایک اچھی مونس و غمخوار اور حقیقی دوست بن سکتی ہے! ۔۔۔۔

شاہین فاروقی

۱۹۴۴ء کی بیش بہا کتابیں

جناب محمد جمیل احمد صاحب ایم اے۔ بریلوی کی تازہ تصنیف

تذکرۂ شاعرات اردو ابتدا سے لے کر موجودہ دور تک کی اردو شاعرہ خواتین کا مفصل مکمل تذکرہ اور ان کے کلام کا انتخاب مع تنقید و تبصرہ دور حاضر کی شاعرات کے حالات خود نوشتہ اور کلام انتخاب کا اپنا انتخاب درج ہے۔ خواتین کی متعدد تصاویر بھی شامل ہیں۔ اس موضوع پر اب تک ایسی کتاب مرتب نہیں ہوئی مقدمہ ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم اے۔ پی ایچ ڈی و پروفیسر محمد طاہر فاروقی ایم اے۔ کاغذ سفید نفیس گرد پوش مجلد حجم صفحے ۸۵۰۔ قیمت صرف عہ 5/12

ٹوٹے ہوئے دل بہترین نفسیاتی، رومانی (نئے افسانوں کا مجموعہ مقدمہ خان بہادر ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں صاحب پی ایچ ڈی۔ کاغذ سفید۔ دیدہ زیب گرد پوش مجلد صفحے ۲۴۴ قیمت صرف عہ

تاثرات نہایت ہی دلدوز حسین اور پُر تاثیر ادب پاروں کا دلکش مجموعہ کاغذ سفید، مصور رنگین گرد پوش مجلد حجم صفحے ۱۲۰ قیمت صرف عہ/۱

(یہ اور دیگر ہر قسم کی کتابیں ملنے کا پتہ)

قومی کتب خانہ ۔ بریلی

سرگزشت حاتم

دہلی کے پہلے اُردو شاعر اور استاد الشعراء شاہ ظہور الدین حاتم کے حالات زندگی اور اُردو، فارسی کلام پر تبصرہ جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے نہایت ہی تحقیق و تلاش کے بعد عالمانہ انداز میں قلمبند فرمایا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کے ذریعے سے اُردو کے ایک بڑے شاعر اور استاد الاساتذہ کی شخصیت اور کردار کے ایسے پہلو روشنی میں آجاتے ہیں جو ہر زمانے میں معیاری سمجھے جائیں گے۔ ان کی زندگی کے حالات پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حال اور قال ایک ہی تھا۔ ان کی زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی تکلف اور تصنع سے پاک تھی۔ تشنہ گان ادب اور محققین کے لئے یہ نادر تحفہ ہے۔ صفحات ۱۲۸

طباعت و کتابت دیدہ زیب

قیمت عاں

(ملنے کا پتہ)

سب رس۔ کتاب گھر رفعت منزل خیریت آباد

حیدرآباد دکن

نو باغ کے گنبد

[illegible] اس کے تمے اکیت اکے گنبد ہفت گنبد سے جانب جنوب واقع ہیں اسی طرح بیجا پوری [illegible] کے سامنے کے تینوں گنبد جو اب نوباغ کے احاطے میں آگئے ہیں، ہفت گنبد سے دو ایک فرلانگ کے فاصلے پر جانب شمال واقع ہیں اور اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ ان میں ایک گنبد چھوٹا ہے اور دو بڑے۔

چھوٹا گنبد اس کا ہر ضلع اندر سے ۱۹ فٹ دو انچ اور باہر سے ۲۶ فٹ ۷ انچ ہے۔ اندر سے قبہ اور دیوارں کی ساری گچ جھڑ گئی ہے۔ کمانوں اور نیم محرابوں کا بھی یہی حال ہے۔ صرف مشرقی کمان کی گچ باقی ہے اور اس کے دونوں ڈھال نما پھول بھی رہ گئے ہیں۔ سوائے ان پھولوں کے اس پر کسی قسم کا نقش و نگار نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام کمانیں اور نیم محرابیں بالکل بے نقش اور سادہ ہوں گی۔ اس کا بائیں طرف کے نیم محراب پر بھی ایک ڈھال نما پھول رہ گیا ہے اسی طرح جنوبی کمان کے اوپر کے آدھے حصے پر گچ اور ایک ڈھال نما پھول باقی ہے۔ مغرب رویہ محراب پر بھی ذرا سا نقش ہے جو بہت معمولی ہے اور دو ڈھال نما پھول ہیں۔ یہ تمام پھول چھوٹے چھوٹے اور بہت معمولی ہیں۔ قبہ بھی بالکل سادہ ہے سوائے لوح نما کنگروں کے اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ان تمام باتوں سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ گنبد دورِ اول کے ابتدائی حصے کا ہے اس لئے کہ اس کی کمانوں کا طرز اسی دور کا ہے۔ مغربی محراب کے سیدھے بازو ایک بہت ہی چھوٹا سا طاقچہ گچ کا بنا ہوا ہے۔ کیا عجب ہے کہ گنبدوں میں طاقچہ کی ابتدا اسی سے ہوئی ہو۔

یوں تو کہنگی کی وجہ سے پورے گنبد ہی کی حالت خستہ ہے مگر قبہ کی حالت تو اور بھی بری ہے، بیچ میں اور اطراف میں کئی سوراخ پڑ گئے ہیں باوجود اس کے اوپر کی استرکاری جوں کی توں باقی ہے اور چونکہ نہ اب تک کبھی اس کی داغ دوزی ہوئی ہے اور نہ کبھی آہک پاشی کی نوبت آئی ہے اس لئے صدیوں کی بارش اور گرد و غبار سے اس کا رنگ اتنا سیاہ ہوگیا ہے جس سے ہم اس کی قدامت کا اندازہ کر سکتے اور اگر کوئی پیمانہ ایجاد ہو تو اس سے صدیوں کا تعین بھی کر سکتے ہیں۔ گلبرگہ میں اس وقت اس سے زیادہ سیاہ کوئی قبہ نہیں ہے اور اسی وجہ سے دورِ اول کے قبہ کو ہم اصلی حالت میں دیکھ رہے ہیں۔ وضع قطع میں یہ ایسا ہی ہے جیسے حیدر باؤلی کے گنبد کا قبہ۔ وہ بڑا ہے اور یہ چھوٹا۔ اس گنبد کی دیواریں سلامی ہیں اور اس کی سیدھی۔ دورِ اول کے گنبدوں میں یہ گنبد سب سے چھوٹا ہے، گنبد کا چبوترہ جانب مشرق ۲ فٹ بلند ہے۔ اس کی اس بلندی کو خوبصورت اور کارآمد بنانے کے لئے اس کے نیچے تین پختہ کمانیں تہ خانہ کی شکل کی یادگار ہیں اگر ان پر دروازے لگا دئے جائیں تو چھوٹے چھوٹے کمروں یا کوٹھوں کا کام دے سکتے ہیں۔

بڑا گنبد اس چھوٹے گنبد سے جانب مغرب، تقریباً ۸۳ فٹ کے فاصلہ پر ایک بڑا عالی شان گنبد ہے جس کا ہر ضلع اندر سے ۳۴ فٹ چار انچ اور باہر سے ۴۹ فٹ ہے۔ اندر اور باہر کی اکثر گچ جھڑ گئی ہے اور گنبد خستہ حالت میں ہے۔ علاوہ ازیں وہ نقش و نگار سے بالکل خالی ہے۔ کمانوں اور نیم محرابوں پر صرف ایک ہلال نما بیل دوڑا دی گئی ہے البتہ مغرب رویہ محراب پر اس سے مختلف دوسری قسم کی خوش نما بیل ہے اور سیدھی طرف ایک طاقچہ ہے۔ اس نہایت مختصر گلکاری کے ساتھ ہر ایک پر مختلف نقش کے دو دو ڈھال نما پھول بنے ہوئے ہیں۔ باہر کی طرف بھی کمانوں پر ایسے ہی پھول بنے ہوئے ہیں۔ مغربی محراب پر ہلالی کنگرے بھی تھے جو سب کے سب جھڑ گئے۔

ان کی کچھ علامتیں بائیں جانب باقی رہ گئی ہیں۔ ان ہلالوں کی دو حالتیں ہیں، کہیں تو ان کے جھڑ جانے سے کمان پر کچھ اثر نہیں پڑتا صحیح سالم رہتی ہے جیسے ہیکل باؤلی کے گنبد کی کمانیں اور کہیں ان کے جھڑ جانے سے کمان شکستہ ہوجاتی ہے جیسے زیر بحث گنبد میں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پہلی صورت میں ہلال کمان بننے کے بعد بنائے جاتے ہیں اس لئے وہ پوری طرح پیوست نہیں ہوتے اور دوسری صورت میں کمان کے ساتھ ساتھ اسی میں ہلال تراشے جاتے ہیں۔ مغربی محراب کی گولائی میں نہ تو کوئی پھول ہے اور نہ اس کے گوشوں میں آرائشی ستون ہیں اور نہ ستونوں کے درمیان کوئی ابھری ہوئی کمان ہے اور نہ کلام شریف کی آیتیں تحریر ہیں۔ کمانوں کے پاکھے لٹکے ہوئے، نیچے سے پھیلے ہوئے اور بالکل سے ہیں بالکل ایسے جیسے مجاہد شاہ کے گنبد کے۔ ان تمام باتوں سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دور اول کے کے ابتدائی حصے میں بنا ہوگا۔ اس دور کی کمانوں کو اصلی حالت میں دیکھنا ہو تو اس گنبد میں دیکھنا چاہئے۔ مزید براں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہلالوں کا استعمال اس قدر عام اور مقبول تھا کہ دور اول کے ابتدائی حصے میں بھی جب کہ دوسری تزائنوں کی ابھی ابتدا نہیں ہوئی تھی ان کا استعمال کہیں کہیں ہونا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی طرح خوزہ ماں صاحبہ کے گنبد میں بھی ان کا استعمال ہوا ہے۔ اس گنبد کا قبہ بھی اندر سے بالکل سادہ ہے صرف کتاب نما کنگرے اطراف میں ہیں۔ ممکن ہے بیچ میں گول پھول بھی ہو مگر اب وہاں کی تمام کچھ ہی جھڑ گئی ہے۔ اوپر سے قبہ چپٹا ہے اور اتنی خوبصورت نہیں ہے جتنا کہ ہیکل باؤلی کے گنبد کا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دور اول میں دونوں قسم کے قبے استعمال ہوتے رہے، ابھرے ہوئے اونچے اور چپٹے پست ان دونوں کی مثالیں یہاں اس چھوٹے بڑے گنبد میں موجود ہیں۔

دوسرا بڑا گنبد مذکورۂ بالا بڑے گنبد سے جانب شمال تقریباً ۴۴ فٹ کے فاصلہ پر ایک اور اتنا ہی بڑا گنبد ہے۔ اس کا ہر ضلع اندر سے ۳۳ فٹ ۲ انچ اور باہر سے ۴۹ فٹ ۵ انچ ہے۔ اس کی کمانیں اور نیم محرابیں فیروز شاہی طرز کی ہیں۔ دور اول اور دور ثانی دونوں کے نمونے یہاں آمنے سامنے موجود ہیں۔ اندر ہر طرف مچان باندھنے کے سوراخوں سے اور ویسے بھی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیواروں اور کمانوں کی استرکاری نہیں ہوسکی ہے اس لئے استرکاری سے پہلے کی حالت دیکھنی ہو تو ہم یہاں اس کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔ اس گنبد میں اب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ مغربی کمان کے ہر دو طرف دو بڑے طاق ہیں۔ پورے قبہ میں کمانوں اور نیم محرابوں کے اوپر اوپر تک استرکاری ہو چکی ہے اور وہ اب بھی موجود ہے چنانچہ سب سے پہلے ہر کمان اور نیم محراب پر کچھ میں خوش نما طاق بنے ہوئے ہیں، ایسے آٹھ طاق ہیں۔ ان کے اوپر لوح نما کنگروں کا حلقہ چڑھا ہوا ہے۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک منقش پتلا سا حلقہ ہے، اس حلقے پر چار منقش چھوٹے چھوٹے پان ہیں اور ہر دو پانوں کے درمیان ایک گول پھول، اس کے اوپر کچھ فاصلے سے بیچوں بیچ ایک گول پھول ہے جس کا اکثر حصہ جھڑ گیا ہے۔

یہ تمام نقوش بہت معمولی اور ادنیٰ قسم کے ہیں۔

باہر تمام گنبد پر قبہ سے لے کر دیواروں تک استرکاری ہو چکی ہے مگر اکثر جھڑ گئی ہے۔ ہر کمان پر دو دو ڈھال نما پھول باقی ہیں۔

میر جہانگیر علی خاں

ضروری اطلاع:۔ نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ براہ کرم خریدار اصحاب نئے سال کا چندہ تقسیم کنندۂ سب رس سے باضابطہ مطبوعہ رسید حاصل کرکے عنایت فرمائیں۔ اضلاع کے خریدار بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں یا وی۔ پی کرنے کے لئے دفتر کو آرڈر روانہ فرمائیں۔

علم تخمیریات کا امام — پاسچر

لوئی پاسچر ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوا، پاسچر کا باپ نپولین کی فوج کا ایک سپاہی تھا جس نے بعد میں ایک چھوٹے سے فرانسیسی قصبے میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور چمڑوں کی دباغت کا کام کرنے لگا۔ پاسچر کی ابتدائی زندگی نہایت ہی سادہ رہی اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسے سائنس کا یہ جید عالم اپنی نوعمری میں بھی اتنا ہی ذہین ہوگا وہ یہ سن کر متعجب ہوں گے کہ اپنے مکتب کے زمانہ میں وہ ایک متوسط درجہ کا طالب علم تھا۔

۱۸۴۰ء میں پاسچر نے طبیعیات کی ڈگری حاصل کی، اس کے ممتحنوں نے جوابی پرچوں کے دیکھنے کے بعد اس کے متعلق یہ نوٹ لکھا۔

"یونانی، لاطینی، فن خطابت، ادب، تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ میں بہتر، ابتدائی سائنس میں بہترین، فرانسیسی مضمون نویسی میں بہترین"

۱۸۴۳ء میں وہ ایک ایسے ادارے (Ecole Normale) میں داخل ہوا جہاں پروفیسروں کی ٹریننگ کا انتظام تھا اور یہیں اس نے ٹارٹرک اور پارا ٹارٹرک ترشوں کے قلموں کا مطالعہ کیا گویا یہ اس کے پہلے سائنٹفک تجربات تھے۔

۱۸۲۰ء میں ایک السای دوا فروش کسٹنر نے ٹارٹرک ترشے کی تیاری کے دوران میں محض اتفاق سے ایک ایسا ترشہ حاصل کیا تھا جسے وہ دوبارہ باوجود کوشش کے تیار نہ کر سکا۔ گے لوسک نے اس عجیب و غریب ترشے کا امتحان کرکے اس کا نام ریسمک ترشہ تجویز کیا، لیکن برزی لیس نے یہ رائے دی کہ اسے پارا ٹارٹرک ترشہ کہنا چاہئے، بہرحال پاسچر کے تجربوں سے اس نامعلوم الاصل مرکب کی ساخت واضح ہوگئی۔ اس نے اس ترشے کی دو قلمیں تیار کیں یعنی ایک وہ جو انگور کے ٹارٹرک ترشے سے حاصل ہے اور جسے عام زبان میں دست راست کا ترشہ اور دوسرا وہ جسے دست چپ کا ترشہ کہنا چاہئے۔ یہ مشاہدہ دراصل اس اہم علم کا سنگ بنیاد ہے جو بیس سال بعد تجسمی کیمیا کے نام سے ایک مستقل حیثیت کا مالک ہوا۔

گریجویٹ ہونے کے بعد پاسچر سٹراس برگ بھیج دیا گیا جہاں اس نے اکادمی کے ریکٹر کی لڑکی ماری لاریں سے شادی کرلی ۱۸۵۴ء میں وہ لل کی نئی سائنس فیاکلٹی کا ڈین اور پروفیسر ہوگیا اور بہت جلدی اس کی جماعت علم کیمیا کی تعلیم کے لئے مشہور ہوگئی۔ اس کے دو سال بعد یعنی ۱۸۵۶ء میں لل کے ایک شراب کے کارخانہ کا مالک نوجوان ڈین کے پاس مشورہ اور امداد کے لئے دوڑتا ہوا آیا۔ اس شخص کو جو چقندر سے الکحل تیار کرنا چاہتا تھا، اپنی اس کوشش میں سخت ناکامی ہوئی تھی۔ پاسچر نے یہ دیکھ کر کہ یہ موقع تخمیر کے مطالعہ کے لئے سودمند ثابت ہوگا فوراً اس کی امداد کے لئے راضی ہوگیا۔

اس نے تخمیر کا باضابطہ مطالعہ شروع کیا اور اپنے تجربوں میں خاص طور پر دودھ کی کھٹاس پر نظر رکھی جسے سائنٹفک زبان میں لیاکٹک تخمیر کہتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ پھٹے ہوئے دودھ میں ایک خاکستری رنگ کی شئے کے اندر نہایت مہین مہین دانے مرتب تھے جن کی جسامت ایسٹ سے بھی چھوٹی تھی اور وہ دیگر بیدلک حاصلات سے اس قدر مشابہ تھے کہ اب تک دوسرے کیمیادان اور ماہرین حیاتیات کی نظریں ان پر نہ پڑ سکی تھیں۔

جب اس خاکستری شئے کو علیحدہ کرکے اس کی نہایت قلیل مقدار تازہ دودھ میں شریک کی گئی تو پاسچر نے دیکھا کہ لیاکٹک تخمیر کی مخصوص علامتیں نمودار ہوگئیں، لہذا معلوم ہوا کہ یہ خاکستری شئے دراصل ایک خامرہ ہے۔

اس دوران میں پاسچر پیرس آگیا جہاں (Ecole Normale) میں سائنٹفک تحقیقات کا کام اس کے سپرد کردیا گیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سترہویں صدی عیسوی سے قبل ہی تمام متمدن دنیا میں زندہ اجسام کی ازخود پیدائش کا نظریہ اپنی اہمیت تقریباً کھو چکا تھا، لیکن اس زمانہ میں خوردبین کی ایجاد کے ساتھ ساتھ ہی بظاہر اس کی موافقت میں نئی نئی دلیلیں مہیا ہونے لگیں۔

مثلاً بارش کے پانی اور دوسری نامیاتی مائعات میں جو ہوا میں کھلے رکھے جائیں نہایت ہی چھوٹی چھوٹی جسامت کے جاندار رونما ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ نظریہ از خود پیدائش کی موافقت میں یہ حجت پیش کی جانے لگی کہ اگر یہ جاندار خود بخود پیدا نہیں ہوئے تو پھر کہاں سے آئے؟

دسمبر [illegible]ء میں موسیو پوشے نے سائنس اکاڈمی میں ایک مقالہ روانہ کیا جس کا عنوان تھا "مصنوعی ہوا اور آکسیجن میں نباتی اور حیوانی عضویوں کی از خود پیدائش"۔ اس سائنسداں نے یہ بیان کیا کہ اس نے اپنے تجربوں میں غلطی کے امکانات کے سد باب کی خاص کوششیں ملحوظ رکھی تھیں اور یہ بلند آہنگ دعویٰ بھی کیا کہ وہ ہوا اور آکسیجن سے معرا فضا میں جانداروں کی از خود پیدائش کو دکھلا سکتا ہے۔

ابھی سائنس داں اس مسئلہ پر بحث کر ہی رہے تھے کہ پاسچر نے خورد بین کے ذریعہ فضائی ہوا کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر ہوا میں جراثیم موجود ہوتے ہیں تو انھیں روکا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک نلی میں سے جس کے ایک سرے پر شیشہ روئی کا ڈاٹ لگا دیا گیا تھا ہوا گزاری گئی تو شیشہ روئی پر جمنے والی گرد میں کئی جراثیم موجود تھے۔ اس کے بعد اس نے مسلسل تجربے کئے اور یہ دکھلانے کی کوشش کی کہ اگر کوئی نامیاتی مائع، فضائی ہوا کی دسترس سے دور رکھا جا سکے تو وہ عرصۂ لامتناہی تک خالص رہ سکتا ہے۔

پانچویں مارچ [illegible]ء میں وہ لکھتا ہے کہ "جتنے تجربے میں نے اس وقت تک کئے ہیں اگر انھیں اکٹھا کیا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نامیاتی مائعات میں عضویوں کی پیدائش کی علت خالص فضائی ہوا کی گرد ہوا کرتی ہے"۔

اس کے بعد پاسچر نے پھر سے تخمیر کا مطالعہ شروع کیا اور اس سلسلے میں لیاکتک تخمیر کے مشاہدہ کے دوران میں وہ ایک اور تخمیر سے دوچار ہوا جسے بیوٹرک تخمیر کہتے ہیں اور جس کی وجہ سے باسی مکھن میں بدمزہ پیدا ہوتی ہے۔ اور چونکہ اول اول وہ اس تخمیر کا اصلی سبب نہ معلوم کر سکا تھا اس لئے وہ اس تخمیر کی پیدائش کے ساتھ ساتھ ہوائی جراثیم کی موجودگی سے بہت متاثر ہوا۔

فروری [illegible]ء میں پاسچر لکھتا ہے "تجربوں کو متعدد مرتبہ دہرانے پر بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ شکر، مانائٹ اور لیاکتک ترشے کی بیوٹرک ترشے میں تبدیلی صرف انھیں عضویوں کی وجہ سے ہوتی ہے اور یہی عضوئے اصلی بیوٹرک خامرے ہیں"۔ اس نے یہ بھی بیان کیا کہ یہ جراثیم چھوٹے استوانہ نما اجسام ہیں جو انفرادی طور پر یا زنجیروں میں حرکت کرتے ہیں اور جب ان جراثیم کو موزوں مائعات میں اگانے کی کوشش کی گئی تو ایک اور دلچسپ حقیقت ظاہر ہوئی چنانچہ وہ اپنے تجربوں کی تفصیل کے دوران میں یہ بیان کرتا ہے کہ "یہ ایک عجیب بات ہے کہ یہ جراثیم ہوا کی موجودگی کے بغیر نمو پاتے ہیں بلکہ لطف تو یہ ہے کہ ہوا ان کی ہلاکت کا موجب ہوتی ہے"۔

اس سائنسداں نے شرابوں کی خرابی کے اسباب کا بھی تحقیقی مطالعہ کیا چنانچہ [illegible]ء میں وہ لکھتا ہے "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ شراب کی بیماریاں بھی خامروں، خورد بینی نباتیے اور ایسے جراثیم کی وجہ رونما ہوتی ہوں جو فضائی تبدیلیوں، تپش کے اختلافات وغیرہ سے شرابوں میں پیدا ہو جاتے ہیں"۔ بعد میں اس نے دکھلایا کہ اگر شراب کو ابتدا میں ۵۰ سے ۶۰ سنٹی گریڈ کی تپش میں تھوڑی دیر تک رکھا جائے تو یہ طریقہ ہر لحاظ سے سودمند ثابت ہوتا ہے۔

اس زمانہ میں ریشم کی کاشت والے خطوں میں ایک وبائی مرض پھوٹ پڑا اور اس مرض کی تباہیاں بڑھنے لگیں تو لوگوں نے پاسچر سے درخواست کی کہ وہ اس وبا کا اصلی سبب دریافت کرے۔ چنانچہ اس نے بڑی ہی کد و کاوش کے بعد نہ صرف ریشم کے کیڑوں کی بیماری کی اصلی وجہ معلوم کر لی بلکہ اس سے بچنے کی احتیاطی تدابیر بھی اہل ملک کو بتلائیں۔ اس طرح پاسچر نے فرانس کی ریشم کی صنعت کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔

اس سے فرصت ہوئی تو پاسچر نے اپنے تجربوں کا رخ ایک اور جانب پھیر دیا لیکن اس مرتبہ [illegible] عدد [illegible] نے اس کو [illegible] بات یہ تھی کہ ایک زمانہ سے جرمنی جنگ کی تیاری کر رہا تھا

شہر [illegible] صنعت میں فرانسیسی جرمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔ پاسچر نے یہ طے کیا کہ وہ بیر کی تیاری کا سائنٹفک مطالعہ کرے گا تاکہ اہل فرانس بھی اس مفید صنعت سے فائدہ اٹھا سکیں۔

اس زمانہ میں وشالیرے میں بیر کا ایک کارخانہ موجود تھا۔ پاسچر نے کئی مرتبہ خود جا کر اس کارخانہ کو دیکھا اور کارخانہ والوں سے مختلف تفصیلات دریافت کیں لیکن اس کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کارخانہ کے کارکن اپنی صنعت کی کئی جزیات سے قطعاً ناواقف تھے۔ جب کبھی ان کے گاہک کوئی شکایت کرتے یا بیر خراب ہونے کی اطلاع مالکوں کو دیتے تو فوراً ایک نیا خامرہ بیرون ملک سے منگوا لیا جاتا۔ اس طرح ہر مرتبہ نئے خامرے کی وجہ سے بیر کا معیار قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

پاسچر نے مشہور بیر شرابوں کے نمونے حاصل کئے اور ان پر تجربے کرنے کے بعد وہ حسب ذیل نتائج پر پہونچا۔

(۱) خالص راب یا بیر خراب میں ہر تبدیلی کی وجہ جراثیم ہوتے ہیں۔

(۲) یہ جراثیم یا تو ہوا سے آتے ہیں یا اجزا مستعملہ یا ان برتنوں میں ہوتے ہیں جنھیں بیر کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے۔

(۳) بیر میں جراثیم نہ ہوں تو وہ غیر متبدل رہتی ہے۔

اسی طرح اس نے یہ بھی دکھلایا کہ اگر تمام شروبات کو پہلے سے گرم کی ہوئی بوتلوں میں ۵۰ تا ۵۵ درجہ تپش کے زیر اثر بھرا جائے تو ان میں خرابی نہیں ہوتی۔ اس طرح سائنسی ادب میں ایک نئی اصطلاح (Pasteurization) کا اضافہ ہوا جس سے مراد مذکورہ بالا طریقہ پر بیر یا شرابوں وغیرہ کو محفوظ کرنا ہے۔

ان کامیاب تجربوں کے بعد پاسچر نے اس مہلک بیماری پر تحقیقات کا آغاز کیا جسے انتھراکس (Anthrax) کہتے ہیں۔ فرانس میں اس متعدی مرض کے شروع ہو جانے سے زراعت کو سخت نقصان پہونچ رہا تھا۔ اسی لئے اس سے جو مویشی متاثر ہوتے وہ آناً فاناً میں مر جاتے تھے۔ بعض گاؤں میں تو اس مرض منحوس سے سارے کے سارے مویشی تباہ ہو گئے تھے۔ یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی اس وبا سے کافی نقصان پہونچ رہا تھا۔ مثلاً ۱۸۶۷ء سے ۱۸۷۰ء کے درمیان روس کے ضلع نووگراڈ میں (۵۶ ہزار) زراعتی مویشی اور (۵۲۸) انسانی جانیں اس مرض کا شکار ہو گئیں۔

بہت زمانہ قبل یعنی ۱۸۳۰ء ہی میں الفرٹ کے ڈاکٹری اسکول کے ایک پروفیسر موسیو ڈلافان نے یہ دکھلایا تھا کہ انتھراکس سے مرے ہوئے مویشی کے خون میں چھوٹی چھوٹی سلاخ نما شکلیں ہوتی ہیں لیکن یہ صرف ایک دلچسپ بات ہی ہو کر رہ گئی اور کسی نے اس کی سائنٹفک توجہ نہیں کی۔

اسی زمانہ میں ایک جرمن طبیب ڈاکٹر کاخ ان جراثیم کو مصنوعی طور پر اگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اگر ان جراثیم کو خاص غذائی محلول میں رکھا جائے تو وہ تیزی سے نمو کرنے لگتے ہیں اور چند گھنٹوں کے اندر اندر اپنی اصلی جسامت سے ۱۰۔۲۰ گنا زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اس طبیب نے یہ بھی مشاہدہ کیا کہ کچھ عرصہ کے بعد جراثیم کے جسم میں مہین مہین دانے پیدا ہو جاتے ہیں۔

پاسچر نے ریشم کے کیڑے کی بیماریوں پر تجربہ کے دوران میں یہ دکھلایا تھا کہ یہ دانے دراصل معمولی پودوں کے بیج یا تخم سے مشابہ اجسام ہیں جن کو سائنس کی اصطلاح میں "بذرے" کہا جاتا ہے اور جن سے جراثیم کی افزائش ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ انتھراکس کا جرثومہ بھی اپنی افزائش اسی طرح کر سکتا ہے اور جب ان سے پیدا شدہ جراثیم کو مصنوعی طور پر خرگوش، چوہے، اور گنی پگ کے جسم میں داخل کیا گیا تو وہی علامات رونما ہو گئیں جو انتھراکس کی بیماری یا انتھراکس سے مرے ہوئے کسی جانور کے خون کے لگ جانے سے پیدا ہوتی ہیں۔

ان جراثیم کو جب ۴۰ درجہ سنٹی گریڈ تپش پر رکھ کر دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ اب بذرے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہے لیکن اس ضمن میں ایک اور اہم بات بھی دریافت ہوئی وہ یہ کہ جراثیم

کا وہ غذائی محلول جس میں انھیں مصنوعی کاشت کے لئے رکھا گیا
تھا وقت کے ساتھ اپنی مضرت رساں قوت بھی کھوتا جاتا تھا مثلاً
جسم میں مصنوعی طور پر داخل کرنے پر اگر یہ کاشتی محلول ابتدا میں
دس میں سے دس جانوروں کے لئے ہلاک ثابت ہوتا تو آٹھ
روز کے وقفہ کے بعد یہی صرف چار یا پانچ کو ہلاک کر سکتا اور دس
یا بارہ روز گزر جانے پر تو وہ بالکل بے ضرر ہو جاتا یعنی یہ معلوم
ہوا کہ وہ جانوروں کے جسم میں کوئی ایسی مدافعتی قوت پیدا کر دیتا
ہے جو انھیں اس مہلک بیماری کے اثرات سے محفوظ کر دیتی ہے۔
اس کے بعد ان اصولوں کو پیش نظر رکھ کر بہت بڑے
بڑے پیمانوں پر تجربے کئے گئے اور یہ دیکھ کر سائینسدانوں کی
آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ پاسچر کی یہ دریافت ایک معجزہ ہے۔
چنانچہ اس طریقے سے فرانسیسی کسانوں کے لاکھوں مویشی بچا
لئے گئے۔

اسی سلسلہ کے تجربوں کے دوران میں پاسچر ہڑک بائی
(Hydrophobia) کے مسائل کو سب پر ترجیح
دیتا رہا۔ اس زمانہ میں اس تکلیف دہ اور خطرناک بیماری کے متعلق
سوائے اس کے کچھ معلوم نہ تھا کہ

(۱) دیوانے جانوروں خصوصاً دیوانے کتے کے تھوک
میں اس بیماری کا سمی مادہ موجود ہوتا ہے۔

(۲) متاثرہ جانوروں کے کاٹنے سے یہ مرض دوسروں
میں منتقل ہو جاتا ہے۔

(۳) جانور کے کاٹنے اور بیماری کے اثرات کے ظاہر
ہونے کے درمیان عموماً چند دنوں سے لے کر کئی کئی ماہ تک کا وقفہ
درکار ہوتا ہے۔

ایک سگ گزیدہ مردہ بچے کے لعاب دہن کو مصنوعی طور
خرگوش کے جسم میں داخل کر کے پاسچر نے یہ ثابت کیا کہ اس طرح
بیماری ایک جانور سے دوسرے میں منتقل کی جا سکتی ہے۔ پس
اس کے بعد اس حاضر دماغ سائنس دان نے انھی
کے تجربوں کو دہرا کر اس سمی مادے کی قوت کو گھٹا دینے کی کوشش
شروع کر دی۔ ایک ایسے خرگوش کے دماغ کے ٹکڑے کو
جو مصنوعی طور پر ہڑک بائی سے مارا گیا تھا حاصل کر کے ایک
صاف ستھرے برتن میں رکھا گیا اور جب اس پر تجربے کئے گئے
تو معلوم ہوا کہ جیسے جیسے دن گزرتے گئے اور دماغ کا یہ ٹکڑا
سوکھتا گیا اس کے سمی اثرات بھی کم ہوتے گئے تا آنکہ آخر میں
اس کو سادہ پانی میں پیس کر عرق حاصل کیا گیا اور جب اس
عرق کو کتوں کے جسم میں داخل کر کے اس کے اثرات دیکھے گئے
تو خود پاسچر کو اپنی اس کامیابی پر انتہائی مسرت ہوئی۔ اس لئے
کہ اب یہ کتے اس بیماری سے بالکل محفوظ ہو گئے تھے یعنی یہ کہ
دوسرے دیوانے کتوں کے کٹوانے سے بھی ان میں مرض کی کوئی
علامات ظاہر نہیں ہوئیں۔

جس زمانے میں پاسچر ان تحقیقات میں مصروف تھا
اس کے پاس ایک نو عمر فرانسیسی لڑکے جوزف میسٹر کو لایا گیا جسے
دیوانے کتے نے کاٹ لیا تھا۔ بڑے ہی کشمکش و پیچ کے بعد
اس حکیم نے یہ فیصلہ کیا کہ اس پر بھی اسی طریقہ علاج کا تجربہ کیا جائے
جو کتوں کے ساتھ ہوا تھا۔ یعنی اس بچے کو بھی چودہ دنوں کے رکھے
ہوئے دماغی مادے کا ٹیکا لگایا گیا اور مسلسل دس روز تک علاج
جاری رہا جس دوران میں بارہ ٹیکے لگائے گئے اور اس طرح اس
بچے کی جان بچالی گئی۔

بعد میں دوا اور سگ گزیدہ مریضوں کے ساتھ اسی طریقہ علاج
کو استعمال کیا گیا اور ان صورتوں میں بھی ان کی جان بچالی گئی۔
اب پاسچر نے بڑے پیمانے پر اس سلسلے میں تجربے شروع کئے اور سائنس
اکادمی کے ایک اجلاس میں دنیا کو یہ خوشخبری دی کہ اس نئے
طریقہ علاج سے دیوانے کتے کاٹے ننانوے فیصدی کا میاب علاج کیا جا سکتا ہے۔

پاسچر کے اپنے کام کے علاوہ اس کے لائق شاگردوں نے
بھی پاسچر انسٹیٹیوٹ میں کام کرتے ہوئے کئی مہلک اور خطرناک بیماریوں
مثلاً خناق وغیرہ کا علاج دریافت کیا۔ چنانچہ ان میں سے ایک تو
ہیضہ کا سبب معلوم کرتے کرتے خود اس مرض میں مبتلا ہو گیا۔

علم جراثیمیات کے اس امام کی آخری عمر، شہرت، اعزاز
اور علمی خطابات سے مالا مال تھی۔ دنیائے سائنس نے اس کی
خدمات کی دل کھول کر ستائش کی اور اس کے کارناموں کو خوب سراہا۔

ހަމަ ތިޔަ ދީ ނު އަ ދަ ފަތިޔަ — ދަރިކަން [illegible] ދަ [illegible] ހަމަ

ހަމަ ތިޔަ ދީ ނު [illegible] — ހަމަ ތިޔަ ދީ ނު [illegible]

ތޫ ،، ޖަބަ ދަ އަ ،، ޖަބަ — [illegible]

ތޫ ،، ޖަބަ ނު އަ ތޫ ،، ޖަބަ — ތޫ ،، ޖަބަ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

شہزادی گلبدن

(اخبار ڈان کے ایک مضمون کا آزاد ترجمہ)

شہنشاہ بابر کی لڑکی گلبدن بیگم قلعہ معلی کی بے فکر عیش پسند اور روشن خیال فضا میں رہنے والی خواتین میں اپنی آپ مثال ہے۔ شہزادی نے اپنے بھانجے اکبر کے کہنے پر اپنے اشہب قلم کے ذریعہ اس زمانہ کے معرکتہ الآرا واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ گلبدن بیگم کو یہ خیال بھی نہ گزرا ہوگا کہ جس کام کو اس نے اپنے ذمہ لیا ہے وہ اسے زندۂ جاوید بنائے گا۔ اور زیب النساء جیسی باکمال شاعرہ کا کلام بھی شہرت کی دنیا میں گلبدن بیگم کی تصنیف پر رشک کرے گا۔

کئی اعتبار سے شہزادی گلبدن بیگم کو واقعات کے مدون کرنے میں از حد مدد ملی اول تو یہ کہ شہزادی کو ہمایوں، بابر اور اکبر جیسے جلیل القدر بادشاہوں کی سرپرستی حاصل رہی۔ ثانیاً یہ کہ قلعہ معلی کے واقعات اس کی آنکھوں نے دیکھے تھے مسز بیورج (Mrs. Beveridge) کے الفاظ ہیں کہ گلبدن بیگم نے اپنے اور اپنے ہمعصر خاندان کی بے کم و کاست تفصیلات سے روشناس کرا کر دنیائے تاریخ میں ایک بڑی خدمت انجام دی ہے اس کی تحریر سلیس بیساختہ اور برمحل ہے۔

گو ابو الفضل کے ادبی شاہکار "آئینہ اکبری" یا بایزید کی تصنیف "ترقی ہمایوں" کی طرح گلبدن بیگم کے "ہمایوں نامہ" کو اہمیت نہ دی جائے لیکن بعض اعتبارات کی بنا پر شہزادی کا ہمایوں نامہ" ابو الفضل اور بایزید کی تصانیف کے مقابل میں کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا بلکہ کچھ بڑھا چڑھا ہی ہوگا۔

ہمایوں نامہ قلعہ معلی کے باسیوں کی صحیح تاریخ کہی جا سکتی ہے یہ تاریخ ایک خاتون کے قلم اور زاویۂ نگاہ کا کارنامہ ہے جس کی ساری زندگی شاہان مغلیہ کی سرپرستی میں بسر ہوئی۔

شہزادی نے اپنی اس تصنیف میں دربار اور خاندانی افراد کے نام بنام حالات تعلقات واقعات بے کم و کاست بیان کئے ہیں خواہ وہ شہنشاہ بابر یا ہمایوں کے پر آشوب زمانہ سے متعلق ہوں یا شہنشاہ اکبر کے پرسکون دور سے مغلوں کے دور کی اس تاریخ (ہمایوں نامہ) کے متعلق تاریخ کے انگریزی طلبہ کو اس وقت تک علم نہ ہوا جب تک کہ ڈاکٹر ریو (Dr. Rieu) نے ہمایوں نامہ کو مدون نہ کر لیا۔ ہمایوں نامہ کے متعلق ہندوستانی مورخین کو علم تھا مگر موجودہ دور کے تاریخ کے طلبہ کو مسز بیورج (Mrs. Beveridge) کا ممنون منت ہونا چاہئے جنہوں نے اس نسخہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اصل نسخہ ہملٹن (Hamillon) کے مجموعہ میں برٹش میوزیم میں محفوظ ہے یہ نسخہ بھی مکمل نہیں ہے کیونکہ مرزا کامران کے نابینا ہونے تک کے واقعات اس میں درج ہیں۔ اصل ہمایوں نامہ میں غالباً شہنشاہ اکبر کے بائیس سالہ دور حکومت کے واقعات درج ہیں کیونکہ نسخہ پر شاہجہاں کے قلم کا یہ ایک نوٹ ہے: "اس تاریخ میں صاحب قران (تیمور) کی فاتح اولاد اور حضرت آشیانی اکبر بادشاہ کے بائیس سالہ دور حکومت کے حالات درج ہیں۔"

جس طرح ہمایوں نامہ مختصر ہے اسی طرح شہزادی گلبدن کے حالات زندگی بھی مختصر ہیں۔ گو شہزادی کی زندگی ایک پردہ نشین خاتون کی حیثیت سے از حد خاموش اور بے خرخشہ تھی لیکن اس کے باوجود وہ اپنے والد کے مصائب اور اپنے سوتیلے بھائی کی جلا وطنی کی تکالیف کے باعث ضرور متاثر تھی۔ شہزادی گلبدن ۱۵۲۳ء میں اس وقت پیدا ہوئی جب کہ شہنشاہ بابر ہندوستان پر اپنے آخری حملہ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ پانی پت کی لڑائی کے وقت گلبدن بیگم بمشکل تین سال کی تھی۔ شہزادی کی ماں دلدار بیگم بابر کی بیوی تھی لیکن ماہم بیگم ملکہ تھی۔ ماہم بیگم کے بچوں میں سوائے ہمایوں کے کوئی باقی نہ رہا تھا اس لئے شاہ بیگم نے شہزادی گلبدن اور اس کے بھائی ہندال کو اپنی اولاد کی طرح پالا پوسا یہی وجہ تھی کہ بابر بھی شہزادی کو بہت چاہتا تھا اور ہمایوں بھی اپنی سوتیلی بہن سے از حد محبت کرتا تھا۔ جب ہمایوں کی شادی حمیدہ بیگم کے ساتھ ہوئی تو گلبدن اور

[illegible] ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ اکبر بھی گلبدن
کا بے حد احترام کرنے لگا [illegible] میں شہزادی گلبدن کی ہر طرح
عزت افزائی کی جاتی تھی۔ گلبدن بیگم نے اپنا ایک واقعہ ان الفاظ میں
بیان کیا ہے جب کہ خواجہ نظام الدین برلاس شاہ بابر کے خلیفہ
ہندوستان تشریف لائے اس وقت گلبدن بیگم نظام الدین
برلاس کی بیوی کے ہمراہ آگرہ میں گئی ہوئی تھی۔ شہزادی کی
خادماؤں نے اس کو بتایا تھا کہ جب خلیفہ آئے تو شہزادی کو
تعظیم کے لئے اٹھنا چاہیے چنانچہ خلیفہ کی آمد پر شہزادی تعظیم
کے لئے اٹھی۔ ان کے بعد سلطانم خلیفہ کی بیوی پہنچی۔ شہزادی ان کی
تعظیم کے لئے بھی اٹھی لیکن نظام الدین نے شہزادی کو تعظیماً اٹھنے
سے یہ کہہ کر روک دیا کہ وہ آپ کی خادمہ ہے۔ اس واقعہ سے
پتہ چلتا ہے کہ گلبدن بیگم کی کیا عزت و توقیر کی جاتی تھی۔ نظام الدین
اور اس کی بیوی نے شہزادی کو کئی ہزار اشرفیاں اور کئی
سو گھوڑے نذر دیئے اور خاصہ پر مدعو کیا۔ ایک پر فضا اونچے
چبوترے پر خلیفہ کے لئے سرخ خیمہ جس کا حاشیہ گجراتی زربفت
کا تھا نصب تھا جس کے اطراف چھ مختلف اعلیٰ درجہ کے خیمے ایستادہ
تھے خیموں کے اطراف ایک بہت ہی خوبصورت قنات تھی۔ خاصے
کے بعد گلبدن بیگم اپنے والد بابر کے سلام کے لئے گئی۔ جس محبت
کے ساتھ بابر پیش آیا اس کی تصویر شہزادی نے ان الفاظ میں
کھینچی ہے "میرے قدمبوس ہونے کے بعد اس نے مجھے گود
میں لیکر مختلف سوالات کئے اور از حد مسرور ہوا"۔ جہاں
کہیں بھی ماہم بیگم جاتی تھیں گلبدن بیگم ہمراہ لیجاتی تھیں۔
جس وقت شہنشاہ بابر دھول پور تشریف لے گئے ماہم بیگم
بھی گئیں۔ ہمایوں بھی گلبدن سے محبت کرتا تھا۔ شہنشاہ بابر کی
مہلک بیماری سے پہلے ہمایوں دہلی میں سخت بیمار پڑا۔ شاہی خاندان
آگرہ سے دہلی گیا اس وقت گلبدن بھی ہمراہ تھی جس وقت
گلبدن بیگم بستر کے قریب پہونچی ہمایوں باوجودیکہ درد سر میں
مبتلا تھا مگر شہزادی کو دیکھ کر اس نے محبت سے اپنا ہاتھ
بڑھایا اور اسے خوش آمدید کہا۔

بابر کے انتقال کے بعد گلبدن بیگم اپنی ماں دلدار بیگم کے ہمراہ
رہنے لگی لیکن اس سے ہمایوں کی محبت میں سرمو فرق نہ آیا۔ ہمایوں
ہمیشہ گلبدن کے مکان پر جایا کرتا جہاں معصومہ سلطان بیگم
گل رنگ بیگم اور گلچہرہ بیگم سلطان کے سلام کو حاضر ہوتیں۔ شہزادی
گلبدن بیگم ہمایوں کی محبت کا ان الفاظ میں ذکر کرتی ہیں۔
"شہنشاہ بابر کے بعد ہمایوں نے مجھ پر اپنی عنایات کی اس قدر
بارش کی کہ مجھے معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ میں یتیم ہو گئی"۔ شہزادی
کی شادی خضر خواجہ خان سے ہوئی جس سے دو بچے ہوئے لڑکے
کا نام سعادت یار اور لڑکی کا نام سلیمہ خانم تھا۔ خضر خواجہ خاں
۱۵۵۵ء میں ہمایوں کے ہمراہ ہندوستان آیا۔ دو سال بعد
اکبر نے اسے لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا اس کی زندگی کا بیشتر حصہ
اکبر کی مصاحبت میں گذرا۔ شہنشاہ اکبر نے اس کو بڑا فوجی
اعزاز عطا کیا اور کچھ عرصہ تک امیر الامراء کی اہم خدمت بھی منصفانہ
طور پر انجام دی۔

مورخین نے شہنشاہ اکبر کے دور میں گلبدن بیگم کا کوئی ذکر
نہیں کیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ شہنشاہ اکبر کی [illegible]
کے زوال کے بعد محل کی خواتین کی اہمیت کم ہو گئی ہو۔ لیکن واقعہ
یہ ہے کہ شہزادی گلبدن عمر ہو چکی تھیں اسلئے وہ اپنا زیادہ
وقت اپنے خانگی امور میں صرف کرتی تھیں لیکن اس کے باوجود
اکبر کی نظروں میں اس کی عزت تھی جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ
اس نے ۱۵۸۷ء میں شہنشاہ ہمایوں کے حالات رقم کرنے کے
لئے گلبدن بیگم کو حکم دیا۔ شہزادی کے لئے اس پیرانہ سالی میں یہ
کام بہت موزوں تھا اب اس کی عمر ۶۴ سال کی تھی اور اس نے
اپنی آنکھوں سے تین شاہی دور دیکھے تھے۔ شہزادی نے اپنے کام کو
کما حقہ انجام دیا۔ ہمایوں نامہ کی تکمیل سے کئی سال پہلے گلبدن
بیگم فریضۂ حج کے لئے مشرف ہوئیں۔ سفر میں ان کے ہمراہ ایک اچھا
قافلہ تھا۔ قافلہ کے افراد میں بابر اور ہمایوں کے زمانے کی خواتین
تھیں جن کے لئے دو جہاز مخصوص تھے۔ ابوالفضل نے
اس قافلہ کی روداد یوں بیان کی ہے "یہ قافلہ اکتوبر ۱۵۷۵ء

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے حیدر آباد کی ایک جھلک

(لیڈی کرزن کی ڈائری کے دو ورق)

[illegible] بروز چہار شنبہ۔ دوپہر کے قریب ہم حیدر آباد پہنچے۔ وزیر اعظم نواب سر سالار جنگ والئی ریاست سے ملنے [illegible] آگئے اور حیدر آباد میں خود اعلیٰ حضرت نظام اپنے تمام امراء کے ساتھ موجود تھے۔ اعلیٰ حضرت [illegible] سیاہ بال اور گل مونچھیں رکھتے ہیں۔ آنکھیں سیاہ ہیں، ابھرا ابھرا نقشہ اور اداس سا چہرہ ہے۔ [illegible] سیاہ ایرانی ٹوپی اور یورپین کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان کے امراء کے کپڑے اور بھی شاندار تھے۔ ان میں سے [illegible] اور قد آور ہیں۔ نواب سالار جنگ بھی قوی ہیکل ہیں۔ ان لوگوں کے لباس یونی فارم جیسے ہیں اور اگرچہ [illegible] مشرقی نہیں، تاہم دلکش ہیں۔ اکثر سفید دستار اور سیاہ چست کوٹ پہنے، سونے کے بکلوس اور کنٹھیاں لگائے ہوئے تھے۔

مسٹر کرزن کی ریذیڈنٹ اسٹیشن پر موجود تھے اور ہم یہاں سے سوار ہو کر ان کے گھر گئے۔ سرکاری گاڑیاں گہری زرد تھیں اور اعلیٰ حضرت نظام کی بگھیاں زرد اور روپہلی ہیں۔ یہ سب چست و چالاک اور مستعد معلوم ہوتے ہیں۔ ریذیڈنسی ایک نہایت نفیس مکان میں واقع ہے۔ یہ کلکتہ کی ہماری قیام گاہ کے نمونے پر بنایا گیا ہے، لیکن چار بازوؤں کی جگہ صرف دو بازو ہیں، درمیانی ہال چھت تک چلا گیا ہے جس میں ایک گیلری اور کھمبوں پر دو منزلیں اور ایک نہایت خوبصورت کمرہ ہے۔

۲۵ نومبر پنجشنبہ۔ حضور نظام کے لئے دربار آج صبح میں منعقد ہوا۔ میں بڑے ہال کے اطراف کی گیلری میں بیٹھی جس کا حال میں نہیں بتا چکی ہوں۔ یہاں سے حضور نظام کی آمد اور اس کے بعد ہونے والے تمام مراسم اچھی طرح دکھائی دیتے تھے۔ دریچے سے جو نظارہ دکھائی دیتا تھا وہ بڑا دلکش تھا۔ ریذیڈنسی کا باغ گھر کے بالکل سامنے ہے اور اس کے احاطے میں بعض نہایت عمدہ درخت ہیں۔ آج یہ ساری جگہ سپاہیوں سے بھری ہوئی ہے۔ ایک انگریزی گارڈ ان سیڑھیوں کے سامنے کھڑا ہے جو ایک چوڑے برآمدے پر جاتی ہیں۔ یہ برآمدہ ایک کمرے کی طرح سجایا گیا ہے اور دربار ہال کے بالکل سامنے ہے۔ باغ میں عمارت تک سوارہ فوج قطار باندھے کھڑی ہے۔ حضور نظام اپنی زرد رنگ کی بگھی میں تشریف لائے جس میں چار سُرنگ گھوڑے جُتے ہوئے تھے۔ کوچ مین اور سائیس بھی زرد وردی میں تھے۔ وہ کل کی بہ نسبت آج زیادہ چست و چاق اور زیادہ مشرقی معلوم ہوتے تھے۔ سیاہ لباس، اس پر "اسٹار آف انڈیا" کا نشان اور ان کو چمکانے والی نیلی ربن —— یہ ان کا لباس تھا۔ دیکھنے میں تو دربار بڑا شاندار معلوم ہوتا تھا، لیکن جو لوگ اس میں مصروف ہوتے ہیں انہیں یہ ہمیشہ نہایت غیر دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ حضور نظام اور والسرائے دونوں ایک طرح کی ڈائس پر ایک دوسرے کے برابر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد ہتوں والی سونے کی کرسیاں دہری قطار میں باب الداخلہ سے تخت تک نیم دائرہ کی شکل میں رکھی گئی تھیں۔ دربار برخواست ہوا تو ڈ فرن حضور نظام کو پہنچانے کے لئے دروازے تک گئے، اور وہ جلوس کی صورت میں تشریف لے گئے۔ آج دوپہر میں ملاقات باز دید تھی، لیکن افسوس ہے کہ میں اس کا تماشا نہ دیکھ سکی۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک بالکل مختلف اور بہت ہی شاندار چیز تھی۔ حضور نظام کے باڈی گارڈ عرب ہیں اور ان کے ملازموں کے لباس بڑے حیرت انگیز ہیں۔

آج ہم ایک نواب صاحب کے بچوں سے اپنے گھر پر ملے ۔ میں نے ان سے زیادہ پیارے بچے کہیں نہیں دیکھے سب سے بڑی ایک آٹھ سالہ لڑکی ہے اور بس کچھ ہی دنوں میں پردے میں بٹھائی جانے والی ہے ۔ یہ سن کر وہ کہتی ہے "کاش میں منجھلی بچی ہوکر پیدا ہوئی ہوتی" بقیہ تین لڑکے ہیں ۔ یہ سب کے سب ہیرے جواہرات کے لالے اور موتیوں کے کرتے پہنے ہوئے تھے ۔ آنکھیں ان کی بڑی بڑی اور سیاہ تھیں ۔ سب کے سب بڑے ہنس مکھ اور ملنسار تھے ۔ دو سال کا بچہ بھی انگریزی کی سمجھ سکتا تھا اور دوسرے تو اچھی طرح اس میں گفتگو کرتے تھے ۔ یہ چھوٹے بچے میری گھڑی کو کھول کھول کر خوش ہوتے تھے ، اور میرا خیال ہے کہ میں ان سے دوستی کرنے میں کامیاب رہی ۔ وہ کل مجھے اپنا پہلا انگریزی خط لکھنے والی ہے ۔ ان بچوں کی نگران بلغاسٹ کی رہنے والی ہے اور ڈفرن نے ایک مرتبہ اس کے باپ سے کچھ سلوک کیا تھا ۔ اس عورت کو اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ اس کے شاگرد اپنے آپ کو اتنی اچھی طرح پیش کر سکے ۔ میں ان کی ماں سے ملنے کا ارادہ کر رہی ہوں ۔ اس کے بعد میں اور بہت سے لوگوں سے ملی ۔ ایک پارسی خاتون جنہوں نے میرا ایک کام کر دیا تھا ۔ سیول سرجن اور دو لیڈی ڈاکٹر ۔ ان میں سے ایک مسز کاکی تھی ۔ دوسری مسز وائٹ حضور نظام کی ملازم ہیں اور کئی برسوں سے اپنی خدمات حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے رہی ہیں ۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ بہت نیک نام اور بہت ہر دل عزیز ہیں ۔

دوپہر ڈھلے اسپورٹس تھے ۔ لیکن اتنی جلدی اندھیرا ہو گیا کہ ہم اپنا پروگرام ختم نہ کر سکے ۔ "ٹینٹ پگنگ" کے علاوہ رسہ کشی بھی تھی —— ایک ہاتھی اور اس کے مقابلے میں ستر آدمی ۔ میرا خیال ہے کہ ہاتھی جیت جاتا لیکن رسی ٹوٹ گئی ۔ چونکہ یہ دیو اس قسم کے کھیل میں حصہ لینے پر مجبور کرنے سے خفا سا ہو گیا تھا ، اس لئے یہ تجربہ دہرایا نہیں گیا ۔ ہم نے ہاتھیوں کی دوڑ بھی دیکھی ۔ یہ بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی ۔ یہ بڑے بڑے جانور بہت تیزی سے لڑھک رہے تھے ، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں ایک دوسرے سے مسابقت کی کوئی خواہش نہ تھی ۔ اس کے بعد اونٹوں کی دوڑ ہوئی ۔ دوڑ کے دوران میں ایک دفعہ اونٹوں کو لٹا دیا گیا ۔ ان کے سواروں نے ان پر لدی ہوئی بندوقوں کو کوہانوں پر رکھ کر تین باڑیں ماریں ، پھر سوار ہو کر چل پڑے ۔ حضور نظام نے خود ایک انعام پایا ۔ وہ تنہا شخص تھے جنہوں نے گھوڑا دوڑاتے ہوئے اپنے بھالے کی نوک سے زمین پر رکھی ہوئی ایک انگوٹھی کو اٹھانے میں کامیابی حاصل کی ۔ یہ اسپورٹس گھوڑ دوڑ کے میدان میں ہو رہے تھے ۔ بازار سے نکلتے ہی آپ ایک کھلے حصے پر پہنچ جاتے ہیں جس میں سبز گھاس کا فرش بچھا ہوا ہے ۔ یہ میدان بڑا ہی خوبصورت ہے ۔ اس کے بیچوں بیچ ایک نفیس اسٹانڈ بنا ہوا ہے ۔ تماشائیوں کا ایک بے پناہ ہجوم باڑ کے دونوں طرف جمع تھا ، جو خود بھی بڑا دلچسپ تھا ۔

شام میں حضور نظام نے ہمیں واقعتاً نہایت شاندار ڈنر پر مدعو کیا ۔ ہم ایک کھلی گاڑی میں سوار ہو کر روشنی کا تماشا دیکھنے نکلے ۔ سارا شہر چراغاں ہو رہا تھا اور جہاں ہماری دعوت تھی اس مقام پر خوب ہی روشنی تھی ۔ سڑکوں پر لنتر ہانڈیوں میں روشنی کا سامان کیا گیا تھا ۔ چاروں طرف اور نیچے اوپر ہزاروں آدمی تماشا دیکھنے جمع تھے ۔ کمانیں بڑی زبردست تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اصلی عمارتوں میں روشنی کی گئی ہے ۔ سڑکوں پر دو طرفہ فوج کا پہرہ تھا اور رہ رہ کر "گاڈ سیو دی کوئین" کا راگ بجایا جاتا تھا ، یہاں تک کہ ہم محل تک پہنچ گئے ۔

یہ اطالوی طرز کی ایک نہایت نفیس عمارت ہے جس کے اطراف دو بڑے بڑے قطعات پر باغ ہیں ۔

[illegible] روشنی کی گئی تھی۔ عمارت کے اوپر بھی روشنی تھی، اور گلاب کے تختے بھی منور تھے۔ ہمارا استقبال محل کے [illegible] کیا گیا جو دو قطعات کے درمیان واقع ہے۔ ہم چہل قدمی کرتے ہوئے دوسرے باغ میں سے ہو کر کمرہ [illegible]۔ ایک ایوان میں جو ایک ہزار فیٹ سے بھی زیادہ ہوگا، دو سو مہمان ڈنر پر بیٹھے۔ درمیان میں [illegible] میں دونوں سرے نہ دیکھ سکی۔ میز سونے کی رکابیوں سے ڈھکا ہوا تھا جن میں پھول رکھے تھے۔ [illegible] باغ کی طرف دیکھتے رہے۔ انتظام نہایت عمدہ تھا اور میرا خیال ہے کہ ڈنر ڈیڑھ گھنٹے [illegible] جاری نہیں رہا۔ حضور نظام میرے اور ڈفرن کے درمیان بیٹھے تھے۔ وائسرائے نے ان کا جام صحت ایک نہایت عمدہ تقریر اور ایک بلند آواز میں تجویز کیا۔ حضور نظام نے جواب میں فرمایا "میں لارڈ اور لیڈی ڈفرن کا جام صحت تجویز کرتا ہوں"۔ اس کے بعد ہم باغ میں آتش بازی کا تماشا دیکھتے ہوئے ایک گھنٹے تک مصروف رہے۔ ہمارے مقابل پانی میں ڈفرن کا، میرا اور حضور نظام کا عکس نظر آرہا تھا۔ دونوں مرد ہاتھ ملا رہے تھے۔ اور میں تھا میں کی طرح سبز لباس میں ملبوس کھڑی تھی۔ تھوڑے سے فاصلے سے یہ نہایت دلکش معلوم ہوتا تھا۔ [illegible] نہیں کہ میں تمہیں آتش بازی کی ساری تفصیلات بتا بھی سکوں گی۔ کیونکہ یہ ایک دوسرے سے بہت [illegible]۔ ان میں آواز نہیں ہوتی، یہ نیچے سے اوپر اٹھتے ہیں، اوپر جاکر پھلجھڑی سی چھوڑتے ہیں اور آخر میں بہت بڑے "خوش آمدید" پر ختم ہوتے ہیں جو آسمان پر لکھا نظر آتا ہے۔

جمعہ ۲۶ — بارہ بجے تک وائسرائے کو کام تھا۔ میں نے برار کے ایک وفد سے ملاقات کی جو میرے فنڈ کے سلسلے میں آیا تھا۔ پھر ان چھے طلبہ کو دیکھنے کے لئے گئی جو طبی کام کے لئے تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ پھر ہم باہر نکلے۔ سکندرآباد اور بلارم سے ہوتے ہوئے کوئی گیارہ میل گئے ہوں گے۔ سکندرآباد میں ایک ایڈریس دیا گیا۔ ہال کی سیڑھیوں پر ناچنے والی لڑکیاں ہاتھ میں جلتی شمع لئے گاتی کھڑی تھیں۔ یہ ایک قدیم اور مذہبی رواج ہے۔ ان کے بعد ایک مقامی مدرسے کی لڑکیاں اور ایک فوجی یتیم خانے کے بچے تھے۔ ایڈریس کے ساتھ ایک پلیٹ بھی پیش کی گئی اور اس کا خوبصورت ڈبہ ایک چاندی کی کشتی میں پیش ہوا۔ واپسی میں ہم ایک بڑے تالاب کے بند پر سے حیدرآباد کنٹیجنٹ کے مس ہاؤز پہنچے تک ہم کئی عمدہ بارکوں کے سامنے سے گزرے۔ کرنل بل یہاں کے کمانڈنگ افسر ہیں۔ عہدہ داروں نے اپنے ناچ کے خوبصورت کمرے میں ہمیں ایک نہایت عمدہ لنچ دیا۔ ڈفرن نے کنٹیجنٹ کا جام صحت تجویز کیا اور ہم دوسری مصروفیات کے انجام دینے کے لئے روانہ ہو گئے۔ سالار جنگ نے ہمیں تالاب میر عالم پر چائے پر مدعو کیا تھا اور آفتاب غروب ہونے سے پہلے ہمیں گھوڑے دوڑاتے پندرہ میل جانا تھا۔ بالآخر یہاں پہنچنے کے بعد ایک گھنٹہ نہایت پرلطف طریقے پر گزرا۔ تالاب مصنوعی ہے اور ایک بند کے ذریعے پانی کو روکا گیا ہے جو عام اصولوں پر نہیں بنایا گیا ہے۔ یہ ایک طویل ریلوے پل سے مشابہ ہے۔ کمانیں تالاب کی سمت میں اندر کی طرف مڑی ہوئی ہیں اور ان کا پشتہ میدان کی طرف ہے۔ یہ بند تالاب کا نہایت حسین کنارہ معلوم ہوتا ہے۔ اس پشتے سے اپنی نظر میں ہٹالو تو یقین نہیں آتا کہ یہ تالاب مصنوعی ہے کیونکہ یہ اتنا حسین ہے۔ ارضیاتی مرکبات کے یہاں عجیب عجیب تماشے نظر آتے ہیں۔ حیدرآباد کے چاروں طرف پتھر اور چٹانوں کے ڈھیر کے ڈھیر کچھ عجیب طرح بکھرے پڑے ہیں۔ جیسے کسی دیو نے انہیں برسایا ہو، یا جیسے زمین اتنی بہہ گئی ہو کہ آخر میں صرف پتھر ہی پتھر

رہ جاتی ہیں۔ اس تالاب میں ایسی بہت سی پہاڑیاں ہیں جن پر جھاڑیاں اور گھاس اگی ہوئی ہے۔ یہ نہایت ہی خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑی پہاڑی پر ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی ہے۔ ہم ایک چھوٹے سے اسٹیمر پر گئے جہاں حضور نظام بھی ہم سے آملے۔ تالاب کا ایک چکر لگایا اور غروب آفتاب کا منظر دیکھا جس سے ہم بہت ہی محظوظ ہوئے۔

گھر پہنچنے کے لئے ہمیں ڈنر کے لئے بس کپڑے ہی بدلنے کی مہلت مل سکی۔ ہم شہر میں سے ہو کر گزرے جسے پھر چراغاں کیا گیا تھا۔ مسٹر گورباری نے اپنے نفیس کمرے میں ناچ کا انتظام کیا تھا جس میں حضور نظام اور ان کے بہت سے امرا موجود تھے۔ اعلیٰ حضرت نے وقت کا زیادہ حصہ گیلری میں بیٹھے ناچ دیکھتے ہوئے گزارا۔ ڈفرن بہت جلد غائب ہو گئے، لیکن میں سپر کے بعد بھی موجود رہی۔

شنبہ ۲۷ر۔ صبح میں سارے مرد بھالوں سے چیتے کا شکار کرنے گئے تھے اور دو کا شکار کر لائے۔ غریب جانور کو پنجروں سے چھوڑتے ہیں اور شکاری بھالے لئے گھوڑوں پر سوار ہو کر ان کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ لارڈ ولیم نے ایک چیتے کا شکار کیا، وہ اور ان کا گھوڑا لوٹ پوٹ ہو گئے لیکن خیر ہوئی کہ چیتے کو صرف فرار کی فکر تھی۔ اگر قریب آکر ان کی یہ ہیئت کذائی دیکھتا تو مزا آجاتا۔ میرے حکم سے وائسرائے کو ایک ہاتھی پر نہایت حفاظت کے ساتھ سوار کر دیا گیا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ شکار کا تماشا اچھی طرح نہ دیکھ سکے ہوں گے، تاہم وہ صحیح سلامت گھر واپس آئے جس کے لئے میں اتنی فکر مند تھی۔

آج وہ بہت معروف تھے اور حیدرآباد کے تمام معاملات نبٹ لینا چاہتے ہیں۔ ریذیڈنٹ، وزیر خارجہ حضور نظام اور سالار جنگ سے طویل ملاقاتیں رہیں۔ ان کے نتائج سے وہ بہت خوش تھے لیکن چونکہ کوئی پبلک بیان اس موضوع پر نہیں دیا گیا ہے اس لئے میں تمہیں کوئی بات نہیں بتاؤں گی۔

صبح میں میں دواخانہ دیکھنے گئی اور لنچ کے بعد ان حیدرآبادی نواب صاحب کی بیوی سے ملی جن کے بچوں کے بارے میں میں نے کل تمہیں بتایا تھا۔ وہ اپنے دیوان خانے میں تھیں، خود ان کے اندرونی گھر میں نہیں۔ نواب صاحب ہماری ملاقات کے وقت موجود تھے۔ اسی طرح وہ سارا زندہ دل کنبہ بھی موجود تھا۔ وہ ایک حسین بی بی ہیں۔ آنکھیں بڑی بڑی اداس اداس سی۔ سرخ اور سنہری رنگ کی ساڑی میں وہ لپٹی ہوئی تھیں۔ ہاتھوں اور سر پر ہیرے اتنے تھے جیسے لاد دیا گیا ہو۔ وہ تھوڑی بہت انگریزی سمجھتی ہیں اور کچھ الفاظ کہنے کی کوشش بھی کی۔

اس کے بعد دوپہر میں ڈفرن اور میں ایک اور صاحب کے مکان پر گئے جو حیدرآباد کے بہت بڑے امرا میں شمار ہوتے ہیں۔ حضور نظام یہاں بھی آئے تھے۔ یہاں ہم نے چائے پی اور "امیزان گارڈ" کو دیکھا جو بوری مدد دی ہیں جس عورتوں پر مشتمل تھا۔ پھر کچھ آدمی ہمارے آگے چلنے لگے۔ سوار اور گھوڑے دونوں بہت بے آرام اور بے کل نظر آتے تھے۔

ہمارا دن ریذیڈنسی میں ایک دعوت کے ساتھ ختم ہوا۔ حضور نظام کو پھر میرے اور وائسرائے کے درمیان جگہ دی گئی۔ میرے دوسرے بازو پر سر میزی پینڈر گھاسٹ تھے۔

دس بجے کے قریب ہم اسٹیشن پہنچے اور رات اپنی ریل کے ڈبوں میں گزاری۔ اس کے بعد ہمیں پورے دو دن ریل میں گزارنے ہیں، صبح چار بجے سے لے کر ۹ بجے رات تک اور ہم دوشنبہ ۳۰ر کی دوپہر میں میسور پہنچ جائیں گے۔

سید مبارز الدین رفعت

سوال و جواب

اس شمارے سے ہم نے یہ تہیہ کیا ہے کہ سوال و جواب کا ایک مستقل سلسلہ سب رس میں شروع کیا جائے۔ اس عنوان کے تحت ہمارے خریداروں کے ایسے سوالات کا حتی الوسع جواب دیا جائے گا جو ادبی یا علمی یا تاریخی قسم کے ہوں یا ان سے عام معلومات میں اضافہ ہونے کا قرینہ ہو۔ مجلس ادارت سب رس کے مطالعہ کرنے والوں سے ان کے سوالات کو خوشی قبول کرنے اور ان کے جواب دینے کے لئے تیار رہے گی۔

عنقا

سوال: بعض کتابوں میں اکثر عنقا کا ذکر آتا ہے، کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ یہ کون جانور ہے؟ در اصل اس کی کوئی اصلیت ہے یا محض خیالی وجود رکھتا ہے؟ عبدالستار

جواب: عنقا ایک ایسا خیالی پرندہ ہے جس کے وجود پر قدیم زمانے کے لوگ نہ صرف یقین رکھتے تھے بلکہ کئی سیاحوں اور مورخوں نے اس کے دیکھنے کا دعویٰ بھی کیا تھا، عنقا کو یونانی زبان میں (PHOENIX) کہتے ہیں یعنی "ارغوانی رنگ والا جانور" گو بعض وقت اس لفظ سے "پام کا درخت" بھی مراد لی جاتی ہے۔

متعدد قوم کے بعض تحریروں میں اس جانور کا تذکرہ ملتا ہے مثلاً زمانہ قدیم میں ہیروڈوٹس HERODOTUS اور اس کے بعد کے بہت سے مورخوں نے اس کا ذکر کیا ہے، ان لوگوں کے لحاظ سے قدیم مصریوں میں اس جانور سے متعلق طرح طرح کی روایتیں مشہور تھیں، مثلاً ان کے نزدیک عنقا ایک ایسا جانور تھا جس کا نچلا دھڑ عقاب جیسا اور اوپری حصہ پرند کا ہوتا تھا، یہ تمام دنیا کے جانوروں میں یکتا خیال کیا جاتا تھا، نہایت مقدس بھی سمجھا جاتا تھا، اس لئے کہ مصری تناسخ پر یقین رکھتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد روح عنقا کا روپ اختیار کرلیتی ہے۔ چنانچہ اسی لئے وہ اپنے بادشاہوں کی قبروں میں اس پرند کے لئے غذا اور خوشبودار اشیا رکھ چھوڑتے تھے۔

بعض عنقا کو خوبصورت ارغوانی رنگ کا ایک ایسا پرند سمجھتے تھے جس کا قد عقاب کے برابر ہوتا تھا اور گردن سنہری رنگ کے پروں سے مزین ہوتی تھی، اس کے علاوہ اس کے سر پر پروں کا ایک تاج ہوتا اور آنکھیں اس قدر روشن ہوتیں کہ ان پر ستاروں کا گمان ہوتا تھا۔

اس پرند کی پیدائش کے متعلق بھی طرح طرح کی باتیں بیان کی جاتی تھیں مثلاً یہ کہ جب عنقا (۵۰۰ تا ۶۰۰) سال زندہ رہنے کے بعد ضعیفی کے آثار محسوس کرنے لگتا (بعض مصنفین نے اس کی عمر ۱۲ سے ۱۳ سو سال تک بھی بیان کی ہے) تو جنگل سے خوشبودار لکڑیاں جمع کر لاتا تھا اور پھر ان کے ڈھیر کو آگ لگا کر خود اس پر بیٹھ جاتا تھا۔

بعد میں اس خاک سے ایک اور عنقا کیڑے یا پوند کی شکل میں نمودار ہوتا تھا، اور جب یہ نوزائیدہ پرند اڑنے کے قابل ہو جاتا تو اپنے باپ کے ڈھانچے کو چونچ میں لے کر مصر کے شہر ہیلو پولیس (HELIPOLIS) کی جانب پرواز کرتا، اس شہر میں سورج کے دیوتا کا مندر تھا اور یہاں ہمیشہ آگ سلگتی رہتی تھی، چنانچہ وہ اس ڈھانچے کو اس مقدس آگ میں جلنے کے لئے ڈال دیتا تھا۔

بعض لوگوں کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ عنقا ہر پانچ یا دس سال میں ایک مرتبہ عربستان سے ہیلو پولس کی جانب اڑ کر آتا ہے، چنانچہ پلائنی نے ایسے بعض شواہد کا ذکر کیا ہے جو اس کی رائے میں معتبر تھے۔ ایک مصری ماہر کہتا ہے کہ شہر (HELIPOLIS) میں سارس یا کلنگ کی قسم کا ایک پرند جس کا نام بنو یا بینو تھا، آفتاب کی پرستش کے ساتھ پوجا جاتا تھا اور بنو بینو ہی پام کے درخت کو بھی کہتے ہیں اس لئے ان کا خیال ہے کہ غالباً یہی پرند مصریوں کا "عنقا" ہوگا لیکن قدیم مصریوں کی روایتوں میں عنقا کو عرب، شام، ہندوستان یا حبش کا باشندہ کہا گیا ہے، نیز بینو کی جو تصاویر قدیم مصری

ستادیں موجود ہیں۔ ان سے عنقا کا سراپا بھی نہایت مختلف ہے۔

بعض محققین کا یہ بھی خیال ہے کہ عنقا مشتری ستارے کا نام ہے جو صبح کا ستارہ ہونے کی حیثیت سے آفتاب کا رہبر سمجھا جاتا تھا۔

عربوں میں عنقا کے متعلق کئی افواہیں مشہور تھیں، بعض اس کو پرند بعض حشرات کی قسم کا جانور سمجھتے تھے، نیز یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ اسبسطوس عنقا کے پروں سے تیار کیا جاتا ہے اس لئے کہ اس پر آگ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

عبداللہ یافعی نے مرآۃ الخیال سے نقل کیا ہے کہ جوار اصحاب الرس میں ایک میل اونچا پہاڑ تھا، جس میں ہر زمانہ طرح کے طیور رہا کرتے تھے، ایک دفعہ کسی برس میں ایک پرند بزرگ خلقت، طویل العنق، جس کا منہ آدمیوں کا سا اور اعضاء میں ہر ایک جانور کی مشابہت پائی جاتی تھی، اس پہاڑ پر آ نکلا، اول اول ان جانوروں کو ستانا اور ہلاک کرنا شروع کیا، پھر وہاں کے آدمیوں کے بچوں پر چوٹ کرنے اور پکڑ پکڑ کر کھانے لگا، ساکنان اصحاب الرس اس پرند کو عنقائے مغرب کہا کرتے تھے، جب اس جانور نے حد سے زیادہ ستانے پر کمر باندھی تو سب جمع ہو کر اپنے پیغمبر حنظلہ بن صفوان علیہ الرحمۃ والرضوان کے پاس گئے، وہ ان کی دعا کے سبب اس آفت سے نجات پائی، کہتے ہیں جب سے یہ جانور کسی جزیرہ میں چلا گیا ہے۔

غالباً ایرانیوں کا قیاسی پرند سی مرغ، الف لیلیٰ اور مارکوپولو کے تذکروں کے سب پرندے بھی عنقا کی خصوصیت کے حامل تھے۔

بہر حال بعد میں رفتہ رفتہ دنیا کو یہ معلوم ہو گیا کہ عنقا کا وجود محض فرضی ہے، اس لئے کہ اکثر نایاب، ناپید یا قیاسی اشیاء کو عنقا کہنے لگے، چنانچہ اردو کا محاورہ "عنقا ہونا" فارسی کے "عنقا شدن" کا لفظی ترجمہ ہے مثلاً ؎

سایہ کو پتہ نہ تھا شجر کا   عنقا تھا نام جانور کا   (مثنوی گلزار نسیم)

چاند

سوال ۔ کیا چاند میں آبادی ہے؟ اور اگر آبادی ہے تو کس قسم کے لوگ یہاں بستے ہیں؟   پریم ناتھ

جواب ۔ اگر زندگی سے ہماری مراد وہ حیات ہے جس کے مختلف مظاہر ہم ہماری دنیا میں دیکھنے کے عادی ہیں تو چاند پر اس قسم کی کسی شے کے وجود کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ چاند میں "ہوا اور پانی" کا فقدان ہے اور ہم کو معلوم ہے کہ ہوا یا فضائی گیس اور پانی زندگی کے لوازم ہیں۔ آج سے تین چار سو سال قبل تک بھی لوگ یہ سمجھتے رہے کہ چاند میں زندگی کے آثار ہوں گے، چنانچہ جرمنی کا مشہور سائنس داں کیپلر چاند میں نظر آنے والے آتش فشاں پہاڑوں کے متعلق غلطی سے یہ قیاس کرتا رہا کہ وہ چاند میں بسنے والے انسانوں کی بنائی ہوئی حصاریں ہوں گی، لیکن بہت زمانہ بعد معلوم ہوا کہ یہ مردہ آتش فشاں پہاڑوں کے دہانے ہیں۔

ہوا اور پانی کی عدم موجودگی کے علاوہ چاند کا ایک حصہ چونکہ آفتاب کی تیز شعاعوں کی زد میں آتا ہے اور دوسرا اس سے پرے رہتا ہے اس لئے ہوا نہ ہونے کی وجہ سے یہاں اس قدر سخت گرمی اور سردی پڑتی ہوگی کہ چاند میں کسی قسم کی حیات کے وجود کا قیاس ہی نہیں کیا جا سکتا۔ بعض ماہرین اب تک یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں کی بعض گہری وادیوں میں اب بھی کچھ نہ کچھ فضائی گیسیں باقی ہوں گی جن کی وجہ سے ممکن ہے ان مقامات پر ادنیٰ قسم کے بعض نباتات پیدا ہوتے ہوں گے۔

لیکن اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ چاند ایک ایسی "دنیا" ہے جس میں جانور تو جانور پودوں کا بھی وجود نہیں البتہ اس "زمین" پر اونچے اونچے پہاڑوں کے ایسے سلسلے میلوں تک چلے گئے ہیں، جن کے ساتھ گہری تاریک وادیاں ہیں ان پہاڑی علاقوں کو ہم دوربین کی مدد سے اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔

م ۔ ر ۔ س

EGYPTIAN MYTH & LEGEND DA'MECKENZIE

۱ دیکھئے صفحہ (۱۸۸)

۲ دیکھئے فرہنگ آصفیہ جلد دوم صفحہ (۲۹۰)

تنقید و تبصرہ

[illegible] | مترجم محمود احمد خاں ایم اے دہلوی
ضخامت ۹۵ صفحے۔ قیمت ۸؍ ناشر خاتون
کتاب گھر اردو بازار دہلی

[illegible] محمود احمد خاں صاحب نے ترجمہ کیا ہے
جنگ [illegible] کے ایک ناولٹ کا۔ اور اس کا مقدمہ جناب
صادق الخیری نے لکھا ہے جو خود ایک بہت اچھے اور کافی
پرانے مترجم ہیں۔ کہانی کا پس منظر مصر ہے۔ جس کی سرزمین
پر اہرام [illegible] کی جنم بھوم ہے۔ قصہ کافی دلچسپ ہے
اور [illegible] "بھوک" کیسے تضادوں کو پامال کرتی ہے۔
[illegible] ہے اور احساسات کو مجرم بناتی ہے۔ اور
قسمت کیسے عجیب و غریب کھیل انسانی کھلونے سے
کھیلا کرتی ہے۔ یہ المیہ کہانی انہی حقائق کو بے نقاب
کرتی ہے۔

دل کے آنسو | رئیس احمد جعفری
ضخامت ۹۶ صفحے قیمت ۱۲؍ ناشر۔ مکتبہ
سلطانی بھنڈی بازار بمبئی ۳۔ ٹائٹل کے لحاظ سے
موزوں خوبصورت گرد پوش۔

رئیس احمد جعفری نے چھے مختصر افسانے لکھے ہیں۔
پلاٹ تقریباً ہر افسانے کا اچھا ہے اور دلچسپ بھی۔ لیکن
جعفری صاحب افسانے کا خاتمہ ناقص طور پر کرتے ہیں۔
جس سے افسانے کی خوبی باقی نہیں رہتی۔ ابتدا اور
عروج کافی اچھے ہوں لیکن اختتام [illegible]
کیا جائے تو افسانے کا اثر مٹ جاتا ہے۔ اس کے لئے
ابھی مشق کی ضرورت ہے۔ ویسے یہ افسانے عام پڑھنے
والوں کے لئے دلچسپ ثابت ہوں گے۔

بیل بوٹے | از مظفر حسین شمیم
ضخامت ۱۴۴ صفحے۔ قیمت عا؍ ناشر
مکتبہ سلطانی بھنڈی بازار بمبئی ۳۔ رنگین گرد پوش۔
زیر نظر مجموعہ بیل بوٹے شمیم صاحب کے لکھے ہوئے
مختلف مضامین، افسانے، تبصرہ اور مقالوں کا مجموعہ
ہے۔ مختلف عنوانات پر مختلف چیزیں موصوف نے لکھی ہیں
اختصار کا بہت زیادہ لحاظ رکھا ہے۔ ان میں سے
تقریباً سب مضامین ہندوستان کے عام پرچوں رسالوں
میں شائع ہو چکے ہیں۔

لیکن اس قسم کے مجموعے کی اشاعت نہ اردو ادب
کے لئے نفع بخش ہے نہ اردو داں طبقے پر کوئی احسان
آج کل ادیب بننا اور چند کتابوں کا مصنف بن جانا
نہایت آسان سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ادب کی خدمت کا
صحیح طریقہ بہت کم ادیب جانتے ہیں۔ اور ذمہ داری
کا احساس تو بہت ہی کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ ہمیں امید
ہے کہ آئندہ شمیم صاحب واقعی کوئی اچھی چیز پیش
کرنے کی کوشش کریں گے

شمس بازغہ | آنسہ محمودہ رضویہ صاحبہ مدیرہ مجلہ [illegible]
ضخامت ۹۷ صفحے۔ قیمت ۸؍ مقام اشاعت
انجمن ترقی اردو کراچی سندھ۔

محترمہ محمودہ رضویہ نے کئی ایک کتابیں لکھی ہیں۔
جن میں سے ایک شمس بازغہ بھی ہے۔ آنحضرت صلعم
کے مختلف واقعات زندگی محترمہ نے اپنے مخصوص طرز
میں بیان کئے ہیں۔ باوجود کئی ایک کتابیں لکھنے کے
ان کی ادبی ترقی کی رفتار پسندیدہ ہے۔ اچھا ہوتا اگر وہ
افسانوی کتابیں لکھنے کی بجائے علمی اور تاریخی لکھتیں۔

گاؤں سدھار کے گیت | ماسٹر محمد شفیع الدین نیر
ضخامت ۱۰۰ صفحے قیمت [illegible]
ناشر۔ آزاد بک ڈپو کوچہ چیلاں۔ دہلی۔

نیر صاحب بچوں کے شاعر ہونے کی حیثیت سے
محتاج تعارف نہیں یہ گیت بھی ان کی نظموں کی طرح
عام فہم اور ستھرے ہیں۔ لیکن بچوں کی بجائے ان کے
مخاطب گاؤں کے باسی "دیہاتی بھائی" ہیں۔ دیہات
کے متعلق تو بہت کچھ لکھا جا چکا۔ لیکن دیہاتیوں کے لئے

یہ اپنے رنگ کی پہلی اور کامیاب کوشش ہے۔ دیہات سدھار کا یہ مجموعہ، معلومات آفریں اور دلچسپ طریقہ یقیناً فائدہ مند ثابت ہوگا۔

شمع فروزاں

مترجمہ صادق الخیری ایم اے۔ حجم ۱۰۰ صفحے قیمت ۱۲؍ مقام اشاعت خاتون کتاب گھر۔ دہلی۔

امریکہ کی نوبل پرائز یافتہ خاتون مسز پرل بک کے ایک انگریزی ناول کا ترجمہ لائق مترجم صادق الخیری صاحب ایم اے نے کیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ ترجمہ کا پورا پورا حق ادا کیا ہے "شمع فروزاں" ایک قدامت پرست چینی گھرانے کی تصویر ہے جسے ایک انگریزی تہذیب سے متاثر لڑکے نے اجاڑ دیا۔ یہ ایک فرض شناس ماں، خدمت گزار بہو، وفادار بیوی اور غیور و کم سخن عورت کی کہانی ہے۔ جس نے بہار کے انتظار میں سات سال تک آرزوؤں، امیدوں کے چمنستان کی آبیاری کی۔ لیکن خزاں کے ایک ہی جھونکے نے جسے پامال کردیا اور جب تمنائیں مردہ، آرزوئیں بے کام ثابت ہوئیں تو اس نے موت کے دامن میں پناہ لی۔

زبان شستہ و پاکیزہ ہے۔ داستان الم انگیز بھی ہے اور دلچسپ بھی چینی زندگی کو جیتا جاگتا دکھایا گیا ہے۔ اس قسم کے اعلیٰ ادبی ترجمے ہمارے ادب کے لئے بے حد مفید ثابت ہوں گے۔

اچھی لڑکی

مصنفہ راحت النساء بیگم انصاریہ معلمہ مدرسہ صنعت و حرفت نسواں سرکار عالی۔

حجم ۹۶ صفحے قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ۔ اندرون دریچہ ماتا۔ حماذی مسجد اثناء عشری مکان میر تراب علی صاحب مدرس نمبری (۵ ۲۳ ۷)

محترمہ راحت النساء بیگم صاحبہ نے لڑکیوں کے پڑھنے کے قابل ایک بڑی اچھی کتاب لکھی ہے۔ اس میں ایک سلیقہ مند اور ایک پھوہڑ لڑکی کا بہت اچھی طرح مقابلہ کیا ہے اور جتایا ہے کہ لڑکیوں کو اچھی تعلیم اور صحیح تربیت کی کتنی شدید ضرورت ہے۔ تاکہ آئندہ زندگی میں وہ اچھی بیوی، اچھی بہو اور اچھی ماں ثابت ہو۔ نیک سلیقہ مند اور تعلیم یافتہ لڑکیاں خود بھی آرام پاتی ہیں اور دوسروں کو بھی آرام دیتی ہیں۔ زبان سلیس اور عام فہم ہے اور کہانی کی دلچسپی شروع سے آخر تک برابر قائم رہتی ہے۔ کم عمر لڑکیوں کو ضرور یہ کتاب پڑھنی چاہئے تاکہ وہ خود اس سے سبق لے سکیں۔ موصوفہ اگر آئندہ بھی بچیوں کے لئے ایسی کتابیں لکھیں تو اچھا ہو۔ کتاب کی ظاہری شکل و صورت بھی سیرت جتنی اچھی نہیں۔ اگر گردپوش اچھا بنایا جاتا تو پھر کتاب ہر طرح دلکش ہوتی۔

۱۹۴۳ء کے بہترین افسانے

مرتبہ۔ عبادت بریلوی حجم ... صفحے قیمت عہ

ناشر۔ حلقۂ ارباب دانش۔ کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

عبادت بریلوی ایم اے۔ سکریٹری حلقۂ ارباب دانش لکھنؤ نے اردو ادب کے چوٹی کے لکھنے والوں کے افسانوں کو یک جا کیا ہے۔ اس سے پہلے ہر سال بہترین نظمیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ لیکن افسانوں کا یہ مجموعہ اپنی نوعیت کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے بہترین افسانے اور پسندیدہ افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن نئے ادب کی رفتار کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ ۱۹۴۳ء میں افسانوی ارتقاء کی یہ مکمل تاریخ ہے۔ آئندہ اگر ہر سال کے افسانے یونہی شائع ہوتے رہیں۔ تو بہتر سے بہتر افسانوی ادب کی تدوین آسانی سے ہوتی رہے گی۔

افسانوں کا انتخاب تین ادیبوں نے کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے معیاری افسانوں کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن عوام خود مطالعہ کے بعد معلوم کرسکتے ہیں کہ واقعی یہ کہاں تک ۱۹۴۳ء کے بہترین افسانے ہیں۔

نتیجہ امتحان اردو دانی (دوم) بابتہ ۱۹۴۴ء

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] (ذات اعلیٰ)
[illegible] [illegible]
(ذات) دوم
[illegible] [illegible] (دوم) اسلام

مدرسہ جملہ فوج

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
۱۔ عبدالرسول خاں
۶۔ [illegible] نظام الدین
۳۳۔ فضل خاں
۴۵۔ حق نواز خاں
۸۰۔ سید عبدالحسین شاہ قادری
۱۰۴۔ محمد حسین احمد
۵۵۔ محبوب علی
۲۲۵۔ عبدالحمید
۲۲۹۔ میاں احمد
۲۴۳۔ غلام رسول خاں
۲۵۱۔ نظام علی خاں
(کامیاب)
۱۔ [illegible] علی
۲۔ علیم اللہ خاں
۳۔ محمد یوسف
۴۔ سید شوکت علی
۵۔ سید محمد علی

۹۔ میر مہر علی
۱۰۔ سید خلیل الدین
۱۱۔ محمود خاں
۱۴۔ ملک اعظم علی خاں
۱۵۔ شیخ حلمین
۱۶۔ ممتاز محمد خاں
۱۷۔ مرزا محبوب بیگ
۱۸۔ رحیم الدین خاں
۲۰۔ امیر علی
۲۱۔ محمد علی خاں
۲۲۔ میر قادر علی خاں
۲۳۔ میر اللہ خاں
۲۴۔ خواجہ علی
۲۵۔ شیخ احمد اول
۲۸۔ محمد قمر الدین
۳۱۔ رحمن خاں
۳۴۔ محمد حسین
۳۵۔ امانت اللہ خاں
۳۹۔ بٹر فیلڈ
۴۰۔ شیو پرشاد
۴۱۔ محمد یوسف
۴۲۔ رامیشور پرشاد
۴۳۔ راج علی سنگھ
۴۶۔ سید مرتضیٰ حسین
۴۷۔ وینا دم
۴۸۔ محمد حسین
۴۹۔ بشیر علی
۵۱۔ کشتیا

۵۲۔ محمود خاں
۵۴۔ محمد ابراہیم
۵۵۔ عبدالمجید خاں
۵۶۔ عبدالغفور
۵۷۔ احمد بن سالم
۵۸۔ محمد حفیظ
۶۴۔ عبدالرحمن خاں
۶۵۔ شیخ علی
۶۶۔ عبدالحمید
۶۷۔ نصیر خاں
۶۸۔ سعید بن علی
۶۹۔ محمد عباس
۷۱۔ لچھمی نارائن
۷۲۔ سید تاج الدین
۷۳۔ محمد شفیع الدین
۷۶۔ محبوب علی خاں
۷۷۔ نعمت خاں
۷۸۔ شیخ عبدالقادر
۷۹۔ عبدالسلیم
۸۲۔ محمد سرور
۸۵۔ حیات خاں
۸۶۔ عوض بن سالم
۸۹۔ ظفر بن حسن
۹۰۔ عبود بلعقیع
۹۱۔ عوض بلعقیع
۹۲۔ سعید الحی
۹۵۔ عثمان بلعلہ
۹۶۔ عقیل یا عقیل

۹۷۔ عبدالہادی عامری
۹۸۔ عمر بن حیدرہ
۹۹۔ سید عبدالقادر
۱۰۰۔ احمد ابراہیم
۱۰۱۔ عبداللہ بالعبید
۱۰۲۔ شیخ عبداللہ بایزید
۱۰۳۔ شیخ علی زبیدی
۱۰۷۔ شیخ احمد یافعی
۱۰۸۔ سید محمد رفاعی
۱۰۹۔ اسلم باسلوم
۱۱۰۔ مرزا اکبر بیگ
۱۱۱۔ شیخ عبدالرزاق
۱۱۲۔ عبدالمالک خاں
۱۱۳۔ اصغر خاں
۱۱۴۔ محمد یوسف شریف
۱۱۵۔ سید پیراں
۱۱۶۔ محمد حنیف
۱۱۷۔ محمد احمد علی
۱۱۹۔ سید محمد
۱۲۲۔ سید خواجہ معین الدین
۱۲۳۔ غلام محی الدین
۱۳۰۔ عبداللہ بن عبود
۱۳۱۔ محمد جلال الدین
۱۳۲۔ سید یوسف الدین
۱۳۳۔ محمد سرور
۱۳۴۔ مرزا اسمٰعیل بیگ
۱۳۹۔ غلام احمد خاں
۱۴۰۔ عبدالغفار

۱۴۱۔ مرزا محمود حسین بیگ
۱۴۳۔ سید محمود علی
۱۴۹۔ شیخ محبوب
۱۴۷۔ عبدالحفیظ
۱۵۰۔ سید الطاف حسین
۱۵۲۔ سید عبدالکریم
۱۵۳۔ محمد حسین
۱۵۸۔ شاہ محمد صالح
۱۶۱۔ سیف الدین
۱۶۶۔ صلاح الدین
۱۷۰۔ محمد بشیر خاں
۱۷۶۔ عبداللہ دین عمر
۱۷۸۔ سید رسول
۱۷۹۔ محمد خاں
۱۸۰۔ منور حسین
۱۸۱۔ شیخ فرید
۱۸۲۔ شیخ حسین
۱۸۳۔ راجیا
۱۸۴۔ سید عبدالغنی
۱۸۵۔ شیخ محبوب
۱۸۶۔ بشیر علی
۱۸۷۔ شیخ حمید
۱۸۸۔ سید موسیٰ علی
۱۸۹۔ محمد چاند
۱۹۰۔ عبدالرؤف
۱۹۱۔ غلام غوث
۱۹۲۔ محمد خواجہ حسین
۱۹۳۔ سید معین الدین
۱۹۴۔ شیخ عبدالمجید
۱۹۵۔ محمد غوث

۱۹۶۔ اکبر علی خاں
۱۹۷۔ محمد عبدالرحیم
۲۰۲۔ اکبرالدین خاں
۲۰۳۔ میر عطا علی
۲۰۴۔ غلام مصطفیٰ خاں
۲۰۵۔ محمد برکت
۲۰۶۔ رحمت حسین
۲۰۷۔ محمد برہان
۲۰۸۔ رام شنکر
۲۰۹۔ محمود علی
۲۱۱۔ عبدالحمید شاہ خاں
۲۱۲۔ وزیر شاہ خاں
۲۱۳۔ محمد عبدالقادر
۲۱۴۔ محمد برہان
۲۱۵۔ محمد رحمت علی
۲۱۶۔ سوامی داس
۲۱۷۔ محمد یوسف شریف
۲۱۸۔ محمد شہاب الدین
۲۱۹۔ موہن سنگھ
۲۲۱۔ محمد عبدالکریم خاں
۲۲۵۔ محمد عبدالمجید خاں
۲۲۸۔ محمد کریم الدین
۲۳۳۔ ابراہیم خاں
۲۳۴۔ سید ضیاء الدین
۲۳۷۔ داؤد خاں
۲۳۸۔ عبدالوحید خاں
۲۳۹۔ قطب الدین
۲۴۰۔ حاجی شریف
۲۴۲۔ سالم
۲۴۳۔ عبداللہ

۲۴۴۔ محمد
۲۴۶۔ محبوب
۲۴۷۔ فیروز
۲۴۸۔ سعید
۲۴۹۔ عبدالقادر
۲۵۰۔ عبداللہ
۲۵۱۔ سلیمان
۲۵۲۔ عبدالرحمٰن
۲۵۳۔ حسین
۲۵۵۔ سالم
۲۵۶۔ محبوب
۲۵۷۔ محمد بن آدم
۲۵۸۔ محمد بن حسن
۲۶۰۔ متیا
۲۶۱۔ سید رضی الدین احمد
۲۶۲۔ سید عبدالقیوم شاہ قادری
۲۶۴۔ امیر علی
۲۶۶۔ احمد حسین
۲۶۷۔ سید محبوب حسین
۲۶۸۔ میاں خاں
۲۶۹۔ سید یٰسین
۲۷۰۔ بجرنگ سنگھ
۲۷۱۔ حسین علی
۲۷۲۔ مرزا احمد بیگ
۲۷۳۔ معین الدین
۲۷۶۔ سید عبدالحی
۲۷۷۔ عبدالرحیم
۲۷۸۔ قادر خاں
۲۷۹۔ مصطفیٰ حسین
۲۸۰۔ امیر حسین

۲۸۱۔ مرزا مصطفیٰ علی بیگ
۲۸۲۔ سید سلطان
۲۸۳۔ محمد بن سالم
۲۸۴۔ محمد یوسف
۲۸۶۔ جگیا
۲۸۷۔ سید جعفر
۲۸۸۔ حمید بیگ
۲۸۹۔ میر ارشد علی
۲۹۰۔ مظفر حسین
۲۹۲۔ سید خواجہ حسین
۲۹۳۔ سید خواجہ [illegible]
۲۹۵۔ سرمد خاں
۲۹۶۔ دستگیر شاہ
۲۹۷۔ عبدالعزیز
۲۹۸۔ میر اسمٰعیل علی
۳۰۱۔ گل محمد خاں
۳۰۳۔ عبداللہ
۳۰۴۔ سید وجیہ الدین
۳۰۵۔ سردار خاں
۳۰۶۔ شیخ احمد
۳۰۸۔ عبدالغنی خاں
۳۰۹۔ محمد انور خاں
۳۱۰۔ [illegible]
۳۱۲۔ غلام احمد خان
۳۱۳۔ عمر خاں
۳۱۴۔ محمد معین الدین
۳۱۵۔ اکبر حسین
۳۱۶۔ غلام فضل خان
۳۱۷۔ ولایت حسین
۳۱۸۔ [illegible]

[illegible]
[illegible]
۳۲۱- [illegible]
۳۲۲- [illegible]
۳۲۳- عبدالرشید خاں
۳۲۴- [illegible]
۳۲۵- [illegible] علی
۳۲۰- [illegible] حسین

مرکز موسیٰ آباد (؟)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
۳۲۹- محمد لقمان
۳۳۰- عبدالحمید خاں
۳۳۲- محمد عالم علی
۳۳۳- عبدالعظیم خاں
۳۳۹- فدا محمد
۳۴۰- محمد نذیر الدین
۳۵۰- شیخ اسمٰعیل
۳۹۹- عبدالغنی
۳۷۰- عثمان خاں
(کامیاب)
۳۳۰- محمد غوث
۳۳۱- محمد محمود خاں
۳۳۳- سعادت اللہ خاں
۳۳۵- عبدالغنی
۳۳۶- سید محی الدین
۳۳۷- محمد حسن الدین
۳۳۸- محمد عبدالرزاق
۳۴۴- محمد جہانگیر
۳۴۵- محمد غلام حسین

۳۳۹- عثمان خاں
۳۴۰- احمد حسین
۳۴۸- نیاز علی خاں
۳۴۹- فضل احمد خاں
۳۵۰- بسم اللہ خاں
۳۵۱- عبدالجبار خاں
۳۵۲- عبدالغفور
۳۵۵- شیخ مولانا
۳۵۶- رام چرن سنگھ
۳۵۸- عبدالرزاق
۳۶۰- محمد محبوب
۳۶۱- عبدالکریم
۳۶۲- شکور خاں
۳۶۳- محمد ابراہیم
۳۶۵- شیخ کریم
۳۶۶- حسن شریف
۳۶۷- شریف محمد
۳۶۸- شیخ رحیم
۳۷۱- امام علی خاں

مرکز بشیر آباد (ذکور)

(کامیاب)
۳۷۳- سید سعید الدین احمد
۳۷۴- محمد عبدالرفیع
۳۷۷- محمد امین الدین
۳۷۹- اننت راؤ
۳۸۲- سوامی
۳۸۳- سید نظام الدین

۳۸۵- سید [illegible]

مرکز بشیر آباد (اناث)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
۳۸۳- مہرالنساء بیگم
(کامیاب)
۳۸۷- رحیم النساء بیگم
۳۸۹- اختر جہاں بیگم
۳۹۰- آمنہ بیگم
۳۹۱- اصغری بیگم
۳۹۲- امت اللہ بیگم
۳۹۳- اختر النساء بیگم
۳۹۴- منور خاتون
۳۹۵- احمد النساء بیگم
۳۹۶- بلقیس بیگم
۳۹۷- ضامن خاتون
۳۹۸- ممتاز جہاں بیگم
۳۹۹- رحمت بانو
۴۰۰- سکینہ بیگم
۴۰۱- بیگم جانی
۴۰۲- رقیہ بیگم
۴۰۳- چاند بیگم
۴۰۵- شاہ جہاں بیگم

مرکز بمبئی (ذکور)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
۴۱۸- جدو پرشاد
۴۳۶- عبدالرزاق
۴۵۰- قاسم
(کامیاب)
۴۱۰- اسمٰعیل
۴۱۲- اسمٰعیل بھائی
۴۱۳- امام الدین
۴۱۶- بدرالدین
۴۲۱- حاتم بھائی
۴۲۳- خوشحال داس
۴۲۵- رام چندر
۴۲۷- رمضان علی
۴۳۱- سید تراب علی
۴۳۲- بشیر احمد
۴۳۵- شیخ داؤد
۴۳۹- شیخ محمد قاسم
۴۴۰- شیخ ولی محمد
۴۴۱- عباس
۴۵۲- کرشنا
۴۵۴- گردھر لال
۴۵۷- محمد خالد
۴۶۵- نصیب اللہ خاں
۴۶۹- ہارون
۴۷۰- ہدایت اللہ
۴۷۱- وتاترے
۴۷۲- منوہر
۴۷۳- پربھاکر
۴۷۴- وسنت

مرکز بمبئی (اناث)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
۴۸۲- مسز دھرم متی
۴۸۶- مس لیلا
(کامیاب)

۴۷۵۔ زر بانو
۴۷۶۔ مسز ارجنا [illegible]
۴۷۷۔ مس انسویا
۴۷۸۔ مس انجم عتیق
۴۷۹۔ مسز سرسوتی [illegible]
۴۸۰۔ شانتا
۴۸۱۔ مس کوشیلیا [illegible]
۴۸۲۔ مس چرپتی جانسی کر
۴۸۳۔ مسز کملا دیش پانڈے
۴۸۵۔ کسم راجچندر [illegible]

مرکز بلدہ (اناث)

(کامیاب با امتیاز)
۴۸۹۔ ظہور النساء بیگم
۴۸۷۔ شمس النساء بیگم

(کامیاب)
۴۹۰۔ عظمت النساء بیگم
۴۹۱۔ افتخار النساء بیگم
۴۹۲۔ عابدہ خانم
۴۹۴۔ سراج جہاں
۴۹۵۔ قادر جہاں
۵۵۱۔ رحیم النساء بیگم
۵۵۰۔ سردار بیگم
۵۵۶۔ جمیل النساء بیگم

مرکز بلدہ (ذکور)

(کامیاب با امتیاز)
۵۲۹۔ سید اسمٰعیل ہاشمی

(کامیاب)
۴۹۶۔ گوری شنکر
۴۹۷۔ عبدالرشید
۴۹۸۔ محمد نصیر الدین
۴۹۹۔ محمد حسین
۵۰۰۔ محمد ظہیر الدین
۵۰۱۔ سید بادشاہ محی الدین
۵۰۲۔ سید عمر
۵۰۳۔ محمد [illegible] قریشی
۵۰۴۔ احمد علی
۵۰۵۔ محمد برہان الدین
۵۰۶۔ مظفر حسین
۵۰۷۔ گوپال راؤ
۵۰۸۔ محمد عبدالقادر
۵۰۹۔ عبدالوہاب
۵۱۰۔ سید رفیق الحسینی
۵۱۱۔ محمد احتشام الدین
۵۱۲۔ شیخ ابراہیم
۵۱۳۔ میر محبوب علی
۵۱۴۔ وینکٹ راؤ
۵۱۵۔ محمد یحییٰ خاں
۵۱۶۔ ظہور الحق
۵۱۷۔ ڈی کرشن راؤ
۵۱۸۔ محمد پاشاہ حسینی
۵۱۹۔ احمد حسین
۵۲۰۔ محمد جہانگیر الدین
۵۲۱۔ محمد عبدالکریم
۵۲۲۔ سیو پرشاد اوستی
۵۲۴۔ محمد یوسف خاں
۵۲۵۔ عبدالغنی
۵۲۶۔ احمد عبدالقیوم
۵۲۷۔ نرسنگ پرشاد دکشت
۵۲۸۔ محمد قدرت نواز خاں
۵۳۰۔ محمد عبدالقادر
۵۳۱۔ محمد عبدالسبحان
۵۳۲۔ محمد فصیح الدین
۵۳۳۔ محمد حبیب اللہ خاں
۵۳۴۔ غلام احمد
۵۳۶۔ ہمت علی خاں
۵۳۷۔ میر امانت علی خاں
۵۳۸۔ سید محمد احمد الدین
۵۳۹۔ بالاجی
۵۴۰۔ وشوناتھم
۵۴۱۔ محمد قادر علی خاں
۵۴۲۔ این سدرشن راج
۵۴۳۔ محمد عبدالرحمٰن خاں
۵۴۴۔ حسین خاں
۵۴۵۔ محمد احمد حسین
۵۴۶۔ محمد محی الدین
۵۴۷۔ محمد قاسم
۵۴۸۔ محمد احمد علی
۵۴۹۔ شیخ سید علی
۵۵۰۔ محمد معین الدین احمد

مرکز دوم [illegible] (ذکور)

(کامیاب با امتیاز)
۵۷۸۔ [illegible] شرما

(کامیاب)
۵۵۰۔ دریا
۵۵۸۔ پی سندیا
۵۵۹۔ وردیا
۵۶۰۔ راملو
۵۶۴۔ [illegible]
۵۶۹۔ [illegible]
۵۷۱۔ [illegible]
۵۷۶۔ اپیا راؤ
۵۷۹۔ [illegible]
۵۸۰۔ [illegible]
۵۸۲۔ وی جگت رامیا
۵۸۳۔ [illegible]
۵۸۹۔ [illegible]
۵۹۳۔ مظفر حسین

مرکز دوم [illegible] (اناث)

(کامیاب با امتیاز)
۵۹۱۔ سلیم النساء بیگم (اول)
۵۹۲۔ لتا بائی

(کامیاب)
۵۸۸۔ پرمیلہ دیوی
۵۸۹۔ لتا دیوی
۵۹۰۔ ویلا بائی

مرکز [illegible] (ذکور)

(کامیاب با امتیاز)
۶۱۳۔ محمد عبدالرحمٰن [illegible]
۶۱۴۔ محمد عبد[illegible]

(کامیاب)
۵۹۴۔ [illegible]
۵۹۵۔ سید فرخندہ علی
۵۹۷۔ [illegible]
۵۹۸۔ [illegible]
۶۰۱۔ [illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
۹۰۰۔ [illegible]
۹۱۳۔ [illegible]
۹۱۴۔ سید [illegible]
۹۲۱۔ [illegible]

مرکز [illegible] (اناث)

(کامیاب با امتیاز)
۹۲۳۔ اقبال النساء بیگم
۹۲۸۔ [illegible] بیگم
(کامیاب)
۹۲۴۔ فضیلت النساء بیگم
۹۲۵۔ قمر سلطانہ خاتون
۹۲۶۔ اختر بانو
۹۲۷۔ [illegible]

مرکز ناگر کرنول (ذکور)

(کامیاب با امتیاز)
۹۲۹۔ محبت علی خاں
۹۳۲۔ نور خاں
۹۳۳۔ محمد بن صلاح
(کامیاب)
۹۳۴۔ محمد اسمٰعیل خان
۹۳۵۔ عبدالحمید
۹۳۶۔ رام سنگھ
۹۳۷۔ [illegible] احمد خاں
۹۳۸۔ شیخ [illegible]
۹۴۰۔ محمد حسین
۹۴۱۔ محمد ابراہیم
۹۴۲۔ داؤد خاں
۹۴۳۔ امین الدین
۹۴۴۔ اسد اللہ خاں
۹۴۸۔ محمد جعفر علی
۹۵۰۔ مرزا حسن علی بیگ
۹۵۱۔ بسم اللہ خاں
۹۵۲۔ محمد اکبر علی
۹۵۵۔ حبیب خاں

مرکز ناگر کرنول (اناث)

(کامیاب با امتیاز)
۶۰۶۔ طیبہ بیگم صدیقی (دوم)
(کامیاب)
۶۰۸۔ محبوب بیگم
۶۰۹۔ حلیمہ بیگم

مرکز نظام آباد (ذکور)

(کامیاب با امتیاز)
۶۶۱۔ محمد حسین
۶۶۳۔ بشیر احمد
۶۶۴۔ محمد عبدالرحیم
۶۶۶۔ محمد عثمان خاں
۶۸۰۔ نرسلو
۶۸۲۔ بی اشتا
۶۸۴۔ ٹی پربھورام
(کامیاب)
۶۵۸۔ سید محبوب علی
۶۵۹۔ عبدالستار
۶۶۰۔ شیخ علی
۶۶۲۔ محمد بدیع الدین
۶۶۸۔ کاشی ناتھ راؤ
۶۶۹۔ جناردھن راؤ
۶۷۰۔ راملو
۶۷۱۔ کے گریندوالا
۶۷۳۔ وینکٹ نرسیا
۶۷۴۔ کے راجندر
۶۷۵۔ وی وینکٹیشم
۶۷۶۔ کے وینکٹیشم
۶۷۷۔ شنکر
۶۷۹۔ ارونی راؤ
۶۸۱۔ ایم ملکیا
۶۸۳۔ دتا ریڈی

مرکز نظام آباد (اناث)

(کامیاب با امتیاز)
۶۸۶۔ جمیل النساء بیگم
۶۸۷۔ سیدہ حجاب الزہرا ہاشمی
۶۸۸۔ کریم النساء بیگم
۷۰۱۔ عائشہ بی
(کامیاب)
۶۸۵۔ شمس النساء بیگم
۶۸۹۔ جعفری بیگم
۶۹۰۔ نظام خاتون
۶۹۱۔ سلیم النساء بیگم
۶۹۲۔ حلیمہ بیگم
۶۹۳۔ فریدہ بی
۶۹۴۔ محمد رشید النساء بیگم
۶۹۶۔ صاحب النساء بیگم
۶۹۷۔ غفور النساء بیگم
۶۹۸۔ حامد النساء بیگم
۶۹۹۔ سیدہ تہذیب النساء بیگم
۷۰۲۔ امیر النساء بیگم

مرکز ہنگولی (ذکور)

(کامیاب)
۷۰۳۔ زادے شیام
۷۰۷۔ شیو داس
۷۰۸۔ پرسرام
۷۱۰۔ سید لیاقت علی
۷۱۱۔ محمد ابراہیم
۷۱۲۔ محمد ہاشم
۷۱۳۔ خواجہ معین الدین خاں
۷۱۴۔ میر حمایت علی
۷۱۵۔ محمد اسمٰعیل خاں
۷۱۶۔ محمد عبدالحق
۷۱۷۔ محمد عبدالوہاب
۷۲۱۔ محمد ثناء اللہ خاں
۷۵۷۔ پنڈت راؤ
۷۵۹۔ بالکشن
۷۶۰۔ نارائن
۷۶۲۔ نارائن
۷۶۳۔ ایرپا

مرکز ہنگولی (اناث)

(کامیاب)
۷۲۲۔ طاہرہ بیگم
۷۲۳۔ عابدہ بیگم
۷۲۴۔ عابدہ بیگم

[illegible]

... [illegible] ... کو آخر فقرہ

[illegible]

... [illegible] ... کی اصل ... کی درخواستیں
... [illegible] ... پیش کرنے پر ... ہو چکا تھا کہ سرکاری
... [illegible] ... کے بعد اس کا تصفیہ کیا جائے گا لیکن اکثر ارکان
... [illegible] ... رائے ہونے اس کی فوری تصفیہ کی
... [illegible] ...

... [illegible] ... ہے یا کہ معلمہ کو پانچ روپیہ ماہوار مشاہرہ کو تیس
... [illegible] ... ما آذر سے دیئے جائیں لیکن ان کی
... [illegible] ... وصول ہونے کے بعد ہوگی۔

چندہ سالانہ سے جمع شدہ رقم مبلغ (للعہ) روپیہ ثانیہ ... [illegible] ... صاحب نے معتمد کے حوالے کئے۔

اس کے بعد دستور العمل مع اس کے قواعد زیر بحث آئے۔ ... [illegible] ... کی ... ترمیمیں پیش کی گئیں اور ان پر غور کیا گیا۔

قاعدہ نمبر ۲ فقرہ ۲ (متعلق مدت رکنیت) جہاں بانو بیگم اور عظمت النساء بیگم کا خیال تھا کہ سہ سالہ ہونا زیادہ مناسب ہوتا لیکن کیونکہ قاعدہ کی رو سے دوبارہ منتخب ہونے کی گنجائش موجود تھی اس لئے بکثرت رائے ان کے خلاف تھی اور دو سالہ میعاد برقرار رکھی گئی۔

قاعدہ نمبر ۲ کے تیسرے فقرے کی مسز تیم ... اور تہنیت النساء بیگم نے قید ... کی سفارش کی تھی اور دوسرے رکن کی طرح عہدہ داروں کو بھی دوبارہ نامزد کئے جانے کی تجویز کی تھی جس کی ... بشیر النساء بیگم صاحبہ۔ جہاں بانو بیگم صاحبہ اور سعید النساء بیگم صاحبہ نے ... لیکن معتمد نے اصول کے لحاظ سے اس فقرہ کی منظوری کی درخواست کی اس کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی ترمیم سے اپنا اختلاف ظاہر کیا۔ کثرت رائے چونکہ معتمد کے خلاف تھی اس لئے تصفیہ کو مجلس انتظامی کی صوابدید پر چھوڑنے کی رائے ہوئی۔

بقیہ قاعدے بکثرت آراء منظور ہوئے اور دستور العمل بحیثیت مجموعی مع صرف قاعدہ نمبر ۲ فقرہ ۳ کی ترمیم کے ساتھ منظور ہو کر مجلس انتظامی کو نافذ کر دینے کی اجازت ارکان سے حاصل کی گئی۔

کیونکہ یہ اجلاس بطور خاص دستور العمل کی منظوری و نفاذ کے متعلق تھا اس لئے اس کے بعد دوسری کوئی کارروائی نہ ہوئی اور مجلس برخاست کی گئی۔

(نوٹ) اجلاس کے ختم پر محترمہ عظمت النساء بیگم صاحبہ کی پیش کردہ تحریک تعزیت منظور کی گئی جو حسب ذیل ہے:

شعبۂ نسواں ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی منعقدہ ۲۰ آذر ۱۳۵۴ف م ۲۰ نومبر ۱۹۴۴ء میں خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالمجید خان ثانی کی وفات حسرت آیات پر جو قرارداد تعزیت متفقہ طور پر منظور کی گئی اس کو حسب تصفیہ مجلس علیا حضرت ہز ہائینس شہزادی درّ شہوار دردانہ بیگم صاحبہ شہزادی برار کی خدمت اقدس میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جاتی ہے۔

"خلیفۃ المسلمین اعلیٰحضرت سلطان عبدالمجید خان مرحوم کی وفات حسرت آیات پر ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسواں کی یہ مجلس انتظامی اپنے دلی رنج والم کا اظہار کرتی ہے سلطان مرحوم اس عثمانی خاندان کے چشم و چراغ اور جلیل القدر سلطان تھے جس نے اسلام کی خدمت کے علاوہ علم و فضل کی بھی صدیوں سرپرستی کی ہے۔ ان کی وفات سے مسلمانان عالم کو جو صدمہ پہنچا ہے وہ ناقابل تلافی ہے۔ خاص کر ہر ہائینس حضرت علیا شہزادی صاحبہ برار کو اپنے پدر محترم کی مفارقت کا جو دلی صدمہ ہوا ہے اس پر تو کل خواتین اسلام متاثر ہوئیں لیکن خاص کر دکن کی خواتین اس سے بے حد غمگین ہیں۔ ہماری دلی دعا ہے کہ باری تعالیٰ سلطان مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور علیا حضرت شہزادی صاحبہ کو اس جانگداز سانحہ میں صبر واستقامت عطا فرمائے۔"

—— معتمد شعبۂ نسواں

تاریخ دکن کانفرنس

ادارہ کے شعبۂ تاریخ کی تحریک پر جو تاریخ دکن کانفرنس منعقد ہو رہی ہے اس کی رکنیت استقبالیہ کیلئے عالیجناب نواب علی یاور جنگ بہادر نے حسب ذیل دعوت نامہ اجرا فرمایا ہے۔

جناب والا!

سرزمین دکن اور خاص کر مملکت حیدرآباد کی تاریخ اپنی گوناگوں خصوصیات اور اہمیت کی وجہ سے ماہرین تاریخ کا مرکز نظر بنی رہی ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر مورخین اور سرکاری و خانگی ادارے کام کرتے آئے ہیں۔ یہ کام اب ایک ایسی منزل پر پہنچ گیا ہے جبکہ شعبۂ تاریخ ادارۂ ادبیات اردو نے محسوس کیا کہ تاریخ دکن سے متعلق ماہرین تاریخ اور صاحبان ذوق ایک مرکز پر مجتمع ہوں اور دکن کی تاریخ کے کام کو آگے بڑھانے میں ایک دوسرے سے استفادہ کریں۔ نیز اس سے دلچسپی رکھنے والوں کے آپس کے میل ملاپ اور ذہنی تعلقات میں اضافہ ہو۔

اس تخیل کے پیش نظر ادارۂ ادبیات اردو کی تحریک اور شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ۔ انجمن تاریخ و اثریات حیدرآباد۔ دفتر دیوانی و مال سرکار عالی۔ محکمۂ آثار قدیمہ۔ بزم تاریخ جامعہ عثمانیہ اور ہسٹری یونین نظام کالج کے اشتراک سے طے پایا کہ ایک ایسی تاریخ دکن سوسائٹی قائم کی جائے جو ہر دو سال میں کسی نہ کسی مقام پر اپنی ایک کانفرنس بھی منعقد کرتی رہے چنانچہ اس کی پہلی کانفرنس اپریل ۱۹۴۵ء میں منعقد کی جا رہی جس میں مختلف جامعات اور اداروں کے ماہرین تاریخ کے علاوہ ایسے اصحاب بھی شرکت کریں گے جو تاریخ دکن کے متعلق کام کر رہے ہیں یا اس سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس انجمن اور کانفرنس کی سرپرستی اعلیٰحضرت بندگان عالی متعالی سلطان العلوم خسرو دکن و برار نے ازراہ معارف پروری قبول فرما کر عزت بخشی ہے۔ آنریبل سر [illegible] صدر المہام مال حکومت سرکار عالی نے اس انجمن کی پہلی کانفرنس کی صدارت قبول فرمائی ہے اور ہز ایکسلنسی نواب صاحب چھتاری صدر اعظم دولت آصفیہ ازراہ علم دوستی اس کا افتتاح فرمائیں گے۔

تاریخ دکن کانفرنس کی اس پہلی [illegible] اجلاسوں کی صدارت و مقالات [illegible] لئے دکن اور ہندوستان کے مشہور ماہرین تاریخ [illegible] کو شرکت کی دعوت کر قبول بھی کر لیا ہے۔

کانفرنس کے سلسلہ میں دکن کے تاریخی آثار [illegible] نیز تاریخی کاغذات کی ایک اعلیٰ پایہ کی نمائش بھی منعقد کی جائیگی [illegible] اہل ملک میں تاریخ دکن کا ذوق بڑھانے میں [illegible]

انعقاد کانفرنس کے انتظامات ایک مختصر مجلس استقبالیہ کے سپرد ہیں مجلس امر کی متمنی ہے کہ اس مفید تحریک کو کامیاب بنانے میں دکن اور اس کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جملہ اصحاب خاطر خواہ اعانت فرمائیں گے۔

کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کی رکنیت کے لئے دس روپیہ چندہ مقرر کیا گیا ہے لیکن امید ہے کہ آپ اپنی جانب سے کوئی عطیہ بھی ارسال فرمائیں گے۔ رکن مجلس استقبالیہ کی حیثیت سے کانفرنس کے عام اجلاسوں میں شرکت کے مجاز ہونے کے علاوہ آپ کی خدمت میں وہ کتاب بھی بطور تحفہ ارسال کی جائیگی جس میں اس اجتماع کے خطبے، مقالے، تجویزیں اور روداد شائع ہوگی۔

مجلس استقبالیہ کی رکنیت کا چندہ اور عطیہ براہ کرم مجلس انتظامی کے معتمد مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی یا خازن ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ کے نام دفتر ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد کے پتہ پر ارسال فرمایا جائے۔

علی یاور جنگ

[illegible] بجے سویرے [illegible] سے راہی ناگرکرنول [illegible] پہلے شیشن پر اترنا پڑتا ہے۔ اسٹیشن [illegible]۔ خوش قسمتی سے مولوی [illegible] ناگرکرنول سے بس میں ملاقات ہوئی اور [illegible] صاحب موصوف سے دلچسپ [illegible] اور پتہ نہ لگا کہ منزل مقصود پر پہنچا۔

ہم [illegible] جناب دوم تعلقدار صاحب کے مکان پہنچا اور [illegible] صاحب موصوف سے میرا تعارف کرایا۔ میرے پہنچنے کے دوسرے ہی دن کلب میں مشاعرہ تھا اور حلقہ سے جناب [illegible] صاحب بھی تشریف لانے والے تھے۔ ان حضرات کو [illegible] جناب دوم تعلقدار صاحب نے اپنی تشویش کا اظہار فرمایا [illegible] ۱۰ بجے شعرائے کرام اپنے دوستوں کے ساتھ رونق افروز ہوئے۔ جناب دوم تعلقدار صاحب نے [illegible] کو سالن لیا [illegible] اپنی دلچسپی میں ایک اضافہ محسوس کیا۔

دوسرے دن صبح ناشتہ سے پہلے میں نے امتحان کا معائنہ کیا جو جناب دوم تعلقدار صاحب کے دولت خانہ کے بالکل متصل [illegible] انجمن امداد باہمی کے وسیع ہال میں مقرر کیا گیا تھا۔ اسی ہال کے پیچھے [illegible] میں اناث کے لئے انتظام کیا گیا تھا۔ جناب [illegible] صاحب نے اپنی موٹر کے ذریعہ لڑکیوں اور صدر معلمہ [illegible] کے لانے لے جانے کا انتظام کیا تھا۔ اناث کی نگرانی کے لئے [illegible] صاحبہ مدرسہ نسواں اور بیگم صاحبہ مددگار مہتمم پولیس کو متعین کیا گیا تھا۔ طبقہ ذکور کی نگرانی کے لئے مولوی احمد حسن [illegible] صاحب وکیل و مولوی مظفر الدین صاحب پیشکار اور مولوی [illegible] صاحب انتخاب ہوئے تھے۔ ذکور میں (۲۱) امیدواروں کے منجملہ (۹) امیدوار غیر حاضر رہے۔ طبقہ اناث میں حاضری برابر [illegible] دوم میں اناث کی حاضری برابر رہی اور ذکور [illegible] (۱۱) امیدوار غیر حاضر رہے۔ خارجی طور پر یہ معلوم کر کے [illegible] غیر حاضر امیدوار کچھ تو سررشتہ پولیس اور کچھ [illegible] تعلق رکھتے ہیں اور بے چاروں کو عین امتحان

رہی کہ دو ڈیوٹی پر بھیج دیا گیا ہے۔ میں اوارۂ ادبیات اردو سے پر زور الفاظ میں یہ استدعا کروں گا کہ ادارہ اپنی طرف سے علم و ادب پسند حکام سے خاص طور پر متعلق کر کے توجہ دلائے کہ امتحان کے روز ان امیدواروں کو جنہوں نے امتحان میں شرکت کرنا ہو کسی سرکاری کام یا خانگی ڈیوٹی پر نہ بھیجا کریں۔ اس سے نہ صرف علم دوستی مقصود ہوگی بلکہ ملک اور قوم کی ایک بے بہا خدمت انجام پائے گی۔

دوران امتحان میں جناب دوم تعلقدار صاحب نے امتحان گاہ تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی اور کافی عرصے تک وہاں ٹھہرے رہے۔ اسی اثنا میں صاحب موصوف نے اپنی طرف سے ناگرکرنول کی سمت میں طبقۂ اناث و ذکور سے اول آنے والے امیدوار کو ایک ایک نقروی تمغہ دینے کا اعلان فرمایا۔ جناب دوم تعلقدار صاحب سے یہ معلوم ہوا کہ سید محمود صاحب بی اے ایل ایل بی منصف ناگرکرنول نے ادارہ کی صدارت قبول فرمائی ہے اور مولوی حفیظ حسن صاحب مددگار مہتمم پولیس نے معتمدی قبول کی ہے۔ جناب مددگار صاحب مہتمم پولیس سے کچھ دیر ملاقات رہی۔ میں نے صاحب موصوف کو ایک سچا ہمدرد اور قومی ارادہ رکھنے والا انسان پایا۔

یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ اکثر امیدواروں کی فیس امتحان جناب دوم تعلقدار صاحب نے اپنی جیب خاص سے خود عنایت کی ہے۔ یہ ہے قومی کام اور اسی کا نام ہے قومی خدمت۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سبھوں کا دل مولوی عارف الدین حسن صاحب جیسا بنا دے جن کا دل و دماغ غریبوں اور بیکسوں کے لئے وقف ہے۔

زبانی امتحان سوا پانچ بجے تک جاری رہا۔ حسب قاعدہ تمام امور کی تکمیل کر کے میں جناب دوم تعلقدار صاحب کے گھر لوٹ آیا۔ چائے پی کر شعرائے کرام کے ساتھ جناب دوم تعلقدار صاحب کی رہبری میں بستی کی طرف چلے۔ جناب دوم تعلقدار صاحب نے ایک دار المطالعہ کا اور اسی سے متعلق ایک کلب کا معائنہ کرایا جہاں اکثر انگلش اور اردو کتابیں اور رسائل پائے گئے۔ یہ دار المطالعہ اور کلب جناب دوم تعلقدار صاحب ہی کا قائم کردہ ہے۔ صاحب ممدوح کو ناگرکرنول

آئے ہوئے تھے [illegible] اور [illegible] کی قلیل تر [illegible]
صاحب موصوف [illegible] کی پُر امیدوں میں جو جگہ حاصل
کی ہے وہ [illegible] کی بات نہیں۔ دار المطالعہ سے [illegible]
جناب دوم تعلقدار صاحب کی خواہش پر جناب لنگر صاحب نے
ایک مختصر سی تقریر کی اور اماں دیہاتی بھائیوں میں سے جو اکثر
جنید تھے ایک صاحب نے بھی تقریر کی۔ جناب دوم تعلقدار
صاحب نے اپنے گرانمایہ پند و نصائح سے ہم سب کو مستفیض فرمایا۔
سرِ شام ہم سب [illegible] کلب واپس ہوئے جہاں ہمارے لئے
حسبِ ترتیب ڈنر کیا گیا اور مشاعرہ بھی مقرر تھا۔ ۹ بجے کھانے
سے فارغ ہو گئے اور مشاعرہ کی دلچسپ محفل آراستہ ہوئی۔ جناب
حمید صاحب جو ناگر کرنول کے سرکل انسپکٹر پولیس ہیں میر مشاعرہ
بنائے گئے اور [illegible] صاحب حیدر آبادی نے سنائی اور مقامی [illegible]
میں [illegible] صاحب نے بہ کیفیت نظم حیدر آبادی کی پرکیف نظم کو سب کو سحر
لے رہے تھے ان کے بعد ادیب صاحب نے گہر افشانی شروع کی۔
اس کے بعد کمترین بھی مشاعرہ کی زد سے نہ بچ سکا۔ یعنی خود تو
شاعر نہیں البتہ جناب دوم تعلقدار صاحب کے اصرار پر بعض
اساتذہ کا کلام سنانے کی عزت حاصل ہوئی۔ میر مشاعرہ نے اپنا
فارسی کلام سنا کر سب سے خراج تحسین حاصل کیا۔ غرض یہ دلچسپ
صحبت شب کے ایک بجے کے قریب ختم ہوئی ہم سب ۱۰ ار دو سرے کو
صبح کی موٹر سے راہی بلدہ ہوئے۔
میں مخصوصاً جناب مولوی عارف الدین حسن صاحب
دوم تعلقدار ناگر کرنول کا دل سے ممنون ہوں جنھوں نے
میرے قیام کے لئے نہایت سہولت بخش انتظام فرمایا۔ اور ساتھ ہی
میں ان حضرات کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے دوران امتحان
میں ہر طرح میری مدد فرمائی۔

مظہر الدین

قیام شاخ قصبہ ٹاکلی

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن
کے پُر خلوص کارکنوں کی مساعی جمیلہ
برگ و بار لائے بغیر نہیں رہیں۔
یہی اسباب تھے کہ ٹاکلی جیسے دور افتادہ مقام میں بھی اس کی
صدائے حق پہنچی اور سوتے والوں کو بیدار کیا۔ چنانچہ اربابِ ادارہ

کی کوشش حق پژوہی سے کارکنان شاخ ادارۂ [illegible]
ادارہ کو باضابطہ اجازت نامہ مرحمت [illegible]
کا زریعہ ہوگا کہ اردو کی ترویج میں حصہ لے اور قرب و جوار کے
دیہاتوں میں اشاعت تعلیم اردو کا فریضہ [illegible]
جلسہ عام میں بالاتفاق حسب ذیل امور طے ہوئے۔
(۱) جناب مولوی محمد [illegible] صاحب بی اے ایل ایل بی
وکیل ہائیکورٹ اورنگ آباد سرپرست شاخ [illegible]
اردو قرار پائے اور آنجناب نے سرپرستی قبول فرما کر
بڑی حوصلہ افزائی فرمائی۔
(۲) صدارت شاخ ادارہ ہذا کو جناب مولوی [illegible] صاحب
تحصیلدار قصبہ ٹاکلی نے قبول فرما کر زینت فرمایا۔
(۳) ارکان انتظامی میں جناب مولوی سید [illegible] صاحب
جناب مولوی قاضی [illegible] الدین صاحب منتخب کئے گئے اور
ہر دو حضرات نے اس کے لئے اپنی خدمات پیش فرما کر کرم
بخشی کی۔
(۴) خدمت معتمدی کے لئے مجھ پر اس بارِ گراں کو رکھا گیا ہے اس
بوجھ کو سہارنے کی اپنے خدا سے دعا کرتا ہوں۔

محمد [illegible] معتمد

شاخ چیتاپور کی جدید تنظیم

مولوی محبوب خان صاحب
بہت زئی بی اے معتمد شاخ
ہذا کے تبادلہ کے سبب چیتاپور
کی ادبی سرگرمیوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ موصوف زبان اردو کے
بہی خواہ تھے۔
محمد عبد العزیز مجاہدی کارکن مدرسہ فوقانیہ چیتاپور نے اپنے
ادبی ذوق کی سبب ادارہ کی خدمت کو اپنا فرض [illegible]
عہدہ داران اور دیگر علم دوست اصحاب سے گفت و شنید کی۔
مولوی مرزا خورشید بیگ صاحب ڈپٹی انسپکٹر [illegible] اور مولوی
مشائخ صاحب عارف کی تسلی سلسل مولوی [illegible] صاحب
دوم تعلقدار اور مولوی محمد عبد القادر خان صاحب ناظر [illegible]
علاقہ [illegible] کی علم دوستی اور حسن توجہ نے ادارہ کی شاخ کی [illegible]

[illegible] اردو کی [illegible] سالانہ اجلاس [illegible]
[illegible] ایک جلسہ [illegible] مولوی مرزا [illegible]
[illegible] صاحب [illegible] متعلقہ [illegible] کی تعلیم
[illegible] عزیز [illegible] کی [illegible] معلومات [illegible]
[illegible] ہوئے بیان کیا کہ اردو زبان
[illegible] جماعت کے ذریعہ عمل میں آتا [illegible]
[illegible] کی اہمیت کی بجائے کہ ان میں اردو زبان
[illegible] کیا جائے [illegible] سے استعمال [illegible]
[illegible] پیش نظر بلند تر مستقبل کا تصور [illegible]
[illegible] ہمارا مستقبل ماضی کی دھندلی یادگار بن کر رہ
[illegible]

صدر جلسہ نے ادارہ کی تاریخ بیان فرماتے ہوئے زبان [illegible]
کی اہمیت پر زور دیا اور فرمایا کہ ایک زندہ زبان ایک قوم
کو زندہ رکھنے کی ضامن ہے۔ زبان کی زندگی اس کی ہمہ گیری
[illegible] ادائے مطالب کی قدرت کا پیدا کرنا شستہ بیانی۔
سلیم المذاقی اور قواعد الکلامی کا حامل ہونا اور معتد بہ ذخیرۂ علم و
ادب کا فراہم ہونا ہے۔ اور آخر میں فرمایا کہ اردو زبان ہی
ایک ایسی زبان ہے جو ہندو مسلم اتحاد کی ایک خوشگوار یادگار ہے۔
بعد ازاں ادارہ کے جدید عہدہ داروں کے انتخابات عمل میں آئے
جو حسب ذیل رہا۔

صدر۔ مولوی اظہر الحق صاحب بی اے۔ دوم تعلقدار جہانگیر [illegible]
نائب صدر۔ مولوی محمد عبدالقادر خاں صاحب [illegible] بیلدار [illegible]
معتمد۔ محمد عبدالعزیز مجاہدی مدرس مدرسہ سلطانیہ عسکریہ
خازن۔ مولوی محمد عبدالقادر صاحب سوداگر
اراکین۔ مولوی مرزا غوث بیگ صاحب تحصیل افسر۔ مولوی میر صدیق علی
صاحب صدر مدرس مدرسہ سلطانیہ۔ مولوی عزیز الدین صاحب
وکیل ایکسٹینٹ۔ مولوی معین الدین صاحب اوورسیر۔ مولوی محمد
شفیع صاحب عارف چیتاپوری۔ مسٹر شرنپ گوڑ صاحب
رکن۔
[illegible] المطالعہ سے متعلق گفتگو کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

جلسہ تقسیم اسناد

بتاریخ ۲۰ فروری [illegible] بوقت [illegible] ساعت شام مولوی مرزا غوث بیگ صاحب مہتمم مدرسہ عارف چیتاپوری کی ساعی جمیلہ سے شاخ ہذا کے زیر اہتمام مولوی اظہر الحق صاحب دوم تعلقدار کی صدارت میں جلسہ تقسیم اسناد بہت اعلیٰ پیمانہ پر منایا گیا جس میں علم دوست حضرات اور دیگر صاحبان کے علاوہ عہدہ داران مقامی جناب عظیم [illegible] صاحب کریٹ انسپکٹر مولوی مرزا محمد بیگ صاحب [illegible] مولوی غلام دستگیر صاحب سررشتہ دار وغیرہ نے شرکت کی اور مولوی میر صدیق علی صاحب بی اے، ایل ایل بی، ڈپٹی صدر مدرس مدرسہ سلطانیہ نے اپنے جملہ اسٹاف مدرسہ اور طلبہ کے ساتھ شرکت فرما کر اپنی علم دوستی اور کارکنان ادارہ کیساتھ اشتراک عمل کا ثبوت دیا۔

جلسہ کی کارروائی قرأت سے شروع کی گئی۔ محمد عبدالرحیم صاحب و محمد معز الدین صاحب متعلم مدرسہ اسلامیہ کی حمد کے بعد صدر جلسہ نے کرسی صدارت کو رونق بخشی بعد ازاں معتمد ادارہ نے رپورٹ سالانہ سنائی۔ اور مولوی حمید الدین صاحب کلیانوی اور مولوی محمد عبدالجبار خاں صاحب اردو عالم نے اردو سے متعلق نظمیں پڑھیں۔ مولوی عارف چیتاپوری نے اپنا پرمغز مقالہ "چیتاپور میں اردو کی ترقی" کے عنوان سے پڑھا۔ صدر جلسہ سے اسناد تقسیم کرنے کی استدعا کی گئی۔ کامیاب امیدواروں نے اسناد حاصل کی۔ آخر میں صدر جلسہ نے کامیاب امیدواروں کو مبارکباد دی اور اردو سے متعلق ایک پرجوش تقریر فرمائی اور زبان اردو کو ایک مکمل زبان ثابت کیا۔ اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے ہندوستان میں اس کی ترقی اور نشو و نما کے حالات بیان کئے۔ معتمد کے شکریہ کے بعد جلسہ برخاست کیا گیا۔

شاخ ادارۂ ادبیات اردو الوت محل

شاخ الوت محل اردو زبان کی ترقی کے لئے ہمہ تن مصروف ہے۔ اس کا ایک دار المطالعہ بھی ہے جہاں کافی تعداد میں ناظرین روزانہ پابندی سے آتے ہیں۔

... کانفرنس کے سلسلہ میں ایک عظیم الشان مشاعرہ بصدارت جناب پروفیسر شور صاحب ترتیب دیا گیا تھا ... ارکان شاخ کی جانب سے ... ضلع ... کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں حسب ذیل تجاویز منظور ہوئیں۔

یہ اجلاس ضلع میں اردو مدارس کی معتدبہ تعداد کے پیش نظر ضلع بورڈ الوت محل سے درخواست کرتا ہے کہ نہ صرف ... مناسب آبادی بلکہ ماتحت اردو مدارس کے ساتھ دفتری مراسلت دغیرہ میں سہولت کے خیال سے بھی ضلع بورڈ مدارس کے ماتحت ہر لوکل بورڈ کے آفس میں ایک اردو داں مسلم کلرک کا تقرر عمل میں لایا جائے۔

یہ اجلاس ضلع بورڈ الوت محل اور میونسپل کمیٹی الوت محل کے اس سرکلر کے خلاف سخت احتجاج بلند کرتا ہے جس کی رو سے اردو مدارس کے تمام رجسٹروں کے اندراجات کا مرہٹی زبان میں ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے۔

یہ اجلاس ضلع بورڈ کے اس اقدام کو اردو زبان کی ترویج و اشاعت و افادیت اور اردو مدارس کے قدرتی حق پر ضرب کاری سمجھتا ہے۔ لہٰذا یہ اجلاس حکومت سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اس سرکلر کو جہاں تک اس کا اردو مدارس سے تعلق ہے کالعدم ٹھیرائے۔

یہ اجلاس ڈی سلوا اسکیم کے مطابق اردو زبان کے جماعتی طریقہ تعلیم کی غیر افادیت بلکہ مضرت کے متعلق اساتذہ اردو کی پیہم شکایات کو مناسب اہمیت دیتے ہوئے پراونشل انجمن ترقی اردو ناگپور کو توجہ دلاتا ہے کہ وہ جماعتی طریقہ تعلیم کے متعلق ڈاکٹر عبدالحق صاحب، ڈاکٹر زور صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سجاد مرزا صاحب جیسے مستند ماہرین تعلیم سے استصواب رائے فرما کر اردو داں پبلک کے لئے اس باب میں صحیح راہ عمل پیش کرے۔

شاخ اندولہ ضلع گلبرگہ

صدر ... ڈاکٹر امنگن کرڑہ صاحب وکیل۔ کتب خانہ دار مولوی حکیم محمد عبد ... شریف صاحب۔ طبیب یونانی اندولہ۔

خازن۔ نرسنگ راؤ صاحب پٹواری اندولہ

معتمد۔ سید عثمان صاحب مدرس تحتانیہ اندولہ

شاخ کلیانی

شاخ ادارہ کلیانی کا جلسہ تقسیم اسناد ۲۸ ... ۱۹ ... منعقد ہوا بصدارت ...

عالیجناب فیضمآب نواب سید محمد جمال الدین حسین خان بہادر دام اقبالہ والیٔ اسٹیٹ کلیانی منعقد ہوا جس میں جناب نواب سید محمد منظور حسین خاں صاحب برادر نواب صاحب ممدوح اور مولوی شیخ خلیل اللہ صاحب بی اے ایل ایل بی تعلقدار اسٹیٹ کلیانی مولوی سید سبط نبی صاحب بی اے ایل ایل بی منصف۔ مولوی نظام علیخان صاحب مددگار۔ مولوی اکبر شمس الدین صاحب خلم کوتوالی اور دیگر معززین شریک تھے یہ جلسہ اندرون قلعہ ورنیا چاندنی چبوترہ کے متصل منایا گیا جہاں ایک پنڈال تیار کیا گیا تھا۔ جلسہ کا آغاز مشاعرہ سے ہوا جس میں جناب منعم، مرزا، مائل، حبیب، عطا، نقیج نے اپنا غیر طرحی کلام سنا کر جلسہ کو محظوظ فرمایا۔ آخر میں صدر آرائے بزم عالیجناب نواب صاحب بہادر کی نظم "نجارہ ل" پڑھی گئی جو کیفیت پر منطبق تھی مشاعرہ کے خاتمہ پر مولوی غلام معین الدین صاحب رکن تشہیر نے شاخ کی کارگزاری کی سالانہ رپورٹ سنائی۔ مولوی سید تاج الدین صاحب منشی فاضل نے "نذر عقیدت" کے عنوان سے ایک مضمون سنایا جس میں نواب صاحب بہادر کے تابناک عہد کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ مولوی شہاب الدین صاحب نے اپنی تقریر میں اردو زبان کی اہمیت اور اس کی مختصر تاریخ بیان کی آخر میں نواب صاحب ممدوح نے شرکائے جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے کلیانی میں علمی مذاق کی ترقی پر اظہار خوشنودی فرمایا اور اکبر الہ آبادی کا ایک شعر پڑھ کر طلبہ کو ان پست و ذلیل ذہنیت سے بچنے کی بطور خاص نصیحت کی کہ وہ جب تعلیم سے بہرہ اندوز ہو کر نکلتے ہیں تو اپنے ان پڑھ اور غریب والدین کو نہ صرف حقیر نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں بلکہ انھیں والدین ماننے میں بھی تامل ہونے لگتا ہے۔ تقسیم اسناد کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

محمد عطا ... معتمد

[illegible] شعبہ نسواں [illegible] ہنگولی

ادارۂ ادبیات اردو شعبۂ نسواں [illegible] اضلاع [illegible] بوقت ۲ ساعت دن بمقام [illegible] مدرسہ [illegible] ہنگولی زیر صدارت محترمہ مسز [illegible] صاحب انصاری [illegible] تعلقدار منعقد ہوا اس جلسہ میں [illegible] سے زائد ہندو اور مسلم خواتین موجود تھیں۔ [illegible] صاحبہ کی تلاوت کے بعد حمیدہ بیگم خورشید معتمد شعبہ نسواں نے سالانہ رپورٹ سنائی خواتین اور طالبات نے تقریریں کیں اور اچھی اچھی نظمیں سنائیں۔ معتمد شعبہ نسواں نے [illegible] رپورٹ میں بیان کیا کہ یہ سارا کام عالیجناب ڈاکٹر [illegible] صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے جو اردو زبان کی ترقی اور اشاعت میں منہمک ہیں۔ ایک اور شخصیت محمد عثمان خان صاحب [illegible] کی ہے۔ صاحب موصوف ہی کی کوشش سے ۱۲ آذر [illegible] سے اس شعبہ کا قیام عمل میں آیا۔ تیسری اہم شخصیت محترمہ قمر النساء بیگم صاحبہ کی ہے جن کی صدارت اور نگرانی میں یہ ادارہ چل رہا ہے۔ یہی ہستیاں شکریہ کے قابل ہیں۔ گزشتہ سال کے نتائج حسب ذیل رہے اس سال اردو فاضل میں ایک شریک ایک کامیاب۔ اردو عالم، شریک ۵ کامیاب اردو دانی میں ۱۱ شریک ۱۱ کامیاب اس طرح نتیجہ ۹۰-۹۵ فیصد رہا۔ اس سال گزشتہ سالوں سے زیادہ طالبات شریک ہیں۔ [illegible] صاحبہ معتمد نسواں مرہٹی ہنگولی نے تعلیم نسواں کی اہمیت ظاہر کرتے ہوئے بیان کیا کہ اصلاحات کے تحت ملکی طبقہ نسواں کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے نمائندے منتخب کرنے ہوں گے۔ لیکن جب تک ہم تعلیم حاصل نہ کریں اور اتنی صلاحیت نہ پیدا کریں کس طرح اپنے طبقہ کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ زبان اردو ہر ہندوستانی کی ادبی زبان ہے کسی خاص قوم یا فرقہ کی نہیں۔ چنانچہ سر سپرو، مسٹر راج گوپال چاری، مسز سروجنی نائیڈو، [illegible] نہرو جیسی ممتاز ہستیاں بھی زبان اردو کی حامی ہیں [illegible] پر ہندو مؤلفین نے بھی بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔

میں ادارہ کی [illegible] کی شکر گزار ہوں جس نے شعبہ نسواں ہنگولی کے تحت بہت کچھ کام کیا ہے۔ محترمہ صدر جلسہ مسز نجم الدین صاحب انصاری نے اپنے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمایا کہ اس ادارے سے مجھے ذاتی دلچسپی ہے کیونکہ یہ ایک ایسی زبان کی ترقی میں مصروف ہے جو ہندو مسلمان دونوں کی مشترکہ ملکیت اور ان کے اتحاد کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ تقریر جاری رکھتے ہوئے محترمہ موصوفہ نے فرمایا کہ مجھے توقع ہے کہ شعبہ نسواں میں دوسری ادبی سرگرمیاں مثلاً مجلس مشاعرہ تصنیف و تالیف کی کوشش جاری کی جائے گی۔ سردست ہنگولی کی ایک جامع تاریخ کی تیاری کی جانب ادارہ کو توجہ کرنی چاہیے اس کے علاوہ خواندگی کی مہم کو تیزی کے ساتھ جاری رکھا جائے۔ ہماری بہت سی بہنیں لکھنا پڑھنا نہ آنے کی وجہ سے نہ صرف زمانے کی رفتار سے ناواقف ہوتی ہیں بلکہ گھریلو زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی اپنا نقصان کر لیتی ہیں۔ ادبیات اردو کے شعبہ نسواں کو چاہیے کہ گھر گھر پھر کر ان پڑھ لڑکیوں اور ماؤں کو لکھنے پڑھنے سے واقف کرائیں۔ مجھے توقع ہے کہ شعبہ نسواں اس کی جانب عملی قدم اٹھائے گا۔ میں خود اپنے فرصت کے اوقات کو اس خدمت کے لئے پیش کرتی ہوں امید کہ دیگر معزز خواتین بھی اس کی جانب توجہ کریں گی۔ آخر میں میں اعلیٰحضرت سلطان العلوم کے عمر و اقبال میں ترقی کی دعا کرتی ہوں جن کی بدولت دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔

تقسیم اسناد کے بعد کامیاب ہونے والی طالبات کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے بعد ازاں خواتین نے عصرانہ میں شرکت کی۔ بعد ختم عصرانہ صدر جلسہ نے بطور خاص شعبہ نسواں کی امداد کے لئے خواتین کی توجہ منعطف کرائی۔ فہرست مرتب کی گئی کر صدر جلسہ اور مسز حامد علی صاحب منصف نے ایک ایک روپیہ نقد عنایت فرمایا۔

حمیدہ بیگم خورشید

روداد قیام شاخ اہم پیٹھ

بصدارت جناب مولوی سید عارف الدین حسن صاحب ورم تعلقدار بتعلق ادارۂ ادبیات اردو قیام شاخ ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس منعقد کی گئی۔ ابتدا مولوی عارف الدین حسن صاحب نے اغراض و مقاصد ادارۂ ادبیات اردو بیان کئے۔ جناب مولوی محمد مرزا ابراہیم بیگ صاحب، جناب مسٹر بچا چاری صاحب وکیل تعلقہ اہم پیٹھ نے مستقر اہم پیٹھ پر قیام شاخ کی اہم ضرورت متحرک فرمائی۔ جس کی دیگر اصحاب نے بھی تائید فرمائی۔ اور باتفاق آراء مستقر اہم پیٹھ پر قیام شاخ منظور کی گئی۔ منظوری کے لئے صدر ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کو ترسیل نقل روداد جلسہ امروزہ تحریک کیا گیا۔ شاخ کے عہدہ داران و ارکان مجلس انتظامی بہ اتفاق آراء منتخب ہوئے۔

صدر۔ پنڈت ہنمنت راؤ صاحب مالوی کر تحصیلدار

شریک صدر۔ مولوی محمد ابوالقاسم صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی مجسٹریٹ ضلع

نائب صدر۔ مولوی مرزا ابراہیم صاحب وکیل۔

معتمد۔ پنڈت بچا چاری صاحب وکیل۔

ارکان انتظامی:۔ مولوی باقر نواز صاحب اورسیر تعمیرات

مولوی نصرت علی صاحب سب انسپکٹر آبکاری۔

مولوی حسن علی صاحب ... آفیسر تعمیرات رائے بندی

مسٹر ہمیا صاحب وکیل

مولوی احمد علی صاحب صدر مدرس

محمد عبدالمجید صاحب مددگار صدر مدرس

محمد علیخاں صاحب پیشکار تحصیل

یہ تحریک باتفاق آراء طے و منظور کر لی گئی کہ امتحان ... کے لئے مرکز اہم پیٹھ ہی قرار دیا جائے۔

روداد جلسہ سالانہ دار المطالعہ شعبۂ طلبہ نارائن کھیڑ

دار المطالعہ شعبۂ طلبہ کا پہلا سالانہ جلسہ عام زیر صدارت جناب راجہ ... بہادر صاحب جاگیردار ... شب مدرسہ وسطانیہ نارائن کھیڑ ... جلسہ گاہ کو شاندار پیمانہ پر سجایا گیا تھا ... اشخاص نے شرکت کی معززین و عہدہ داران ... شریک جلسہ تھے۔ جلسہ ہی صدر ... شروع ہوئی اور ارکان و صدر ... کیا اور ٹھیک ... ساعت شب تحریک و تائید صدارت کے بعد ... دکن سے جلسہ کا آغاز ہوا اور مولوی سید عبدالصمد صاحب نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ عبدالسلیم شمیم نے بیانات سنائے اور حسب ذیل ... نے مطالعہ پر تقریریں کیں۔ ابوالبرکات محمد سلطان الدین خاں صاحب حمید، اپا راؤ صاحب وکیل، ناگ لیا صاحب وکیل، اقبال احمد صاحب، عبدالغفار خاں صاحب، نذیر احمد صاحب ... میر محمد علی صاحب، ہنمانڈلو صاحب، عبدالقیوم صاحب، ... صاحب، عبدالسلیم شمیم اور مندرجہ ذیل اصحاب نے خوش الحانی کے ساتھ نظمیں سنائیں۔

عبدالسلیم صاحب خنجر، عبداللطیف صاحب عشق، عابد ... بیگ صاحب زار۔ خواجہ خلیل الرحمن صاحب عاشق، احمد محی الدین ... محمد قاسم صاحب شیدا۔ یوسف علی حسن صاحب۔ بعدازاں صدر محترم نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا علم و ادب کی ترقی کے لئے ایسی انجمن کی سخت ضرورت ہے تاکہ ادبی ذوق کو بڑھا کے احساس کو اعلیٰ معیار پر پہنچانے میں صحیح رہنمائی ہو سکے۔ یہی ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کے قیام کا بنیادی مقصد ہے اور اب تک کئی مفید کتابیں ملک کے سامنے پیش کر چکا ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ اب اس ادارے نے اپنے ملک کے طلبہ کی ذہنی تربیت کے لئے شعبۂ طلبہ قائم کیا ہے جس کی ایک شاخ نارائن کھیڑ میں بھی یہاں کے نوجوانوں نے قائم کی ہے جس کا مقصد طلبہ میں مضمون نگاری اور فن تقریر کی طرف توجہ دلانا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اردو ہندوستان کی مروجہ و مشترکہ زبان ہے اور روز افزوں ترقی پا رہی ہے۔ اور قوی امید ہے کہ ایسی انجمنوں کے باعث مزید ترقی کرے گی مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ ...

[illegible] کو کامل ذخیرہ اردو ادب [illegible] [illegible] سمجھتا ہوں کہ ہم [illegible] [illegible] کے ذریعہ کو بہار کباد دیتا ہوں اور [illegible] ہوا ہے۔ تقریب جاری رکھے جو آپ [illegible] دلی جذبات کا اظہار کرتا ہوں اور [illegible] ہوگا جو سب ہمارے آقا کے [illegible] حضرت جنت مکانی کی نیک صفات [illegible] ہم سب حضرت بندگان عالی ظلہ العالی شہزادگان [illegible] عمر و اقبال میں ترقی کی دعا کرتے ہیں۔

آخر میں آپ نے دارالمطالعہ شعبہ طلبہ عثمانیہ کمیٹی کی [illegible] پر گراں قدر صلہ عطا فرمایا اس کے بعد [illegible] نے معزز صدر و حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ [illegible] کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔

پیام عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب

شعبہ طلبہ عثمانیہ کمیٹی کے سالانہ جلسہ [illegible] اور وصول ہوا۔ میں آپ کے اس جلسہ میں ضرور شریک ہوتا لیکن بعض اہم کاموں کی وجہ سے ان دنوں میرا بلدہ میں رہنا بہت ضروری ہے۔ میں اپنی عدم شرکت کی آپ اور آپ کے جلسہ کے صدر راجہ [illegible] راؤ صاحب جاگیردار سے معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ آپ جیسے ہونہار نوجوان اپنے لائق صدر کی رہنمائی میں اردو زبان اور ادب کی سچی خدمات انجام دیں گے۔ اردو زبان ہندو مسلم اتحاد کا نشان ہونے کے علاوہ ہمارے ملک کی سرکاری اور آپ کے وطن کی مادری زبان ہے۔ اس کے تحفظ اور ترقی کے لئے کوشش ہر بہی خواہ ملک کا مقدس فرض ہے۔ آپ کے جلسہ کی کامیابی کے لئے میری بہترین تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

پیام جناب خواجہ حمید الدین صاحب شاہد

جناب نے اپنے شعبہ کے سالانہ جلسہ میں شرکت کی دعوت دیکر میری جو عزت افزائی فرمائی اس کے لئے میں آپ کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے انتہائی افسوس ہے کہ بعض ناگزیر وجوہ کی وجہ سے اس جلسہ میں شریک نہ ہو سکوں گا۔ آپ میری طرف سے اپنے صدر راجہ [illegible] راؤ صاحب جاگیردار سے معذرت چاہئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اردو زبان کے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے میں آپ کی تمام سرگرمیوں میں غائبانہ شریک ہوں۔ اور آپ کی ہر ایک تحریک سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ اردو زبان ہندو مسلم اتحاد کا نتیجہ ہے اور یہی وہ واحد ذریعہ ہے جو اہل ملک کو ایک دوسرے سے قریب تر کر سکتا ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ آپ نوجوان اپنے بزرگوں کی سرپرستی میں اپنی زبان کی سچے معنوں میں خدمت انجام دیں۔

ہندستانی تمدن

تاریخ ہند کے اکثر طالب علم پروفیسر ایشوری پرشاد کی ان قابل قدر کتابوں سے واقف ہوں گے جو انگریزی میں شائع ہو کر اونچے علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے تاریخ ہند کا مطالعہ ایک خاص نقطۂ نظر سے کیا ہے۔

ہندستانی تمدن اسی مصنف کی ایک ضخیم کتاب کا ترجمہ ہے جس میں انھوں نے ہڑپا اور موہنجودارو کے قدیم ہندی تمدن سے لیکر گپت خاندان کے تدریجی کارناموں تک کی عمرانی، مذہبی سیاسی اور فنی تحریکات کا تذکرہ کیا ہے۔ اگر ہم اپنی تاریخ کا مطالعہ اس کے پس منظر میں کرنے کے عادی ہو جائیں تو سب سے پہلے ہمارے سامنے جو چیز آئے گی وہ اس کی بوقلمونی ہے کس طرح مختلف قومی اور تمدنی قوتیں ملیں۔ ان میں ربط ضبط پیدا ہوا اور اس ربط ضبط نے رنگ برنگ کے رد عمل پیدا کئے اور پھر کس طرح ہزاروں برس کی عمرانی، مذہبی، سیاسی اور فنی تحریکوں نے مل جل کر مستقل تمدنی سرمایہ مہیا کرنے میں حصہ لیا۔ اگر ہماری نظر ان سب چیزوں کا احاطہ کر سکے تو تاریخ ہمارے لئے سب سے بڑا اخلاقی درس بن جائے۔

موضوع اس قدر ٹھوس ہے پھر بھی کتاب کے انداز بیان میں خشکی یا بوجھل پن نہیں۔

از رسالہ آجکل بابت ۱۵ جنوری ۱۹۴۵ء

عمارتِ ادارہ

نومبر کے سب رس میں عمارت ادارہ کی تعمیر کے لئے فراہمی رقم کی جو اپیل شائع ہوئی ہے اس کا ملک اور بیرون ملک میں فراخدلی سے خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ بلند دست اصحاب سرزمین دکن کے اس علمی اور ادبی مرکز کی تعمیر میں ادارۂ ادبیات اردو کا ہاتھ بٹا رہے ہیں ان کی فہرستیں رقموں کی تفصیل کیساتھ سب رس میں شائع ہوتی رہیں گی۔ اس سلسلے میں اردو کے بہی خواہوں کو یہ معلوم کرکے مسرت ہوگی کہ تعلقہ گنگا کھیڑ کے ایک جوان آبکاری نے اپنی قلیل تنخواہ میں سے ہر مہینے ایک روپیہ کا عطیہ دینے کا پیشکش اپنے حسب ذیل کارڈ کے ذریعہ سے کیا ہے۔

"حضرت قبلہ السلام علیک

بعد از قدمبوسی عرض ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ادارہ کی عمارت تعمیر ہو رہی ہے جسکے لئے رقم چندہ وصول کیجا رہی ہے۔ اگر ارباب ادارہ میری یہ گزارش قبول فرمائے تو میں ہر ماہ بغرض تعمیر عمارت ادارۂ ادبیات اردو اپنی تنخواہ سے ایک روپیہ ادا کرتا رہوں گا۔ جواب کا منتظر

خادم محمد برہان الدین اردو عالم
جوان آبکاری گنگا کھیڑ"

یہ کارڈ ادارہ کے ایک مخلص دوست اور سرگرم رفیق مولوی عارف الدین حسن صاحب ڈویژن آفیسر آبکاری کے نام آیا تھا جس کو انھوں نے حسب ذیل تحریر کیساتھ دفتر ادارہ پر ایصال فرمایا ہے۔

"مسٹر برہان الدین اردو عالم کامیاب جوان آبکاری ضلع پربھنی کا کارڈ ملفوف کر رہا ہوں کہ آپکے ادارہ کی تعلیم نے صرف مادۂ علمیت ہی نہیں بڑھایا بلکہ جذبۂ ایثار و خدمت گزاری ملک بھی پیدا کیا۔ میں اسے انتہا متاثر ہوا۔ جناب اس کا جواب انھیں راست عطا فرما دیں۔"

یہ تو حیدرآباد کے ایک غریب بہی خواہ اردو کا ایثار تھا اب بیرون ریاست کے ایک مخلص دوست کی تحریر کا اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"میں نے سوچا کہ اس موقع پر ادارہ کی کچھ خدمت کروں۔ لہٰذا میں نے طے کیا کہ جب تک ادارہ کی عمارت تعمیر نہ ہوگی اسوقت تک سالانہ پچیس ۲۵ روپیہ اپنی آمدنی سے اس فنڈ میں ادا کرتا رہوں گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اور ادارہ میری اس حقیر پیشکش کو قبول فرمائیں گے۔"

یہ مولوی [illegible] انصاری صاحب معتمد انجمن اشاعت اردو ناگپور کے خطوط کا اقتباس تھا اس کے ساتھ صاحب موصوف نے پچیس روپے کا چک بھی ایصال فرمایا ہے۔

ہم ان دونوں صاحب ایثار علم دوستوں اور اردو کے بہی خواہوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور متوقع ہیں کہ ادارہ کو ایسے ہی سیکڑوں بہی خواہ حاصل ہوں گے۔

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت		نام کتاب	صفحات	قیمت	
مس کی بیٹا ...	۸۰	•	[illegible]	[illegible] ...	۳۸	•	۴
مرکز شعر غالب ...	۹۳	•	۸	[illegible] کائنات ...	۶۸	•	۸
نظام الملک ...	۴۰	•	[illegible]	مطالع سخن ...	۱۴۴	•	۱۲
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	[illegible]	[illegible]	کیف سخن ...	۱۳۲	•	۱۲
[illegible] (۸ تصاویر)	۱۴۰	۱	•	[illegible] سخن ...	۱۳۷	•	۱۲
[illegible] جذب ...	[illegible]	۱	۱۲	سراج سخن ...	۱۵۴	•	۱۲
[illegible] ماں ...	۴۸	•	[illegible]	ایمان سخن ...	۱۴۰	•	۱۲
سید احمد خاں ...	۱۹	•	[illegible]	[illegible] سخن ...	۳۴	•	۱۲
[illegible] ...	۴۸	•	[illegible]	مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	•
[illegible] تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	[illegible]	دوم (۵۰)	۳۳۲	۵	•
[illegible] چھاؤں ...	۱۳۲	۱	[illegible]	[illegible]	۱۷۵	۱	•
[illegible] ...	۱۶۸	۱	[illegible]	نقد سخن ...	۲۴۸	۲	۸
[illegible] کرشمے ...	۱۱۲	۱	[illegible]	نذر ولی ...	۱۹۳	۲	•
[illegible] ...	۲۳۰	[illegible]	[illegible]	[illegible] و تبسم ...	۱۸۴	[illegible]	•
[illegible] اعظم [illegible]	۳۰۰	[illegible]	[illegible]	مشاہیر قندھار دکن	۱۴۵	۱	•
[illegible] ...	۱۶	[illegible]	[illegible]	[illegible] دنیا ...	۱۹۶	۱	•
[illegible] ...	۲۰۰	۲	•	[illegible] میں اردو	۱۱۲	۱	۸
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible] نامہ	[illegible]	۲	•
[illegible] ...	۹۵	[illegible]	[illegible]	[illegible] دکن ...	۱۵۴	۱	[illegible]
[illegible]	۴۰	[illegible]	[illegible]	[illegible] غالب	۲۴۰	۳	•
اردو کی پہلی کتاب	۵۱	•	[illegible]	[illegible]	۴۰۰	۳	۸
دوسری کتاب	۵۶	•	[illegible]	[illegible]	[illegible]	۱	۳
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	[illegible]	دفتری معلومات ...	۵۹	•	۴
[illegible] ...	۱۲۰	[illegible]	[illegible]	[illegible] اور فرہنگ	۳۸	•	۴
[illegible] ...	۹۴	[illegible]	۸	اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲
[illegible] تاریخ دکن ...	۱۴۴	[illegible]	[illegible]	نمود زندگی ...	۲۱۶	۱	۸
ہندوستانی تمدن ...	۳۳۰	[illegible]	۸	سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	[illegible]	۱۲
پودوں کی کہانی	۸۰	۱	[illegible]	میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۴	۳	۸
مرلقا ...	۱۰۰	[illegible]	[illegible]	[illegible] ...	۳۲	•	۳
پانی کی کہانی ...	۴۸	•	[illegible]	[illegible]	۱۱۳	•	۱۲
رسالہ طبیعہ	۳۱۰	۳	[illegible]	[illegible] ...	۱۵۰	۱	۱
[illegible] گوہریں ...	۴۰	[illegible]	[illegible]	[illegible] (۱۷) تصاویر	۱۱۸	[illegible]	۸
[illegible] ادب اردو	۱۷۶	[illegible]	[illegible]	[illegible] ...	۱۲۸	۱	۸
[illegible] شاعری	۱۸۴	[illegible]	[illegible]	[illegible] (۴) تصاویر	۸۰	•	۱۰
[illegible] سخن	۹۴	[illegible]	[illegible]	[illegible] دکنی ...	۱۴۸	•	[illegible]
یوسف عادل [illegible] قید فرنگ میں	۸۹	۱	•	[illegible] کا [illegible] ...	۱۶۸	۱	•
[illegible] اقبال ...	۲۷۹	۲	۸	[illegible]	۴۴	•	[illegible]
آریائی زبانیں ...	۱۰۴	۱	•	[illegible] ...	[illegible]	•	۸
نظام علی خاں ...	۳۲	•	[illegible]	ادارہ [illegible] ۱۹۴۳ء میں	[illegible]	•	۸
تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	[illegible]	ناصر الدولہ	۳۴	•	[illegible]
عرب اور عربستان ...	۵۶۰	•	۱۰	افضل الدولہ ...	۳۲	•	[illegible]
				نواب میر محبوب علی خاں	۴۳	•	[illegible]

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
[illegible] بیگم
[illegible] سکینہ بیگم [illegible]

سب رس

جلد ۸ — بابت اپریل ۱۹۴۵ء — شمارہ ۴

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔

قرآن السعدین | یہ اخبار سررشتہ تعلیمات [illegible] کی [illegible] ہوکر شائع ہوتا تھا۔ [illegible] اس کی دوسری جلد [illegible] جس پر ۱۸۴۸ء درج تھا سیہ اخبار پر حسب ذیل عبارت درج رہتی تھی۔

"قرآن السعدین

نمبر (۲۲) جلد ۲ قیمت ماہواری دو روپیہ اور پیشگی دس روپیہ سالانہ اور گیارہ روپیہ ششماہی مورخہ ۲۳ اگست یوم شنبہ ۱۸۴۸ء عیسوی"

اس کا حجم عموماً (۱۲) صفحات ہوتا تھا کبھی کبھی ایک دو صفحات کا ضمیمہ بھی شامل کر دیا جاتا تھا۔ اس اخبار میں تمام ہندوستان کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ علمی، تاریخی اور سائنسی مضامین کو بھی بطور خاص جگہ دیجاتی تھی تصویریں بھی شریک رہتی تھیں جو لیتھو میں خوبصورت چھپتی تھیں۔ فلکیات، نباتات، حیوانات وغیرہ پر اکثر اشاعتوں میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھا گیا ہے۔ اس کی افادیت کے بارے میں جلد دوم نمبر (۲۵) میں صفحہ (۲۴۹) پر جو عبارت درج ہے اس کا اقتباس یہ ہے:-

> "قرآن السعدین کو جاری ہوئے دو سال گزرتا ہے۔ دھرم نارائن اس کا مہتمم یا تو سکالر یا ماسٹر مدرسہ دہلی کا ہے۔ حال کی نسل کے بہبود اور ترقی کے واسطے جیسے مفصل کل اخباروں میں سے میری دانست میں وہ بہت بہتر ہے...... اس کی زبان میں آورد ہے آمد نہیں باعث اس کا یہ ہے کہ اس کے مضامین انگریزی سے

اردو میں ترجمہ کئے جاتے ہیں۔ میں اس اخبار کو ہمیشہ بڑی [illegible] کے ساتھ [illegible] پڑھتا [illegible] کے پڑھنے کے قابل ہے۔ الخ [illegible]

اب ہم یہاں اس اخبار کے صفحہ ۳۴۰ تا ۳۴۱ بابت ۱۱ اگست ۱۸۴۸ء کی عبارتیں نقل کرتے ہیں۔

بیان نباتات کا

نباتات ایسی قسم کے اسجار دیکھنے میں آتی ہیں جو کبھی ہندوستان میں دیکھنے نصیب نہیں ہوتے۔ ثعلب ایک قسم کی نباتات ہے جو ہندوستان میں جاکر بہت قیمتی ہے اور گران قیمت سے بکتا ہے یہ ایک قسم کی گھاس کے جیسا اس کے درخت کے ٹکڑے ہیں یہی ثعلب ہندوستان میں عطاروں کے ہاتھ یہاں کے لوگ بیچتے ہیں وہ ثعلب جو اصل ولایت سے آتی ہے اس میں اور اس میں بہت فرق ہے لیکن بسبب شکل و شباہت کے تمیز نہیں ہو سکتی۔ ایک بوٹی اسجار ایسی دیکھنے میں آئی کہ اس میں زہر اس قدر ہوتا ہے جیسا کہ بچھو یا سانپ کی کاٹنے میں ہوتا ہے اس کا نام بچھو ہے اس بچھو کے درخت کی یہ صورت ہے کہ وہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک مادہ دوسرا نر، مادہ کا درخت چھوٹا ہوتا ہے۔ قریب آدھ گز کے اور نر بہت بڑا ہوتا ہے اگر اس کے پتے کسی کے ہاتھ کسی کا لگ جائے فوراً ہاتھ پر آبلے پڑ جائیں اور تکلیف ایسی ہوتی ہے جس طرح بچھو کے کاٹنے میں ہوتی ہے۔ اور یہ ہاتھ میں اسی طرح کی ایذا کرتی ہیں۔ ۴ تاریخ جولائی کو [illegible] میں میرے ہاتھ اس بوٹی کا پتا لگ گیا تھا اسی وقت آبلے پڑ گئے اور تکلیف اور سوزش اس قدر تھی کہ برداشت نہ کر سکتا تھا غرض کہ دوسرے روز تک ہاتھ [illegible] رہا

[illegible] کے خشک [illegible] کیا قدرت
[illegible] پھپھک میں [illegible] اور ختم
[illegible] اور [illegible]
[illegible] ہے اس [illegible]
[illegible] بیان [illegible] اس کے لکھے
[illegible]

[illegible] درخت [illegible] کے

[illegible] زبان اندلس میں
[illegible] زبان میں [illegible]
[illegible] فارسی میں انجرہ [illegible]
[illegible] ہندی میں [illegible]
[illegible] میں [illegible]

ماہیت اس کی

ہو ایک قسم [illegible] ہے پتا اس کا نیم کے پتے
سے [illegible] ہوتا ہے [illegible] پھوڑنے کا نٹے [illegible] روئیں
کے اس کے پتوں اور ٹہنیوں پر ہوتے ہیں اگر بدن
آدمی پر لگ جائے اسی وقت سوزش اور جلن اور خارش
پیدا ہو جائے پھول اس کا زرد ہوتا ہے تخم اس کا زرم براق
[illegible] تخم السی کے ہوتا ہے بہتر وہ ہے جو تگین [illegible] ہو۔

طبیعت

اول درجہ میں اور تیسرے میں گرم و خشک دوسرے
درجہ میں [illegible] ہے۔

افعال و خواص اس کے

یہ [illegible] اخلاط [illegible] بلغم وغیرہ کو لطیف کر دیتا ہے
[illegible] ہے .... دو
بہت [illegible] پسینہ بہت لاتی ہے۔ [illegible] اور شمس

[illegible] کہ [illegible] کو [illegible]

....

.... کے ہو منہ پر [illegible] ہیں ان کی کاٹ ذائل
[illegible] اگر شہد [illegible] ہے۔ اگر [illegible]
[illegible] ہو اس کے [illegible] اگر [illegible] تو اس [illegible]
کا [illegible]
[illegible] اس کے [illegible]

بیان حیوانات و حشرات الارض کا

اب میں بعض حیوانات کا لکھنا چاہتا ہوں لیکن قبل
اس کہنا ہے کہ [illegible] وہ [illegible] پہاڑ [illegible]
سے چاہوں اور لفظ [illegible] زبان پر لاؤں۔ واضح ہو کہ [illegible]
پہاڑ پر ایسے کثرت سے ہوتے ہیں جن کو [illegible] کہہ سکیں۔
قد یہاں کے مچھروں کا برابر [illegible] ہوتا ہے۔ [illegible] ان کے برابر
[illegible] ہوتی ہیں یہ وقت جلانے چراغ کے [illegible]
گھر میں گھس آتے ہیں بعض وقت بہ سبب ان کے ہجوم کے
چراغ گل ہو جاتا ہے۔ پسو اس پہاڑ پر اس کثرت سے
ہیں جس کثرت سے موسم برسات میں درمیان ہندوستان
کے حلوائیوں کے مکانوں پر مکھیاں جمع ہوا کرتی ہیں اسے
زیادہ ہر ایک کپڑوں میں موجود ہوتے ہیں بہ سبب ان کے
نیش زنی کے نیند نہیں آتی۔ کوئی کپڑا ایسا نہیں رہتا جس
میں حضرت پسو کی فوج کا گزر نہ ہو۔ اسی واسطے بعض
آدمی رات کے سونے کے واسطے تھیلی سلواتے ہیں اور
تھیلی میں گھس کر سوتے ہیں جب حضرت پسو سے
بچ سکتے ہیں اگر شام کے وقت مکان میں جھاڑو
[illegible] جمع کر لو یہ تکلیف صاحب لوگوں کو نہیں ہوتی۔ ہمارے [illegible]
اس آفت ناگہانی میں گرفتار رہتے ہیں کیونکہ ان کے مکان
بہت اچھی طرح پر واقع ہیں۔ ہندوستانیوں کے مکان [illegible]
بجز چھپروں کے اور کچھ نہیں ہے۔ چونکہ یہ بیماروں کے [illegible]

بقیمت گراں ہندوستان میں بکتے جاتے ہیں اسی لئے
مفت ہر ایک آدمی کے بدون خواہش پہنچ جاتی ہے مفت
ہم آدمیوں کا ملن پہنچے کو ہیں۔ واسطے ادائے حاجت
بشری کے جو شخص جنگل میں جاتا ہے یا غار میں اترتا
ہے دو چار چونک کر خون بہا آتا ہے۔ سانپ اس پہاڑ
میں کوڑیالے بہت دیکھنے میں آئے اژدہا بھی بہت
ہیں ایک اژدہا کہ قد اس کا قریب دو بانس کے اور
دل اس کا دو وانگ مدور قریب ہمارے بنگلے کے رہتا
ہے۔ بسبب عدم فرصت کے اتنا ہی حال لکھا گیا جو
خدمت عالی میں بھیجتا ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ بوقت
فرصت بہت حال ضروری مع حال نباتات اور حیوانات
کے مشرح لکھ کر عرض کروں گا۔ الراقم کریم الدین از مقام
کوہ منصوری۔

اس اخبار کے صفحہ (۴۷۹) مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۸۴۸ء
میں ایک نئے رسالہ "خیرخواہ ہند" کا تعارف کرایا گیا ہے جو لالہ
رام چند مدرس علوم انگریزی مدرسہ دہلی ماہانہ شائع کرتے تھے
صفحات (۵۰) اور چندہ ماہانہ ایک روپیہ تھا۔ یہ رسالہ ہم کو
دستیاب نہ ہو سکا لیکن اس اخبار میں اس رسالے کے بعض مضامین
کو نقل کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس رسالہ میں بھی
سائنسی مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ ہم یہاں ان کے اقتباس
درج کرتے ہیں:-
"جاننا چاہیے کہ فقط وہ علوم جن سے انسان کی راحت
اور نیکی زیادہ ہو سکے وہی قابل تحصیل اور فکر اور تامل کرنے
کے ہیں منجملہ ان کے ریاضیات اور طبعیات اور سیاست
مدنی اور اصول قوانین اور علم اخلاق اور تاریخ اور معرفت طبیعی
اور طب وغیرہ......"
"حکمائے متقدمین نے یہ دیکھ کر کہ آفتاب ہر روز مشرق
سے طلوع کر کے مغرب میں غروب ہو جاتا ہے یہ قیاس کر لیا کہ
وہ گرد زمین کے گردش کرتا ہے خلاف اس کے حکمائے متاخرین
نے بہت سے تجربات سے قیاس بالا کے برعکس ثابت کیا......
باستعانت اور باتوں کے ثابت کیا کہ زمین آفتاب کے گرد
بیضوی مدار میں گردش کرتی ہے......"

اخبار نمبر (۴۲) مورخہ ۲۲ [illegible]
ماسٹر رام [چندر] کی تصنیف "عجائبات روزگار" [illegible]
ہوئے ان کی کتاب کے صفحہ (۱۲۰) کی عبارت نقل کی ہے
جس کا اقتباس یہ ہے:-
"سات ستارے اس قدر بڑے ہیں کہ بعض
ان میں کے زمین سے ذرا چھوٹے [illegible]
وہ ستارے جو ذرا ذرا سے آسمان پر چمکتے
ہوئے معلوم ہوتے ہیں فی الحقیقت تمام
مانند آفتاب کے ہیں اور ان کے گرد بہت سے
سیارے مثل کرۂ زمین کے گردش کرتے
ہیں اور ان سب سیاروں میں مخلوقات
کی کسی نہ کسی طرح کی بستی ہے......"
صفحہ (۴۹۶) اور (۴۹۰) پر "فرد تقسیم منافع
مطبع العلوم منافع فیصدی ایک روپیہ یکم دسمبر ۱۸۴۷ء لغایت
آخر اگست ۱۸۴۸ء" کی سرخی کے تحت حصہ داروں کے
نام مع حصص و منافع درج ہیں جن میں سے حسب ذیل قابل ذکر ہیں:
"مسٹر سرنجر صاحب، مفتی صدر الدین خاں صاحب،
رائے رام سرن داس صاحب، مولوی مملوک علی صاحب، لالہ
رام کشن، الطاف حسین، ماسٹر نور محمد"
صفحہ (۴۹۶) پر ایک اور اخبار "صدر الاخبار" کا
ذکر ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں بھی کیمیائی مضامین شائع
ہوتے تھے۔ اس عبارت کا اقتباس یہ ہے:-
"صدر الاخبار و تاریخ الافکار مورخہ چہارم اپریل
ماہ حال کے مطالعے سے گزرا اس میں ثبوت اختلاف شکل عروسی
کا نتائج افکار لالہ منولال صاحب اسسٹنٹ سول انجنیئر سے مندرج
ہے...... اس میں شک نہیں کہ اختلاف مذکور لالہ منولال
و صاحب مہتمم صدر الاخبار کے ملاحظہ سے نہ گزرا ہوا اور اس
انھوں نے اپنی ہی فکر سے نکالا ہو مگر اظہار اس امر کا کہ وہ
کسی کتاب میں نہیں ہے اس بات پر دال ہے کہ انھیں ان
کتابوں پر نظر نہیں کیونکہ اگر صاحب موصوف نے تحریر اقلیدس
انگریزی جو باہتمام کلکتہ بک سوسائٹی کے ۱۸۳۲ء میں طبع ہوئی
ہے ملاحظہ کی ہوتی تو وہ اس امر کو نہ فرماتے......"
(باقی آئندہ)
خواجہ حمید الدین

ادبی شاہکار کی تخلیق ماہیت کے لئے تخلیق حیات
[illegible] ایک راز سربستہ ہے۔ حیات کی ادنیٰ ترین اور
[illegible] خلیہ ہے۔ ماہرین کیمیا بآسانی خلیہ کی
تحلیل [illegible] عناصر ترکیبی میں کر سکتے ہیں۔ یہ عناصر نوعیت
کے اعتبار سے [illegible] ہوتے ہیں جن سے بے جان اشیاء
ترکیب پاتی ہیں۔ عمل میں لا کسی وقت کہ ان عناصر کو اسی
کی نسبت سے جو خلیہ میں پایا جاتا ہے ترکیب دیا جا سکتا
[illegible] اصل خلیہ نہیں بلکہ ایک خلیہ نما جسم ہوتا ہے جس میں
حیات کی صفت قطعاً مفقود ہوتی ہے۔ چونکہ سائنس کے
اساسی اصول مانع ہیں کہ حیات کو روح یا ایک غیر مادی
اور فوق الفطرت جوہر مانا جائے، اس لئے مجبوراً ماہرین
سائنس اسی مفروضہ میں پناہ لیتے ہیں کہ کسی نہایت بعید
زمانہ میں حرارت اور فضائی حالات کا ایسا نادر اجتماع اتفاقاً
واقع ہوا کہ ان کے تحت ہی ترکیب پیدائش حیات کا باعث
ہوئی اور ان حالات کا مجموعہ پھر اسی صورت میں نہ واقع
ہوا ورنہ پیدا کیا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے اب حیات اس
عناصر کی کسی مصنوعی ترکیب سے پیدا نہیں کی جا سکتی۔ ماہرین
تنقید [illegible] اعلیٰ شاہکار کی کیفی تحلیل بآسانی اس کے صفات ترکیبی
میں کر سکتے ہیں، وہ اس کی پائندہ دلکشی اور اثر و جاذبیت
کا راز اس کے اسلوب بیان، طرز انشاء، زبان کی شستگی، جذبات
کی لطافت، خیالات کی رفعت، موضوع کی عظمت اور اہمیت
میں تلاش کرتے ہیں۔ اس کے رونما ہونے کے اسباب و علل
کا [illegible] مصنف کی فطری قابلیت، سابقہ تجربات اور اس کی
ذہنی تشکیل میں حصہ لینے والے عوامل خاص طور پر عصری
روح میں [illegible] تے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اتنی تحلیل و
تدقیق کے بعد بھی ادبی شاہکار ایک معمہ ہی بنا رہتا ہے۔
ایسے ادبی شاہکار بھی پائے جاتے ہیں جن میں تنقیدی
نقطۂ نظر سے نقائص اور خامیاں بھری نظر آتی ہیں مگر

جن کی طاقتور کشش سے کوئی سنجیدہ مزاج نقاد انکار نہیں
کر سکتا۔ یہ کشش شاید ان نقائص ہی کے اندر اجتماع کا نتیجہ ہو۔
بہرحال اگر ہم حقیقی روح ادب کے متلاشی ہیں تو ہمیں
ایسی دوسرے قبیل کے شاہکاروں کا جو فنی آرائش و
تزئین کے حشو و زوائد سے معرا ہیں بہ نظر غائر مطالعہ
کرنا چاہیے۔ فن تنقید کی کسوٹی پر پرکھے ہوئے شاہکاروں
میں یہ روح ہوتی ضرور ہے مگر اتنے دبیز حجابوں کے اندر
کہ اس کا مشاہدہ امر محال ہے۔ اسی نکتہ کی توضیح کے لئے میں
ایک ایسی کتاب کی مثال لیتا ہوں جس کو ادبی شاہکار کہتے
ہوئے مجھے مطلق تامل نہیں ہوتا اگرچہ نقادان ادب اس کو
ایک سرسری نظر ڈالنے کی بھی شاید زحمت گوارا نہ کریں۔
کتاب کا نام "نشتر" ہے مگر اصل میں وہ نشتر نہیں جو
صرف ہلکی چوکے لگاتا ہے بلکہ ترکش ہے جس کا ہر تیر پڑھنے
والے کے دل میں گھر کئے بغیر نہیں رہتا۔ سیدھا سادہ مختصر
سا افسانہ ہے۔ تشبیہ و استعارہ کی چاشنی ہے نہ صنائع و
بدائع کی رنگ آمیزی۔ اشخاص جو اس میں حصہ لیتے ہیں
دنیا کی مشہور و معروف ہستیاں نہیں بلکہ متوسط طبقہ کے
معمولی افراد ہیں [illegible] کسی خاص غیر معمولی
صفت یا کمال [illegible] واقعات جو بیان کئے
گئے ہیں تاریخی اہمیت رکھنے والے حالات نہیں بلکہ انہی افراد
کی روزمرہ کی خانگی زندگی سے متعلق ہیں۔ مگر ہر واقعہ ان
اشخاص کی سیرت کے اندرونی پہلوؤں کو اس طرح روشن
کر دیتا ہے جس طرح برق کی چمک ایک لمحہ کے لئے گرد و پیش
کی اشیاء سے پردۂ ظلمت اٹھا لیتی ہے۔ جس زمانہ کی یہ
کتاب پیداوار ہے اس پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنی ضرور
ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ روح عصری کا اثر کس حد تک اس کی
تشکیل کا ذمہ دار ہے۔ یہ زمانہ اٹھارویں صدی کے اواخر
یا انیسویں صدی کے آغاز کا ہے۔ جب کہ تنزل و ادبار کی
گھٹائیں ہندوستان پر اور خاص طور پر مسلمانان ہند پر
چھائی ہوئی تھیں۔ اولوالعزمی اور بلند حوصلگی سرے سے

غالب تھی۔ قوائے عمل شل ... کے سرچشمے خشک ہو گئے تھے
تصوریات پر صرف ایک رنگ غالب تھا۔ سہل انگاری
کا رباب زندگی سے صرف ایک سُر سنائی دیتا تھا۔ تن آسانی
عدل و دماغ کے رگ و ریشے میں انحطاط کی سمیت سرایت
کر چکی تھی۔ شمشیر و سناں کی جگہ طاؤس و رباب نے چھین
لی تھی۔ سیاست اور کشور کشائی سے توجہ ہٹ کر ادنیٰ قسم
کے عیش و عشرت پر مرکوز ہو گئی تھی۔ منتہائے نظر زندگی
کا آرام اور معراج تمنا حظِ نفس تھا۔ ایسے ناساز گار
اور ناساعد زمانے میں انسان اپنے ذاتی کمال سے
کتنی ہی پرواز کرے اعلیٰ معیار تک اس کی رسائی محال ہوتی
ہے۔ قوم کی عام پستی کسی ذی کمال فرد کو بھی ابھرنے کا موقع
نہیں دیتی جس طرح موسم خزاں میں کوئی ایک پودا بھی
بار ور نہیں ہو سکتا۔ ان ناموافق حالات میں اس چھوٹی
سی کتاب نے جنم لیا۔

مصنف ایک معمولی سیدھا سادا شخص ہے جس کی
سادگی سادہ لوحی کی حد تک پہنچ گئی ہے جن معاملات کو وہ
بیان کرتا ہے ان کے مضمرات پر اس کی نظر نہیں پڑتی جس
موقع میں خود کو پاتا ہے اس کی نزاکتوں سے بے خبر رہتا ہے۔
کسی گہرے حکیمانہ نکتہ کا ... اظہار کر دیتا ہے کہ
گویا اس کا ذہن گہرائی میں جانے کی قابلیت ہی نہیں
رکھتا۔ ایک ماہر فن ادیب جن استادانہ چالوں اور ہنر
مندانہ تدبیروں سے ناظرین کے دل کو موہ لینے کی کامیاب
کوشش کرتا ہے مصنف ان سے نابلد ہے۔ اس کی
نظر صرف ظاہر پر پڑتی ہے۔ مگر جو اسے نظر آتا ہے بلا کم و
کاست پیش کر دیتا ہے۔ اس طرز نگارش سے اگرچہ اس کے
فن اور ذہانت و رسائی کی قدر ہمارے دل میں گھٹ جاتی
ہے مگر اس کے خلوص اور ذہنی دیانت داری کی قدر بہت
بلند ہو جاتی ہے۔ کسی جگہ بھی ہمیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ حقیقت
کے اصلی خط و خال پر انشار پردازی کے رنگین نے پردہ ڈال
دیا ہے۔

کتاب آپ بیتی ہے اور مصنف خود ہی اس کا ہیرو بھی ہے
غالباً ادب کی مشکل ترین صنف ہے اور اس ...
بچا کر چلنا پڑتا ہے چونکہ وہ خود مرکزی مقام رکھتا ہے ...
اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور ذاتی تعصبات اور ...
میں اصل حقیقت مسخ شدہ نظر آتی ہے۔ اس کی کوشش
دانستہ یا نادانستہ یہی ہوتی ہے کہ اپنے عیوب کی پردہ پوشی
کرے۔ اور اپنی خوبیوں کو خوب نمایاں اور بڑھا کر کے ظاہر
کرے۔ مصنف کی صاف دلی اور طبعی انکسار نے اسے ان
کانٹوں میں الجھنے سے بچا لیا ہے وہ اپنے محاسن کا ذکر کرتا
تو ہے جانچ کے بغیر جس کی وجہ سے ناظرین یہ تذکرہ گراں نہیں
گزرتا اور بعض اوقات وہ اپنی کارگزاریوں کا بیان اس طرح
سے کرتا ہے کہ ناظرین کے تفنن طبع کا باعث ہوتا ہے۔ زمانہ
حال کے آپ بیتی لکھنے والے جنھوں نے آزاد خیالی
اور صاف گوئی کے مکتب میں تربیت پائی ہے عموماً ایک
دوسری غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں جو پہلی غلطی کی ضد ہوتی
ہے۔ وہ جس کو ہم فخر معکوس سے منسوب کرتے ہیں یہ لوگ
اپنے عیوب اور خطاؤں کی کھلم کھلا بے باکی اور دیدہ دلیری
سے تشہیر کرتے ہیں اور اپنی بداعمالیوں کو مزے لے کر بیان کیا
کرتے ہیں۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنی صاف گوئی
اور رائے عامہ سے بے پروائی کا اثر ناظرین کے دل میں
بٹھا دینے پر تلے ہوئے ہیں اور اپنے جذبۂ خود نمائی کی تشفی
صاف سیدھے طریقے سے نہیں بلکہ چھپی ہوئی عیارانہ چال
سے کر رہے ہیں۔ مصنف کا دامن اس فخر معکوس کے دھبے
سے بھی پاک ہے۔ وہ اپنی لغزشوں کا اظہار ندامت و انکسار
کے ساتھ کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے قدرتاً اسے ہماری ہمدردی
حاصل ہو جاتی ہے۔ قصہ کی ہیروئن کوئی نامور شہزادی
یا امیرزادی نہیں نہ وہ کوئی باکمال عالی مرتبت خاتون ہے۔
اس کا تعلق سماج کے اس بدقسمت طبقے سے ہے جس
کے متعلق عام انسان وقعت و ہمدردی کے نہیں بلکہ نفرت
اور حقارت کے جذبات محسوس کرتے ہیں۔ کوئی واقعہ نفس

[illegible] گر ایسے حالات میں نہیں رکھا جاتا کہ
[illegible] کی ہمدردی حاصل کرنا ممکن
[illegible] ضروری ہے۔ گر قصے کا کمال ہے کہ ابتدا
[illegible] بے حد طاقت پیدا ہو رہی ہے دین کے قبضہ
[illegible] جاتی ہے اور آخر تک اس کیفیت پر اس کی
[illegible] میں تھا۔ ہر وقت کی وقت ہر قدم پر ہمارے
[illegible] جاتی ہے اس کا دل غیر معمولی طور پر حساس
ہے۔ [illegible] محبت کی اس میں بے پایاں استعداد ہے۔
اس کے [illegible] کی لطافت اور ذہن کی نزاکت خراج تحسین
حاصل کرنے میں کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ وہ ایک درخشاں
و تاباں نگینہ ہے جو ایک بھدی اور بدرنگ انگوٹھی میں جڑا
[illegible] اور ہماری توجہ اس کی حسن و خوبی پر اس مضبوطی سے
مرکوز ہو جاتی ہے کہ اس کے گرد و پیش کے معمولی کر [illegible] پیدا کرتے
ہیں ہمارے شعور میں راہ ہی نہیں پاتے۔ اس کی سخن فہمی
مرقع فارسی۔ نکتہ رسی۔ بذلہ سنجی۔ شیریں کلامی خوش گفتاری
[illegible] سب سے بڑھ کر ایک اعلیٰ نصب العین سے اس کی
عقیدت و وابستگی ناظرین کے قلوب میں احترام و محبت کا ہیجان
پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کا انجام حزنیہ پر ہوتا ہے۔ اور
[illegible] ہے کہ یہی انجام اس کی شگفتہ صفت طبیعت سے ایک
[illegible] مطابقت رکھتا ہے۔ خانگی زندگی کی پرسکون راحتوں
اور خاموش خوشیوں سے مستفیض ہوتے تصور کرنا
ہمارے لئے سخت دشوار ہے۔ شعلہ جل کر ہی ختم ہوتا ہے۔
سوز سے نجات پانا اس کے لئے ممکن نہیں۔ جس قسم کا شعلۂ
عشق اس قلب میں بھڑک رہا تھا اس کی آخری منزل
سکون نہیں موت ہی ہو سکتی تھی۔ اور کون کہہ سکتا ہے ممکن
ہے جس کو ہم آخری منزل باور کرتے ہیں وہ بھی ایک فرودگاہ
بے منزل ہو۔ اگر اس کا انجام عام قصوں کی طرح تاہل اور
خانہ داری کی زندگی پر ہوتا تو شاید ہمیں ایسا ہی عجیب معلوم ہوتا
کہ گویا ہم برق کو محل فانوس میں جاگزیں دیکھ رہے ہیں۔
یا [illegible] کو بانسری سے سن رہے ہیں۔

کتاب میں اشعار کثرت سے ہیں مگر چونکہ حسن شاہ اور
خانم جان کی زندگی ایک سلسل پر ترنم نظم معلوم ہوتی ہے اور
اشعار اس سے کچھ اس خوبی سے ربط رکھتے ہیں کہ قطعیات اور
کا کہیں احساس نہیں ہونے پاتا۔ بہت سے اشعار ایسے
بھی ہیں جو عام طور پر متداول ہیں اور کثرت استعمال سے پامال
ہو گئے ہیں مگر حیرت ہے کہ جب ہم انہی کو اس قصہ میں
پڑھتے ہیں تو ہم ان کو ایک نئی تازگی زیادہ گہرے معنی اور
خوش گوار تلازمات سے معمور پاتے ہیں گویا ہم ان شعر
کو پہلی مرتبہ پڑھ رہے ہیں اور ان کی حسن و خوبی کا اسی
لئے ادراک کر رہے ہیں۔ زیادہ تر اشعار حافظ سے لئے گئے
ہیں۔ اور یہ ایسا ہی چاہیے تھا اس لئے کہ حافظ کا رنگ
تغزل کچھ ایسی شوخی اور جاذبیت رکھتا ہے اور اس کے
اشعار قلب انسانی کی گہرائیوں کا اس طرح آئینہ دار ہیں کہ
اس کی مثال کسی اور شاعر میں ملنی مشکل ہے۔ دیوان
حافظ کی شرحیں ان گنت ہیں اور شارحین نے کبھی اپنے
خیالات ان میں ٹھونسنے اور کبھی دور کے معنی ان سے
کھینچ نکالنے میں ان تھک کوششیں کی ہیں۔ یہ کتاب بھی
ایک اعتبار سے اشعار حافظ کی شرح ہے جو ایک انوکھے
انداز سے کی گئی ہے۔ تڑپتا ہوا دل اور نازک حسیات
رکھنے والے دو حقیقی انسان اپنی واقعی زندگی سے اس کی
تفسیر کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ہر مقام حافظ کے کسی
نہ کسی شعر کی توضیح و تشریح کرتا اور اس کے مجرد خیال
کو مقرون صورت میں پیش کرتا ہے۔ طوالت کے خوف
سے صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔
حسن شاہ اپنی سادگی یا سادہ لوحی سے خانم جان کو
کھری کھری سنا دیتے ہیں۔ خانم جان رنجیدہ ہو جاتی ہے سہ

گل بہ گفت کہ از راست نہ رنجیم ولے
ہیچ عاشق سخن تلخ بہ معشوق نہ گفت

یہ بے رخی سے ہٹ جاتی ہے تو وہ حیران اور متعجب ہو جاتے
ہیں سہ

آن ترک پری چہرہ کہ دوش از بر ما رفت
آیا چہ خطا دید کہ از راہ خطا رفت

دوسرے موقع پر حسن شاہ خواستگار معافی ہوکر جاتے ہیں۔

تا منفعل نہ گشت بجانہ نہ بخشش
می آرم اعتراف گناہ نہ بود ۔ ۔ ۔

خانم جان کے چہرے سے خفگی مترشح ہے۔

دوش می آمد و رخسارہ برافروختہ بود
تا کجا باز دل غمزدہ سوختہ بود

اور لوگ موجود ہوتے ہیں۔ اظہار ندامت برملا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اپنے سر کا سایہ اس کے قدموں پر ڈالتے ہیں۔ کیا اشارہ پردازی کا ایک دفتر بھی اس سے زیادہ اور موثر پیرائے میں احساس ندامت کو ظاہر کر سکتا ہے۔

وہ اسو قت سایہ پر لات رسید کرتی ہے۔

رسم عاشق کشی و شیوۂ شہر آشوبی
جامۂ بود کہ بر قامت او دوختہ بود

گو حسن شاہ کو عتاب میں الفت کی جھلک نظر آتی ہے۔

گرچہ می گفت کہ زارت بکشم می دیدم
کہ نہانش نظرے با من دل سوختہ بود

بہت جلد عارضی عتاب پر دائمی الفت غالب آجاتی ہے اور مصالحت ہو جاتی ہے۔

گر ز دست زلف مشکینت خطائے رفت رفت
ور ز ہندوئے شما بر ما جفائے رفت رفت
گر دل از غمزۂ دلدار بارے برد برد
در میان جان و جاناں ماجرائے رفت رفت

حسن شاہ طلبگار نظر عنایت ہو کر کہتے ہیں۔

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

وہ بظاہر بے اعتنائی مگر بباطن کمال دلجوئی سے ایک الائچی ان کی طرف پھینک دیتی ہے۔

با صبا در چمن لالہ سحر می گفتم
گفت حافظ من و تو محرم ایں راز نیم

بے معرفت مباش کہ در من یزید عشق
اہل نظر معاملہ با آشنا کنند

کتاب میں بعض خطوط بھی ہیں جو حسن شاہ ... کی باہمی مراسلت کا نتیجہ ہیں۔ خطوط میں ... کا رنگ غالب ہے۔ القاب مقفی پر شکوہ اور طول ... کی ایک طولانی زنجیر معلوم ہوتا ہے۔ عام ادبی ... جن کی آرائش و زیبائش پر ان کی انشا ... قوت صرف کردی ہے مگر ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ... حسن شاہ کے تخیل کی پیداوار ہوتا اور وہ انشا پردازی کے میدان میں اپنے حسب مرضی تگ و تاز کرسکتے تو وہ ... سے عاری اور لفاظی سے معمور ہوتا۔ ... کی طرح بے مقصد لفاظی اور بے معنی سخن سازی اس کی امتیازی خصوصیت ہوتی۔ مگر ایک پاک ہستی کے پاک عشق کی بدولت اور پر خلوص غم کے طفیل سے انہی کے داغ کی پیداوار ایک ادبی شاہکار ہے جو خاص وعام کے لئے مساوی طور پر ایک ... قوت کشش رکھتا ہے۔ وہ حقیقی معنی میں زندگی اور حقیقی تجربے سے معمور زندگی کی ایک کاوش ہے۔ کتاب ایک داستان غم ہے۔ وہ ستارۂ الم ہے اور غم والم سے ہر انسان گھبراتا ہے مگر عجیب اور بظاہر متضاد حقیقت ہے کہ غم انسان کے لئے جو کشش رکھتا ہے مسرت میں نہیں پائی جاتی۔ اکثر زندہ جاوید افسانے الم انگیز ہی ہیں۔ طربیہ سے تھوڑی دیر کے لئے انسان دل بہلا لیتا ہے مگر حزنیہ اس کے دل پر گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے اور اسے بلند سطح پر اٹھا دیتا ہے۔ اور اس کے جذبات کا تزکیہ کرتا ہے۔ مسرت کی کنہ تک انسان پہنچ جاتا ہے مگر غم کی کنہ اس کی دسترس سے باہر ہے۔ غم اگر حقیقی عظمت رکھتا ہے تو انسان اس کے آگے حیران اور ششدر اور مبہوت ہو کر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے جذبی انداز میں احترام بھی شامل ہوتا ہے۔ وہ احترام جو ایک ... فہم انسانی حقیقت ہی پیدا کر سکتی ہے۔ شاید مسرت کے مقام سے غم کا مقام قلب کائنات سے قریب تر ہے اس کا ثبوت ...

بہ شہیداں کہ اندر ایں ہمہ خونیں کفناں
از سر مستے بعل حکایت کن و بیں ...

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

١

[illegible]

([illegible])

ادبی [illegible] کی نظریات

[illegible] زبان میں صحیح قسم کے تنقیدی ادب کی ابتداء بہت بعد میں ہوئی ہے۔ اس لئے کہ ادب اور شاعری [illegible] پر جو کتابیں لکھی گئی رہیں ان کے لئے زیادہ تر فارسی زبان کو استعمال کیا گیا ہے حالانکہ ان کتابوں کے مصنف خود اردو کے شاعر تھے اور ان میں سے بعض تو میر تقی میر اور میر حسن جیسے باکمال استاد سخن بھی ہیں۔

یہ بات ہے کہ بعض شعراء نے اپنے کلام میں نقد شعر سے متعلق بہت اچھی بحثیں کی ہیں اور اس موضوع پر سب سے پہلے گولکنڈہ کے ملک الشعراء ملا وجہی نے آج سے تقریباً ساڑھے تین سو سال قبل اپنی کتاب "قطب مشتری" کے دیباچے میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ وضاحت کی ہے اور اس کے بعد کے کئی شاعروں مثلاً ابن نشاطی، ملک الشعراء غواصی، میر تقی میر، حاتم نے بھی اپنے کلام میں نقد شعر کے اصول پیش کئے لیکن یہ سب نظم کے پیرایہ میں تھا اور ضرورت شعری کی خاطر یہ شعراء مجبور تھے کہ شاعری کے عام اسلوب سے سرگرداں نہ ہوں اسی لئے ادبی تنقید کی نظریات کے ارتقاء میں ان کے اس قسم کے اشعار سے زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ مجبوراً ہمیں نثر کی کتابوں کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے۔

اردو نثر میں ہماری شاعری کا پہلا تذکرہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل مرزا علی لطف نے مرتب کیا تھا اور یہ تذکرہ بھی ایک اور فارسی تذکرے "گلزار ابراہیم" پر مبنی ہے لیکن لطف نے ترجمہ نہیں کیا بلکہ تالیف کی یعنی "گلزار ابراہیم" کے مصنف نواب علی ابراہیم خاں کی مختصر اور مجمل عبارتوں کو مرزا علی لطف نے اپنی ذاتی معلومات اور تحقیق و کاوش کی بنا پر اس شرح و بسط کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے کہ اکثر و بیشتر مقامات پر جہاں علی ابراہیم صرف دو چار سطریں لکھ سکتے تھے علی لطف نے دو چار صفحوں کا اضافہ کیا ہے۔ اس طرح علی لطف کا تذکرہ گلشن ہند بجائے خود ایک جداگانہ کتاب بن گیا ہے اور اس کا سنہ تالیف [illegible] سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں اگرچہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی تحریک پر فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں سہل اور آسان اردو نثر لکھنے کا آغاز ہو چکا تھا لیکن علی لطف کی عبارتیں قدیم اردو نثر کی طرز میں بالعموم مقفیٰ اور مسجع ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی دو عبارتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ اردو میں پہلے پہلے ادبی تنقید کا کیا ڈھنگ تھا اور اس کی نظریات کس قسم کی اصطلاحوں پر مشتمل تھی۔

دہلی کے ایک ابتدائی شاعر محمد شاکر ناجی کے سلسلے میں علی لطف لکھتے ہیں:-

"محمد شاہ فردوس آرامگاہ کے وقت میں اس نے شہرت پائی ہے اور بطور قدما کے طرز ایہام پر بہت کم طبع آزمائی ہے۔ خوش طبعی اور ظرافت سے بیشتر سروکار رکھتا تھا اور عالم کی ہجو کرنا شعار رکھتا تھا۔ شیوۂ قدیم میں صاحب دیوان ہے اور وضع سابق میں شاعر خوش بیان۔"

اردو کے سرتاج شعراء میر تقی میر کی نسبت علی لطف نے یہ رائے ظاہر کی ہے:-

"غرض اس تردد سے زبان قلم کی اور خامہ سے مدعی رقم کی مراد یہ ہے کہ ناقدردانی سے اہلیا کی اور ناسمجھی سے اہل دنیا کی اب بازار سخن سازی اس درجہ کاسد ہے اور ہوائے فہرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد کہ میر سا شاعر جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا اور جادو طرازی بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا وہ نان شبینہ کا محتاج ہے اور بات کوئی نہیں اس کی پوچھتا آج ہے۔"

یہ عبارتیں اصل میں اردو ادبی تنقید کا پہلا نمونہ ہیں اور ان کے مصنف نے فارسی عبارتوں کی تقلید میں

قافیے کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے اور اس لئے تصنع اور آورد کا دخل بہت زیادہ ہو گیا ہے ۔ اس کتاب کی ترتیب کے تقریباً پچاس سال بعد دہلی میں مولوی کریم الدین نے اردو شعرا کا ایک اور تذکرہ "طبقات شعرائے ہند" مرتب کیا۔ یہ بھی "منتخب لطف" کی طرح ایک اور کتاب پر مبنی ہے۔ لیکن اس میں بھی مولف نے اپنی جانب سے معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ یہ کتاب دراصل گارساں دتاسی کی "استوار دیلا لتراچور اینددوی اے ایندوستانی" کا ایک آزاد ترجمہ ہے۔ اس میں کریم الدین نے علی لطف کی طرح قافیوں اور سجع کا التزام نہیں کیا۔ بلکہ سادہ اور روزمرہ کی زبان استعمال کی ہے لیکن وہ بھی موجودہ ادبی اردو سے بہت مغائرت رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر اس کی بھی دو عبارتیں پیش ہیں۔ پہلے محمد شاکر ناجی ہی کے متعلق مولوی کریم الدین کی تنقید ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"بہت شوخ مزاج تھا ہر کسی کی ہجو کرتا تھا۔ راہ چلتے سے لڑتا تھا۔ ہر ایک سے بولتا تھا۔ اس سے ہر ایک کو نجات پانی مشکل تھی۔ بجائے ناجی کے اگر ہاجی تخلص اختیار کرتا تو میرے نزدیک بہت بہتر تھا"

"گلشن ہند" سے میر تقی میر کے متعلق رائے اوپر نقل ہو چکی ہے اب کریم الدین کی زبان سے اسی باکمال شاعر کا حال معلوم کیجئے:۔

"شعر اس کا تمام شعرائے سابقین و متاخرین سے بے شک بہت اچھا ہے۔ تمام فنون نظم وہ جانتا تھا۔ خصوصاً غزل اور مثنوی اس کی سب سے بہتر ہے۔ آج کے زمانہ تک تمام شعراء اس کے اچھے ہونے میں شک نہیں کرتے۔ یہ شاعر واقع میں ایسا ہے کہ اگر اس کو بادشاہِ شعراء کہیں تو بجا ہے۔"

ان دو کتابوں کی عبارتوں کے مقابلے سے معلوم ہوگا کہ پچاس سال کے عرصے میں اردو کی ادبی تحریروں میں کیا فرق پیدا ہوا تھا اور ادبی تنقید کی لفظیات کس طرح تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ یہ ایک عجیب اتفاق کی بات ہے کہ طبقات شعرا کے بھی ٹھیک پچاس سال بعد محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" لکھی جو اردو کی تیسری تنقیدی کتاب کہی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کتاب کی تالیف کے بعد ہی واقعہ یہ ہے کہ اردو تنقید نگاری صحیح معنوں میں عالم وجود میں آئی۔ محمد حسین آزاد نے زبان میں ایسی شگفتگی اور الفاظ کے مطالب میں ایسی قطعیت پیدا کر دی کہ تنقید لکھنے والوں کا راستہ بہت کچھ صاف ہو گیا۔ انھوں نے بھی محمد شاکر ناجی کی ہجو گوئی کا ذکر کیا ہے لیکن معلوم ہوگا کہ زبان میں کتنی علمیت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"تیز مزاج اور شوخ طبع بہت تھے۔ راہ چلتے سے الجھتے تھے اور جس کے گرد ہوتے تھے اسے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا"

میر تقی میر کی نسبت آزاد نے جو رائے ظاہر کی ہے اس کا نمونہ پیش کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوگا کہ آزاد نے ادبی تنقید کی لفظیات کو کتنا معین اور شائستہ بنا دیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"میر صاحب کی زبان شستہ، کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ ان کے خیالات کو جو کہ سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں محاورہ کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں۔

[illegible] ان میں بہ نسبت اور شعرا کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے"

[illegible] آزاد کے بعد حالی اور شبلی نے ادبی تنقید کی ایسی عمدہ خدمت کی کہ اب یہ ایک ایسی شاہراہ بن گئی ہے کہ [illegible] بخوبی دخل پا سکتا ہے۔ حالی اردو کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے انگریزی کی تنقیدی [illegible] کا اردو میں چربہ اتارا۔ ان کا مقدمۂ شعر و شاعری اردو ادبی تنقید کی پہلی کتاب ہے جس میں یورپ کے [illegible] خیالات سے استفادہ کیا گیا ہے اور ادبی تنقید کی نظریات اور اصول کے تعین کرنے میں مدد لی گئی ہے۔ [illegible] آزاد اور شبلی دونوں کے مقابلہ میں زیادہ سہل اور سادہ تھا اور اسی اسلوب میں انھوں نے مقدمۂ [illegible] کے علاوہ "حیات سعدی" "یادگار غالب" اور "حیات جاوید" جیسی بلند پایہ کتابیں مرتب کیں جن کے بعض حصے ادبی تنقید کے شہ پارے سمجھے جاتے ہیں۔

شبلی کا اسلوب بیان اپنی رنگینی اور عالمانہ شوکت کے باعث اردو کے تنقیدی ادب میں خاص کر قابل ذکر ہے کہ شبلی کے بعد سے اب تک اردو کے جتنے انشا پردازوں نے بھی تنقیدی ادب لکھنے کی کوشش کی وہ شبلی ہی کے اسلوب سے متاثر ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے نہ تو محمد حسین آزاد کی طرح روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی کے ذریعے سے اپنی تحریروں کو بامزہ بنانے کی کوشش کی اور نہ حالی کی طرح اتنی سادگی و صفائی اختیار کی کہ عبارتیں بے رنگ ہو جائیں۔ انھوں نے ایک درمیانی راستہ اختیار کیا اور صحیح معنوں میں اس علمی و ادبی تحریر کو معراج کمال پر پہنچا دیا جو آج اردو کی ایک معیاری علمی تحریر سمجھی جاتی ہے اور جس میں عہد حاضر کے بڑے سے بڑے ادیب اور نقاد مثلاً مولوی عبدالحق، مولانا سلیمان ندوی، نیاز فتحپوری، ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی اور قاضی عبدالغفار، اعلیٰ سے اعلیٰ تنقیدی مضامین اور کتابیں تحریر کر رہے ہیں۔

شبلی کی شعر العجم اور موازنۂ شعر و شاعری اردو کی وہ تنقیدی کتابیں ہیں جن کا اسلوب اور زبان ابھی عرصے تک نمونے کا کام دیتے رہیں گے۔ شبلی اور حالی کے اسلوب میں جو فرق ہے وہ ان مثالوں کے ذریعے سے واضح ہو سکے گا۔

حالی اپنے مقدمۂ شعر و شاعری میں اردو غزل کے عشقیہ مضامین کی بحث میں لکھتے ہیں :۔

"ذوق کی غزل میں عموماً زبان کا چٹخارہ اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے۔ مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔ ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے لیکن اس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے۔ داغ کی غزل میں باوجود زبان کی صفائی، روزمرہ کی پابندی اور محاورہ کی بہتات کے طرز ادا میں ایک شوخی اور بانکاپن ہے، جو اسی شخص کا حصہ ہے۔"

شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر میں صنائع و بدائع کی سرخی کے تحت میر انیس کی یوں مدافعت کی ہے۔

"میر انیس جس زمانے میں تھے شاعری کا مدار صنائع و بدائع پر رہ گیا تھا۔ مبالغہ، ایہام اور مناسبات لفظی یہی چیزیں شاعری کا کمال خیال کی جاتی تھیں۔ میر انیس کو انہی لوگوں میں رہنا سہنا تھا۔ انہی سے داد سخن لینی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ انہی کی قدردانی پر معاش اور ضروریات زندگی کا انحصار تھا۔ ایسی حالت میں کیونکر ممکن تھا کہ وہ

زمانہ کی [illegible] مسعود تقاد رہے۔ وہ جانتے تھے کہ جس شاعری کو وہ تذکرہ کرنا چاہتے [illegible] کے چہرے کے داغ ہیں۔ لیکن انہوں نے مجبوراً اس کو گوارا کیا۔"

اس مختصر سے مضمون کے اقتباسات سے ٹھیک طور پر پتہ نہیں چل سکتا کہ ادبی تنقید کا [illegible] کیا ہوتا چلا آیا ہے تاہم ان خاکوں سے ایک سرسری اندازہ ہو سکتا ہے کہ گزشتہ [illegible] میں ادبی تنقید کا اسلوب اور اس کی لفظیات کس طرح واضح ہوتی آرہی ہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر خود ایک چھوٹا سا کتاب لکھی جا سکتی ہے اور ممکن ہے کہ آئندہ ہماری زبان کا کوئی صاحب [illegible] پر محنت کرکے شرح و بسط کے ساتھ ان تمام مدارج کو قلمبند کرے جو اردو میں تنقید [illegible] اور جن کی بنا پر آج ہماری زبان اس قابل ہے کہ اس میں اچھی سے اچھی تنقیدی کتابیں اور مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔

اسی سلسلے میں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ جب سے اردو میں ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہوئی ہے ہماری ادبی تنقید کی لفظیات میں معتدبہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے لیکن چونکہ یہ تحریک ابھی ایک عبوری حیثیت رکھتی ہے اور اس کے لکھنے والے مغربی زبانوں کی بعض علمی و فنی اصطلاحوں کے لئے ہر وقت نئے نئے الفاظ گھڑ کر استعمال کر رہے ہیں اس لئے جب تک یہ عبوری دور ختم نہ ہو اور ترقی پسند ادب میں حالی اور شبلی جیسے اعلیٰ پایہ کے نقاد پیدا نہ ہوں اس وقت تک یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہماری ادبی تنقید کی لفظیات میں کس حد تک اضافہ ہوا اور یہ اضافہ ہمارے ادب اور تنقید پر کس قسم کا اثر ڈالے گا۔

سید محی الدین قادری زور

ہندوستانی تمدن

از پروفیسر ڈاکٹر ایشورا ٹوپا۔ ڈی فل ریڈر تاریخ تمدن ہند، جامعہ عثمانیہ۔

یہ تقریباً پانچسو صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جس میں فاضل پروفیسر صاحب نے ہندوستان کے قدیم تمدن کو دس ابواب میں شرح و بسط اور تحقیق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر اردو تو کجا کسی اور زبان میں بھی ایسی عالمانہ کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ جو لوگ قدیم ہندوستان سے واقف ہونا چاہتے ہیں اس کو ضرور پڑھیں۔ صفحات (۴۰۴) قیمت ۔

سب رس کتاب گھر سے طلب فرمائیے۔

سرگزشت حاتم

دہلی کے پہلے اردو شاعر اور استاد الشعراء شاہ ظہور الدین حاتم کے حالات زندگی اور منتخب کلام پر تبصرہ جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے نہایت ہی تحقیق و تلاش کے بعد عالمانہ انداز میں قلمبند فرمایا ہے اس چھوٹی سی کتاب کے ذریعے سے اردو کے ایک بڑے شاعر اور استاد الاساتذہ کی شخصیت اور کردار کے ایسے پہلو روشنی میں آجاتے ہیں جو ہر زمانے میں معیاری سمجھے جائیں گے۔ ان کی زندگی کے حالات پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حال اور مقال ایک ہی تھا۔ ان کی زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی تکلف اور تصنع سے پاک تھی۔ تذکرگان ادب اور محققین کے لئے [illegible] صفحات ۱۴۰ [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کالے پانی کا مفرور قیدی

(بسلسلۂ گزشتہ)

[illegible] جو تیر کی تلاش تھی۔ وہ عقاب کی طرح جیسی پر جھپٹا اور اس سے پیشتر کہ بیچارا [illegible] تیر پھر اس کے قلب کو چیرتا ہوا نکل گیا، جیسی کٹی ہوئی شاخ کی طرح زمین پر آرہا [illegible] کے بعد اس کا جسم بے حرکت ہو گیا، اس قدر طویل مدت کے بعد آج بھی اس بھیانک سین کی ہر ایک [illegible] ذہن میں اس طرح محفوظ ہے گویا یہ واقعہ کل ہی ہوا تھا۔

[illegible] کے بھائی ڈی ڈے نے تحریک کی کہ رات کے کھانے پر جیسی کی ٹانگ کا بھونا ہوا گوشت ضرور ہونا چاہیے [illegible] بھی فوراً قیدی، اس نے کہا "جیسی ایک درندہ تھا اور درندے کا گوشت کھایا جاسکتا ہے" [illegible] نے بھی اس کا ساتھ دیا، چنانچہ آدھ گھنٹے کے اندر اندر جیسی کا جگر ایک لکڑی میں چھید کر کباب [illegible] اور اس گروہ کے جوان کے لئے جیسی کی ٹانگ ہی کو جلا کر آگ تیار کی گئی، رات میں جب سب مل کر اس کو کھانے کے لئے بیٹھ گئے تو مجھ بھی طوعاً و کرہاً اس میں شریک ہوجانا پڑا اس لئے کہ انکار یا اعتراض کی مجھ میں [illegible] اور نہ اس کا موقع ہی تھا۔

ان واقعات کا سب پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ رات میں کسی نے بات چیت کی کوشش تک نہ کی، ہمارے ساتھیوں میں سب سے شقی القلب آدمی بھی اس منحوس دن کے ہیبت ناک واقعات کو اپنے ذہن سے بھلا نہ سکتا تھا، آزادی کی اس راہ میں ہم تین لاشوں کو اپنے پیچھے چھوڑ رہے تھے۔

دو دن کے مسلسل سفر کے بعد ہم افتاں و خیزاں امریکی ہندیوں کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں داخل ہوئے، امریکی [illegible] کی یہ آبادی دریائے مارونی کے کنارے واقع تھی اور یہاں ہمیں کھانے پینے کو کچھ مل بھی گیا لیکن سفر کی تکان سے چور ہو کر جب ہم بے خبر سو گئے تو ان ظالموں نے ہماری آمد کی اطلاع ولندیزی حاکموں کو دے دی چنانچہ جب آنکھیں کھلیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ چار ولندیزی سپاہی پستول ہاتھ میں لئے ہماری نگرانی کر رہے ہیں۔

اس مرتبہ مجھے پھر تادیبی کیمپ بھیج دیا گیا، جہاں میرا نام غیر اصلاح پذیر اشخاص کی فہرست میں درج ہو گیا قیدیوں کے اس بدقسمت گروہ کا تادیبی کیمپ چاروین میں واقع تھا جس جگہ سال کے بارہ مہینے ملیریا اور پیچش کا دور دورہ رہتا۔ اور جہاں تقریباً مادر زاد ننگے قیدی نیم وحشی انسانوں کی صورت میں مچھروں اور دوسرے [illegible] کیڑوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیئے جاتے۔ لیکن اس مرتبہ پھر اللہ نے مجھ پر فضل کیا۔ اس لئے کہ ایک نئے [illegible] کی وجہ سے جسے میں نے نہایت رقت آمیز خط لکھا تھا مجھے اسی دنوں کی سخت عقوبت کے بعد ایک اچھے مقام پر بھیج دیا گیا۔

فرانسیسی گیانا میں میری بود و باش کے دوران میں میں نے مزید دو مرتبہ بھاگ نکلنے کی ناکام کوششیں کیں۔ چنانچہ اس کی پاداش میں مجھے رائل کے جزیرے کو بھیج دیا گیا —— رائل اس کالے پانی کے ان تین خوفناک جزیروں میں سے ایک ہے جہاں جا کر کوئی قیدی زندہ واپس آنے کی توقع نہیں کرتے اس سلسلے کے [illegible] سینٹ جوزف اور ڈیولس آئیلینڈ (شیطان کا جزیرہ) ہیں جہاں سخت عادی مجرم اور قومی غدار رکھے جاتے ہیں۔

رائل کے جزیرہ میں مجھے لاکاسے اونڈ کی اس مشہور بارک میں داخل کیا گیا جہاں تعزیری بستی کے چھٹے ہوئے قیدی رکھے جاتے ہیں ان بارکوں کی زندگی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ان کا صحن تقریباً ہر روز

تازہ خون سے آلودہ رہتا۔ قتل اور خون یہاں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی اور نہ کوئی اس [illegible]
[illegible] قید خانے کے معاملات میں جھانک کر دیکھتے کہ کوئی نعش تو پڑی ہوئی نہیں ہے اور اگر [illegible]
مل جاتا تو کھینچ کر چپ چاپ سمندر میں پھینک آتے، اس لئے کہ ان سیکڑوں قتل کی وارداتوں [illegible]
آئے دن ہوتی رہتیں کب تک کوئی ثبوت مہیا کرتا۔ اکثر رات گئے اپنے کمرے کو واپس ہوتے ہوئے [illegible]
میں میں نے ایسی لاشیں روندی ہیں جن کے جسم سے ابھی تک گرم گرم خون جاری تھا اور اکثر [illegible]
برہنہ پیروں سے چپچپے خون کے دھبے چھڑائے ہیں۔

ان جزیروں میں کسی باہر کے آدمی کو آنے کی اجازت نہیں ہے چنانچہ سوائے بستی کے حکام کے [illegible]
بہت کم لوگوں نے اس جزیرہ کو دیکھا ہے۔ یہاں میں نے وہ عقوبتیں برداشت کیں جنہیں الفاظ بیان
نہیں کرسکتے، پھر بھی میری زندگی باقی تھی اس لئے کہ گو میرے اطراف لوگ دھڑا دھڑ مرتے رہتے اور
خون کی ندیاں بہتی رہیں، لیکن میں جیتا ہی رہا۔

اس کے بعد سینٹ جوزف کے جزیرہ میں مجھے قید تنہائی کی سزا ملی، ایک تنگ و تاریک [illegible]
جسے یہاں کے قیدی "سوکھی سولی" کہتے تھے مجھے رکھا گیا تھا، روشنی اور دھوپ سے [illegible]
ایک قیدی دن کے (۲۴) گھنٹے پڑا سڑتا ہے۔ یہاں اسے کوئی کام دیا جاتا ہے نہ کوئی کتاب پڑھنے
کو ملتی ہے اور سوائے سمندر کی موجوں کی مسلسل سسکیوں یا کسی بدنصیب قیدی کی [illegible] کے
اس کے کان کوئی اور آواز نہیں سن سکتے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اچھے خاصے ہوشمند [illegible] کو کچھ
دنوں میں مخبوط الحواس بنا دیا جاتا ہے تاکہ پریس یا اعلیٰ فرانسیسی حکام تک ظلم و ستم کی [illegible]
نہ سکیں اور اگر بفرض محال ان کی رسائی بھی ہو جائے تو وہ بآسانی دیوانوں کی [illegible]

اسی تادیبی قید خانے میں مسلسل چھ سال گزارنے کے بعد نومبر ۱۹۲۶ء میں مجھے پہلی مرتبہ کاکین
منتقل کر دیا گیا۔ اس عرصے میں مجھے کالے پانی کی اس زندگی کا کافی تجربہ ہو چکا تھا، میں کے علاوہ یہاں کے
نظام حکومت کے اندرونی حالات سے بھی میں بہت کچھ واقف ہو گیا تھا، مجھے معلوم تھا کہ کس طرح [illegible]
(۲۵) فرانک کی رشوت کے عوض قیدی بہت سا عیش و آرام حاصل کر سکتے تھے۔ کس طرح یہاں [illegible]
عہدہ دار سرکاری کپڑوں اور کمبلوں کو غیروں کے ہاتھ بیچ ڈالتے ــــــ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ سال
کے بارہ مہینے بے چارے قیدیوں کو تقریباً برہنہ رہنا پڑتا ــــــ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس بستی کے محافظ [illegible]
کے نام سے کیسی رنگ رلیاں منانے کے عادی تھے، اور سچ تو یہ ہے کہ اس قید خانے کی [illegible]
تکلیف دہ مشاہدے مجھے بغاوت پر آمادہ کرتے تھے، کیونکہ عادی سے عادی مجرم کا دل بھی [illegible]
دیکھ کر جو بے یار و مددگار قیدیوں کے ساتھ روا رکھی جاتیں برافروختہ ہو جاتا تھا، [illegible]
انسانیت کے تنزل یا اس دنیا کے اسفل السافلین کو دیکھنا ہے۔ ایک ایسی نوآبادی کا [illegible]
مقبوضات میں سب سے قدیم ہوتے ہوئے بھی سوائے [illegible] یا [illegible] کے [illegible]
کی تجارت نہیں کر سکتی، نپولین سوم کے زمانے میں جب اس نوآبادی کو بسایا گیا تو خیال [illegible]
گزارنے کے بعد قیدی اس نوآبادی میں آزاد کر دئے جائیں گے [illegible]
شادی بیاہ کر کے گھر بسا [illegible] فرانس کا [illegible]

[illegible] کا قانون نافذ کیا گیا تھا یعنی یہ کہ ہر مجرم کو قید سے آزاد ہونے کے بعد مساوی مدت تک [illegible] ہو کر رہنا پڑتا تھا۔

ایک عجیب [illegible] اس لئے کہ نوآبادی کا کوئی آدمی ان قیدیوں سے کسی قسم کا واسطہ رکھنا ہی [illegible] کہ یہاں کی دیسی عورتیں تک ان مجرموں سے شادی کرنے کو اپنی توہین خیال کرتی تھیں، فرانس [illegible] مجرموں کو بھی [illegible] دور دراز ممالک میں جا کر قسمت آزمائی کرتے اس نوآبادی کے نام سے نفرت [illegible] دنوں میں یہ حصۂ ملک نکبت بہیمیت اور بے آئینی کے لئے مثالی ہو گیا۔

[illegible] بے کاری بے راہ روی اور افلاس کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے اس قدر وسیع ملک [illegible] پچاس میل سے کم سڑکیں ہیں نہ کوئی تجارت ہے نہ کسی صنعت کا نام و نشان ہے نہ کوئی فیکٹری ہے [illegible] ہر مہینے ایک سامان سے لدا ہوا جہاز اس کے ساحل پر آ کر ٹھیرتا ہے اور اپنا بار اتار کر خالی ہی واپس [illegible]

[illegible] قبل سے ہی فرانسیسی حکومت کو اس نوآبادی کی ناکامی کا علم ہو چکا ہے چنانچہ ہر وہ گورنر جو یہاں [illegible] ہے اس کو ترقی دینے کی مقدور بھر کوشش کرتا ہے بعض کا فی الواقع چاہتے تو بعض کو کو پیدا کرنے کی سعی کرتے اور کئی گورنروں نے تو یہاں تک ہاتھ پاؤں مارے کہ فرانس سے لوگوں کو ترغیبیں دے دے کر بلوایا — لیکن یہ تمام [illegible] ہمیشہ نقش برآب ہی رہیں۔ اس دارالخلافے کی آبادی تقریباً گیارہ ہزار ہے جس میں (۰۰۰۰) کے قریب قیدی اور (۳۰۰) آزاد مجرم ہیں۔ قیدیوں کو بظاہر کافی آزادی میسر ہے اس لئے کہ دن بھر وہ شہر میں [illegible] پھرتے ہیں لیکن رات کو واپس آ کر انھیں کال کوٹھڑیوں میں بند ہو جانا پڑتا ہے۔

جزیرے میں اپنی بود و باش کے معاملات میں وہاں کے مفصل حالات قلم بند کرتا رہا اور بعد میں ان کاغذات کو نوآبادی کے نو وارد گورنر موسیو سیڈو کے یہاں راز میں روانہ کر دیا، میری یہ محنت اکارت نہیں گئی اس لئے کہ ان کاغذات کو دیکھ کر نئے گورنر کو مجھ سے دلچسپی ہو گئی اور جب مجھے کاین منتقل کر دیا گیا تو اس نے از راہ عنایت نوآبادی کے محافظ خانے کی ترتیب کا کام میرے ذمے کر دیا۔

[illegible] دفتر میں میں نے کئی ماہ تک سخت محنت سے کام کیا، ہزاروں مثلیں دیکھیں، کئی کتابوں، مضمونوں [illegible] مجرموں کی رپورٹوں کا تفصیلی مطالعہ کیا، نظم و نسق کی روداد، قیدیوں کی غذا، لباس یا دیگر سہولتوں کی فہرست اور طبی امداد کے بجٹ کی تفصیلیں پڑھیں اور ان سب سے جی کھول کر استفادہ کیا اور وہ مواد حاصل کیا جو بعد میں اس جہنم آباد کے رازہائے درون پردہ کے طشت از بام کرنے میں میرے کام آیا۔

[illegible] گورنر سیڈو کا بڑا مزاج تھا، اپنے زمانہ حکومت میں نوآبادی کی حالت سدھارنے کے لئے اس نے وہ سب کچھ کیا جو ایک حاکم کر سکتا تھا، لیکن نوآبادی کی کمیٹی ہر قدم پر اس کی راہ میں نئی رکاوٹیں پیدا کرتی رہتی تھی [illegible] اس کا وجود ایک رحمت سے کم نہ تھا، اس لئے کہ اس کے تبادلے کے بعد ہی مجھے دوبارہ قید تنہائی کی [illegible] سزا بھگتنے کے لئے رائل کے جزیرے کو بھیج دیا گیا یہاں میں نے اپنی قید کے سب سے بدترین تین سال گزارے۔

[illegible] جب فضا خاموش ہونے لگتی تو میں اندازہ لگا لیتا کہ رات آ رہی ہے اس لئے کہ اس غار نما کوٹھڑی میں جہاں [illegible] اندھیرا ہی رہتا، روشنی سے صبح یا شام کا اندازہ لگانا مشکل تھا، چنانچہ ہر روز جب سمندری پرندوں [illegible] مجھے آفتاب کے طلوع ہونے کا پتہ لگ جاتا تو میں کوٹھڑی کی دیوار پر اپنے ناخن سے ایک نشان بنا دیتا،

تاکہ اس طرح کالے دنوں کا حساب رکھنے میں سہولت ہو سکے۔

۳ نومبر [illegible] کو میں اس جہنم آباد میں میرے داخل ہونے کے ٹھیک پندرہ سال بعد کرسمس کے ... قفل میں مجھ کسی کے کنجی لگانے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور محافظ نہایت لاپرواہی کے ساتھ ایک دستاویز میرے حوالے کر کے چلا گیا، لیکن اندھیرے میں رہتے رہتے میری بصارت اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ میں اسے ٹھیک سے نہ پڑھ سکا، بہرحال معلوم ہوا کہ اس دستاویز کی رو سے میں آئندہ ایک "آزاد مجرم" تھا

آزاد مجرم! یعنی میں بے گھر بے در راستہ کے آوارہ کتے کی طرح زندہ رہنے کے لئے آزاد تھا، جنگل جنگل مارے مارے پھرنے اور درندوں کا شکار بننے کے لئے آزاد تھا، لیکن نو آبادی کی حدود اور کالونی کے دروازے دس سال کے لئے مجھ پر بند تھے — میں آزاد تھا — مگر دنیا میں نہ میرے لئے آذوقے کا کوئی سہارا تھا — نہ زندہ رہنے کی کوئی سبیل۔

میں نے بھی وہی پیشے اختیار کئے جو آزاد مجرم اپنے پیٹ کی آگ بجھانے اختیار کرتے ہیں۔ میں نے جنگل میں ایک جھونپڑا ڈال لیا اور یہاں رہ کر میں یا تو تیتریاں پکڑتا یا جنگل کے درختوں سے ربر جمع کر کے اس سے طرح طرح کے کھلونے تیار کرتا اور انھیں شہر کے کباڑیوں کے ہاتھ بیچ ڈالتا، اس نیم وحشی زندگی میں مجھ پر کیا کیا گزری اس کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا ہوں، بڑے دن کے تہوار پر اور کچھ نہ ملا تو میں نے طوطے بھون لئے، آزادی کی لو کے کیا ہو پر سال نو کا جشن اور ایسٹر کی عید پام کے گودے اور گوہ کے تلے پر منائی، میرا جسم چیچڑیوں اور جوؤں کا مستقل کیمپ بن چکا تھا اور میرے پیر جونکوں کے زخموں سے چھلنی ہو چکے تھے۔

روپے کی مجھے سخت ضرورت تھی اور میرے پاس ایک حبہ بھی نہیں تھا، اس لئے کہ اس عذاب سے چھٹکارا پانے کے لئے کم از کم ایک ڈونگی تو ضروری تھی اور ایک معمولی ڈونگی بھی سو فرانک سے کم میں نہ مل سکتی تھی اور پھر سمندر میں پندرہ روز کے راشن کے لئے پچاس فرانک تو خرچ ہو ہی جاتے۔

ایک روز میں سینٹ لارین میں بیٹھا ہوا اپنی قسمت کو رو رہا تھا کہ ایک سیاح نے جو موٹی سن ہیٹ پہنے ہوئے تھا، اشارے سے مجھے بلایا۔

"کیا میاں کوئی ایسا قیدی مجھے مل سکتا ہے جو انگریزی بات کر سکتا ہو؟" اس نے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں مجھ سے پوچھا۔

"تھوڑی بہت تو میں بھی بول لیتا ہوں" میں نے جواب دیا۔

"میں اس جزیرے میں ایک قیدی مسمی بل بی نائے کو تلاش کر رہا ہوں" اس نے انگریزی میں بات کرتے ہوئے دریافت کیا "یہ وہ شخص ہے جس کا تذکرہ "شیطانی جزیرے" کی مصنفہ بلاٹر نال نے اپنی کتاب میں کیا ہے (بات یہ ہے کہ کئی سال قبل جب اس خاتون نے اس جزیرے کی سیاحت کی تھی تو میں نے اپنے روزنامچوں کے مسودے چند فرانک کے عوض اس کے ہاتھ فروخت کر دئے تھے، چنانچہ اس مشہور ناول کی بنیادیں انھیں روزنامچوں پر رکھی گئی تھیں)

میں نے کہا "کہئے میرا نام ہی بل بی نائے ہے؟"

معلوم ہوا کہ یہ اجنبی کسی امریکی فلم کمپنی کے کرتا دھرتاؤں میں سے تھا اور یہ لوگ ایک ایسا فلم بنانے کی دھن میں تھے جس کا قصہ اس شیطانی جزیرے سے متعلق تھا اور اس میں ایک ایسا منظر بھی آتا تھا جس میں

[illegible] جیسے ملین [illegible] کر نکل بھاگا تھا، چنانچہ فلم کمپنی کے دیگر عہدہ داروں نے اس آدمی کو [illegible] تھا کہ وہ جزیرے کے حالات سے ذاتی طور پر واقفیت حاصل کر سکے۔
[illegible] "اگر کوئی قیدی اس مقام سے بھاگ نکلے تو وہ کونسا راستہ اختیار کریگا۔ [illegible] کیسی کیا دشواریاں پیش آئیں گی" وغیرہ وغیرہ۔

رات بھر میں اس کے سوالات کا جواب دیتا رہا، اس دوران میں میں نے اس آدمی کے لئے قید خانوں کے [illegible] کھینچ ڈالے، سڑک کے نقشوں کی تصویریں کھینچ کر دیں۔ غرض جس قدر بھی معلومات مجھ سے حاصل کی جا سکتی تھیں، اس کے ساتھ ساتھ میں اپنی پچھلی فراری کی ناکام کوششوں اور ذاتی تجربوں کو بھی بیان کرتا جاتا تھا جن کا اقتباس وہ اپنی ڈائری میں کرتا جاتا تھا۔

جب اجالا ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس کا طیارہ جو اسے اس جزیرے میں لایا تھا اُسے لے جانے کے لئے کھڑا ہے، لیکن جانے سے پہلے اس نے میرے ہاتھ میں (۲۰۰) ڈالر کے نوٹ رکھ دئے —— یہ رقم میں اپنی فراری کے چوتھے اقدام میں صرف کرنا چاہتا تھا۔

"اس مرتبہ تو میں آزاد ہو کر ہی رہوں گا"۔ نہ جانے کتنی بار میں نے اس جملے کو اپنے دل میں دہرایا۔

کئی دنوں تک میں اپنے ساتھیوں کی تلاش میں قید خانے کی بستی کا کونا کونا چھانتا رہا، مجھے ایسے لوگوں کی تلاش تھی جو نہ صرف جسمانی حیثیت سے فولاد کی طرح مضبوط ہوں بلکہ جن کے دلوں میں آزادی کی لگن بھی آگ کی طرح بھڑک رہی ہو، بہرحال بڑی تلاش کے بعد مجھے پانچ ایسے ساتھی مل گئے جو میری مطلب کے تھے اور خوش قسمتی سے ان میں کا ایک آدمی جہاں دیدہ ملاح بھی تھا۔

۱۰ مارچ ۱۹۳۵ء کی شب کو ہم ایک مقررہ مقام پر جمع ہوئے اور رات کی تاریکی میں ساحل کے ایک ویران مقام کی جانب روانہ ہو گئے، جہاں ایک چینی تاجر نے ہمارے لئے ناؤ کے چھپا رکھنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن جب ہم اس جگہ پہونچے تو ہم نے دیکھا کہ یہاں ایک بہت چھوٹی سی ڈونگی جو مطلوبہ ناؤ کی نصف بھی نہ ہوگی، بندھی ہوئی ہے اور اس میں رکھا ہوا سامان بھی اتنا نہیں ہے جتنے کے لئے ہم سے روپیہ لیا گیا تھا، ظاہر ہے کہ اس بدمعاش نے ہمیں دھوکا دیا تھا اور عین اس وقت جب ہمارے لئے قدم پیچھے ہٹانے کا کوئی سوال نہ تھا اس نئی افتاد سے میں پریشان ہو گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا گویا ہماری مہم شروع ہونے سے قبل ہی ناکام ہو گئی۔

لیکن نہ جانے وہ کونسی چیز تھی جو ہمیں واپسی سے روکتی تھی، ہم نے کہا "ہرچہ بادا باد" اور پھر اللہ کا نام لے کر کشتی پر سوار ہو گئے اور بہاؤ کے رخ چلنے لگے، دریا کے دہانے پر پہونچ کر ہمارے ساتھی ملاح شفلو نے کہا "اب ہم کو پال کھول دینا چاہئے" اور پھر وہ خود پتوار کا ڈنڈا سنبھال کر بیٹھ گیا۔

سچ جانئے معمولی حالات میں کوئی کوتاہ سے کوتاہ عقل انسان بھی اس قسم کے سفر کی جراءت نہ کرتا لیکن ہم پر آزادی کا بھوت کچھ ایسا سوار تھا کہ اس اقدام میں کوئی بڑے سے بڑا خطرہ بھی ہماری نظروں میں رتی برابر اہمیت نہ رکھتا تھا، رات بھر ہم اسی طرح اندھیرے میں کشتی کھیتے رہے اور جب صبح ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ ہماری کشتی بہت دور سمندر میں نکل گئی ہے اور ہمارا پیچھا کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔

میں نے ایک مٹی کے تیل کے ڈبے میں کوئلے جلائے اور اس پر چائے تیار کرنے لگا، یہی گھری چائے ہمارا صبح کا ناشتہ تھی، اس لئے کہ ہمارے ساتھ اس بدمعاش چینی نے جو سامان خورد و نوش رکھا تھا وہ بہت ہی کم تھا اور ہم اسے نہایت سخت ضرورت کے وقت استعمال کرنا چاہتے تھے، چنانچہ کسی نے بھی ناشتہ نہ ملنے کی

شکایت نہیں کی، بلکہ اسی سلامتی سے سیدھی کشتی چلائے کو ہم ہنس ہنس کر پینے لگے، ایسا معلوم ہوتا تھا
گویا کسی آزاد ملک کی [illegible] میں چند دوست صبح کے ناشتے میں مشغول ہیں
لیکن تیسری رات کے آتے آتے تک ہماری دوستی اس قدر پکی نہیں رہی جو صبح [illegible]
دینے والی روشنی اور نمکین پانی کے تھپیڑوں نے ہمیں چڑچڑا بنا دیا تھا، خیال کیجئے پچاس گھنٹوں تک
ہم ایک دوسرے سے لگے ہوئے دوستوں کی طرح پڑے میٹھی باتیں کرتے رہے تھے ——— لیکن اب ہر ایک
آدمی دوسرے کا عیب نکالنے لگا تھا، سمندر کی موجیں جو کہ بہت بے شور تھیں اس لئے ہم کوئی [illegible]
نہیں رکھ سکتے تھے، اور ہر آن کشتی کے الٹ جانے کا ڈر لگا رہتا تھا، افراتفری میں ایک پرشور موج
کے تھپیڑے سے میں اس قدر حواس باختہ ہوا کہ میرے ہاتھ سے سمت نما آلہ بے اختیار چھوٹ گیا۔ [illegible]
سمندر کی گہرائیوں نے اسے آناً فاناً نگل لیا، یعنی اس مصیبت کا ساتھ دینے والا یہ سہارا بھی [illegible]
چوتھے دن صبح ہوئی تو ہم سب بھیگ کر ختم ہو چکے تھے، ہمارے جسم بری طرح اکڑ گئے تھے، اور
بھوک پیاس سے ہمارا حال برا ہو رہا تھا، میں نے دیکھا کہ کشتی میں رکھی ہوئی پانی کی ٹانکی میں سمندر کا
پانی چلا گیا ہے، چنانچہ یہ تجویز ہوئی کہ اس کے کھارے پن کو دور کرنے کے لئے اس میں مجبوراً دودھ ملا دیا جائے
لیکن میرے ساتھی اس کا ایک گھونٹ بھی حلق کے نیچے نہ اتار سکتے تھے۔
"اب تو سلامتی اسی میں ہے کہ ہم واپس ہو جائیں" دادر نے کہا "کم از کم جنگل میں پانی
تو ملے گا۔ پیاسے مرنے سے تو پانی پی کر مرنا اچھا ہے"
"بھائیو! ہمیں نکل کر ابھی تین دن تو ہوئے ہیں" میں نے کہا "اور چلتے وقت ہی میں نے تم لوگوں
سے کہا تھا کہ ہم واپسی کا نام نہیں لیں گے، اگر ہماری کشتی ترینی ڈاڈ پہونچ گئی تو ہماری آزادی یقینی
ہے۔ لیکن اگر جزیرے پر کہیں بھی ہم نے اترنے کی کوشش کی تو ہماری دوبارہ گرفتاری کو کوئی چیز روک
نہیں سکتی اور اس کے بعد عمر بھر چھٹکارا ناممکن ہے۔"
اس طرح ہم دن بھر اور رات بھر لڑتے رہے اور ان جھگڑوں نے ہمیں اور بھی بدمزاج بنا دیا
"واللہ اب مجھ سے زیادہ سہا نہیں جاتا" بے برت نے کشتی کے ایک کونے سے چلا کر کہا "راستہ
بدل ڈالو، خواہ کچھ ہو ہم جزیرے پر ہی اتر جائیں گے"
"ٹھیرو!" میں نے دادر کو بادبان کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر کہا "تمہیں میرا حکم ماننا پڑے گا
میرے ہاتھ میں یہ پستول ہے اور اس میں چھ گولیاں ہیں، تم مجھ پر حملہ کر سکتے ہو لیکن یاد رکھو میں
اس کشتی میں کسی کو زندہ واپس نہیں ہونے دوں گا"
"بادبان کھینچ دو" بابرت نے میری دھمکی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے غصے سے کہا لیکن اسی وقت دادر بھی
میرے ہاتھ سے تفنچہ چھین لینے کی نیت سے میری طرف لپکا، مگر راستہ میں اس کی ٹکر شفو سے ہو گئی اور وہ دونوں
لڑھکتے ہوئے کشتی کے فرش پر آ گرے، یہ ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ کیا سکٹ کے چیخنے کی آواز نے ہم سب کو
گویا خواب سے بیدار کر دیا، وہ پکار رہا تھا "وہ دیکھو زمین! وہ دیکھو زمین!!" مجھے کوئی ساحل صاف نظر [illegible]
سب کھڑے ہو کر دیکھنے لگے لیکن میں اپنی جگہ سے نہ ہلا، یہ سوچ کر کہ کہیں مجھے غافل کرنے کی نیت سے یہ ترکیب
بھی نکالی نہ گئی ہو"
"او ہو یہ تو ترینی ڈاڈ ہی ہے" میرے ساتھیوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "[illegible] ادھر دیکھو"

[illegible] ہو سکتے ہیں" [illegible] میں نشان کی دکھلائی ہوئی سمت کی طرف نظریں اٹھائیں دو تھی [illegible] انداز میں [illegible] پہاڑوں کی چوٹیاں سبز اور زرد میں صاف نظر آرہی تھیں۔ ہمارے [illegible] جذبات [illegible] اس [illegible] کے ساتھ ہی ختم ہو گئے اور ہم فرط خوشی سے بچوں کی طرح ناچنے اور چلانے لگے۔

[illegible] دنوں کی طویل محنت کے بعد ہماری کشتی کو ساحل کا وصال نصیب ہوا، جب ہم قریب پہونچے تو [illegible] ساتھیوں نے [illegible] کو دکر [illegible] ہوئے ریتیلے ساحل پر جا نکلیں۔ لیکن وہ اس قدر کمزور اور ناتواں ہو چکے [illegible] چل نہیں سکتے تھے، بلکہ انھیں ریت پر گر مچھوں کی طرح رینگنا پڑ رہا تھا۔

[illegible] پر پہونچنے کے بعد ہم نے دیکھا کہ [illegible] کی ایک جھونپڑی میں دو ایک ہانڈیاں رکھی ہوئی ہیں اور ان میں [illegible] اور نمکین مچھلی بھری ہوئی ہے۔ ہم نے سمجھا کہ یہ اللہ کی دین ہے اور اپنی مٹھیاں بھر بھر کر کھانے [illegible] جب [illegible] جانوروں کی طرح پیٹ بھر کر کھا چکے تو تھکاوٹ اور نیند نے ہمیں آدبوچا —— جس کے بعد نہ معلوم کب تک ہم سوتے رہے۔

بہت دن چڑھے ہماری آنکھ کھلی تو ہم نے ایک گاؤں کا رخ کیا، یہاں کے انگریز حاکموں نے جو گیانا کے فرانسیسی شیطانوں سے نفرت کرتے تھے، ہمارا افسانہ نہایت ہمدردی سے سنا، ہمیں کھانا اور کپڑا دیا گیا اور جب ہم ایک دو روز آرام کر چکے تو ایک کشتی بھی یہ کہکر ہمارے حوالے کی گئی کہ اگر ہم چاہیں تو بھاگ کر کسی اور جزیرہ میں اپنی جانیں چھپا سکتے ہیں۔

[illegible] اور جون کو ایک انگریزی اگن بوٹ کے ذریعے ہماری کشتی کو کھینچ کر سمندر میں پہونچا دیا گیا، اس سے مدعا یہ تھا کہ ہم ان لاتعداد انگریزوں کے مقبوضہ جزیروں سے ہوتے ہوئے جو اس سمندر میں ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں میامی پہونچ جائیں۔

اس کے بعد کچھ دنوں تک تو ہم ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے تک سفر کرتے رہے لیکن آخری مرتبہ جب ہم نے ایک جزیرہ چھوڑا تو ہم سمندر میں بھٹک گئے، اور اس طرح چھے دنوں تک مسلسل بہتے رہنے کے بعد ہم نے یقین کر لیا کہ اب خدا ہی ہمیں کبھی ساحل کی صورت دکھلا سکتا ہے پھر ایک بار وہی اگلی مصیبتوں نے ہمیں آگھیرا ہماری غذا ختم ہونے لگی اور پانی کا قطرہ قطرہ بچایا جانے لگا، لیکن سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ ہم لوگ پھر ایک مرتبہ اپنا صبر کھونے لگے تھے،

[illegible] سے نکلنے کے ٹھیک سولھویں روز بعد ایک سمندری طوفان نے ہماری کشتی کو ایک ایسے ویران ساحل پر پھینک دیا، جس سے ہم واقف نہ تھے، کشتی ایکسپریس ٹرین کی رفتار کے ساتھ ساحل سے ٹکرائی اور ٹکرا کر الٹتے الٹتے بچ گئی، اس گڑبڑ میں ہمارا سامان سمندر کی موجوں کے حوالے ہو گیا اور ہم بے یار و مددگار گرم گرم ساحلی [illegible] دیئے گئے۔

اس آسمانی عذاب سے ہم سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ جنگل کے کسی نامعلوم گوشے سے چند امریکی ہندی تیر کمان اور برچھے لئے ہوئے ہم پر ٹوٹ پڑے، اور ہمارے رہے سہے سامان کا زبردستی جائزہ لینے لگے، جب ہم نے انھیں روکنے کی کوشش کی تو ان کی دھمکیاں سنجیدہ ہوتی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔ اس لوٹ مار میں انھوں نے ہماری ہر [illegible] ڈھیر کر رکھ دی اور جب واپس جانے لگے تو ہمارے کپڑے تک اتروائے۔

بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ لٹیرے' امریکی ہندیوں کی ایک خاص نسل سے تعلق رکھتے تھے جنہیں امریکہ میں "سیاہ کھانے والے ہندی" کہتے ہیں' بہرحال انھوں نے اپنی مہربانیوں سے ہمیں خلاصی دے دی۔ اس قدر بے حیا ضرور ہو گیا کہ اب نہ ہمارے پاس پہننے کے لئے تن پر ایک چیتھڑا ہی تھا نہ بھالو پر بیٹھنے کے لئے ایک کمان ع نے غم مند ہونے پر غم کا لا۔

گرم گرم تپتی ہوئی ریت پر ہم کسی نامعلوم مقام کی طرف چلنے لگے' اس سفر میں چار روز تک ہمیں کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔ راستے میں کبھی کبھی ہم چقماق کی مدد سے آگ روشن کر لیتے اور مینڈک یا کیکڑوں کو پکڑ کر ان پر بھون لیتے۔ یہی ہماری غذا تھی اور انھیں پر ہمارا گزارا تھا' راستے کی ناہمواری سے ہمارے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے اور ہمارے جسم مچھروں اور زہریلے کیڑوں کے کاٹنے سے سرخ ہو گئے تھے' لیکن اس پر بھی ہماری ہمتیں بندھی ہوئی تھیں اس لئے کہ اللہ کے فضل سے اب ہم میں کسی قسم کا جھگڑا یا مخالفت نہ تھی' محض خوف اور جان کے خطرے نے ہمیں متحد کر دیا تھا'

اس سفر کے چوتھے روز جب آفتاب غروب ہونے لگا تھا اور ہم رات کے بسیرے کے لئے چوطرفہ نگاہیں دوڑا رہے تھے' ہمیں کچھ فاصلے پر گھاس کی چند جھونپڑیاں نظر آئیں۔ ہم نے غور سے دیکھا تو ان کے سامنے ماہی گیروں کے بڑے بڑے جال بھی لٹکتے ہوئے نظر آئے' بھوک اور آرام کے اشتیاق میں ہم ان جھونپڑیوں کی طرف بے اختیار دوڑنے لگے اور جب ان کے قریب پہونچے تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ کیونکہ یہاں کوئی آدمی یا آدم زاد کا نام نہ تھا' ——— شاید یہ ماہی گیروں کی عارضی آرام گاہیں تھیں اور وہ اپنے شکار کی تلاش میں بحر سے پر چلے گئے تھے' بہرحال یہاں ہمیں ایک بڑی تامبیل جھونپڑی کی چھت سے لٹکتی ہوئی مل گئی اور جب ہم اسے آناً فاناً بھون کر چٹ کر چکے' تو لباس کی تلاش میں ان جھونپڑیوں کا جائزہ لینے لگے۔ مگر یہاں سوائے چند بوسیدہ چیتھڑوں کے کچھ نہ تھا اور ہم لباس کی کسی توقع سے ہاتھ اٹھا ہی چکے تھے کہ ایک ساتھی نے کسی جھونپڑی سے آواز دی' معلوم ہوا کہ اسے وہاں چند مچھلی پکڑنے والوں کے لنگے مل گئے تھے' اور انھیں پاکر وہ خوشی سے ناچ رہا تھا۔

پے برت نے کہا "کچھ نہ پہننے سے تو یہی لنگے غنیمت ہیں" اور پھر وہ انھیں ایسے شوق سے پہننے لگا جیسے کوئی غیر فرانسیسی اجنبی پیرس کے سلے ہوئے کپڑے پہن کر خوش ہوتا ہے۔ بہرحال اس لباس کا ایک فوری فائدہ تو ہم نے محسوس کیا وہ یہ کہ اب مچھر اور کیڑے ہم کو اس قدر دق نہ کرتے تھے۔

دوسرے روز اس ہیئت کذائی میں ہم مارے مارے پھر رہے تھے کہ کولمبیا کے سپاہیوں کی ایک ٹکڑی نے ہمیں دیکھ لیا اور پیٹ پکڑ کر قہقہہ مارنے اور ہنسنے لگے' ان میں سے ایک نے کہا "ارے یار ان داڑھی مونچھوں والی عورتوں کو اپنے یہاں ضرور لے چلنا چاہئے' کپتان انھیں دیکھ کر یقیناً خوش ہوگا۔ برسوں بعد ایسی مخلوق نظر آتی ہے"

ایک گھنٹے کے اندر اندر ہم کولمبیا کے ساحلی شہر سانتا مارتا پہونچا دئے گئے' ان سپاہیوں کے افسر نے ہمارے ساتھ بڑی مہربانی کا سلوک کیا' ہمیں کھانا کھلایا گیا اور کپڑے دئے گئے لیکن جیسا کہ ہم کو بعد میں معلوم ہوا فرانسیسی قونصل کو ہمارے آنے کی خبر بھی کر دی گئی۔

گلچیں

(باقی آئندہ)

اکبر الٰہ آبادی کے غیر مطبوعہ خطوط

مدین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی کے نام مشاہیر اردو نے وقتاً فوقتاً جو خطوط لکھے تھے ان کو ادارہ کی طرف سے مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی شاد و اقبال کے نام سے چھپ چکی ہے۔ اردو زبان کے مشہور شاعر اکبر الٰہ آبادی کے بھی خطوط اسی سلسلہ میں مرتب ہو چکے ہیں۔ ان میں سے چند خطوط ناظرین سب رس کی دلچسپی اور معلومات کی خاطر ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں۔

(۱)

الہ آباد۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۱۲ء

عالی جناب مدظلہ

اپنی خوش نصیبی پر نازاں ہوں کہ آپ سے امیر با توقیر اور صاحب روشن ضمیر اور عالم باعمل و مدبر اور حکیم صاحب شرح و تفسیر کے دل میں میری جگہ ہے۔ اگرچہ آپ وقت بیان مسائل توحید سے اپنی روحانی ترقی کرتے جاتے ہیں اور دنیاوی ترقی اس راہ میں چنداں مفید نہیں ہے تاہم ایسے آثار پائے جاتے ہیں کہ آپ کے ایوان دولت کی شمعیں روشن تر ہو جائیں۔

چند روز ہوئے آپ کے بھانجے صاحب نے سرفراز فرمایا تھا۔ سبحان اللہ ان کی قابلیت ان کے ولولے اور اخلاق سے دل خوش ہو گیا۔ بڑوں کے بڑے ہی ہوتے ہیں۔

دنیا سے میں ایسا دل برداشتہ ہو گیا ہوں کہ کیا عرض کروں۔

ہجر میں اس غم کے مجھ پر سانس لینا بار ہے
زندگی ظالم مگر اب تک گلے کا ہار ہے

اس مطلع سے تسکین ہوتی ہے۔

یہ عمر کب تک وفا کرے گی زمانہ کب تک جفا کرے گا
مجھے قیامت کی ہیں امیدیں جو کچھ کرے گا خدا کرے گا

اڈیٹروں سے ناک میں دم ہے۔ بلقانیوں کے ظلم کے خیال سے کہیں میری زبان سے نکل گیا تھا۔ ع

بحمد اللہ اب خون شہیداں رنگ لایا ہے

یہ اسی وقت کہا تھا جب صرف سرویا اور آسٹریا کی بحث تھی۔ دوسرا مصرع صاف تھا۔

اس قدر کیں سختیاں بلقانیوں نے بے گناہوں پر
بالآخر چرخ ان کے سر کو زیر رنگ لایا ہے۔

ایڈیٹر صاحب مساوات نے یہ اشعار اسوقت چھاپے جب اعلان جنگ منجانب بلقان ہو گیا۔ ان پر اعتراض ہو رہا ہے۔ اگرچہ مجھ سے ہنوز کچھ نہیں کہا گیا تاہم کلفت ہوتی ہے۔
اڈیٹر صاحب کی یہ بھی حرکت ہے کہ ان کے نام پرائیوٹ چٹھی آئی تھی۔ انھوں نے اس کو چھاپ دیا۔ خدا بلاؤں سے

جلد نجات دے۔ سوسائٹی کا تعلق خواہ مخواہ مجبور کرتا ہے۔ اگر تندرست ہوتا تو جنگلوں، پہاڑوں میں بھاگ جاتا [illegible]
کیا ہے۔

فکریں کبھی تھیں اس کی راحت مجھے بڑی ہو
اب کہہ رہا ہوں یارب تکلیف میں کمی ہو

آپ کا ساتھ ہوتا تو شاید عافیت میں گزرتی۔ لیکن بہت دوری ہے۔ خدا کرے شرف حضوری میسر آئے۔ دوبارہ مضامین تعمیل ارشاد میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ ذرا اطمینان خاطر ہو لے۔ اگرچہ یہی ظاہر ہے کہ

دل کی جو خواہش ہے وہ سامان ہونے کا نہیں
الغرض دنیا میں اطمینان ہونے کا نہیں

دعاگو
اکبر

(۲)

الہ آباد۔ ۲۷ اکتوبر ۱۴ء

عالی جناب

دونوں نظمیں دلکش ہیں۔

دشمن کو محبت سے مروت سے کرو زیر
نکلا ہے کہیں کام فقط تیر و تبر سے

کیا عمدہ نصیحت ہے۔

شاداب بہر خدا نغمۂ توحید سنا

اصل بات یہی ہے۔
کسی والا نامے میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ پنجاب میں جنگ و اختلاف ہے اور انہی وجوہ سے میں نے مسلک توحید و صلح کل اختیار کیا ہے۔ یہاں بھی ہندو مسلمان شیعہ سنی کی بحثوں نے پریشان کر رکھا ہے۔ توحید و صلح کل کے مسائل کو برابر بیان فرماتے رہیئے اور ان پر زور دیجئے۔ میرا خیال زیادہ تر آپ سے ملازمت حاصل کرنے کے لئے یہی تھا اور ہے کہ ان امور پر زور دیا جائے۔ اور عمدہ مضامین پیدا کئے جائیں۔
پرسوں ایک مطلع ذہن میں آیا تھا عرض کرتا ہوں شاید پسند فرمایئے۔

نہ مستقبل کی سنتے ہیں نہ کچھ ماضی کی کہتے ہیں
جو اہل وجد ہیں وہ حال ہی کے ساتھ رہتے ہیں

یا یوں پڑھیے:— حال ہی میں مست رہتے ہیں۔
میرا دل تو اس خیال سے بہت تسکین پاتا ہے کہ آپ ایسا ذی علم، با اثر، با اقتدار رئیس ملک توحید و صلح کل کے مسئلہ کی طرف متوجہ ہے۔
حضور والا نے ایسے پاکیزہ اشعار موزوں فرمائے کہ حیرت ہو گئی۔ اور مرحبا و تحسین کا کلمہ بے اختیار زبان پر آیا۔ کیا کہوں بہت [illegible] ہوں ناتواں ہوں کوئی باسلیقہ رفیق سفر ملتا تو خدمت عالی میں حاضر ہو کر چند روز غم غلط کرتا۔ میرے آرام کا اہتمام خدام والا پر چھوڑا جائے [illegible] قبل اس کے خود جناب نے ارادہ تشریف آوری اور امید ملاقات کا اظہار فرمایا تھا کہ کس کا ارادہ پیدا ہو
انشاءاللہ آپ کو شادکام رکھے۔

[illegible]
سید اکبر حسین

(۳)

[illegible]

علی جناب مدظلہ

آداب بجا لاتا ہوں۔ صحیفۂ کرامت کا صدور باعث انبساط خاطر ہوا۔ نہایت شوق سے آپ کے مضمون کا [illegible] کہ اب میں آپ نے پنجاب کے لئے تحریر فرمایا ہے۔ دنیا میں تمام خرابیوں کی جڑ شرک۔ اسی لئے غیر خدا کو [illegible] تقسیم کر رکھا ہے۔ اگرچہ ہم کیا ہماری سعی کیا۔ دنیا کا مزاج ہی یہ ہے۔ خوب ہوتی تو دنیا کیوں ہوتی۔ لیکن بہرحال مسئلہ توحید پر زور دیتے رہنا عمدہ ترین شغل زندگانی ہے۔ اگرچہ میری غزل میں ایک شعر ہے۔

فکر چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا … میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں

اس غزل کے دو تین شعر اور عرض کر دوں۔ ایسا سامع کہاں پاؤں گا۔

چرخ سے کچھ امید تھی ہی نہیں … آرزو کوئی دل نے کی ہی نہیں
چاہتا تھا بہت سی باتوں کو … لیکن افسوس اب وہ جی ہی نہیں
جرأت عرض حال کیا ہوتی … نظر لطف اس نے کی ہی نہیں

خواجہ صاحب سے سفر دکن کی نسبت کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ ان سے تو ملنا ہی دشوار ہو رہا ہے۔ وقت ایسا نازک ہے کہ بدگمانیوں سے محفوظ رہنے کو لوگوں نے مکالمت و مجالست و زیارت احباب سے کنارہ کشی کو اولیٰ سمجھا ہے۔ خصوصاً وہ زبانیں اور طبیعت جن پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

دن بھر ایک ایک منہ کو تکتا ہے … بات کرنے میں عیب نکلتا ہے

اگر اچھا رہا ہمت بندھی تو خواجہ صاحب رفیق سفر کافی ہوں گے اور یوں تو آپ کی قدر دانی اور محبت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بے تکلف استمداد کروں گا۔

اللہ آپ کو شاد و بامراد رکھے۔

خاکسار
اکبر حسین

(۴)

الہ آباد۔ ۲۲ نومبر ۱۹۱۴ء

جناب والا مدظلہ

عید سے مجھ کو کیا نسبت۔ لیکن تبریک کے تار اور کارڈ کا شکر گزار ہوں۔ پریم بچن کا مضمون خوب ہے۔ اکثر ہمدرد ایک ایک کاپی لے گئے۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ سکھوں اور آریوں میں کیا وجہ اختلاف رہی اور اظہار مخالفت نے کیا پیرایہ اختیار کیا ہے۔

توحید پر مضامین و رسائل تحریر فرماتے رہیے۔ بنی آدم ہمیشہ لڑیں گے۔ مگر موحد کا دل ٹھکانے رہے گا۔ اور کیا کچھ ترقیاں چاہئے اگر دل لگا ہے۔ خدا یا زمانے نے آپ پر یہ نعمت پیش کر دی ہے۔ زہے نصیب۔

خواجہ صاحب حیدرآباد تشریف لے جاتے ہیں۔

[illegible]

(٧)

[illegible]

(٨)

[illegible]

(٩)

[illegible]

ساتھی

"مل گئی! مل گئی!!" درخشاں کا مقبول عام [illegible]
[illegible] کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنی
دنیا کا [illegible] شادی [illegible] اور جس کے لئے اس نے اپنی زندگی
وقف کر دی تھی جب تک کالج میں رہا اس کی خدمات ایک
[illegible] کالج چھوڑا تو تلاش معاش میں سرگرداں
پھرنے کے بجائے اس نے رسالہ یا اخبار جاری کرنے کا ارادہ کیا۔
پروفیسروں اور عزیز رشتہ داروں نے سفارش کر کے اچھے عہدے
پر لگوانے کا وعدہ کیا مگر اس نے کسی کی نہ سنی۔ کسی سے
امداد طلب کر کے سرمایہ لیا اور کسی سے قرض لیا اور اس طرح
سب سے پہلے "درخشاں" ایک ماہوار رسالہ نکالا۔ رفتہ
رفتہ اس کے حوصلے بڑھنے لگے۔ "درخشاں" کے علاوہ وہ کئی اور
رسالے اور ایک اخبار شائع کرنا شروع کیا۔ قرضہ ادا کر دیا
اور خود بھی ایک پریس کا مالک ہو گیا۔

دوست احباب نے اور عزیز و اقارب نے خاص
طور پر بڑھ چڑھ کر اس کی شادی کی کوشش شروع کی
مگر وہ ہمیشہ ٹالتا چلا گیا وہ یہی کہتا "جب کسی کو پالنے کے لائق
ہو جاؤں گا تو شادی بھی کروں گا۔ اب تو خود کو پالنے
کے لالے پڑے ہیں۔" لیکن اس میدان میں آ جانے کے بعد
اس کے پاس دولت آ گئی کہ وہ ایک کو کیا کئی کو پال سکے۔ نیز
عزت اور شہرت تو اس کے قدم چومتی تھی۔ جہاں بھی وہ لڑکی
[illegible] شادی [illegible] ہو جاتی مگر وہ ابھی انتخاب نہ کر سکا تھا۔ ہر
وہ دوشیزہ جس پر اس کی نظریں پڑیں ہر طرح سے جانچا
مگر کوئی لڑکی معیار پر پوری نہ اترتی۔ وہ ایسی لڑکی چاہتا تھا جو زیادہ
حسین نہ بھی ہو تو اپنے میں کسی قدر رعنائی رکھتی ہو۔ حسن سیرت
کی مالک ہو اور سب سے بڑھ کر اس میں علمی اور ادبی ذوق ہو۔

یہ زمانہ ناصر کے لئے عجیب کشمکش کا تھا۔ ادھر ماں
قبر میں پیر لٹکائے بیٹھی تھی اور اس کا بے حد تقاضا تھا کہ بیٹے
کا سہرا [illegible] دیکھ لے۔ عزیز و اقارب الگ تنگ کر رہے تھے۔
وہ سوچتا کیا کروں اور کیا نہ کروں۔

ایک نئی افسانہ نگار خاتون "شمائل" کے اکثر افسانے
اس کے پاس آتے تھے اور اکثر "درخشاں" میں چھپ بھی چکے تھے
اپنی غیر معمولی مصروفیات کی وجہ سے ناصر کا خیال اس طرف
گیا ہی نہ تھا۔ لیکن ایک روز جبکہ وہ ڈاک دیکھ رہا تھا "شمائل"
کا ایک تازہ افسانہ مع ایک طویل خط کے ملا۔ شمائل کے افسانے
کی تعریف میں اکثر خطوط اسے مل بھی چکے تھے۔ اس نے افسانہ
کو دیکھ کر ناصر کا خیال اس طرف منعطف ہوا۔ پہلی بار اس نے
شمائل کے متعلق سوچا "کیا یہ میری بیوی بن سکے گی۔
ادبی قابلیت اس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ افسانوں کے
پلاٹ سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے دل میں اصلاحی سرگرمی
موجود ہے۔ اس طرح ضرور وہ حسن سیرت کی بھی مالک ہوگی۔"
اس طرح ناصر شمائل کو پرکھا گیا۔ اب سوال حسن صورت
کا رہ گیا تھا۔ ناصر نے سوچا "اگر وہ زیادہ حسین نہ بھی ہو تو
مضائقہ نہیں۔ پھر تو رعنائی رکھتی ہو گی۔ یہ پاک و پاکیزہ خط
لکھنے والی عورت حسین ہونا چاہیے۔"

کئی روز تک ناصر شمائل کے خیال میں رہا۔ دل و دماغ
پر عجیب سروری کیفیت طاری تھی۔ آنکھیں شوخی سے ناچ
رہی تھیں۔ ہونٹوں پر ہر دم تبسم کھیل رہا تھا۔ تیسرے روز
شام کو وہ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے تصفیہ کر چکا تھا کہ شمائل
سے وہ ضرور شادی کرے گا۔ اس دل خوش کن تصفیہ سے وہ
بے قابو ہو گیا اور پکارا "مل گئی! مل گئی!! مل گئی!!!"

اب ایک سوال رہ گیا تھا کہ آیا شمائل شادی شدہ
ہے یا نہیں۔ مگر اس کا جواب بھی آسانی سے معلوم کرنے کی ایک ترکیب
نکل آئی۔ ایک ماہ بعد "درخشاں" کا خصوصی نمبر نکلنے والا تھا۔
ناصر نے سوچا۔ درخشاں کے خاص لکھنے والوں کے حالات اور
تصاویر بھی اس پرچہ میں شامل کر دی جائیں۔ اس طرح وہ
شمائل کے حالات سے بھی آگاہ ہو جائے گا اور تصویر بھی مل جائے
گی۔ چنانچہ اس نے خاص خاص مضمون نگاروں سے
التماس کی کہ وہ اپنے حالات اور تصویر بہ جلد از جلد روانہ فرمائیں۔

شمائل کو کس نے خاص طور دعوت دی۔
شمائل کو خط لکھنے کے بعد ناصر کسی گہری بے چین
نہ تھا۔ وہ اپنے خط کا انتظار کرتا۔ یہ وہی ناصر تھا جو بعض اوقات
افسانہ نگاروں کے ان جملوں پر جو فراق اور ہجر کی کیفیت
پر لکھے گئے ہوں گے، بے اختیار ہنس دیتا مگر اب ناصر کی بھی وہی
حالت تھی۔ بلکہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی حالت ان
افسانے کے کرداروں سے بھی زیادہ نازک ہے۔ اکثر عاشق
مایوس ہو کر جا بیٹھتا کہ تخلیہ میں روئے اور خوب روئے۔
آخر دو ہفتے بعد شمائل کا خط آیا۔ چھوٹا سا لفافہ اور
اس پر شمائل کی تحریر دیکھ کر ناصر بے اختیار ہو گیا۔ دل بہلانے
لگا۔ بار بار وہ دل سے سوال کرتا۔ اگر وہ شادی شدہ ہو تو؟
مگر دل سے کوئی جواب پا کر خاموش ہو جاتا۔ لفافہ کھولنے سے
پہلے اس نے لفافہ کو دو بار دیکھا۔
ایک ابھری سی چیز اس میں موجود تھی یعنی تصویر!
ناصر کی حالت متغیر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ لفافہ کھولنا چاہتا تھا
مگر ہاتھ اس کی مدد نہیں کر رہے تھے۔ اس کی حالت ایسی
ہو گئی تھی جیسے کہ کسی چور کی چوری کے وقت ہوتی ہے۔ بمشکل تمام
ناصر نے خط کھولا۔ ایک پری چہرہ خاتون کی تصویر اس میں موجود
تھی۔ عمر سولہ اٹھارہ کی لگ بھگ تھی۔ ایک ادائے مستانہ
سے باغ کی ایک روش پر کھڑی تھی۔ ہاتھ میں ایک گلدستہ تھا۔
ناصر نے آہ بھر کر تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے
دل میں وہی سوال پیدا ہوا "کیا وہ شادی شدہ ہے" وہ
چونک گیا۔ کاغذات کو الٹ پلٹ کر کے اس نے وہ کاغذ نکالا
جس میں شمائل کے حالات تھے۔ سرسری طور پر پڑھا۔ آہا!
شادی کا کہیں ذکر ہی نہیں تھا۔ یعنی وہ غیر شادی شدہ ہے۔
اس کا ہاتھ خود بخود دل کی طرف گیا۔ ناصر آنکھیں بند کر کے
خاموش بیٹھ گیا اور بہت دیر تک یونہی بیٹھا رہا۔
وہ چاہتا تھا کہ ماں سے ذکر کرنے سے پہلے شمائل کے
رجحانات معلوم کرے۔ چنانچہ اس نے شمائل کو نہایت رنگین
پیرائے میں ایک خط لکھا جس میں اپنی دلی آرزو کا اشارتاً

ذکر کر دیا اور اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔
ایک ہفتہ کے بعد شمائل کا خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ
وہ ناصر کے دل کی بات جان گئی ہے۔ ناصر نے اس کی اس
دور بینی کی داد دی۔ ملنے کے بارے میں شمائل نے لکھا تھا۔
"جب آپ چاہیں اور جہاں آپ چاہیں میں ملنے تیار
ہوں۔"
ناصر کو منہ مانگی مراد مل گئی۔ مگر ملنے کے مقام کا تعین ایک
اہم مسئلہ تھا۔ وہ روز سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ "۲۲ دسمبر
کو شام کے پانچ بجے وہ "تفکس ہوٹل" کے کمرہ نمبر ۵ میں ملے۔"
ناصر کو امید تھی کہ شمائل راضی ہو جائے گی۔ چنانچہ ہوا بھی یہی
اس لئے اس نے کمرہ کو ایک ہفتہ پہلے ہی کرایہ پر حاصل
کر لیا۔ دن بھر ناصر اس کمرہ میں پڑا رہتا اور وہ ایسے حرکات
کرتا کہ ہر دیکھنے والا اسے ضرور مفقود الحواس جانتا۔ اپنی
کرسی کے سامنے وہ دوسری کرسی رکھتا اور مصروف گفتگو
ہو جاتا گویا شمائل اس کے سامنے موجود ہے۔ اپنی گفتگو کو فصیح
اور پر اثر بنانے کے لئے وہ ہر جملے کے بعد ضرور شعر استعمال کرتا۔
بہرحال انتہائی کشمکش کے یہ چند دن کسی طرح گزر گئے۔
۲۲ دسمبر کا دن آ گیا۔ پانچ بجے کا وقت مقرر کیا گیا تھا مگر ناصر
وہاں حسب معمول صبح سے موجود تھا۔ خدا خدا کر کے گھڑی
نے پانچ بجائے۔ ناصر کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ وہ کرسی پر
سے اٹھ کر کھڑکی کے قریب گیا۔ اور ہوٹل کے پھاٹک پر نظریں
گاڑ دیں۔ کسی عورت کو نہ آتے دیکھ کر دور دور تک نظریں
دوڑائیں مگر وہ ناکام واپس آ گیا۔ وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔
اس کا سارا بدن لرزاں تھا۔ اس وقت ناصر کی حالت اس
بچے کی طرح تھی جو امتحان کا پرچہ کسی قدر خراب کر کے نتیجہ کا
منتظر ہو جو ابھی ظاہر ہونے والا ہے۔
دروازہ پر دستک ہوئی۔ ناصر نے لپک کر دروازہ کھولا
باہر ہوٹل کا نوکر کھڑا تھا۔ اس نے تشتری بڑھائی جس میں ایک
کارڈ تھا۔
"شمائل"

پچپن کے بعد

ہر سال حضرت غفران مآب کے محرم کے مہینہ میں خصوصاً پہلے دہے میں عجیب سوانگ اور تماشے ہوا کرتے تھے۔ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ انہیں ایام محرم میں ایک روز دیکھتا کیا ہوں کہ ایک ٹکڑی چلی آ رہی ہے۔ غالباً چالیس پچاس آدمی ہوں گے۔ کوئی دس پندرہ آگے چل رہے ہیں۔ باقی باقاعدہ قطار باندھے ہوئے ان کے پیچھے آ رہے ہیں۔ آگے چلنے والے کہتے تھے کہ "پچپن سال ہو گئے"۔ اس کے جواب میں دوسرے سب کے سب ایک ساتھ کہتے تھے کہ "بیٹھے بیٹھے سو گئے"۔ اس کے ساتھ ہی راستہ پر چت لیٹ جاتے تھے۔ پھر اٹھتے اور تھوڑی دور یہی نعرہ لگاتے ہوئے جاتے اور راستہ پر لیٹ جاتے۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ اسی طرح ہر محلہ سے گزرتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد حضرت غفران مآب نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا سوانگ ہے تو عرض کیا گیا کہ حال میں پچپن سال کی جو گشتی نافذ ہوئی ہے اس کی نقل کی جا رہی ہے۔ یعنی اچھا خاصا آدمی پچپن سالہ عمر ہوتے ہی بیکار ہو جاتا ہے جو مرنے کے برابر ہے۔

اس وقت تو مجھے زیادہ لطف نہیں آیا بلکہ اس لطیفہ کو سمجھ نہ سکا۔ لیکن بعد میں جب میں ملازم ہوا اور ملازمین کو وظیفہ پر علیحدہ ہوتے ہوئے دیکھا کہ کس قدر رنج و پریشانی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اور توسیع کے لئے کس کس طرح کوشش کی جاتی ہے تو سمجھ میں آیا کہ یہ لوگ غالباً موت تک ملازمت سے علیحدہ ہونا نہیں چاہتے ہیں۔ ان میں اکثر اس آنے والے وقت کے لئے بالکل تیار نہیں رہتے اور وظیفہ کو ایک بلائے ناگہانی خیال کرتے ہیں۔ وظیفہ اور پچپن سالہ عمر کی تھوڑی سی صراحت کر دینا مناسب ہے۔ سرکار نے عام رعایا کے حقوق کو پیش نظر رکھ کر ایک قاعدہ مقرر فرما دیا ہے کہ پچپن سال کی عمر یا بعد ضرورت پچپن سالہ ملازمت پر عہدہ دار کو وظیفہ دے دیا جائے تاکہ دوسرے عہدہ داروں کی ترقی کا موقع ملے [illegible] نہیں کہ وظیفہ پانے والا عہدہ دار کام کرنے کے قابل نہیں ہے۔ جیسی مرضی اعلیٰحضرت آپ کا تحمل ہے۔ جس کو ہر گز اس خیال میں [illegible] آپ کی تشفی کے لئے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض وقت سرکار عالی ایک وظیفہ یاب عہدہ دار کو ہماری سرکار بڑی بڑی ذمہ دارانہ خدمات عطا کرتی ہے۔ حالانکہ وہ بھی پچپن سال پر اپنی خدمت سے وظیفہ پر علیحدہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے محض پچپن سالہ عمر انجام دہی کار کی مانع نہیں ہے۔

بہت سے ملازمین وظیفہ کے وقت متردد رہتے ہیں اور اکثر بوجہ کثرت اولاد فکرمند ہوتے ہیں کہ اب قرض کیونکر ادا ہوگا۔ بچوں کی پرورش اور لڑکیوں کی شادی کا کیا انتظام ہوگا۔ عموماً زمانہ ملازمت میں اخراجات کا لحاظ نہیں کرتے اور اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتے ہیں اسی کا نتیجہ یہ پریشانی ہے۔ میرے تجربہ میں ان پریشان لوگوں میں مسلمان زیادہ ہوتے ہیں۔ حالانکہ ابتدائے ملازمت سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک روز ہم کو ملازمت سے علیحدہ ہونا ہے لیکن اس کو پیش نظر رکھ کر اپنے اخراجات کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ اور ایک حصہ تنخواہ کا محفوظ نہیں کیا جاتا۔ اب تو سرکاری بیمہ میں بہت سہولت پیدا ہو گئی ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ علاوہ اس کے دوسری معتبر کمپنیاں بھی ہیں۔ اگر باقاعدہ کفایت شعاری کے ساتھ ایک مقررہ موازنہ پر عمل کیا جائے تو کافی بچت ہوگی اور کوئی منفعت بخش جائداد بھی وظیفہ تک خریدی جا سکتی ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کے پاس بعد وظیفہ کافی آمدنی ہوتی ہے لیکن ان کو ہیچ اپنی علوم [illegible] کا رنج رہتا ہے۔ ایک بڑے عہدہ دار جنہیں کئی بار توسیع مل چکی تھی وظیفہ کے قریب یہ کہتے سنا کہ "ہائے ہائے چالیس لاکھ

[illegible] ایک مصیبت ہے۔ [illegible] شہر ہو یا قصبہ میں مکان بنا کر [illegible] سے باہر نہیں آ سکتے اور [illegible] بڑا آدمی [illegible] کام کرے اور یہ لے [illegible] ایک دل مست ہو کہ ہمارا بھی تک برسر حکومت ہیں۔ وہ بڑے شہر میں تو ہم کو کوئی پوچھے کا بھی نہیں۔ ایسی شان و شوکت کے دلدادہ اور دوسرے فضول [illegible] عہدہ داروں کے لئے تو حقیقت میں پچپن سال عمر کی قید [illegible] سے کم نہیں۔

اگر ابتدائے ملازمت ہی سے اپنے کو خادم ملک اور خدمت گزار رعایا سمجھیں بلکہ باشان و شکوہ عمل ہو کریں تو وظیفہ کے وقت آپ کی جدائی عام طور پر ناگوار ہوگی اور آپ ہر جگہ عوام میں ہر دل عزیز رہیں گے۔

بعض عہدہ دار بعد وظیفہ کر تلاش معاش میں سرگرداں رہتے ہیں ان میں سے کچھ تو اپنے اثرات و تعلقات کی بنا پر دو تین سال کے لئے مختلف ملازمتوں میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور بڑی تعداد میں باوجود کوشش کے ناکام رہتے ہیں۔ ان کوشش کرنے والوں میں سے بعض کمی آمدنی کو پورا کرنے کے لئے ملازمت کی جستجو کرتے ہیں اور چند ایسے بھی رہے جو اپنا بیکاری کو دور کرنے اور جو کچھ تھوڑی بہت حکومت تھی اس کو حاصل کرنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ مشکل سے سو میں ایک یا دو ایسے بھی نکلیں گے جو اپنی آمدنی پر قناعت کر کے اپنا وقت عبادت [illegible] و خدمت ملک و قوم کے لئے وقف کرتے ہیں۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ وظیفہ کے بعد گوشہ نشین بن جائیے اور کوئی کام نہ کیجئے۔ موقع ملے تو ضرور ملازمت کیجئے اور اپنی آمدنی میں اضافہ کیجئے۔

بعض وظیفہ یاب عہدہ دار تو غضب کرتے ہیں کہ باوجود بیماری دل کی بیناؤں و خرابی ہوش و حواس کے صرف طلب زر کی خاطر دوبارہ ملازمت کی تلاش میں رہتے ہیں

ایسی ذہنیت کے لوگ ملازمت حاصل کر کے اپنی عزیز عمر قبل از وقت ختم کر دیتے ہیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ ہر وظیفہ یاب دوبارہ ملازمت کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اور نہ ہر وظیفہ یاب کرایسے مو قعے مل سکتے ہیں۔ میرا روئے سخن عام وظیفہ یاب عہدہ داروں سے ہے ہر شخص کو اپنی صحت اور دوسرے حالات پر غور کر کے عمل کرنا مناسب ہے۔

حقیقت میں اصل کام کرنے کا وقت بشرط صحت وظیفہ کے بعد کا ہے۔ کیونکہ بچپن تو تعلیم حاصل کرنے میں صرف ہو جاتا ہے اور جوانی سے وظیفہ تک حصول تجربہ کے لئے وقف ہے۔ علم و تجربہ کے بعد عمل کا وقت وظیفہ کے بعد کا ہے جب کہ عقل پختہ اور تجربہ مکمل ہو جاتا ہے۔

وظیفہ کے بعد اگر حقیقت میں پچپن سال کی عمر ہے اور اوائل شباب و زمانہ ملازمت پاک و صاف گزرا ہے تو پھر اس کا لطف دیکھئے کیسے آرام و چین سے آپ کی بقیہ عمر گزرتی ہے۔ اگر علم کا شوق ہو تو اس سے بہتر کونسا وقت مل سکتا ہے! تحریر و تقریر کے لئے بے فکری اور دلجمعی کی ضرورت ہے جو وظیفہ کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ زراعت و تجارت بہترین مشاغل ہیں۔ کچھ نہیں تو باغبانی صحت اور دل بہلائی کا خاصا مشغلہ ہے۔ اگر خدا نے استطاعت دی ہو تو سفر کرنے میں لطف آئے گا۔ اور معلومات میں اضافہ ہوگا۔ بہرحال بیکاری سب سے بدتر ہے جو کچھ ہو سکے کیجئے اور اپنے کو مشغول رکھئے۔ کیونکہ مشہور ہے کہ بیکار وظیفہ یاب بڑی بلاؤں کا شکار بن جاتے ہیں اور بہت جلد مر جاتے ہیں۔

بعض حضرات وظیفہ کا جزو سرکار کو فروخت کر کے کچھ رقم لے لیتے ہیں۔ یہ نہایت نازک کام ہے۔ سوائے اشد ضرورت اور ناگزیر حالات کے ایسا سودا کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ اگر عمر زیادہ ہوئی تو گھاٹے میں رہتے ہیں۔ ایک تو وظیفہ کے باعث نصف آمدنی ہو جاتی ہے۔ اس پر

زوجہ وظیفہ سے مزید تنگی ہوتی ہے۔ خرچ تو وہی رہتا ہے لیکن آمدنی میں کمی ہو جاتی ہے۔ وظیفہ یاب کی پریشانی کا سبب یہ بھی ہے۔ دوسری ملازمت کی تلاش کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ابتدا میں تو کوشش ہوتی ہے کہ ہم کو استعفیٰ قبول کی گئی۔ سوال خرچ کا ہے۔ اگر آپ نے صحیح طور پر خرچ کیا اور آمدنی میں اضافہ کیا تو خیر کوئی تکلیف نہ دیکھنے میں آتی ہیں۔ ورنہ شادی بیاہ میں تحفے تحائف وغیرہ پر روپیہ خرچ ہو جاتا ہے جس کا بدل نہیں تو اس قدر زحمت و تکلیف کا سامنا ہوتا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

وظیفہ کے بعد ہر شخص کو جلد سے جلد اپنے جدید ماحول کا خیال رکھنا چاہیے۔ کفایت کے ساتھ لباس، غذا، تفریح اور صحت کا خیال مقدم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدائی پانچ چھ ماہ تک کسی قدر تکلیف ہوگی۔ لیکن ایک پروگرام مرتب کرکے عمل کرنے سے کافی راحت ملے گی۔

اس سلسلے میں موجودہ عہدہ داروں اور ملازمین سے اپنے اور دوسرے وظیفہ یاب عہدہ داروں کے چند تجربات بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ ان کا جی چاہے تو اس پر عمل کریں ورنہ ان کا اختیار۔

(۱) آپ اپنے کو کبھی عہدہ دار نہ سمجھیں۔ بلکہ خادم ملک تصور کریں اور اس پر سختی سے عمل فرمائیں۔ کیونکہ بعد وظیفہ آپ کی یہ خصوصیت کہ آپ عہدہ دار ہیں باقی نہ رہے گی اور آپ بھی عام رعایا میں شامل ہو جائیں گے۔

(۲) ابتدائے ملازمت سے اپنے وظیفہ کے حصہ کا خیال رکھ کر کچھ پس انداز کریں۔ اور کفایت کے ساتھ زندگی بسر کریں تو وظیفہ کے وقت آپ کو پریشانی میں بہت کچھ کمی ہوگی۔

(۳) اپنے دوستوں کی تعداد بڑھائیں۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ بعض عہدہ دار اپنے عہدہ کے نشہ میں اپنے سابقہ موجودہ دوستوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور صرف اپنے ہم رتبہ کے خوشامدی عہدہ داروں کو قابل التفات [illegible]

خیال کرکے انہیں سے ربط رکھتے ہیں۔ اور [illegible] کو اپنا خیر خواہ تصور کرتے ہیں۔ یہ بہت [illegible] ہے۔ آپ کی ملازمت کے ختم کے ساتھ رخصت [illegible] بعد وظیفہ آپ کے سابقہ دوست آپ سے [illegible] آپ سے دور رہیں گے۔ اور آپ تنہا رہ جائیں گے۔

(۴) ملازمت کے زمانے سے بھلا بنا کر [illegible] جس کو انگریزی میں [illegible] (پبلک ریلیشنز) کہتے ہیں، رکھیں تاکہ وظیفہ ملنے پر آپ کی پبلک میں عزت رہے۔

ایک بڑے عہدہ دار جن کا اب انتقال ہو چکا ہے مجھ سے فرماتے تھے کہ "دیکھیے کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ میرے مکان پر سے دفتر جاتے ہوئے بعض وہ نظر آتے ہیں جن کو تقرر میرے ہاتھ سے ہوا ہے اور جن کو میں نے کئی ترقیاں دی ہیں، آج مجھ کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں، اور بعض مجھ سے اپنا منہ چھپا لیتے ہیں۔ اب مجھ کو رنج ہوتا ہے۔ میں یہ مکان چھوڑ کر دوسرے دور کے محلہ میں مکان بنا کر رہنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ بات قابل نوٹ ہے کہ جب وظیفہ کے چند ماہ بعد ان کو دوسری خدمت ملی جو سابقہ خدمت سے اعلیٰ ترین تھی تو یہی لوگ پھول کے ہار لے کر مبارکباد دینے حاضر ہوئے۔"

آخر میں وظیفہ یاب عہدہ داروں کے لئے میری ایک تجویز ہے کہ اتحادی اصول پر ان کا ایک انجمن ہونی چاہئے۔ اور ایک کلب۔ گو اس وقت چند کلب موجود ہیں۔ لیکن ان میں بیشتر برسر خدمت عہدہ داروں کی تعداد ہے۔ ایسے کلبوں میں زیادہ تر عہدہ داری کی شان نظر آتی ہے۔ علاوہ اس کے ہر وظیفہ یاب عہدہ دار ان کے اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اور [illegible] مقامات پر [illegible] نہیں ہے۔ کلب کے علاوہ ایک [illegible] [illegible] [illegible] ہو۔ [illegible] وظیفہ کا [illegible] لیے ایک [illegible] [illegible] ہو جائے۔

[illegible] اس تحریک سے کامیابی کی کوشش کے لئے پیش کرتا ہوں۔
[illegible] اس کی تکمیل اور [illegible]
(یہ تقریر حیدرآباد ریڈیو سے نشر کی گئی)

سید محمد تقی

سویرا

سجھائی دینے لگا ہے اب اس اندھیرے میں
کچھ ایسی دیر نہیں رہ گئی سویرے میں

وہ دور افق پہ سپیدی کا کھل رہا ہے نشاں
ہر ایک سمت سے آثارِ صبحِ نو ہیں عیاں

سسک رہے ہیں وہ تاریکیوں کے ہمراہی
سہم کے بیٹھ گئی راستے میں گمراہی

جو ظلمتوں میں چمکتے تھے ہو گئے بے نور
خود اپنا خونِ جگر پی گئی شبِ دیجور

نہ وہ شکار رہے اور نہ گھات میں صیاد
مٹا جہادِ مسلسل سے زندگی کا تضاد

جواں فضاؤں میں حل ہو گئے مثالِ شہاب
وہ مالکانِ زمیں غاصبانِ خانہ خراب

نئے اصول بنے ہیں نئے جہاں کے لئے
مئے حیات ہوئی عام این و آں کے لئے

عابدی

انوار — حضرت علی اختر حیدرآبادی کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پرگو شاعر ہیں بلکہ حیات اور کائنات پر ان کی نظر بہت وسیع ہے۔ موجودہ زمانے میں سوائے جوش کے کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں۔ اس مجموعے کی اشاعت سے اردو شاعری میں ایک گرانبہا اضافہ ہوا ہے۔ صفحات ۱۹۸ قیمت [illegible] سب رس کتاب گھر سے طلب فرمائیے۔

تصحیح — سب رس فروری ۱۹۵۱ء میں پروفیسر شور کی ایک نظم "عرض نیاز" شائع ہوئی تھی۔ اس کے ایک مصرعہ میں "موج" کی جگہ "نوح" شائع ہو گیا۔ صحیح مصرعہ یہ ہے۔ (بے آگ شعلے، بے موج طوفاں) ادارہ

اپریل

اپریل کا مہینہ زندہ دلی کے مظاہروں کے لئے ایک زندگی کا پیام دیتا ہے۔ قدیم رومن اپریل کو اپریلس کہتے تھے جس کے معنی کھلنے کے ہیں۔ یہ نام انھوں نے غالباً اس لئے رکھا ہوگا کہ اس موسم میں کلیاں کھلتی ہیں۔ انگلستان کے پرانے باشندے اس کو ایسٹر کا مہینہ کہتے تھے۔ اس مہینے کی پہلی تاریخ کو اپنے قاصد ادھر ادھر بھیجنے کا رواج کہا جاتا ہے کہ حضرت مسیح کی سنت کے طور پر شروع ہوا۔ حضرت مسیح نے اپنے قاصد اسی دن ادھر ادھر بھیجے تھے۔ حضرت مسیح کی زندگی کا یہ واقعہ ازمنۂ وسطیٰ میں ایک اعجازیہ کا موضوع بنا رہا اور ایسٹر کی تقریب میں کھیلا جاتا تھا۔ اس مہینہ کی پہلی تاریخ کو انجان لوگوں کے ساتھ مذاق کرنے اور ان کو بے وقوف بنانے کا رواج سارے یورپ میں عام ہو گیا۔ معلوم نہیں اس کی ابتدا کب ہوئی۔ باور کیا جاتا ہے کہ انگلستان اور جرمنی والوں نے فرانس کی تقلید میں پہلی اپریل کی تقریب منانا شروع کی۔ فرانس میں جو لوگ پہلی اپریل کو بیوقوف بنائے جاتے ہیں ان کو "اپریل کی مچھلی" کہا جاتا ہے۔ انگلستان میں انھیں "اپریل کا بیوقوف" سمجھا جاتا ہے اور اسکاٹستان میں "گوک"۔ انگلستان میں سب سے زیادہ عام مذاق جو اس دن کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ کسی کو بے وقعت کام پر لگا دیا جائے یا کسی سے ملاقات کا تصفیہ کر کے ملاقات نہ کیجائے یا پھر کسی راستہ چلنے والے سے کہا جائے کہ اس کے چہرے پر کچھ لگا ہے یا کپڑا لٹکا ہوا ہے اور جب وہ کپڑا صاف کرنے یا مکھی اڑانے کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے تو سب چلاتے ہیں "اپریل کا بے وقوف"۔

یورپ والے بہت مصروف زندگی بسر کرتے ہیں اس لئے انھوں نے مذاق اور بے وقوفی کے لئے ایک دن مقرر کر لیا۔ بے روزگاری اور فرصت نے ہندوستان کو بے وقوف بنا رکھا ہے اور ہندوستانیوں کی زندگی کو مذاق۔ اس لئے ہمارے ملک میں مذاق اور بے وقوفی کی رسمیں کبھی دبا دی گئیں۔ ہزاروں روزانہ بے وقوف بنتے ہیں اور اپنی بے وقوفی کو مذاق سمجھ کر ٹال دیتے ہیں۔ غرض ہماری زندگی کا ہر دن "پہلی اپریل" ہے۔ بیروزگاری اور فرصت کے سلسلے میں مجھے یہ کہنے دیجئے کہ بیروزگاری ایک صلاحیت ہے جو کام کرنے والوں کو شکر گنج بنا دیتا ہے اور فرصت ایک وقفہ ہے جو جھونپڑی میں محلوں کے خواب دکھاتا ہے۔ ہماری زندگیوں سے اگر بیروزگاری کی آہ اور فرصت کی واہ کو نکال دیا جائے تو پھر خواب و خیال کی دنیا ختم ہی ہو جائے گی۔ خیر تو جب تک ہمارے ملک پر یورپ کی تہذیب کا اثر نہیں پڑا تھا۔ "اپریل" کو منانا تو ایک طرف سمجھا بھی نہیں گیا تھا۔ لیکن مشرق کے لئے جب سے مغرب نے اپنے آپ میں کشش پیدا کر لی ہے ہم میں سے بعض لوگ اس رسم میں شریک ہو گئے ہیں۔ کیا برا ہے اگر اس بہانے دل میں ایک لہر اٹھے۔ اور ہونٹوں پر ایک تبسم آ جائے۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ مذاق مذاق میں فرق ہے۔ اگر سرکس کے مسخرے کی طرح ہم قلابازیاں لگانے لگیں تو یہ ایسا ہی مذاق ہوگا جیسے ہندوستانی فلم کے ہیرو کی فراق زدہ میں سنجیدگی۔ جب تک مسخرا اور مذاق میں فرق نہ کیا جائے گا قہقہوں سے منہ بگڑتے رہیں گے، ہونٹوں پر تبسم نہیں آئے گا۔ قہقہے تو ڈگڈگی بجا کر اور بندر نچا کر ہر مداری وصول کر لیتا ہے لیکن سچی مسکراہٹ کو دل سے ہونٹوں پر کھینچ لانا آسان کام نہیں۔ دل کو ہنسانے کے لئے ایک پاکیزہ مذاق کی ضرورت ہے اور مذاق کی پاکیزگی اپنے اطراف نازک حدیں رکھتی ہے۔ ذرا ان حدوں سے نکلے اور مذاق کرا ہو گیا۔

یہ تو ہوا مذاق۔ آئیے بے وقوفی کے متعلق بھی کچھ سن لیجئے۔ بیوقوفی جو کچھ بھی ہو لیکن بے وقوف بنانے والوں سے زیادہ بے وقوف بننے والوں کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں۔ بے وقوف بنانے والوں کا فرض صرف یہ ہے کہ وہ بے وقوف بناتے وقت خود بیوقوف نہ بن جائیں۔ لیکن بے وقوف بننے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ بے وقوف نہیں۔ محسوس کریں لیکن اپنی بے وقوفی کو

[illegible] بے وقوف ایسے ہیں جو بے وقوف [illegible] عقلمند بے وقوفوں" کی [illegible] ایک کو ان بے وقوفی کا احساس ہوتا ہے۔ [illegible] کر دوسروں کو بے وقوف بنانا چاہتا ہے [illegible] مگر بے وقوفی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ [illegible] عقل مندی کی سند سمجھتا ہے۔ عقلمند بے وقوف [illegible] دنیا میں ہزاروں طرح کے مستقل بے وقوف موجود ہیں۔ ایک بے وقوف وہ ہے جس کو روشنی طبع بے وقوف بنا دیتی ہے اور وہ ہر دوسرے شخص کو اپنے مقابلے میں بے وقوف سمجھتا ہے۔ ممکن ہے دنیا ایسے بے وقوفوں سے کسی دور میں خالی نہیں رہی ہو۔ لیکن موجودہ دور جس طرح پروپگنڈے کا دور ہے اسی طرح سے روشن طبع بے وقوفوں کا دور کہا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں اگر سارے عقلمند کانفرنسیں منعقد کرنا، جلوس نکالنا، نعرے لگانا اور قرار دادیں منظور کرنا چھوڑ دیں تو دنیا اتنی بے وقوف نہ رہے جتنی کہ اب ہے۔ خیر۔ ایک بے وقوف وہ ہے جس کی بے وقوفی محض جاہلیت یا کم علمی ہوتی ہے۔ جب تک اس کے دیوان خانہ میں سند نہ لٹکے۔ سند کی نقلیں جب تک درخواستوں کے ساتھ منسلک نہ ہوں اور وہ خواتین جب تک "بشرف ملاحظہ" سے شروع ہو کر "واجب تھا عرض کیا" پر ختم نہ ہوں اس کی بے وقوفی میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ عقل کی پیمائش سند کے بغیر ممکن نہیں۔ ایک بے وقوف وہ ہے جو بے وقوف بنانے کے لئے بے وقوف بنا پھرتا ہے۔ لوگ اسے بے وقوف سمجھ کر خود بے وقوف بنتے ہیں اور وہ بے وقوفی سے اپنے سارے کام نکال لیتا ہے۔ فقیر اپنے آپ کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑا کر رہا ہے۔ "ایک پیسہ لوں گا ہزار گنا دوں گا۔" ہم اسے پیسے دیتے ہیں۔ لیڈر کہتا ہے "ساری دنیا خطرے میں" اور ہم اس کی پناہ میں آجاتے ہیں۔ ایک بے وقوف وہ ہوتا ہے جس کو ساری دنیا عقلمند کہتی ہے۔ یہ بے وقوف "لال بجھکڑ" قسم کا ہوتا ہے اور لال بجھکڑ کے قسم کا کام کر کے عقل مند مشہور ہو جاتا ہے۔ ایک بھینس نے اپنا سر ایک مٹکے میں پھنسا لیا تھا۔ گاؤں والے پریشان ہوئے کہ اب کیا کیا جائے۔ ایک ہی حل تھا اور وہ "لال بجھکڑ" کی مدد لینا۔ چنانچہ لال بجھکڑ کو صورت حال کی نزاکت سے آگاہ کیا گیا۔ لال بجھکڑ نے اپنی تدبیر سے فوراً مشورہ دیا کہ پہلے تو بھینس کی گردن کاٹ ڈالی جائے۔ اس طرح بھینس کا سر نکل جائے گا۔ اب رہ گیا سر تو اس کے لئے پتھر سے مٹکا پھوڑ دیا جائے۔ ہاں تو اس قسم کے بے وقوف کی مدد سے ہر مسئلہ ایک نیا مسئلہ پیدا کرتا ہے۔ اور مسائل کے ہجوم میں وہ ایک عقلمند کی طرح اپنا الو سیدھا کرتا ہے۔ ایک بے وقوف وہ ہے جس کو حالات بے وقوف بنا دیتے ہیں۔ حالات سے بنے ہوئے بے وقوفوں میں سب سے زیادہ دلچسپ ماضی کو پوجنے والا ہوتا ہے۔ وہ ماضی میں اس قدر کھو جاتا ہے کہ حال اس کے آنسوؤں میں بہہ جاتا ہے۔ اور مستقبل تو دھندلی نگاہوں کو دکھائی ہی نہیں دیتا۔ حال کا بے وقوف خود فراموش ہوتا ہے اسے اپنی بھی خبر نہیں ہوتی۔ خود کو دھوکہ دیتا ہے۔ دوسروں کو دھوکے میں رکھتا ہے۔ اس طرح بعض وقت بے حال اور بعض وقت بحال ہو کر حال کو بے مصرف بنا دیتا ہے۔ مستقبل کا بے وقوف سراب کے پیچھے دوڑتا ہے۔ دن کو خیال اور رات کو خواب اس کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ وہ شیخ چلی کی طرح ہوائی قلعے بنانے میں زندگی بسر کر دیتا ہے۔ ایک بے وقوف وہ ہوتا ہے جسے مطلبی بے وقوف کہہ سکتے ہیں۔ یہ بے وقوف گربہ مسکین بن کر آستینوں میں سانپ کی طرح کھیلتا ہے۔ اور جب مطلب نکل جاتا ہے تو شیر کی طرح جھپٹ کر اپنی بے وقوفی کا خراج وصول کر لیتا ہے۔ ایک بے وقوف وہ ہوتا ہے جس کو بے وقوفی سے فطری مناسبت ہوتی ہے۔ وہ غیر محسوس طریقے سے اپنی بے وقوفی کے مظاہرے کرتا ہے اس کی بے وقوفی اکثر

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] خزاں چمن پہ غضب — ہے چمن پھر بھی اک جہانِ طرب
[illegible] غم ہی دوستی — زر بکف غنچہ اس میں پھوٹا کب
[illegible] و بیدار زاں میں — ہمسری کا نہیں ہے کوئی سبب
[illegible] و نہالِ باغ خدا — ہیں الگ ان ہی قدوں کا ڈھب
گرد آلود [illegible] سے چہرے — چمک اٹھی جبیں [illegible] جب
ہیں بنے پیتل کو کہو یا سونا! — خود کھلونا ہے طفلکِ کتب
فرق بدماش و پاکہ گوہر میں — کیوں دکھائیں نہ بلبل و عقرب

ہیں شریف و رذیل ایسے ہی
منظرِ لطف و رونمائے غضب

(۲)

آدمی آدمی نہیں یکساں — گرچہ فی الاصل آدمی ہیں سب
کرکے سب سے برابری کا سلوک — دل میں پچھتائے جا رہا ہوں اب
ہم محلہ ہیں میرے شیخ گھرو — نام سے ہے عیاں وقارِ نسب
بھائی! آداب عرض کرتا ہوں — خود کہا میں نے ان کو دیکھا جب
[illegible] کی نہیں انھوں نے کبھی — گرچہ میرا عمل تھا درسِ ادب
دفعتاً کچھ مجھے خیال آیا — آخر اس سرکشی سے کیا مطلب
میں جو چپ آج ہو گیا عمداً — چل دیئے شیخ جی بھی مہر بہ لب

کیا قیامت ہے اے علی منظور
ہیں گھرو صاحب یہ تک اسلام طلب

سید علی منظور

[illegible] صاحب [illegible] ہے اور تو اب صاحب عالیشان [illegible] بڑے صاحب کہلاتے ہیں۔

تم

تم وہ دل پہ لگا ہے کہ دکھائے نہ بنے
اور چاہیں کہ چھپائیں تو چھپائے نہ بنے

تم میری زندگی میں بہار بن کر آئے۔ قرار بن کر دل کی اجڑی بستی آبادی۔ اب جبکہ تم رگ رگ میں سما چکے ہو جیسے بسمل کی طرح تڑپا رہے ہو۔ تم میرے درد سے لاپروا میری تڑپ سے بیگانہ ہو گئے ہو ــــ آرزو تو یہ تھی تم کو آنکھوں کا نور دل کا سرور بنا کر رکھتی۔ اپنی زندگی کے چند روز تمہارے سایہ میں چین سے گزارتی۔ میرا دم تمہارے قدموں پر نکل جاتا اور میری زندگی کا مقصد پورا ہو جاتا۔ لیکن فلک کج رفتار کو یہ منظور نہ ہوا ــــ میں نے آفتاب کا طلوع بھی دیکھا اور غروب بھی۔ گر زندگی کا روشن پہلو ہمیشہ میری نظروں کے سامنے رہا۔ میں غروب کا مقصد نہ سمجھ سکی۔ کاش انسان پہلے اپنے انجام کو سوچ لے۔ لیکن۔ تم نے مجھے سوچنے کا موقع بھی نہ دیا۔ شاید یہی میری تباہی کا باعث ہوا۔ ہر عروج کے ساتھ زوال اور بدر کے ساتھ ہلال ہے ــــ لیکن میں اپنی منزل پر پہنچ بھی نہ سکی۔ پہلی ہی سیڑھی پر خزاں نے مجھے لوٹ لیا۔ اب اس کا گلہ کس سے کروں خدا سے ــــ یا ــــ بندہ سے ــــ تمہاری محبت میرے دل ہی نہیں جان کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے ــــ اب یہ جان کے ساتھ ہی جائے گی ــــ مگر یہ جان بھی بہت سخت اور کٹھن ہے ــــ نہ نکلتی ہے نہ چین لینے دیتی ہے ــــ یہ تھا محبت کا آغاز ــــ اور یہ انجام ہے ــــ

ضبط کی تاب نہ یارائے خموشی مجھ کو
ہائے اس دردِ محبت کو چھپاؤں کیونکر

م۔ح۔ب

غزل

تو اور تیری عبادت گاہیں
منزل ایک ہزاروں راہیں

اٹھیں ایسی کس کی نگاہیں
تھم گئے آنسو، رک گئیں آہیں

کیا جانیں بے چاری نگاہیں
دل کو دل سے ہوتی ہیں راہیں

دل میں شوقِ منزل لیکر
چلتا ہوں، بنتی ہیں راہیں

کون خطاکارِ الفت ہے؟
میرا دل یا تیری نگاہیں؟

پھر کیا ہے معیارِ الفت
چاہنے والے کیونکر چاہیں

شاید دل پر آنچ ہے آئی
آگ لگاتی نکلیں آہیں

درد کا ناممکن نہیں درماں
ہو سکتا ہے آپ جو چاہیں

غم کا مداوا، دل کی تسلی،
چند تبسم، چند نگاہیں

ہر ذرہ ہے حسن بداماں
کس کو چاہیں کس کو نہ چاہیں؟

ٹوٹی امیدوں کے ہیں نظارے
جلتے آنسو، ٹھنڈی آہیں

پیہم نقشِ پا کا تسلسل
پیدا کر دیتا ہے راہیں

دامودر ذکی ٹھاکر

پس اندازی کی اہمیت

ماہرین معاشیات کے متعلق یہ اکثر سننے میں آتا ہے کہ وہ اپنی بات پر بہت کم قائم رہتے ہیں اور بار بار اپنی تجویزیں بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی وہ لوگوں کو ضروریات پر آمدنی کا زیادہ سے زیادہ حصہ صرف کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور کبھی زیادہ سے زیادہ پس اندازی کی تلقین کرنے لگتے ہیں۔ ماہرین کی رائے میں اس قسم کی تبدیلی حالات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ کساد بازاری کے حالات میں صرف میں اضافہ روزگار میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے کہ کساد بازاری کے برے اثرات کو جلد دور کیا جا سکتا ہے۔ جنگی معیشت کا بنیادی مقصد دشمن کے خلاف فتح پانا قرار پاتا ہے اور اس کے لئے زیادہ سے زیادہ معاشی وسائل جنگ کے کاموں کی طرف منتقل کرنے پڑتے ہیں۔ اگر عوام اپنے صرف میں کمی نہ کریں تو حکومت آسانی سے ان وسائل کو حاصل نہیں کر سکتی۔ اس لئے صرف میں کمی اور پس اندازی کا مشورہ دیا جاتا ہے۔

جنگ کے دوران میں حکومت کے مصارف کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔ ان مصارف کی پابجائی کئی مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے۔ ان طریقوں کو اختیار کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عوام اپنے صرف میں کمی کریں۔ مختلف قسم کے محاصل میں اضافہ کر دیا جاتا ہے اور نئے نئے محاصل عائد کئے جاتے ہیں۔ لیکن قوم میں محاصل کا بار برداشت کرنے کی صلاحیت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اگر جنگ کے تمام کے تمام مصارف محاصل کے ذریعے سے پورے کئے جائیں تو معاشرہ پر اس کے برے اثرات پڑتے ہیں اور اس لئے حکومتیں محاصل میں اضافے کے ساتھ ساتھ عوام اور اداروں سے زیادہ سے زیادہ قرضے حاصل کرنے کی بھی کوشش کرتی ہیں۔ حکومت کو قرض دینے والے اشخاص ضروریات کو ملتوی کر کے صرف میں کمی کرتے ہیں۔ عام طور پر حکومتیں قرضے کے اختیاری طریقے کو پسند کرتی ہیں۔ حکومت قرضے لینے کا اعلان کر دیتی ہے اور عوام کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ چاہیں تو قرضہ دیں کسی قسم کا جبر نہیں کیا جاتا۔ البتہ اخباروں، سینما اشتہارات اور جلسوں کے ذریعے سے جنگ کے دوران میں لوگوں کے قومی جذبات کو ابھار کر صرف میں کمی کرنے اور حکومت کو قرض دینے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ شہروں اور دیہات میں پس اندازی کے ہفتے منائے جاتے ہیں اور عوام کی طرف سے پس اندازی کی مہم کو منظم کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ راشن بندی اور بعض دوسرے معاشی کنٹرول (مثلاً خانگی سرمایہ کاری پر حکومت کا تسلط) قائم کر کے افراد کو صرف میں کمی پر مجبور کیا جاتا ہے۔

یہ محسوس کیا گیا ہے کہ قرضے حاصل کرنے کے صرف اختیاری طریقے کو اختیار کر کے کم آمدنی پانے والے اشخاص کو قرضے دینے کی ترغیب نہیں دلائی جا سکتی۔ اگر ان کے صرف میں کمی نہ کی گئی تو آمدنی بڑھنے کی وجہ سے یہ لوگ اشیا کی محدود مقداروں کو خریدنے کی کوشش کریں گے جس کا لازمی نتیجہ قیمتوں کا بڑھنا اور افراط زر کے برے اثرات پیدا ہونا ہوگا۔ انہی حالات کو روکنے کی غرض سے انگلستان کے مشہور معاشی لارڈ کینیس نے موجودہ جنگ شروع ہونے کے چند مہینوں کے بعد لازمی پس اندازی کی ایک اسکیم پیش کی تھی۔ جنگ کے دو سالوں تک حکومت برطانیہ اور برطانوی عوام نے جن کے مفاد کی خاطر اصل میں یہ اسکیم تیار کی گئی تھی، اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی لیکن دو سال بعد حالات نے مجبور کیا کہ اس کو اختیار کیا جائے۔ اس کے مطابق کم آمدنی پانے والے اشخاص بھی لازمی طور پر اپنی آمدنی کا ایک خاص فی صد حکومت کو بطور قرض

دیتے ہیں جب تک جنگ جاری ہے قرض دینے والوں کو سود ملتا رہے گا اور جنگ کے ختم [illegible]
مقررہ مدت پر ان قرضوں کی رقم واپس کی جائے گی۔

دوسری قوموں کی طرح حکومت ہند کے مصارف بھی جنگ کی وجہ سے کئی گنا بڑھ گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت ہند نے اپنے مصارف کو بڑی آسانی سے پورا کر لیا ہے۔ حاصل میں اضافہ ہوا ہے مختلف طریقوں سے اختیاری اور لازمی قرضے لئے گئے ہیں حکومت ہند کے موازنہ میں توازن قائم رکھنے کے باوجود اتحادی اقوام کی جنگی ضروریات پوری کرنے کی غرض سے افراط زر کی پالیسی اختیار کی گئی۔ جس کی وجہ سے زر کی مقدار بڑھی اور ہندوستانی معاشرہ کو افراط زر کے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ حیدرآباد کی معیشت چونکہ برطانوی ہند کی معیشت سے بالکل جدا نہیں ہے اس لئے یہاں افراط زر کے اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ حالی روپے کی مقدار میں اتنا زیادہ اضافہ نہیں ہوا ہے جتنا کہ کلدار کی مقدار میں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ حکومت سرکار عالی کے موازنہ میں توازن قائم کرنے کا مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس جنگی حالات کی وجہ سے حکومت کی آمدنی جنگ سے پہلے کے مقابلہ میں تقریباً دوچند ہو گئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس سال کے مالیہ میں تین کروڑ کی بچت کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ ہمارے یہاں سب سے اہم مسئلہ افراط زر کے حالات کو روکنا اور اس کے اثرات سے معاشرہ کے مختلف طبقات کو محفوظ رکھنا ہے۔ اس کے لئے پچھلے سال زائد منافع پر محصول عائد کیا گیا تھا۔ یہ محصول اس سال کے مالیہ میں بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ یہاں اس کا تذکرہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ محصول زائد منافع کے سلسلے میں جو بھی رقم وصول کی جائے گی اس کا ایک خاص فی صد جنگ کے بعد ادا کرنے والے اداروں اور افراد کو واپس کر دیا جائے گا۔ تاکہ جنگ کے بعد کساد بازاری کے حالات میں واپس شدہ رقم سے کاروبار کی حالت کو سدھارنے میں مدد مل سکے اس طرح سے انھیں لازمی طور پر پس انداز کرنے کے لئے مجبور کیا گیا ہے۔ کم آمدنی پانے والے اشخاص کو ترغیب دلانے اور سہولت پہنچانے کی خاطر حکومت سرکار عالی کی طرف سے ([illegible]
Certificates) جاری کئے جاتے ہیں اور بنک اور دوسرے اداروں کے لئے سرکاری ہنڈیوں کے طریقے کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی آمدنی کا ایک حصہ لازمی طور پر حکومت کے پاس بطور امانت جمع کیا جائے۔ ان امانتوں پر دو فی صد سالانہ سود دیا جائے گا اور یہ امانتیں پانچ سال کے بعد یا جنگ ختم ہونے کے ایک سال کے بعد واپس کی جائیں گی۔ لازمی پس اندازی کی اسکیم کے تحت افراد اور کمپنیوں سے ایسی آمدنیوں کا ایک خاص فی صد بطور امانت طلب کیا جائے گا جو محصول زائد منافع سے مستثنیٰ ہوں۔ چھ ہزار سالانہ یا اس سے کم آمدنی پانے والے اشخاص پر اس اسکیم کا اطلاق نہیں ہوگا۔ جن اشخاص کی آمدنی چھ ہزار سے بارہ ہزار روپے سالانہ ہے انھیں دقتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے خاص طور پر گنجائش رکھی گئی ہے۔ اگر وہ بیمہ یا پراویڈنٹ فنڈ میں اپنی آمدنی پر ادا شدنی امانت کی شرح کے دوچند سے زائد قسطیں دیتے ہوں تو ان سے امانت کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ جیسے جیسے آمدنی میں اضافہ ہوگا آمدنی کا زیادہ فی صد لازمی پس اندازی کے سلسلے میں دینا پڑے گا۔

[illegible] کی سکیم کو نافذ کر کے حکومت سرکار عالی نے بالکل صحیح اقدام کیا ہے
[illegible] کے اداریئے پر محصول آمدنی یا انکم ٹیکس عائد نہیں کیا گیا ہے ۔
[illegible] روپے ماہانہ سے زیادہ آمدنی پانے والوں کے لئے لازمی پس اندازی کی
[illegible] کم آمدنی والوں کے لئے اس قسم کی کوئی اسکیم جاری نہیں ہوئی ہے ۔ یہ ضرور صحیح
[illegible] کم آمدنی والوں کے لئے انگلستان جیسے ملک میں زیادہ آسانی اور کامیابی سے چلایا
[illegible] کے حالات میں بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے یہاں مزدور طبقہ کے لئے لازمی
[illegible] کرنے میں بہت سی دقتیں پیدا ہوں گی ۔ گھریلو صنعتوں کے لئے مزدور اور زرعی
[illegible] اس کے دائرہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا البتہ بعض منظم صنعتوں کے مزدوروں کو جنگی
[illegible] میں انعام Bonus تقسیم کر کے لازمی قرضے ادا کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے ۔
زرعی طبقہ کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ اس وقت کے حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنی زائد آمدنی
[illegible] کے لئے بچا رکھے اس وقت کی پس اندازی ہوئی دولت جنگ کے بعد کی ضروریات اور زمین
کی ترقیات وغیرہ پر صرف کی جا سکے گی ۔ اس وقت یہ دیکھا جا رہا ہے کہ زرعی طبقہ اپنی خوشحالی کا
[illegible] شادی وغیرہ پر بہت زیادہ صرف کر رہا ہے ۔ یا پھر یہ لوگ اپنی زائد آمدنی سے سونا
[illegible] خرید رہے ہیں ۔ ان کے لئے اس طرح سے اپنی آمدنی کو خرچ کرنا کسی طرح سے بھی مفید نہیں ہے
اس وقت سونا اور چاندی کی قیمت دوسری چیزوں کی طرح کئی گنا بڑھی ہوئی ہے اور یہ ایک لازمی
امر ہے کہ معمولی حالات میں ان کی قیمت موجودہ قیمت کی نصف اور تہائی بھی نہ رہے گی ۔ اس لئے اپنی
رقم کو ایسی چیزوں کی خریداری پر جن کی قیمت گرنے والی ہے، صرف کرنے میں سوائے نقصان کے
کچھ فائدہ نہیں ۔ زرعی طبقے کے لئے لازمی پس اندازی کو اس طرح سے اختیار کیا جا سکتا ہے کہ
اس وقت لیوی کے طور پر غلہ ان سے وصول کیا جا رہا ہے اس کی قیمت پوری کی پوری اس وقت
ادا نہ کی جائے بلکہ اس کا ایک خاص حصہ مختلف طریقوں سے حکومت کی تمسکات میں لگا دیا جائے
بقیہ قیمت کے بدلے میں یہ تمسکات کاشتکاروں کو دیدی جائیں ۔ یہاں اس بات کا تذکرہ کر دینا ضروری معلوم
ہوتا ہے کہ زرعی اجناس کی قیمت کا تعین کرتے وقت ان کے مصارف پیدائش کا بھی خیال رہے ۔ کاشتکار کو
معقول قیمت ملے تا کہ وہ منافع کمانے کے قابل ہو سکے ۔ زرعی طبقے کو اختیاری پس اندازی کی ترغیب
بھی مختلف طریقوں کو اختیار کر کے دلائی جا سکتی ہے ۔ یہ لوگ جاہل ہونے کی وجہ سے حالات سے واقف
نہیں ہوتے ۔ پروپیگنڈا کر کے یہ چیز واضح کی جائے کہ اس وقت خرچ میں زیادہ فائدہ نہیں الٹا نقصان ہے ۔
پس اندازی ہی موجودہ حالات میں ان کے لئے بہتر ہے ۔ ان کے لئے ڈاک خانہ کے سیونگ بنک میں سہولتیں
فراہم کرنے سے بھی زیادہ کام نہیں نکلے گا اس سلسلے میں انجمن ہائے امداد باہمی سے بہت مفید کام لیا جا سکتا ہے ۔
یہ انجمنیں ایسے کھاتے کھولیں جن میں کاشتکار اپنی رقم اس شرط کے ساتھ جمع کرے کہ یہ رقم جنگ کے ختم ہونے
کے بعد ہی واپس کر دی جائے گی ۔ امریکہ میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ بعض چیزوں کی قیمتیں اقساط کی شکل
میں جنگ کے دوران میں ادا کر دی جائیں گی اور جنگ کے اختتام پر رقم ادا کرنے والوں کو چیزیں ملیں گی اس طریقہ کو

حیدرآباد میں زرعی طبقے کے لئے بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ کاشتکار اپنی اپنی انجمنوں میں مال [illegible]
خریدنے کے لئے اقساط ادا کرتے رہیں اور جنگ کے ختم ہونے پر انہیں ان کی مطلوبہ چیزیں فراہم کی جائیں۔
ایسے لوگ جن کی آمدنی پانچ سو روپے ماہوار سے کم ہے انہیں بھی پس انداز کرنے کی ترغیب [illegible]
اس کا بہترین طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ پروویڈنٹ فنڈ کے موزوں طریقے اختیار کر کے سیونگس بینک میں انہیں اپنی
رقمیں جمع کرنے کا مشورہ دیا جائے اور یہ رقمیں جنگ کے دوران میں واپس نہ کی جائیں بلکہ جنگ کے ختم
ہونے پر ادا کی ہوں۔ اس سے بھی کہیں زیادہ مفید طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ زندگی کے بیمہ کی افادیت کا پرچار
زیادہ سے زیادہ کیا جائے۔ اب تک تعلیم یافتہ طبقے نے بیمہ کے فوائد کو صحیح طریقے پر سمجھنے کی کوشش نہیں
کی ہے اور اس لئے اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اس سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا جاتا اور بہت سے ایسے اشخاص
جن کی آمدنی اچھی خاصی ہوتی ہے اپنی اولاد کے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑتے۔ حکومت سرکار عالی نے سرکاری
بیمہ کا طریقہ رائج کیا ہے لیکن اس سے بھی جو فائدہ اٹھایا جاتا ہے وہ خاطر خواہ نہیں۔ سرکاری ملازمین صرف
تکمیل ضابطہ کی خاطر اس میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بیمہ کے کاروبار کو زیادہ سے زیادہ وسعت
دی جائے تاکہ لوگوں میں پس اندازی کی عادت پیدا ہو۔

اب تک لازمی اور اختیاری پس اندازی کے جو طریقے بیان کئے گئے ہیں ان کا معاشرہ کے نقطۂ نظر
سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ حکومت صرف مالدار اور سرمایہ داروں ہی کی مقروض نہیں رہے گی بلکہ دوسرے طبقات بھی
قومی قرضے کے مالک بن جائیں گے اور حکومت کے مالیاتی استحکام میں مختلف افراد اور طبقات کی دلچسپی بڑھ
جائے گی۔ یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ کم آمدنی پانے والا اور متوسط الحال طبقہ گرانی کی وجہ سے
ویسے ہی پریشان ہے۔ اگر اسے پس اندازی پر مجبور کیا جائے تو اس کی مشکلات میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا
لیکن یہ بات بھی ذہن نشین رہنا چاہئے کہ پس انداز نہ کرنے سے حالات اور زیادہ ابتر ہو جائیں گے جب
ہر شخص یہ کوشش کرے گا کہ اشیاء کی جو حکومت کی خریداری کے بعد محدود مقدار میں باقی رہ گئی ہیں
ان کو زیادہ سے زیادہ قیمت پر خریدے تو اس کا لازمی نتیجہ چیزوں کی قیمت کا بڑھنا اور افراط زر کے حالات
میں شدت کا پیدا ہونا ہوگا۔ افراط زر سب سے زیادہ غریب طبقہ کو متاثر کرتا ہے۔ سرمایہ داروں اور مالداروں
کو منافع کمانے کے اور مواقع پیدا ہو جاتے ہیں دولت کی تقسیم میں عدم مساوات بڑھ جاتی ہے۔ مزید برآں
اس وقت جب کہ روپے کی قدر صرف پانچ یا چھ آنے کے برابر رہ گئی ہے چیزوں کو خریدنے میں نقصان ہے
جنگ کے بعد جب کہ حالات میں دوبارہ توازن قائم ہو جائے گا اور روپیہ اپنی اصلی قدر پر آجائے گا اس وقت
روپیہ صرف کر کے زیادہ مقدار میں چیزیں حاصل کی جائیں گی۔ غرض پس اندازی اور کفایت شعاری خود
عوام کے نقطۂ نظر سے بھی بہت زیادہ مفید ہے اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگ بھوکے مریں اور
پس انداز کریں۔ کہنے سے یہ مراد ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنی ضروریات ملتوی کریں، سفر کم کریں، دعوتیں
کم دیں اور رسومات اور شادیوں وغیرہ پر زیادہ صرف نہ کریں۔ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے
کام لیں اور ایسی ضروریات جن کو ملتوی کیا جا سکتا ہے ملتوی کر دیں۔ جنگ کے بعد اپنی ضروریات کی
تکمیل کم روپیوں سے کی جا سکے گی۔ اس وقت پس انداز کی ہوئی دولت سے جنگ کے بعد زیادہ مقدار میں

[illegible] کی اور معیار زندگی کو بہتر بنایا جاسکے گا۔ اب جو کارخانے جنگی ضروریات کی چیزیں [illegible] ہیں جنگ کے بعد عوام کی ضروریات پوری کرنے والی اشیا تیار کریں گے۔ چیزوں کی [illegible] ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ وہ سستی بھی ہوں گی۔ اس وقت محنت کی کمائی کو کام میں [illegible] حاصل ہوگا۔ غرض اس وقت کفایت شعاری اور پس اندازی افراد اور حکومت دونوں کے نقطۂ نظر سے مفید ہے۔

[illegible] پس اندازی کے فوائد صرف جنگ کے دوران ہی تک محدود نہیں ہیں جنگ کے ختم ہونے پر پس اندازی اور کفایت شعاری کے اور بھی بہتر نتائج پیدا ہوں گے۔ حیدرآباد میں معاشی منصوبہ بندی (جس کا مرکزی مقصد عوام کا معیار زندگی بلند کرنا ہے) کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہوگی اور یہ سرمایہ جنگ کے دوران میں پس اندازی کی ہوئی دولت سے حاصل کیا جاسکے گا۔ اس کے علاوہ جنگ کے بعد لوگوں کی قوت خرید میں کمی روزگار میں کمی کی وجہ سے ہوگی۔ لیکن اس کمی کی تلافی ایک حد تک پس اندازی کی ہوئی دولت سے کی جاسکے گی اور کساد بازاری (جو جنگ کے بعد عموماً پیدا ہوتی ہے) کے حالات کو روکا جاسکے گا۔ اس طرح سرمایہ اور قوت خرید کی کمی کو جنگ کے دوران میں بچائی ہوئی دولت کے ذریعے سے دور کیا جاسکے گا اور ملک کی صنعتی ترقی میں مدد ملے گی۔ جنگ کے دوران میں بچانے اور مختلف قسم کے کاروبار میں لگانے کا ایک اور بڑا فائدہ بھی ہوگا۔ اب تک سرمایہ کے مالک صرف چند مالدار طبقات رہے ہیں اور انہی کی دولت میں مزید اضافہ ہوتا رہا ہے۔ جب چھوٹی چھوٹی بچتیں کرنے والے اپنے سرمایہ کو مختلف کارخانوں میں لگائیں گے تو وہ بھی کارخانوں کے حصہ دار بن جائیں گے اور اس طرح سے معاشرہ کے لئے اچھے اثرات پیدا ہوں گے، دولت کی تقسیم عدم مساوات میں کمی ہو جائے گی۔ جنگ کے دوران میں افراط زر کے اثرات کو روکنے اور جنگ کے بعد صنعتی ترقی کے لئے پس اندازی بہت ضروری ہے۔ جب تک ملک میں صنعتی ترقی نہیں ہوگی اور اس کی حیثیت زرعی ملک جیسی رہے، عوام کا معیار زندگی بلند نہیں ہو سکے گا۔ اس اہم موقع کو ہاتھ سے نہیں کھونا چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں افسوس کرنا پڑے۔

امتیاز حسین خاں

معلم بالغاں

از مولوی سید زاہد حسین صاحب ایم اے۔ ایم ایڈ

تعلیم بالغاں کو موجودہ زمانے میں جو اہمیت دی جارہی ہے اس کے پیش نظر یہ کتاب ادارہ کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ تعلیم بالغاں کی اہمیت، بالغوں کی نفسیات، طریقہ تعلیم اور چند عملی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ تعلیم بالغاں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ صفحات (۵۶) قیمت ۱۲ر

(ملنے کا پتہ) سب رس کتاب گھر۔ رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن

ادھورے گیت

بانسری کی لے میں کچھ گیت ڈھلتے ہی رہے
نت نئے ارماں مچلتے ہی رہے
آسماں سے بارشِ انوار ہو
بہہ رہی ہو چاندنی
پھیل جائیں نور کی کرنوں کے جال
رقص فرما ہوں ستارے گا رہے ہوں آبشار
گونج اٹھا ہو فضاؤں میں کوئی نوخیز راگ
ایک لامحدود نغمہ، اک مسلسل گیت، اک جھنکار ہو
جیسے پائل کی صدا ——
سطحِ دریا پہ اچھلتی کودتی لہروں کا رقص
تیز ہو نبضِ حیات
گا رہی ہو کائنات
رقص کرتی ہو جوانی کی بہار
وقت کے یہ کیف زا لمحے نہ گن
میں نے صدیوں کو نچھاور کر دیا ——
ان حسیں لمحات پر
انبساط و کیف سے معمور ہیں
اک سرودِ غیر فانی، ایک لطفِ جاوداں
تشنگیٔ روح آسودہ نہیں
شوق کا یہ پیچ و تاب
نوجوانی ہے سراپا اضطراب
زندگانی ہے تمنا کا سراب
ایک نامعلوم غم!
ایک نغمہ، اک فسانہ، ایک غم انجام یاس
سیکڑوں برسوں سے اب تک تشنۂ تکمیل ہے

سردار الہام

غزل

غباروں سے ابھی [illegible]
ارے تو یہ تری [illegible]
کوئی تارا فلک سے ٹوٹ جائے
لرز جاتی ہے راتوں کی سیاہی
جنوں کو کیا تعلق، غم سے مطلب
محبت میں فقیری ہے نہ شاہی
ہوس صورت گرِ ہر حق و باطل
معاذ اللہ جہانِ مرغ و ماہی
برہنہ سر برہنہ پا ہے آدم
بہت آساں ہے تیری کج کلاہی
عبادت اک فریبِ سوزِ پنہاں
ارے تو یہ طلسمِ خانقاہی
زمیں کو چین ہی لینے نہ دیں گے
محبت کے یہ ہنگامے الٰہی
مری آوارگی منزل نشاں ہے
دلیلِ راہ میری بے نگاہی
کہاں وہ خوابگہ کا تیرہ عالم
کہاں یہ پیدا و پنہاں تباہی

عزیز حامد مدنی

تنقید و تبصرہ

ہندوستان کی تجارت

از معین الدین بلگامی بی اے عثمانیہ۔ قیمت ۸؍ ۔ حجم ۴۸ صفحے
مقام اشاعت۔ فاطمہ منزل حمایت نگر۔ حیدرآباد دکن

زیر نظر پمفلٹ میں ہندوستان کی تجارت پر سیر حاصل بحث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور سات عنوانوں کے تحت موضوع کو واضح کیا گیا ہے۔ (۱) ہندوستان کی معیشت میں تجارت کی اہمیت (۲) ہندوستان کی تجارت کے اقسام (۳) اندرونی تجارت (۴) بیرونی تجارت (۵) توازن تجارت و توازن ادائی (۶) تجارتی پالیسی (۷) موجودہ جنگ کے ہندوستان کی تجارت پر اثرات۔

موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے کارآمد کتاب ثابت ہوگی۔

ہندوستان کے زرعی مسائل

از شفیق الرحمن بی اے عثمانیہ۔ قیمت ۸؍ حجم ۸۲
مقام اشاعت۔ فاطمہ منزل۔ حمایت نگر۔ حیدرآباد دکن

ہندوستان زراعتی ملک ہے اور اس کی ترقی کا انحصار محض زرعی ترقیوں پر ہے۔ گیارہ عنوانات کے تحت زراعت کے معاملات کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے (۱) تاریخی پس منظر (۲) زرعی ترقی میں حکومت کا حصہ (۳) زمین کی زرخیزی (۴) کھاد کا استعمال (۵) ذرائع آب پاشی (۶) زمین کٹاؤ (۷) تقسیم و انتشار اراضی (۸) زرعی آلات (۹) مویشی (۱۰) زراعت دوران جنگ میں (۱۱) زرعی ترقی کا مستقبل۔

زارعین کے لئے نہایت مفید معلومات یکجا کئے گئے ہیں اور نہایت اچھی طرح زراعت کے مستقبل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ضمناً مویشیوں سے بھی بحث کی گئی ہے۔

ہندوستان میں امداد باہمی کی تحریک

از محمد طاہر حامد عثمانیہ۔ قیمت ۸؍ حجم ۸۰
ناشر۔ ادارۂ معاشیات۔ فاطمہ منزل حمایت نگر حیدرآباد دکن

زیر نظر کتاب چھ فصلوں پر ... (۱) امداد باہمی کی تعریف (۲) مختلف ممالک میں امداد باہمی (۳) امداد باہمی کی ضرورت (۴) ہندوستان میں امداد باہمی کا آغاز و ارتقا (۵) امداد باہمی کے ادارے (۶) ریزرو بنک اور امداد باہمی (۷) امداد باہمی کا عملی پہلو اور مستقبل۔

کافی اچھا مطالعہ ہے۔ اس تحریک سے ہندوستان میں ناکامی کے اسباب بیان کئے گئے ہیں اور اس کی امید ظاہر کی گئی ہے کہ اگر اس کو صحیح اصولوں پر چلایا جائے تو بہت مفید ہوگی۔

ہندوستان کی قومی آمدنی

از توفیق محمد خاں بی اے عثمانیہ۔ قیمت ۸؍ حجم ۸۰ صفحے
پتہ۔ فاطمہ منزل حمایت نگر۔ حیدرآباد دکن۔

مضمون کو چار فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) قومی آمدنی سے کیا مراد ہے؟ (۲) ہندوستان کی قومی آمدنی کے مختلف اندازے (۳) قومی آمدنی معلوم کرنے کے طریقے (۴) قومی آمدنی میں اضافہ کی تجاویز۔

معاشیات کے طالب علم یا معاشی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے اسے ضرور پڑھیں۔

ہندوستان کا نظام بنک کاری

از انعام الدین بی اے عثمانیہ۔ قیمت ۸؍ ۔ حجم ۸۰ صفحے
پتہ۔ فاطمہ منزل۔ حمایت نگر۔ حیدرآباد دکن۔

چار عنوانات کے تحت بنک کاری پر بحث کی گئی ہے (۱) بنکوں کی اہمیت (۲) ہندوستان میں بنک کاری کی تاریخ (۳) ہندوستانی بازار زر (۴) ریزرو بنک۔

اس چھوٹے سے کتابچہ میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "ز۔ س"

اطلاع۔ براہ کرم اپنے ذمے کا چندہ روانہ فرما کر شکریہ کا موقعہ عطا کیجئے۔

ادارے کی خبریں

مرکز اردو امتحانات بمبئی کا جلسۂ تقسیم اسناد

۱۲ اپریل اتوار کے دن

شام کو انجمن اسلام (الٰہی) میں ایک جلسہ ہوا جس میں ان طلبہ کو جو ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کے اردو امتحانات میں بمبئی مرکز سے کامیاب ہوئے سندیں دی گئیں۔ جلسہ کی صدارت جناب ڈاکٹر ملک الرحمٰن صاحب پرنسپل اسمٰعیل کالج نے فرمائی۔ بعد جناب پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی نے کامیاب طلبہ کو خطاب کیا۔

جلسہ کی ابتدا پنڈت کیفی کی مشہور نظم "ہماری زبان" سے ہوئی جس کو ایک طالب علم نے نہایت خوش الحانی سے پڑھا۔ اس کے بعد انجمن اسلام کے مددگار معتمد اعزازی نے امتحانات کی رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ سندوں کی تقسیم کے بعد ہر امتحان میں بمبئی مرکز سے درجۂ اول میں کامیاب ہونے والے امیدواروں کو کتابیں بطور انعام دی گئیں۔ یہ انعامات انجمن اسلام کو شہر بمبئی کی انجمن ترقی اردو کی طرف سے وصول ہوئے تھیں۔

پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی نے کامیاب امیدواروں کو مبارک باد دینے کے بعد ہندوستان کے لئے ایک مشترکہ زبان کی ضرورت و اہمیت پر ایک مختصر مگر جامع تقریر فرمائی۔ صاحب موصوف نے فرمایا کہ اگر ہندوستان ایک ہونا چاہتا ہے اور اگر ہندوستانی ایک دوسرے کی باتوں کو نہیں، بلکہ دلوں کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کا تنہا حل یہی ہے کہ سارے ملک کی زبان ایک ہو جائے۔ پھر جناب موصوف نے بتایا کہ اردو ہی ہر حیثیت سے ہندوستان کی مشترکہ زبان بننے کی اہل اور حق دار ہے۔

جناب صدر نے اپنی تقریر میں کامیاب طلبہ کو اور آگے قدم بڑھانے کی ترغیب دلائی اور یہ امید ظاہر کی کہ یہ امتحانات اردو یونیورسٹی کا سنگ بنیاد ثابت ہوں گے۔

مددگار معتمد اعزازی انجمن اسلام بمبئی

مرکز اردو امتحانات بمبئی کی رپورٹ

(جو ۱۲ اپریل کے جلسۂ تقسیم اسناد میں پڑھی گئی)

جناب صدر!

بمبئی میں تعلیم بالغاں کا کام ایڈلٹ ایجوکیشن کمیٹی کے تحت ایک عرصے سے جاری ہے۔ اسی طرح بمبئی ایڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی سرپرستی میں تعلیم یافتہ حضرات کو دوسری زبانوں کے ساتھ اردو پڑھانے کا کام بھی ایک مدت سے انجام پا رہا ہے۔ لیکن پہلی صورت میں تعلیم ایک بہت محدود معیار پر پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی اور دوسری صورت میں کوئی باضابطہ نصاب اور معیار مقرر نہیں تھا۔ چند نوجوانوں کی جنھیں اردو زبان سے بہت دلچسپی ہے، ایک بہت ہی مختصر سی جماعت نے یہ طے کیا کہ دونوں صورتوں کی اصلاح کی جائے اور اس کے لئے مناسب یہ سمجھا گیا کہ ان تمام لوگوں کے لئے جو مختلف کلاسوں میں تعلیم حاصل کرتے ہوں امتحانات مقرر کئے جائیں۔ خوش قسمتی سے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی سرپرستی میں تین چار سال سے باضابطہ نصاب و معیار کے تحت اردو امتحانات ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ ان اردو دوست نوجوانوں نے ادارہ سے درخواست کی کہ بمبئی میں بھی ان امتحانات کا مرکز قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ ادارہ نے بڑی خوشی سے مرکز بنانے کی اجازت دی اور بمبئی میں اس سلسلہ کا پہلا امتحان دسمبر ۱۹۴۳ء میں ہوا۔

ادارہ کی طرف سے یہ امتحانات سال میں دو بار یعنی جولائی اور دسمبر میں ہوا کرتے ہیں۔ جولائی میں چار امتحانات یعنی اردو دانی، اردو زباں دانی، اردو عالم، اردو فاضل ہوا کرتے ہیں۔ لیکن دسمبر میں صرف ابتدائی یعنی اردو دانی کا امتحان ہوتا ہے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۴۳ء

میں جب بمبئی میں پہلے پہل مرکز قائم ہوا تو صرف اردو دانی کا امتحان ہوا جس میں ۲۷ امیدوار شریک ہوئے اور ان میں ۱۲ کامیاب ہوئے۔

بایان مرکز نے یہ محسوس کرکے کہ یہ ایک نہایت مفید اور اہم کام ہے اور چند افراد اس کو باضابطہ طور پر انجام نہیں دے سکتے اس کو انجمن اسلام کے سپرد کر دیا تاکہ ایک پبلک ادارہ کی سرپرستی میں یہ مفید و اہم کام بہتر طور پر انجام پا سکے۔ چنانچہ اس سلسلے کا دوسرا امتحان جولائی ۱۹۴۲ء میں انجمن کی سرپرستی میں ہوا۔ اس دفعہ مختلف امتحانات میں امیدوار شریک ہوئے جن کی تعداد حسب ذیل ہے:-

اردو عالم	اردو زبان دانی	اردو دانی
۳ امیدوار	۱۰ امیدوار	۵۶ امیدوار

ان امتحانات کا نتیجہ حسب ذیل رہا:-

اردو عالم -	۳ امیدواروں میں	۳ کامیاب
اردو زبان دانی -	۱۰ 〃	۸ 〃
اردو دانی -	۵۶ 〃	۲۷ 〃

اردو دانی کے امتحان میں ایک خاتون بھی شریک تھیں اور یہی مرکز میں اول آئیں۔

اردو دانی کے امتحان میں دو تعلیم یافتہ ہندو حضرات بھی شریک تھے۔

اسی سال کا دوسرا امتحان دسمبر ۱۹۴۲ء میں ہوا اور حسب معمول صرف اردو دانی کا امتحان ہوا۔ اب کے بار ۵۸ امیدوار امتحان میں شریک ہوئے جن میں ۳۹ کامیاب ہوئے۔

امیدواروں میں ۱۳ تعلیم یافتہ خواتین بھی تھیں جن میں ایک پارسی اور ۱۲ ہندو تھیں۔ یہ تمام خواتین امتحان میں کامیاب ہوئیں اور دو امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئیں۔

مرد امیدواروں میں ۶ تعلیم یافتہ ہندو بھی تھے۔ ان میں چار کامیاب ہوئے اور ایک نہ صرف امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئے بلکہ مرکز میں اول آئے۔

یہاں ہم بمبئی ایڈلٹ ایجوکیشن کمیٹی کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس نے ہماری درخواست پر اپنے [illegible] میں ہمارے نصاب کے مطابق تعلیم دینا منظور کیا اور طلبہ کو امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دی۔

ہم لٹریسی کلاسوں کے سپروائزر صاحبان کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ وہ لوگ اس سلسلہ میں انجمن کا ہاتھ بٹاتے رہے ہیں۔

ہم جناب تصدق حسین صاحب ہیڈ ماسٹر میونسپل کرلا اینگلو اردو ہائی اسکول، جناب سید شہاب الدین دسنوی صاحب سکریٹری صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ اور جناب انصار علی صاحب، مدرس انجمن اسلام ہائی اسکول کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان حضرات نے گزشتہ امتحانات کے موقعہ پر زبانی امتحان کے سلسلے میں ہماری مدد فرمائی۔

ادارۂ ادبیات اردو امتحانات کے سلسلے میں ہم کو اکثر مراعات دیا کرتا ہے۔ ہم اس کے لئے ادارہ کے شکر گزار ہیں۔

معتمد اعزازی - انجمن اسلام، بمبئی

روئداد مجلس عاملہ شعبۂ نسواں

شعبۂ نسواں کی مجلس عاملہ کا اجلاس بمقام دفتر ادارہ - رفعت منزل بتاریخ ۱۶ اسفندار ۱۳۵۲ف صبح ساڑھے دس بجے منعقد ہوا۔ حسب ذیل ارکان نے شرکت کی۔

۱- محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ	۴- محترمہ بلقیس بانو صاحبہ
۲- 〃 عظمت النساء بیگم صاحبہ	۵- 〃 سعید النساء بیگم صاحبہ
۳- 〃 تہنیت النساء بیگم صاحبہ	۶- 〃 بشیر النساء بیگم صاحبہ

محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ نے بذریعہ خط شرکت سے معذوری ظاہر فرمائی اور محترمہ فہمیدہ سلطانہ صاحبہ کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ اورنگ آباد میں ہیں۔ بذریعہ ٹیلیفون یہ اطلاع ملی کہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ معتمد شعبۂ نسواں کا مزاج ناساز ہے اور وہ تشریف نہیں لاسکیں۔ اس لئے

اور شام میں ایک جلسہ منعقد کر گئے ادارہ کے مقاصد کو
واضح کرتے ہوئے قیام شاخ کی تحریک کی جو بہ غلبۂ آراء
منظور ہوئی اسی جلسہ میں ایک مجلس انتظامی بھی تشکیل دی
گئی اور توقع تھی کہ اضلاع کی دیگر شاخوں کی طرح شاخ
نرمل بھی اردو زبان کی خدمت انجام دے گی اور نرمل
میں تعلیم بالغاں کی مہم کا آغاز کیا جائے گا۔ لیکن اس
شاخ کا قیام ایسی منحوس گھڑی میں عمل میں آیا کہ آج تک
اس نے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا اور حرف غلط کی طرح
مٹ کر رہ گئی تھی۔ مجھے اس کا بڑا قلق تھا اور جب کبھی
اس کا خیال آتا تو ایک روحانی تکلیف ہوتی۔ میں موقع
کا متلاشی تھا کہ کسی طرح اس شاخ کو پھر سے زندہ
کرنا چاہیے۔ چنانچہ میرے ایک دوست اور جامعہ کے ممتاز
فارغ التحصیل مولوی محمد بن علی بادہاب صاحب بی اے
نرمل کے تحصیل دار منتخب ہوئے۔ میں نے صاحب موصوف
سے نرمل کی شاخ کا حال بیان کیا اور انھیں توجہ دلائی
کہ کسی طرح نرمل کی شاخ کا احیا کیا جائے۔ تحصیلدار صاحب
نے اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اس وقت تو آمادگی ظاہر
نہ کی لیکن مستقبل قریب میں اس کام کو پورا کرنے کا
وعدہ فرمایا۔ حسن اتفاق سے میرے ایک دوست مسٹر
شوکت علی خاں ایم اے نرمل کے دوم تعلقدار ہو کر
آئے۔ صاحب معز کو اردو علم و ادب سے خاص دلچسپی
ہے اور تحصیل دار صاحب کے توجہ دلانے پر انھوں نے
بھی اس کام میں دلچسپی لینے کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ
تحصیل دار صاحب نے ...... مورخہ ۱۸ اردی بہشت
۱۳۶۵ف میں مجھے نرمل آنے کی دعوت دی تاکہ شاخ کا
احیاء ہو اور ایک دارالمطالعہ اور مدرسہ شبینہ کا افتتاح
کیا جائے۔

میں ۱۰ اردی بہشت ۱۳۶۵ف کو شام کے ۴ بجے
کی ٹرین سے نظام آباد روانہ ہوا۔ ٹرین نظام آباد
پر ۱۰ بجے پہنچی اور میں نے رات وہیں گزاری۔ صبح
مولوی سید غوث صاحب ایم اے دوم تعلقدار [illegible]
ادارۂ ادبیات اردو دوم تعلقدار [illegible]
ایک سرکاری کانفرنس کے سلسلے میں نظام آباد [illegible]
لائے تھے۔ صاحب موصوف سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔
میں آپ کی علمی قابلیت، ملک و قوم کی خدمت کے جذبات
اور حسن اخلاق سے بے حد متاثر ہوا۔ ساڑھے گیارہ
بجے کی بس سے روانہ ہو کر ساڑھے تین بجے نرمل پہنچا۔
جناب تحصیل دار صاحب نے اپنے مکان پر میرے قیام کا
انتظام کیا تھا۔ صاحب موصوف میرے منتظر تھے۔
کھانے سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر آرام کیا۔ جلسہ دوسرے
دن شام کو رکھا گیا تھا۔ شام میں ۶ بجے دوم تعلقدار صاحب
میری ملاقات کے لئے تشریف لائے اور تھوڑی دیر بعد
مولوی عبدالجبار صاحب سبحانی صدر مدرس بھی آ گئے۔
ان اصحاب سے ملاقات رہی۔ دوم تعلقدار صاحب نے
قیام شاخ اور ادارے کے متعلق تبادلۂ خیال فرمایا۔
یہ صحبت تقریباً دو گھنٹے رہی۔ دوم تعلقدار صاحب نے
رات کے کھانے پر مدعو فرمایا۔ حسن اتفاق سے اس
دعوت میں مولوی عبدالقیوم خاں صاحب [illegible]
ڈائرکٹر کارپوریشن، مولوی سید حسین صاحب [illegible]
مہتمم کوتوالی عادل آباد، مولوی سرتاج بیگ خاں صاحب
دوم تعلقدار عادل آباد اور مولوی شرف الدین صاحب
وکیل نظام آباد بھی شریک تھے۔ منصف صاحب اور
مہتمم صاحب تعمیرات سے بھی ملاقات ہوئی۔
دوسرے دن دوپہر میں صدر مدرس صاحب
نے کھانے پر مدعو فرمایا۔ شام میں ۶ بجے عالی جناب
مولوی شوکت علی خاں صاحب ایم اے دوم تعلقدار
کی صدارت میں جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں عوام کے
علاوہ جناب منصف صاحب، جناب مہتمم صاحب تعمیرات،
سیٹھ لوڈورام صاحب، سیٹھ [illegible] صاحب
اور وکلاء صاحبین شریک تھے۔ جناب تحصیل دار صاحب

[illegible] نہایت ہی موثر الفاظ
[illegible] ہوئے میرا تعارف کرایا۔ اس کے
[illegible] ایک مختصر تقریر کی جس میں ادارہ کے مقاصد
[illegible] کی اہمیت و ضرورت کو بیان کیا اور یہ
[illegible] ذریعہ تعلیم بالغان کو کیا اہمیت حاصل
[illegible] زبان کی خدمت در اصل ایک قومی خدمت ہے۔
[illegible] ہی ہندو مسلم اتحاد کا سنگ قرار دی جا سکتی ہے۔
ابھی چند دن پہلے ہندوستان کی عام زبان کا فیصلہ کرنے کے لئے وردھا میں گاندھی جی کی صدارت میں ایک کمیٹی منعقد ہوئی تھی جس میں ڈاکٹر تارا چند، مولانا سلیمان ندوی، ڈاکٹر عبدالحق وغیرہ شریک تھے۔ ان حضرات نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد یہ تصفیہ کیا کہ ہندوستان کی عام زبان ہندوستانی ہو سکتی ہے۔ جو اردو اور ناگری رسم الخط میں لکھی جائے گی۔ اردو لکھنے والوں کو ناگری اور ناگری لکھنے والوں کو اردو رسم الخط سیکھنا چاہیئے۔ بہرحال اب یہ طے پا گیا کہ ہمارے ملک کی عام زبان اردو ہوگی۔ اس لئے ہندوستان کے ہر خطہ میں رہنے والوں کو خواہ ان کا تعلق کسی مذہب یا فرقے سے ہو اردو کی ترقی کے لئے کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ یہی ہماری قومی زبان ہے۔ میں اپنی تقریر کو طول دینا نہیں چاہتا کیونکہ باتیں تو بہت کی جا سکتی ہیں لیکن میں اس کا قائل ہوں کہ باتیں کم ہوں اور کام زیادہ۔ آخر میں زرل کے رہنے والوں سے استدعا کروں گا کہ اپنی زبان کو پھیلانے اور اس کو ترقی دینے کے لئے کسی مدد سے دریغ نہ فرمائیں اور وہ لوگ جو پڑھنے سے محروم ہیں ان کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ حضرات میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آج کل کسی کو لکھنا پڑھنا سکھانا بہت بڑی نیکی ہے۔ مجھے آپ سے بڑی بڑی توقعات ہیں۔ امید کہ آپ میری اس گزارش پر ضرور توجہ فرمائیں گے اور اس بات کا پکا ارادہ کر کے یہاں سے اٹھیں گے کہ زرل میں کوئی شخص ان پڑھ نہ رہے گا۔

اس کے بعد عالی جناب دوم تعلقدار صاحب نے میری تقریر پر تبصرہ فرماتے ہوئے جن الفاظ میں میرا تعارف کرایا شاید میں اس کا مستحق نہ تھا۔ یہ محض صاحب موصوف کی عالی ظرفی، حسن اخلاق اور خلوص تھا۔ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ادارۂ ادبیات اردو کئی سال سے ملک میں اردو کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے بانی ڈاکٹر زور صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اپنی ذاتی کوشش اور گورنمنٹ کی امداد کے بغیر ادارہ قائم کیا اور اسے کامیابی سے چلا رہے ہیں۔ یوں تو ہندوستان میں اور کئی ادارے ہیں جن کو ہماری حکومت کی طرف سے رقمی امداد ملتی ہے۔ لیکن ادارۂ ادبیات اردو کی ہم سب کو مدد کرنی چاہیئے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا رہا۔ میں تمام باشندگان زرل کی طرف سے شاہد صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ زرل کی شاخ اردو زبان کی خدمت کرے گی کیونکہ یہ ہماری مادری اور سرکاری زبان ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو نے اب ایک یادگار کام کی طرف قدم اٹھایا ہے اور وہ اس کی ذاتی عمارت ہے۔ غالباً شاہد نے عمداً اس کا ذکر نہیں کیا کیونکہ ادارہ کا مسلک دست سوال دراز کرنا نہیں ہے لیکن میں اس کام کی اہمیت کے پیش نظر یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اہل ملک کو ادارہ کی عمارت کے لئے دل کھول کر مدد کرنی چاہیئے۔ یہ ایک یادگار عمارت ہوگی۔ عمارت فنڈ کے لئے عالی جناب آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر صدر المہام تعمیرات و نائب صدر ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے اپیل شائع ہوئی ہے عمارت کا مجوزہ نقشہ بھی اس میں شریک ہے۔ یہ عمارت سلطان العلوم کے عہد میمنت مہد کی ایک عظیم الشان یادگار ہوگی۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

دلچسپ اُدبی کتابیں

جدید طرزِ سخن کے نوادر

[illegible] [illegible] مجموعہ بیکلؔ کی نظموں اور غزلوں کا بہترین مجموعہ ہے۔ جناب بیکلؔ حیدرآباد کے نوجوان شعراء میں ایک خاص شہرت کے مالک ہیں اور ان کا کلام بہت مقبول ہے۔ عالی جناب اکبر [illegible] صاحب کا دیباچہ اور جناب پروفیسر سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ جدید شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ صفحات (۱۹۲) طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر سنہری نام قیمت عالی

نمودِ زندگی مولوی سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کے کلام کا مجموعہ ہے جو نہایت سلیقہ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں (۱۰۱) نظمیں (۱۷) غزلیں اور (۵) رباعیات ہیں۔ سید علی منظور صاحب حیدرآباد کے کہنہ مشق مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی شاعری کے قدردان دور دور پھیلے ہوئے ہیں اُردو کا کوئی مشہور و مستند رسالہ ایسا نہیں جس میں آئے دن ان کی غزلیں اور نظمیں نہ چھپی ہوں اور پھر یہ نظمیں ایک رسالے سے دوسرے رسالے میں نقل کی جاتی ہیں۔ علی منظور صاحب عہدِ حاضر کے ان چند کامیاب شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں زندگی کی صحیح ترجمانی کی اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی صفحات (۲۱۲) قیمت عہ

انوار حضرت علی اختر حیدرآبادی کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ علی اختر صاحب ہندوستان کے چوٹی کے شاعروں میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پُرگو شاعر ہیں بلکہ حیات اور شباب پر اُن کی نظر بہت وسیع ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شعر ان کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہے۔ موجودہ زمانے میں سوائے جوشؔ کے کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں۔ اس مجموعے کی اشاعت سے جدید اُردو شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا ہے صفحات ۱۰۰ قیمت عہ

ارمغانِ جذب پنڈت رگھو بیدر راؤ صاحب جذبؔ (عالم پوری) کی رباعیات کا مجموعہ ہے۔ اس کے ذریعہ سے سنسکرت اور بھاشا کی شاعری کے اخلاقی اور ناصحانہ پہلو کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ اکثر رباعیاں سنسکرت اور بھاشا کے شعراء کے خیالات کا عکس ہیں اور بعض خود ان کے دل و دماغ کی فکر و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ سادگی، سلاست، خیالات سلجھے ہوئے اور طرزِ بیان اس قدر سادہ اور بے تکلف کے معمولی سمجھ کا انسان بھی سمجھ سکے۔ ہر رباعی دل کی دھڑکن ہے جو شعر کے جسم میں آگئی ہے ابتدا میں جناب ماہر القادری صاحب کا ایک بسیط اور معلومات آفریں مقدمہ ہے جس میں انھوں نے سنسکرت اور ہندی شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ صفحات (۱۲۰) قیمت مجلد ۱۲ر

ماہِ لقا یہ مولوی عزیز احمد صاحب بی اے ایم (لندن) پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ مصنف شہزادی و شہوار کی طویل نظموں کا مجموعہ ہے جن میں یورپ کی شاعری کے مفید اثرات جلوہ گر ہیں۔ جدید یا ترقی پسند اردو شاعری کے دلدادہ اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ صفحات ۱۰ قیمت عہ

سراجِ سخن شاہ سراج اورنگ آبادی اُردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری نے سراجؔ کے کلام کا پاکیزہ انتخاب کیا ہے۔ اگرچہ ان کا زمانہ دو سو سال پہلے کا ہے لیکن ان کا کلام بہت صاف ہے جس کا یہ دلچسپ اور معیاری انتخاب ہے۔ پروفیسر سروری صاحب کے محققانہ اور پُرازمعلومات مقدمہ سے اس مجموعہ کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ جو اصحاب پاکیزہ اور سلیس و سادہ شاعری کے دلدادہ ہیں وہ اس بہترین انتخاب کی قدر کریں گے صفحات ۱۶۷ قیمت ۱۲ر

ایمانِ سخن | مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار اُردو نے عہد آصفجاہی
کے ملک الشعرا شیر محمد خاں ایمان کے کلام کا انتخاب کیا ہے جس کے ساتھ
ان کا بلند پایہ مقدمہ بھی ہے جس میں انھوں نے ایمان کے حالاتِ زندگی
اور شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ ایمان اُردو کے اساتذۂ سخن میں شمار
کئے جاتے ہیں اور ان کے کلام اور قصائد کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں
تعداد صفحات (۱۲۰) قیمت ۱۲ر

فیضِ سخن | میر شمس الدین محمد فیض اُردو شاعری کے مسلم الثبوت استاد
مانے جاتے تھے۔ وہ ایک صاحب دل بزرگ تھے۔ ان کا کلام ان کے دل
کی آواز ہے۔ وہ ایک خاص مکتب شاعری کے بانی بن گئے تھے جو
عاشقانہ شاعری میں تصوف کی رنگ آمیزی کرتا ہے۔ ڈاکٹر
سید محی الدین صاحب قادری زور نے حضرت فیض کے کلام کا بہترین
انتخاب شائع کیا ہے۔ اس کے ساتھ ان کا ایک بصیرت افروز مقدمہ
بھی ہے جس میں فیض کی حیات اور شاعری پر مستقل بحث کی گئی ہے

اس کتاب میں غزلیات کے علاوہ فیض کی مثنویوں اور دیگر
کلام کا بھی انتخاب شامل ہے۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ
حضرت خواجہ میر درد اور شاہ سراج اورنگ آبادی کے بعد تصوف و
عرفان اور شعر و سخن کا امتزاج جتنا اچھا حضرت فیض کے کلام میں
موجود ہے کسی اور اردو شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ تعداد صفحات (۱۴۴)
مع تصویر مرقد حضرت فیض قیمت ۱۲ر

بادۂ سخن | ڈاکٹر احمد حسین مائل کے کلام کا دلچسپ اور معیاری انتخاب ہے
ان کے کلام میں سادگی اور خداداد بے تکلفی ہے اس انتخاب کے ساتھ
ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کا معرکتہ الآرا مقدمہ بھی شریک ہے
جس میں داغ اور مائل کے معرکوں کا بھی تذکرہ درج ہے صفحے ۱۴۰ قیمت ۱۱ر

کیفِ سخن | حضرت کیفی ایک بذلہ سنج طبیعت کے سخن گو تھے۔ آزاد منشی،
لطیفہ سنجی ان کے کلام میں جا بجا جھلکتی ہے وہ حیدرآباد کے جدید شعرا
کے بلند پایہ طرح اندازوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری
زور نے ان کے کلام کا انتخاب ایک معلومات افزا مقدمہ کے ساتھ
مرتب کیا ہے اُردو شاعری کا ذوق رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب
مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔ حضرت کیفی دکن کے [illegible]
اس انتخاب میں ان کی چند نظموں کے اقتباسات بھی شامل ہیں۔

متاعِ سخن | نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز داغ دہلوی کے شاگرد
اور حیدرآباد کے ایک پختہ مشق شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں [illegible]
اور زبان کی پاکیزگی نمایاں ہوتی ہے۔ اس انتخاب کے ساتھ جناب
ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کا مقدمہ بھی ہے جس میں
ان کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے شاعری اور زبان کا مذاق
رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔
تعداد صفحات (۱۳۶) مع تصویر شاعر قیمت ۱۲ر

مرقعِ سخن جلد اول | یہ دکن کے پچیس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر
تذکرہ ہے جامعہ عثمانیہ کے متعدد اساتذہ طلبۂ فاضلین اور اہل قلم نے
اس تذکرہ کی تالیف میں حصہ لیا ہے۔ یہ تذکرہ پانچ ادوار پر
منقسم ہے ہر دور کے شروع میں ایک تمہید ہے جس میں اس کی
ادبی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے ہر عہد کے مشاہیر شعرا کے
حالات ان کے کلام کا نمونہ اور اس پر تبصرہ ہے ان شاعروں کے
تذکرے کے ساتھ دیگر ہم عصر دکنی اور شمالی ہند کے شعرا کے نام
دیدئے گئے ہیں تاکہ اُردو شاعری کا تاریخی منظر معلوم ہو سکے۔
شاعروں کی تصویروں کے علاوہ فرمانروایانِ دکن اور مقتدرانِ
ادب و شعر کی بھی تصویریں شریک ہیں۔۔۔ صفحے [illegible] مع تصاویر قیمت [illegible]

مرقعِ سخن جلد دوم | پچاس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے
اس کی ترتیب بھی اسی ڈھنگ پر ہے جیسی پہلے کی ہے۔ ہر شاعر کے
سوانح حیات اور نمونۂ کلام کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری پر تبصرہ
بھی کیا گیا ہے۔ ان دونوں کتابوں سے حیدرآباد کی گزشتہ اور
موجودہ شاعری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے صفحے [illegible] تصاویر [illegible]

[illegible]	۳۳۶	۳	۸
[illegible]	۱۹۶	۱	۰
[illegible]	۲۳۶	۰	۱۲
[illegible]	۴۸	۰	۴
سرسید احمد خان	۱۶	۰	۲
سرسالار جنگ	۴۸	۰	۶
مغربی تصانیف اردو کے تراجم	۱۳۵	۱	۴
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴
اقبال نمبر	۱۹۸	۱	۴
سائنس کے کرشمے	۱۱۴	۱	۰
عمرانی [illegible]	۲۳۰	۲	۱۲
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸
دادا بھائی	۱۶	۰	۴
اردو نامہ	۲۰۰	۲	۰
ارسطو جاہ	۹۵	۰	۶
عماد الملک	۴۰	۰	۶
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۵
دوسری کتاب	۵۶	۰	۵
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	[illegible]
کاغذ کی ناؤ	۱۲۶	۱	۴
فن تقریر	۹۲	۰	۸
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴	۱	۰
ہندستانی تمدن	۳۴۰	۳	۸
پودوں کی کہانی	۸۰	۰	۰
[illegible]	۱۰۰	۱	۰
پانی کی کہانی	۴۸	۰	۶
[illegible]	۳۱۲	۳	۸
[illegible]	۴۰	۰	۴
تاریخ ادب اردو	۱۷۶	۱	۴
ورڈس ورتھ اور اس کی شاعری	۱۸۴	۱	۴
ہوش کے ناخن	۹۴	۱	۰
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹	[illegible]	۰
[illegible]	۱۷۶	[illegible]	۸
[illegible]	۱۰۴	[illegible]	[illegible]
[illegible] خاں	۳۲	[illegible]	۴
تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول	۳۴۹	۵	۰
[illegible] اور عربستان	[illegible]	۰	۱۰

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible] سخن	۱۳۴	[illegible]	۱۱
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	[illegible]	[illegible]	۰
دوم (۵۰)	۴۳۴	۵	۰
نقد سخن	۱۷۵	۱	۰
[illegible]	۲۲۸	۲	۸
[illegible]	۱۹۲	[illegible]	۰
معاصر [illegible]	۱۸۴	[illegible]	۰
[illegible] کی دنیا	۱۳۵	۱	۰
[illegible] مدراس میں اردو	۳۹۶	[illegible]	۸
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
نذر دکن	[illegible]	[illegible]	[illegible]
روح غالب	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
دفتری معلومات	۵۶	[illegible]	۶
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶
اردو [illegible] کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲
نمود زندگی	۲۱۶	۱	۸
سرگذشت ادارہ	۳۰۴	۰	۱۲
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۴	۳	۸
[illegible]	۳۸	[illegible]	[illegible]
خطابیات	۱۱۴	۰	۱۲
علم خانہ داری	۱۵۶	۱	۰
[illegible] (۱۹) تصاویر	[illegible]	۱	[illegible]
[illegible]	[illegible]	۱	۸
[illegible] (۳)	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]		[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]		[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]		[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]		[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]		[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]		[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]		[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ارمانِ مسرت

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

(دریا کے کنارے ایک چٹان پر ایک دوشیزہ سر نیوڑائے بیٹھی ہے۔ عمر تیرہ اور چودہ برس۔ نظر کے انہماک چہرہ کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ماضی کی کسی خیالی تصویر میں محو ہے۔ اس کے پاس ہی ایک جوان کھڑا ہے جس کا رنگ کالا، بال مائل اور چہرہ ستا ہوا ہے۔ سینہ پر ایک نقرئی تمغہ آویزاں ہے۔ اس کی نظریں دوشیزہ پر جمی ہوئی ہیں۔ دریا کی سطح پرسکون ہے۔ کوئل کوکو کر رہی ہے۔ گرما کا موسم ہے، مئی کا مہینہ، مطلع صاف اور دھوپ تیز ہے۔ دریا کے کنارے کے جو راستہ ہے اس کی دونوں جانب جھاڑیاں پھولوں سے لدی کھڑی ہیں۔)

دوشیزہ:۔ خدا جانے وہ کیا کہے گا۔

جوان:۔ کہے گا کیا۔ آخر اتنے دنوں تک کہاں مر رہا تھا!!

دوشیزہ:۔ وہ اس سے پہلے آ ہی نہ سکتا تھا۔ ہائے اللہ! وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔

جوان:۔ اور مجھے تو تم سے دشمنی ہے نا!

دوشیزہ:۔ مجھے جنگ سے اس کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔

جوان:۔ آخر میں بھی تو جنگ ہی پر گیا تھا!

دوشیزہ:۔ (اسے چھوتے ہوئے) آہ!

جوان:۔ کیا واقعی...... (آواز رک جاتی ہے بولا نہیں جاتا)

دوشیزہ:۔ نہیں۔ نہیں جم! تمہاری طرح نہیں!!

جوان:۔ پھر پریشانی کی کیا بات ہے؟ ہمت سے کام لو!

دوشیزہ:۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا۔

جوان:۔ کوئی پاتا ہے۔ کوئی کھوتا ہے!

دوشیزہ:۔ مجھے اس کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ مگر کیا معلوم تھا کہ وہ واپس آجائے گا؟

جوان:۔ (اکڑپن سے) اس میں کیا قباحت ہے۔ صاف صاف کہہ دینا کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔

دوشیزہ:۔ کہہ تو دوں...... لیکن........

جوان:۔ (اس کے شانوں کو کڑا کر یاد دلانے کو ذرا سا جھٹکا دیتے ہوئے) تم اس کے منتظر کی کوشش کی کہ تم دونوں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑوں گا!!!

(دوشیزہ اس کی طرف پاس نظروں کو دیکھ کر جھکی ہوئی ہے اور خوشامدانہ انداز میں اس کے قریب ہوتی ہے۔) تو بگڑو جم! مجھے یہی امید ہے!

جوان:۔ آؤ اس کے یہاں پہونچنے سے پہلے نکل چلیں۔

(وہ انکاری طور پر سر ہلاتی ہے)

جوان:۔ آخر ٹھہرنے سے فائدہ؟ دنیا کے راستے ہم پر کھلے ہوئے ہیں!

دوشیزہ:۔ اب اس وقت تو میرا جانا ممکن ہے۔ اس کے بعد البتہ اسے بھول جانے کی کوشش کروں گی۔

جوان:۔ خدا تمہاری مدد کرے۔

دوشیزہ:۔ وقت کیا ہوگا جم؟

جوان:۔ کوئی ۲ ½ بجے ہوں گے۔

دوشیزہ:۔ (دریا کے کنارے والے راستہ کو مڑ کر دیکھتی ہے اور کہتی ہے۔)

اس نے ۴ بجے آنے کو کہا تھا۔ اب تم جاؤ۔

جوان:۔ جاؤں کیوں۔ کیا کسی کا ڈر پڑا ہے۔ آخر وہ ہے کیا۔

دوشیزہ:۔ (بیدلی سے) اچھی طرح نہیں کہہ سکتی۔ میں نے اسے تین سال سے نہیں دیکھا ہے اور تمہاری ملاقات کے بعد تو میں نے اس کا خیال تک نہیں کیا۔

جوان:۔ آخر کچھ تو کہو۔ پست قد ہے کہ لمبا۔ دبلا ہے یا موٹا۔

دوشیزہ:۔ بس تمہاری ہی طرح ہوگا۔ اچھا اب تم چلے جاؤ۔

جوان:۔ یہ غیر ممکن ہے۔ تمہارے بغیر ہرگز نہیں جا سکتا۔ توپ کی گرج گولوں کی بوچھاڑ تو مجھے اپنی جگہ سے ہٹا ہی نہ سکی پھر انسان تو انسان ہی ہے۔

دوشیزہ:۔ (اسے ملتجیانہ انداز میں دیکھ کر) جم!

جوان ۔ [illegible] اب وہ جھک کے اسے سینے سے لگا لیتا ہے۔

دوشیزہ ۔ مگر وہ دیکھ لے گا۔

جوان ۔ اگر میں جانتا ہوتا تو کبھی اتنے دنوں تک غائب نہ [illegible] تم تصور نہیں کر سکتیں وہاں سے کب کا رخصت ہو چکا ہوتا۔ [illegible] تم سے اتنی ہی محبت ہے۔

دوشیزہ ۔ اچھا وعدہ کرو کہ اس پر ہاتھ نہ اٹھاؤ گے۔

جوان ۔ ایسا ہی ہوگا۔

دوشیزہ ۔ نہیں وعدہ کرو۔

جوان ۔ اگر وہ خاموش رہا تو میں بھی کچھ نہ ہوگا۔ ورنہ اگر ذرا بھی چیں بہ جبیں ہوا تو ایسا مزا چکھاؤں کہ حضرت کو چھٹی کا دودھ یاد آئے۔

دوشیزہ ۔ ہائے اللہ کیا کروں۔

جوان ۔ مجھے تم سے محبت ہے میں کسی طرح تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔

دوشیزہ ۔ غالباً وہ بھی یہی کہے۔

جوان ۔ پھر یا تو وہ رہے گا یا میں!!

دوشیزہ ۔ مجھے ڈر ہے کہ ......

جوان ۔ جب تک دم میں دم ہے کس کی مجال ہے جو بال بھی بیکا کر سکے وہ اکیلا آئے یا یار دوستوں کو لے کر سب کے خون سے دریا کو رنگ دوں گا۔ کوئی ہمیں شمہ برابر بھی نقصان نہیں پہونچا سکتا (خنجر نکالتا ہے)

دوشیزہ ۔ نہیں جم! اس کی ضرورت نہیں لاؤ مجھے دیدو۔ (ہاتھ پکڑ لیتی ہے)

جوان ۔ کیوں ڈر گئیں؟ (مسکرا کر) تم عورتیں ان مناظر کو دیکھ ہی نہیں سکتیں جن سے ہم مرد دن رات کھیلا کرتے ہیں۔ میں نے پانچ منٹ کے اندر ہزاروں آدمیوں کو دم توڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کی لاشیں میدان جنگ میں اس طرح بے گور و کفن پڑی تھیں جیسے کسی مار کا غذ پر کھیاں۔ میں خود بھی بار ہا موت کے منہ سے نکلا ہوں اور دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے پھر ایک اور سہی۔ میں اس سے کچھ تعرض

کروں گا۔ بشرطیکہ وہ بھی مجھ سے نہ چھیڑے۔ نہیں تو تم جانتی ہو میں کتنا اکھڑ ہوں وہ بھاگ بھی نہ سکے گا اور جان ہی سے مار ڈالوں گا۔

سن رہی ہو ڈیزی! میں نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔

دوشیزہ ۔ ایسا سہانا وقت لڑنے کا نہیں۔ وہ دیکھو چڑیاں بھی خوشی منا رہی ہیں۔

جوان ۔ یہ سب اسی کا پرتو ہے۔ میرے سینگ تو نہیں کہ خواہ مخواہ لڑتا پھروں۔ ڈیزی! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہاری زلفوں کا اسیر۔ تمہاری آنکھوں کا متوالا ہوں۔ مجھے تمہاری ہر چیز سے محبت ہے۔

دوشیزہ ۔ میں بھی تمہاری پوجا کرتی ہوں جم! مجھے تم ساری دنیا سے زیادہ پیارے ہو!!!

جوان ۔ یا اللہ تیرا شکر ہے! شاباش ڈیزی میں یہی سننا چاہتا تھا۔ آؤ مجھے پیار کرو۔

دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو جاتے ہیں۔ اتنے میں دور سے کسی کے گانے کی آواز آتی ہے۔ دوشیزہ تڑپ کر الگ کھڑی ہو جاتی ہے اور مڑ کر دریا کے کنارے والے راستہ کو دیکھتی ہے۔ جوان پاس والی جھاڑی میں چھپ جاتا ہے آواز قریب تر ہو جاتی ہے۔

میخانۂ الفت میں ✦ فردوس مسرت میں
اس شوخ حسیں کیساتھ ✦ اب جشن مناؤں گا

دوشیزہ ۔ یہ وہی ہے!

جوان ۔ گھبراؤ نہیں! میں تو یہیں ہوں!!

گانا ختم ہو جاتا ہے ایک فوجی چٹان کی دوسری جانب سے آتا دکھائی دیتا ہے۔ سنہرے بال دھوپ میں چمک رہے ہیں بھورا رنگ چھریرا بدن۔ لبوں پر مسکراہٹ۔ لیکن چہرے سے تھکن ظاہر ہوتی ہے۔

فوجی ۔ ہیلو ڈیزی! میری پیاری ڈیزی!!

(دوشیزہ آنے والے کے مقابل راستہ روک کے کھڑی ہے۔ تھوڑے سے تامل کے بعد جواب دیتی ہے)

ہلو جیک! مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔

فوجی ۔ کہو کہو ڈیزی! آج کے مبارک دن کیا کہنا ہے؟ مجھے بھی تم سے اتنی ہی محبت ہے کہ سالوں میں پوری نہ ہوں۔
ڈیزی! تم مجھ سے ناراض تو نہیں؟
دوشیزہ ۔ تم بہت دیر سے آئے۔
فوجی ۔ یہ سچ ہے۔ گر ان قوانین پر کس کا بس ہے۔ میں دیر سے آنے پر مجبور تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تمھیں بھول گیا تھا۔ نہیں بلکہ میں ہر وقت تمھاری ہی یاد میں مگن رہتا تھا۔ جوں جوں واپسی کا دن قریب آتا جاتا تھا۔ میری بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ میں سوچا کرتا تھا کہ جب یہاں سے نجات ملے گی تو تمھارے ساتھ خوب جشن مناؤں گا۔ مہینوں کا تھکا ماندہ سراپا عشرت بن جاؤں گا۔ غرض تمھارے ملنے کی خوشی مجھے دیوانہ کئے دیتی تھی۔ تمھیں یاد ہوگا، ڈیزی کہ جب جانے سے پہلے تم سے اسی جگہ رخصت ہوا تھا تو تم نے مجھ سے کہا تھا "جنگ جلد واپس آنا اور مجھ سے شادی کرنا" مجھے تمھارے یہ الفاظ آج تک یاد ہیں۔ میں فوجی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ آؤ مجھ سے شادی کر کے میری دنیا کو عیش و مسرت سے بھر دو۔ زندگی کی کلفتوں کو محبت کے نغموں میں گم کر دیں۔ آؤ میری پیاری میرے قریب آؤ۔
دوشیزہ ۔ نہیں!
فوجی ۔ (حیران ہو کر) نہیں! کیوں نہیں؟
(جوان جھپٹ کر جھاڑی سے نکلتا ہے اور دوشیزہ کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا ہے)
جوان ۔ اس لئے!
فوجی ۔ میں آپ کو نہیں پہچانتا۔ کون ہیں یہ ڈیزی؟
دوشیزہ ۔ یہ میرے منگیتر ہیں۔
فوجی ۔ اب سمجھا! کیا میں آپ کا عہدہ دیکھ سکتا ہوں۔
جوان ۔ (جس کے ہاتھ میں برہنہ خنجر ہے) خبردار امیر مذاق مت اڑانا۔
فوجی ۔ خدانخواستہ میں آپ کا مذاق کیوں اڑاؤں مجھے تو تمام چیزوں پر ہنسی آتی ہے خود اپنی ذات پر بھی اچھا تو آپ سے کب ملاقات ہوئی ڈیزی!
جوان ۔ دل سے دل ملتے دیر نہیں لگتی۔
فوجی ۔ بڑی خوشی کی بات ہے! میں ڈیزی کو آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ اس کے دل کی حفاظت کرنا۔
جوان ۔ کیا بکواس ہے! ڈیزی میری ہے۔ تم کو نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو چیز میری ہے مجھے عزیز ہی رہے گی۔ البتہ تمھیں کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے۔
فوجی ۔ یہی تو میں بھی عرض کر رہا ہوں جناب! آپ خواہ مخواہ الجھ رہے ہیں۔ میں نے مصیبت کا نہایت خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا ہے اور گزشتہ چار سال میں ایک مرتبہ بھی ملول نہیں ہوا آپ اپنی درشت کلامی سے میرے جذبہ مسرت کو مٹانے کی لاکھ کوشش کریں لیکن کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ خدا حافظ پیاری ڈیزی!
دوشیزہ فوجی کی طرف بڑھتی ہے۔
جوان ۔ دور رہو اس سے!
دوشیزہ ہچکچا کر رک جاتی ہے اور دفعتہً رونے لگتی ہے۔
فوجی ۔ ہیں یہ کیا ڈیزی! روتی کیوں ہو؟ میں نے لاکھوں دلدوز مناظر دیکھے ہیں لیکن کسی دوشیزہ کا رونا نہیں دیکھا جاتا۔ ہم میں سے کس سے شادی کرو گی؟ بولو تمھیں کون پسند ہے؟
دوشیزہ ۔ (جوان کی طرف اشارہ کر کے) وہ
فوجی ۔ بس ٹھیک ہے۔ خوش رہو۔ آباد رہو۔ میری آرزو تھی کہ تم سے مل کر خوب جشن مناؤں گا سو وہ آرزو پوری ہو گئی۔ تم سے مل لیا اب خوشی مناؤں گا۔
خدا حافظ ڈیزی!
(ہنستا ہوا چلا جاتا ہے دوشیزہ اور جوان دونوں کی نگاہیں اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ یہاں تک وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور صرف قہقہہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔)
جوان ۔ احمق ہو گیا ہے!
دوشیزہ ۔ دھوپ بہت تیز ہے۔ شائد......

(گالزوردی)

مرزا متین احمد بیگ [illegible]

دکن میں عمارت بیدر کی ابتداء

..... جھکر ..... صوبہ بہمنیہ میں ہوا اس وقت کی ..... آبادی ۲۰٫۲۲ لاکھ سے کم نہ تھی۔ سلاطین بہمنی نے ..... ایسا بہتر نمونہ پیش کیا جس کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں بمشکل ملتی ہے۔ ان کی سطوت و جبروت کی دھاک تمام دکن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پانچ لاکھ سے زیادہ کی جمعیت تیز ہزار ہاتھی کا دل جنگ میں رہتا تھا اور ایک ہی عزم و لوکانہ میں کئی علاقے مفتوح ہوجاتے تھے۔ بایں ہمہ متانت و سنجیدگی ..... اور خلوص نیت کا اسلامی نمونہ، انصاف و معدلت کے ساتھ حکمرانی کرنا زراعت و صنعت و حرفت میں دلچسپی لینا یہ تمام خوبیاں ان میں موجود تھیں۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ علوم و فنون کے قدردان تھے۔ ایران، عراق، عجم، عرب، مصر، ترکستان اور شام کے علماء شہرت سلطنت کی وجہ سے بلا طلب جوق جوق چلے آتے تھے۔ یہاں ان کی آؤ بھگت ہوتی تھی اور بادشاہ بے انتہا مراعات سے کام لیتے تھے۔ جن روشن دماغ بادشاہوں کے ایسے کارنامے ہوں پھر انھوں نے علوم و فنون کی اشاعت و ترویج کے واسطے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ سلاطین بہمنی نے اپنے ڈیڑھ دو سو برس کے زمانہ حکمرانی میں علوم و فنون کی وہ سرپرستی کی جو شاید ہی کسی حکومت نے کی ہو۔ یہی سبب تھا کہ ممالک اسلامیہ کے ایسے جید اور برگزیدہ علماء نے بیدر میں بود و باش اختیار کی۔ جن کے فیض سے بیدر مالا مال ہوگیا اور خود بیدر میں اس پایہ کے علماء پیدا ہوئے کہ جن کے فیوض علمی کی آبیاری سے نہ صرف دکن بلکہ ہندوستان کی درس گاہیں سیراب ہورہی ہیں۔

شیخ بدرالدین جلال حمزہ بڑے پایہ کے عالم و فاضل گزرے ہیں۔ آذری تخلص تھا حضرت شیخ محی الدین طوسی کے مرید تھے حضرت شاہ نورالدین کرمانی کے مصاحب بھی تھے۔ جواہر الاسرار، عجائب الدنیا، سعی الصفا، بہمن نامہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں

شہاب الدین احمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں بیدر تشریف لائے۔ احمد شاہ بہمنی کے زمانہ تک آپ نے بہمن نامہ لکھا ہے اور اس میں عمارات شاہی و قصر شاہی کے متعلق قصیدہ بھی درج ہے آپ بڑے پایہ کے شاعر اور تصوف میں کامل تھے۔ حج حرمین شریفین سے فارغ ہوکر اسفرائن سے بیدر آئے اور ایک مدت رہ کر پھر وطن کو واپس ہوئے۔ (۸۳) برس کی عمر میں ۸۶۶ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

ملا سامعی یہ بڑے زبردست شاعر اور اپنے وقت کے علامہ ہوئے ہیں۔ آپ علاء الدین شاہ بہمنی کے زمانہ میں بیدر آئے آپ کا یہیں وصال ہوا۔ ملا سید طاہر استرآبادی علم لغت اور نجوم میں زبردست عالم ہوئے ہیں آپ شاعر بھی تھے علاء الدین شاہ بہمنی کے زمانہ میں آپ پیدا ہوئے اور یہیں انتقال کیا۔ محمود گاواں کے مزار کے پہلو میں دفن ہوئے۔ ملا عبدالغنی مفتی نجم الدین یہ دونوں سلطان احمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور بیدر میں انتقال کیا۔ ان دونوں کے مزار بیدر میں کہاں ہیں معلوم نہ ہوسکا۔ علاء الدین بہمنی کے زمانے میں حکیم ارزقی پیدا ہوئے۔ شعر گوئی میں بڑی مہارت تھی اور اپنے زمانہ کے استاد تھے بہمنیہ زمانہ کے شاہی حکیم تھے۔ آپ کا مزار بیدر میں حضرت کرمانی صاحبؒ کی چوکھنڈی میں ہے۔ ملا محمد قاسم مشہدی بڑے لائق مجتہد اور شاعر تھے دولت بہمنیہ کے فضلائے عصر میں آپ کا پایہ ارفع و اعلیٰ تھا۔ دولت بہمنیہ کی طرف سے حافظ شیرازی کو بلانے آپ ہی کو بھیجا گیا تھا۔ حکیم کاشی علاء الدین شاہ بہمنی کے زمانہ میں بیدر آئے۔ حکیم شاعر اور منجم تھے۔ نظام شاہ بہمنی کے اتالیق بھی تھے۔ ملا شمس الدین محمد امام اصمعی فاضل لغت کے خاندان سے ہیں محمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں بیدر آئے۔ یہ بزرگ بڑے عالم اور ولی کامل ہوئے ہیں۔

حضرت شیخ نور سمستانیؒ حضرت شاہ نعمت اللہ ملتانیؒ حضرت شاہ محب اللہ المعروف المشہور خواجہ ابوالفیضؒ نبیرہ خواجہ بندہ نوازؒ حضرت سید سادات سید حنیف صاحب قبلہ حضرت

سید شاہ زین الدین گنج نشین ؒ مولانا حاجی سرور سعید الدین تاج
قندہاری ؒ مولانا محمد حسین سیفی ؒ مولانا علاء الدین جوہری
صدر العلماء شیخ الاسلام محمد منیر ؒ مولانا امیر محمد عرف مولانا
منیر صاحب گوہری ؒ مولانا شیخ حسام الدین صاحب ٹکری
مولانا سید حسن طلاقی دولت آبادی۔ ملا عبدالکریم ہمدانی جیسے
ہزارہا علماء کاملین فضلاء و اہلِ کمال نے اپنے قدوم
میمنت لزوم سے بیدر دکن کو علوم و فنون کا معدن بنادیا۔
پہلے زمانہ میں مدرس کے واسطے جداگانہ عمارتوں
کے بنانے کی جانب ۸۸۶ھ تک مسلمانوں نے توجہ نہیں کی۔
اس زمانہ کے علماء اپنے گھروں، مسجدوں اور خانقاہوں میں
تعلیم و تعلم کا کام انجام دیتے تھے اور ان کا طریقۂ تعلیم
بھی بالکل سیدھا سادہ ہوتا تھا۔ استاد مسجد میں بیٹھ جاتا
اور اس کے گرد و پیش شاگردوں کا حلقہ بن جاتا تھا۔ اساتذ
خالصتاً للہ درس دیتے تھے اور ان کے شاگرد امیر و غریب
سب چٹائیوں پر بیٹھے ہوئے تحصیل علم کرتے تھے اس کے بعد
اسلامی دنیا میں سب سے پہلے نیشاپور اور بغداد میں مدرسہ
کے لئے عمارتیں تیار ہوئیں اور دوسرے ملکوں میں اس کی
تقلید ہونے لگی۔ دکن میں بھی یہی قدیم طریقہ ۸۷۶ھ تک جاری
رہا چنانچہ حضرت شیخ نور آسمانی ؒ کی خانقاہ حضرت شاہ خلیل اللہ
کرمانی ؒ کا آستانہ حضرت شاہ ابراہیم قادری الملتانی کی مسجد ابھی
بیدر میں موجود ہیں جن میں تشنہ کامان علم تحصیل سے سیراب
ہوتے تھے۔ سلطان مراد شاہ ثانی شہنشاہ روم کا انتقال
۸۵۵ھ میں ہوا اور سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ ۸۵۵ھ میں
تخت نشین ہوا تو قسطنطنیہ میں ۸۶۶ھ میں بیت العلوم بنانا
شروع کیا تو اس کا بھائی یوسف عادل خاں بانی خاندان
عادل شاہیہ بیجاپور کے مشورے سے ملک التجار خواجہ جہاں
محمود گاواں وزیر اعظم دولت بہمنیہ نے سلطان السلاطین
جلال الدین محمد شاہ ثانی بہمنی کے زمانہ میں بیدر میں مدرسہ
کی شاندار عمارت تعمیر کرائی جس کے چپہ چپہ سے آج بھی فیضان
علم کی کیفیت مترشح ہے اور جس کے در و دیوار نقش و نگار سے

تمدن اور ترویج علوم و فنون کا حقیقت [illegible]
ثبوت ہے کہ لوح مدرسہ پر بالکل [illegible]
یہ صدا آویزاں کوشش ہے کہ

قال اللہ تعالیٰ وسیق الذین اتقوا ربہم الی الجنۃ زمرا حتی
اذا جاءوہا وفتحت ابوابہا وقال لہم خزنتہا سلام
علیکم طبتم فادخلوہا خالدین وقالوا الحمد للہ الذی [illegible]
وعدہ واورثنا الارض نتبوأ من الجنۃ ...... [illegible]
العالمین۔

۸۷۶ھ میں اس کی تعمیر شروع ہوئی اور ۱۱
سال کی مدت میں اس کی تعمیر ختم ہوئی اور ۸۸۷ھ میں افتتاح ہو کر
سلسلہ درس کا آغاز ہوا۔ تاریخ تعمیر آیت قرآن شریف ربنا تقبل منا
سے ۸۷۷ھ نکلتی ہے یہ ایسی دعائیہ تاریخ ہے جس کے سبب
محمود گاواں کا مدرسہ مقبول عام ہوا۔ یہ چوگوشہ مستطیل اور
نہایت خوبصورت نفیس و دلفریب وضع کی عمارت ہے جس کی
نقاشی اور ساخت بے نظیر ہے۔ طول (۲۰۵) گز اور عرض
(۱۸۰) گز ہے۔ دو مینار اور رو کار پر چند گنبد ملک کے بنوائے
گئے تھے۔ میناروں کا ارتفاع (۱۰۰) فٹ ہے اور سمنان
و کاشغر کی عمارتوں کی وضع پر بنائے گئے تھے۔ تعمیر مدرسہ میں
سنگ سیاہ اور مضبوط اینٹ اور چونہ سے سارا کام لیا گیا ہے اور
عمدہ عمدہ قدیم مسالے سے اس کی ورزبندی کی گئی ہے۔ رو کار اور
مینار مدرسہ پر بہترین روغن اور چینی نقش و نگار کا کام ہوا ہے اور
نہایت نفاست سے آیات قرآنی تحریر کی گئی تھیں جن تین
فٹ کے قریب حروف موٹے ہیں اور وسعت حروف ۶ انچ سے
کم نہیں ہے۔ قلم آشنا خوش خط اور بے نظیر نسخ اور دوائر پر مبنی
ہے کہ گھنٹوں دیکھنے سے بھی سیری نہیں ہوتی اور آنکھوں میں
تازگی آتی جاتی ہے اور ہر زندہ دل سیاح اور فنون لطیفہ
کے شائق کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ ہندوستان کی ساری قدیم
و جدید عمارتوں میں مدرسہ محمودیہ کے جیسی عمارت ڈھونڈنے سے
بھی نہیں ملتی اور نہ دکن میں اس کی نظیر ہے۔ حالانکہ اس کے
بعد سلاطین بحری و عادل شاہی نے اپنے اپنے شہروں احمد نگر

[illegible] ایک [illegible] اسی طرز کا تعمیر کیا تھا لیکن اب
[illegible] محمود گاواں کو [illegible] مدرسہ کے
[illegible] کی ندمت کے [illegible] اور
[illegible] مدرسہ کے [illegible] بتایا جاتا ہے۔

عہد بہمنیہ میں لاکھوں روپے کی آمدنی کی جاگیرات اور علاقہ جات مدرسہ کے لئے وقف تھے۔ اس کے ضلعے سے اس عالیشان جامعہ کے اخراجات اور طلبہ کا طعام و قیام اور لباس کے مصارف پورے ہوتے تھے۔ سلطان محمود شاہ بہمنی کے زمانہ تک یہ مراعات جاری رہیں۔ مدرسہ کی ترمیم و آہک پاشی وغیرہ کا بھی خاص انتظام تھا۔ اس کے لئے خزانۂ سلطنت بہمنیہ سے علاوہ کئی ہزار تنکہ (اس زمانہ کا سکہ) الگ دیئے جاتے تھے جس کی اصل سند راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔

حضرت شیخ سیاء الدین سہروردی کے مرید و خلیفہ حضرت شیخ جلال الدین جمالی تھے۔ اپنے مرشد کے اشارہ سے جمالی تخلص فرمانے لگے۔ دہلی سے آپ حجاز تشریف لے گئے۔ سلطان مرزا والیٔ ہرات کے زمانہ میں ہرات پہونچے اور مولانا میر علی کے توسل سے حضرت جامیؒ کے پاس تشریف لے گئے جہاں ایک عرصہ تک رہے۔ آپ نے حضرت جامی کو بیدر چلنے کی توجہ دلائی اور مولانا جامی علیہ الرحمۃ نے شیخ جمالی کو جامعہ محمودیہ کی صدارت کے لئے تحریک کی لیکن زوال سلطنت بہمنیہ کے حالات سے دونوں بزرگوں نے ارادہ ترک فرمایا۔ وہاں سے شیخ جمالی ہندوستان آگئے اور بابر کی صحبت میں رہے۔ آپ کا وصال ۹۴۲ھ میں ہوا۔ دہلی میں مزار ہے۔ آثار رضاویہ میں آپ کا ذکر ہے۔ [illegible] قطب العصر مولانا شیخ ابراہیم قادری الملتانی شیخ ابراہیم سرہندی حافظ عبدالعزیز قادری تھے۔ اس مدرسہ کے امام المتکلمین تھے۔ میری مرتبہ کتاب "جامعہ محمود گاواں" میں مفصل حالات درج ہیں جو ہنوز طبع نہیں ہوئی۔

مدرسۂ محمود گاواں کا نصاب تعلیم یہ تھا۔ صرف و نحو عربی زبان میں۔ منطق۔ ریاضیات۔ ہندسہ۔ ہیئت۔ فقہ حدیث۔ علوم معقول و منقول۔ حکمت۔ ادب اور معانی میں [illegible] جاتا تھا۔ بعض درجوں میں علوم دینیات کے درس کی نشستیں تھیں اور بقیہ حصوں میں حفاظ اور تجوید قرآن اور حدیث کے طالب علم رہتے تھے۔ جہاں روزانہ صحیح بخاری شریف کے درس سے پہلے اس کا ختم ہوتا تھا۔ اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ ابتدائی جماعتوں کو تعلیم دیتے تھے۔ ایسے طلبہ "معید" کہلاتے تھے۔

امتحانات مدرسہ محمودیہ۔ اس میں تعلیم کے دو درجے تھے۔ لازم اور مدرس۔ پہلا امتحان کامیاب ہونے پر لازم کی سند ملتی تھی اور طالب علم کا نام ایک خاص رجسٹر میں جس کو روزنامچہ جالیوں کہتے تھے درج ہوتا تھا۔ درجہ لازم کے نصاب کے دو حصے تھے۔ پہلے میں بلاغت اور علم کلام کی انتہائی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اور دوسرے میں اصول فقہ تفسیر و حدیث عقائد کی تعلیم ہوتی تھی۔ لازم صرف دوم درجہ کے شہروں کا قاضی (جج) یا نائب قاضی (اسسٹنٹ جج) ہو سکتا تھا۔

مدرس کے درجوں کے لئے کوئی خاص مضمون یا امتحان نہ تھا بلکہ ایک مدت معینہ تک لازم تھا کہ وہ اونچی جماعتوں کو خاص خاص مضامین پر لکچر دیا کرے۔ اس مدت کے بعد اس کو ایک سند ملتی تھی۔ مدرس کو سند ملنے کے بعد ان کو سلطنت پر جلیل القدر منصب کا استحقاق ہو جاتا تھا۔ بلحاظ تعلیم مدرس کی کئی قسمیں تھیں۔ کاتب۔ منشی۔ مولوی۔ ملا۔

ملا تعلیم کا سب سے آخری درجہ تھا۔ وزارت۔ قضاۃ۔ صدارت۔ قاضی القضاۃ کی خدمتیں انھیں کو دی جاتی تھیں۔ ملا تاج اللہ قاضی القضاہ۔ ملا راج اللہ صدر الصدور ملا ہمن۔ ملا محمود صدر جہاں کے لقب سے عہد بہمنیہ میں عرصۂ دراز تک وزیر اوقاف و عطیات رہے۔ عہد بہمنیہ میں علوم و فنون کی اشاعت اس وسیع اور مستحکم پیرایہ سے ہوئی تھی کہ چھوٹے چھوٹے قصبات اور مواضعات تک ملا نظر آتے تھے۔ ایک صدی تک ان کی یہ گرم بازاری کروڑوں مسلمانوں کے امن و امان کا باعث ہوئی اور اب بھی ہزاروں مواضعات میں پچھلے نامور ملاؤں کے خاندان کی یادگاریں کچھ نہ کچھ پائی جاتی ہیں۔ ان کی تلاش سے قدیم خاندانوں کے شجرے اور حالات دستیاب ہو سکتے ہیں۔ میں نے اس قسم کا بہت کچھ مواد جمع کرلیا ہے۔

سید محمد بیدری

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

([illegible])

[illegible]

آنکھ مچولی

[دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے دستک تیز ہوتی ہے تو ساتھ ہی دستک دینے والے کی آواز بھی بلند ہو جاتی ہے]

ارشد :۔ سلیم بھئی دروازہ کھولو۔۔۔ دروازہ کھولو بھئی (آہستہ) سانپ سونگھ گیا ہے سب کو! (بلند آواز میں) دروازہ کھولو بھئی (آہستہ) نمبر دیکھ لوں مکان کا (دیکھنے جانے کی آواز) جی ہیں! یہی تو ہے (اندر کی دستک) بھئی ——

(چٹخنی کھلنے کی آواز اور پھر دروازہ کھلنے کی)

سلیم :۔ (خواب آلود اور غنودہ انداز میں ۔۔۔ بے پروایانہ)۔ کون ہو تم؟

ارشد :۔ میں ——

سلیم :۔ (بات کاٹ کر) تم کوئی بھی ہو۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ لیکن کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ تم نے اس شخص کی نیند اچاٹ کی جس کی زندگی کا سہارا آج کل خواب اور محض خواب ہیں!

ارشد :۔ میں ——

سلیم :۔ (فوراً بات کاٹ کر) میں کچھ نہیں جانتا۔ پہلے تو تمہاری وحشیانہ دستک میرے خوابوں میں کھلتی رہی، مگر دروازے پر تمہارے ہاتھوں کی آخری یورش نے مجھے اس جنت سے گھسیٹ نکالا۔ تم (اچانک رک جاتا ہے) ۔۔۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟

ارشد :۔ میں چاہتا ہوں کہ ——

سلیم :۔ (فوراً بات کاٹ کر) تم کچھ بھی چاہو، میرے نزدیک تم کرہ ارض پر ایک زندگی ہو۔ اگر میں اس شہر کا حاکم ہوتا تو تمہیں لوہے کے تپتے ہوئے ستون سے باندھ کر بازار کے چوراہے پر کھڑا کر دیتا۔ اور وہاں سے ہر گزرنے والا تمہارے چٹکیاں لیتا۔ تمہارے بال کھینچتا۔ تمہارا گلا گھونٹتا اور میں ۔۔۔ نہایت آہستہ آہستہ بڑے مزے سے ۔۔۔ بہت ہولے ہولے کند قینچی سے تمہارے ہاتھ کترتا ۔۔۔ اور جب تمہارے وہ کترے ہاتھ لٹکنے لگتے ۔۔۔ جب تمہاری رگیں ۔۔۔ (اچانک رک جاتا ہے) ۔۔۔ ہیں ہیں کیا کہا تم نے؟

ارشد :۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔

سلیم :۔ اگر تم کچھ کہتے بھی تو مجھے کیا غرض تھی۔ ہاں ۔۔۔ تم کس سے ملنا چاہتے ہو؟

ارشد :۔ اس مکان میں میرے ایک دوست

سلیم :۔ (فوراً بات کاٹ کر) میں دوستی کا دشمن ہوں۔ اس دنیا کا خمیر ایسے بیہودہ مرکب سے اٹھایا گیا ہے کہ یہاں دوستی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہاں کی سب دوستیاں دشمنیاں ہیں۔ اور سب دشمنیاں ریاکاریاں ہیں ۔۔۔ سمجھے! ۔۔۔ اب کوئی اور بات کرو!

ارشد :۔ (طنزاً) آپ کے مزاج تو اچھے ہیں؟

سلیم :۔ اگر تمہیں میرے مزاج کی پڑی ہوتی تو یوں آدھی رات کو ۔۔۔ اس جاڑے میں ۔۔۔ اس بادلوں بھری رات میں گرم بستر پر سوتے رہنے دیتے۔ تم مجھے کوئی اوباش معلوم ہوتے ہو!

ارشد :۔ (غصے میں) آپ ہوش میں ہیں یا یونہی ۔۔۔ تہاری بکے جا رہے ہیں؟ بات تک نہیں کرنے دیتے ۔۔۔ آپ نے پی تو نہیں رکھی! ۔۔۔ آخر آپ ہیں کون؟

سلیم :۔ (ہنس کر) جب آدمی کا یہ حال ہو جائے، بیتا ہو یا نہ ہو ۔۔۔ اسے کچھ پتا نہیں رہتا۔ میری آنکھوں نے مجھے اس سخت اور کرخت دنیا میں لا ڈالا، جہاں دھول اور دھویں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ میں ہوں کون ——

(مجھے یہ علم کون ہو!)

ارشد :۔ بات یہ ہے حضرت کہ یہاں میرے ایک دوست ——

سلیم :۔ (بات کاٹ کر) مجھے تمہارے دوست سے کیا واسطہ! ۔۔۔ میں اس مکان میں اکیلا رہتا ہوں۔

ارشد :۔ نمبر کیا ہے اس مکان کا؟

سلیم :۔ مجھے نمبر یاد ۔ رکھنے کا قائل نہیں۔ اپنی محرومیوں کی یاد سے چھٹکارا ملے تو مکانوں کے نمبر یاد کروں!

(بادل گرجتا ہے اور تیز ہوا چلتی ہے)

ارشد :۔ (لجاجت سے) دیکھیے ناصر میرا خیال ہے آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔ اور دیکھیے ابر گھر آیا ہے، تیز ہوا بھی چلنے لگی ہے۔ آپ مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ یہاں ایک صاحب جن کا نام ——

سلیم :۔ (بات کاٹ کر) مجھے سوائے ایک کے کسی انسان کا نام یاد نہیں۔ اور مجھے وہ نام بھی بھول جائے تو —— (رک جاتا ہے۔ تیز ہوا سے اندر کی کھڑکی بجتی ہے) ۔۔۔ میں کھڑکی بند کر دوں

[illegible]
[illegible] تھا جواب
[illegible] ایک نئی مصیبت
[illegible]
[illegible] کر نیند
[illegible])
سلیم۔ (اندر سے بولتا ہوا آتا ہے
قدموں کی چاپ جیسے نزدیک آ کر
رک جائے)۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ
اگر مجھے —— ہیں! ——
ارے بھئی —— (آہستہ سے) نام تک
بھی نہ پوچھا —— (بلند آواز سے)
اے بھئی —— بھئی اجنبی! ——
اے مسافر میاں! —— اے کسی دوست
کا پتہ پوچھنے والے!
(وقفہ۔ بادل گرجتا ہے۔ تیز ہوا چلتی
ہے اور بارش برسنے لگتی ہے۔)
—— [illegible] —— بے چارا! بھیگ جائے
گا۔ ٹھٹھر جائے گا۔ کسی نالی میں گر کر
اکڑ جائے گا —— مجھے سوچنا چاہیے
تھا۔ اپنی پریشانیوں کا شکار ایک میں
ہی کیا کم ہوں کہ ایک بے چارے بھٹکے ہوئے
مسافر کو —— (رک جاتا ہے ——
دور سے پانی میں چلنے کی آواز۔)
بوڑھا۔ (دور سے نزدیک آتے ہوئے)
ارے بھئی اس محلے میں کوئی اللہ کا بندہ جاگ
بھی رہا ہے کہ سب کے سب مر گئے؟ (کھانستا ہے)
سلیم۔ میں زندہ ہوں بھئی —— میں
جاگ رہا ہوں —— کیا بات ہے (انداز
میں [illegible])۔

بوڑھا۔ دم بھر کے لئے سر چھپانے کی جگہ
مل جائے۔ یہ کڑاکے کا جاڑا —— یہ بارش
—— یہ ہوا —— بے ایمان ہوا ——
مر جاؤں گا میں —— اُف!
سلیم۔ اندر آ جاؤ —— اندر آ جاؤ
—— اندر آ کر باتیں کرو (قدموں کی چاپ
—— دونوں اندر کمرے میں) بیٹھ جاؤ
لکڑیاں سلگ رہی ہیں ابھی —— تم دو
ایک پھونکیں مارو —— میں تمہارے لئے
انڈے لے آؤں اُبلے ہوئے —— تم کانپ
رہے ہو ٹھنڈ سے۔
بوڑھا۔ انڈوں ونڈوں کی ضرورت نہیں
بیٹا —— تم یہیں بیٹھو۔ خود ہی آگ سلگا
[illegible] منہ سے پھونکیں [illegible]
کی آواز)
بوڑھا۔ بس میرے بچے —— آپ
بھلے معلوم ہوتے ہو —— تم مجھے کسی
خاندانی نظر آتے ہو اس عمر میں یہ تہذیب
و تہذیب —— یہ رکھ رکھاؤ ——
یہ مسافر نوازیاں —— خاندانی ہی
تو کیا کرتے ہیں یہ —— تم اس گھر
میں اکیلے رہتے ہو بیٹا؟
سلیم۔ بالکل اکیلا۔
بوڑھا۔ جی نہیں اکتاتا!
سلیم۔ اکتاتا تھا کسی زمانے میں۔ مگر
اب تو گڑیا بھی آ جائے کمرے میں تو وحشت
سی ہونے لگتی ہے۔ چاہتا ہوں۔ بس
یونہی تنہا پڑا رہوں اپنے خیالوں میں
کھویا ہوا۔
بوڑھا۔ میرا آنا تمہیں ناگوار تو نہیں

گزرا؟
سلیم۔ بالکل نہیں۔ بالکل نہیں۔
بوڑھا۔ لیکن تم گھبرائے ہوئے سے ہو۔
سلیم۔ بات یہ ہے بڑے میاں کہ تم
سے پہلے ایک شخص آیا تھا یہاں۔ کسی دوست
کا پتہ پوچھتا پھر رہا تھا۔ میں دن بھر تنہا بیٹھے
بیٹھے تھک جاتا ہوں۔ تو کسی سے تعلقات
بڑھا کر اپنے آپ کو محبوس کر دینے کی بجائے
راہ چلتوں پر پھبتیاں کستا ہوں۔ انہیں بیوقوف
بناتا ہوں۔ اس طرح میرے دل کو تسلی ہوتی
ہے۔ اس بے چارے سے بھی میں نے یونہی
کیا۔ بات تک نہ کرنے دی۔ اسے یقین ہو چکا
ہوگا کہ میں دیوانہ ہوں۔ ہوا سے یہ کھڑکی
بجنے لگی۔ میں اسے بند کرنے اندر آیا۔ اور
جب باہر جا کر دیکھا تو وہ غائب تھا!
بوڑھا۔ نام کیا بتایا تھا اس نے؟
سلیم۔ میں نے اسے نام بتانے کا
موقع ہی نہیں دیا۔
بوڑھا۔ کیسا تھا؟
سلیم۔ اندھیرے میں خاک نظر آتا۔
بوڑھا۔ آواز کیسی تھی اس کی؟
سلیم۔ آواز؟ —— آواز
کے متعلق میں کیا کہوں —— بس یوں
سمجھ لو کہ —— کوئی پچیس چھبیس کے
لگ بھگ کی عمر والوں کی آواز میں
جو ایک قسم کی —— ایک قسم کی تھر
تھراہٹ —— یا یوں کہہ لو کہ لرزش
سی کپکپاہٹ سی، جھرجھری سی ——
یعنی —— یعنی کراری آواز تھی!
بوڑھا۔ یہ نہیں بتایا کہ اسے کون سے

نمبر کی تلاش تھی؟
سلیم۔ میرے مکان کا نمبر پوچھا تھا بیچارے نے۔ مگر میں ٹال گیا۔
بوڑھا۔ تم نے ظلم کیا بیٹا۔ تمہاری لہجہ نرمی اور علم دیکھ کر تو میں شک تک نہیں کر سکتا کہ تم ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں بھی کر سکتے ہو۔ تم نے بہت برا کیا۔
سلیم۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ دراصل میرا خیال تھا کہ جب اس کی مایوسی انتہا حد تک جا پہنچے گی تو میں اسے گلے لگا لوں گا۔ اسے اندر لے آؤں گا۔ چائے پلاؤں گا۔ سگرٹ پیش کروں گا۔ اسے اس کے دوست کے گھر چھوڑ آؤں گا۔ مگر اس پر میری وحشت کا میرے اندازہ سے کہیں زیادہ اثر ہوا۔
بوڑھا۔ بھٹکے ہوؤں سے مذاق نہ کیا کرو بیٹا۔ ورنہ شریر تقدیر کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں اور وہ ایسے مذاق کر گزرتی ہے کہ پچھتاوا بیکار ثابت ہوتا ہے۔ تم کیا جانو۔ میں نے تمہاری طرح کتنوں سے مذاق کیا، کتنوں پر پھبتیاں کسیں، کتنوں کو سیدھی راہ سے بھٹکایا۔ میں نے [illegible] ہے ـــ (رک کر وقفہ کے بعد) تم نے کسی عورت کا بھی مذاق اڑایا ہے؟
سلیم۔ رہنے دو ایسی باتوں کو بڑے میاں!
بوڑھا۔ اس میں شرم کی کونسی بات ہے؟
سلیم۔ کیا فائدہ ایسی باتوں کا۔ یونہی ـــ خواہ مخواہ ـــ بس پریشانی ہوگی مفت میں۔
بوڑھا۔ تم ہاں یا نہیں میں جواب دو۔
تم نے کسی عورت کا بھی مذاق اڑایا ہے؟
سلیم۔ خدا جانے تم کون ہو بڑے میاں۔ رات کا تو گیا اور صبح [illegible] میری دکھتی رگیں ٹٹول کر تمہیں کیا ملے گا۔ میں تلخ اور کڑی حقیقتوں سے منہ موڑے خوابوں کا رسیا ہوں آج کل۔ فضول باتیں سوچتا رہتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ یہ کارڈ جس کے دونوں سرے دیوار میں پیوست ہیں اگر چھت سے الگ ہو کر فرش اور چھت کے درمیان معلق ہو جائے۔ بولنے لگے گانے لگے ـــ (ہنستا ہے) اور اگر روشندانوں کی دو رسیاں سانپوں کی طرح بل کھاتی فرش پر رینگنے لگیں۔ اور اگر یہ دری سلیمانی کہانیوں کی جادو کی دری کی طرح مجھے ساتھ لیتی اوپر فضا میں ابھر جائے۔ اگر ـــ
(بوڑھا کھانستا ہے)
اگر آگ کا ایک شعلہ گول مول گیند سی بن کر میرے سر کے ارد گرد گھومنے لگے۔
بوڑھا۔ یعنی سب ان ہونی باتیں میری مرضی کے مطابق ہونے لگیں۔ تو جی بہلا [illegible] میرا۔
بوڑھا۔ یعنی تمہارا جی دکھی ہے آج کل!
سلیم۔ میں بہت دکھی ہوں بڑے میاں۔ بہت دکھی ہوں۔ اور آج تو ـــ اور بیچارا اجنبی ـــ کسی ماں کا لال ـــ بھٹکا ہوا بے کس مسافر ـــ ٹھٹھر رہا ہوگا کسی دکان کے چھجے تلے۔ میں بڑا بیوقوف ہوں۔
بوڑھا۔ پچھتاوا بے سود ہے میاں۔ تمہارا نام کیا ہے؟
سلیم۔ سلیم ـــ اور تمہارا؟
بوڑھا۔ میرا نام کبھی محمود المظفر علی خاں تھا، مگر اب تو محمود ہی کافی ہوگا۔ عمر کے گھٹنے اور بڑھنے کے ساتھ ساتھ نام بھی گھٹتے رہتے ہیں۔ ایک زمانے میں [illegible] کا مشہور ٹھیکے دار تھا۔ کوڑی لگا کر [illegible] اشرفی پاتا تھا۔ مزے سے گزر رہی تھی کہ اچانک۔ (بادل بہت زور سے کڑکتا ہے)
سلیم۔ بیچارا اجنبی۔
بوڑھا۔ ہاں تو بڑے مزے سے گزر رہی تھی کہ اچانک ایک ناگن ـــ (رک جاتا ہے)
سلیم۔ ناگن؟
بوڑھا۔ یعنی عورت ـــ لیکن تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔
سلیم۔ رکھے ہوئے ناسور کو پھر سے چھیڑ دو گے بڑے میاں۔ اور پھر یہ تو تم جانتے ہو کہ ـــ
بوڑھا۔ (فوراً بات کاٹ کر) کہ ناسور بہنے لگیں۔ تو بڑی تحمل سے رکھتے ہیں۔
سلیم۔ بالکل!
بوڑھا۔ لیکن اگر پیپ بہہ رہا ہے تو صحت کے لئے مفید رہتا ہے۔ ورنہ رگ رگ میں زہر پھیل جاتا ہے اور ـــ
سلیم۔ (بات کاٹ کر) لیجئے تم میرا دکھڑا سن کر ہی دم لو گے!
بوڑھا۔ شاید میں تمہارے کسی کام آ سکوں۔
سلیم۔ کام وام تو رہی باتیں ہیں۔ کوئی کسی کے کام نہیں آتا۔ یہ دنیا خود غرضوں کی بستی ہے۔ میں کہتا ہوں بڑے [illegible]

[illegible]
[illegible] میں جا رہا ہوں
[illegible]
[illegible] میں ان
[illegible]
نہیں لیا [illegible]
کے [illegible] پیدا
ہو [illegible] بیٹھے ہوئے [illegible]
[illegible] دیکھو بڑے میاں۔ میں
تمہارے [illegible] ہوں ——،

بڈھا۔ (گرج کر) [illegible] کچھ کہنا ہے کہہ جاؤ۔ [illegible]

سلیم۔ (ایک حسرت بھرے لہجے میں) زندگی [illegible] سات سالوں میں جس [illegible] بار بار زندہ رہنے پر مجبور کیا۔ وہ [illegible] کی محبت ہی تو ہے۔ وہ محبت [illegible] لیکن اس کی محبت کی یہ نشانیاں [illegible] دیکھو [illegible] ہوں۔ اس الماری میں کتابوں [illegible] ایک پلندہ پڑا ہے اس میں کوئی دو [illegible] ہوں گے۔ کونے والے سوٹ کیس میں دو تین سو روپے کی نقدی ہوگی تم [illegible] ہو۔ یہ صوفے، یہ قالین، [illegible] فریموں والی تصویریں یہ [illegible] سب [illegible] جا سکتے ہو تم [illegible] بڑے میاں۔ یہ مجبوری کی [illegible] ہیں۔ ان ہونی [illegible] (بڈھا کھانستا ہے) تمہیں پروین کے خطوط کے لئے بیہودہ [illegible] پڑا ہے۔ تم بڈھے ہو، تمہارے بال کھچڑی بن چکے ہیں۔ تمہیں جوانوں کے ان کھیلوں سے کیا لگاؤ۔

بڈھا۔ — کہو اور کہنا ہے تو وہ بھی کہہ ڈالو

سلیم۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔ تم کہو تو میں تمہارے پیر چھو لوں۔ پر یہ خطوط۔ بڑے میاں —— دیکھو —— تم دیکھتے ہی نہیں میری طرف —— تم سمجھتے ہی نہیں!

بڈھا۔ میں سن چکا ہوں اور سن لو کہ یہ خط تمہیں نہیں مل سکتے۔ وہ بھولی بھالی لڑکی تمہارے اس کرتوت سے واقف ہو چکی ہے۔ کہ تم ان کے ذریعے اسے بدنام کرنے کی دھن میں ہو۔ اس نے روتے روتے مجھ سے اس کا ذکر کیا۔ سو مجھے یہ ناخوشگوار فرض ادا کرنا پڑا۔ میں یہ خطوط لئے جا رہا ہوں۔ تم اپنے دل کی رونق کے لئے یادوں کی تصویریں تیار کرو۔ آخر یاد بھی تو محبوب کی بہت بڑی دین ہے۔

سلیم۔ مجھے شاعری سے ذرا بھی مس نہیں ایسی ——،

بڈھا۔ (بات کاٹ کر) لیکن ابھی ابھی تم نے ایک اجنبی سے کہا تھا کہ تم خوابوں کی دنیا کے بسنے والے ہو!

سلیم۔ تم نے سب کچھ سنا؟

بڈھا۔ ہاں۔

سلیم۔ اور پھر تم نے اس بے چارے کو جانے دیا۔

بڈھا۔ میں ذرا سی نیکی کے لئے اتنی بڑی نیکی کو کیسے فراموش کر سکتا تھا۔

سلیم۔ تو کیا اب تمہارے دل میں کسی دکھی سے ہمدردی کی ایک چنگاری تک باقی نہیں رہی؟

بڈھا۔ میرا دل سرد ہے!

سلیم۔ کیا تم ——

بڈھا۔ (بے پروایانہ) میں کچھ نہیں سنتا تھا اب میں جاتا ہوں۔ اور تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ جذباتی نہ بنو، کیونکہ جذباتی انسان واقعات کی گردن پر سوار نہیں ہو سکتا۔ ان کے قدموں سے لپٹ پڑا رہتا ہے!

(قدموں کی چاپ)

سلیم۔ بڑے میاں (چیختا ہے) بڑے میاں!

بڈھا۔ تمہارا گلا خوب چلتا ہے!

سلیم۔ بڑے میاں! میں پوچھتا ہوں کیا کائنات کی کوئی قوت تمہیں اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی!

بڈھا۔ اس وقت کائنات کی سب سے بڑی قوت میرا ارادہ ہے! —— چودھری محمد اسد کا ارادہ۔

سلیم۔ اسد کا؟ تم اسد ہو!

(دروازہ بند ہونے کی آواز)

سلیم۔ (پکارتا ہے) اسد۔ اسد (دروازہ کھول کر باہر آواز دیتا ہے) اسد!

(وقفہ)

سلیم۔ (زور سے دروازہ بند کرتا ہے) ظالم، وحشی، بدتمیز —— یہ سب اسی کمبخت اجنبی کی بددعا کا نتیجہ ہے۔ وہی سبز قدم میرے ہولناک افسانے کا عنوان ہے، قہر ٹوٹے

اس پر ـــــ اگر پڑا ہو کسی نالی میں !
(وقفہ۔ قدموں کی چاپ جو قریب آ کر رک جاتی ہے)
ارشد۔ بڑے میاں
اسد۔ (یعنی بوڑھا) جی
ارشد۔ بڑے میاں نمبر چوبیس کونسی گلی میں ہوگا۔
اسد۔ یہی تو مکان نمبر چوبیس ہے۔ لیکن چودھری محمد اسد صاحب تو مکان نمبر بیالیس۔
(وقفہ)
ارشد۔ اس شہر کے سارے باسی دیوانے تو نہیں ہو گئے ؟
اسد۔ تمھارا شبہ بجا ہے، لیکن شبہات غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ تم اپنے اتنے عزیز دوست کو بھی نہیں پہچانتے۔ یہ سفید ڈاڑھی اور یہ خوفناک پگڑی تمھاری نگاہوں کو دھوکا دے رہی ہے شاید ـــــ لو ـــــ اب دیکھو۔
ارشد۔ (معمولی سے وقفہ کے بعد مسرت سے) اسد بھیا۔ اسد بھیا! (وقفہ۔ وہ دونوں گلے ملتے ہیں) یہ روپ کیسے دھارا ؟
اسد۔ میں تمھیں کہا کرتا تھا نا کہ محبت میں کئی روپ دھارنے پڑتے ہیں۔ سو آج وہ نظریہ حقیقت کی صورت میں تمھارے سامنے ہے۔ اس مکان میں رہنے والے مسٹر سلیم، جن کا دماغی توازن آج کل بگڑا ہوا ہے، اور جو اب سے دو ماہ پیشتر بہت زیادہ بگڑ چکا ہے۔

اب سے دو دن ـــــ محبت کرتے تھے ایک لڑکی سے، پروین سے، دونوں میں ـــــ
ارشد۔ (بات کاٹ کر) آہستہ بولو۔
اسد۔ (اسی لہجہ میں) یہ ریوالور مجھے آہستہ بولنے کی اجازت نہیں دیتا کہتا ہے گرجو۔ دہاڑو شیروں کی طرح۔ اور سارے شہر کو سناؤ۔ کہ پروین نے اسے خط لکھے۔ اور پھر ـــــ جیسا کہ ہوتا آیا ہے، پروین نے میری طرف توجہ کی اور پھر ـــــ
ارشد۔ جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔
اسد۔ (ہنس کر) ہاں ! جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، اس نے ایک اور کو مرکز توجہ بنالیا۔ میں نے اسے سمجھایا بجھایا کہ لڑکی یہ طرز عمل ٹھیک نہیں۔ میں بڑا کڑا انسان ہوں۔ میں خواب دیکھنے کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے فریب دیکر تو تم کہیں کی نہیں رہو گی۔ مگر وہ ایک نہ مانی !
ارشد۔ یہ آواز کیسی تھی ؟
اسد۔ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیا۔
ارشد۔ کسی کے قدموں کی چاپ تھی شاید
اسد۔ سلیم صاحب گھوم رہے ہوں گے اپنی خوابگاہ میں ـــــ خیر ـــــ تو مجھے معلوم ہوا کہ اس نے سلیم کو بیشمار خطوط لکھے ہیں۔ جو سلیم کے پاس محفوظ ہیں۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ان خطوط کو اپنے قبضے میں کر لوں۔ اور پروین کو یہ خوف دلاؤں کہ میں اس کے سارے راز گلی گلی میں افشا کرتا پھروں گا ـــــ اسے اپنا لوں، سو میں اس بھیس میں سلیم کے ہاں آیا۔ اور اس سفید ڈاڑھی اور اس کالے ریوالور کی مدد سے

وہ خطوط حاصل کرنے [illegible] جیب میں [illegible]
ارشد۔ تم نے اچھا نہیں کیا اسد۔
اسد۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ کیا تم نے [illegible] بھائی بھائی کے پرانے فلسفے سے اپنا دامن نہیں بچا لیا۔ میں نے تمھیں مدت ہوئی کہا تھا کہ [illegible] وہ تمھیں نیکی اور بدی کی [illegible] اٹھا کر دکھا دے گا۔
ارشد۔ عجیب آدمی ہو۔ [illegible] کر کے مجھے [illegible] کر رہا ہے ؟
اسد۔ تم میری باتیں نہیں سمجھو گے تم تمسخر سے ہو ٹھٹھے سے۔ لو بھیا ہم [illegible] چلے !
ارشد۔ لیکن تم ؟
اسد۔ میرے لئے سلیم صاحب نے [illegible] بجائی تھی۔ مجھے ٹھنڈ ٹھنڈ نہیں لگ رہی ! میں آج بہت ہی خوش ہوں۔
ارشد۔ (چند لمحے کا وقفہ) شکریہ گر بھیا تم نے غلط نمبر کیوں لکھا تھا مجھے ؟
اسد۔ جب میں نے پہلے پہل تمھیں سلیم سے باتیں کرتے سنا، تو مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم نے نمبر پڑھنے یا یاد رکھنے میں غلطی کی ہے۔
ارشد۔ تم ہماری باتیں سنتے رہے اور پھر مجھے یوں ہی بھٹکنے دیا ؟
اسد۔ دوسرا معاملہ بہت نازک تھا۔ معمولی تکلیف کے بعد میں اسے خاموش اور ابر آلود رات کو [illegible]۔ بھلا کیا نمبر لکھا تھا میں نے ؟

ارشد۔ ۲۴

(اسد جس نے ۲۴ کہا تھا گزرے ہو چکر چھپتے ہوئے، تمہارے جملہ سے متاثر تھا)

ارشد۔ متاثر تھا!

اسد۔ ہاں! اس قدر متاثر تھا کہ میری داستان کی پریشانی سے برداشت کر لیا۔ ورنہ بہت مشکل ہے کسی اجنبی کا انتقام دیتا ہے۔

ارشد۔ عجیب اتفاق ہے ــــ (رقص ــــ (آہستہ سے) کون آیا ہے!

اسد۔ (آہستہ سے) وہ ہر کونے میں آ جائیں گے ــــ ہٹ آؤ یا خفا سے پارلی کی چاپ ــــ دیکھو)

ارشد۔ پروین

پروین۔ (حیران اور خوف زدہ ہو کر) کون؟

اسد۔ تمہارا اسد! جو سلیم کی طرف سے تمہارے خطوط کا بنڈل اسی وقت کا ہو میں کئے تم سے ابھی کہا کہ ایک لمحہ کا انتقام لیتے ہوئے نکلا ہوا ہے۔

پروین۔ اسد!

اسد۔ یہاں کیسے آئیں تم!

پروین۔ تم مجھے یہ پوچھنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

اسد۔ تمہیں حیران ہو رہی ہو گی مجھے یہاں دیکھ کر۔ لیکن تمہاری حیرت دور کرنے کے لئے میں تمہیں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس طرح الف لیلہ کے پرانے قصوں میں دیووں پریوں کی زندگی طوطوں اور

محلوں کے جسموں میں بند ہوتی تھی اسی طرح سلیم کی طرف سے تمہارے لکھے ہوئے خطوط کے بنڈل میں تمہارا مستقبل دیکھا بیٹھا ہے۔ لیکن تم یقین کرو کہ اگر تم نے ــــ

پروین۔ وحشی! بدمعاش۔

اسد۔ (ہنستا ہے) ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ خطوط کا وہ بنڈل اب تمہارے قریب کھڑے ہوئے میرے دوست کے جیبے کی اندرونی جیب میں محفوظ ہے۔ فیصلہ تمہارے سامنے ہے۔ یاد رکھو بتا دوں کہ بس اب تمہارے سر گرم ہونے کی دیر ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟

پروین۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم اتنے پست بھی ہو سکتے ہو۔ تم لڑکیوں کے جذبات سے کھیلتے ہو اور سمجھتے ہو کہ تم نے بڑا تیر مارا ہے!

اسد۔ جذبات سے تم کھیلیں یا نہیں؟

پروین۔ تم نے سلیم سے میرے خطوط چرا کر چھپنے کیوں گئے!

اسد۔ چھوڑ لے گئے ــــ مجھ سے دادا تم!

پروین۔ اور اب تم ناجائز طور پر مجھ پر دباؤ ڈال کر ــــ (اچانک رک جاتی ہے)

اسد۔ ہاں! ہاں! اپنی شگفتہ تقریر جاری رکھو۔ تمہارے لہجے کی لچک تمہاری گفتار کی شیرینی اور تمہارے ہونٹوں کی جادو بھری جنبشوں کے لئے میں مہینوں ترسا کیا ہوں ــــ اور اگر اب تمہارا لہجہ

سخت اور باتیں تلخ ہیں۔ مگر جو ایک ہنگامے پر موقوف ہے۔ مگر کیا فرق انیسویں صدی کے اسد اللہ خان نے بیسویں صدی کی مگر چودھویں کا اسد کے دل کی بات کہہ دی ــــ ہاں تو تم کیا کہہ رہی تھیں؟

پروین۔ (لہجہ سخت ہو جاتا ہے۔ آواز بلند ہو جاتی ہے) بس۔ میں تمہیں بتلا دینا چاہتی ہوں۔ کہ اگر تم نے میرے خطوط سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو تمہیں عمر بھر پچھتانا پڑے گا۔ میں تمہیں خبردار کئے دیتی ہوں۔ کہ اگر تم یہ ذلیل رویہ اختیار کرتے ہو تو میں بھی ــــ

اسد۔ (غصے میں بات کاٹ کر) تم کیا کر سکتی ہو؟ ابھی تک تمہارے وہی ڈھنگ ہیں۔ کتنی بے خوف ہو تم ــــ اور پھر کتنی عاقبت نااندیش۔ اور اگر میں کہہ دوں کہ تمہارے ان خطوط کی نقلیں چھپوا کر بانٹ دوں! پھر کس کام آئے گا تمہارا یہ طنطنہ!

پروین۔ دیکھا جائے گا۔ میں تم جیسے بزدل کمینوں کے خوف سے حالات کو ناخوشگوار بنانے کی قائل نہیں۔ موقع محل دیکھ کر نبٹ لیا جائے گا۔

اسد۔ (کھلکھلا کر اور غصے میں) تم سانپ کی دم پر پاؤں رکھ چکی ہو۔ کیا اب یہ تمہارے بس میں ہے لیکن تم نہیں جانتیں کہ اس کے منہ پر تمہارا بس کبھی نہیں چل سکا۔ اور پھر سانپ ہمیشہ منہ کی طرف ہی سے ڈستا ہے۔

پروین۔ میرے پاس ہر جانب سے کالج کا دفتر ہے۔

اسد۔ [illegible] پروین؟

پروین۔ (چلتی ہے اور جاتے ہوئے کہتی ہے) اُف لڑکی۔ معمولی بات ہے۔

اسد۔ (زور سے) اس پر رومنٹک لڑکی۔

پروین۔ (دور سے) دشمن لڑکی۔

یہ شباب کی ہابی (Hobby) ہے۔

اسد۔ اگر کل یہ خطوط تمہارے باپ کے ہاتھوں میں نہ ہوں، تو میرا نام اسد نہیں!

پروین۔ (بیت ۔ دور سے) کوئی دوسرا نام تجویز کر رکھو اپنے لئے۔

اسد۔ عجب بلا کی چھوکری ہے۔

(مختصر سا وقفہ) ارشد۔ نکالنا تو ریا [illegible] چھٹی کی دائیں جیب میں ہوگا۔ میں اب برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نہیں دیکھ سکتا کہ یہ نازک سی لڑکی مجھ ایسے چھٹے کٹے نوجوان کا یوں منہ چڑاتی نکل جائے۔

ارشد۔ ہوش کی دوا کرو۔ ابھی ابھی سلیم پر ہنس رہے تھے۔ اب خود تمہارے منہ سے کف جاری ہے۔

اسد۔ ارشد۔ وقت ضائع نہ کرو۔

ارشد۔ بھئی کچھ سوچو تو سہی۔ تم نادان لڑکی کے ان خطوط سے ناجائز فائدہ اٹھا کر شائستگی کی عام سطح سے کتنے نیچے اتر جاؤ گے؟ سوسائٹی میں تمہیں کتنا ذلیل سمجھا جائے گا اور پھر بچے ہوئے پھل میں وہ رس کہاں جو خود گرنے والے پھل میں ہے۔

اسد۔ میرا کلیجہ اگر پتھر کا ہوتا تو شاید میں برداشت کر لیتا سب کچھ۔

ارشد۔ جذباتی نہ بنو۔

اسد۔ ارشد تم بہت [illegible] ناصح نہیں۔ تم نے اچھا نہیں کیا مجھے روک کر ——— اچھا ——— پیچھے کی اندرونی جیب میں خطوط کا وہ موٹا بنڈل ہوگا۔ نکالو ذرا میں اپنے کوٹ میں محفوظ کر لوں۔

ارشد۔ خطوط۔

اسد۔ ہاں ہاں خطوط۔

ارشد۔ پروین کے لکھے ہوئے خطوط!

اسد۔ ہاں ہاں پروین کے لکھے ہوئے خطوط۔

ارشد۔ وہ پروین کے پاس ہیں۔

اسد۔ (گھبرا کر بلند آواز میں) کیا مطلب؟

ارشد۔ وہ میں نے پروین کو دے دیے ہیں!

اسد۔ (غصے میں) کیوں؟

ارشد۔ تم ٹھنڈے دل سے سنو تو کہوں۔

اسد۔ (گرج کر) یہ تم کیا کر رہے ہو ارشد؟

ارشد۔ میں سچ کہہ رہا ہوں خطوط کا وہ بنڈل اب پروین کے پاس ہے۔ بھولی سی نادان لڑکی ہے۔ جذبات کی زد میں آکر جو خطوط اس نے لکھے انہیں ناجائز دباؤ کا ہتھیار بنا لینا سفلہ پن ہے اب وہ اپنی جگہ خوش ہوگی اور سلیم اور اسد کا رومانی بخار بھی چند دنوں میں اتر جائے گا اور پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

اسد۔ ارشد! تم نے بہت [illegible] [illegible] ہے تم نے [illegible] کی جنت میں شعلے [illegible]

ارشد۔ میں نے [illegible] کی بات کہی ہے۔

اسد۔ میں تعاقب کر [illegible] گلیوں میں بھٹک رہی ہوگی۔

ارشد۔ تم نہیں جا سکتے

اسد۔ مجھے جانا ہوگا۔

ارشد۔ (جھک کر [illegible]) اسد۔

اسد۔ میں تمہیں بتا دوں ارشد کہ تم نے ایک اجنبی لڑکی پر رحم کھا کر اپنے عزیز دوست پر مصیبتوں کا پہاڑ گرا دیا تم میری اخلاقی زبوں حالی سے واقف ہو پھر تمہیں اپنے اخلاق کی دلدل میں [illegible] سے فائدہ۔

ارشد۔ میں نہیں چاہتا کہ تم محض جسمانی حظ کے لئے چند معصوم دوشیزاؤں کے احساسات سے کھیلو۔ تمہیں سلیم سے بھی صلح کر لینی چاہیے۔

اسد۔ ارشد تمہارا دماغ تو نہیں پھر گیا؟

ارشد۔ جب تم سلیم سے گلے مل رہے تھے تب میں تمہارے ساتھ کمرے میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔

اسد۔ ارشد۔ میں برداشت نہیں کر [illegible]

ارشد۔ تمہیں برداشت کرنا ہوگا۔

(قدموں کی چاپ سلیم کے دروازے پر رک [illegible] دیتی ہے)

[illegible] (آواز) کہاں گئے!
[illegible]
[illegible] ایک [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] آپ [illegible]
[illegible]
[illegible] ہوں
[illegible] آرام میں خلل ڈالتے پھرو؟
[illegible] تمہارے [illegible]

ابھی بھی میرے دل کا چراغ گل ہوا ہے۔
ارشد:۔ اس وقت اگر میں آپ کے کسی کام آسکوں تو مجھے خوشی ہو گی۔ اگر قریب ہی ڈاکٹر کا کوئی مطب ہو تو مجھے پتہ بتا دیجئے۔ میں بلا لاؤں اسے۔
سلیم:۔ مجھ سے مذاق کرتے ہو؟ پاگل سمجھ رکھا ہے؟ تم خود پاگل ہو۔ سنا ہے ——— [illegible] کہیں کا سر پھرا نے کے لئے اگر کوئی بہت زمیں ملتی اور [illegible] میرے لئے ڈاکٹر بلانے ——— [illegible] کہیں کا!

ارشد:۔ لیکن میں تو آپ سے ———
سلیم:۔ میں جانتا تھا اس دنیا میں ہر شخص کے سینے میں سودا چھپا ہوا ہے ——— سو سمجھ جاؤ۔
(وقفہ)
ارشد:۔ (آہستہ سے) عجیب دنیا ہے۔ عجیب ہیں اس دنیا میں بسنے والے۔ جذبات کے دھاگے پر الجھے ہوئے ہیں۔
اسد:۔ ارشد تم بھی کتنے بیوقوف ہو!
ارشد:۔ میں یا تم!
سلیم:۔ کیا چلے گئے؟ ——— (ہاتھ جھاڑ کر) (آواز) چلے گئے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ خس کم جہاں پاک!
(ارشد کی دھیمی سی ہنسی)

(باجازت آل انڈیا ریڈیو۔ پشاور) **احمد ندیم قاسمی**

غزل

دل کی ٹوٹی کشتی کو اب ساحل ساحل بہنے دو
گوشۂ جاں میں چپکے سے ارماں طوفاں ہونے دو

اندازِ وفا کا ذکر ہی کیا یہ رسمِ جفا ہی رہنے دو
غم کا بار اٹھا ہی ہو یہ لطفِ فراواں سہنے دو

جس نے سمجھا جس نے جانا وہ ہی ہوا وہ بیگانہ
دل ہی کو وہ رازِ ازل وہ رازِ محبت کہنے دو

آغازِ کرم بھی دیکھا ہے انجامِ کرم بھی دیکھ لیا
جس سے بڑھے ناکامیٔ حسرت ایسی تسلی رہنے دو

آپ کی آنکھیں پرنم کیسی آنچل دل کی بوچھ آئی
اشک مرے بے قیمت ہیں جب انکو یونہی بہنے دو

رنجش ہے بے مہری کی اب جانِ تمنائے اشرف
ترکِ محبت آپ کو بس گر ایسی کرامت رہنے دو!!

علی اشرف

حسنِ سوگوار

ایک دوشیزہ! سراپا حسرت و اندوہ و یاس!
ہو گئی کمسن تو غم سے پھول سا چہرا اداس!
نرم و نازک لب مگر تیسیرِ تبسم کا مزار
غنچۂ فردوس شکارِ گردشِ لیل و نہار
حسن کی رنگیں بہاروں پر خزاں چھائی ہوئی
اک کلی کھلنے سے پہلے ہی پژمردہ، سنولائی ہوئی
مرکزِ جور و ستم، پامالِ غم، قلب و جگر!
کیسے دیکھوں، آہ یہ منظر! کہاں تابِ نظر!!
اشک باری، بے قراری، آہ و زاری تا کجا!
تا کجا! اے پیکرِ غم۔ سوگواری تا کجا!
مانتا ہوں یہ وہ غم ہے جس کا درماں ہی نہیں!
جو حوادث سے نہ ٹکرائے وہ انساں ہی نہیں
جانتا ہوں تجھ کو حاصل ہی نہیں صبر و سکوں!
حشر ساماں ہے ترے دل میں غمِ سوزِ دروں!!
خوب واقف ہوں! تری دنیائے ارماں لٹ گئی!
ابتدا ہی تھی کہ ۔۔۔! بزمِ لطف ساماں لٹ گئی
یہ بھی سچ ہے زندگی ہے اب تہِ دامانِ ابر!
انتہائے حسرت و غم ہی سہی! لازم ہے صبر!
نقشِ حرماں بن کے، نازک دل پہ صدمہ ڈھائے
نوجوانی! شورشِ طوفانِ غم میں بہہ نہ جائے
ہو نہ جائے تو کہیں اس درجہ بیزارِ حیات
دھندلی دھندلی سی نظر آنے لگے یہ کائنات!
غنچۂ فردوس ۔۔۔ نہ ہو جائے کہیں بے رنگ و بو
سرد پڑ جائے نہ یکسر خواہشِ ذوقِ نمو!!
کون دیگا، پھر ترے جلووں کو نظروں کا خراج!
چھین لے گا وقت جب اس حسن کی عظمت کا تاج
التجائے شوق ہے بیدار کر ذوقِ نظر
پھر بانداز دگر دنیائے دل پامال کر

مجیب خیرآبادی

حشرِ جذبات

کہیں دنیا میں نہ تھا حسن کا ساماں پیدا!
میری نظروں نے کیا جلوۂ امکاں پیدا
لاکھ دنیا میں ہوں میرے لئے زنداں پیدا
میری تخئیل سے ہیں دشت و بیاباں پیدا
اب دے مجھ کو فریبِ چمن اے رنگِ بہار
میرے دامن پہ ہے اشکوں سے گلستاں پیدا
جذب ہو جائیں دو عالم کے مناظر جس میں
اتنی کر دہر میں تو وسعتِ داماں پیدا
یہ محبت کی حکایت ہے نہ ہوگی کبھی ختم
اسی عنوان سے ہوگا نیا عنواں پیدا
کیوں ابھی سے ہے تجھے جلوۂ نو کی امید
انتہا کفر کی ہولے تو ہو ایماں پیدا
ہائے اشکوں کا برا ہو کہ کھلا عشق کا راز
سوز پنہاں ہے، مگر دولتِ داماں پیدا
تیرے ہی ذوقِ جنوں میں ہے کمی کچھ ورنہ
ذرے ذرے سے ہے اک روحِ بیاباں پیدا
دیکھ لو ثاقبِ وارفتہ کو تم غور سے آج
مدتوں ہوگا نہ پھر ایسا غزل خواں پیدا

شاہ ۔۔۔ کانپوری

تیموری آرٹ

ایم ولی صاحب کی ایک کتاب "ایرانی فن تصویر" عنقریب منظر عام پر آنے والی ہے۔ اس کا ایک حصہ ہم یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔ ہندوستانی تاریخ نے تیموری جیسی کچھ شخصیتیں ہے، عیاں اس کے ساتھ اس تصویر کا بھی مقابلہ کیجئے۔

مغلیہ خاندان کے عروج سے پہلے ہی دنیا کا زبردست فاتح تیمور لنگ، وسط ایشیا کے افق پر نمودار ہو چکا تھا۔ اسی سبب سے ایران طوائف الملوکی کی فتنہ پردازیوں کا زیادہ عرصہ تک شکار نہ رہ سکا۔

تیمور ترکی نژاد تھا۔ بمقام کش پیدا ہوا۔ غالباً یہی مقام اب شہر سبز کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی معرکہ آرائیوں نے ابتداء ہی سے کچھ ایسا عالم میں اس کے نام کا ڈنکا بجوا دیا تھا۔ اور اس نے وسط ایشیا پر فتح پالی تھی۔ کئی سال تک بے خانماں پھرنے کے بعد، جس میں اسے سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا، مشرقی ترکستان اور ماوراء النہر کے علاقوں کو مسخر کر لیا۔ اسی سال اس نے ایران کی تسخیر کا بھی منصوبہ باندھ لیا تھا۔ لیکن پورے ملک کی تسخیر میں کئی سال لگ گئے۔ اگرچہ خراسان کی طرح بعض مشرقی صوبوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی، تاہم جنوبی ایران اس وقت تک موزوں سلطنت نہ بن سکا، جب تک تیمور نے آذربائیجان، سیستان اور جارجیہ کے علاقوں کو چاروں طرف سے گھیر کر ان سے اپنی طاقت کا لوہا نہ منوا لیا۔ ستر ہزار باشندوں کو تہہ تیغ کر کے اس نے شہر اصفہان پر قبضہ کیا تھا۔ شیرازیوں نے اس خوف سے کہ کہیں ان کا بھی یہی حشر نہ ہو، تیمور کے استقبال کے لئے پہلے ہی سے شہر کے دروازے کھول دیے تھے۔ غرض چھ سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد، تمام جنوبی ایران اس کے زیر اقتدار آ گیا۔ اس وقت تیمور نے سمرقند کو اپنا دارالخلافہ قرار دیکر نظم و نسق کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ باوجود اس کے تیموری فوجوں کی پیشقدمی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ حتی کہ اس کی سلطنت کی حدود شرق میں ہندوستان اور مغرب میں روس کی سرحدوں سے جا ملیں۔

اس میں شک نہیں کہ تیمور ایک سخت گیر فاتح تھا۔ لیکن تہذیب و شائستگی کی خوبیوں سے بھی عاری نہ تھا۔ جس وقت بھی اس نے لوٹ کھسوٹ یا تاخت و تاراج کا بازار گرم کیا، نہایت دانشمندی اور دوراندیشی سے کام لیا۔ ناکاروں کو تباہ اور قابل قدر اشیاء کو محفوظ کر کے سمرقند لے جایا کرتا۔ جذبۂ حسن پرستی اس کی فطرت میں موجود تھا۔ یہی خصوصیت اسے اپنے پیشرو، سکندر اور چنگیز خاں سے ممتاز کرتی ہے۔ تیمور نے اپنے دارالسلطنت کو حقیقی معنی میں سونے کی چڑیا بنا رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ باج گزار ممالک کی مختلف اقوام کے اساتذۂ فن، اس کے دربار میں کھنچے چلے آئے تھے۔ تیموری حکومت ہی کو یہ ناز زیبا ہے کہ اس نے تصویر سازی جیسے فن لطیف میں ایک نئے ذوق کی تشکیل کی، اور اسی کے بابرکت دور میں، ایرانی فن تصویر کی نشو و نما بھی مکمل ہوئی۔

تیمور اس دار فانی سے رحلت کر چکا تھا۔ لیکن اس کے جانشین اس کی اتباع میں، آرٹ کی سرپرستی کئے جا رہے تھے۔ تا وقتیکہ فلک کج رفتار کی فتنہ پردازیوں نے، قضائے مبرم بن کر انھیں اقتدار سے محروم نہ کر دیا۔ [illegible]

کی فنی دلچسپیوں میں رتی برابر بھی فرق نہ آنے پایا۔ شاہان تیموریہ اس دنیا سے چل بسے، اور ان کی یاد ہمارے ذہنوں سے محو ہو چکی، لیکن وہ آرٹ جو ان پرستاران فن کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھا تھا، اس نے ان کے اسمائے گرامی کو صفحۂ ہستی پر ثبت کیا۔ یہی آرٹ عرصۂ دراز تک ان شیدایان فن کے نام کو قائم و دائم رکھے گا۔

گوناگوں تہذیب و تمدن کی نمائندہ دو سربر آوردہ ہستیاں، جو تیمور کے پرتو سے آ چکی تھیں، تیموری آرٹ میں یکجا ہو کر ایک دوسرے سے متصل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیموری عالیشان عمارتوں میں، اندرونی اور بیرونی دیواروں کی پچی کاری، اسی روح پرور کیفیت کو پیش نظر کرتی ہے۔ اور پچی کاری نے اپنی ہم عصر کتابی تصویروں [illegible] کو بھی بڑی شدت سے متاثر کیا تھا۔ بعض شاعری نہیں بلکہ اس صنف کے جوشیں عمل میں بھی اپنی روح کو جاری و ساری کر دیا تھا۔

کہتے ہیں کہ استاد گنگ، تیموری مکتب تصویر کا بانی تھا۔ اس فاضل فن حسن کار کے متعلق کچھ زیادہ واقعات نہیں ملتے۔ سوائے اس کے کہ اس نے استاد جہانگیر بخاری کو تعلیم دی تھی، جو عمدۃ المصورین کے لقب سے مشہور ہے۔ اور استاد جہانگیر نے اپنی باری میں بہزاد کے استاد پیر سید احمد تبریزی کو فن سکھایا تھا۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ دنیائے فن کے نابغ میں جذبۂ مشاہیر پرستی کا فقدان کتنا زبردست خسارہ ہوتا ہے کہ استاد گنگ، جیسی شخصیت کی زبان زد عام، زندگی کے حالات تک معلوم نہیں! جس کی وجہ سے بعض لوگ اسے محض ایک داستانی شخصیت تسلیم کرتے ہیں۔ حقیقت حال کچھ بھی ہو اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں کہ تیموری کتب کا کوئی بانی تھا یا نہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ تیموری آرٹ ایک خاص رتبہ پر پہنچ چکا تھا۔ جس کے بعض حقیقی کارنامے ہم تک پہنچے ہیں۔ بہرحال اس کتب کی برتری کسی صورت میں کم نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے برعکس وہ سب افراد اس کتب میں جذب ہو جاتے ہیں، [illegible] کے غذیہ، مادی حیثیت سے اس [illegible]

تیموری آرٹ کی باقیات۔

(۱) اس دور کی باقیات [illegible] سب سے مقدم خواجو کرمانی کا مسودہ [illegible] میں [illegible] درج ہے۔ جنید نے اس کی تصویریں بنائی تھیں [illegible] اس وقت بغداد [illegible] تیموری [illegible] میں جس آرٹ کی پرداخت کی جاتی تھی، یہ حیرت انگیز کارنامہ اسی فن کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ اسی طرازی کی وجہ سے عجائب خانے کا یہ شاہکار مانا جاتا ہے۔ اس شاہکار کے پیکروں میں ملائمت اور چابکدستی کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ مغل اثرات ہنوز زائل نہ ہوئے تھے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ وسط ایشیا کے سماج کی جامع اقدار [illegible] اس مرقع میں بھی متنوع عناصر کی کامل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ پیکروں کے بشرے بالکل چینی قطع کے ہیں۔ خالص ایرانی مناظر کو، چینی ایرانی (مخلوط) طرز کی عمارتوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اصول و عمل کی [illegible] تمام خوش [illegible] کے باوجود، کبھی تو بھونڈے پن کا احساس پیدا ہوتا ہے، اور کبھی نزاکت و لطافت ذوق کی طرف خیال منتقل ہو جاتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس مخلوط احساس سے قدرت مصورہ میں نقص پیدا ہونے کے بدلے اس کی دلکشی و دل بستگی میں مزید اضافہ ہی دکھائی دیتا ہے۔

(۲) بلخی کے شہرت یافتہ مرقع کا ذکر بھی اہم ہے۔ اس مرقع کی تصویروں کو ابتدا میں سلطان احمد نے ترکستان میں جمع کیا تھا، اس میں جو شامل بلخی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ایک ترکی شہزادے کی تصویر بھی شامل کر دی گئی تھی، اس لئے اس تصویر کی نسبت سے اس وقت سے اس البم کا نام بھی بلخی کا مرقع یا البم مشہور ہو گیا۔ یہ نسخہ کئی ہاتھوں سے گزرتا ہوا کتابوں کے ایک شوقین

[illegible] کے لڑکوں نے
[illegible] ۔ اس طرح اس
[illegible] ایک دوسرے بھی شامل
[illegible] دیا اس کی
[illegible] کے دور میں یہ وسیع
[illegible] فنون کے عجائب خانے میں
[illegible] (illegible) جیسے حقیقت
[illegible] یہاں منتقل کیا
[illegible] جس کو اس نے یونانی تحریر کی آمیزش
[illegible] اس کے سرورق پر [illegible]
[illegible] پھول پتیوں نے شگفتہ کاریں
[illegible] پر بلبلان خوش الحان کے نغمہ سرا ہونے
کی [illegible] زور کے ساتھ منکشف کی گئی تھی جس
[illegible] میں [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ یقینا
[illegible] کو [illegible] سے آگاہ کرنے کی خاطر،
اپنا [illegible] کر کے ہی نہیں دکھلایا، بلکہ ان کی عمیق تہوں
میں ابھی [illegible] دیا ہے۔

(۳) برٹش میوزیم میں [illegible] ۱۴۳۶ء کا ایک تیموری
قلمی نسخہ ہے جس میں قلم سیاہی و طلائی، قالینوں اور
قلمی کتب کے حاشیوں کے [illegible] بنے ہوئے ہیں ان کی
[illegible] تفاصیل کو غیر معمولی نفاست کے ساتھ بنا کر
نہایت پرتکلف اور دیدہ زیب رنگوں سے آراستہ کیا
گیا ہے۔

(۴) [illegible] کا مجموعہ مسودات، جو ۲۹ نسخوں پر
مشتمل [illegible] میں مجلد ہے۔ [illegible]
نے [illegible] کر رکھا ہے جس کو اعلیٰ حضرت سلطان السلاطین
[illegible] پناہ سلیمان سپاہ ظل اللہ قہرمان الماء
والطین، [illegible] الاسلام والمسلمین، ناصب رایات
[illegible] الاحسان، قاطع [illegible] الظلم والطغیان [illegible]
[illegible] شاہ [illegible] ابن عمر شیخ [illegible] امیر

تیموری [illegible] خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی خدمت عالی
میں [illegible] ترتیب دیا گیا تھا، تفصیل کا بستانی
[illegible] کا نمونہ ہے۔ چونکہ اس نسخہ میں جسم عریاں
بھی شامل ہے، اس لئے خیال ہوتا ہے کہ شاہ [illegible]
[illegible] سامان عمل [illegible] جن کو ان کے [illegible]
آرٹ میں اعلیٰ ترین احساسات و جذبات کے اظہار کا ایک
بہترین وسیلہ کہا جاتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس جگہ اسے
ایسے ہی [illegible] اثرات کے تحت، ایرانی آرٹ کی رسمی پابندی
میں بنا دیا گیا ہو۔

[illegible] تیموریہ میں سب سے نامور شہزادہ شاہ رخ تھا
اپنے قبلہ [illegible] ہرات سے مملکت کے نظم و نسق کو
چلا رہا تھا۔ فن مصوری کے جو درخشاں ستارے اس کے دربار
کی زینت بنے ہوئے تھے، جس کام کی تکمیل انھوں نے سمرقند
میں نہ کی تھی، ہرات میں کی۔ یعنی تیموری دور کی ابتداء
ایرانی آرٹ میں جن اہم ترین محاسن کا سیلاب امڈا چلا آتا
تھا، اسے آب چل کر نہایت مربوط و منظم طریقہ پر جذب کر لیا۔
چنانچہ چینی نقاشی سے سیاہی قلم خط کشی، عراقی طرز سے
طلائی و نوری پرداز کاری ([illegible]) اور اطالوی نمو
سے عہد عتیق کی نورانی درخشندگی اخذ کی گئی تھی۔ اور ان سب
ماخوذہ اجزاء و عناصر کا خوش آہنگ [illegible] اس زمانے
کا اسلوب کار تھا۔ اطالوی اثرات تیموری دربار میں،
غالباً ان ایلچیوں کے توسط سے داخل ہوئے ہوں گے، جو
اسے ایشیائی بزرگ ہستی سمجھ کر اپنی اطاعت کیشی جتلانے
کی غرض سے آتے تھے۔ گو کہیں ابھی بہزادی آرٹ کے کمال
نفاست سے دوچار ہونا باقی ہے، تاہم تیموری آرٹ کے
شاہ رخ دور کے متعلق اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس زمانے کی
آرٹ، کل ایرانی فن تصویر کشی، نہایت لطیف و معرکہ
رنگ بندی اور اسکیم کے نمونوں کو پیش نظر کرتا ہے۔

(۵) [illegible] کی سیاہی قلم نقاشی کے چند نمونے ڈاکٹر
[illegible] کے ہاں موجود ہیں۔ جن کو [illegible] کے شاہی

کتب خانے سے حاصل کیا تھا۔ ان نسخوں میں یورپی اور چینی تاثرات کو نہایت خوبصورتی سے ہم آہنگ بنایا گیا ہے۔

(۶) [illegible] کا نسخہ معراج نامہ اور [illegible] کا نظامی صاحب [illegible] کو بیت کی [illegible] کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان دونوں بے نظیر یادگاروں سے تیموری خاندان کے متمول سلاطین کی عظمت وجبروت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

(۷) اسی زمانے کا بنا ہوا ایک شکار کا منظر ہے۔ جس میں رنگوں کا [illegible] ہے۔

(۸) ایک اور نسخہ محمد رقص درویشان کا ہے جس کو سلطان مرزا علی گیلانی نے سنہ ۹۲۹ھ میں ترتیب دیا تھا۔ وہ سو کتابی تصویروں پر مشتمل ہے کئی مصور مل کر ان تصویروں کو ایک ہی [illegible] اور ایک ہی [illegible] میں بلند [illegible] کی کوشش کی ہے۔

(۹) رستم خوابیدہ کی تصویر بھی بڑی جاذب نظر ہے جو اسی زمانے کے صحیح اسلوب کو نمایاں کرتی ہے۔

ایرانی آرٹ کی عظمت کا یہ [illegible] مستقبل کا [illegible] پاکستان کا [illegible] ابتدا ہی سے ہم دیکھتے چلے آرہے [illegible] کہ ساتھ [illegible] حقیقت [illegible] عمل کاری کی پرمسرت [illegible] کر لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اشاریت (Symbolism) کو اپنے خیالی ارتسامات سے آراستہ کر کے [illegible] کا پتہ بھی نکالا تھا جس کی وجہ سے آرٹ اپنی سکونی (Static) حالت سے ترقی کرکے وجدانی کیفیات تک بلند ہو جاتا ہے۔ آخر ان واقعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سلسلہ کام مستقبل کے آرٹ کے لئے ایک مستقل دستور العمل کا کام [illegible] رہے تھے۔ گو اب بھی کہیں کہیں درشتی و کرختگی اور [illegible] (Primitiveness) [illegible] دکھلا رہے تھے، کمال مطلق ابھی تک دست رس سے باہر تھا۔ بہزاد کا ظہور ابھی نہ ہوا تھا۔

امجد علی

اردو ادب میں چار نئی کتابیں

شاعر مزدور احسان دانش کا تازہ کلام

مقامات ـ شیرازہ ـ زخم و مرہم ـ گورستان

[illegible] ـ [illegible] ـ [illegible] ـ [illegible]

پتہ:- مکتبۂ دانش گنپت روڈ انارکلی لاہور

نیلی ساری

——— موٹر بس کے انجن نے ہوبل آئیل کے گھونٹ لئے اور دوسرے ہی لمحہ سامنے والی
بس [illegible] عمارتوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی! ———
[illegible] سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا' لیکن اس کی وجہ بہت دن بعد ملے ہوئے لنگوٹیا یار کی جدائی
نہیں [illegible] ——— اسے اچھی طرح یاد تھا کہ کل جب دکاندار نے اسد کے سامنے ریشمی ساریاں پیش کیں' تو اس نے
نیلی ساری کو کئی مرتبہ الٹ پلٹ کر دیکھا' دبایا اور مسلا' لیکن پھر بھی اس نے پسند نہیں کیا! اس کی قیمت جارجٹ کی
ساری سے صرف چند روپے زیادہ تھی اور ممکن تھا کہ کچھ بحث و تکرار کے بعد تھوڑی سی کمی ہو جاتی! مگر کس قدر حیرت
ہے! اسد نے پسند ہی نہیں کیا!

شاید چند روپیوں کی بچت کے لئے ایسا کیا ہو؟

نہیں!

اس نے تو میرے بچوں کے لئے بہت سی دیہاتی مٹھائیاں اور میوے لائے تھے' کیا کنجوس آدمی ایسا کر سکتا ہے؟
اور پھر جب اُسے اپنی بہن کے بچوں کی یاد آئی تو اس نے بالوشاہی بھی خریدلی! تنگ ظرف ہرگز ایسا نہیں کر سکتا؟

پھر کل اس کے ریشمی ساری نہ خریدنے کا معمہ ———
وہ انھیں خیالات کے بے پناہ سمندر میں غوطے لگاتا ہوا دفتر پہنچا' ابھی ابھی ڈاک آئی تھی' اسے محسوس ہوا'
ایک خط کے سرنامہ کی تحریر سے اس کے اندر اندر کے مضمون کا پتہ نہیں چلتا اسی طرح ایک آدمی کے دلی جذبات سے
اس کی بیوی ——— دوست ——— بھائی' بہن کوئی بھی واقف نہیں ہو سکتا۔

رات بستر پر لیٹے لیٹے یہی خیال عتیق کو ستا رہا تھا ——— کیوں اسد نے ریشمی ساری نہیں خریدی؟ —
اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں' اتنے میں بچہ اس کے پاس آگیا' اس کے گال سے اپنے رخسار ملتے ہوئے کہنے لگا۔
"ابا! مجھے اچھی موٹر لادیں گے نا؟"
جب عتیق نے موٹر دینی منظور کی تو بچہ خوشی خوشی سو گیا' سامنے کھونٹی پر عتیق کی شیروانی ٹنگی تھی' بہت پرانی ہوگئی تھی!
اسے خیال آیا ——— اب ایک شیروانی سلوانی چاہئے۔

اور ساتھ ہی اس کی نظر اپنے پہلو میں سوئے ہوئے بچے پر پڑی وہ اپنے آپ سے کہنے لگا' یہ شیروانی تو
ابھی دو مہینے کام دے گی لیکن پہلے بچے کی موٹر ——— !
اس خیال کے ساتھ ہی پھر اُسے اسد کی خریدی ہوئی ساری کا خیال آیا' وہ سوچتا رہا' جانے کیا کیا
سوچتا رہا' تھوڑی دیر بعد نیند لگ گئی' مگر نیند میں بھی دماغی سکون میسر نہ ہوا۔

دوسرے دن بھی احساسات کا بچھو رہ رہ کر اس کے قلبی سکون پر نیش زنی کرنے لگا' اس نے اسد کو
خط لکھ کر اس معاملے کی تفصیلات دریافت کرنے کا تہیہ کر لیا' لیکن اس کا ارادہ شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکا'
صبح جب وہ دفتر پہنچا تو آج کی ڈاک میں اسد کا خط تھا' سادہ کارڈ نہیں ——— اچھا خاصا وزنی لفافہ!
دو آنے کے ٹکٹ چسپاں کئے گئے تھے اس پر' عتیق حیران تھا کہ اتنا بڑا خط کیا ہوگا؟ اس نے نہایت ہی
عجلت اور بیم و رجا کے عالم میں لفافہ چاک کیا۔ پہلی دو چار سطریں پڑھنے کے بعد وہ بھول گیا کہ وہ دفتر میں

بیٹھا ہے' وہ فرفر خط پڑھنے لگا ——

—— سچ تو یہ ہے کہ تمہارا مختصر سا کاروانِ حیات جنتِ ارضی سے کم نہ تھا' اس میں شک نہیں کہ تمہارے پاس دو دن بڑے ہی آرام سے گزرے' مدت کے بعد تم سے مل کر میں اپنے آپ کو بھول بیٹھا تھا' گر وہ نیلی ریشمی ساری والا واقعہ —— اس ساری کی قیمت صرف چودہ روپے زیادہ تھی اور تم بھی خریدنے کے لئے اصرار کر رہے تھے' لیکن میں نے تمہاری بات سنی ان سنی کر دی' تم نے خیال کیا ہوگا — آخر گاؤں والا ہے' پیسے پیسے کے لئے جی لوٹتا ہو تو کیا تعجب؟ لیکن شفیق' سچ کہوں؟ —— وہ بخل نہیں تھا —— کنجوسی نہ تھی' پھر ——

ساری ہاتھ میں لے کر میں نے بار بار الٹا پلٹا اور مسلا ضرور —— لیکن اس کی نفاست' چمک زرین کناری اور آڑھی ترچھی لکیریں! کتنی دلفریب تھیں' اس کے لمس سے ایسا محسوس ہوا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں' انتہائی بھیانک' ڈراؤنا اور بھیانک خواب! صبیحہ کی موہنی صورت میری آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگی تھی! اس ساری نے بہت پرانی یاد تازہ کر دی! یا کیسی زخمِ دل ہی کہو تا! وہ پھر رسنے لگا' ایسی نرم اور ملائم چیز پر میں نے زندگی میں صرف ایک بار ہاتھ پھیرا تھا' اسی لئے ——

وہ شام مجھے یاد ہے' ساون کا مہینہ تھا' آسمان پر کالی کالی گھٹائیں نیل بے زنجیر کی طرح گھوم رہی تھیں' ساری فضا پر ایک اداسی کا عالم تھا' ایسے میں ایک مفلوک الحال شخص ساری بیچنے کے لئے لایا' ساری پچاس روپے میں بک رہی تھی' میں تو پسینہ میں شرابور ہو گیا' سارا جسم کانپنے لگا جیسے میرے اندر سے کسی نے زندگی چھین لی تھی' میری حالت اس شخص کی سی تھی جس کے قریب ہی کسی سوراخ سے سانپ نکل آیا ہو — اور یہ نیلی ریشمی ساری زمین پر' پلنگ پر' نہایت عجیب طریقے سے پھیلی ہوئی تھی' میں ہکا بکا رہ گیا' دماغ پھٹا جا رہا تھا' میں نے چیخ چیخ کر کہا —— "اس سانپ کو ہٹاؤ' میری نظروں سے دور کرو!"

ممکن ہے دنیا مجھے پاگل سمجھے' عقلمند لوگ لمبے لمبے ہاتھ کر کے پکار اٹھیں گے' پریشانی کی بات ہی کیا تھی؟ ساری معمولی کپڑا ہی تو ہے! لیکن اس کاروباری دنیا سے ذرا ہٹ کر احساسات و جذبات کی دنیا میں داخل ہو جائیں تو؟ قومی جھنڈا' جس پر ہمارے جذبات' احساسات' محبت اور خلوص کی تہہ جمی ہوئی ہوتی ہے' ایک معمولی کپڑا ہی تو ہے! ایک ٹکڑا معمولی قیمت کا! لیکن اس کی خاطر ملک کے جانباز اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ سیکڑوں سپہ سالاروں کو جھنڈے کی ایک لہر آزادی کا وہ پیغام دیتی ہے جس کا ہم اظہار بھی نہیں کر سکتے' اس تھوڑے سے کپڑے میں مستقبل' ماضی' تہذیب' معاشرت' مذہب اور آزادی کی زندہ تاریخ دکھائی دیتی ہے۔

میں نے جب اس ساری کو اس طرح بکتے دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے' اس ساری کے پیچھے جو روح فرسا تاریخ تھی وہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ اس میں کسی خاندان کی کتنی ہی زندگیوں کے دکھ حسرتیں' ناکامیاں چھپی ہوئی تھیں' اس میں میری زندگی کے عبرت انگیز واقعات چھپے ہوئے تھے' میرے مظالم کی داستان تھی۔ تم کہو گے مظالم اور میں؟ ہاں میں! اتنا بیچ اور کمینہ بن گیا تھا! یہ ساری میری تباہی کی آخری سیڑھی تھی!

[illegible] ایک زمانہ تھا، سرکار، دربار اور سماج میں میری عزت تھی، اسلاف کے عادل شاہی عہد [illegible] ہوئے امتیازات کو انگریزی حکومت نے باقی رکھا تھا، کتنے ہی گاؤں قبضے تھے، اسلاف کے خون [illegible] حاصل کی ہوئی دولت و عزت ہمارے گھر غلامی کر رہی تھی، لیکن جب نیا نظام قائم ہوا تو عسکری قوتیں [illegible] کوئی موقع نہ رہا اور اپنی صلاحیتوں کو سماجی امور میں تبدیل کرنے کا بھی کوئی طریقہ نظر نہ آیا، کیش [illegible] ہی ایک شغل تھا، اس وقت کی سماجی حالت ایسی تھی کہ جوا، طوائف، شراب اور اسی قبیل کی [illegible] عادتوں نے اہمیت حاصل کر لی تھی، موٹروں اور بگھیوں کا ذکر کرنا فخر و مباہات کا اظہار تھا، ایسے مشاغل میں دولت بکھیرنے والا شخص ہی زیادہ کامیاب رہتا تھا۔ اس وقت یہ چیزیں سماجی اور خاندانی شرافت [illegible] تھیں مگر آج سماج کس قدر بدل گیا ہے، محنت، شرافت اور صداقت کو اہمیت حاصل ہے، یہ کیفیت [illegible] اس وقت ہم اک رنگ کو ہی زندگی سمجھتے تھے، ہماری بے اعتدالی اور ہوس پرستی ہماری مقبولیت کا ذریعہ تھی۔ امارت کا احساس، دولت کا نشہ اور عیش کوشی میں زندگی کے دن بڑی تیزی سے گزر رہے تھے۔ دماغ اور دل ہیجانی لہروں پر ڈول رہے تھے، جذبات میں اضطراب تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اس وقت میرا خیال تھا ——— لڑکیاں چاہے جانے ہی کے لئے پیدا کی گئیں، ان کے بدن کی ساخت، ان کے رہنے کا رنگ ڈھنگ، لمبے لمبے سیاہ بال، رسیلی آواز، سج دھج، گڑیوں کی طرح ادھر ادھر گھومنا ایسی چیزیں ہیں کہ انسان کے دل میں گدگدی پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتیں ایک مسکراہٹ سے قیدی بنا لینا بھی وہ جانتی ہیں اور ہر دوشیزہ کا مینائے شباب اسی لئے ہے کہ وہ الٹ پلٹ کر توڑ دیا جائے، اب سوچتا ہوں، وہ سب ایک جوش تھا جیسے پانی میں سوڈا ڈال دیا گیا، محبت اور پیار ایک بدہضمی ہے۔ لیکن لڑکیوں کا نام سن کر ہیجان پیدا ہوتے والی منزل سے بھی گزرا ہوں، اس وقت درجنوں نام یاد تھے، لیکن آج ———

چاروں طرف ایک نظر ڈالتا ہوں تو وہ سب کی سب ابھی تک بڑی سڑ رہی ہیں کسی کی اپنے شوہر کے ساتھ ایک حیثیت ضرور ہے، آدمی حیثیت والا جانور ہے! کم از کم سماج کے بنانے والے تو عقلمند تھے۔ وہ آدمی کے مقابلے میں عورت کا سر نیچا کرنا نہیں چاہتے تھے، مرد عورت پر حکومت کرتا ہے۔ یہ اس کی حیثیت ہے۔ لیکن مجھے کیا غرض؟ ہوگا کوئی سماج! وہاں آدمی رہتے ہوں گے! ——— اب تو جان لیا میں نے!

آج سے پندرہ برس پہلے میری شادی ہوئی تھی، لیکن شادی کی مقدس ذمہ داریوں سے میں اپنے آپ کو آزاد سمجھتا تھا، میں نے کبھی بیوی سے کھل کے بات نہیں کی۔ وہ بدصورت تھی؟ نہیں وہ حسین تھی، اس قدر کہ اگر کسی مٹی کے پتلے کو آنکھ اٹھا کر دیکھ لیتی تو وہ بھی زنیب کی تلوار کا شکار بن جاتا! لیکن جب یہ حسن مجھے مسرت بخشنے کی کوشش میں تھا تو میں بازار کی گھناؤنی خوبصورتی کا شکار تھا، دل و دماغ کی بے راہ روی میں بیوی کے سکھ اور چین کی کیسے فکر؟ عورت کی زندگی کچھ اور تھی، ہم ہر قسم کی دہشت، آزادی اور بے راہ روی جائز سمجھتے تھے عورتیں زیادہ سے زیادہ مقید، محکوم اور بے زبان جانور کی طرح تھیں! باہر جھلک بھی نظر نہیں آتی تھی، اوروں سے میل ملاپ معیوب اور اپنے شوہر سے گفتگو میں کمتری کا اظہار معیار شرافت تھا، عورت کے جوالا مکھی کو سماج کی چٹانیں راستہ ہی نہیں دیتی تھیں، دوسری عورتوں کے رنگ محلوں میں ہی ہمارا وقت گزرتا تھا، ہمارے قہقہے، عشق و ہوس اور دل کی ساری

رنگینیاں وہیں پوری ہوتی تھیں، پھر بیویوں کا حال کون پوچھتا؟ ....
میں اکثر راتوں میں کھانے کے بعد گھر سے نکل جاتا اور صبح تک باہر ہی رہتا تھا، یہ چیز صبیحہ کے لئے ناگوار ہوتی لیکن اپنے دکھ کے اظہار کی ہمت اس میں نہ تھی۔ اس وقت گرہستی کا مسلک یہ تھا کہ شوہر کے عیوب پر ناک بھوں نہ چڑھائے، وہ اپنی ہزاروں مصیبتوں کو اپنی چال ڈھال، رفتار و گفتار سے بھی ظاہر نہ ہونے دیتی تھی، دھول ہی دل میں غم کھاتی رہی، میں اکثر یہ اس کے چہرے سے جان لیتا تھا، لیکن اس وقت احساسات کی نوک ہی جل چکی تھی۔
آدمی کو اپنی زندگی کے بہت کم واقعات یاد رہتے ہیں، خیر جانے دو!

آخر کار بچہ پیدا ہوا، دو ماہ بعد وہ بچے کو ایک سفید کپڑے میں لپیٹ کر میرے پاس لے آئی، اس دن وہ کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی، کسی نے سچ کہا ہے کہ عورت ماں بننے کے بعد ایک شگفتہ پھول بن جاتی ہے۔ وہ منظر آج بھی میرے دل پر نقش ہے، یہی نیلی ساری پہنے ہوئی تھی، ساری کی دلکشی سے اس کے چہرے پر مسرت کھیل اٹھی تھی یا پھر اس کے شوق کی پرچھائیاں اسے اس قدر حسین بنا رہی تھیں، بہرحال صبیحہ انتہائی مسرت و شادمانی کے عالم میں کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

اس دن اس نے نہایا تھا، بال کھلے چھوڑ دئے تھے، جیسے اندھیری رات کو دن کی شاخیں اٹھائے ہوئے تھیں، اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل تھا، جسم کی طرح شاید دل بھی پاک ہو گیا تھا، جسم سے، دل سے پاکیزگی جیسے پھوٹ رہی تھی، عورت کی زندگی میں محبت ہی تو بڑا جذبہ ہے! ان دنوں جیسے وہ بہار پر تھی، اس کی صباحت پر زردی جھوم رہی تھی، ایک قسم کی جاں بخش مٹھاس اس کے چہرے پر کھیل رہی تھی، زندگی کی تلخیاں احساس مسرت میں ضم ہو گئی تھیں، یہ مسرت کا احساس نہ تھا، اس کی نگاہوں میں رحم و ہمدردی تھی، التجا تھی۔
بچے کو ہاتھوں میں لئے کتنی دیر تک دیکھتی رہی، اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، میں آگے بڑھا، لڑکا پیدا ہونے سے مجھے کتنی مسرت ہوئی! لیکن اُسے روتا دیکھ کر حیرت ہوئی، پوچھا —— "یہ کیا؟ خوشی کے وقت آنسو کیسے؟"
اس نے ایک لمبی سانس لی اور بولی —— "ناگ پیدا ہوا ہے! کتنا زہر پھیلائے گا؟ کون جانے!"
میں نے کوئی جواب نہ دیا، کتنا بڑا طنز تھا میری زندگی پر: یہ تم سمجھ سکتے ہو!

میری ہوس پرستی نے مجھے عقل و دل دونوں سے بیگانہ کر دیا، ایک ... نے مجھے دیوانہ بنا دیا، دن کا اکثر حصہ اور بیشتر راتیں میں اسی کے ہاں گزارتا تھا، ایک دن میرے دل میں خیال آیا کہ میں اپنے ہوس کے کھلونے کو اس نیلی ریشمی ساری میں ملبوس دیکھوں، یہ ساری صبیحہ کی تھی! شادی پر اس کے بھائی نے تحفہ دی تھی، اس ساری پر وہ جان دیتی تھی، اس نے شاید دو مرتبہ سے زیادہ نہیں پہنا تھا، لیکن میں نے دغا کی، ظالم بن گیا، جھوٹ گھڑ کر تم کھو گئے لوگ جس کی اس قدر عزت کرتے تھے، وہ شخص اس قدر نیچ؟ ہاں، آج کل سارے عزت والے نیچ اور کمینے ہیں! دنیا ایک فریبی دغاباز، بدنیت اور عیار کی عزت کرتی ہے، یہ میدان اسی کے ہاتھ آتا ہے! ہمدردی، احسان اور شرافت سبھی ڈھونگ، خود غرضی کا بہروپ! غریبوں اور حاجت مندوں کا خون نچوڑ کر ان کی ہڈیوں کو چوس کر پھر انھیں کے سامنے روٹی کا ٹکڑا ڈال کر ہمدردی اور سخاوت کا دعویٰ کیا؟ اپنے سوانگ کے نبھاؤ کا کتنا حسین طریقہ!
اور لوگ —— دنیا کے سارے آدمیوں سے مجھے کچھ نفرت سی ہو گئی ہے، دنیا بیکار ہے! ویسے تو بیسیوں آدمی ملے، میں انھیں کچھ کچھ پہچانتا ہوں، وہ صرف آدمی تھے، اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ ان آدمیوں کے بڑے بڑے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

دنیا

میرا سہاگ اس وقت لٹا جب کہ بچپن شباب سے اٹھکھیلیاں کر رہا تھا اور میں عورت کہلانے سے پہلے ہی بیوہ کہلانے لگی۔

پچپن برس کے شوہر سے بچھڑے ایک سال بھی نہ ہونے پایا تھا کہ خالہ بی نے مجھ کو کسی اور کے ہاتھوں بیچ ڈالنے کی ٹھان لی۔ مجھ کو یہ بات پسند نہ تھی۔ اپنا پیارا ساجد رہ رہ کر یاد آنے لگا۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔ سب کی چوری ایک ایک بات لا کھوں تاکیں اور وہ سپنا میں۔۔۔ دیکھے ہوئے کو وہ تنہائی میں دہراتے تھے۔ میں فلم کی ہیروئن اور وہ ہیرو معلوم ہوتے تھے۔

لیکن بیت گئے وہ دن ——— !

ہم ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے تھے، دو ننھے دوستوں کی طرح۔ حالانکہ سماج ہمیں شادی کے بندھنوں میں باندھ چکا تھا۔ پھر بھی ہم اس کی آلائشوں سے پاک تھے۔ اس لئے کہ میں ابھی ننھی تھی اور ساجد بچہ۔

خالہ بی نے ——— مجھے ایک دولت مند بوڑھے سے بیاہ دیا۔ کتنا ظلم ہے جوانی کو بڑھاپے کی آغوش میں سونپ دینا۔ وہ ہونٹ جو موت کا تلخ گھونٹ پینے کے قابل ہوں وہ کس لئے گلابی ہونٹوں سے رستی ہوئی شراب پئیں ——— ! اف ! کتنا بڑا گناہ !!

لیکن مشرقی لڑکیوں کے منہ میں زبان ہو تو بولیں۔ ان کی زبان پر تو شرم کی مہر لگی ہوتی ہے اور دل میں سماج کی فرسودہ روایات کا خوف، وہ ہنسی خوشی اپنی آرزوؤں کو سماج کے نذر چڑھاتی ہیں۔ میں نے بھی اپنی قربانی چڑھائی۔ آہوں اور طوفانی اشکوں کے ساتھ۔

میرا "جوان نما" شوہر رنگ کٹا کر پھولوں میں ملنے کا شیدائی تھا۔ روز ڈاڑھی بنواتا، مونچھوں پر خضاب چڑھاتا، لمبی لمبی حنائی زلفوں میں "عروس بہار" ڈالتا اور پھیلا بنا رہتا۔ چندھیائی آنکھوں میں سرمہ لگائے چکن کی اچکن اور تنگ مہری کا پاجامہ پہنے بنتا۔ جیسے منہ میں گلوری دبائے مجھ سے نوجوانوں کی طرح چھیڑ کرتا۔ عمر سے ہر بات اچھی معلوم ہوتی ہے۔ بوڑھے سے اظہار محبت سن کر شرم نہیں آتی بلکہ تنفر پیدا ہوتا ہے۔ اپنے حسن کی تعریف سن کر جی خوش نہیں ہوتا بلکہ بیٹھا جاتا ہے۔ اپنے سے چھیڑ کرتے ہوئے دیکھ کر تغافل کو نہیں انتقام کو جی چاہتا ہے۔ میری حالت پنجرے میں پھنسے ہوئے پرندکی سی تھی جسے نہ اڑنے پر یوں اور نہ بھاگنے کے لئے جگہ۔ مجھے اس کی ہر بات نصیحت معلوم ہوتی تھی چاہے وہ از دواجی ہی کیوں نہ ہو اور میں حافظ کے اس شعر پر عمل کرتی تھی جو شاید بچپن میں مولوی صاحب کے ہاں پڑھا تھا ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند جوانان سعادت مند پند پیر دانا را

وہ پیر دانا تھا۔ لہٰذا وہ باپ کہلانے کی تمام صلاحیتیں رکھتا تھا اور شوہر بننے کی صورت بھی نہیں۔ مجھ کو اس سے انتہائی نفرت ہو چلی تھی۔ ہر جذبے کی انتہا تضاد کیفیت پیدا کرتی ہے۔ میرا تنفر بھی محبت میں بدل گیا ——— ؟

گرما کی شام تھی۔ چائے پی چکنے کے بعد اپنے گلاب کے باغیچے میں گلگشت کر رہی تھی۔ ابر پارے فضا میں کہیں کہیں اڑتے پھرتے تھے۔ ہوا میں کسی قدر خنکی آ چکی تھی۔ صنوبر پر مشرقی حرماں نصیب پرند چیخ رہا تھا۔

اس کی دلدوز چیخ نے میرا دل ہلا دیا اور میں بے تاب ہو گئی۔ آنکھوں سے دو نقرئی آنسو نکل پڑے ساتھ ہی خشک لبوں سے سسکتی ہوئی آہ۔ طبیعت غیر ہوئی جاتی تھی، خود کو سنبھالنے کے لئے مرمریں نشست پر بیٹھنے کے لئے پلٹی ہی تھی کہ ——— ایک خوب رُو نوجوان میری طرف ٹکٹکی باندھے جانے کب سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ میں پریشان سی ہو گئی اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ایک ہی خیال تھا جو بار بار دل میں آ رہا تھا کہ "میرے بابیچ میں یہ کون درمانہ چلا آیا۔" ہیجانی کیفیت اس شدت سے طاری تھی کہ میں کچھ کہہ نہ سکی اجنبی نوجوان نے خود مسکراتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا "آداب عرض کرتا ہوں" میری پریشانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ آخر جرأت کرکے پوچھا "آپ کون؟"

"ناچیز جمیل" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"او ——— آپ ہیں جمیل میاں، کیوں کیسے آنا ہوا۔ اور آئے بھی تو اطلاع تک نہ دی۔ اسٹیشن پر آدمی بھیج دیا جاتا ———" میں نے ایک ہی سانس میں سب کچھ پوچھ لیا، جانے کیوں؟۔

وہ مسکرا پڑے اور شرارت سے کہا "اور کچھ پوچھئے گا؟ ایک ہی سانس میں اتنے سوال"

"تو حرج ہی کیا ہے" میں نے جھینپتے ہوئے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں" وہ سنجیدہ بنتے ہوئے بولے "کالج میں چھٹیاں ہو گئیں، گھر لوٹنے کی بجائے ادھر چلا آیا۔" ذرا کی ذرا وہ رک گئے اور پھر معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے "اپنی نئی بھاوج کے درشن کرنے"

"تعطیلات یہیں گزاریئے گا"

"جیسی آپ کی مرضی"

وہ مشرقی لباس میں بہت خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے پریشان اور دراز بال، ادبی لگاؤ، شاعرانہ مذاق اور رومان پسندی پر غمازی کر رہے تھے۔ سنہرے چشمے میں سے نرگسی آنکھیں چمک رہی تھیں، جوانی کے خون نے ان کی سانولی رنگت میں ایک دلکشی پیدا کر دی تھی۔ ان کی جاذبیت میرے دل میں کھب گئی۔

وہ میری طرف دیکھ رہے تھے اور میں انھیں گھور رہی تھی۔ نظریں نیچی ہونے سے پہلے ہی دلوں کے پار ہو گئیں ——— وہ افسانوی ہیرو معلوم ہوتے تھے۔

گرما بسر کرنے کے لئے ہم برفانی وادی "زیبان" میں آٹھہرے۔ آتشیں آفتاب نے افق کی گود میں اپنا منہ چھپا لیا تھا۔ لیلائے شب کے دراز گیسو "زیبان" کی رومان پرور فضا پر لہرانے لگے تھے اور اس کی کافوری پیشانی پر کے جھر جھر کرتے جھومر کی سنہری کرنیں صنوبر اور شمشاد کی چوٹیوں سے بوس و کنار کر رہی تھیں، میں اور جمیل میاں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ نرگس کوئی دلکش گیت گنگناتی آئی اور شربت کے بلوریں گلاس میز پر رکھ دیئے۔

میں نے سرخ سرخ شربت کا ایک گھونٹ پی کر گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا "کیوں جمیل میاں! آج آبشار کی سیر کیسی رہے گی؟"

"بہت پرکیف" انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "لیکن بھیا؟" "پڑے سوتے ہوں گے"!

نرگس بول اٹھی "آبشار کی سیر کے ساتھ کشتی رانی ہو جائے تو کیا کہنے"
"واللہ لطف آ جائے" جمیل تقریباً چیخ اٹھے۔
"دیکھنا نرگس ذرا ہوشیار رہو" میں نے ہدایت کرتے ہوئے کہا "صاحب بیدار ہو جائیں تو کچھ کہہ سن کر ٹال دیجیو"
"تو ہم نہ چلیں" اس نے بسورتے ہوئے کہا
"کل ہمارے ساتھ چلنا اچھی طرح سیر کرا لائیں گے" جمیل میاں نے اس کو جواب دیا اس کے گالوں اور ہونٹوں پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے گردن ہلا کر رضامندی ظاہر کی۔
میں جھنجھلا کر بولی "نہیں وہ آپ کے ساتھ نہ جائے گی"۔ وہ بولے "کیوں آپ چلیں اور وہ بیچاری منہ دیکھا کرے"۔
"ہوں بے چاری ــــ بڑا رحم آتا ہے نا آپ کو" میں خواہ مخواہ بگڑی جا رہی تھی۔ وہ مناتے ہوئے بولے "اچھا اب چلئے بھی۔ خفا ہونے کا یہ وقت بھی تو نہیں"۔ ان کے اس جملے پر مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ اپنے مضبوط ہاتھ میں میرا ہاتھ تھامتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔
عورت کتنی کوتاہ دل ہوتی ہے۔ اپنے محبوب کی نگاہ کسی اور پر پاتی ہے تو جل کر بھسم ہو جاتی ہے۔ بل کھاتی ہوئی ناگن کی طرح اس کے تیور زہریلے ہو جاتے ہیں۔ لیکن مرد! کتنے سادہ دل، کتنے سادہ لوح اور بھولے ہوتے ہیں۔
ہم دریائے سین کی طرف روانہ ہو گئے۔
صنوبر کے سایوں تلے ساحل پر پہونچ کر دونشستہ طاؤسی کشتی کرایہ پر لی اور دھڑکتے دل کے ساتھ اپنا ننھا سفینہ مضطرب موجوں کے سپرد کر دیا وہ سفینہ کھے رہے تھے اور میں پانی کے نقرئی قطروں سے کھیل رہی تھی۔
"آپ نے تو چپ کی سادھ لی۔ کچھ بولئے نا" انھوں نے مجھ سے کہا۔ میں چپ کی رہی تو انھوں نے کہا "موسم بڑا سہانا ہے" "ہاں جمیل بڑی سہانی رات ہے۔ لیکن ...."
"لیکن کیا" انھوں نے فوراً سوال کیا۔
یہ مسکراتا چاند، ساکت و صامت دریا، خوابیدہ ننھی ننھی موجیں اور ہچکولے کھاتا ہوا سفینہ۔ پھر اس سفینے کے تم کھیون ہار۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی خوابوں کے جزیرے میں اڑے جاتے ہیں"۔ کہتے کہتے میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ انھوں نے چپو رکھ دئے۔ "ہاں بھابی جان زندگی ایک خواب ہی تو ہے اور ہماری ــــــ خصوصاً میری زندگی تو "ایک خواب ہے کسی دیوانے کا"۔
"یہ خصوصاً میں" کے کیا معنی، بات تو ہماری ہو رہی تھی"۔
"ہاں ہو تو رہی تھی، لیکن انسان اپنے ہی متعلق کچھ کہہ سکتا ہے۔ جو خود اپنی زندگی کی گتھیاں نہ سلجھا سکا ہو وہ کسی اور کی زندگی پر کیسے حکم لگا سکتا ہے"۔
کیوں نراس ہو اپنی زندگی سے، ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے ــــــ" میری آواز حلق میں پھنسنے لگی اور میں چپ ہو رہی وہ کہنے لگے۔

"بس جو بھی دیکھا بہت دیکھا' کاش اندھا ہوتا اور وہ بھی نہ دیکھ سکتا!"
کیوں بہکی بہکی باتیں کئے جا رہے ہو۔ میرا دل دھڑک رہا ہے للہ ایسے شگون زبان سے نہ نکالو"
وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ میں نے کہا "اک ذرا میرے قریب آجاؤ جمیل" وہ ذرا کی ذرا جھجکے پھر قریب آ گئے۔
"اور قریب آجاؤ' نا' لیٹ جاؤ' تمہیں سکون کی ضرورت ہے" میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
وہ بچوں کی طرح میری گود میں لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے ان سے کہا "جمیل کوئی گیت سناؤ گے"
"نا" وہ کچھ کھوئے کھوئے انداز میں بولے۔ "تو کوئی رومانی نظم ہی سہی ———— وہ "آتشکدہ" ہے نا مخدوم کی وہی سنا دو"۔ میں نے پیار بھرے انداز میں فرمائش کی۔

وہ ایک لمحہ تک ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے پھر بولے "یہ رومانی نظارے' تنہائی' قرب' شعر اور موسیقی۔! آخرا!! بخدا میں اس کی تاب نہیں لا سکتا۔ کیوں امتحان لے رہی ہو میرا ———— بخدا اس ساز کو نہ چھیڑو جس میں فریاد چھپی رہی ہو۔ وہ یک بہ یک اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے "چلئے۔ اب ہمیں لوٹ جانا چاہئے"

صبح خوش گوار تھی "زیبان" میں آفتاب کی نرم اور سنہری کرنیں غذائیت کی طرح ضروری ہی نہیں بلکہ دلفریب مناظر کی جاذبیت بڑھانے کے لئے لازمی ہیں۔ دریائے "سین" کی ننھی ننھی موجیں "منزل" (میری قیام گاہ) کی سنگین دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ بادبانی کشتیاں آ اور جا رہی تھیں۔ دور سے آنے والی کشتیوں کے سفید مستول کسی ہندوستانی بیوہ کے آنچل کی طرح سسک سسک کر لہرا رہے تھے۔ رومان پسند سیاحوں کی حسین ٹولیاں گھومتی پھرتی تھیں۔ ہر طرف شادابی ہی شادابی تھی۔ پتے پتے اور بوٹے بوٹے پر مسرت جھلک رہی تھی۔
جمیل میاں آبنوسی دریچے کی چوکھٹ پر کہنیاں ٹیکے دریا کی سیر کر رہے تھے۔ ان کے سیاہ دراز بال مچل مچل کر سانولے سلونے گالوں کی بلائیاں لے رہے تھے۔ میں قہوہ بنا رہی تھی۔ جب تیار کر چکی تو وہ بھی آگئے اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا "کتنی حسین ہے یہ وادی! جی میں خواہ مخواہ چاہت کی امنگ پیدا ہوتی ہے" نرگس نے جو پاس ہی کھڑی قہوہ میں شکر ملا رہی تھی' کن انکھیوں سے مجھے تاکتے ہوئے سوال کیا "کس سے بابو صاحب"
میں جھلا کر چیخ اٹھی "تجھ سے چڑیل"
وہ سنجیدہ سی ہو گئی۔ جمیل میاں نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا "اس حسین وادی' نقرئی جھیل' لہلاتے سبزے' تھرکتی موجوں' جھاگ اڑاتے ساحل' جگ مگ جگ مگ کرتے چاند' جھل مل جھل مل کرتے تاروں غرض اس خوابوں کے جزیرے کے ذرہ ذرہ کو چاہنے اور ہو سکے تو چاہے جانے کی آرزو ہے نرگس"
"او مائی ورڈز در تھ" میں نے جملہ چست کیا۔
"تو اظہار تعشق ہو رہا تھا" جمیل میاں کے بعیلانے غصہ میں کانپتے ہوئے کہا۔ شاید انہوں نے صرف آخری جملے سنے تھے۔
"کیا کہہ رہے ہیں آپ"، جمیل عالم استعجاب میں کہہ اٹھے۔
"میرے گھر میں میری نظروں کے سامنے اور میری بیوی سے اظہار محبت کر رہے ہو اور پوچھتے ہو کیا کہہ رہے ہیں آپ! اللہ رے بے باکی!!! اپنے بھائی کے گھر پر ڈاکہ ڈالتے ہوئے شرم نہیں آتی نہیں"

"بھیا"

"بہی وطن ———— جواب سے بھیا کہا۔ نکل جاؤ میرے گھر سے ———— اسی وقت"

جمیل بھی ہوگئے "ہاں چلا جاؤں گا ———— لیکن بھیا، شرم آپ کو آنی چاہئے نہ کہ مجھے۔ شرم اس کو آنی چاہئے۔ جس نے کسی کی زندگی پر ڈاکہ ڈالا ہے، کسی کے جذبات سے کھیلا ہے اور کسی کے ساز زندگی کو چور چور کردیا ہے اس آرزو میں کہ شاید اس سے کوئی نغمہ نکلے تو تعیش سماعت ہو۔ جس طرح رباب پر ایک فن کار ہی کی انگلیاں راگ راگنیاں پیدا کرسکتی ہیں، اسی طرح حسن کے ساز کو جوانی ہی ہم آہنگ زیست کرسکتی ہے ———— کاش آپ کے خشک بازو کسی کی مینائی گردن میں حمائل ہونے سے پہلے ہی شل ہوجاتے۔ آپ کے خشک ہونٹ کسی کے آتشیں لب کو چھونے سے قبل ہی بے حس ہوجاتے اور آپ کے جذبات شہوانی جوانی سے ہم آغوش ہونے سے پہلے ہی فنا ہوجاتے ————" کہتے کہتے وہ کمرے سے چلے گئے۔ اسی شام کی گاڑی سے وہ وطن لوٹ گئے۔

وہ چاہے کس قدر ہی مختصر ہو

محبت کی جوانی زندگی ہے

محبت کا خواب کتنا سہانا اور کس قدر نا پائیدار ہوتا ہے۔ کاش زندگی ایک ننھا سا حسین خواب ہی بن جائے۔ لیکن ظالم فطرت کو کیوں قرار آنے چلا تھا۔ اس کی رگ رگ میں ذوق فنا انگڑائیاں لیتا رہتا ہے اور شاید فطرت کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ ناپائیدار ہے۔ عبدیت اور معبودیت کا بے نام فرق یہیں جاکر ختم ہوتا ہے۔ حسن کا رہی خالق، حسن ازل بھی خالق، اس کی مخلوق بھی فانی اس کے شہ کار بھی فانی ؎

نہ تو اور نہ میں اور نہ وہ جاودانی

ازل کے مصور کا ہر نقش فانی

ارے توبہ، رہنے بھی دو اس خالق و مخلوق اور بقا و فنا کی الجھنوں کو میں کہہ رہی تھی جمیل میاں کو گئے چار سال بیت گئے۔ انھوں نے بھلا دیا یہ تو میں کہہ نہیں سکتی۔ ہاں میں نے انھیں ابھی تک دل میں بسائے رکھا تھا اور اگر انھوں نے بھلا دیا ہو تو اس میں ان کا کیا قصور! ؎

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے

تم نے ہمیں بھلا دیا، ہم نہ تمہیں بھلا سکے

یوں بھی یاد اور بھول اضافی چیزیں ہیں، محبت سے ان کا تعلق؟ ہاں تو چار سال بعد کی بات ہے کہ ان کی شادی کا دعوت نامہ ملا۔ ہمیں بلایا تھا۔ میں بہت خوش تھی۔ شاید ان بیاہی لڑکی بھی آرزوئے وصل کی لطیف چٹکیوں سے دل ہی دل میں اتنا خوش نہ ہوتی ہوگی۔ کیوں نہ خوش ہوتی میرے جمیل کی شادی تھی نا۔ شادی کسی کے ساتھ کیوں نہ ہو، وہ میرا محبوب ہی تو تھا۔ مجھے خود دیکھئے شادی ہوئی بڑے بھائی سے اور دل ہارا ننھے جمیل سے۔ "بوڑھے" کو میرے انبساط پر بہت اچنبھا ہوا اور انھیں یقین ہو چلا کہ مجھے جمیل سے کوئی تعلق خاطر نہیں اس لئے وہ شادی میں شریک ہونے پر راضی ہوگئے۔

سورج کی زرد شعاعیں نیم جان پتوں پر پھیل رہی تھیں۔ شہتوت اور دیوار کے دراز سائے دہشت ناک معلوم ہوتے تھے۔ خشک ٹہنیوں اور سوکھے پتوں کی رگڑ سے جو آواز نکلتی ایسا معلوم ہوتا تھا مرثیہ خوانی ہو رہی ہے۔ ہوا کے گرم جھونکے اس اداس فضا کو اور بھی بھیانک بنا دیتے تھے۔ ہر طرف وحشت اور ہر سمت خوف و ہراس طاری تھا ——— جیسے دنیا ماتم کدہ بنی ہوئی ہے۔

جمیل میاں کے مکان پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نہ در پر دربان نہ باغیچہ میں مالی، نہ چہل پہل نہ شور ہنگامہ، نوبت کی آواز نہ شہنائی کی سریلی دھن، نہ ڈھول کی تھاپ نہ ڈومنیوں کا گانا ——— میرا ماتھا ٹھنکا۔ خشک اور بوڑھے درخت پر الو.... چیخ اٹھا — میرا جی بیٹھ گیا، نبضیں چھوٹ گئیں - پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ لیکن کانوں میں کسی کی جانی پہچانی آواز آ رہی تھی جیسے کوئی کہہ رہا ہو "بھائی جان ——— میری جان، تمہارا کب سے انتظار ہے۔ آبھی جاؤ، دیکھو تاہم ایسے میں بھی تمہیں کو یاد کر رہے ہیں"۔ قدم اٹھ گئے اور میں دوڑنے لگی۔ زور سے بہت تیز۔ کبھی اتنی تیزی سے نہیں دوڑا تھا۔ وہ تو خیر گزری ڈرائنگ روم میں جمیل میاں کی ممانی گئیں اور میں سنبھل گئی۔ سانس پیٹ میں سمانے لگا تو منہ سے نکل گیا "جمیل میاں"

کہاں کا سلام کیسا پیام، کیسی خیر و عافیت اور کدھر کی مبارک سلامت۔ شاید ہونی کو حیات پہلے ہی محسوس کر لیتے ہیں۔ انھوں نے ایک آہ کھینچی، آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔ کہنے لگیں ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

بس اس کو تو تمہارا ہی انتظار تھا۔ "یعنی آپ کیا کہہ رہی ہیں" "سچ کہہ رہی ہوں بیٹی" ان کی آنکھوں سے گنگا جمنا ابل پڑی اور سسکیوں کے درمیان رکتے رکتے کہا "آٹھ دن پہلے بھلا چنگا تھا۔ ادھر شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں ادھر اس کے دشمن بیمار پڑ گئے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں تپ دق ہے، مرض پرانا ہو چلا ہے، اندر ہی اندر گھن لگ گیا ہے۔ زندگی کی کوئی امید نہیں اور کل تو ڈاکٹر جاوید نے اے۔ پی کے بعد بالکل نراس کر دیا"۔

میں بے قابو ہو کر بولی "ان ڈاکٹروں کا کیا کہنا، یہ تو خدائی فوجدار ہیں، جسے چاہا مار ڈالا جسے چاہا چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ زندگی اللہ کے ہاتھ ہے، میرا معبود ضرور انھیں بچائے گا، اس اٹھتی جوانی پر ضرور ترس آ جائے گا اسے"!

"نہیں بیٹی، موت بوڑھے اور جوان کو تھوڑا ہی دیکھتی ہے۔ بس جس کی سر گئی وہ سدھارے لیکن میرا جمیل کہتا تھا کہ نہیں ڈاکٹر! میں آج نہیں مر سکتا ——— اس کے آنے تک میں زندہ رہوں گا۔ کوئی قوت مجھے نہیں مار سکتی۔ زندگی صرف چند ساعتوں کے نظام ہی کا نام تو نہیں بلکہ زندگی ایک نظام نامے کے تحت چلتی ہے۔ دیکھو میرے ذمے ایک اور کام رہ گیا ہے۔ اسے پورا کر لوں تو سدھاروں، چاہے اس کے پورا ہونے میں کتنی ہی دیر کیوں نہ ہو ——— میں نہ مروں گا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے کمرے کی طرف چل پڑیں۔

جمیل آنکھیں بند کیے بستر علالت ——— نہیں، نہیں بستر مرگ پر پڑے تھے۔ بس ہڈیاں ہی ہڈیاں اور اور سانس ہی سانس باقی تھی۔ قدم کی آہٹ پر انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ چشم ٹھہلا اب چشم بیمار ہو گئی تھیں۔ بخدا میں تاب نہ لا سکی۔ لیکن کیا کرتی چپ ہی رہی، وہ آہستہ آہستہ بولے۔ ع بہت دیر کی مہرباں آتے آتے"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہوئی ہوگی [illegible] کتاب کے مقدمے کی تالیف میں ہوئی ہے۔ مناسب ہو [illegible] آئندہ وہ اپنے مقدمے کو ایک علٰحدہ کتاب [illegible] میں شائع کریں کیونکہ اس میں جملہ [illegible] شعرا کے تفصیلی حالات شامل ہوگئے ہیں۔

موت وحیات

از شاطر حکیمی۔ ناشر سی۔ پی اکیڈیمی ناگپور۔

شاطر حکیمی صوبۂ متوسط کے خوش فکر شعراء میں ایک اچھی جگہ کے مالک ہیں اور اچھے ترقی پسند رجحانات کے باعث عہد حاضر کے نوجوان اُردو شعراء کی صف میں شامل نظر آتے ہیں۔ وہ جس مقام پر پیدا ہوئے اور جہاں نشوونما پائی اس کے لحاظ سے ان کی یہ خصوصیات خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔ صوبۂ متوسط، دوآبۂ گنگ وجمن یا پنجاب یا دکن کی طرح اُردو زبان اور ادب کا مرکز نہیں سمجھا جاتا لیکن عہد حاضر میں اس سرزمین سے اچھے اچھے شاعر، انشاپرداز اور صحافت نگار پیدا ہوتے جارہے ہیں جس کی وجہ سے یقین ہے کہ ایک روز یہ صوبہ بھی اُردو کے خدمت گزاروں کا مامن و مخزن ثابت ہوگا۔

شاطر حکیمی کا یہ مجموعۂ کلام ان کے تابناک مستقبل کا آئینہ دار ہے۔ وہ نہ صرف ایک اچھے شاعر ہیں بلکہ زمانے کے رجحانات سے پوری طرح واقف بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں دلکشی، پختگی اور زندگی پائی جاتی ہے۔ زبان پر بھی انھیں قابو حاصل ہے اور قافیوں اور ردیفوں میں ترنم پیدا کرنے کے راز سے بھی وہ بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں کے عنوان بھی بہت دلچسپ اور بے تکلف مقرر کئے ہیں۔ یقین ہے کہ ان کا یہ مجموعہ اُردو شاعری کی دنیا میں اپنی جگہ پیدا کرے گا۔

ہندوستانی معاشیات کے مبادی

از شرف الدین بی اے (عثمانیہ)
ناشر انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد

یہ ضخیم کتاب سلسلۂ مطبوعات انجمن طیلسانین عثمانیہ کی چودھویں کڑی ہے۔ اور اس کا پیش لفظ مولوی محمد حبیب الرحمن صاحب ناظم سررشتۂ تجارت وحرفت نے قلم بند کیا ہے۔

اس کتاب کی ترتیب میں اگرچہ انگریزی کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے لیکن برطانوی ہند کے علاوہ مملکت آصفیہ کی معاشی زندگی کے متعلق بھی جگہ جگہ حالات کا اضافہ کردیا گیا ہے۔ کتاب سات ابواب پر منقسم ہے پہلا باب قدرتی ذرائع اور آبادی، دوسرا ہندوستان میں معاشی تغیر، تیسرا زراعت، چوتھا صنعتی ترقی۔ پانچواں حمل ونقل اور تجارت، چھٹا زر قیمتیں اور بنک کاری اور ساتواں مالیات کے لئے مختص کیا گیا ہے۔ بہرحال پوری کتاب علمی معاشیات کی ضروری معلومات سے مملو ہے اور چونکہ اسلوب بیان بہت سادہ اور سلیس ہے اس لئے توقع ہے کہ عام اُردو داں اس کے مطالعہ سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

شیرازہ

از احسان دانش۔ ناشر مکتبۂ دانش کرشن نگر لاہور۔

احسان دانش پنجاب کے مشہور شعراء میں سے ہیں اور اب تک ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ جن میں سے بعض پر اس رسالے میں تبصرہ بھی شائع ہوچکا ہے۔

یہ ان کا ایک جدید مجموعہ ہے جو غلام معین الدین ای سی ایس کے نام معنون کیا گیا ہے۔ اس کو آتش گل، داغوں کے پھول اور جھنکارین کے عنوانات کے تحت تین حصوں پر منقسم کیا ہے۔ پہلے دو حصے نظموں پر مشتمل ہیں اور آخری حصہ غزلوں کا مجموعہ ہے۔

احسان دانش شاعر مزدور کے لقب سے مشہور ہیں اور اس وقت سے مزدوروں کی ترجمانی کرتے آئے ہیں جب کہ جدید ترقی پسند شعراء کا گروہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ ان کے کلام میں جوش اور اثر دونوں موجود ہیں اور وہ حزن وملال کی اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کا یہ مجموعہ بھی ان کی شاعری کے جدید رجحانات کا دلچسپ نمائندہ ہے اور توقع ہے کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نوٹ کیا جاتا ہے کہ مولوی قاضی خیرالدین صاحب منتخبہ طلبہ کو تعلیم دیتے ان طلبہ میں سے انتخاب کر کے اردو امتحانات میں شریک کروایا۔ سنہ کے کامیاب امیدواروں کو اسناد تقسیم کرنے تھے سیل گاؤں کے چند معزز حضرات نے جلسہ کا معقول انتظام کیا۔

جلسہ تقسیم اسناد سیل گاؤں یکم مئی سنہ موتی لال صاحب مرکاری کے مکان میں ایک جلسہ عام کیا گیا۔ دیہات میں منادی کرادی گئی تھی۔ جلسہ کا آغاز ٹھیک چار بجے ہوا۔ مولوی شیخ حسین صاحب نائب معتمد، ابوالظفر محی الدین صاحب سابق معتمد کی تائید پر مسٹر نیچیل نے جلسہ کی صدارت کی۔ مولوی شیخ حسین صاحب مولوی ابوالظفر محی الدین صاحب نے ادارہ کے اغراض و مقاصد پر کافی روشنی ڈالی۔ آخر میں صدر جلسہ نے بھی تعلیم کی اہمیت پر مختصر تقریر کی اور کامیاب طلبہ کو اسناد تقسیم فرمایا۔

۲ مئی سنہ کو سیل گاؤں سے سون پیٹھ روانہ ہوئے جہاں مولوی شیخ بنے صاحب مستاجر نے جو ایک علم دوست ہیں گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا اور اپنے یہاں قیام و طعام کا معقول انتظام کروایا جس کے ہم بہت مشکور ہیں۔

جلسہ تقسیم اسناد سون پیٹھ باگھم ۳ مئی سنہ کو مدرسہ وسطانیہ سون پیٹھ میں ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا جلسہ مسٹر نرسنگ راؤ بخشی جمعدار وسطانیہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ قصبہ ہذا کے حسب ذیل حضرات نے شرکت فرمائی۔

ڈاکٹر سنبھا راؤ صاحب، منوہر راؤ صاحب بخشی اول مددگار مدرسہ ہذا۔ مولوی سید احمد صاحب جمعدار، مولوی قاضی نظیرالدین صاحب، مولوی غلام محبوب صاحب منشی تپہ خانہ، ماہر راؤ صاحب دیسکھ، مولوی محمد ہاشم صاحب، ناگور راؤ صاحب دیسکھ، بھیما شنکر راؤ صاحب، حسین خان صاحب ملکیر، ہری بھاؤ صاحب، اننت راؤ صاحب، مولوی شیخ بنے میاں صاحب مستاجر۔ جلسہ کے آغاز پر مولوی شیخ حسین صاحب و مولوی ابوالظفر محی الدین صاحب نے ادارہ کے اغراض و مقاصد بیان کئے۔ ازاں بعد صدر جلسہ نے بھی اپنے زرین خیالات سے حاضرین کو مستفید کیا اور سندیں تقسیم کیں۔ جلسہ کے ختم پر طلبہ اردو امتحانات میں شریک ہوئے۔

۴ مئی سنہ کو جلنا پہنچے اور دفتر ادارہ ادبیات اردو کو صحیح واپسی ہوگئی۔

تعلیم و تدریس کا مفت انتظام اردو امتحانات کی تیاری کرائی جاری ہے روزانہ صبح درس ہو رہے ہیں۔ خاص طور پر مولوی شیخ حسین صاحب مولوی نورالدین صاحب مولوی خیرالدین صاحب مولوی ابوالظفر محی الدین صاحب (جو بغرض استفادہ تعطیلات موسم گرما تشریف لائے) خورشید النساء بیگم صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ نسوان اردو میں مصروف ہیں مولوی سعیدالدین صاحب درس دے رہے تھا۔

ادارہ کے حالات مولوی شیخ حسین صاحب، مولوی نورالدین صاحب مولوی سعیدالدین صاحب اور جملہ ارکان نہایت سرگرمی سے کام انجام دے رہے ہیں کتب خانہ کا انتظام سعیدالدین صاحب کے ذمہ ہے ابتداء سے اب تک ادارہ جناب قاضی محبوب الدین صاحب کے دیوان خانے میں ہے جس کا ادارہ بہت ممنون و مشکور ہے۔ علم کا ذوق بڑھانے کے لئے ادارہ کے دارالمطالعہ سے لوگوں کو کتابیں دی جاتی ہیں روزانہ عوام اور ارکان دارالمطالعہ میں آتے ہیں افسوس ہے کہ ادارہ کی مالی حالت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے اخبار رہبر دکن ایک سال سے بند ہے۔

بلڈنگ فنڈ صدر ادارہ کی اپیل پر ادارہ ہذا نے تقسیم اسناد کو فی الحال ملتوی کر دیا ہے اس فنڈ کی تکمیل کے لئے عالی جناب دوم تعلقدار صاحب میر مجلس ادارہ ہذا سے ملاقات کی گئی۔ امید کی جاتی ہے کہ حسب استطاعت دفتر ہذا سے بلڈنگ فنڈ کے لئے رقم روانہ کی جائے گی۔

اردو امتحانات بابت سنہ ۱۳۵۲ف امسال حال ادارہ ہذا کے اردو امتحانات ہر روز ... جولائی سنہ ۱۳۵۲ف کو ۱۲ / اراکین مقامی کی نگرانی ...

حسب ذیل مرکزوں میں منعقد ہوئے۔
الف: اندولہ۔ بانسواڑہ۔ بھینسا۔ اور بلدہ (اناث) بلدہ (ذکور) بلدہ (فوج) بلولی۔ بھیر۔ پرلی۔ ناگلی۔ جگتیال۔ دوم کنڈہ۔ کورنگل۔ گدوال۔ سنگاریڈی۔ مومن آباد (فوج) میونہ ناگرکرنول۔ نظام آباد۔

ادارہ کی طرف سے حسب ذیل اصحاب بحیثیت صدر نگرانکار تشریف لے گئے تھے جنھوں نے تاریخ اور وقت مقررہ پر امیدواروں کا امتحان لیا۔

مولوی کلیم اللہ حسینی صاحب مولوی فاضل (اندولہ) مولوی محمد حسین صاحب اظہر (اندولہ) مولوی مظہر الدین صاحب (بانسواڑہ) مولوی احمد اللہ حسینی صاحب (بھینسا) مسٹر راماکرشن راؤ پستکی (بلولی) مولوی محمد حسن صاحب ایم اے (بھیر) مولوی محمد امیر الدین صاحب (پرلی) مولوی رکن الدین صاحب خان (ناگلی) مولوی شیخ محمد اسمٰعیل صاحب (جگتیال) مولوی ظہیر الدین صاحب (دوم کنڈہ) مسٹر شیشیا (کورنگل) مولوی معین الدین صاحب ایم ایس سی (گدوال) نواب باقر علی خاں صاحب (سنگاریڈی) مولوی حمید الدین صاحب (نظام آباد) مولوی احمد محی الدین صاحب منشی فاضل (ناگرکرنول)۔

مرکز بلدہ ذکور و اناث حسب سابق سٹی کالج اور [illegible] ہائی اسکول نامپلی مقرر کئے گئے تھے۔ مرکز فوج نظام کالج اور پولیس سے میدان قرار پائے۔ مرکز بلدہ کے صدر نگران کار مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار جامعہ عثمانیہ مرکز بلدہ فوج کے صدر نگران کار پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی تھے۔ مرکز اناث کی نگرانی محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ، محترمہ [illegible] بیگم صاحبہ، محترمہ بیگم صاحبہ ڈاکٹر [illegible] اور محترمہ مسز عبد الرحمن صاحبہ مدیر وقت نے فرمائی۔

مولوی اکبر الدین صاحب ایم اے اور مولوی خیر الدین صاحب وکیل نے مرکز بلدہ کی نگرانی میں صدر نگرانکار صاحب کی بہت مدد فرمائی۔ مرکز فوج کی نگرانی میں ہندو راج صاحب سکسینہ ایم ایس سی، مولوی عبد الحفیظ صاحب صدیقی ایل ایل ایم، مولوی عبد القادر صاحب فاروقی (عثمانیہ) اور مولوی ابو الظفر محی الدین صاحب نے ہاتھ بٹایا۔

مرکز اناث کی نگرانی میں محترمہ افسر النساء بیگم صاحبہ اور محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ نے بڑی مدد دی۔

جملہ مراکز کی تفصیلی روئداد سلسلہ وار شائع کی جا رہی ہے۔

مرکز نظام آباد

ماہ جولائی ۱۹۴۶ء کو رات کے ساڑھے نو بجے نظام آباد پہونچا۔ اسٹیشن پر مولوی محمد حسین خاں صاحب معتمد شاخ ادارہ نظام آباد تشریف لائے تھے۔ مسافر بنگلہ میں قیام و طعام کا انتظام کیا گیا تھا۔ معتمد صاحب کو قیام و طعام کا خاص خیال تھا جس کی وجہ بیحد آرام رہا۔ ۱۳ ر شہریور ۱۳۵۵ف کو رسم سے امتحان شروع ہو گیا۔ مولوی انیس الحق صاحب صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ نظام نے از راہ عنایت مدرسہ کا بڑا ہال ذکور کے امتحان کے لئے اور باز و کا کمرہ اناث کے لئے دیدیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ فرنیچر اور سیاہی کی دواتیں بھی دلوادی تھیں جس کی وجہ سے معتمد صاحب کو بہت سہولت ہوگئی نیز صاحبزادہ مولوی میر احمد علی خاں صاحب مہتمم تعلیمات نے اپنے دفتر سے اناث کے پردہ کے لئے راوٹیاں وغیرہ فراہم کردی تھیں۔

ذکور کے امتحان میں معتمد صاحب کے علاوہ وینکٹ کشور صاحب صدر مدرس ٹاؤنڈی کلاں تعلقہ کاماریڈی، مولوی محمود عالم صاحب نائب معتمد شاخ ادارہ، مسٹر ڈی راجنا اور مولوی عبد الاحد صاحب مددگاران مدرسہ تحتانیہ تعلقہ نظام آباد اور مولوی محمود علی خاں صاحب محمود نے نگرانی فرما کر بہت مدد دی۔

طبقہ اناث میں جناب صفیہ بیگم صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ نسواں وسطانیہ نے بحیثیت صدر نگرانکار مسلسل تین روز نگرانی فرما کر اپنی انتہائی دلچسپی کا ثبوت دیا۔ صدر صاحبہ نے اپنی مدد کے لئے ایک اور نگرانکار محترمہ شریف بانی صاحبہ کو بھی بلا لیا تھا۔ اس کے علاوہ خادمہ بھی طالبات کو پانی پلانے کے لئے موجود تھی۔

[illegible] صاحب کہاں کر مکمل اپگریڈ [illegible] سے متعلق [illegible] بہت اچھا رہے۔ کام [illegible] معلوم کر کے انتہائی مسرت ہوئی کہ [illegible] کا [illegible] میں آپ ہی کی توجہ خاص کا مرہون منت ہے کہ ایسے خدمت گزاران قوم کی ضرورت [illegible] مزاج امتحان گاہ تشریف نہ لا سکے۔ [illegible] ہوا۔

سب سے پہلے کر مولوی غلام محمد صاحب وکیل تعلقہ [illegible] یہ معلوم ہوا کہ صاحب موصوف ہی کی بدولت وہاں ادارہ قائم ہوا اور چل رہا ہے۔ بانی بھی وہی ہیں۔ انہوں نے زیادہ وقت امتحان گاہ میں دیکر انتہائی دلچسپی کا ثبوت دیا۔

[illegible] کو مولوی غلام احمد صاحب کے ہمراہ صاحبزادہ میر احمد علی خاں صاحب مہتمم تعلیمات و مولوی بشیر احمد صاحب مہتمم خزانہ امتحان گاہ تشریف لائے تھے۔ مہتمم صاحب تعلیمات نے تمام پرچوں کو بغور ملاحظہ کرکے معیار کے متعلق اظہار خوشنودی فرمایا۔

معتمد صاحب ادارہ نظام آباد کی زبانی معلوم ہوا کہ دو سالہ اسناد تقسیم شدنی ہیں۔ اس کے لئے ایک جلسہ منعقد کرنے کی کوشش میں ہیں۔ موصوف نے انتہائی کوشش کی کہ ہماری موجودگی میں ہو جائے۔ لیکن اکثر عہدہ دار تعطیلات کی وجہ مستقر پر نہیں تھے۔ جناب مہتمم صاحب تعلیمات و خزانہ نے امید دلائی کہ قریب میں جلسہ تقسیم اسناد منعقد کریں گے۔ معتمد صاحب موصوف و مہتمم صاحب تعلیمات کا یہ خیال ہے کہ سابقہ ارکان کی تبدیلی ضروری ہے۔ کام کرنے والوں اور دلچسپی رکھنے والوں کو شریک کرنا چاہیے۔

آخر میں معتمد صاحب شاخ ادارہ نظام آباد کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جن کی وجہ مجھ کو ہر طرح آرام ملا نیز موصوف پڑتے پانی میں مجھے اسٹیشن نظام آباد پر سوار کراکے واپس ہوئے۔

مجید الدین

مرکز پرلی

بتاریخ ۲۰ امرداد [illegible] بوقت ۶.۵۰ م کو اسٹیشن نامپلی حیدرآباد دکن سے روانہ ہوکر تقریباً ۱۰ بجے شب اسٹیشن پر مولوی شیخ محمد نذیر صاحب معتمد ادارہ ادبیات اردو مستقر پرلی مع ارکان موجود تھے۔ صاحب موصوف سے ملاقات کے بعد جناب نے دیگر ارکان کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد آبادی کو روانہ ہوئے مدرسہ تحتانیہ میں قیام کا انتظام تھا۔

مدرسہ تحتانیہ قصبہ پرلی میں ہی امتحان کا انتظام تھا۔

تاریخ مقررہ سے پہلے ہی نشستوں کا انتظام ہوچکا تھا ٹھیک ۱۰ بجے امتحان زبان دانی کا آغاز کیا گیا۔ امتحان گاہ میں معتمد ادارہ کے علاوہ مولوی نواز الدین صاحب، مولوی شیخ حسین صاحب، مسٹر بھوانی پرشاد صاحب اور مسٹر ادھو راؤ صاحب موجود تھے۔

مدرسہ تحتانیہ نسواں میں طالبات کے امتحان کا انتظام تھا جس کی نگراں کار صدر معلمہ صاحبہ تھیں۔ وقت سے دس منٹ پیشتر پرچے بذریعہ مولوی شیخ محمد نذیر صاحب معتمد ادارہ صدر معلمہ صاحبہ کی خدمت میں روانہ کر دیئے گئے تھے۔ دوران امتحان میں مولوی غلام رسول صاحب اول مددگار وسطانیہ پرلی امتحان گاہ میں تشریف لائے اور تھوڑی دیر کے بعد واپس ہوئے نیز وقتاً فوقتاً تشریف لاکر تھوڑی دیر نگرانی کرتے رہے۔

زبان دانی کا زبانی امتحان لیا گیا اور حسب نظام اوقات اردو عالم کے پرچہ جات لئے گئے۔

ادارہ کے عام حالات:— دار المطالعہ مولوی قاضی لطف الدین صاحب کے دیوان خانے میں ہے جس کو موصوف نے ادارہ کے لئے وقف کر دیا ہے۔ مولوی فصیح الدین صاحب مدرس وسطانیہ، شرافت علی صاحب مدرس، مولوی عبد القادر صاحب ادارہ کے اراکین ہیں۔ دار المطالعہ میں کوئی اخبار نہیں آتا البتہ "سب رس" آیا کرتا ہے۔ معتمد صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ سعید الدین صاحب ایک نوجوان محنتی ادارہ کے خیرخواہ تھے مگر وہ فکر معاش میں بیڑ چلے گئے ہیں جن کی روانگی کے باعث ادارہ اب خاموش ہو گیا ہے۔

ادارہ کا کوئی مستقل سرمایہ نہیں ارکان ادارہ موقع و محل سے نہایت عمدگی سے کاروبار ادارہ انجام دے رہے ہیں۔ ادارہ کی عمارت کے لئے چندہ کا آغاز کیا گیا ہے جس میں جناب محسن بن شبیر صاحب مرحوم تعلقدار مومن آباد کا خاص حصہ ہے۔

قیام و طعام کا انتظام مولوی شیخ محمد وزیر صاحب معتمد ادارہ شاخ کیرلی کے یہاں تھا انتظام معقول رہا۔ ادارہ کی جانب سے شیخ محمد وزیر صاحب و دیگر ارکان کا شکریہ ادا کیا گیا۔

ناکلی ضلع اورنگ آباد

چہارشنبہ کے روز ۲۹ امرداد ساڑھے چار بجے دن کی ٹرین سے اورنگ آباد کی طرف روانہ ہوا پندرہ سولہ گھنٹوں کے طویل سفر کا خیال ہی طبیعت کو قبل از وقت تھکا دینے کے لئے کیا کم تھا۔ اس پر ہمراہان کو وقوق کی لا انتہا غیر دلچسپ گفتگو مستزاد تھی۔ جگہ ملی بھی تو ایسے ڈبے میں جو مارواڑ کے تاجروں اور صرافوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک ہمنشیں نے گفتگو سیاست حاضرہ سے شروع کی تو خوش ہوا کہ سفر کی گھڑیاں لطف و آرام سے گزر جائیں گی اور تھکن کا احساس نہ ہونے پائے گا۔ لیکن چند منٹوں کے بعد گفتگو کا رخ بازار کے نرخ کی طرف پھر گیا اور گھنٹوں کے بعد بھی گفتگو بازار کے بھاؤ سے آگے نہ بڑھنے پائی۔ ان کو اصرار تھا کہ میں بھی کچھ کہوں۔ میں کہتا کیا جب سننا بھی میرے لئے بار تھا۔ بہرحال وہ رات آنکھوں میں کٹ گئی صبح نمودار ہوئی اور دھند لکا صاف ہوا تو اورنگ آباد کا اسٹیشن سامنے تھا۔

اسٹیشن سے باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ خلد آباد کو جانے والی بس ٹرین کے آنے سے ایک گھنٹہ قبل جا چکی ہے اب وہاں تک جانے کے لئے ٹانگے کے سوا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ رات کے سفر کی تھکن کے ساتھ پیش آنے والے سفر کا خیال ہمت شکن تھا، لیکن وقت پر ناکلی پہنچنا بھی ضروری تھا۔ بہ مجبوری تمام ٹانگے میں بیٹھا اور خلد آباد کی طرف چل پڑا۔ راستہ میں آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اس سے سفر کی کلفت اور سرگرانی یک گونہ کم ہو گئی۔ خلد آباد میں مجھے لینے کے لئے شاخ ادارۂ ادبیات اردو ناکلی کے معتمد جناب وزیر خاں صاحب پہلے ہی سے موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ یہاں سے ناکلی چلنے کی ٹیری نہیں ہے یہ راستہ کچا ہے اور دلچسپ ہے لیکن وہاں معلوم ہوا کہ دلچسپ سفر تو اب شروع ہونے والا ہے ..... خلد آباد سے ناکلی جانے کے لئے گھوڑے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹوں کے بعد ہم ناکلی میں داخل ہوئے۔

خیال تھا کہ شاید ناکلی جا کر دست اہل آبادی میں ہماری بات کے کسی تعلقہ کے مستقر سے کم نہ ہو گی لیکن دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی خانہ شماری پانسو سے زیادہ نہیں ہے اور صرف تین سو مکانات مسلمانوں کے ہیں۔ یہ بات حیرت انگیز تھی کہ اس مختصر سی آبادی میں سو امیدوار ادارہ کے مختلف امتحانات میں شریک تھے۔ اس کے علاوہ تھا امیدواروں نے گزشتہ سال جامعہ نظامیہ کا امتحان منشی میں شریک ہو کر کامیابی حاصل کی تھی اور اس سال بھی اس امتحان کی تیاری میں بعض امیدوار مشغول ہیں۔ مجھے مولوی وزیر خاں صاحب نے بتایا کہ یہ ساری علمی سرگرمی وہاں کے صدر مدرس مولوی کریم خاں صاحب اور اورنگ آباد کے وکیل شاخ ادارہ ناکلی کے سرپرست مولوی شیخ لعل صاحب بی اے ایل ایل بی عثمانیہ کی پرخلوص کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس وقت میری حیرت اور بڑھ گئی جب میں نے سنا کہ ایک خانگی مدرسہ بھی "مدرسہ سلطانیہ اسلامیہ" کے نام سے قائم ہے۔ وکیل صاحب کے پرخلوص ایثار اور سادگی اور طالب علمی کے ابتدائی دور سے لیکر اب تک جو جو مشقتیں برداشت کر کے انھوں نے مسلسل ترقی کی ہے اس کو سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ علاوہ ازیں ناکلی میں ایک خانگی اقامت خانے کے مصارف بھی مستقلاً ان کی ذاتی آمدنی سے پورے ہوتے ہیں۔ پھر زاد الطلبا اور مفلوک الحال لوگوں کی مالی امداد الگ رہی۔ تین دن تک امتحانات ہوتے رہے اس عرصے میں وہاں کے خطیب و قوالی مولوی محمد جعفر صاحب کا مہمان رہا جن کی مہمان نوازی اور مخلصانہ گفتگو نے دل سے اجنبیت کا احساس مٹا دیا۔ ان کے علاوہ شیخ لعل صاحب، کریم خاں صاحب، وزیر خاں صاحب، قاضی تاج الدین صاحب اور وہاں کے تحصیلدار صاحب کے مخلصانہ سلوک کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ ان حضرات سے مختلف مباحث کے علاوہ ادارۂ ادبیات اردو کے متعلق بھی گفتگو رہی۔ مولوی کریم خاں صاحب نے ان تجاویز کا ذکر کیا جو انھوں نے ادارہ کے سامنے پیش کی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ادارہ کے امتحانات کو مقبول عام ہونے کے لئے ضرورت ہے کہ حکومت ان کو مسلمہ قرار دے۔ یہ ایک ایسی مفید تجویز ہے جس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے خود ادارہ کے ارباب اقتدار کوشاں ہیں۔ ناکلی میں جن امیدواروں نے امتحانات میں شرکت کی یہاں کی فہرست کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مختصر سی آبادی میں اتنے امیدواروں کا شریک ہونا بجائے خود لائق تعریف ہے۔ مجھے "اردو دانی" کے زبانی امتحان کے موقع پر محسوس ہوا کہ لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں تیار تھیں جس کے لئے صدر معلمہ صاحبہ مستحق مبارکباد ہیں۔ ان طالبات کے جوابات سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ امتحان "اردو زبان دانی" کے لئے بڑی آسانی سے تیار کی جا سکتی تھیں۔ جمعرات شب کو ناکلی سے رخصت ہوا۔ لیکن وہاں کے رہنے والوں کے خلوص اور سادگی کی یاد اب تک حافظے میں محفوظ ہے۔ یہ چیزیں قصبات میں زیادہ نظر آتی ہیں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سرمایہ کر دیا جائے پر غور کیا گیا اور طے پایا کہ چندۂ سالانہ کی
ادائی ارکان کی سہولت اور مرضی پر ہو کہ جس طرح چاہیں
ادا کریں۔ چندے کی کتاب میں نام درج کر دیئے جائیں گے
اور چندوں کی ادائی سہ ماہی ششماہی یا سالانہ جس طرح
چاہیں ارکان کر سکیں گے۔

روئداد مجلس انتظامی اردو امتحانات

ادارۂ ادبیات اردو امتحانات

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس یکشنبہ ۹ خورداد ۱۳۵۴ف مطابق ۱۹ اپریل ۱۹۴۵ء صبح ساڑھے نو بجے نظام کالج میں منعقد ہوا۔ حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

(۱) مولوی سید علی اکبر صاحب پرنسپل نظام کالج۔ صدر
(۲) مولوی محمد سجاد مرزا صاحب پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج نائب صدر۔
(۳) مولوی فضل حق صاحب پروفیسر انگریزی نظام کالج۔
(۴) ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔
(۵) مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ریڈر تاریخ جامعہ عثمانیہ۔
(۶) مولوی فاخر الحسن صاحب لکچرار عثمانیہ ٹریننگ کالج۔
(۷) مولوی میر محمد عالم صاحب مددگار ناظم تعلیمات۔
(۸) مسٹر شام سندر صدر انجمن پست اقوام۔
(۹) مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب مددگار ناظم رجسٹریشن و اسٹامپ۔
(۱۰) مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار اردو سٹی کالج۔
(۱۱) مولوی خواجہ حمید الدین صاحب ایم اے مہتمم ادارہ۔

۱۔ گزشتہ اجلاس کی روئداد پڑھی گئی اور جناب صدر نے اس کی توثیق فرمائی۔

۲۔ اردو امتحانات کے مرکز بمبئی کی یہ تحریک پیش ہوئی کہ
"زبان دانی کے اختیاری مضامین میں ترجمے کے لئے گجراتی زبان کو بھی جو بمبئی کی عام زبان ہے شامل کر لیا جائے۔"
طے پایا کہ اگر مرکز بمبئی سے اس امتحان میں پچیس یا اس سے زیادہ تعداد میں ایسے امیدوار شریک ہوں جو [illegible] گجراتی ترجمہ لیں تو اس کا پرچہ مرتب کیا جائے۔

۳۔ ممتحنین کے معاوضے کے سلسلہ میں جو پرچے مرتب کرنے اور پرچے کو جانچنے کے لئے علیحدہ علیحدہ [illegible] کے مسئلہ پر بحث رہا۔ اور طے پایا کہ امتحانات کی فیس چونکہ قلیل رکھی گئی ہے اس لئے موجودہ معاوضے میں تبدیلی مناسب نہیں ہے۔ البتہ سال حال جبکہ امیدواروں کی درخواستیں وصول ہو جانے پر اگر یہ معلوم ہو کہ ان کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے تو اس مجلس انتظامی کی ذیلی کمیٹی معاوضے کی شرح میں حسب ضرورت ترمیم کرے۔

۴۔ ۱۹۴۵ء کے پہلے امتحانات کے لئے ممتحنین کا تقرر عمل میں آیا۔

روئداد مجلس انتظامی

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس بتاریخ ۱۹ امرداد ۱۳۵۴ف م ۲۰ اپریل ۱۹۴۵ء شام کے ساڑھے چھ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔
حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

عالیجناب آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر
" نواب معین نواز جنگ بہادر
" مولوی سید علی اکبر صاحب
" مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب
" مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی
" ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور

مولوی محمد یونس صاحب ناظم آرائش بلدہ کو بھی عمارت ادارہ کے مقام کے تصفیے کے سلسلہ میں جناب صدر نے اس اجلاس میں شرکت کے لئے مدعو فرمایا تھا۔ اور انھوں نے بھی شرکت فرمائی۔

گزشتہ اجلاس کی روئداد سنائی گئی اور جناب صدر نے اس کی توثیق فرمائی۔ حسب ذیل امور شریک ایجنڈا تھے۔

۱۔ عمارت ادارہ کے لئے مقام کا تعین۔
۲۔ مخزن علوم و فنون (اردو انسائیکلو پیڈیا) کے لئے

[illegible]

۳۔ عملۂ دفتر ادارہ کے مشاہروں میں اضافے
کے [illegible] صاحب [illegible] تھا اور جن کی تفصیلات
[illegible] کی گئی تھیں۔

۴۔ [illegible] مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کی
[illegible] نسبت ذیلی کمیٹی کی سفارش۔

۵۔ تعلیم بالغاں کے سلسلہ میں نظام کالج میں عام
معلوماتی تقاریر کا انتظام۔

۱۔ گزشتہ اجلاس کی روداد کے سلسلہ میں معتمد
ادارہ نے توجہ دلائی کہ شعبۂ نسواں کے لئے جو دستور العمل
منظور کیا گیا تھا اس میں ایک مسئلہ غور طلب تھا جس کی طرف
معتمدہ شعبۂ نسواں نے دستور کے آخر میں خاص طور پر ایک
نوٹ کی صورت میں اشارہ کیا تھا۔ اس کو پڑھ کر سنایا گیا اور
کافی غور و خوض کے بعد طے پایا کہ دستور کے فقرہ جات ۲ و ۳
کی ترمیم کر کے دستور کی منظوری کی اطلاع شعبۂ نسواں کو دی جائے۔

"قاعدہ ۳ - فقرہ ۲۔ مجلس عاملہ کے عہدہ دار اور
ارکان ایک سال کے لئے نامزد کئے جائیں گے اور ختم مدت پر
دوبارہ نامزد ہو سکیں گے۔"

اس تصفیہ کی رو سے فقرہ ۳ کی ضرورت باقی نہیں
رہتی اس لئے اس کو حذف کر دیا جائے۔

۲۔ عمارت ادارہ کے لئے مقام کے تعین کے سلسلے
میں عالیجناب صدر صاحب نے ارشاد فرمایا کہ وہ اور مولوی
محمد یونس صاحب نے بعد غور و خوض طے کیا ہے کہ صرف دو
ہی مقامات ایسے ہیں جو ادارے کی عمارت کے لئے موزوں
ہیں۔

(۱) حسین ساگر کے کنارے وہ مقام جہاں اب محکمۂ اسکیات
واقع ہے۔

(۲) بشیر باغ کے عقب کا وہ مقام جو حسین ساگر کے بند کے
ختم پر واقع ہے۔

اس سلسلہ میں مولوی محمد یونس صاحب نے
نقشہ دکھا کر مقامات کی وضاحت کی۔ کافی غور و خوض کے بعد طے
پایا کہ پہلا مقام ادارے کی عمارت کے لئے زیادہ موزوں ہے
اور اس کے حصول کے لئے عالیجناب نواب صدر المہام بہادر
سررشتۂ تعمیرات سے استدعا کی جائے۔

جناب صدر نے وعدہ فرمایا کہ اب چونکہ ایک مناسب
مقام کا انتخاب مجلس انتظامی نے قطعی طور پر کر لیا ہے اس لئے
نواب ظہیر یار جنگ بہادر صدر المہام متعلقہ اور عالیجناب
صدر اعظم بہادر سے بہت جلد اس کے حصول کا تصفیہ کرا لیں
گے نیز یہ کہ ادارے کی عمارت کا سنگ بنیاد حضرت والا شان
ہز ہائینس ولیعہد بہادر شہزادۂ برار کے دست مبارک سے
رکھوایا جائے گا اور عمارت بننے کے بعد اس کا افتتاح کرنے کی
اعلیٰ حضرت بندگان عالی سے استدعا کی جائے گی۔

۳۔ مخزن علوم و فنون کے لئے سرکاری امداد کی جو اسکیم
بنائی گئی ہے وہ ملتوی کر دی گئی اور طے پایا کہ آنریبل
مولوی سید محمد اعظم صاحب کی موجودگی میں اس پر غور کیا
جائے گا۔

۴۔ عملۂ دفتر ادارہ کے مشاہروں میں اضافے کا
مسئلہ آئندہ اجلاس تک ملتوی کر دیا گیا اس لئے کہ آنریبل
نواب لیاقت جنگ بہادر آج کے اجلاس میں شریک نہیں ہیں

۵۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کے کتب خانے
کی خریدی کی نسبت جو ذیلی کمیٹی بنائی گئی تھی اس نے
چونکہ اپنی کوئی سفارش اب تک پیش نہیں کی ہے اس لئے
سفارش آنے تک اس مسئلہ کو ملتوی کیا گیا۔

۶۔ تعلیم بالغاں کے سلسلے میں عام معلوماتی تقاریر کا
اسکیم مرتب کرنے کے لئے ایک ذیلی کمیٹی بنائی گئی جس میں مولوی
سید علی اکبر صاحب، پروفیسر مجید صدیقی صاحب اور مولوی نصیر الدین
صاحب ہاشمی شامل رہیں گے۔ اس مسئلہ کی نسبت مولوی
سید علی اکبر صاحب نے تفصیل سے وضاحت فرمائی اور اس
امر کا وعدہ فرمایا کہ ان مفید اور ضروری تقریروں کا انتظام
وہ اپنی نگرانی میں نظام کالج کے ہال میں فرما دیں گے۔

روداد مجلس انتظامی۔

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس تاریخ ۲۴ خورداد ۱۳۵۲ف مطابق ۲۴ اپریل ۱۹۴۳ء شام کے پانچ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔ حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

عالیجناب آنریبل نواب لیاقت جنگ بہادر
" نواب حسین نواز جنگ بہادر
" مولوی عبد المجید صدیقی صاحب
ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور

عالیجناب آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر اور مولوی سید علی اکبر صاحب نے بذریعہ ٹیلیفون شرکت سے معذرت کی اطلاع دی۔

حسب ذیل امور شریک ایجنڈا تھے۔

۱۔ عملۂ ادارہ کے مشاہروں میں اضافے کے لئے محاسب صاحب ادارہ کی تجاویز۔
۲۔ کتبخانہ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کے خریدی کی نسبت ذیلی کمیٹی کی سفارش۔
۳۔ تعلیم بالغان کے سلسلے میں عام معلوماتی تقاریر کی اسکیم۔

(۱) عملۂ دفتر ادارہ کے مشاہروں میں اضافے کے لئے محاسب صاحب نے جو تختہ پیش کیا تھا۔ اس کو بعد ترمیم مناسب منظور کیا گیا۔

(۲) تعلیم بالغان کے سلسلے میں جن معلوماتی تقاریر کے انتظام کے لئے ایک سب کمیٹی مولوی سید علی اکبر صاحب۔ مولوی عبد المجید صدیقی صاحب اور مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی پر مشتمل بنائی گئی تھی اس نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۳ خورداد ۱۳۵۲ف میں جو اسکیم مرتب کی تھی اس کو پیش کیا گیا۔ طے پایا کہ اس کی نسبت آئندہ مجلس انتظامی میں غور کیا جائے۔

(۳) مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کے کتب خانے کی خریدی کے بارے میں سب کمیٹی نے ابھی کوئی قطعی رائے نہیں پیش کی ہے اس لئے کہ اس کتب خانے کا معائنہ نہیں ہو سکا ہے۔ طے پایا کہ آئندہ مجلس انتظامی تک مکمل رپورٹ تیار کی جائے۔

شاخ ہمناباد

بتاریخ ۱۹ خورداد ۱۳۵۲ف م ۲۰ اپریل ۱۹۴۳ء بصدارت مولوی سید اسمٰعیل صاحب بی اے ایل ایل بی تحصیلدار تعلقہ ہمناباد جلسۂ تقسیم اسناد امتحانات اردو بابتہ ۱۳۵۲ف منعقد کیا گیا اور صاحب صدر نے اسناد تقسیم فرمائے۔ اس کے بعد سید اسمٰعیل صاحب وکیل و صدر شاخ ادارہ نے یہ تحریک پیش کی کہ معتمد شاخ مولوی سید شیر زماں صاحب اپنے تجارتی کاروبار کی وجہ سے عدیم الفرصت رہتے ہیں اس لئے دفتری کاروبار کے لئے ان کی ضرورت ہے کہ عہدۂ معتمدی و صدارت میں اس طرح تبدیلی ہو تو مناسب ہے کہ صدر معتمد اور معتمد صدر ہو جائے اور اراکان میں بھی تبدیلی ہو تا کہ ادارہ کے کاروبار دفتری باضابطہ طور پر چل سکیں چنانچہ یہ تحریک بالاتفاق منظور ہوئی اور حسب ذیل عہدہ داروں اراکان کا انتخاب عمل میں آیا۔

(۱) مولوی سید شیر زماں صاحب سوداگر افغانی۔ صدر
(۲) سید اسمٰعیل صاحب وکیل۔ معتمد
(۳) پنڈت مرڈاڑپا صاحب " رکن
(۴) پنڈت بھیم راؤ صاحب " "
(۵) مولوی محمد صدیق صاحب " "
(۶) " محمد عبد الوحید صاحب "
(۷) " نبی الحسن صاحب صدر مدرس رکن
(۸) " محمد عبد الغفور صاحب سوداگر "
(۹) " سید عبد الرحمن صاحب "
(۱۰) " حاجی محمد حسین صاحب سوداگر "

شاخ پرلی

۱۱ خورداد ۱۳۵۲ف مطابق یکم مئی ۱۹۴۳ء کو ادارۂ ادبیات اردو کے امیدوار فراہم کرنے کے لئے مولوی شیخ حسین صاحب نائب معتمد مولوی ابو الظفر محی الدین صدیقی سابق معتمد شعبۂ طلبہ پرلی گاؤں روانہ ہوئے جہاں مولوی ہدایت علی صاحب پولس پٹیل نے امیدوار فراہم کرنے میں بڑی امداد فرمائی جس کے ہم بہت ممنون ہیں۔ بڑگا

ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات

نام کتاب	صفحات	روپے	آنے	پائی	نام کتاب	صفحات	روپے	آنے	پائی
[illegible] ...	۸۰	۰	۸	۰	[illegible]ی کا جاگیر	۴۸	۰	۸	۰
[illegible]گزشت غالب ...	۹۳	۰	۸	۰	[illegible]بیاتی کائنات ...	۹۸	۰	۸	۰
[illegible]م انفال ...	۴۶	۰	۴	۰	[illegible]تاج سخن	۱۲۴	۱	۱۲	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۲۳۰	۲	۸	۰	[illegible]ف سخن	۱۴۲	۰	۱۲	۰
[illegible] (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰	[illegible]دہ سخن	۱۴۷	۰	۱۲	۰
[illegible]ستان جانب	۱۲۰	۱	۱۲	۰	سراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲	۰
روپ جنگ سے پہلے	۲۱۸	۲	۸	۰	[illegible] سخن	۱۲۰	۰	۱۲	۰
[illegible] سیاحات	۴۷۲	۳	۸	۰	فیض سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
[illegible]سالار جنگ ...	۳۸	۰	۴	۰	مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
فرہنگ تصانیف اردو کے تراجم	۱۶۵	۱	۴	۰	دوم (۵۰)	۴۴۲	۵	۰	۰
[illegible] کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	۰	نقد سخن	۱۷۵	۱	[illegible]	۰
[illegible]تیال لغیر ...	۱۹۸	۱	۴	۰	نذر ولی	۲۳۸	۲	۸	۰
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰	۰	گریہ و تبسم ...	۱۹۲	۲	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	۰	مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰	[illegible]ن کی دنیا ...	۱۴۵	۱	۰	۰
داغ بہاری	۱۶	۰	۲	۰	مدراس میں اردو	۱۹۹	۱	۸	۰
اردو ناصر ...	۲۰۰	۲	۰	۰	[illegible] ناصر ...	۱۱۲	۱	۰	۰
سرگزشت حاتم ...	۱۲۸	۲	[illegible]	[illegible]	نذر دکن ...	۱۵۴	۱	۴	۰
[illegible]اد الملک ...	[illegible]۴۰	[illegible]	۹	[illegible]	[illegible] غالب	۲۴۰	۲	۸	۰
دودانی کی پہلی کتاب ...	۵۹	۰	۵	۰	عاصم ...	۲۹۹	۱	۴	۰
دوسری کتاب ...	۵۹	۰	۵	۰	دفتری معلومات ...	۵۹	۰	۶	۰
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	۰	آبدوز کشتیاں اور سرنگ ...	۴۸	۰	۹	۰
[illegible]غذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	۰	اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۴	۱	۱۲	۰
[illegible] ...	۹۴	۰	۸	۰	نمود زندگی ...	۲۱۹	۱	۸	۰
قدیم تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	۰	سوگذشت ادارہ ...	۳۰۴	۰	۱۲	۰
ہندوستانی تمدن ...	۳۳۰	۳	۸	۰	میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
اردو کی کہانی ...	۸۰	۰	۱۰	۰	بلقان	۳۲	۰	۳	۰
[illegible] ...	۱۰۰	۱	۰	۰	خطابیات ...	۱۱۴	۱	۱۲	۰
[illegible]نی کی کہانی ...	۴۸	۰	۶	۰	علم خانہ داری ...	۱۵۰	۱	۰	۰
[illegible]سایل طبیہ ...	۳۱۲	۲	۸	۰	چیونٹی (۱۶) تصاویر	۸۰	۰	۱۲	۰
[illegible] ...	۴۰	۰	۴	۰	انوار ...	۱۹۸	۱	۸	۰
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۶	۱	۸	۰	کشمکش ثانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
[illegible] اردو دان ...	۴۲۳	۱	۱۲	۰	گارساں دتاسی	۱۲۸	۱	۴	۰
[illegible] ...	۵۹	۰	۸	۰	[illegible]ات کا بھولا	۱۹۸	[illegible]	۸	[illegible]
حیدرآباد ...	۸۸	۰	۱۰	۰	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]اد اقبال ...	۱۷۶	۲	۸	۰	بلاغت	۵۹	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]بالی زبانیں ...	۱۰۴	۱	۰	۰	ادارہ سنہ ۱۹۴۲ء میں	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]نام علی خان ...	۳۲	۰	۴	۰	ناصر الدولہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۹	۵	۰	۰	افضل الدولہ	۳۲	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]ب اور عربستان ...	۵۶	۰	۱۰	۰	نواب میر محبوب علی خان	۳۴	[illegible]	[illegible]	[illegible]

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ [illegible]

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
[illegible] بیگم
[illegible] سکینہ ایم ایس سی

جلد ۸ — بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۵ء — شمارہ ۱۰

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے عہد آفریں برقی پریس میں چھپکر خیرت آباد سے شائع ہوا

مہدی افادی

مہدی حسن کا ذکر علماً ادبیات میں اب بھی کبھی کبھی آتا ہے۔ عوام شاید ان کے نام سے نا واقف ہوں لیکن اردو ادب [illegible] کہ ان کی شخصیت کو سمجھیں مگر ادب کے طالب علم کے لئے ان کی ذات اور ان کے مختصر [illegible] [illegible] بلکہ مہدی حسن بھلائے جانے کے لائق نہیں۔ ان کی ہستی ونیائے ادب کے [illegible] [illegible] [illegible] اس کی [illegible] اور ان کی ذہانت [illegible] کے ان تھے۔ شبلی کے بعد نقاد [illegible] [illegible] "کاش خود ان کے [illegible] مصنف کو ایسے دو [illegible] نصیب ہوتے" اگر اس قول میں خوش [illegible] کے لائق رائے پر غالب بھی ہو تو حقیقت سے یہ تعریف یکسر معرا نہیں۔

مہدی حسن کو مرے ہوئے صرف چوبیس سال ہوتے ہیں۔ کتنا کم عرصہ ہوا! لیکن ان کا نام کتنا کم سنائی دیتا ہے۔ جب تک مجھے ان کی تحریرات کے مطالعے کا موقع نہ ملا خود میں ان کو ساٹھ ستر سال پہلے کا ادیب سمجھتا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ مہدی حسن کی زندگی غیر معمولی واقعات و حادثات اور جاذب نظر و قائع سے خالی ہے۔ شاید اکثر حضرات کو یہ خشک اصلیت غیر دلچسپ معلوم ہو۔ مگر حقیقت یوں نہیں۔ ان کی ذات اور طبیعت کے بعض گوشے مطالعے کے لائق ہیں نہ صرف اس وجہ سے کہ وہ دلچسپ ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ ان کا گہرا اثر ان کی طرز تحریر پر پڑا۔ یہ بات کسی [illegible] نظر نہیں آتی!

صحیح تاریخ ولادت کا پتہ نہ چل سکا مگر اغلب ہے کہ ۱۸۶۸ء یا اس کی قریب کی تاریخ میں پیدا ہوئے۔ گورکھپور کے ایک شریف اور خوش حال خاندان کے فرد تھے۔ والد سے خودداری، دیانت داری اور شرافت نفسی جیسی عمدہ خصلتیں ورثہ میں ملیں۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ عربی و فارسی میں کامل استعداد بہم پہنچائی تھی مگر باقاعدہ انگریزی تعلیم سے محروم رہے۔ کچھ دن گھر پر انگریزی پڑھی اور کچھ دن علی گڑھ میں گزارے۔

بچپن سے اردو ادب کے شائق اور دلدادہ تھے۔ اچھی نظمیں یاد کرنے اور اعلیٰ ادبی کتابیں پڑھنے سے از حد مسرت محسوس کرتے۔ "تہذیب الاخلاق" بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے اور کہتے "مجھے اسی تہذیب الاخلاق نے آدمی بنا دیا"۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کا بھی خاصا شغف تھا جو کچھ لکھتے تھے وہ اعتبار سے لکھتے یہی وجہ ہے کہ ابتدائی ایک دو مضامین ہی سے ارباب ذوق میں چمک گئے۔ بیس اکیس سال کی عمر میں سلسلۂ ملازمت میں منسلک ہو گئے۔ مختلف عہدوں سے ترقی کرتے ہوئے آخر کار نائب تحصیل دار ہوئے۔ سرکاری ملازمت سے مہدی حسن چاہے معاشی اعتبار سے خوش حال کیوں نہ رہے ہوں لیکن ان کی ادبی زندگی اسی وجہ سے نامکمل رہی۔ سرکاری ملازمت کے قیود ایک طرف اور دور دراز مقامات کا سفر علمی مراکز سے دوری اور اطمینان و یکسوئی کا فقدان دوسری طرف ان کے ادبی نشو و نما میں ہمیشہ مانع رہے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تو کبھی کم نہ ہوا لیکن پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ کتب بینی روز کے معمول میں داخل تھی۔ کوئی نئی کتاب نہ ملے تو اپنی مختصر لائبریری سے کوئی پڑھی ہوئی کتاب ہی نکال کر ورق گردانی شروع کر دیتے۔

مہدی حسن کی سی باقاعدہ ضبط و نظم کی زندگی بہت کم لوگوں کو بسر کرتے دیکھا گیا ہے۔ ہر کام کا ان کے پاس ایک وقت مقرر تھا۔ سونا، اٹھنا، پڑھنا، دوستوں کو خط لکھنا ہر چیز اپنے وقت پر ہوتی اور ان کے پروگرام میں بہت کم بے ربطی کی صورت پیدا ہوتی۔ کتابیں پڑھنے اور مضامین لکھنے کے بعد خط لکھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ خط کا جواب نہ دینا ان کے نزدیک اخلاقی جرم تھا۔ دوستوں اور احباب کو خط باقاعدہ لکھتے اور جواب بھی

[illegible] ان کو [illegible] دنوں سے بہت دلچسپی تھی۔ [illegible] میں تمام تر [illegible]
[illegible] ادب وغیرہ [illegible] ہیں۔ مہدی حسن کی طبیعت کو ایک دلچسپ خصوصیت [illegible]
[illegible] کا شعر [illegible] ہے کہ کوئی تحریر میں ہو کہ اس کو [illegible] میں [illegible]
[illegible] ان کو بہت مرغوب تھا۔ بے ربط تحریر اور ضبط و نظم سے آزاد زندگی [illegible]
[illegible] کے وقت عمر چالیس سے زیادہ اور پچاس سے کم تھی۔ اس طرح یہ مرنے والا جوان مرگ کہلانے کا مستحق
نہیں۔ لیکن مہدی حسن کی ادبی زندگی بہت مختصر تھی۔ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ تمام تر فرصت کے چند لمحوں
میں لکھا۔ ان کی طبیعت کے جوہر کبھی ان کی مختصر تحریروں میں پوری طرح جلوہ گر نہ ہو سکے۔ گر ان کے لکھے
ہوئے اسلوب اور بے مثال طرزِ انشا کی جو جھلکیاں ان کے مختصر مضامین کے دامن میں محفوظ ہیں اہلِ نظر کی
آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔ دل انھیں دیکھ کر ایک لذت افسردہ پاتا ہے کہ اردو کا ایک نوخیز ادیب
اپنے دورِ نشو و نما ہی میں ہم سے رخصت ہو گیا۔ عمر بھر وہ کسی مستقل ادبی تصنیف یا سلسلۂ مضامین
تحریر کے خیال کو کثرتِ کار کی وجہ سے ٹالتے رہے۔ مرنے سے کچھ دن پہلے ان کا ارادہ پختہ ہو گیا تھا کہ سرکاری
ملازمت سے چھٹی پاتے ہی وہ اپنے آپ کو علم و ادب کے لئے وقف کر دیں گے۔ مگر انھیں کیا معلوم تھا
کہ اتنی جلدی اس عالمِ آب و گل سے انھیں کوچ کرنا ہے۔ ان کی فطری لیاقت اور طبعی ذہانت جو صرف اپنا
حصہ تھی اور اردو ادب کے لئے ایک نعمت ہے جہاں سے کم نہ تھی پھر کسی ادیب میں دیکھنے میں نہ آئی۔ ع

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

مہدی حسن کا تمام سرمایۂ عمر ایک مجموعۂ مضامین اور ان کے مکتوبات کا ایک مجموعہ ہے۔ جن کو ان کے
انتقال کے بعد ان کی غمزدہ بیوی نے بڑی محنت سے مرتب کیا۔ مضامین کا مجموعہ "افاداتِ مہدی" کے نام
سے غالباً سب سے پہلے ۱۹۲۳ء میں معارف پریس اعظم گڑھ سے چھپا تھا۔ اس کے بعد اسی مطبع سے دوسری
بار اور چھپا۔ اس مجموعے میں عبدالماجد کا دیباچہ اور ایک مختصر مضمون بھی شامل ہے جو مہدی حسن کی وفات
پر ہمدم لکھنؤ میں چھپا تھا۔ دیباچے کے بعد مہدی حسن کی زندگی کا ایک مختصر خاکہ "ان کی یاد" کے عنوان سے
مہدی بیگم نے لکھا ہے۔ ظاہر ہے اس مجموعے میں جتنے مضامین شامل ہیں انھیں مہدی حسن نے اس خیال سے
کبھی نہیں لکھا تھا کہ ان کو کتابی شکل میں جمع کرنا ہے۔ یہ مضامین مختلف ادبی تحریکات، ادبی بحثوں، نئی کتابوں
پر تبصروں، کچھ مختصر تراجم اور کچھ ادبِ لطیف کے ٹکڑوں پر مشتمل ہیں۔ مضامین کا باضابطہ سلسلہ ۱۸۹۹ء سے
شروع ہو کر ۱۹۱۹ء میں ختم ہوتا ہے۔ صرف ایک مختصر مضمون "علمِ لئے یونان پر ایک سرسری نظر" ۱۸۹۰ء کا
لکھا ہوا ہے۔ یہ مضامین ملک کے مختلف رسالوں اور اخباروں مثلاً "البشیر، مخزن، نقاد، معارف، مشرق
وغیرہ میں شائع ہوئے تھے۔ مضامین کی کل تعداد تیس ہے جن میں بعض بہت مختصر اور بعض طویل ہیں۔

انیسویں صدی کا عشرہ آخر اور بیسویں صدی کا ربع اول ہندوستانی تمدن اور ادب دونوں کے لئے ایک
عبوری دور تھا۔ انیسویں صدی کے آخر تک ہندوستان کی معاشرت اور ادب دونوں نے مغرب کا گہرا اثر قبول
کرنا شروع کیا تھا۔ سرسید احمد خاں کی تحریک بیداری مسلمانوں کی معاشی اور معاشرتی ترقی کے لئے ہی
[illegible] واقعہ ہے جیسا حالی کی قدیم طرزِ شعر کی مخالفت اور نئے طرز کی بنیاد اردو شاعری کے لئے ایک

یادگار تغیر ہے۔ اسی زمانے میں نثر پر زیادہ توجہ کی گئی۔ اردو میں تنقید کو پہلی بار متعارف کیا گیا۔ فرسودہ موضوعات کو اور مافوق الفطرت دیووں اور پریوں کے قصے کہانیوں سے اردو ادب نے بیزاری کا اظہار کیا۔ ٹھوس علمی و ادبی مضامین اور حقیقی ناول لکھے جانے لگے۔ نذیر احمد، شبلی، حالی، سرسید اور ان کے رفقائے کار کا اس دور کے ادب کی تعمیر میں بڑا حصہ رہا ہے۔ اردو ادب کا یہی تعمیری دور مہدی حسن کے مضامین کا زمانہ ہے۔ ان کو تاریخ، فلسفہ اور تنقید سے از حد دلچسپی تھی۔ ادب کے دلدادہ اور خصوصاً اردو ادب کے بڑے شائق تھے۔ ان کے مضامین اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ اردو ادب میں ٹھوس علمی مواد فراہم کرنے کے لئے اپنی جانب سے ہر ممکنہ کوشش کرنے تیار تھے۔ خود بھی فرصت کے اوقات میں لکھتے تھے اور دوسرے اچھے لکھنے والوں کو لکھنے پر اکساتے تھے۔

مہدی حسن کے مضامین کو بآسانی تین شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) ایسے مضامین جو دراصل اپنے وقت کے رسالوں یا کتابوں پر تبصرے ہیں یا جن میں کسی وقتی ادبی تحریک پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے (۲) علامہ شبلی کی علمیت، ان کی تصانیف سے متعلق مضامین (۳) خالص علمی اور ادبی مضامین

مہدی حسن اپنے وقت کی ادبی تحریکات اور تصانیف سے بہت باخبر رہتے تھے۔ ملک کے متعدد ادبی رسالے ان کے زیر نگاہ ہوتے اور ان کی ادبی بحثوں میں یہ بڑے شوق سے حصہ لیتے۔ "تمدن عرب" پر کسی نے سخت تنقید کی تھی اور اس کے مصنف پر چند الزامات عائد کئے تھے اس کے جواب میں ایک مضمون "تمدن عرب پر ایک علمی چٹھی" کے عنوان سے لکھا جس میں تفصیل سے کتاب کی خوبیاں گنائیں اور کتاب کے نفس مضمون اور ترجمے کے اسلوب دونوں پر وسعت نظر سے بے لاگ رائے دی۔ یہ مضمون تمدن عرب کا ایک مجمل تبصرہ کہلایا جاسکتا ہے۔ اسی قبیل کے دوسرے مضامین میں "ایک خط" "البیان" "ادارۂ ادبیہ" "نظام الملک طوسی" وغیرہ شامل ہیں۔

مولوی اسلم جے راجپوری نے "شعر العجم" پر چند اعتراضات کئے تھے اس کے جواب میں "شعر العجم پر ایک فلسفیانہ نظر" کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا جس میں نمبروار ہر اعتراض لکھ کر اس کا تشفی بخش جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ان مضامین میں مہدی حسن نے اردو زبان اور ادب کی مقبولیت اور وسعت کے لئے جگہ جگہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت اردو صحافت کی ترقی پر بار بار زور دیا ہے۔ "البیان" اور "معارف" کی حمایت میں مضامین لکھے اور اردو داں پبلک سے باصرار درخواست کی کہ یہ اور اس طرح کے علمی و ادبی رسالوں کی حمایت ان کے اہم فرائض میں داخل ہے۔

شبلی اور ان کی تصانیف سے مہدی حسن کو دلچسپی نہیں عشق تھا۔ منجملہ تیس مضامین کے کوئی دس کے قریب مضامین شبلی اور ان کی تصانیف پر لکھے گئے ہیں۔ علاوہ بریں دوسرے مضامین میں جہاں جہاں موقع آیا ان کے قلم نے شبلی کی مدح سرائی میں کبھی کوتاہی نہ کی۔ دراصل مہدی حسن کو تاریخ اور خصوصاً فلسفہ، تاریخ اور تاریخ اسلام سے از حد دلچسپی تھی۔ شبلی ہی وہ شخص تھے جنھوں نے اردو میں پہلی بار ان موضوعات پر تحقیق و تدقیق سے قلم اٹھایا اور بیش بہا کتابیں ...... پیش کیں۔ مہدی حسن کی شبلی پرستی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اردو میں خالص علمی لٹریچر دیکھنا چاہتے تھے۔ ملک کے پست مذاق طبقے سے تو کوئی امید نہ تھی البتہ جو اس کے اہل ہیں ان سے طالب تھے کہ وہ کچھ لکھیں۔ ہم عصر مصنفین میں سرسید، حالی اور شبلی ہی وہ حضرات تھے جو خلوص اور محنت سے اردو میں علمی مواد فراہم کر رہے تھے۔ شبلی کی "شعر العجم" اور "موازنۂ انیس و دبیر" جیسی تنقیدی کتابیں اردو کے لئے بالکل نئی تھیں

[illegible] کی ان کے بڑے شائق تھے۔ ان وجوہ کے علاوہ شبلی کو چاہنے کی ایک اور وجہ ان کے ذاتی خوشگوار تعلقات [illegible]۔ دونوں ایک دوسرے سے بہ کمال مروت پیش آتے اور ہمیشہ خلوص و محبت کا اظہار کرتے۔

"[illegible] عرب اور یورپ و لیم شبلی" "علامہ شبلی کا ماہوار علمی رسالہ" "آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ" "شعر العجم پر ایک طائرانہ نظر" "شمس العلما علامہ شبلی نعمانی" وغیرہ ان کے چند دلچسپ مضامین ہیں جن میں انھوں نے شبلی کی تحریر اور ان کی زندگی پر بہ حیثیت عالم، مورخ، محقق، سوانح نگار اور نقاد روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ مہدی حسن کی شبلی سے والہانہ دلچسپی اور محبت کی وجہ سے شبلی اور ان کی تصانیف سے متعلق بے لاگ تنقید کی امید رکھنا درست نہیں۔ گر پھر بھی جو کچھ انھوں نے لکھا ہے دلچسپ اور دلکش لکھا ہے کہیں کہیں دلائل و براہین سے تبصرے کا رنگ بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

شبلی کی جو بھی کتاب چھپ جاتی یہ اس پر مضمون لکھتے۔ جہاں کسی نے شبلی پر اعتراض کیا یہ اس کا منہ توڑ جواب دینے تیار ہو جاتے۔ گو مہدی حسن نے اکثر جگہ "شبلی پرستی" کی دھن میں تقریظ و تنقید کے جادۂ اعتدال سے انحراف کیا لیکن اپنے ایک مضمون "حالی اور شبلی کی معاصرانہ چشمک" میں تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے انتہائی سلامت روی کا ثبوت دیا۔ یہی نہیں بلکہ قابل تعریف بات یہ ہے کہ انتہائی فیاضی سے شبلی کی بعض فروگزاشتوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "یہ غور طلب ہے کہ غالب کی طرح شبلی کی افراط خودداری بھی معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہیں ہے۔ شبلی نے "الکلام" لکھی لیکن سرسید کا نام تک نہ آیا حالانکہ سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے دور جدید میں مذہب کو معقولات عصریہ سے تطبیق دینے کی کوشش کی۔"

مہدی حسن کے مضامین کا اہم ترین حصہ ان کے علمی و ادبی مضامین ہیں۔ ان مضامین میں زیادہ تر ادبی موضوع یا معاشرتی اور تاریخی مباحث پر قلم اٹھایا ہے۔ "حکمائے یونان پر ایک سرسری نظر" مختصر مگر دلچسپ ہے۔ "بیسویں صدی کا آغاز اور دماغی صحت مغیر فانیوں سے" اور "ترکوں کی معاشرت" معلومات آفریں مضامین ہیں۔ مہدی حسن شبلی کی مکمل تقلید کرنا چاہتے تھے۔ گو خود کو کبھی تحقیقی مضامین لکھنے کا موقع نہ ملا لیکن رجحان ادھر ہی تھا۔ فلسفہ تاریخ اور تاریخ اسلام کے متعلق جو کچھ بھی جانتے تھے اکثر اس کا اظہار اپنی تحریروں میں کرتے رہتے تھے۔ جرمن مستشرق وان کریمر کی "تاریخ اسلام" کا اردو میں ترجمہ شروع کیا تھا جس کے کچھ اجزا "مخزن" میں "افادات وان کریمر" کے نام سے شائع کئے تھے لیکن عدیم الفرصتی کی بنا پر اس کی تکمیل سے بھی قاصر رہے۔

مرحوم کو ادب اور تنقید سے غایت دلچسپی تھی۔ اردو میں تنقید عالیہ پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن انھیں اس کا بھی احساس تھا کہ اردو میں اعلیٰ پایہ کی تصانیف کی بہت کمی ہے۔ "ارتقائے ادب اردو" "اردو لٹریچر کا نفس واپسیں" "مشرق اور انشا پردازی کا دور جدید" ان کے اعلیٰ ادبی مذاق اور شستہ خیالات کے گواہ ہیں۔ ادب پر ان کی نگاہ بڑی ادبی تھی۔ ملک میں تیسرے لٹریچر کے شائع ہونے کے بہت شاکی تھے۔ ایک مضمون میں رقم طراز ہیں "ہمارے ہاں دو چار معزز مستثنیات کے سوا عموماً اہل قلم صحیح قوت فیصلہ نہیں رکھتے یعنی اپنی استعداد کا صحیح مصرف نہیں جانتے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی پیداوار دماغی بلحاظ اوصاف و مقدار عموماً دوم درجہ کی ہوتی ہے ـــــ یہ مستقل مصنفین کی حالت ہے صحافت یعنی مضمون نگاری اس سے بھی گزری ہے۔ غیر ذمہ دار لٹریچر کی ایک مقدار کثیر ہے جو جرائد عصریہ کے ہاتھوں ملک میں تقسیم ہوتی رہتی ہے۔

[illegible]

کے اعتبار سے کوئی وجہ جواز نظر نہ آئے۔ بعض مضمون تشنہ ملیں گے بعض خیالات پرانے ہونے کی وجہ سے غیر دلچسپ معلوم ہوں گے۔ بعض ادبی بحثیں بے وقت کی راگنی معلوم ہوں گی اور بعض تاریخی اور تنقیدی مضامین وقت گزر جانے اور علم و ادب میں ترقی ہونے کی وجہ سے پھیکے نظر آئیں گے۔ لیکن جو چیز ان سب کی تلافی کرنے والی ہے وہ ہے مہدی حسن کا اسلوب بیان۔ انشا ان کے اسلوب کو ابھی اور پختہ ہونا چاہئے تھا۔ بعض مقامات پر نامانوس الفاظ اور ترکیبیں مل جاتی ہیں کہیں جملوں کی بناوٹ عجیب سی معلوم ہونے لگتی ہے۔ لیکن طرز ادا کی انفرادیت کہیں بھی کم ہونے نہیں پاتی۔ مہدی حسن بلاشبہ ایک انفرادی طرز کے انشا پرداز تھے۔ ان کی طبیعت کا رکھ رکھاؤ اور نفاست پسندی ان کی تحریر میں جذب ہو گئی تھی۔ الفاظ بڑے سلیقے سے استعمال کرتے محاورے بڑے قرینے سے جڑتے چلے جاتے۔ عبارت کی خاص خصوصیت اس کا اتار چڑھاؤ ہے۔ کہیں لہجہ وقت کے لحاظ سے سنجیدہ کبھی گرم و تیز اور کبھی نرم ہو جاتا تھا۔ اسلم جے راج پوری اور احسن مارہروی پر تنقید کرتے وقت جو لہجہ ہے اس کی تندی "بخت عم" میں باقی نہیں رہتی۔ ان کی تنقیدوں میں اکثر طنز کا چبھتا ہوا پہلو مضمر ہوتا۔ یہ طنزیہ انداز ان کی خاص خصوصیت ہے۔ اسلم کے متعلق لکھتے ہوئے کہتے ہیں:۔ "میرا خیال ہے کہ ملک میں ایسے نفوسِ قدسی صدیوں میں پیدا ہوں گے جو منصفانہ تنقید اور تنقیص بے جا یعنی عیب گیری کی حد فاصل کا احساس کر سکیں اس لئے بے محل جنبش لب سے خاموشی اچھی۔ یہ خیر سے گونگے ہوں تو اعتراض کی بات نہیں۔ لیکن بولئے اور آدمی کی طرح نہ بولئے تو مجھے شکایت ہوگی۔ اس خلوص اور سچ کا کیا ٹھکانہ ہے کہ شعر العجم کے جزئی عیوب بھی ریویو نگار کے خیال میں اتنے ہیں کہ اگر وہ ابھار کر دکھائے جائیں تو ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے!" طنز کا یہی پہلو مولوی عبدالحق کے متعلق لکھتے ہیں تو اور زیادہ ابھر جاتا ہے" "مذاق صحیح ہو تو یہ کام یورپ کے سہارے کرنے کے ہیں۔ مجھے اتنا موقع نہیں۔ دوسروں کو "کلام غالب" پر دیباچہ لکھنے لکھانے سے فرصت نہیں ایک صاحب "نقاد" سے متقاضی ہیں کہ دیباچہ لکھواؤ۔ یہ دیباچہ کیا بلا ہے؟ آج تک میری سمجھ میں نہ آیا۔ اگر مقدمہ سے غرض ہے تو سیدھے عبدالحق کے پاس حیدر آباد جائیے۔ تنقید و تبصرہ منظور ہے تو مجھے مجبوراً کہنا پڑتا ہے اس کا دور ختم ہو چکا"۔

شبلی ان کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "نذیر احمد اور آزاد کی روحوں نے ایک قالب اختیار کر لیا ہے"۔ یہ رائے بالکل درست لیکن نذیر احمد اور آزاد کا رنگ ایک جگہ جما نہیں۔ مہدی حسن علمی و تاریخی مضامین لکھتے تو نذیر احمد کا اسلوب آزاد کے طرز پر حاوی ہوتا نظر آتا۔ ان کے ادب لطیف کے ٹکڑوں میں آزاد کا رنگ بالکل کھلا ہوا ملتا ہے۔ الفاظ کی در و بست اور محاوروں کا شوق بالکل وہی عبارت کی ترکیب، رنگینی، روانی، البیلا پن اور شگفتگی بالکل آزاد کی سی تھی۔ مگر تکلفات کا وہ عالم نہ تھا۔ طرز بیان ہمیشہ ہلکا پھلکا رہتا۔

ایک جگہ عبارت کی روانی اور بے ساختگی دیکھئے "یہ حالت جس قدر مایوس کن ہے اس سے زیادہ لائق افسوس ہے۔ کہ ایک مشہور انشا پرداز کا خیال سن رکھئے کہ جس طرح ہر شعلۂ محبت مصیبت کا گھر ہے، مشغلۂ سخن سب سے بڑھ کر ہے۔ حسن کلام کے پیچھے نہ دیکھئے۔ سارے اہل قلم بری طرح جئے اور عمر بھر روٹیوں ہی کے محتاج رہے"۔

زور بیان کی کتنی اچھی مثال ہے:۔ "بڑے بڑے سنجیدہ حضرات اپنے نامۂ اعمال کی طرح اخباروں کے کالم سیاہ کرتے رہے جس سے کچھ دنوں کے لئے اخباری افق کی فضائے بسیط ایک دم سے تیرہ و تار ہو گئی۔ کیا یہ کوئی علمی واقعہ تھا؟

[illegible]

[illegible]

جامعہ نگر (دہلی)

انگریزی زبان میں ڈرامے کی ابتدا

انگریزی زبان میں ڈرامے کی ابتداء یوں بھی دلچسپ اس وجہ سے ہو جاتی ہے کہ دیگر زبانوں میں اور انگریزی زبان میں ڈرامے کی ابتداء حسن اتفاق کہئے یا کسی اور وجہ سے مذہبی روایات کی رہین منت ہے۔ اس لئے ربط مضمون کی خاطر بطور تمہید ان دیگر زبانوں میں ڈرامے کی ابتداء کے حالات کا مختصراً ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا جس سے تکمیل مضمون کے ساتھ موضوع بحث کے دیگر پہلو پر بھی روشنی پڑ سکے۔

ہندوستان میں ڈرامے کی ابتداء تقریباً اس وقت سے ہوتی ہے جب سے کہ شاعری کا رواج ہوا ہے۔ سنسکرت میں لفظ (ناٹک) ناٹ سے نکلا ہے جس کے معنی ناچ کے ہیں اور لفظ (روپک) بھی جس کے معنی بھیس بدلنے کے ہیں سنسکرت کے ناٹک کے معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ جہاں تک ادبی تحقیق کا تعلق ہے یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان میں (ناٹک) کی بنیاد مذہب کے ساتھ پڑی ہے۔ اس سے متعلق ایک مشہور روایت ہے کہ بہت سے دیوتاؤں نے ہم خیال ہو کر دیوتائے علم برہما کے پاس ایک عرضداشت گزرانی جس میں یہ خواہش ظاہر کی گئی کہ ان کی دل بہلائی کے لئے کوئی موزوں سامان مہیا کیا جائے۔ برہما نے ان کی درخواست منظور کی اور ان کے لئے ناٹ وید ایجاد کی جس میں مکالمہ رگ وید سے حاصل کیا۔ نقالی یجر وید سے اگانا سام وید سے اور ناچنا اتھروید سے۔ وشوا کرما کو فوراً حکم ملا کہ وہ ایک رنگ شالہ یا اسٹیج تیار کرے۔ یہ رنگ شالہ اندر بھون میں تعمیر کیا گیا اور تیوہار اندر دھوج کے موقع پر رنگ شالہ میں پہلا ناٹک جو کھیلا گیا وہ "امرت منتھن" تھا اس ضمن میں ایک اور روایت بھی ہے کہ سب سے پہلا رنگ شالہ جس نے بنوایا وہ راجا بھیشم ہے۔ جس نے اداکاری گندھرپ اور اپسراؤں کے سپرد کی۔ الغرض اس قسم کی قدیم روایتوں سے یہ تو ضرور پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں ڈرامے کا رواج بہت قدیم سے ہے اور ابتداً یہ چیز پوجا پاٹ کے موقع پر ناٹک کے نام سے پیش ہوتی تھی جس میں دیویوں، دیوتاؤں، رشیوں اور منیوں کی زندگی کے حالات پیش کئے جاتے تھے۔ اور بعد کو راجا، مہاراجا خود اس قسم کے ناٹکوں میں بحیثیت ہیرو کے حصہ لینے لگے تھے۔

مصر کی مشہور کتاب "(Book of Dead)" یعنی غالباً سوائے مذہبی ڈرامے کے کچھ اور نہیں ہو سکتی جس میں (Dead) اہم اداکار اور دیگر اداکار دیوتا ہیں۔ گو یہودیوں کے پاس ڈرامے کو کوئی فنی حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔ تاہم ان کی عبادات کے طریقوں کی چھان بین سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ڈرامائی عناصر ان کی عبادات میں کسی نہ کسی صورت میں شامل تھے۔

یونانیوں کے پاس اداکاری کا رجحان دیگر اقوام کے مقابلہ میں زیادہ پایا جاتا تھا اور یونانیوں کے حسن کارانہ ذوق کا ذکر ہی کیا ہے جب کہ جدید ڈرامے کے المیہ (Tragedy) حصہ کی بنیاد قدیم (Greek Tragedy) پر رکھی گئی ہے۔ ان کے ہاں بھی عبادات کے طریق اور ڈرامائی مظاہروں میں بہت قریب کا تعلق ہے۔ یونانیوں کے مشہور دیوتا (Dionysus) کی پرستش کے موقع پر ساری رسومات کی ادائیگی میں یہ بات ملحوظ رکھی جاتی تھی کہ رسوم ڈرامائی شکل میں پیش کئے جائیں۔ ان کا یہ دیوتا (معابد) چونکہ (Athens) میں واقع تھا اس لئے زائرین کا ایک ہجوم رہا کرتا تھا۔ ایسے موقع پر یونانی

ڈراموں کو منظوم پیرایہ میں پیش کیا جاتا تھا ۔ ان ڈراموں میں قومی ویر اور بہادروں کے مشہور کارنامے اور ان کی زندگی کے حالات اس انداز میں پیش کئے جاتے تھے تاکہ ناظرین کے قلوب میں مہاتی جذبات پیدا ہو جائیں۔ لیکن بعد کو ان ڈراموں میں سیاسی اور قومی مسائل بھی شریک کئے جانے لگے ۔ تاہم اس بات کا خیال ضرور رکھا جاتا تھا کہ ڈراما نویس ڈرامے کی تیاری میں اور اداکار اداکاری کے موقع پر عبادتی تقدس کو رخصت نہ ہونے دیے۔
یونانی ڈرامے کا ذیلی مقصد اصلاح اخلاق، ذوق تعلیم اور سیاسی شعور کا پیدا کرنا بھی ہوا کرتا تھا۔ یا یوں کہئے کہ یونانی ڈراما مذہبی تعلیمات اور تلقین کا دوسرا نام تھا۔ بدیں وجہ یونانی ڈرامے کی ابتدا کو مقابلتہً شروع ہی سے اعلیٰ حیثیت حاصل ہے۔ ہندوستانی اور یونانی ڈرامے کے متعلق جو کچھ پیش کیا گیا ہے عام حیثیت سے اس کا اطلاق راست اور بے کم وکاست جدید فن ڈراما پر ہوتا ہے، اس طرح انگریزی ڈرامے پر بھی
جب عیسائیت کا آفتاب یورپ پر طلوع ہوا اور گیلیلو (Galileo) کے اصول تعلیمات نے لوگوں کے ذہنوں میں کمل انقلاب بپا کر دیا اور فاتح روم کمزور اور نحیف (Judee) کے قدموں پر سرنگوں تھا تو نئے خدا کی پرستش کرنے والوں نے پہلے پہل ڈرامائی اور رومانی میلانات کو نفرت سے دیکھنا شروع کیا۔ بہ الفاظ دیگر رومانی اسٹیج میں بجائے المیہ اور ڈرامائی رجحانات کے (Athletic) مناظرے اور مجادلے (Gladiatorriot) کے میلانات زیادہ کارفرما ہونے لگے ۔ رومانی ڈراما باوجود یونانی ڈرامے کی پیداوار ہونے کے اپنے اندر وہ اخلاق اور تقدس نہیں رکھتا تھا اور یونانی ڈراما جو انتہائی مذہبی اور مقدس فرائض کی بنیادوں پر قائم تھا رومیوں کے ہاتھوں میں صرف کھیل اور تماشا بن کر رہ گیا۔
رومی چونکہ یونانیوں کی طرح اعلیٰ مذاق اور حسن کارانہ جذبات سے لگاؤ نہ رکھتے تھے اس نے وہ ڈرامائی فن کو بالکل پست اور مبتذل انداز میں پیش کر کے تفریح طبع کا سامان مہیا کر لینا کافی سمجھتے تھے ۔ دور اول کے نصرانی جو آنے والی دنیا کے لئے ایک سرچشمۂ مسرت وشادمانی محفوظ کرنا چاہتے تھے رومی (Amphe- Theatre) کے بھیانک اور دل ہلا دینے والے مناظر دیکھ نہ سکے جن میں انسان خونخوار جانوروں کی بھینٹ چڑھا دئے جاتے تھے اور وہ چونکہ ایک سادہ اور تصنع سے معرا زندگی کے متلاشی تھے اس قسم کے حالات کے خلاف ایک زبردست تنفر اور رد عمل اپنے اندر محسوس کرنے لگے اور بالآخر شاہ (Constantine) کے دور میں ان کے سدباب کے لئے امتناعی احکام جاری کئے گئے۔
بہرحال مسیحیت نے بہت جلد یہ محسوس کر لیا کہ عوام کے قلب ودماغ پر رومی کھیل تماشوں کا کس قدر گہرا اثر مترتب ہے اور اس کے خلاف مسیحیت کو کس قدر اہم اور مشکل جنگ کرنی ہے علاوہ ازیں عیسائیت نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ عبادات کے غیر دلچسپ طریق اور خشک پند ونصائح عوام پر بہ مشکل اثر انداز ہو سکتے ہیں جب کہ عوام کی آنکھیں رومی تفریحات اور تفرج گاہوں کے دلپذیر مناظر سے لطف اندوز رہ چکی ہوں ۔ ایسی صورت میں اور ان حالات کے تحت مسیحیت کے لئے ناگزیر تھا کہ وہ اپنی تلقین وتعلیم کو ایسے جاذب پیرائے اور دلپذیر اسلوب میں عوام کے سامنے پیش کرے کہ وہ قدیم عقیدہ سے متنفر نہ سہی کم از کم بیزار ہو کر جدید عقیدے کو اپنے دل میں جگہ دیں۔
مسیحیت کو اپنے ابتدائی نقوش گہرے طور پر مرتسم کرنے کے لئے عبادات کے طریق میں ڈرامائی عنصر کو

شریک کرنا پڑا ۔ اس طرح سب سے پہلے (Communim) کو عوام کے سامنے پیش کیا گیا ۔ جس میں مسیح کی موت اور مصائب کے حالات کو نہایت ہی دلچسپ اور درد انگیز انداز میں بتلایا گیا تھا ۔ غیر مسیحی دنیا میں یونانی ڈراما کی مرکزیت انسانی خدا (Dionysus) پر ختم ہوتی تھی اور دورِ مسیحیت میں ڈراما کی مرکزیت خدائی انسان (christ) پر موقوف تھی گو (Dr. Hase) اپنی کتاب (Miracle plays) میں یہ لکھا ہے کہ "دورِ مسیحیت کے تمدن میں عوام کے لئے وہ کشش و جاذبیت نہ تھی جو غیر مسیحی زمانے میں یونانی تمدن نے پیش کی تھی ۔ چنانچہ سولھویں صدی عیسوی میں عیسائیت کے رہبر مسیح کو اگرچہ یونانی خداؤں اور دیوتاؤں پر تفوق حاصل تھا لیکن مسیحی تمدن کو وہ کشش اور اثر نصیب نہ ہوا جو یونانی تمدن کی میراث تھی ۔ چوتھی صدی عیسوی میں متذکرہ حالات کے تحت "The passion of Christ" المیہ پیش کیا گیا ۔ ہم یہ یقین سے نہیں کہتے کہ ڈراما نویس کا مقصد آیا کوئی ادبی معیار کا ارتقا مقصود تھا یا مسیح کی آمد کا پیام دینا تھا ۔ بہرصورت اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس المیہ کا بیشتر حصہ (Euripides) سے ماخوذ ہے ۔ ازاں بعد سولھویں صدی عیسوی میں ڈرامے کی طربیہ نگاری کی ابتدا یوں ہوئی ہے کہ (Hraswitha) نامی ایک مسیحی جوگن نے (Gander) (Their Terence) کی اتباع میں چھ طربیہ ڈرامے پیش کئے جو صرف مسیحی معبد کی چار دیواری تک محدود اور جو خاص طور سے مسیحی جوگن کی دل بہلائی کے لئے تصنیف کئے گئے تھے اور آج کے جدید ترقی یافتہ فن ڈراما کی ابتدا ان متذکرہ قدیم المیہ و طربیہ ڈراموں سے ماخوذ ہے ۔
علاوہ عباداتی طریق میں ڈرامائی عنصر کو شریک کرنے کے ایک اور کوشش جو کی گئی وہ یہ تھی کہ مذہبی تقاریب مثلاً (Easter - good Friday) ڈرامائی شکل میں منائے جانے لگے اور بتدریج ان ڈراموں میں علاوہ مقدس انجیل کے مسیحیت کے تاریخی اجزا کا بھی کافی حصہ شریک کیا گیا ۔ جب اس ڈرامائی ادب نے مسیحیت کو پوری طرح اپنے اندر سمانے کی صلاحیت پیدا کرلی اور جب عوام کو دلچسپی ہونے لگی تو لاطینی زبان کو مقامی زبان سے بدلا گیا اور لاطینی زبان نے جب پوری طرح چولا بدلا تو ڈراما مذہبی بندھن سے آزاد ہوکر منصۂ شہود پر آیا اور اس طرح وہ بالآخر ہر دل عزیز ہوگیا ۔

اب ہم اس سرسری خاکہ کے بعد اس تحقیق کی طرف رجوع ہوں گے جو ہمیں انگریزی زبان کے ڈرامے کے منبع اور سرچشمہ کی طرف رہبری کرتی ہے ۔ دوسرے ممالک میں اور خاص طور سے فرانس میں جدید ڈرامے کا سرچشمہ مذہبیات، ادبیات اور موسیقی وغیرہ ہیں مگر انگلستان میں اس کی ابتدا دوسرے ذرائع سے ہوئی یعنی ابتدائی حالات میں اس میں مذہبی رجحان و میلان پایا جاتا تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ اس کا سرچشمہ صرف مذہب ہی ہے کیونکہ اگر مذہب ایک طرف زبردست عنصر تھا جس نے قرون وسطیٰ کے مزاج کو موزوں کیا تو دوسری طرف رزمیہ میلان بھی اس کے قومی کردار کا طرۂ امتیاز تھا ۔ اس طرح دورِ وسطیٰ کے فرنگیوں میں ہمیں مذہبی پیشوا بھی ملتا ہے اور میدان کارزار کا علم بردار بھی ۔ اس طرح ابتدائی انگریزی ڈرامے کے محرک دونوں ہوا کرتے تھے ۔ اول الذکر کو اگر تلقین مقصود تھی تو آخر الذکر کو تفریح ۔ اس طرح انگریزی ڈرامے کی پیدائش اور پرورش کی ذمہ دار یہ دو جماعتیں تھیں جن میں سے ہر ایک کو اپنا مقصد ملحوظ تھا ۔

محمد عبدالجبار فاروقی

رادھا

رمیش تپہ خانہ میں ملازم تھا۔ اس کو اپنی بیوی سندرا سے بے حد محبت تھی۔ سندرا کا دل بھی محبت سے معمور تھا۔ رادھا باپ کی نورِ نظر اور ماں کی لختِ جگر تھی۔ وہی ان کے اندھیرے گھر کا چراغ تھی۔ رمیش کی مالی حالت خراب نہ تھی۔ اس کا دل بھی بہت غنی تھا۔ وہ اکثر رادھا کے لئے بازار سے قسم قسم کے کھلونے لایا کرتا اور رادھا اپنا بیشتر وقت گڑیا، گڈے کی شادی رچانے میں گزارتی تھی۔

زمانہ ایک حالت پر نہیں رہتا، رادھا کا بچپن بھی دیکھتے دیکھتے گزر گیا۔ اب وہ شباب کے پُرفضا باغ میں قدم رکھ چکی تھی ایک پھول تھا جو ویرانے میں کھلا تھا۔ اس کی معصومیت اور بچپن کے مجسمہ سے شباب کا رنگ جھلکنا شروع ہوگیا۔ اس کے والدین اس کی معصوم اور حسین صورت دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے تھے۔ انھیں اب رادھا کی شادی کی فکر ہوئی۔ وہ رادھا کو ایک بڑے گھرانے کی بہو بنانا چاہتے تھے، جہاں دولت اور چین کا مُن برستا ہو لیکن وہ نسوانی جذبات سے بالکل ناآشنا تھے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ عورت کی مسرت دولت سے نہیں خریدی جاسکتی۔ انہیں تو صرف اپنے فریضہ سے سبکدوش ہونے کی لو لگی تھی۔

بیسیوں رشتے توڑنے کے بعد جو رشتہ انہیں پسند آیا، وہ سندر کا تھا۔ محض اس لئے کہ وہ پچاس ہزار کی جائداد کا وارث تھا۔ اس کے والدین کا انتقال ہوگیا تھا۔ وہ اکیلا رہا کرتا تھا۔ شرافت اور سچائی کا مجسمہ تھا۔ قدرت ہمیشہ سچائی اور شرافت کے خلاف بغاوت کرتی ہے، غرض اس کے پاس دنیوی عیش کے سب سامان تھے۔ لیکن ایک چیز نہ تھی اور وہ تھی صحت۔ وہ دائم المریض تھا جس کے متعلق ڈاکٹروں کا فیصلہ تھا کہ وہ تھوڑے دنوں کے بعد زندہ نہ رہے گا۔ گر خاندانی لال بجھکڑوں نے ڈاکٹروں کی رائے کو ہذیان سمجھا اور الٹا فتویٰ دے دیا کہ شادی تو ایسی اکسیر دوا ہے جس سے تمام مرض دور ہو جاتے ہیں۔ غرض رادھا کی شادی دھوم دھام کے ساتھ سندر سے ہوگئی اور والدین نے پچاس ہزار روپیوں پر اس کو فروخت کردیا۔

رادھا کو اپنے شوہر کے مکان کا باوا آدم ہی نرالا نظر آیا۔ وہ میکے میں اپنا سارا وقت اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہنسی خوشی میں گزارتی تھی لیکن یہاں صرف دو ہی ہستیاں موجود تھیں۔ ایک تو خود اس کی اپنی ذات اور دوسری اس کا مریض شوہر سندر۔ دولت اس کے قدم چومتی تھی لیکن رادھا کو دولت سے مطلق رغبت نہ تھی۔ وہ اپنے والدین کی تنگ خیالی پر دل ہی دل میں افسوس کرتی تھی۔ وہ سماج کو ایک بے پناہ سمندر سمجھ رہی تھی جس کی خوفناک موجوں میں ہر عورت کی انفرادی شخصیت اور ہر انقلابی ذہنیت کے لئے موت کا سامان ہے۔ وہ ایک دل برداشتہ خادمہ کی طرح شوہر کی خدمت کرتی تھی، والدین کی غلطی کا واحد علاج صبر سمجھتی تھی اور کبھی اس کے پائے استقلال میں جنبش نہ ہوئی۔ وہ صرف ایک چیز کی خواہاں تھی اور وہ تھی شوہر کی تندرستی۔

رادھا کے ہاتھوں کی مہندی بھی میلی نہ ہونے پائی تھی کہ اس کے پتی کی کشتیٔ حیات بیماریوں کے گرداب میں پھنس کر تھپیڑے کھانے لگی "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"۔ تمام معالج اس بات پر متفق تھے کہ وہ بچ نہیں سکتا۔ تندرستوں کو مریض کی سانس بھی مہلک ثابت ہوتی مگر رادھا جو بلبل کی طرح اس پھول کے سامنے رکھ کر آہ و فغاں کیا کرتی تھی، وہ اس نزاعی سانس کو اپنی زندگی سمجھ رہی تھی اور یہ سمجھے ہوئے تھی کہ محبت کو فنا نہیں۔

سندر نے کروٹ لی اور اپنی بے رونق آنکھیں کھولیں۔ رادھا سامنے کھڑی تھی۔ اس کا سانس پھولا

ہوا تھا پیشانی پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ سندر کی حالت نے آخری وقت کا پیام سنا رہی تھی۔ کچھ دیر تک سندر حیرت کی نگاہ سے رادھا کو دیکھتا رہا اور پھر کہنے لگا میرے دھونے سے کچھ نہیں ہوتا رادھا۔ انسان پانی کا ایک بلبلا ہے۔ اس کو ٹوٹتے دیر نہیں لگتی۔ اس حباب کو خواہ ہوا کا تیز جھونکا توڑ دے یا وہ خود پانی میں مل جائے ایک ہی بات ہے۔ موت کی دوا دنیا میں نہیں ہے گو میں موت سے نہیں گھبراتا۔" یہ باتیں رادھا نے اپنے پتی کی زبانی سنیں اور زخمی ہرن کی طرح تڑپ کر کہنے لگی "کوئی بیماری ایسی نہیں جس کا علاج دنیا میں موجود نہ ہو۔ جو طاقت آدمی کو بیمار ڈالتی ہے وہ تندرست کرنا بھی جانتی ہے۔ ناگ والے کے پاس ناگ کے کاٹے کا تریاق بھی تو ہوتا ہے"۔ سندر کی قوت گویائی فرط غم اور حسرت و یاس کی وجہ سے سلب سی ہوگئی۔ نیم بے ہوشی کی حالت اس پر طاری ہوگئی۔ رادھا جو اس کے پلنگ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی دعا کرنے لگی "خداوند! میرے شوہر کو تندرست کر دے اس کی بجائے مجھے موت دے۔ وہ میرا جیون ہے وہ میرا عیش ہے جب وہ زندہ نہ ہوگا تو میں زندہ رہ کر کیا کروں گی"

سندر نے کروٹ لی اور تھوڑا سا پانی رادھا کے ہاتھ سے پیا۔

آسمانی دیوتاؤں نے رادھا کے درد بھرے نالوں کو سن لیا اور سندر کو موت کے طوفان سے نکال کر زندگی کی خوش گوار وادی میں ڈال دیا۔ سندر اچھا ہو گیا اور اطمینان کی زندگی کے سانس لینے لگا لیکن رادھا کے جسم کی نزاکت اس موذی مرض کے مقابلے کے قابل نہ تھی وہ اس سے متاثر ہوگئی۔ اس کے چہرہ کی سرخی زردی سے بدل گئی۔ اس کا بھرا ہوا جسم، ابھرا ہوا سینہ، ہڈیوں میں تبدیل ہونے لگا اور رفتہ رفتہ اس موذی مرض نے اس کے جسم کی روح کھینچ لی۔ اس کی دعا قبول ہو چکی تھی۔ اس کا شوہر تندرست ہو گیا تھا اس کی پچاس ہزار کی جائداد اس بدنصیب رادھا کو موت کے پنجے سے نہیں بچا سکی۔ آخر کار اس مرض مہلک کی بدولت رادھا دنیا سے رخصت ہوگئی اور دنیا کو بتلا گئی کہ والدین کی ذرا سی غلطی اولاد کے لئے موت کا پیام ہے۔؎

جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

محمد عزیز الرحمٰن (عثمانیہ)

محبت کی چھاؤں :- مرزا ظفر الحسن صاحب بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ ہر فسانہ میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کار فرما ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔ اس کا حسین و جمیل سرورق دیکھتے ہی اس کتاب کے بے باک اسلوب اور اس کے افسانوں کی بے پناہ شوخی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد ۱۲

الله

[illegible]

[illegible]

([illegible])

[illegible] (١٧٦١) [illegible]

[illegible]

[illegible] (١٧٨١) [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

وجہی کی سب رس

دکن ہندوستان کا دل ہے۔ علم و ادب کی سرپرستی جیسی کچھ یہاں ہو رہی ہے اس سے کوئی ناواقف نہیں۔ خصوصاً اُردو کو اس بے ہنگم دَور میں پناہ دینے والے دکھنی ہی ہیں۔ وہ دن حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے جب یہ کہا جاتا تھا کہ دلّی اور دلّی کے بعد لکھنؤ ہی اُردو کا مرکز ہے۔ اب دلّی اور لکھنؤ والوں سے زیادہ اس مرجھائے ہوئے پودے کو دل کے لہو سے سینچنے والے دکھنی ہی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ زبان شمال والوں کی تھی دکھنیوں کو ملی اور انھوں نے سرآنکھوں سے لگایا اور یوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اہلِ زبان کے احسان مند بن گئے۔ بلکہ اُردو کو اس قدر زیادہ محبوب رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ نام نہاد "اہلِ زبان" کے منھ کھولنے سے بہت پہلے دکھنی یہ زبان بولتے پالتے تھے۔ اس میں شاعری کرتے اور کتابیں لکھتے تھے اور اس کو ایک ادبی زبان بنا چکے تھے۔ چنانچہ ولی قطب شاہ اور ملّا وجہی اسی خاکِ دکن سے اٹھے۔

کچھ دنوں پہلے تک فیضی کو نثر نگاری میں پہلا استاد سمجھا جاتا تھا اور یہ "استادی" محض ناواقفیت کی بنا پر تھی۔ ہم اکثر یونہی اپنی انجانی نادانی سے کسی کو کچھ اور کسی کو کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ اب تحقیقات نے علم کا میدان وسیع کر دیا ہے اور نئے نئے واقعات و حالات روشنی میں آتے جا رہے ہیں۔ اسی وجہ سے اکثر ہمیں اپنے پہلے فیصلہ کو باطل قرار دے کر ایک نئی رائے قائم کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ وجہی، فیضی سے پہلے بہت دنوں پہلے ہوا ہے۔

دکھنی زبان یعنی اردو کی ابتدائی صورت میں ہمیں سب سے پہلے شعر و سخن کا پتہ چلتا ہے۔ اس سے پہلے ادبی اور درباری زبان فارسی ہوا کرتی تھی۔ شمالی ہند کے لوگ فارسی ہی میں تمام کاروبار کیا کرتے تھے۔ وہ اردو کو اس قابل نہ سمجھتے تھے کہ اس میں کچھ لکھیں پڑھیں۔ یوں ایک زمانہ تک انھوں نے اسے منھ نہ لگایا۔ لیکن دکھنیوں نے سب سے پہلے اس بات کی کوشش کی کہ یہ ادبی زبان بن جائے۔ ولی اور قطب شاہ جیسے شاعروں نے جو اُردو کے سب سے قدیم شاعر ہیں اُردو یا دکھنی میں شاعری کی اور اس زبان کو اس قابل سمجھا کہ اس میں داستانِ دل سنائی جا سکتی ہے۔ ولی کا کلام شمالی ہند میں بھی پہنچا اور جب لوگ اس سے واقف ہوئے تب ہی انھیں معلوم ہوا کہ جس زبان کو وہ عام زبان اور ادبی وسعتوں کے لئے ناکافی سمجھتے تھے وہ ولی جیسے استاد کے لئے ذریعۂ اظہارِ جذبات بھی بن سکتی ہے۔

جس طرح اس زبان کو شعر و شاعری کے لئے سب سے پہلے دکھن والوں نے استعمال کیا، اسی طرح اس کو نثر نگاری سے مالا مال کرنے کا سہرا بھی دکھنیوں ہی کے سر ہے۔ اس کے ثبوت میں سب سے پہلی جو قابلِ ذکر او معیاری کتاب ہمیں ملتی ہے وہ ملّا وجہی کی تصنیف کردہ کتاب "سب رس" ہے۔

"سب رس" سے پہلے نثر میں ایک دو رسائل اور بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ایسے نہیں کہ ادب میں انھیں کوئی خاص اہمیت دی جا سکے۔ وہ خالص ادبی حیثیت والے نہیں نہ ادب کی خصوصیات رکھتے ہیں۔ ان میں کچھ تو مذہبی تبلیغ کے لئے لکھے گئے تھے کسی مسئلہ وغیرہ پر بحث تھی اور بعض فلسفیانہ موضوع پر تھے۔ اس قسم کے رسائل کو جو بہت مختصر ہوتے ہیں ایک مستقل کتاب کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔

ملّا وجہی کی اس کتاب کو پڑھنے اور اس کی زبان پر تبصرہ کرنے سے پہلے ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ یہ دکھنی نثر کا استاد فارسی زبان کا کافی بڑا شاعر تھا۔ اس کا ایک ضخیم کلیات ہمیں ملتا ہے۔ اس کا ایک اردو دیوان بھی تھا لیکن ہنوز اس کا پتہ نہ چل سکا۔ وجہی جب فارسی میں شاعری کرتا ہے تو یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ

[illegible]

وہ اپنے موضوع میں اپج کے ساتھ ساتھ وسعت بھی پیدا کرتا ہے اور زندگی کی نہ بدلنے والی حقیقتوں
اور مسائل حیات پر وہ ہر ایک طبقہ کے زاویۂ نگاہ سے روشنی ڈالتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
اس نے زندگی کو بہت زیادہ قریب سے دیکھا تھا۔ خود کو ایک انسان سمجھ کر اس نے انسانوں کو پرکھا
تھا۔ یہی وجہ ہے وہ ہر طبقہ کی بہترین ترجمانی کرتا ہے اور اپنے دور کا بہت موزوں نمائندہ ثابت ہوتا ہے۔
اس کا ادب عوام اور عام لوگوں کا ادب ہے۔ یہ کتاب اس زمانہ کی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویر ہے۔ اس
دور کی سیاست، درباری زندگی اور عام طبقے کے خیالات، امراء کے حالات سبھی اس مرقع میں نظر آتے ہیں۔
وہ کسی خیالی دنیا کا خواب دیکھنے والا مصور نہیں بلکہ ایک حقیقی اور واقعی دنیا کا چابکدست عکاس ہے۔
اس کی کتابوں میں "سب رس" سب سے آخری تصنیف ہے۔ یہ اس کی لمبی عمر کے آخری دور میں
لکھی گئی۔ اس وقت تک وہ دنیا کے نشیب و فراز سے آگاہ ہو گیا تھا۔ وہ تلخ و شیریں تجربات کا مزہ چکھ چکا
تھا۔ جوانی کی نادانیاں بہت پیچھے رہ گئی تھیں اور بڑھاپے کے غور و فکر سے آشنا ہو گیا تھا۔ زندگی ڈھل چکی تھی۔
لیکن خیالات پختہ ہو گئے تھے۔ یہی فن کے شباب کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس نے تمام منازلِ حیات کبھی ہنسی خوشی
سے اور کبھی رو دھو کر طے کئے تھے۔ وہ بہت دور چلا آیا تھا۔ پھر اس نے مڑ کر عمر رفتہ کو دیکھا اور اسے وہ ساری باتیں
ایک ایک کرکے یاد آگئیں جو اس لمبے لمبے راستے پر اسے پیش آئی تھیں۔ اسی یاد کو، انہی تجربات کو اس نے
ملفوظ کر دیا۔ جہاں دیدہ ہونے کی وجہ سے وہ جانتا تھا کہ کونسی بات کیسے کہی جا سکتی ہے۔ اس نے چار بادشاہو
کا زمانہ دیکھا تھا۔ یعنی ابراہیم قطب شاہ کے عہدِ حکومت میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کا ذوق تھا۔
اس کو ماحول بھی سازگار ملا۔ گولکنڈہ اس وقت علم و ادب کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وجہی کا خاص طرز بہت جلد
مشہور ہو گیا اور اس کی اکثر شعراء سے چشمک تھی۔ محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے درباری رنگ
کو بھی اس کی آنکھیں دیکھتی رہیں۔ اس کے سامنے گولکنڈہ کی سیاسی بساط کئی مرتبہ جمی۔ گولکنڈہ کی
ساری زندگی اس کے قلم سے "سب رس" میں ٹپک گئی ہے۔ یہ اس کے سارے تجربات کا نچوڑ ہے۔ نام بھی
"سب رس" اس نے خوب ہی رکھا۔ زندگی کا ہر رخ اس میں روشن ہے۔
"قطب مشتری" میں اس نے بھاگ متی کا عشق، محمد قلی قطب شاہ کے ساتھ نہایت تفصیلی رنگ میں
لکھا ہے۔ اس دور کی جزئی تفصیلات بیان کی ہیں۔ علم و ادب، تہذیب و تمدن، خیالات و رجحانات،
رسم و رواج بھی وجہی کے یہاں ملتے ہیں۔ خارجی و داخلی دونوں پہلو جھلکتے ہیں۔
وجہی محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا۔ محمد قطب شاہ کے دور میں یکایک
رنگ بدلا گویئے اور شاعروں کی کوئی قدر نہ رہی۔ ایرانی امراء نظر سے گر گئے ملک کے علماء و فضلاء کو دربار میں
باریابی ہوئی۔ شعر و سخن کی بجائے ادب و فلسفہ کی سرپرستی ہونے لگی۔ غواصی جو وجہی سے کم عمر تھا منظر میں ابھرا
اور وجہی پس منظر میں چلا گیا...... بہت دنوں بعد ایک اور دفعہ وجہی کے دن پھرے۔ عبداللہ قطب شاہ عنفوانِ شباب
میں جب بادشاہ ہوا تو پھر اس کے نانا قلی قطب شاہ کا زمانہ لوٹ آیا۔ وجہی پھر چمک اٹھا۔ مذہب امامیہ جاگ اٹھا۔
کیونکہ عبداللہ کی تربیت میں اس کی ماں حیات بخشی بیگم کا بڑا حصہ تھا۔ غرض وجہی کا یہ آخری زمانہ تھا۔ بادشاہ
مہربان ہوا اور ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی۔ وجہی نے "سب رس" لکھی۔ اپنے قلم کی ساری قوتیں اس میں بھر دیں
کیونکہ یہ اس کی حاصلِ زندگی تھی۔ اس کا اپنا ایک خاص اسلوب ہے۔ اب [illegible] نثر نگار دل کے لئے یہ مشعلِ راہ کا
کام کرتی ہے۔ ۱۰۴۵ھ میں یہ کتاب لکھی گئی۔ اس کے بعد تاریخ ادب میں وجہی کا نام نظر نہیں آتا۔ گویا اس کا
شاہکار ہی آخری ادبی کارنامہ تھا۔

زینت ساجدہ

شاعر امرء القیس

عرب کی شاعری زمانۂ جاہلیت میں اوج کمال پر تھی۔ عرب شاعر قومی تمدن و معاشرت کا معمار ہوتا تھا اور قومی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ شعراء کی آزادی طبع انہیں ہر اس شخص کی ہجو کرنے پر آمادہ کر دیتی تھی جو ان کے خلاف مشاغل کرتا جس سے وہ شخص تمام قبیلے میں ہدف ملامت بن جاتا تھا اور ہر ایک اسے نہایت ذلیل و خوار تصور کرنے لگتا تھا اور کوئی شاعر اگر کسی کی تعریف کر دیتا تو اس شخص کی بے حد تعظیم و تکریم کی جاتی تھی۔

زمانۂ جاہلیت میں عرب شعراء میں باہم معرکہ آرائیاں اکثر وہاں کے بازاروں یا میلوں میں ہوا کرتی تھیں اور جس شاعر کا کلام مایۂ ناز تصور کیا جاتا اس کے کلام کو خانۂ کعبہ میں معلق کر دیا جاتا تھا تاکہ دوسرا مدعی اس سے بہتر کلام پیش کر سکے۔ یوں تو اس زمانے میں متعدد مشہور شعراء گزرے ہیں لیکن امرء القیس کو اپنے تمام ہمعصر شعراء پر نمایاں فضیلت حاصل تھی چنانچہ بعض ارباب ذوق و فن نے اس کو جسد شاعری میں بہ منزلہ سر کے قرار دیا ہے۔

امرء القیس اسلام سے چالیس سال قبل گزرا ہے۔ اس کا باپ قبیلہ کندی سے تھا۔ امرء القیس ایک نہایت آزاد منش اور حسن پرست انسان تھا یہی وجہ ہے کہ اس کی آزادی فطرت اور حسن پرستی ہر وقت اسے ایک پری وش کی جستجو پر ابھارتی رہتی تھی اس لیئے وہ ملک الضلیل کے لقب سے مشہور رہے اور اس کی بے شمار محبوبائیں جن میں ام حویرث اور عنیزہ قابل ذکر ہیں۔ عنیزہ اس کی چچا زاد بہن بھی تھی جس کے فراق میں اس نے اپنا بے نظیر قصیدہ اہل ذوق کے سامنے پیش کیا اور خوب داد تحسین حاصل کیا۔

عرب کا او جڈ بدو صحیفۂ فطرت پڑھ کر شاعر بنا۔ ضروری تھا کہ اس کا کلام سرتاپا فطری اور اثر میں ڈوبا ہوا ہو۔ چنانچہ وہ اپنے مخصوص انداز سے قصیدہ اس طرح شروع کرتا ہے وہ ایک رہ نورد ہے راستے میں وہ اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں کبھی وہ اپنی معشوقہ کے دیدار سے پہلی بار مشرف ہوا تھا اور اب وہاں ٹوٹے پھوٹے کھنڈر اس زمانۂ گزشتہ کی یاد دہرا رہے ہیں عہد رفتہ کی یاد شاعر کو بے قرار کر دیتی ہے اور وہ چند لمحے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے وہاں ٹھہر جاتا ہے اور اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے ؎

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل   بسقط اللوی بین الدخول فحومل

فتوضح والمقراط لم یعف رسمہا   لما نسجتہا من جنوب وشمال

(ترجمۂ اشعار) ٹھیر جاؤ اے دوستو! اور مجھے اپنے حبیب اور اس کے مکان کی یاد تازہ کر لینے دو جو توضح، مقراط، دخول اور حومل کے درمیان تھا اور اب تک باد شمالی و جنوبی کی آمد و رفت نے اس کے دلکش نشانات کو ناپید ہونے نہیں دیا۔

یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ شاعری اگرچہ کہ ایک غیر مادی شئے ہے لیکن مادیت کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور ہر قوم کا ادب اس کے تمدن و معاشرت، اخلاق و آداب اور خیالات کا آئینہ دار ہوتا ہے چنانچہ زمانۂ جاہلیت کی ایک غیر متمدن اور سادہ لوح قوم کے شاعر امرء القیس کے کلام میں بھی سادہ خیالات اور عام فہم تشبیہات و استعارات کا پایا جانا لازمی ہے۔ وہ جس مضمون کو چاہتا بغیر کسی ہیر پھیر اور تکلف کے اشاروں، کنایوں میں بیان کر دیتا تھا ؎

الا رب یوم کان منہن صالح   ولا سیما یوم بدارۃ جلجل

(ترجمہ) دارۃ جلجل پر وہ اتنا مبارک دن تھا کہ کوئی دن اس کے برابر نہیں ہے۔ دارۃ جلجل ایک تالاب کا نام ہے اور اس شعر میں ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب کہ قبیلے کی چند عورتیں وہاں نہانے گئی تھیں۔ شاعر کی شوخ نظریں

اس قسم کے نظاروں کی منتظر ہی رہا کرتی تھیں اس کی حسن پرست فطرت نے اسے اس وقت وہاں پہنچا دیا۔ اس کی شوخ طبیعت رنگ لائی، اس نے چپکے سے سب عورتوں کے کپڑے چھپا دیئے۔ ان عورتوں میں اس کی معشوقہ عنیزہ بھی تھی جب سب عورتیں نہا کر کپڑے تلاش کرنے لگیں تو امرءالقیس ان کو اور خصوصاً عنیزہ کو کپڑوں کی گٹھڑی دکھا دکھا کر تماشہ انداز سے ہنسنے لگا۔ اس واقعہ سے ہمیں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اگرچہ امرءالقیس ایک اخلاقی جرم کا مرتکب ہوا تھا لیکن اس نے اس کی پردہ پوشی کی بجائے بلا تامل تشہیر کر دی اور اپنی خوبیوں کے ساتھ کمزوریوں کو نظر انداز ہونے نہ دیا یقیناً یہ انسانیت کا ایک اعلیٰ کردار اور زندگی کا ایک اہم پہلو ہے جس کے بغیر سازِ زندگی بے سرا اور بے کیف رہ جاتا ہے۔

صحرائے عرب کی پرسکوت وسعت۔ لوؤں کی لپٹ۔ بادِ صرصر کے طوفان، تپتی ہوئی ریت کی موجیں تاروں بھری روپہلی راتوں میں قافلہ والوں کے پُرزور قہقہے اور جوش آور نغمے اور ریگستان میں جرس کی گونجتی ہوئی صدائیں، جا بجا کھجوروں کے جھنڈ خوبصورت اونٹ، گائیں اور دوسرے صحرائی جانور اگر خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں تو کیا شاعر نے ان کی تصویر کو الفاظ کا ایسا جامہ پہنایا ہے کہ تصور انھیں ہو بہو سامنے لا کھڑا کر دیتا ہے ؎

فادبرن کالجزع المفصل بینہ بجید معمّ فی العشیرۃ مخول

اور یہ بات ہمیں شاعر کی زبانی ہی معلوم ہوئی کہ عرب کی گائے کا منہ اور سر سیاہ اور باقی جسم سفید ہوتا ہے۔ شاعر نے گوڑوں سے ان کی مشابہت بتا کر گائے کے حسن میں چار چاند لگا دیئے اور ان کے منتشر جتھے کو اس مالا سے تشبیہ دے کر جس کے موتی سنہری تار میں الگ الگ پروئے ہوئے ہوں منظر کو اور زیادہ دلکش کر دیا ہے۔

امرءالقیس کو یہ کمال حاصل تھا کہ جب وہ کسی واقعہ کو بیان کرتا یا کسی چیز کا خاکہ کھینچتا تھا تو اس کی جزئیات تک کو نہ بھولتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے کہ وہ نہایت صبا رفتار اور حملہ آور ہے اور اسے اتنی قدرت تھی کہ وہ سامنے دوڑتا دوڑتا اچانک مڑ کر پیچھے اس طرح دوڑنے لگتا ہے جیسے کسی پتھر کو سیلاب بلندی سے نیچے تیزی سے پھینک دے ؎

مکر مفر مقبل مدبر معاً کجلمود صخر حطہ السیل من عل

متعدد تشبیہات کو ایک ہی شعر میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کرنا کوئی آسان کام نہیں لیکن ایک جاہل بدو شاعر امرءالقیس کے کلام پر نظر ڈالئے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ کس خوبی سے اس کام کو انجام دیتا ہے ؎

لہ ایطلا ظبی وساقا نعامۃ وارخاء سرحان وتقریب تتفل

گھوڑے کی دونوں رانیں ہرن کی رانوں کی طرح، پنڈلیاں شتر مرغ کی پنڈلیوں کی مانند بتا کر اس کی صبا رفتاری کو بھیڑیے کی تیز روی اور خرامی رفتار کو لومڑی کے بچے کے پھدکنے سے تشبیہ دی ہے۔

شاعر کی جدت پسند طبیعت ہر چیز کو ایک نئے روپ میں پیش کرنے کے لئے بے قرار رہتی تھی۔ وہ اپنے ہمعصروں سے محبوبہ کی نازک انگلیوں کو معمولی مسواک سے تشبیہ دیتے ہوئے بارہا سن چکا تھا اس کی جدت پسندی رنگ لائی اور اس نے محبوبہ کی نرم و نازک سے انگلیوں کو وادی ظبی کے سفید اور لمبے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے موسم بہار کا ایسا دلکش منظر پیش کرتا ہے کہ انسان اس سے مسحور ہو کر بجائے ایک لق و دق صحرا کے اپنے آپ کو وادیٔ غبیط کی سرسبز و شاداب سرزمین میں محسوس کرنے لگتا ہے جہاں ابر بہار نے رنگ برنگ کے پھول کھلائے ہیں ؎

والقی بصحراء الغبیط بعاعہ ! نزول الیمانی ذی العیاب المحمل

مختصر یہ کہ امراء القیس کے کلام سے ہمیں ملک عرب کے حالات بہم پہنچتے ہیں کیونکہ اس نے بدوؤں کی نفسیاتی کیفیات جنگجو عربوں کے حالات ان کی فیاضی و مہمان نوازی اور بہادری ان کے خیالات اور صحرائی جانوروں، اونٹوں اور گھوڑوں کے حالات سب اس طرح ترتیب دیئے ہیں کہ پڑھنے والا پاس کی چیزوں اور ماحول سے بالکل بے خبر ہو کر عرب کی اس ریتیلی سرزمین کی سیر کرنے لگتا ہے۔

قدسیہ

گاؤں کی شام

اپنی کرنوں کو سمیٹا مہر عالم تاب نے
اپنی منزل پر تھکے ہارے مسافر آگئے
موجزن دریا کی آنکھوں میں خمار آنے لگا
دور لہراتے ہوئے پرچم کی لہریں تھم گئیں
چل دیئے گھر کی طرف سب دھوپ کے مارے کسان
بیچ سے کھیتوں کے یوں مبہم جھلکتی ہے سڑک
دور افتادہ مکانوں سے دھواں اٹھنے لگا
حسن کی کچھ دیویاں پنگھٹ سے گھر جانے لگیں
گنگناتیں، جھومتیں، مڑتی ہوئیں، گاتی ہوئیں
لہلہاتے پھول پودے سب اچانک تھم گئے
گاؤں کی شورش سکوں کی وادیوں میں کھو گئی

فرشِ رنگیں خود بخود میدان سے اٹھنے لگے
راستوں کے چلنے والے چلتے چلتے تھم گئے
آبشاروں کی روانی پر سکوں چھانے لگا
جھاڑیوں کے سائے میں آوارہ نہریں تھم گئیں
ہند کی قسمت کے مالک یعنی بے چارے کسان
کفر کے بادل ہیں جیسے نورِ ایماں کی چمک
طائروں نے قصد اپنے آشیانوں کا کیا
ہر طرف تنہائی پا کر موج میں گانے لگیں
مستیوں کی رو میں گاگر اپنی چھلکاتی ہوئیں
شام کے اورنگ پر زریں ستارے جم گئے
سبزۂ بیگانہ کے مانند دنیا سو گئی

اے دلِ محزوں ہر اک شے چپ ہے اس دریا کے پاس
تو بھی سو جا گود میں لے کر ہجومِ درد و یاس

اشعر ملیح آبادی

اردو زبان کا تشکیلی دور

اردو زبان کی ارتقا کی تاریخ میں، شاید ہی کوئی دور، اتنا اہم اور ہیجان‌انگیز ہو جتنا کہ اس کا تشکیلی دور ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں، نہایت ہیجان کا زمانہ تھا، جس میں سیاسی تمدنی کے علاوہ، لسانی افراتفری بھی اپنے منتہا کو پہنچ گئی تھی۔ ہندوستانی ماہرین لسانیات کے اقوال کے مطابق، اس زمانے میں، ہندوستان کی ہند آریائی زبانیں ایک عبوری دور سے گزر رہی تھیں، جو ان کا "آپ بھرنشہ" دور، یعنی متوسط ہند آریائی دور کی پراکرتوں کے موجودہ بھاشاؤں کی طرف مائل ہونے کا دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں ہند آریائی زبانوں کا اتنا کافی ادب ہم کو نہیں ملتا، کہ ہم ان کے تدریجی ارتقا کا عمدگی سے مطالعہ کر سکیں۔ اردو کے تعلق سے تو یہ مسئلہ اور بھی مشکل ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی تشکیل میں کسی ایک بولی کو دخل نہیں ہے، بلکہ اس زمانے کی ان تمام ہندوستانی بولیوں جیسے قدیم پنجابی پراکرت، برج بھاشا، باگڑو، راجستانی اور ہند ایرانی زبان، فارسی کا بھی حصہ ہے۔ ہند آریائی بولیوں میں، اختلافات کے ساتھ ساتھ، مشابہتیں بھی اتنی ہیں کہ متعلم لسانیات کے لئے ہر قدم پر غلطی کا امکان ہے، اور جو رائے وہ قائم کرے گا، اس کی رو سے ایسے نظریے بن جانے کا احتمال ہے، جن کے نتائج دور رس ثابت ہو سکتے ہیں۔

اردو زبان کی ابتدا کے مسئلہ پر پچھلے چند سال سے اردو کے بعض سنجیدہ محققین، سرگرم تحقیق ہیں اور اس کا تھوڑا بہت ادب بھی پیدا ہو چکا ہے، جو رسالوں کے چند مضامین اور ایک دو کتابوں پر بھی مشتمل ہے۔ جس میں "دکن میں اردو" "اردوئے قدیم" "پنجاب میں اردو" اور "اردو شہ پارے" کے علاوہ "نقوش سلیمانی" اور "رسالہ اردو" کے وہ مضامین بھی شامل ہیں، جو اس موضوع پر، وقتاً فوقتاً شایع ہوئے ہیں۔ ان میں قدیم مخطوطات کی چھان بین کر کے اردو کے قدیم ترین ادب کو اکٹھا کرنے کی بیش بہا کوشش کی گئی ہے۔

اس سارے مواد کی، ہم کو یقیناً ضرورت ہے اور اب اس کے سامنے آجانے کے بعد، مواد کے مستند ہونے کی چھان بین اور مخطوطات کے متن کا لسانی مطالعہ کرنے کی بھی ضرورت ہے، جس کے بعد ہی ہم یہ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اردو نے اپنی تشکیل میں کن کن بولیوں سے مدد لی اور کس جز کی حد تک، اور اس پر اپنا کیا اثر ڈالا۔ یہ کام ظاہر ہے کہ کئی ماہرین لسانیات کا ہے اور یہ فن ہندوستان کے لئے ابھی نیا ہے۔ چنانچہ دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی اس کے عالم کم ہیں۔ ایسی تحقیق کے لئے، متعلقہ موجودہ زبانوں کے علاوہ، متوسط ہند آریائی زبانوں یعنی پراکرتوں اور قدیم ہند آریائی یعنی سنسکرت پر عبور حاصل کئے بغیر قدم اٹھانا دشوار ہے۔

حالیہ زمانے میں صرف تین کتابیں ایسی شایع ہوئی ہیں، جن میں اس مسئلہ تک صحیح فنی راستے سے پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتابیں "ہندوستانی لسانیات" "ہندوستانی صوتیات" اور "پنجاب میں اردو" ہیں۔ اول الذکر دو کتابیں ٹھیٹ فنی ہیں اور آخر الذکر کتاب، گو تاریخی اور بیانی ہے، پھر بھی کسی حد تک فنی بحثوں پر بھی مشتمل ہے۔ ابھی ابھی ایک کتاب جامعہ کلکتہ کے مشہور پروفیسر لسانیات ڈاکٹر سنوتی کمار چٹرجی کی "ہند آریائی زبانیں اور ہندی" کے نام سے شایع ہوئی ہے، جس کا تعلق زیادہ تر ہندی زبان کے مسائل سے ہے، تاہم اردو کے بعض پہلوؤں پر بھی، اس سے روشنی پڑ سکتی ہے، کیونکہ بنیادی طور پر ہندی کی قواعد، اردو سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ لیکن

مصنف کو، فارسی اور عربی سے، اتنی نفرت ہے کہ وہ ان دونوں زبانوں کی بنیادی شکل کے لئے عام پسند اصطلاح "ہندوستانی" سے بھی ناراض ہیں، کیونکہ انھیں اس میں فارسی کی بو آتی ہے، اس لئے وہ سنسکرت شکل کا "ہندوستھانی" کو رائج کرنا چاہتے ہیں۔ فنی تحقیق میں، جب جذبات بھی شامل ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ ہم صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتے۔ اردو کا تصور، کم از کم، فارسی اجزا کے بغیر ناممکن ہے۔ فارسی جو ہند ایرانی کی بیٹی ہے، ہندوستان کی موجودہ ہند آریائی زبانوں کی سگی خالہ زاد بہن ہی تو ہوتی ہے۔

موجودہ ہند آریائی زبانیں جیسے پنجابی، سندھی، گجراتی، مرہٹی، اودھی، بنگالی اور اردو، ان پراکرتوں کی بیٹیاں ہیں، جو آج سے تقریباً بارہ سو سال پہلے آریائی ہندوستان یعنی دراوڑی حصوں کو چھوڑ کر سارے ملک میں رائج تھیں۔ پراکرتیں خود، قدیم ہند آریائی سے مشتق سمجھی جاتی ہیں، جس کی سب سے اہم یادگار، سنسکرت ہے۔ پراکرتوں کا دور ۶۰۰ ق م سے ۱۰۰۰ء تک معین کیا جاتا ہے۔ اسی زمانے سے پراکرتوں کے اجزا بکھرنے لگے، اور صوتی اور صرف نحوی تبدیلیاں ہوتے ہوتے، خاص خاص علاقوں میں ان کی خاص خاص صورتیں بننے لگیں۔ زبانیں، زندہ جسد کی طرح ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن ان کی تبدیلی، ان کی تعمیر کی طرح سیکڑوں سال میں جا کر محسوس ہوتی ہے۔ زبانوں کی تبدیلی کے عام اصول، کفایتِ توانائی، سہولت اور آسانی ادا ہوتے ہیں۔

اردو زبان کا نقطۂ آغاز، مسلمانوں کا ہندوستان میں آنا، اور یہاں کی زبانوں سے اُن کا تعلق ہے۔ مسلمانوں کا سب سے پہلا قافلہ یہاں آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں پہنچا، گو ان کے اور خاص طور پر عربوں کے تعلقات، ہندوستان سے بہت قدیم ہیں۔ منظم طور پر ساتویں صدی عیسوی کے [illegible] ہندوستان کی طرف رخ کرنا شروع کیا۔ ان کے اسباب سے متعلق کچھ کہنا بحث کو طول دینا ہے، لیکن [illegible] پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اسباب، ان اسباب سے کچھ زیادہ اچھے نہیں تو برے بھی نہیں تھے، جنھوں نے کئی سو سال بہت پہلے آریوں کو ہندوستان آنے پر مجبور کیا تھا۔

آریوں ہی کی طرح، یہ بھی مختلف اوقات اور مختلف گروہوں میں یہاں آئے۔ سب سے پہلا قافلہ ۶۳۶ء میں ملتان تک آ کر رک گیا تھا، اس کے تین چوتھائی صدی بعد، محمد بن قاسم کی ممتاز قیادت میں عراق اور ایران کے سرفروشوں کی ایک خاصی تعداد، سندھ میں آ کر مقیم ہو گئی اور ایک اسلامی نو آبادی یہاں بن گئی۔ اسلامی تہذیب اور شائستگی، عقائد اور اثر کا سب سے پہلا گہوارہ یہی تھا اور یہیں سے، ہندوستانی زبانیں بولنے والوں کا میل ملاپ، عربی اور فارسی بولنے والوں کے ساتھ شروع ہوا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسی کے عربی نام پر، سارے ملک کا نام "ہند" اور یہاں کی زبانوں کے لئے "ہندی" کا نام مخصوص ہو گیا، جو آج ملک کی عظمت کا نشان بن گیا ہے۔

اس وقت، ہندوستان کی، ہند آریائی زبانیں اپنے ارتقا کے دوسرے دور، یعنی پراکرتوں کی حالت میں تھیں، جس کا نقشہ یہ تھا کہ پنجاب، سندھ اور گجرات میں، جو زبانیں رائج تھیں، وہ ایک پراکرت سے تعلق رکھتی تھیں، جس کو بعض وقت بیرونی دائرے کی بولی سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ مہاراشٹر علاقے میں اس پراکرت کا نام "مہاراشٹری" تھا، اس کی خصوصیت یہ تھی کہ، قدیم ہند آریائی کے حروفِ صحیح کے ساتھ اس کا سلوک کسی قدر بے دردانہ تھا، چنانچہ سنسکرت کے الفاظ، "پریا" "راجا" "کوکیلا" کی شکل، اس میں "پیا" "رایا" (جس سے بعد کا رائے مشتق ہے)

اور "کو [illegible] ہے۔ مشرقی پنجاب اور صوبہ متحدہ [illegible] تھا، جو سب سے اہم پراکرت [illegible] اور دھ میں اردو، ماگدھی اور [illegible] میں ماگدھی رائج تھی۔ راجستان کے [illegible] پراکرت مروج تھی، جسے کچھ آدیتی [illegible] وغیرہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ماہرین لسانیات کا کہنا ہے کہ، اس وقت یہ پراکرتیں، اور خاص طور پر شورسینی، پراکرت کے پنجہ سے [illegible] "آپ بھرنشہ" یعنی مسخ ہو رہی تھی۔ اس سے جو زبانیں بنیں وہ برج بھاکا، بانگڑو، بندیلی، قنوجی اور ہندستانی کہلاتی ہیں۔ راجستان کی پراکرت سے موجودہ مالوی، میواتی، مارواڑی اور گجراتی بولیاں پیدا ہوئیں۔

ان تمام بولیوں کی تشکیل کا آغاز ۱۰۰۰ء کے قریب ہوتا ہے اور یہ زمانہ محمود غزنوی کی فتح پنجاب سے کم و بیش مطابقت رکھتا ہے۔ اس وقت تک مسلمانوں کو ہندوستان میں بسے ہوئے تین صدی کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اردو کے اولین آثار، جو ہم کو دستیاب ہوئے ہیں، وہ اس کے دو سو سال بعد کے ہیں۔ گویا اس زبان کو تشکیل پاتے پاتے پانچ سو سال کا عرصہ لگ گیا۔ یہی زبانوں کی تشکیل اور ارتقا میں فطرتاً ہوتا ہے۔ اردو ہی کے دوش بدوش دوسری جدید ہند آریائی زبانیں بھی تشکیلی دور سے گزر رہی تھیں، چنانچہ ان کے اولین ادبی آثار بھی، بارھویں صدی سے لے کر پندرھویں صدی عیسوی تک کے زمانہ پر حاوی ہیں اور سب سے پہلے نمونے جو ہم کو ملتے ہیں، وہ اردو ہی کے ہیں۔

محمود غزنوی اور اس کے جانشین مسعود کے زمانے میں، اردو کی پُرامن تشکیل کے لیے مواقع فراہم ہو گئے تھے، چنانچہ اس زمانے تک اس کو یہ حیثیت حاصل ہو چکی تھی کہ وہ ایک مستقل زبان سمجھی جانے لگی تھی

اور نہ صرف فارسی، بلکہ عربی کو بھی وہ متاثر کرنے لگی تھی۔ فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں اس کے الفاظ راہ پانے لگے تھے، چنانچہ کافور (کپور)، انبج (آنب)، صندل (چندن)، قرنفل (کرن پھول) معرب ہندوستانی الفاظ ہیں اور کوتوال، روپ، پانی، مور، توتا، رتن، ماشہ غرض بیسیوں اردو الفاظ، فارسی میں داخل ہو گئے تھے۔ کوتوال جو در اصل "کوٹ + وال" یعنی قلعہ والا یا قلعہ کا نگہبان ہے، فردوسی جیسے مستند فارسی شاعر کے کلام میں بھی ملتا ہے۔

یہی زبان تھی جس کو ساتھ لے کر مسلمان دہلی پہنچے تھے۔ اس سرزمین کی بولیوں نے اردو زبان کے ارتقاء کی دوسری منزلوں پر اثر ڈالا۔ ایک تو اس موقع پر اب وہ ایک تیار بولی کی صورت میں پنجاب سے ابھی ابھی آئی تھی۔ دوسرے، اٹھارویں صدی کے وسط میں، جب اس کی چار سو سال پہلے کی تشکیل دکن سے یہاں پہنچی تھی۔

دہلی دراصل چار بولیوں کا نقطۂ اتصال ہے۔ مشرقی پنجابی، برج بھاشا، اور راجستانی دو بولیں "او = ٥" یا "و = [illegible]" گروہ کی زبانیں کہلاتی ہیں۔ یعنی ان کے اسما، صفات اور افعال کی آخری علامت "او" یا "و" ہوتی ہے۔ جیسے "میرا بیٹا آیا" کی صورت، ان زبانوں میں "میرو بیٹو آیو" ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں بانگرو اور راجستانی میں یہی صورت، میرا بیٹا یا پُت یا پُترٌ آئیا، ہوتی ہے۔ اِن لسانی صورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے، ظاہر ہے کہ وہ پرانا مقبول نظریہ جو اردو کا نشو و نما برج بھاشا سے کرتا تھا، معلق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب بعض ماہرین لسانیات جیسے پروفیسر چیٹرجی اور ڈاکٹر عبد الستار صدیقی نے لسانی شہادتوں سے اس کو پایۂ ثبوت کو پہنچا دیا ہے۔ مثال کے طور پر اردو کے چند مروجہ الفاظ جیسے

[illegible]

(6) by me the Greedy ……

[illegible]

اس کی وجہ سے ایک طرف بعض ضروری آوازوں جیسے "ز" "ژ" "ف" وغیرہ کے ادا کرنے کے ذریعے مہیا کئے، دوسری طرف سنسکرت کے اصول کے مطابق ہر لفظ کے آخری "ہ" جو ایک مختصر "آ" یا "ہی" کی آواز پوشیدہ رکھتی ہے، وہ فارسی میں علامت نہ ہونے کی وجہ سے ترک کر دی گئی اور لفظ فارسی اصول کے مطابق ساکن بن گیا جیسے "پد" سے "پد" "مگ" سے "مگ" "پھل" سے "پھل" وغیرہ۔

سب سے آخری بات یہ ہے کہ قدیم زمانے سے ہندوستان کے علمی اجارہ داروں نے سنسکرت کے سوا کبھی کسی عوام کی زبان کو منہ نہیں لگایا۔ پالی کا نشو و نما دراصل اسی علمی اور مذہبی اجارہ داری کے خلاف ایک تحریک تھی، جس کا ہندوستان میں جو حشر ہوا، ہمارے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ عوام کی زبانوں کی سرپرستی کے ثبوت بہت کم ملتے ہیں۔ اسی دباؤ کا اثر تھا کہ ہندوستان کے مصنفین، جب جدید زبانوں میں لکھنے بیٹھتے تو مجبوراً قدیم شکلوں اور طرز کی طرف مائل ہو جاتے تھے، اس عادت کو بیمس نے اس طرح ظاہر کیا ہے کہ "ہندوستانی مصنف جب لکھنے بیٹھتا ہے تو وہ غیر فطری بن جاتا ہے۔ اور اس بات کا اعتراف تمام ماہرین لسانیات کو ہے۔"

لیکن مسلمان بادشاہوں نے، جب عوام کی زبانوں کی سرپرستی شروع کی تو چند سال کے اندر اندر ساری جدید زبانوں میں تصنیف و تالیف کے شوق کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ چنانچہ اودھی میں "پدماوت" اور "رامائن" بنگالی میں "رامائن" اور "ویدوں" کے ترجمے، راجستانی، گجراتی اور مرہٹی میں میرا بائی، پدما نا اور اکنا تھ جیسے عظیم الشان شعرا اور مصنفین اٹھنے لگے۔ یہ ذہنی انقلاب سلطان محمود غزنوی کے زمانے سے شروع ہو چکا تھا، جس نے سنسکرت اور دوسری جدید زبانوں کی سرپرستی کی اور معتبر شعرا، جیسے مسعود سعد سلمان، امیر خسرو، عبدالرحیم خانخاناں وغیرہ سب نے عوام کی زبانوں میں لکھنا شروع کیا۔ اس تحریک سے ہندو مذہبی رہنماؤں نے بھی فائدہ اٹھایا، اور عوام تک پہنچانے کے لئے مذہبی ادب کو جلد جلد عوام ہی کی زبانوں میں منتقل کرنا شروع کیا۔ اس طرح اردو، جدید ہند آریائی زبانوں کے نشو و نما کا بھی براہ راست باعث ہوئی۔

عبدالقادر سروری

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

شکوۂ آبلہ ابھی سے میر ہے پیارے ہنوز دلّی دور

میٹرک کا امتحان دینے کے بعد ہی سے کالج کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ ابھی نتیجہ بھی تو نہ نکلا تھا۔ جانے کیوں کالج کے نام سے ایک خوشگوار کپکپی سی ہوتی تھی۔ جیسے ملیریا کا بخار چڑھ رہا ہو۔ جاڑا جاڑا سا ہوتا۔ لیکن ایک لطف سا محسوس ہوتا۔ ہر روز سوچتی تھی کہ آخر کونسا مضمون لینا میرے لئے بہتر ہوگا۔ سائنس ــــ اونھوں ــــ کیا کروں گی سائنس لے کر۔ کونسے تیر مارنے ہیں۔ کونسی ایجاد کرنی ہے۔ یہ سائنسدانوں نے مشین گن بنانی ہے۔ آخر یہ کونسی مصیبت ــ گھریلو زندگی کی سائنس ہی ہم ہندوستانی لڑکیوں کو آجائے تو کافی ہے۔ ایک ردی ٹھیک طور سے ڈالنی تو آتی نہیں اور چلیں شان بگھارنے۔ سائنس میں بھی تو کئی شعبے تھے۔ ایک شعبہ تھا نباتیات۔ آپا نے نباتیات لی تھی۔ ان کو چھٹیوں میں دیکھتی تھی۔ پتہ پتہ پھول پھول کسی چیز کو ڈھونڈھتی پھرتی ہیں۔ میں باغ لگا لگا کر حیران۔ وہ نوچ نوچ کر مجھے آزردہ کرتی تھیں۔ پوچھتی تو جواب ملتا۔ ارے ہم کو اس پھول میں کچھ ریسرچ کرنی ہے۔ نہ جانے یہ ریسرچ کیا بلا ہوتی ہے۔ کون جانے یہ سب۔

لیکن میں نے بعض نباتیات لینے والے بی۔ ایس سی کے گھر دیکھے تھے۔ اجاڑ سے پڑے تھے۔ نہ درخت نہ گملے! نہ بیل نہ بوٹے!! باغ تو بڑی چیز ہے!!! میں سوچتی تھی! یہ لوگ کیوں شیخی شیخی کو کوئی ایسا مضمون لے بیٹھتے ہیں جس میں سلیقہ سے اپنی کارگزاری بتا بھی نہیں سکتے ــــ میں نے باغ میں کچھ سبزی لگائی تھی۔ میرے پودوں میں چیونٹیاں لگ رہی تھیں۔ بڑا افسوس ہوتا تھا اپنی محنت اور شوق کی چیزیں یوں ویران ہوتیں دیکھ کر۔ نباتیات کے ایک پروفیسر سے پوچھا کہ بتایئے کیا علاج کروں ان کے دفیعہ کا؟ آخر آپ لوگوں نے کچھ تحقیق کی ہوگی! ــ وہ ایسا تو لے ہوگئے۔ کچھ بھی تو نہ بتا سکے۔ کہہ دیا مجھے باغ داغ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اور نہ کبھی ان خرافات کی تحقیق کی ہے۔ کتنی بدمذاقی ہے اس جواب میں ــــ! افسوس!! بہت سی آرزوئیں خاک میں مل گئیں ــ

حیوانیات سے متعلق بہت کچھ سنا تھا۔ اس شعبہ سے بھی ایک بدگمانی سی تھی۔ سنا مینڈک چیرنی ہوتی ہے۔ تمام وقت بدبو میں دن گزارنا ہوتا ہے۔ میں تو بڑی بددماغ ہوں۔ بدبو کی ذرا برداشت نہیں۔ تانے شاہ کا دماغ ہے اس حیثیت سے۔ ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتی۔ یہ سب کیونکر سہہ لوں گی۔ ڈاکٹری کا بھی خیال تھا۔ مگر اس پیشہ سے بھی بدظنی تھی۔ ڈاکٹر جتنی صفائی کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں اتنے ہی غلاظت میں گھرے رہتے ہیں۔

پھر ایک لہر آئی کہ نہیں جی ہسٹری میں تاریخ لیں گے۔ یہ کیسی رہے گی۔ پھر سوچتی کہ یہ تو وہی لے سکتا ہے جس کا دماغ رٹو قسم کا ہوتا ہے۔ جس کا حافظہ زبردست ہے۔ جس کو برسوں کی باتیں یاد رہتی ہیں۔ مجھے تو اپنی تاریخ پیدائش بھی یاد نہیں رہتی۔ اپنی بے ہنگام زندگی کا کوئی اہم سے اہم واقعہ بھی بھول بھول جاتی ہوں ـــ بس مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا۔

پھر آخر لوں کیا سر اپنا ــــ اب شعبۂ فنون کے دوسرے پہلو کو سوچتی کہ اردو، فارسی اچھی رہے گی۔ یا اردو کے ساتھ کوئی اچھا سا مضمون اور لے لوں گی۔ اپنی زبان ہے۔ اس پر ہی قدرت آجائے۔ مگر یہ اردو کے ساتھ ہندی بھی ضروری ہے۔ یہ ہندی کیا ہوتی ہے؟ ہاں ع گو گرد راہ ہے گر آندھی کے ساتھ ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ލޭޔާދޭޔާ، ލޭޔާދޭޔާ

[illegible]

ލޭޔާދޭޔާ، ލޭޔާދޭޔާ

[illegible]

ލޭޔާދޭޔާ، ލޭޔާދޭޔާ

[illegible]

ލޭޔާދޭޔާ، ލޭޔާދޭޔާ

[illegible]

ލޭޔާދޭޔާ، ލޭޔާދޭޔާ

[illegible]

ލޭޔާދޭޔާ، ލޭޔާދޭޔާ

[illegible]

ލޭޔާދޭޔާ، ލޭޔާދޭޔާ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ایثار

جس وقت کسی شخص کو چاروں طرف سے مصیبتیں آگھیرتی ہیں تو اکثر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ بے خود سا ہو جاتا ہے اور اس کے دل و دماغ کی ساری قوتیں جواب دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، لیکن ایسے میں عورت کا عالم بالکلیہ جداگانہ ہوتا ہے۔ زندگی کے ناپیدا کنار سمندر میں اس کی کشتیٔ حیات ہچکولے کھاتی ہے اور آلام و مصائب کے قیامت خیز طوفان کی نذر ہونے لگتی ہے، آسمان کو چومنے والی سمندر کی موجیں اس کی زندگی کا شیرازہ بکھیر دینے کے لئے اس کی طرف بڑھتی ہیں، مگر اس کی پیشانی پر شکنیں تک نہیں آتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مرد ریت کے ذرّوں سے تیل نکال سکتا ہے، شراب کو پانی بنا سکتا ہے، مگر اس زندگی میں ایک عورت کے صبر و استقلال ضبط و تحمل کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ مصیبتیں جو مرد کی کمر کو دوہرا کر ڈالتی ہیں عورت ان کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کرتی ہے۔ مگر افسوس! کہ دنیا عورت کو جسمِ بے روح تصور کرتی ہے حالانکہ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ صنف نازک نے قوموں کی تقدیریں زیر و زبر کر دیں، حکومتوں کے تختے الٹ پلٹ کر ڈالے، دہر میں ایک ہل چل پیدا کر دی۔ ساتھ ہی مرد کو زندگیٔ جاوید بخشی، اس کی ہمدرد و غمخوار بنی، اس کی مصیبتوں میں ہاتھ بٹایا، اور اس طرح اس کی مقدر کی تاریکیوں کو اپنی ان تھک محنت و کوشش سے چکا چوند کر ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو مرد کا سکونِ قلب بنا کر اس جہانِ فانی میں تخلیق فرمایا ہے کہ وہ اس وقت جب کہ مرد کی ہمت جواب دے چکی ہو، اس کے حوصلوں پر پانی پھر چکا ہو، ناکامیوں، نامرادیوں کے گھٹا ٹوپ بادل اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہوں، تو وہ نور بن کر، اس کے قلب کا سرور بن کر اس میں روح تازہ کی تخلیق کرے، وہ ہمت اور وہ حوصلہ بخشے جس سے اس میں آگے بڑھنے کی طاقت پیدا ہو جائے، حیاتِ مستعار کی ساری کلفتیں اطمینانِ قلب سے مبدل ہو جائیں، امن اور چین اس کا رفیق ہو، عورت جس کی شفیق ہو .... غرض یہ مشاہدات ایک ایسے درد بھرے واقعہ کو تازہ کرتے ہیں جو اپنے اندر ایک داستان چھپائے ہوئے ہے،

انگلستان میں لیزلی نامی امیر گھرانے کا ایک شخص تھا، پشتوں سے دولت گھر میں چلی آتی تھی، قسمت کا ایسا دھنی تھا کہ مٹی پر ہاتھ پھیرتا سونا ہو جاتا، طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ دولت نے اسے کبھی راہ انکساری و راستی سے نہ ہٹایا اور خوشامدی مصاحبو کی چکنی چپڑی باتوں نے کبھی اس کا دماغ خراب نہ کیا، یہی وجہ تھی کہ اس نے ایک اوسط درجہ کے شریف گھرانے کی ایک حسین لڑکی میری نامی سے شادی کی، میری کے بھاگ جاگ گئے اور سوسائٹی میں اس کے حسن اور خوش مزاجی کے چرچے ہونے لگے۔ ایک طرف دولتِ بے اندازہ، طرف دیگر محبتِ بے پناہ۔ اس پر لطف یہ کہ طبیعتیں جدا جدا، مشرق و مغرب کا فرق۔ ایک طرف سنجیدگی و متانت کا دَور دورہ تو ایک جانب ظرافت زندہ دلی کا راج۔ مگر کیا مجال جو دونوں میں بال برابر بھی فرق آیا ہو، لیزلی کی یہ آرزو کہ اس کے پاس جو کچھ مال و متاع ہے وہ بیوی کی نت نئی خواہشوں کی نذر ہو جائے اور میری کی یہ تمنا کہ اپنے شوہر کو مسرور و محفوظ رکھنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھے۔ پھر ایک دو روز نہیں، برسوں ان دونوں کی زندگی اسی طرح مہر و وفا اور ایک دوسرے کی رفاقت و محبت میں بسر ہوئی۔ دونوں کی رفتار سے کون بے خبر ہے؟ صبح شام اور شام صبح کچھ اس قدر تیزی سے آپس میں بدلے سدلے کا پتہ تک نہ چل سکا کہ کب صبح ہوئی اور کب شام، ایک دوسرے کی محبت میں سرشار، زندگی کی منزلیں طے کرتے ہوئے

چلے جا رہے تھے اور یونہی چلتے رہتے اگر گردشِ روزگار ان کے درمیان حائل نہ ہوتی ۔ فلک کینہ پرور اور تقدیرِ [illegible] کو میاں بیوی کا چین، سکھ، ایک آنکھ نہ بھایا۔ ان پر ایک بلائے ناگہانی ٹوٹ پڑی، وقت نے پلٹا کھایا۔ پلٹا بھی ایسا کہ لیبرلی کو دن ہی میں تارے نظر آنے لگے۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ اس نے ایک کاروبار شروع کیا تھا اور نفع کی امید پر اپنی دولت کا ایک کثیر حصہ صرف کر ڈالا، رنگ میں بھنگ، پھول میں کانٹا، خوشی میں غم کی چاشنی ۔ ان چیزوں کا کچھ ازل ہی سے ساتھ چلا آیا ہے اور پھر دولت کا حال تو چلتی پھرتی چھاؤں کا سا ہے ...... چنانچہ یہی حشر لیبرلی کا ہوا کہ ایک تو ناتجربہ کاری، دوسرے تقدیر کی ناسازگاری دیکھتے دیکھتے وہ شخص ...... وہ شخص روپیہ جس کے ہاتھوں میں کھیلتا تھا پیسہ پیسہ پر نظر رکھنے پر مجبور ہوگیا اور وہ سرمایہ جس سے صدہا امیدیں وابستہ تھیں منٹوں میں ہاتھ سے جاتا رہا، نقصان ہوا جس سے لیبرلی کا صبر و شکیب جاتا رہا ۔ چند روز تو اس نے کوشش کی کہ کسی طرح یہ حال اپنی مشفق بیوی پر ظاہر نہ ہونے پائے لیکن آخر کب تک ...... اس کی خاموشی، اس کے چہرے کی بے چینی میری کی نگاہوں سے کیسے پوشیدہ رہ سکتی تھی ؟ اس نے فوراً تاڑ لیا کہ ہو نہ ہو لیبرلی پر آفتِ ناگہانی کا آسمان ٹوٹ پڑا ہے، لیکن وہ چاہتی تھی کہ لیبرلی خود ہی انکشافِ حال کرے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، گردشِ روزگار کا دھارا ضبط کے بندوں کو توڑ کر بہہ نکلا اور وہ لیبرلی جس نے اپنے احوال کے چھپانے کے ہزاروں جتن کئے تھے، اپنی بیوی کو ہمراز بنانے پر مجبور ہوا، حالات نے اسے مجبور کیا کہ کوئی اس کا غمخوار ہو، کوئی اس کا شفیق ہو، کوئی ہو جو اس کی مصیبتوں میں شریک ہو لیکن اسے رہ رہ کر یہ خیال ستاتا تھا کہ کہیں اس کی ناداری ...... اس سے اس کی چہیتی بیوی کو بیگانہ نہ کر ڈالے اور کہیں وہ ذات جو اس کے قلب کا سرور اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اس سے کنارہ کشی نہ کر بیٹھے ۔

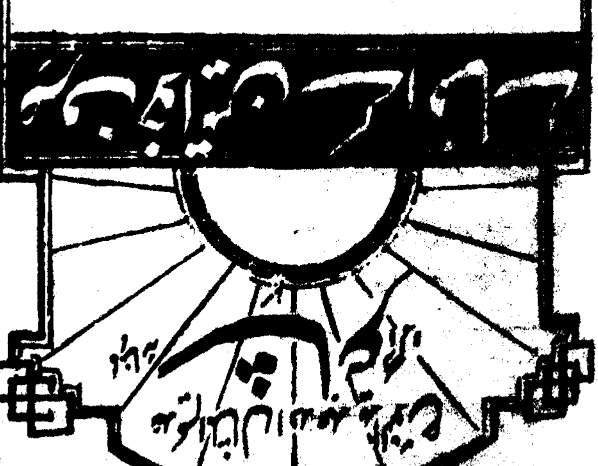
بے چین ہو ہو جاتا جب اسے خیال آتا کہ کہیں اس کا اظہارِ حال میری کے لبوں کی دلفریب مسکراہٹ اس کے دل خوش کن نغمات اور اس کی آنکھوں کی مستانہ جھلک کو اس سے چھین نہ لے ...... مگر ایسے لمحات آہی پہنچے جب کہ اس کے دل پر اندھیاری گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، مستقبل کی مصیبتیں ایک ڈراؤنا اور بھیانک منظر پیش کر رہی تھیں اور لیبرلی اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا اپنی ماضی کی زندگی میں گردش کر رہا تھا، اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی کہ اتنے میں اس کی بیوی رحمت بن کر سامنے آکھڑی ہوئی، لیبرلی گویا ایک خواب سے چونک پڑا، بیوی کی طرف دیکھا جس کے معصوم چہرے اور دلکش نگاہوں سے محبت و وفا ٹپکی پڑتی تھی، دونوں خاموش تھے

لیبرلی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ اپنے نورانی وجود سے اس کے دل کے ظلمت کدہ کو سکون اور اطمینان کے نور سے منور کر رہی ہے، تھوڑی دیر تک کمرہ میں خاموشی چھا گئی، لیبرلی کو ایکبار چند لمحوں کے لئے پھر انھیں خیالات نے آگھیرا جو اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے، اس نے نگاہیں نیچی کر لیں، اس کے چہرہ پر مردنی سی چھا گئی، وہ سوچنے لگا، بھلا کیسے یہ حسن و عیش کی دیوی مفلسی و ناداری کی ناقابلِ برداشت مصیبتیں جھیل سکے گی، کس طرح وہ عیش و آرام کی زندگی کو مصائب و آلام پر قربان کر سکے گی ؟ لیبرلی انھیں خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ میری کی آواز نے اس کی ایک ایک گتھی سلجھا دی، آنکھ اٹھائی تو بیوی کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے تھا جو اس سے اس کی پریشانیوں کی کنہ پوچھ رہا تھا، اس نے اس وقت اپنے آپ میں ایک نئی طاقت محسوس کی اور وقت کی موزونیت سے فائدہ اٹھا کر صاف صاف الفاظ میں اپنی غم آلود زندگی کے

[illegible]

[illegible]

[illegible]



[illegible]

[illegible]

[illegible]

ނިމުނީ

تنقید و تبصرہ

یوروپین اور انڈو یوروپین شعرائے اُردو و فارسی

از رائے بہادر رام بابو سکسینہ
نول کشور پریس لکھنؤ

یہ ضخیم کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ چار سو سے زیادہ صفحات کا ایک ضمیمہ بھی شامل ہے جس میں ان یوروپی اور انڈو یوروپین شعرائے اردو فارسی کے اردو کلام کے انتخابات درج ہیں جن کا ذکر اس بسوط تاریخ میں کیا گیا ہے۔ کتاب پندرہ ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں بارہ ضمیمے الگ شامل ہیں۔ اس کا پیش لفظ رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو نے قلمبند فرمایا ہے جو اردو ادب کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں اور اردو شعر و سخن کے عہد حاضر میں سب سے بڑے سرپرست ہیں۔

رائے بہادر رام بابو سکسینہ اردو کے ایک خاص دلدادہ اور وسیع النظر ادیب ہیں ان کی تاریخ ادب اردو ایک عرصہ قبل شائع ہو کر انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے ماہرین میں خاطر خواہ مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ ان کی کئی اور کتابیں زیر ترتیب یا زیر طبع ہیں جن میں جدید اردو ادب پر تین جلدوں میں ان کی زیر ترتیب کتاب کا بڑے اشتیاق سے انتظار کیا جا رہا ہے

تاریخ ادب اردو کی اشاعت کے بعد سے رام بابو سکسینہ کی وسیع النظری اور ان کے مذاق سلیم کو بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ لیکن زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں علمی و ادبی تحقیق اور تلاش و جستجو کی بھی خاص صلاحیت موجود ہے اور وہ صبر و استقلال اور محنت و مشقت سے کبھی نہیں گھبراتے چنانچہ اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں انھوں نے محنت و جستجو کا جو اعلیٰ ثبوت دیا ہے وہ اردو ادب کی تاریخ میں اپنی آپ نظیر ہے۔

یہ موضوع جس قدر وسیع ہے اس کا اندازہ اس کتاب کے مطالعہ کے بغیر اردو کے بڑے سے بڑے ماہر تاریخ کو بھی نہیں ہو سکتا اور بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ مصنف نے تلاش و تحقیق کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا اور اس طرح سے اردو ادب کے اس پہلو پر ایک ایسی مستند کتاب پیش کی جس پر شاید ہی کوئی اور اضافہ کیا جا سکے گا۔

اس کتاب کے پہلے پانچ باب در اصل ان اسباب کی وضاحت کرتے ہیں جن کی بنا پر مغربی ممالک کے نو واردوں نے ہندوستان کی تہذیب و معاشرت سے انس پیدا کیا اور ہندوستانیوں سے اتنے قریب ہو گئے کہ ان کی زبان میں شعر و شاعری بھی کرنے لگے۔ یہ پانچ باب بجائے خود ایک جداگانہ کتاب ہیں جن کو فرنگیوں اور ہندوستانیوں کے ابتدائی تعلقات اور میل جول کے عنوان سے اردو میں الگ شائع کیا جا سکتا ہے۔ غرض اس پس منظر کو پیش کرنے کے بعد چھٹے باب سے مصنف نے اصل تذکرہ شروع کیا ہے پہلے یوروپین شعرائے اُردو و فارسی کو لیا ہے اور ان کے بعد ارمنی، ہند برطانوی، ہند پرتگالی، ہند فرانسیسی، ہند جرمن، ہند اٹالوی شعرا میں سے ہر ایک طبقہ کے لئے ایک علاحدہ باب وقف کیا ہے۔ تیرھواں باب "مختلف ہند یوروپین شعرا" سے اور چودھواں باب "ہند یوروپین شاعرات اردو" سے بحث کرتا ہے۔

آخری یعنی پندرھویں باب میں پوری کتاب کا مختصر خلاصہ خدمات اردو ادب کے عنوان سے قلمبند کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان بڑی خوش قسمت ہے اور اس کتاب کے مطالعہ سے اردو کے مخالفین بھی اس امر کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ یہی زبان ہندوستان کی ایک مشترک قومی زبان رہی ہے جس نے نہ صرف اس ملک کے ہر حصے کے باشندوں میں مقبولیت حاصل کی بلکہ جو لوگ باہر سے ہندوستان آئے ان کا دل بھی موہ لیا۔ شاید ہی ہندوستان

کی کوئی اور زبان ایسی ہو جس میں اس کثرت کے ساتھ بیرون ملک کے باشندوں نے شعر و شاعری کی ہو اور اپنے دیوان یادگار چھوڑے ہوں۔ میری نظر میں اردو زبان کی یہ خصوصیت بھی قابل فخر ہے کہ اس کے لئے رام بابو سکسینہ جیسا وسیع النظر عالم و فاضل اور محقق فراہم ہو سکا۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ بہت جلد اس کا اردو ترجمہ شائع کیا جائے اور یقین ہے کہ جب وہ شائع ہو جائے گا تو اہل اردو اپنی زبان اور ادب کے اس محسن کی حقیقی خدمات سے واقف ہوں گے اور اس کا اعتراف کریں گے۔

اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ زیر نظر کتاب کی اشاعت سے اردو کے وقار اور ہمہ گیری میں بہت بڑا اضافہ ہوا ہے اور اس کے مصنف نے نہ صرف اپنے اعلیٰ پایہ محقق ہونے کا ثبوت فراہم کیا بلکہ اردو ادب کی بھی ایک بنیادی خدمت انجام دی ہے۔

کتاب میں اردو شعرا کی متعدد تصویریں اور ان کے خاندانی شجروں کے کئی نقشے بھی شامل ہیں جن کی وجہ سے نہ صرف کتاب کی دیدہ زیبی میں اضافہ ہوا بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے ہر شاعر کے حالات اور واقعات جمع کرنے میں کیسی کیسی زحمتیں اٹھائیں۔

توقع ہے کہ رام بابو سکسینہ صاحب اسی طرح اردو کی خدمت کرتے رہیں گے اور جدید اردو ادب پر جو کتاب وہ مرتب کر رہے ہیں اس کی پہلی جلد جلد سے جلد شائع ہو کر منظر عام پر آسکے گی۔

اسرار حیات

از ڈاکٹر ایشور ٹوپا - ناشر حیدرآباد تلگو اکیڈیمی۔

اس چھوٹی سی کتاب میں مشہور آندھرا صوفی ویما کے تخیلات، حقایق زندگی سے متعلق پیش کئے گئے ہیں۔ ابتدا میں پروفیسر آر۔ سبا راؤ پروفیسر تلنگی جامعہ عثمانیہ و معتمد تلگو اکیڈیمی نے ویما یا ویمنا کی زندگی اور اس کی شاعری پر ایک مختصر سا مقدمہ قلمبند کیا ہے۔ جس کے بعد ڈاکٹر ٹوپا کا دیباچہ ہے اور پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے جو بارہ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے ہر باب ایک مختلف عنوان کے لئے وقف ہے اور ویما کی شاعری سے اس خاص عنوان کے تحت خیالات ایک جا کر دیئے گئے ہیں مثلاً پہلا باب انسانی تہذیب کے راستے کے عنوان کے لئے وقف ہے اور دوسرے میں انسانی برتری اور کمتری پر ویما کے خیالات جمع کئے گئے ہیں۔

حیدرآباد تلگو اکیڈیمی نے اب تک "تلگو ادب" اور "ایک شاہی حکمران" جیسی کتابیں شائع کی ہیں اور خاص کر قرآن مجید کا تلنگی ترجمہ تین جلدوں میں مرتب کرایا ہے۔ ابتدائی دس پاروں پر مشتمل پہلی جلد شائع بھی ہو چکی ہے۔ زیر نظر کتاب بھی اسی کے سلسلہ مطبوعات کی چھٹی کڑی ہے اور توقع ہے کہ اس اکیڈیمی کی طرف سے ایسی ہی مفید کتابیں شائع ہوتی رہیں گی۔

زیر نظر کتاب اسرار حیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تلنگانہ کے مشہور صوفی ویمنا نے زندگی کے حقائق کو سمجھنے کی بڑی اچھی کوشش کی تھی۔ وہ وجیانگر کے راجا کرشنا دیو رائے سے قبل بمقام کنڈاپلی پیدا ہوا تھا اور اپنی زندگی کا زیادہ تر زمانہ ضلع گنٹور کے ایک قصبہ میں گزارا تھا۔ اس کے کلام میں ایک خاص سوز و گداز اور انسان دوستی نمایاں تھی۔ ڈاکٹر ٹوپا صاحب کی یہ کوشش قابل قدر ہے کہ انھوں نے اس کے کلام کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور مختلف عنوانات کے تحت اس کے شہ پارے یکجا کر دیئے۔ ضرورت ہے کہ اسی طرح ہندوستان کی دوسری زبانوں کے صوفی شعرا کے ملفوظات اور خیالات بھی اردو میں پیش کئے جائیں۔

مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں

از عبداللطیف اعظمی۔ ناشر شبلی اکیڈیمی دہلی۔

حال ہی میں مولانا سید سلیمان ندوی کی مبسوط کتاب "حیات شبلی" شائع

ہوچکی ہے اور زیر نظر کتاب شبلی پر کوئی جامع تصنیف نہیں ہے بلکہ ایک چھوٹا سا مقالہ ہے جو جامعہ ملیہ کے امتحان بی اے کے سلسلے میں ۱۹۴۱ء میں لکھا گیا تھا۔ یہ اگرچہ ایک طالب علمانہ کوشش ہے لیکن اس کی ترتیب میں عبداللطیف اعظمی صاحب نے صحیح ذوق ادب سے کام لیا ہے اور اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ نثر کے لئے وقف ہے اور دوسرا شاعری کے لئے۔ ہر حصے میں پہلے پس منظر کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے بعد شبلی کی اہمیت اور خصوصیات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ چونکہ مولف کو شبلی سے خاص عقیدت ہے اس لئے انھوں نے شبلی کے معاصرین کے مقابلے میں شبلی کی فوقیت جتانے میں تھوڑے بہت مبالغے سے کام لیا ہے اس لئے اس کتاب کا صحیح نام دراصل محاسن شبلی رکھا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شبلی اردو کے ایک بہت بڑے ادیب، مورخ اور نقاد تھے اور انھوں نے اس زبان میں علمی و ادبی مضامین کے لئے ایک ایسا اسلوب ہموار کردیا تھا جس پر آنے والی نسلیں کامیابی کے ساتھ گامزن رہیں گی۔ تاریخی نظموں کے لئے بھی انھوں نے جو اسلوب اور شکل استعمال کی تھی وہ بھی آج تک اردو شعرا کے لئے نصب العین کا کام دے سکتی ہے۔ ان حقیقتوں کے پیش نظر اس کتاب کا مطالعہ اردو ادب اور خاص کر تنقید کا ذوق رکھنے والوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔

یہ جنگ مصنفہ ٹامس مان۔ مترجمہ محمد اعظم ایم اے۔ لکچرار شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ

ٹامس مان عہد حاضر کا ایک بہت ہی ممتاز جرمن ادیب ہے جس نے اپنی اعلیٰ تصنیفات کی بدولت ۱۹۲۹ء میں ادب کا نوبل انعام حاصل کیا تھا۔ وہ جرمن ناول نگاروں کا سرتاج مانا جاتا ہے لیکن اس نے موجودہ جنگ کے متعلق بھی دو کتابیں لکھیں جن میں ایک "عمومیت کی فتح" اور دوسری "یہ جنگ" کے عنوان سے شائع ہوئیں۔ موخر الذکر کتاب ۱۹۴۰ء میں اس وقت لکھی گئی تھی جب کہ نازیوں کا اقبال معراج کمال پر پہنچ چکا تھا اور ان کے حملے ہر طرف زور و شور سے جاری تھے اور متحدین کو پے در پے شکستیں ہو رہی تھیں۔ ایک ایسے نازک وقت میں بھی ٹامس مان نازیوں کے انجام کے متعلق جو عقیدہ رکھتا تھا وہ اس کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے اور جرمنی کی تباہی کی نسبت جو پیشین گوئیاں اس نے عین اس کے عروج کے زمانے میں کی تھیں وہ آخر کار صحیح ثابت ہوئیں اور ٹامس مان کی دور بین نگاہ اور سیاسی بصیرت کا ثبوت فراہم ہوگیا۔ اس اہم کتاب کا یہ ترجمہ قابل قدر ہے اور مترجم نے جرمن انداز بیان کی پیچیدگیوں اور فلسفیانہ مباحث کی خشکیوں کے باوجود اس کتاب کو حتی الامکان سلیس اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔

نئے زاویے جلد دوم۔ مرتبہ کرشن چندر۔ ناشر مکتبۂ اردو لاہور۔

یہ دیدہ زیب کتاب دراصل ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے بہترین مضامین نظم و نثر کا ایک عمدہ انتخاب ہے جس کو اردو کے مشہور ادیب کرشن چندر نے خاص ذوق اور سلیقے سے مرتب کیا ابتدا میں خود انھوں نے معروضات کے عنوان سے ایک دیباچہ لکھا جس میں جدید ادب کے رجحانات اور جدید ادیبوں اور شاعروں کے خصوصیات پر بڑی سلاست اور خوبی سے نظر ڈالی ہے۔ جدید یا ترقی پسند ادب علم برداروں کو اپنے علمی و ادبی تحریروں میں اسی قسم کا سنجیدہ اند بیان اختیار کرنا چاہئے اور اپنے ادب کے ایسے ہی اچھے نمونے موقع بموقع انتخابات کی شکلوں میں شائع کرنے چاہئیں جیسے کہ اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

اس واقعہ سے کوئی وسیع النظر دلدادۂ اردو انکار نہیں کر کہ اردو ادب اب ایک جدید راستے پر چل نکلا ہے۔ اور اس کتاب سے واضح ہوگا کہ نئے راستے پر چلنے والے ادیبوں اور شاعروں میں کیسی کیسی شخصیتیں شامل ہیں۔ اور یہ کہ اس قسم کے ادب میں زندہ اور آگے بڑھنے کی کیا کیا صلاحیتیں موجود ہیں۔ جو لوگ مستقبل کے اردو ادب کی تابناکیوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔"

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	روپے	آنے	پائی
[illegible]	۸۰	۰	۸	۰
[illegible]	۹۲	۰	۸	۰
[illegible]	۴۰	۰	۴	۰
[illegible] گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	۰
رقعات نثر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	[illegible]	۰
ارمغان جذب	۱۲۰	۱	۱۲	۰
یورپ جنگ سے پہلے	۲۱۸	۲	[illegible]	۰
تاریخ سیاسیات	۲۷۲	۳	۸	۰
سرسالار جنگ	۴۸	۰	[illegible]	۰
مغربی تصانیف اردو کے تراجم	۱۴۵	۱	[illegible]	۰
[illegible]	۱۳۲	۱	۴	۰
[illegible]	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۴	۱	[illegible]	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	[illegible]	۰
[illegible]	۱۹	۰	[illegible]	۰
اردو نامہ	۲۰۰	۲	[illegible]	۰
سرگزشت حاتم	۱۲۸	۲	۰	۰
عماد الملک	۴۰	[illegible]	[illegible]	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	[illegible]	۰
" دوسری کتاب	۵۶	۰	[illegible]	۰
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	[illegible]	۰
کاغذ کی ناؤ	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر	۹۲	۰	۸	۰
مختصر تاریخ دکن	۱۴۴	۱	[illegible]	۰
ہندستانی تمدن	۳۴۰	۳	[illegible]	۰
پودوں کی کہانی	۸۰	[illegible]	[illegible]	۰
مرقعا	[illegible]	۱	[illegible]	۰
پانی کی کہانی	۴۸	[illegible]	[illegible]	۰
رسائل طبیہ	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو	۷۶	[illegible]	۸	۰
رفیق لود و قداں	۲۲۴	[illegible]	۱۲	۰
اشوب	۵۶	[illegible]	۸	۰
حیدر آباد	۸۸	[illegible]	[illegible]	۰
شاد اقبال	۱۷۶	۲	۸	۰
آریائی زبانیں	۱۰۴	۱	۰	۰
نظام علی خاں	۳۲	۰	۴	۰
تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	[illegible]	[illegible]	۰
عرب اور عربستان	۵۶	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	روپے	آنے	پائی
[illegible] کا جادو	۴۸	۰	۴	۰
طبیعیاتی کائنات	۹۸	۰	۸	۰
مطالع سخن	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن	۱۲۷	۰	۱۲	۰
معراج سخن	[illegible]	۰	۱۲	۰
ایمان سخن	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن	۱۳۳	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	[illegible]	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) "	۳۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	[illegible]	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن	۱۵۴	۱	۴	۰
روح غالب	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصم	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی	۴۱۶	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان	۳۲	۰	۴	۰
خطابیات	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری	۱۵۵	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۸۰	۰	۱۲	۰
انوار	۱۶۸	۱	۸	۰
کشش [illegible] (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
گارساں دتاسی	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا	۱۹۸	۱	[illegible]	۰
سکندر جاہ	۲۴	۰	۴	۰
[illegible]	[illegible]	۰	۱۰	۰
ادارۂ [illegible] ۱۹۳۴ء میں	۴۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
افضل الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
نواب میر محبوب علی خان	۳۴	۰	۴	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد دکن

[illegible]

[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]

(11) [illegible] — [illegible] — (٧) [illegible]

[illegible]

[illegible]

نوادر

اضداد کی طُرفہ دنیا میں ہر زیر و زبر کو دیکھ لیا
للہ! وہی پھر مشقِ ستم، راحت کے اثر کو دیکھ لیا

اب خاک کے تا کس ذرّوں کو توفیقِ جہانبانی ہو عطا
اک طرح نہیں ہر پہلو سے خورشید و قمر کو دیکھ لیا

یہ کلیاں، یہ غنچے بھی ہیں کچھ، اک سانس میں مرجھا جاتے ہیں
اب دل کوئی فطرت کا نگیں تزئینِ گہر کو دیکھ لیا

دنیا کی فضا ہے اور ہی کچھ، اور شمس و قمر کی ہے وہی گردش
اب کوئی نیا مقصودِ سفر، اس دورِ قمر کو دیکھ لیا

تہذیبِ جہاں میں وضع ہو کوئی جو رجدا، اخلاق نیا
کیا طرزِ وفا، کیا رنگِ بلا، ہر خیر کو شر کو دیکھ لیا

چمن میں ہر طرف شباب رنگ کی پکار ہے
لٹا دے تو بھی آشیاں، بہار پھر بہار ہے!

وہاں نفس کی موج نے چمن میں جان ڈال دی
تجھے ہنوز جنبشِ صبا کا انتظار ہے؟

اس کے خیال کو نہ پوچھ، اس کا خیال ہی تو ہے
اشک بنا ٹپک گیا، درد بنا سما گیا!!

قصرِ مآل فکر کے سارے ستون ہل گئے
عشق نے ایک سانس لی، عقل کو ہوش آگیا

حرماں خیرآبادی

اردو شاعری اور نئی تحریکیں

اردو شاعری عہد اصلاح کے بعد سے، اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ، اصولوں کی تبدیلی کی وجہ سے، اس سر منزل پر پہنچ گئی تھی، جہاں سے، نوجوان شعرا کو، اس کے ارتقائی رفتار بھی سست نظر آنے لگی۔ یوسف ظفر کے یہ مصرعے شاید اس ذہنیت کی ترجمانی کرتے ہیں ؎

کیا مجھے اپنے خیالوں کے ادا کرنے کو
اسی رفتار سے چلنا ہے کہ جس سے اب تک
دھیرے دھیرے مرے ہم عصر چلے جاتے ہیں

ذہنیتوں کی یہ تبدیلی، کچھ تو گزشتہ جنگ عظیم کے بعد کے حالات کے ردّ عمل کا نتیجہ ہے، اور کچھ نئی عالمی تحریکوں کی صدائے بازگشت، جس نے شعرا کی نوجوان نسل کو انقلاب کی طرف مائل کر دیا۔ چنانچہ جدید اردو شاعری کے ارتقا کی تاریخ میں یہ آخری دس بارہ سال، نئی نئی تحریکوں اور الفاظی تصورات کی افزائش کے سبب پچھلے ادوار کے مقابلے میں، ممتاز نظر آتے ہیں۔ یہ دور اردو شاعری میں نئے شعری تصورات اور ایسی فنی تحریکات کا آغاز کرتا ہے، جو بہ حیثیت مجموعی اس سے پہلے اردو شاعری سے نامانوس اور اجنبی تھیں۔ نوعمر شعرا نے اپنی ساری توانائیوں اور جدت طرازانہ مساعی کے ذریعے، اردو شاعری کو ایک ایسے نہج پر ڈالنے کا بیڑا اٹھایا ہے، جو بعض حیثیتوں سے عالمی ادبی تحریکات سے ہم آہنگ ہے۔ وسیع تر عالمی پس منظر اور قریب ترین قومی روابط کا یہ لازمی نتیجہ تھا، لیکن، ہمارے اپنے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کی مناسبت سے، ان تحریکات میں سے، ایسے پہلو زیادہ موثر صورت میں جلوہ گر ہو رہے ہیں، جو ہماری زندگی سے زیادہ گہرا ربط رکھتے ہیں یا نوجوان شعرا کی ذہنیتوں پر زیادہ اثر ڈال سکتے ہیں۔

شاعری کی اصلاح کی جو تحریکیں، اس وقت برپا ہو رہی ہیں، وہ شعر کی صوری اور معنوی ہر حیثیت پر اثر انداز ہیں اور بہت کچھ ترمیم اور تنسیخ کی پیشین گوئی کر رہی ہیں، اور اگر ان کی ترقی، نئی راہوں میں بے روک جاری رہی تو عروض، قافیہ، ردیف اور دوسرے سارے اگلے فنی لوازم میں، اردو شاعری ایک نیا ورق الٹنے کو تیار ہے، جس میں، وقتی جذبات کی رو گزر جانے کے بعد، وہ رفتہ رفتہ ایک انفرادی رنگ پیدا کرتی جائے گی اور نئی شاعری ہندوستان کی دوسری زبانوں کی شاعری سے بھی اتنی ہی ممیز ہوگی، جتنی وہ، قدیم، عبرانی اثر کی شاعری سے مختلف ہو سکتی ہے۔ یہ حقیقی ہندوستانی شاعری ہوگی، جس میں عالمی شعری دبستانوں کا اثر، اس کے مخصوص مزاج کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک نئی صورت میں جلوہ گر ہوگا۔

نئی تحریکوں کا مقصد، سب سے پہلے، اردو شاعری کو، حیات کی من و عن ترجمان، بلکہ کنیز بنانا ہے۔ ادب اور زندگی کا اصول، اس دور میں اتنا ہی چھایا جا رہا ہے، جتنا کہ عصر اصلاح کے فوراً بعد، نیچرل یا فطری شاعری کا اصول مقبول انام ہو چکا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ، عصر اصلاح کے بعد سے لے کر موجودہ دور تک، جدید شاعری کا ارتقا بتدریج ہوتا رہا، اور سوائے اس عصر کے درمیانی ادوار میں، کوئی تحریک اس شدومد کے ساتھ نہیں اٹھی، جیسی کہ موجودہ تحریک، ادب برائے زندگی ہے۔ اس نقطۂ خیال کو منتقل کرنے میں اس عصر اور ہر عصر کے سب سے بڑے شاعر، اقبال کے شعری اور فنی نظریوں کو بہت کچھ دخل ہے، جو شعر و فن میں

ظاہری دلآویزی کے علاوہ، باطنی افادیت کے بھی قائل تھے۔ چنانچہ "فنونِ لطیفہ" کے بارے میں فرماتے ہیں۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا!
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس، مثلِ شرر کیا!
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو، وہ بادِ سحر کیا!

شعر کو وہ حیاتِ ابدی کا پیغام سمجھتے تھے۔

نئی تحریکات کے بارے میں، موافق اور مخالف بہت کچھ کہا گیا ہے .... اور کہا جاتا رہے گا اور جس طرح عصر اصلاح کی تحریکوں کے بارے میں خیال آرائیاں ہوتی رہی تھیں، لیکن، بے چینی، اضطراب اور تجدد پسندی کی وہ لہریں، جو، نوجوان ذہنوں میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں، اپنا کام کرتی رہیں، اور اب بھی کر رہی ہیں۔ رفتہ رفتہ اس ساری سعی کا مفہوم متعین ہوتا جائے گا، جو اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ زندگی کی بدلی ہوئی قدروں سے شعر اور ادب کو ہم آہنگ بنایا جائے۔ وقتی اور فنا پذیر جذبات، اپنی طبعی موت مرنے والے ہیں، لیکن فکر کی نئی دھارا، شکست و ریخت اور تعمیرِ جدید کے آثار چھوڑے بغیر نہیں جائے گی۔

ادب کو عام پسند اور عوام پسند بنانے کا رجحان بھی ان تحریکوں کا ایک پہلو ہے دوسرے الفاظ میں، ادب سے خواص پسندی، ذہنی امارت اور اجارہ داری کو مٹانا بھی، نئی تحریکات کے پیشِ نظر ہے، فی نفسہٖ یہ مسئلہ اختلاف سے بالکلیہ بری نہیں کہ ادب کو کس حد تک عوام پسند ہونا چاہئے؟ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس تحریک کے اثر سے اردو شاعری میں، فرضی حسن و عشق کی داستانوں کی بجائے، زندگی کے مشاہدے اور مطالعے کے نئے نئے زاویۂ نظر پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ شاعری کو عوام پسند بنانے کا مقصد ابھی پورے طور پر اس طرح حاصل نہیں ہو سکا کہ شاعری کی پچھلی روایات کا اثر، نئے نمونوں سے ابھی تمام تر زائل نہیں ہونے پایا ہے۔

موضوعات کے تنوع، اسالیب کی توسیع اور فنی تجدد پسندی کی تجربی کوششوں کے لحاظ سے، موجودہ دَور کی شاعری ایک حقیقی عبوری دور سے گذر رہی ہے، اور اگر اپنے سارے خد و خال کے ساتھ کامیاب نہ بھی ہو، پھر بھی، چند بنیادی اصولوں میں ہماری شاعری، اگلے اَدوار کی شاعری کے مقابلے میں بالکل مختلف ہوگی، جس کے اجزا میں، شعر کے قدیم تصور سے، مختلف ایک نیا فنی تصور ہوگا، جس کی عمارت، محض ردیف قافیے مخصوص اور معین اوزان، روزمرے اور محاورے کے سہاروں پر ٹکی ہوئی نہیں، بلکہ شاعر کے انفرادی احساس حسن کاری، اس کی روح کے ذاتی ترنم اور اس کی اپنی فکر کے عناصر پر کھڑی ہوگی۔

موجودہ شاعری، مسلمہ اور مخصوص اوزان سے بھی اتنا ہی جی چراتی ہے، جتنا وہ ردیف اور قافیے سے گھبراتی ہے۔ اوزان اور صُوَرِ شعریہ کا تنوع، جتنا اس دَور میں مقبول ہو رہا ہے، اس سے پہلے اردو شاعری میں کبھی مقبول نہ ہو سکا تھا۔ اسمٰعیل میرٹھی، شرر، نظم طباطبائی اور ڈاکٹر بجنوری نے بے قافیہ نظم کو اردو میں کھپانے کی سعی کا جو انجام دیکھا تھا، اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت، شعرا کا احساسِ ترنم، ابھی ردیف اور قافیے کے سہاروں کو ترک کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن اِس دَور میں بے قافیہ نظم نہ صرف مقبول ہو رہی ہے، بلکہ اس میں چند ایسی اصطلاحی خصوصیات بھی نشو و نما پا رہی ہیں، جو اس میں شک نہیں کہ پہلے پہل، مغربی شاعری سے در آمد کی گئیں، لیکن رفتہ رفتہ، وہ زبان کے مزاج سے ہم آہنگ ہوتی

جارہا ہے۔ اس طرح ہماری شاعری، مشرق اور مغرب کے ظہورِ شعریہ کے متوازی، ایک نیا اور اپنا انفرادی راستہ بنائی جارہی ہے، جو اپنی ترقی یافتہ صورت میں اردو شاعری کی فنی خصوصیت سمجھا جائے گا۔

موجودہ شاعری میں، بعض خاص خاص موضوعات کی حد تک تو اردو، بلکہ تقلید کا شائبہ ضرور پیدا ہوگیا ہے، جن میں، افلاس، بھوک، قید، امراض، مزدور، کسان، سرمایہ داری وغیرہ کا ذکر بطور مثال کیا جاسکتا ہے؛ اس میں کچھ تو سیاسی تحریکات کا اثر ہے، اور کچھ اس لئے کہ یہ ایک شعری "وضعداری" اور "مسلک" سا بن گیا، جس کے پیرو، تقریباً تمام نوجوان شاعر اور دو ایک جہاں دیدہ سخن سنج بھی ہیں، جس طرح غزل گوئی کا قدیم شاعر، مضمون پر مضمون گھڑنے پر فخر کرتا تھا، اسی طرح آج کا شاعر بھی غالباً یہی سمجھتا ہے کہ جب تک وہ اس زمرے کے موضوعات پر قلم نہ اٹھائے، ترقی پسندی کی سند پا ہی نہیں سکتا۔

عشق و محبت کا جادو اب بھی بول رہا ہے اور شاید سر چڑھ کر بول رہا ہے، لیکن اس سلسلے میں جو بات بنیادی ہے وہ یہ ہے کہ، موجودہ شاعری میں رسمی حسن پرستی کا شائبہ بہت کم ہوگیا ہے، نوجوان شاعر عشق و محبت کے جذبات کے اظہار میں، رمزیت، اشاریت اور استعاروں کے قدیم تو بر تو پردوں کو چاک کرنے پر تلا ہوا ہے، ممکن ہے کہ نئے دبستاں کے شعرا کے ابین یہ چیز بعض وقت رسمی معلوم ہو، لیکن ہم کو جگہ جگہ ایسے نمونے بھی نظر آجاتے ہیں، جہاں شاعر کی فکر، پاک اور معصوم محبت اور کبھی کبھی حسنِ ماورا کے سراپردۂ آستاں تک پہنچتی دکھائی دیتی ہے، اور کہیں کہیں رازِ درونِ پردہ کی جھلک بھی دکھائی پڑتی ہے۔ اصلی اور نقلی جذبات کی یہاں بھی گنجایش ہے، لیکن کام کی بات اس سلسلے میں دیکھنے کے قابل یہ ہے کہ موجودہ شاعر، عشق و محبت کے جذبات کے اظہار میں، کسی طرح کی ذہنی پیچیدگی میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا۔ وہ دن کو دن اور رات کو رات کہنے پر مصر ہے۔ چنانچہ عاشقانہ اور رمزیہ شاعری میں، قدیم اور جدید دور کے شاعر بھی، معشوق کا اتا پتا بتانے سے گریز کرتے تھے، موجودہ شعرا نے، وہ رسم توڑ دی ہے، اور بعض تو شاید اس رو میں دور تک بہے چلے جارہے ہیں

ان تحریکات میں، جو نوجوان شعرا کی مساعی کا محور بنے ہوئے ہیں، یہ تحریک شاید، سب سے زیادہ دوررس نتائج کا باعث ہوگی کہ انھوں نے اسالیب شعر کو وسعت دے کر، اس خیال کو عملی جامہ پہنا دیا ہے کہ اردو اور ہندی دو مختلف زبانیں نہیں، بلکہ ایک ہی زبان کے دو مختلف اسالیب ہیں۔ صلح و آشتی پسندی جس کی شاعر سے توقع کی جاسکتی ہے، اس کا یہ ایک نہایت مستحسن اشارہ اور اقدام ہے۔

نئی تحریکات میں شعر کی ہئیت، سب سے زیادہ نمایاں چیز ہے۔ موجودہ شاعری کا یہ وہ پہلو ہے، جو سب سے زیادہ معرکتہ الآرا بنا ہوا ہے۔ نظم کی اصناف میں آزاد نظم، موجودہ عہد کی گویا خصوصیت بن گئی ہے، جو قدیم دبستاں والوں کو ایک طرح کی دخیل چیز معلوم ہوتی ہے۔

جدید دور کے آغاز میں اردو شاعری نے اصلاح کا جو قدم اٹھایا تھا، وہ بظاہر موضوعات کی توسیع تک محدود رہا، لیکن ضمنی طور پر ایک بنیادی فرق قدیم اور جدید دبستانوں میں یہ بھی نمایاں ہوا کہ قدیم دور کی زیادہ تر محاورے، روزمرے اور صنائع بدائع کی نگہداشت کی شاعری کے مقابلے میں، جدید دور کی شاعری مطالب اور معانی پر زیادہ متوجہ رہی۔ موجودہ دور میں مطالب اور موضوعات کی بھی چھان بین شروع ہوئی اور فنی اعتبار سے نئے نئے تجربے شروع ہوئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ گزشتہ نصف صدی کے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مدرسۂ محمود گاواں بیدر کی تباہی

جب دولت بہمنیہ تباہ ہوگئی اور شاہان بریدیہ کا تسلط قائم ہوا تو ہمسایہ سلطنتوں کی لشکر کشی کے اندیشہ سے دار السلطنت بیدر کے گرد حصار کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ تنگ جا کے میسر آنے کے باعث علی برید شاہ فرمانروائے بیدر نے کل امرائے دولت اور مشائخین و معززین کو جمع کرکے دریافت کیا کہ آیا زندوں کی حفاظت ضروری ہے یا مردوں کی۔ سبھوں نے کہا کہ حفاظت تو زندوں کی کی جائے۔ علی برید مطالب کا جواب پاکر ایک فتوے پر سب کے دستخط لے لئے اور عام طور پر جس قدر عظیم الشان عمارتیں، رفاہ عام کے ایوانات ... گنبدیں اور قصر تھے سب کو توڑ کر فصیل، حصار و برج تعمیر کئے گئے۔ مدرسۂ محمود گاواں سے متعلق جو عمارتیں تھیں وہ بھی توڑ دی گئیں صرف مدرسہ اس صدمہ سے بچ گیا

عہد بریدیہ میں شاہان بیجاپور، احمد نگر و گولکنڈہ کی شورشوں سے مدرسہ کی موقوفہ جائداد میں دست درازی شروع ہوئی اور اکثر جاگیرات جو اس جنگ و جدل کے رقبے میں تھیں ان سے ہمسایہ سلطنتوں نے متمتع ہونے نہ دیا۔ رفتہ رفتہ سلطنت بریدیہ کا رقبہ اس قدر محدود ہوگیا کہ اس کے زیر نگیں صرف دو تین ضلع اور کوئی چار ہزار فوج رہ گئی۔ دارالسلطنت بیدر سے وہ اگلی شان و شوکت مفقود ہوگئی اور اطراف و اکناف سے اہل غرض کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ بیسیوں گھر ویران ہوگئے۔ اس طرح شہر کے ساتھ مدرسہ بھی ویران ہوگیا فرمانروایان بیجاپور کا بیدر پر قبضہ ہونے کے بعد قلعداری ہو تقریباً ۱۰۲۰ھ تک اس کی افتادہ حالی کا یہی عالم رہا (نائب سلطنت کا سلسلہ شروع ہوا) یہاں تک کہ علی عادل شاہ ثانی کے زمانہ میں ملک مرجان مختار الملک والا جاہ نے بیدر پر عادل شاہیہ قلعداری ... رہی سہی جائداد کو بھی سلطان کی بیگم ملکہ پری بانو کے ذاتی اخراجات کی شق میں شریک کردیا۔

۱۰۶۶ھ تک عادل شاہیہ کی قلعداری رہی۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی نے ۱۰۶۷ھ میں بیدر فتح کیا، مدرسہ کی بے کسی اور بربادی سے سخت متاثر ہوکر اس کی درستی اور تعمیر کا انتظام فرمایا اور حکم دیا کہ پچھلی حالت پر لانے کی کوشش کی جائے۔ متعدد صوبہ داران عالی مقام اور حکام وقت مثلاً نواب افتخار خاں بہادر عالمگیری، مختار خاں رنجی، سبزواری نواب ابوالفخر خاں اور نواب قلندر خاں نے اس کو اصلی حالت پر لانے کی ہر ممکنہ کوشش کی اور اس میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ ۱۰۸۰ھ کے دورۂ دکن کے زمانہ میں شہنشاہ عالمگیر غازی نے بیجاپور کے نامور عالم اور مقتدا بزرگ حضرت نائب رسول اللہ مولانا صبغۃ اللہ مدنی کے جانشین مولوی سید محمد معین کو منتخب فرماکر مدرسۂ محمودیہ کا امام المدرسین مقرر کیا۔ مدرسۂ محمود گاواں میں مولوی صاحب نے اشاعت علوم کی کوشش شروع کی ان کے علم و فضل کی شہرت سن کر دور دور سے طالبانِ علوم و فنون آ آکر حلقۂ تلامذہ میں شریک ہونے لگے۔ اس زمانے کے تعلیمی کورس میں ادب کی بڑی اہمیت تھی۔ یہ سلسلہ کم و بیش ۱۱۰۰ھ تک جاری رہا۔ ۱۱ رمضان المبارک ۱۱۰۷ھ کو جلال الدین قلعدار کے زمانہ میں بجلی گرنے سے اس مدرسہ کے جنوب و مشرق کے حصہ کی عمارت منہدم ہوگئی۔ یہ بھی ایک حکمت الٰہی ہے کہ جلال الدین محمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں مدرسہ کی عمارت بنی تو دوسرے عالم جلیل الدین صوبہ دار کے زمانہ میں منہدم ہوئی۔ مدرسہ منہدم ہونے کے بعد عالمگیری درس و تدریس کا انتظام درہم ہوگیا۔ عہد مغلیہ کے خاتمہ پر ملک کی حالت بد سے بدتر ہوگئی تھی سارے امرا اپنے اپنے علاقوں کے انتظامات کرنے اور آئے دن کی شورشوں کو مٹانے میں لگے ہوئے تھے۔ دکن کا بہت سا حصہ نواب قمر الدین خاں بہادر

آصف جاہ اول بانیٔ خاندان آصفیہ کے قبضہ میں آچکا تھا۔ بیدر کے عالمگیری قلعدار واصل خاں کو قلعداری سے معزول کرکے اور جہانگیر کی جاگیر دے کر نواب آصف جاہ اول نے نواب میر کلان خاں بہادر کو بیدر کی قلعداری عطا کی ۱۱۵۲ھ تک بیدر پر شہنشاہ دہلی کی طرف سے قلعدار و حکمران مقرر ہوتے رہے۔ اس کے بعد آصف جاہی قلعداری کی عملداری شروع ہوئی۔ اس زمانہ میں تعلیم و تعلم کا کوئی باقاعدہ انتظام نہیں تھا اس لئے نواب مختار الملک سر سالار جنگ بہادر کے زمانۂ وزارت تک مدرسہ کھنڈر بنا رہا اور جس قدر پتھر، چونا اور اینٹ کا انبار تھا اس کو عوام لے جا لے جا کر اپنے مکانوں کی تعمیر میں لگاتے رہے۔ تعلیم کی جانب جب نواب سر سالار جنگ بہادر کی توجہ مبذول ہوئی اور اضلاع میں مدرسین مقرر کئے گئے تو بیدر میں بھی اسی مدرسۂ محمود گاواں میں حافظ غلام مصطفیٰ صاحب اول تعلقدار کے زمانہ سے نواب منصور یار جنگ بہادر کی تعلقداری تک (۱۳۰۱ف تک) فارسی درس ہوتا رہا۔ ۱۳۰۹ف میں مولوی اکرام الدین خاں صاحب اول تعلقدار کے زمانہ میں مدرسہ فوقانیہ کی جدید عمارت علی باغ کے حوض پر تیار ہوئی اور مدرسہ اس میں منتقل ہوگیا۔ مدرسۂ محمود گاواں کی عمارت پھر کس مپرسی کی حالت میں رہی ۱۳۰۹ف کے قحط میں مدرسہ دو تین سال تک لاوارث، یتیموں کا وارڈ بنا رہا۔ اس کے بعد مدرسہ پھر چمگادڑوں کا گھر بن گیا اور ۱۳۲۲ف تک کم و بیش اسی حال پر رہا۔

اعلیٰحضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصف جاہ سابع فرمانروائے دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے زرین کارناموں میں سے محکمہ آثار قدیمہ کا قیام بھی ایک زرین کارنامہ ہے کہ اس سے ازمنۂ ماضیہ کے آثار کی حفاظت، ان کی ترمیم اور داغ دوزی ہونے لگی۔ ۱۳۲۴ف سے اس مدرسہ کو محکمہ آثار قدیمہ نے اپنی زیر نگرانی لیا ۱۳۲۸ف میں ہزار ہا روپے کے صرفہ سے ترمیم کرکے اندر کے حصہ کو پاک و صاف کیا گیا اور صحن میں جو اینٹ، چونہ پڑا ہوا تھا اس سے منہدمہ حصہ کا پایہ درست کرکے اسی پر چار چار فٹ اونچی دیوار بنائی گئی اور اوپر کی منزلوں کے دونوں حصوں میں دروازے لگا کر مقفل کر دیا گیا ہے۔ ۱۳۴۵ف میں مدرسہ کو سنگ بستہ دیوار سے محصور کر لیا گیا۔ غرض محکمہ آثار قدیمہ کی توجہ سے اتنا ضرور ہوا کہ اب اس ویران مدرسہ میں کسی قدر رونق آچکی ہے۔

سید محمد (بیدری)

تاریخ گولکنڈہ :- حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقا، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں، علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم، نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔

تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ بڑی سائز سوا تین سو سے زیادہ صفحات قیمت ہے

کنول رانی کے نام ———

معلوم نہیں کیوں میں نے رانی سے کہہ دیا۔ "رانی تم واقعی پیاری ہو۔ بالکل ہندی افسانوں کی ہیروئن۔" یہ سن کر جب رانی کے چہرے پر گلال چھلکنے لگا تب خیال آیا کہ میں نے کیا کہہ دیا۔ کتنی بڑی بات۔ جانے کیوں میں نے یونہی کہہ دیا۔ زندگی کی بعض حماقتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ہمیشہ ہمیشہ ہم انہیں سوچ سوچ کر پشیمان ہوا کرتے ہیں۔ رانی کو ایک زمانہ سے میں دیکھ رہا تھا۔ جوہی کی بیل سے زیادہ نازک، اور بیلے کی پھولوں سے لدی ڈال کی طرح لچک دار رانی۔ یوں تو میں نے ہزاروں ہی لڑکیاں دور اور نزدیک سے دیکھی تھیں اور ان میں سے کوئی ایک مجھے پسند بھی تھیں لیکن رانی کی بات ہی اور تھی۔ اس کے کنول رنگ میں ایک عجیب اداسی گھلی ہوئی تھی اور آنکھوں میں ایک مایوس چمک کہ دیکھنے والے کی نگاہیں اس پر پڑتیں تو جذب ہو کر رہ جاتیں۔ اس کے چہرے پر ہی ٹھٹک جاتیں اور وہاں سے انہیں لوٹنا مشکل ہو جاتا۔ اس کا حسن مثالی حسن تو نہیں کہ میں اس کی آنکھوں کو نرگس، شہلا، اس کے ہونٹوں کو گلاب کی پنکھڑیاں، اس کے گالوں کو چاند اور سورج اور اس کی باہوں کو کنول کے ڈنٹھل کہہ سکوں۔ نہیں اس میں ایسی کوئی بات نہیں۔ عام لڑکیوں کی طرح وہ بھی ایک سیدھی سادھی لڑکی ہے۔ کوئی غیر معمولی لڑکی نہیں۔ ہاں جسم میں لچک ہے اور آواز میں لوچ۔ بناوٹ نام کو نہیں۔ اور میں ——— میں ہی کیا اسے ہر دیکھنے والا دیکھتا اور شاید یہی سوچتا رہ جاتا ہے کہ اس کی آنکھوں کی مایوس چمک میں زیادہ کشش ہے کہ اس کے چہرہ کی چمکیلی اداسی میں۔ کتنی عجیب سی بات ہے۔ لیکن اسے دیکھ دیکھ کر یہی خیال پیدا ہوتا ہے اور میں اب تک کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ اگر یہ تو میں نے صرف سوچا ہی تھا۔ کبھی کہنے کا ارادہ نہیں تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن میں اس سے ایک ایسی افسانوی بات کہہ دوں گا۔ مجھے اس کا ہرگز افسوس نہیں کہ میں نے اس کے حسن کو سراہا کیوں لیکن اس دن میری بات سن کر اس کا خجل ہو جانا واقعی افسوس کے قابل تھا۔ اس نے خیال کیا ہوگا کہ میں اس کے حسن سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں اور جو کچھ میں نے کہا وہ میرے دل کی آواز تھی ——— دل کی آواز کیا ہوتی ہے۔ یہی شاید محبت جسے کہتے ہیں۔ واللہ مجھے اس سے محبت نہیں۔ میں اس قسم کے اداس سراپا سے متاثر ہو کر اس کے بارے میں سوچتا ضرور ہوں لیکن اسے محبت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میری آنکھوں میں تو وہ اور ہی آنکھیں بسی ہوئی ہیں —— سوئی سوئی ٹھنڈی آنکھیں جن میں کوئی طویل اور میٹھا خواب گھلا ہوا ہے۔ جو شاید ہمیشہ سوئی سوئی ہی رہیں گی۔ کبھی نہ جاگیں گی۔ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے دیکھنے والے کی طرف نہ دیکھیں گی ——— اور ان دو سوئی آنکھوں کے نیچے دو سرخ اور شاداب ہونٹ مسکراتے رہتے اور مجھے خیال ہوتا کہ ان میں جتنا شہد ہے وہ جنت میں بھی نہ ملے گا —— رانی کی آنکھوں میں یہ بات تھی نہ ہونٹوں میں۔ اس کے ہونٹ تو خنک تھے بھیگے ہونے کے باوجود خنک سے لگتے۔ ان میں حلاوت اور نشہ میں نے کبھی محسوس نہیں کیا۔ پھر میں رانی سے کیسے محبت کر سکتا ہوں۔ کاش میں نے وہ الفاظ نہ کہے ہوتے۔ کاش اس نے ان کا غلط مطلب نہ سمجھا ہوتا۔

وہ محبت کے ناقابل تو نہیں لیکن میں اس کے لئے نہیں بنا۔ اس سے کوئی اور بھی تو محبت کرتا تھا۔ کمار۔ کمار میرا دوست تھا۔ اسی نے بار بار رانی کی باتیں کر کے، اس کے حسن کے گیت گا کے مجھے ادھر متوجہ کیا تھا۔ ایک دفعہ یوں ہی ہم دونوں میں بات ہونے لگی۔ ہم دونوں جب ملتے تو دنیا کا کوئی موضوع سخن باقی نہیں رہ جاتا۔ ایک دن یوں ہی حسن کی بات ہونے لگی۔ میرا خیال تھا کہ آج تک میں نے حسن کو ایک ہی آدمی میں مکمل نہیں دیکھا۔ کسی کی کوئی چیز اچھی ہوتی ہے کسی کی کوئی اور حالانکہ کی

گردن کی تراش بڑی نازک ہے۔ حسنی کے ہاتھ خوبصورت ہیں، نفیس کی آنکھیں پیاری ہیں، توشیل کماری کی کمر، نیلو کے بال اور رانی کے پھڑکتے ہوئے ہونٹ۔ اس قسم کی تنقید کرنے سے ہمارا مقصد عیاشی نہ تھا۔ ہم دونوں بڑے شریف انسان تھے۔ ہم فلسفیوں کی سنجیدگی کے ساتھ ان کو پرکھتے تھے اور بعض اوقات آپس میں بحث بھی ہونے لگتی، مجھے جو ادا نازک معلوم ہوتی کمار اُسے بھدا سمجھتا۔ گھنٹوں سنجیدہ بحث ہوتی لیکن ذاتی دلچسپی کسی میں ہمیں محسوس نہ ہوئی۔ ہاں میں اُن ان دیکھی سونی سونی آنکھوں سے متاثر ضرور تھا جنھیں میں نے کبھی نہ دیکھا تھا لیکن پھر بھی ہمیشہ دیکھا کرتا تھا۔ جو ہمیشہ مجھے جانی پہچانی لگتی ہیں۔ کمار اس بات پر مجھے بنایا کرتا کہ میں جاگتے میں خواب دیکھا کرتا ہوں وہ خوابوں کا نہیں حقیقت کا قائل تھا اور اسی وجہ رانی کے متعلق خیال آرائی کرتا رہتا۔

ایک دن رانی ہمارے قریب سے گزری، اچھی سے اچھی ساری بھی وہ بڑی لاپروائی سے باندھتی، بال بنانے کا انداز بھی اسے نہ آتا اور یوں اپنے آپ کو بالکل اداس بنالیتی۔ کمار کچھ دیر تک تو اس کا نگاہوں سے پیچھا کرتا رہا پھر بولا "یار سچ کہتا ہوں اگر میں اپنی مرضی کے موافق اس کو سنواروں تو ہندی افسانوں کی ہیروئین لگے گی۔ سارے کالج میں کوئی مقابلے کی نہ نکلے پھر —— "

بات ہوئی بھی اور ختم ہوگئی۔

اس دن مولسری کے پیڑ کے نیچے میں کھڑا نفیس کا انتظار کر رہا تھا۔ رانی بھی لجائے جسم چرائے وہیں آکر کھڑی ہوگئی۔ میں بلا ارادہ اسے غور سے دیکھتا رہا اور خواہ مخواہ بغیر اپنے الفاظ اور ان کے معنی پر غور کئے میرے منھ سے نکل گیا "رانی تم واقعی اچھی ہو۔ بالکل ہندی افسانوں کی ہیروئین"۔ مجھے شاید یاد نہیں رہا کہ میں کمار سے نہیں رانی سے کہہ رہا ہوں اور یوں کہہ رہا ہوں جیسے اس سے دلی لگاؤ ہے۔ رانی کے چہرے پر سرخی سمٹ آئی۔ گردن جھک گئی اور اس کے ہونٹ بھیگے ہونے کے باوجود سوکھے سوکھے معلوم ہوئے۔ تب مجھے پتہ چلا کہ میں نے بڑی بے جا بات کہہ دی۔ اب میں اسے مفہوم سمجھا بھی تو نہیں سکتا کہ بات اور بری نہ ہو جائے۔

اس کے بعد ایک دن ونود کے ہاں وہ دعوت میں ملی اور جوں ہی مجھ سے نگاہیں چار ہوئیں گلابی ہوگئی۔ مجھے بھی اپنی حماقت یاد آگئی۔ اس نے شاید شیل کماری اور نفیس سے اس کا ذکر کیا تھا۔ باقاعدہ لڑکیوں میں بحث ہوتی رہی اور اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلا کہ میں دل ہار بیٹھا ہوں۔ ونود کے ہاں موقعہ پاتے ہی ساری لڑکیوں نے گھیر لیا۔ نفیس نے پوچھا "بتائیے آپ نے یہ سب کیوں کہا تھا؟" میں اس کا جواب کیا دیتا۔ میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ میں نے کہا "بھئی یہ اچھی ضرور ہیں۔ لیکن وہ ہیروئین والا جملہ کسی اور کا تھا اور یوں ہی میرے منھ سے نکل گیا"۔ لڑکیاں بھلا میری بات کیوں ماننے لگیں!

نیلو بولی "آپ اپنے جذبات کے اظہار کے لئے "اور" کی آڑ کیوں لیتے ہیں" میں بے بس ہوگیا کہنا پڑا کہ "سنئے "کسی" نے کہا تھا کہ انھیں اگر ان کی پسند کے موافق سنوارا جائے تو یہ ہندی افسانوں کی ہیروئین لگیں گی"۔ شیل یوں ہنسنے لگی گویا اسے ہمدردی ہو مجھ سے۔ وہ سمجھی میں بات بنا رہا ہوں۔ میں کھسیانا ہوگیا۔

حسنی آنکھ مار کر بولی "اچھا اچھا کسی اور کی پسند بیان کرو، تاکہ ہم اسے اسی ڈھنگ سے سنوار کر ہیروئین بنادیں"۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ آخر میں نے کہہ دیا "کہو تو ان سے پوچھ کر بتادوں!" —— سب ہنسنے لگے گویا میں جان جان کر جھوٹ بول رہا ہوں۔ ان کی غلط فہمی دور کرنا تو میرے بس کی بات نہ تھی۔ آخر انھوں نے وعدہ لے کر ہی چھوڑا کہ میں دوسرے دن ضرور پوچھ کر بتادوں گا۔

دوسرے روز کمار سے کچھ بحث ہونے لگی اور مجھے

یاد آگیا۔ ہم نے اپنی مصیبت کا سارا حال کہہ سنایا کہ کس طرح رانی کو وہ چاہتا ہے اور الزام میرے سر ہے —

سن کر وہ ہنستا پھر بولا ——— "بات تو ٹھیک ہے۔ اسی طرح ایک بار تو میں اسے ہیروئن بنا دیکھ لوں گا — سن اس کے پاس ایک سرمئی رنگ کی سلک کی ساری ہے جس پر چوکور نقش بنے ہیں۔ وہ ایک دن ڈھنگ سے پہنے دیکھی اونچی آستینوں کا چست پھنسا پھنسا بلاؤز پہنے کانوں میں نئی وضع کے ٹاپس، بال اچھی طرح بنائے کہ پیشانی نمایاں ہو اور ان میں پھول سجائے، کلائیاں بھر بھر چوڑیاں پہنے، ماتھے کی بندیا کچھ نمایاں ہو۔ گلے میں وہ زنجیر ڈالے جو وہ پہلے پہل پہنا کرتی تھی۔ بس اور ہاں وہ ساری اس قدر پہنے کہ آنچل کو لہرانے دے۔ بس ایک دن صرف ایک دن —" میں یہ سب کچھ سن کر ہنس پڑا۔ کمار کو کس قدر تفصیلات یاد تھیں۔ مجھے عورت تو یاد رہتی ہے اس کا لباس اور دوسری ذیلی باتیں یاد نہیں رہتیں۔ یہ باتیں سن کر میں نے سوچ لیا کہ لڑکیوں کو یونہی ٹال دوں گا بھلا یہ باتیں بھی ان سے کہنے کی ہیں۔

مگر تو کیجیے جو یہ حوا کی بیٹیاں مان جائیں کبھی۔ بات کہہ کر یہ کبھی نہیں بھولتیں۔ لائبریری کے برآمدہ میں لڑکیوں کی فوج کھڑی تھی۔ میں بری طرح گھر گیا۔ اکیلا تھا اس لئے گھبرا گیا۔ آخر مجبوراً رک رک کر مجھے بتانا پڑا کہ وہ "سرمئی رنگ کی دھاری دار ساری پہنے، بالوں میں پھول سجائے۔ چست اٹھی ہوئی آستینوں کا بلاؤز پہنے کہ مانو کندھوں پر دو کبوتر بیٹھے ہیں۔ کانوں میں ٹاپس، کلائیوں میں چوڑیاں آنچل لہراتا رہے۔" میں تو کسی ادبی جلسہ کی روئداد ایک سانس میں سنا گیا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو سب کی سب بری طرح ہنس رہی ہیں۔ ان سب کے پیچھے میں نے رانی کو دیکھا۔ سمٹی سمٹائی لجائی ہوئی کھڑی تھی۔ گال زیادہ گلابی ہو گئے تھے۔ جھکی جھکی آنکھوں کی اداسی اور زیادہ چمک گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں کے کونوں میں دبی دبی کوئی چیز ابھری اور رک گئی ———

مجھے میرے اپنے ہونٹ جلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں پلٹ پڑا۔

شیلا نے مجھے روک لیا اور کہنے لگی "اچھا ہم رانی کو بنا سنوار کر ہیروئین بنا دیں گے۔ لیکن ہمیں کیا ملے گا۔ چاکولیٹ کھائے بہت دن ہو گئے۔ وعدہ کرو تو ہم سفارش کریں۔" "بھئی مجھے سفارش کی ضرورت نہیں اور نہ یہ میری خواہش ہے تو تمھیں چاکولیٹ کھلاؤں۔" تو اس نے کہا "اچھا تو کسی اور سے کہہ دیجیے کہ کھلا دیں۔" میں جھنجلا کر بول اٹھا "بھئی میں اب زیادہ سفارت کا فریضہ انجام نہیں دے سکتا مجھے چھوڑ بھی دو۔" ایک قہقہہ پڑا اور میں نے دیکھا کہ ان ہنسی سے سرخ سرخ لڑکیوں کی فوج کے پیچھے سے دو مسکراتی اداس آنکھیں ایک لمحہ کو اٹھیں پھر نیچے جھک گئیں۔ شاید انھوں نے کچھ کہا بھی تھا میں نے سمجھا نہیں یا اگر سمجھا تھا تو بھول جانا چاہتا ہوں۔

جب ہنسی ختم ہوئی تو ساری کا معاملہ پھر سے شروع ہوا۔ کونسی ساری؟ کیسی تھی وہ؟ واللہ مجھے خود اس ساری کا رنگ یاد تھا نہ وضع۔ میں کیا تفصیل بتاتا۔ میں نے کبھی بھی اس کی ساری سے محبت نہیں کی تھی۔ جب ہر لڑکی باری باری بول چکی تو آہستہ سے کسی کی آواز آئی۔ معلوم نہیں ہمیشہ اس میں اتنی موسیقیت رہتی ہے یا نہیں مگر اس وقت مجھے یوں لگا کہ دور بہت دور کسی ٹھنڈی جھیل کے کنارے پھولوں میں گھرا ہوا کوئی پپیہا چپکے سے "پی" بول اٹھا۔ رانی بولی "اس ساری پر میں نے دوسرا رنگ چڑھا دیا — اور وہ زنجیر بھی ٹوٹ گئی" ——— وہ ایسے کہہ رہی تھی جیسے اسے واقعی افسوس ہو۔ معصوم رانی۔ بھولی بھالی لڑکی! ان شریر لڑکیوں کی بات کو حقیقت جان رہی تھی۔ کاش اسے کاش اسے معلوم ہوتا کہ یہ میرے دل کی نہیں کمار کے دل کی آواز ہے۔ میں نے تو صرف ترجمانی کی تھی۔ خیال اس کا زبان میری۔ اب میں کیسے سمجھاؤں؟

میں جانے مڑا ہی تھا کہ نیبو نے روک لیا "کہاں چلے ہیں جناب؟ لائیے ساری تحفہ دیکھیں اور دوسری چیز مہیا کرنے روپئے نذر دیجئے۔ اب آپ یوں سستے نہ چھوٹیں گے۔"

"میں گھبرا کر بولا" بھئی میں کب انھیں بنا سنورا دیکھنا چاہتا ہوں جو ساری تحفہ دوں"۔ ـــــــ وہ لڑکیاں سمجھ رہی تھیں کہ میں واقعی رانی کو چاہتا ہوں۔ وہ سب ہنسنے لگیں۔ حسنی بولی "بڑے معصوم بنتے ہیں آپ۔ بہت بوچھا کسی اور کی آڑ میں شکار چھپے رستم ہیں بتا نکالئے روپے۔ چاکولیٹ کھائے بھی بہت دن ہوگئے۔"

میں نے دل ہی دل میں گڑگڑا کر دعا مانگی " اے خدا تو مجھے بچائے۔ یہ کیسی حماقت ہوئی ہے مجھ سے۔ کیسی منحوس گھڑی تھی جب میں نے اسے ہیروئن بنایا تھا۔ اے اللہ میں کیا کروں" میں نے ہمدردی کے لئے نفیس کو دیکھا۔ مگر وہ خود بھی ہنس رہی تھی مجھے بنا رہی تھی۔ جب میں بڑی مشکل سے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا تو میری عجیب حالت تھی۔ برسات کے اس ٹھنڈے بھیگے موسم میں، میں پسینہ میں ڈوب گیا۔ بال پریشان، ہونٹ خشک اور جب میں نے موسری کے جھنڈ میں پناہ لی تو میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایسا کہ یوں کبھی نہ دھڑکا تھا۔ دو۔ مجھے کمار آتا ہوا دکھائی دیا

میرے سینے میں دل خون ہوگیا اور بوند بوند آنتوں میں ٹپکنے لگا۔ اندر ہی اندر میں خوف کھا رہا تھا کس سے؟ رانی سے! کمار سے یا پھر اپنے آپ سے! میں سمجھ نہ سکا۔

اور اب بھی جب رانی کہیں ادھر ادھر مل جاتی ہے اور ایک لمحہ کو ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوتی ہیں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ آسمان کی بلندی پر کئی ستارے آپس میں ٹکرا گئے اور ان کی چنگاریاں میرے جسم میں پیوست ہوگئیں رانی کا سر جھک جاتا ہے۔ چال میں زیادہ لچک پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے اداس چہرہ پر مایوس شفق پھوٹنے لگتی ہے۔ وہ آخر کیا خیال کرنے لگی ہے۔ اور میرے ذہن میں دو سونی سونی آنکھیں ابھرتی ہیں۔ شاداب ہونٹ مسکرا اٹھتے ہیں اور میں چونک کر آپ ہی آپ کہتا ہوں "میں نے یہ کیا کیا ـــــــ رانی سے مجھے محبت تو نہیں"ـــــ معلوم نہیں کیوں میں نے رانی سے یوں ہی کہہ دیا تھا کہ تم ......"

زینت ساجدہ

رات کا بھولا اور دیگر افسانے:۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے۔ ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو، فارسی وعربی مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں مثلاً دنیائے افسانہ اور کردار افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ اس کتاب کا ٹائیٹل ملک کے بلند پایہ حسن کار مسٹر عبدالقیوم نے بنایا ہے۔ طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات ۱۶۸ قیمت عہ

من کی دنیا۔ حیدرآباد کے نوجوان افسانہ نگار رشید قریشی ایم اے کے افسانوں کا نفیس مجموعہ ہے۔ افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں۔ کتاب بہت دلچسپ اور انداز بیان نہایت شگفتہ ہے۔ ہر فسانہ رعنائی خیال اور رنگینی بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو کے نئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور ترقی پسند نظریوں کے پرستاران افسانوں کے مطالعہ سے ضرور محظوظ ہوں گے۔ صفحات (۱۶۰) قیمت مجلد عہ

جدید اُردو ادب میں عورت کا مقام

مرد جذباتی انتہا پسند ہوتا ہے۔ عورت کے بارے میں
اس کی انتہا پسندی بعض اوقات حد اعتدال سے گزر جاتی ہے۔
کبھی اس کے قلم سے عورت کی اتنی تعریف و توصیف نکلتی
ہے کہ وہ اسے "ماتا دیوی" اور "حور" جیسے پاکیزہ ناموں
سے یاد کرتا ہے اور کبھی "طوائف" "کسبی" اور "پیشہ ور"
جیسے نام دیتا ہے۔ عورت نے زندگی کی تصویر میں اپنے وجود
سے رنگ بھرا ہے اور مرد اسی تصویر کو دیکھ کر جیتا ہے۔ اسی
عورت کے لئے وہ سب کچھ کرتا ہے، کر رہا ہے اور کرے گا۔ جو کچھ
ہوا، ہو رہا ہے اور ہوگا وہ "ایک عورت" کے لئے ہوا، ہو رہا ہے
اور ہوگا۔ عورت نے مرد کے افسانۂ حیات کو مکمل کیا اور یہ افسانہ
زبانوں سے نکلا، صفحۂ قرطاس پر رقم ہوا اور ہوتا رہے گا۔ ادب،
آرٹ اور فن اسی عورت کے اطراف گھومتے رہے ہیں اور
گھومتے رہیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک زمانہ
کسی خاص قسم کے عمل کا ہوگا تو دوسرا ردِ عمل کا اور یہ عمل
و ردِ عمل کا سلسلہ جب تک دنیا باقی ہے، اس میں مرد و عورت
کی زندگیوں کا وجود باقی ہے باقی رہے گا۔

ادب زندگی کی تصویر ہوتا ہے۔ زندگی داخلی اور
خارجی اثرات کے دباؤ سے ادلتی بدلتی رہتی ہے اسی لئے
ادب ان تمام ذہنی، احساساتی اور نظریاتی تغیرات کی عکاسی
کرتا ہے جو زندگی کو نئے نئے سانچوں میں ڈھلتے رہتے ہیں
اور جن کا تعلق براہ راست شعوری بہاؤ سے ہوتا ہے۔
ادب خواہ برائے ادب ہو کہ برائے زندگی دونوں صورتوں میں
زندگی سے متعلق ہوتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے میں
خیالات مسائل حیات کے نہیں بلکہ فنی لطافتوں کے گرد
گھومتے ہیں اور دوسرے میں جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے
صرف حیات اور اس کی ساری اچھائیوں اور برائیوں پر
روشنی ڈالی جاتی ہے اور ادبی، سیاسی، سماجی اور مذہبی قدروں
کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور اس کا اصل مطمح نظر ایک اعلیٰ زندگی
کی تشکیل ہوتی ہے جس کی انتہائی شکل نیٹشے، برنارڈ شاہ

کے "کامل انسان" یا (Superman)
کی بسائی ہوئی دنیا کا تصور ہوتا ہے۔ دنیا کا ادب تو دنیا جیسا
وسیع و بسیط ہے میں صرف اردو ادب اور اردو ادب میں
بھی جدید اردو ادب میں عورت کے مقام پر ایک طائرانہ
نظر ڈالوں گی کیونکہ وقت کے پر ہوتے ہیں اور میں پندرہ
منٹ جیسے قلیل عرصے میں اس سے زیادہ کی جرأت نہیں
کر سکتی۔

آج کل کے اردو ادب کے ناموں میں سب سے
زیادہ نمایاں "ترقی پسند" ہے۔ یہ "ترقی پسند ادب"
اگر بہ نظر غور دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ محض ایک ڈھونگ
ایک صریحی غلط پروپگنڈا اور صرف جنسیاتی مظاہروں کی
نمائش گاہ نہیں ہے۔ اس پر تنقید کرنے سے پہلے ہمیں
اپنے اردگرد کی زندگی پر بھی نظر رکھنی چاہئے اور ادیب
زبان، قلم سے وہی بولتا ہے، جو اس کی آپ بیتی ہوتی ہے
یا جس کا وہ مشاہدہ کرتا ہے۔ صرف اس جنگ کے
زمانے ہی سے نہیں بلکہ گزشتہ جنگ کے زمانے ہی
سے ہندوستانیوں میں اتنی بیداری پیدا ہو گئی ہے کہ وہ
اپنے سیاسی، معاشرتی، معاشی، اقتصادی اور ادبی
ماحول کی خوبیوں اور خامیوں کو سمجھنے لگے ہیں اور اگر
سمجھنے نہ بھی لگے ہوں تو کم از کم شدت سے محسوس ضرور
کرنے لگے ہیں۔ غالب کا ایک شعر ہے ؎

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزرے غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!

اور آج کل غالب کا یہ احساس اس قدر شدید ہو گیا ہے کہ
عام طور پر ادیب و شاعر یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ جیسے خدا
کچھ کر ہی نہیں رہا ہے، وہ دیکھتا سب کچھ ہے پر کرتا کچھ نہیں
اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان آزادی، امن و سکون،
اور سب سے بڑھ کر اطمینان قلب کے لئے جیسے ترس رہا ہے۔
سرمایہ دار سب کچھ رکھ کر نادار ہیں اور نادار کے تو پوچھنے ہی کیا۔

لیکن اب نادار کو اپنی ناداری کا احساس ہوگیا ہے اور سرمایہ کی اس غیر اصولی تقسیم کے خلاف وہ احتجاج کر رہا ہے۔ اس کی ایک اچھے پیمانے پر زندگی بسر کرنے کی خواہش اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ ہر "ذریعہ" کو اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ ایسی خواہش ہی کیوں پیدا ہوئی تو آپ اس محرک کو کیا کہیں گے "جو نفس امارہ" کے نام سے موسوم ہے۔ ریشم و دیبا کتنے ہی اتنے نفیس و لطیف ہیں کہ ان پر ہاتھ پھیرنے کی خواہش ہر دیکھنے والے کے دل میں پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ بات اب افسانہ بن گئی کہ "نفس" یا "دل" کو قابو میں رکھنا ضروری تھا۔ ایسے بس میں رکھنے والے جانے کس مٹی کے بنے ہوتے تھے۔ قناعت پسندی کے تصور سے جمود پیدا ہوتا ہے اور آدمی میں ہاتھ پاؤں ہلانے کی حس خاموش ہوجاتی ہے۔ اس "مشینی دور" میں انسان کو کسی آسمانی امداد سے زیادہ اپنی قوت بازو پر بھروسہ ہے زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے میں صرف عقل کی روشنی مشعل راہ منزل نظر آتی ہے۔ ایسا محسوس کیا جارہا ہے کہ مذہب و اخلاق کے اصول انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں اور بہ حیثیت انسان کے ان کو اب بھی توڑا جاسکتا ہے۔ ان میں رد و بدل ہوسکتا ہے اور انہیں ایک بلند ارتقائی شکل بخشی جاسکتی ہے، جنت و دوزخ، نرگ اور سورگ کا تصور اب دلوں سے محو ہورہا ہے، زندگی کی خوشیاں جنت اور اس کی مصیبتیں جہنم ہیں۔

عورت کی فطرت بے حد لچکیلی ہوتی ہے جس طرح پانی جس برتن میں ڈالا جائے اسی کی شکل اختیار کرلیتا ہے اسی طرح عورت جس ماحول، جس رنگ اور جن حالات میں رہتی ہے خود کو اسی کے موافق ڈھال لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذاہب عالم کی اساس اور اخلاق انسانیت کی بنیاد سچ پوچھئے تو عورت ہی کی ذات پر ٹکی ہوئی ہے۔ اس کے ذہنی اور دماغی توازن پر حیات انسانی کا دارومدار ہوتا ہے۔ جہاں یہ توازن بگڑا حیات انسانی بے بادبان کشتی کی طرح کائنات کے بحر ذخار میں ڈوبنے لگتی ہے کیونکہ کائنات کی جان مرد اسی کی گود کا پالا ہوتا ہے اسی کی گود میں افلاطون اور سقراط جیسے نادرہ کار پلے اور اسی کی آغوش میں نیرو جیسا ظالم پرورش پایا۔ یہ دونوں قسم کی اولادیں اس کے مد و جزر حیات کی مظہر ہیں وہ زمانہ گیا جب عورت پردوں میں رہا کرتی تھی، وہ اپاہج تھی، معذور تھی۔ اس میں کوئی قوت ارادی نہ تھی اس میں کوئی بیداری نہ تھی۔ اب وہ مردوں کے دوش بدوش زندگی کے میدان میں اتر آئی ہے۔ اگر کسی کو اس کی یہ آزادی ایک آنکھ نہیں بھاتی تو اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا یہ آنکھ کا اپنا قصور ہے۔ وہ آنکھ اس کے ہم دوش کی آنکھ نہیں آج سے پچاس برس پہلے کی پیدا شدہ آنکھ ہے اور اس آنکھ کی اسے کوئی پرواہ نہیں اس کی آنکھ تو دور کہیں افق پر لگی ہوئی ہے۔

آج سے پچیس سال پہلے کے اردو ادب میں اس "جمہوریت پسندی" کے جراثیم بھی پائے جاتے ہیں جو آج بہت زیادہ پھیل گئے ہیں۔ پہلے عورت نذیر احمد، رسوا، سرشار، شرر وغیرہم کے پاس گھر گرہستی، عقیل فہیم، ایک خاص نوابی آن اور شاہانہ حیثیت کی مالک تھی تو اس ربع اول کے آخر میں وہ پریم چند کے متوسط اور ادنیٰ طبقوں کی قدرے خوش حال اور رو دھو کر زندگی بسر کرنے والی اور بعض اوقات فاقے کرکے گزارا کرنے والی عورت تھی۔ لیکن پریم چند والے طبقے میں بعض ایسے ادیب بھی ملتے ہیں جو محض فن برائے فن کے قائل ہیں۔ امتیاز علی تاج کے ہاں عورت کا مقام ملاحظہ فرمائیے، انارکلی جیسی عزیز شے گم ہوگئی اور شہزادہ سلیم نے اس کے ماتم کی بجائے اپنی "شکست آرزو" کا ماتم کیا!

دور حاضر کی ابتدا بہت ہی سست سی ہے۔

عظم کولوکا، علی عباس حسینی، احمد ندیم قاسمی، سدرشن
اپیندر ناتھ اشک اور شبیر حسن، عصری رجحانات سے
متاثر ضرور ہیں لیکن ان کے افسانوں میں وہ حرکت
اور عمل نہیں جو اب چند سالوں سے میرا خیال ہے
۱۹۳۸ء کے بعد سے، پیدا ہو گیا ہے اور اس شدت سے
پیدا ہوا ہے جیسے کوئی رکا ہوا طوفان یکایک پھٹ پڑا ہو۔
ترقی پسندی اندھی حقیقت نگاری ہرگز نہیں ہوتی اس
میں مشاہدہ اور تخیل ہوتا ہے، ادب نہ صرف ہمعنان
حیات ہوتا ہے بلکہ وہ ناقد اور مفسر حیات بھی ہوتا ہے۔
یہ ادب دو حال کی تصویر اور مستقبل کے لئے "اشاریہ"
ہوتا ہے۔ ننگی حقیقت نگاری "فطرتیت" ———
(Naturalism) کی بے اثر تحریک میں
گم ہو جاتی ہے۔

جدید اردو ادب میں ۱۹۳۸ء بہت اہم ہے۔
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت تک جو مطالعہ ادیب
کرتے اور جن مسائل پر غور و خوض کرتے رہے وہ اب یکایک
ان کے علم سے نکل پڑ رہا ہے اور کرشن چندر، راجندر سنگھ
بیدی، اوپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی
احمد ندیم قاسمی، جگندر ناتھ، فیاض محمود، دیوندر ستیارتھی
اختر انصاری، اختر اورینوی، حسن عسکری اور
ممتاز مفتی اس بساط کے اہم مہرے ہیں۔ انھوں نے
نہ صرف اپنے ملک کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ادبی
زندگی کا مطالعہ کیا ہے بلکہ یورپ اور امریکہ وغیرہ دیگر
ممالک کے ان سارے مسائل کی بھی وافر چھان بین کی ہے۔
ان ادیبوں میں اکثر نے جیمس جوئز، ڈی ایچ لارنس
اور فرائیڈ جیسے موجودہ زمانے کے سب سے بڑے ماہران
نفسیات و جنسیات کا مطالعہ کیا ہے اور بعضوں نے تو
اپنی ادبی زندگی کی باگیں اسی راہ پر موڑ دی ہیں۔ یہ لوگ
جنسیات اور اس کی مختلف کیفیات کے متعلق لکھنے
ابھار اور ان کا ادعا ہے کہ جنسی مسائل ہر دور

میں پائے جاتے ہیں البتہ انھیں سائنٹیفک اصولوں
سے اب تک حل نہیں کیا گیا تھا۔ اس جنسی تعلیم کی
روشنی میں انھیں وہ اخلاقی قدریں جو انسان کو
جکڑے ہوئے ہیں بری معلوم ہونے لگی ہیں اور وہ انھیں
توڑ پھینکنے میں مصروف ہیں۔ مرد اور عورت ایک دوسرے
کے لئے بنے ہیں ان کا فطری میلان لازمی ہے بعض
معاشی اور معاشرتی پابندیوں نے ان دونوں کے
اس بندھن کو توڑا ہے اور آج عورت کی سماج کے
خلاف بغاوت انہی پابندیوں کو توڑنے کی کوشش
ہے۔ احمد عباس کے افسانہ "بارہ گھنٹے" کو پڑھئے
اور اس بغاوت کی معراج ملاحظہ فرمائیے۔ جنسیات
اور اس کے پیچیدہ مسائل کو سب سے پہلے عظیم بیگ چغتائی
نے اپنے خاص رنگ میں پیش کیا۔ متوسط طبقے......
کی لڑکیوں کی ذہنی کیفیات ان کی الڑھ پن کی شوخیاں
بے باکیاں، انھوں نے اس رنگ سے بیان کیں کہ قاری
کا ذہن اس تصویر میں فلم کا لطف لینے لگا۔ ان کے بعد
عصمت چغتائی نے عورت کو اس زمانے کی عورت کی حیثیت
سے اس کے خاص رنگ میں پیش کیا۔ عصمت کے نسوانی
کردار زندہ، چلتے پھرتے، مصیبتوں میں روتے بعض وقت
اس عالم میں بھی مسکراتے، خوشیوں میں ہنستے، خطروں
اور حادثوں کے وقت دماغوں کو استعمال کرتے ہیں۔
اخلاق و کردار کا اعلیٰ سے اعلیٰ اور بدتر سے بدتر نمونہ
اس نے پیش کیا۔ اس کے ہاں حجاب کی پریوں کی کہانیاں
نہیں۔ فرانسیسی ہیروئنوں کی بجائے "جبری" ہے اور
عالی شان، خوبصورت پائیں باغوں کی بجائے ٹوٹی
سڑی، گندی کوٹھڑی ہے۔ دادی زبیدہ، روحی اور
نسرین کی بجائے الہ بی، زہرہ، طلعت، رفیعہ اور
ریحانہ وغیرہ ہیں جو ہم سے ملتے ہیں، لڑتے ہیں، جھگڑتے
ہیں۔ ان کی شرارتوں پر جی کھولتا ہے اور پھر ان کو پیار
بھی کرتا ہے۔ ممتاز مفتی کی "آپا" اور "چچا جوباجی" ہندوستان کے

پچاس فی صد گھرانوں میں ملتی ہیں پچھلے زمانے میں اگر عورت
چلمن سے جھانک لیتی تھی تو وہ اب عصمت کی کالج کی شوخ
لڑکی اور حسن عسکری کی "حرامجادی" بن گئی ہے۔ رسوا کی
تہذیب یافتہ امراؤ جان ادا اس صنعتی دور میں منٹو کی
"ہتک" بن کر "کالی شلوار" پہن چکی ہے، عصمت نے
"لحاف" اٹھایا ہے اور اس میں سے جو "بو" آنے لگی ہے
وہ اس گندگی کا تصور ہے جو خوبصورت ریشمی لحافوں کے
نیچے دبی ہوئی ہے۔ منٹو نے "قحبہ خانوں" کا مشاہدہ کیا ہے
بقول کرشن چندر "منٹو نے زندگی کے زہرآب کو بہت قریب
سے دیکھا ہے، چھوا ہے، چکھا ہے، اور اب وہ تیز نشتر
بن کر سماج کے فاسد مادہ کو خارج کر دینا چاہتا ہے۔
ظاہر ہے کہ مریض چیختا ہے چلاتا ہے، بین کرتا ہے۔
منٹو کو اس کی پروا نہیں وہ اس قدر بے رحم ہے کہ گویا ظالم
دنیا بھی پسند نہیں کرتا" اور عورت کو یہ مقام در اصل مرد
ہی نے عطا کیا ہے، محض اپنے جرم کو چھپانے کے لئے
اس سے گریزاں ہے اس کے منہ پر انکار کر جاتا ہے کہ
وہ اس سے محض آشنا بھی نہیں۔ منٹو کے ہاں مس فریا،
مسز ڈی سلوا سے لے کر گھاٹن لڑکی تک کئی کرسچین لڑکیاں
ملتی ہیں جو آج کل خصوصاً اس جنگ کے زمانے کی "زیادہ
سو لجر اگاؤ" مہم کی خصوصی پیداوار ہیں۔ کرشن چندر
نے کشمیری عورت کی زندگی کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر کر رکھ دیا ہے۔
کشمیر صرف جنت نظیر ہی نہیں صرف چشم و نظر کی راحت
ہی نہیں اگر اسے چشم بینا سے دیکھیں تو رنگ و بو کی وہ تصویر
ہے جس کو اندر ہی اندر کیڑا کھا چکا ہے۔ اور اس خطۂ ارم
کی یہ ایک حقیقت ہے کہ اس چشمہ سے لے کر اس چشمہ تک
اور اس لاری سے لے کر اس لاری تک کئی ایک "بتیدائیں"
پھرتی ہیں اور نہ معلوم کب تک ماحول انہیں اس طرح پھرنے
پر مجبور کرے گا۔ کرشن چندر نے زندگی پر وسیع نظریں ڈالی
ہیں اور "سورج کے چابک دست ماہی گیر" کی طرح زندگی
کی اہم موضوعات کو اپنے فن اور تخیل کے جال میں سمیٹ

لیا ہے۔ چنانچہ چندرا، دنتی، سرائے کی لڑکی وغیرہ اسی کے
ایسے کردار ہیں جو بیک وقت رومانی، خوددار اور
افلاس زدہ ہندوستانی عورت کی زندگی کے علاوہ
علاوہ ترجمان ہیں۔ اس طرح اس کی فن کاری نے سماج
کے جنتی اور جہنمی دونوں رخوں کی تصویر کھینچی ہیں۔
بیدی گو کرشن چندر تک نہ پہنچے لیکن عورت کی اس کے
ہاں مکمل تصویر ہے۔ اس کی عورت کی نمایاں خصوصیت
اس کی اس حد تک ذہانت ہے جہاں خنک مزاجی پیدا
ہو جاتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی "مصبوحی"، پنجاب کی
"آتشیں گر شہاب" کا لرزاں، رقصاں اور خنداں
نمونہ ہے۔ اس کے ہاں عورت وہ بدست پنگھٹ والی
ہے جس کے کانوں کو پتلی پتلی بالیاں چومتی رہتی ہیں،
جس کی زلفوں میں گھٹاؤں کا سارنگ اور آنکھوں میں
ستاروں کی سی چمک ہے۔ جن کے چلنے میں ہواؤں کا سا انداز
ہے جس کا سینہ چھلکتا ہوا میکدہ ہے اور جس کے ہونٹ
پیمانوں کے لب! دیویندر ستیارتھی خود خانہ بدوش ہے
اس کے سارے کرداروں اور ان کی زندگیوں پر مغلئی خانہ بدوشیت
سی چھائی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک قسم
کی کشادگی "وسعت اور لاابالی پن بھی وابستہ ہے —
علی عباس حسینی نے ایسا "توفیق تنہائی" ڈھونڈ رہے
جس نے اپنے آپ کو قدامت کے شکنجوں سے چھڑا کر جدت
کی شاہراہوں پر ڈال دیا ہے۔

بقول عبادت بریلوی ان ادیبوں کے علاوہ "دوسرے
لکھنے والوں کا ایک جنگل نظر آتا ہے" جس کی زیادہ تر نمائندگی
نوجوان طبقہ کر رہا ہے۔ ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، ریاض روفی
ممتاز شیریں، ابراہیم جلیس، عزیز احمد، شکیلہ اختر، قرۃ العین حیدر
شمس آغا وغیرہ کے نام سب سے نمایاں ہیں۔ اس طبقے
میں عورتیں بہت نہ ہی کچھ زیادہ ہی نظر آتی ہیں ادبیہ
آج کل کی تعلیم دیگر ممالک کے ادبیات، یا سیاست اور
تمدن سے واقفیت کا نتیجہ ہے۔ تعلیم یافتہ عورتوں نے

ادب میں حصہ لیا اور نمایاں حصے رہی ہیں، بقول سعود زاہدی صاحب "کہیں کہیں تو جنسی عریانی میں یہ عورتیں مردوں کو بھی پیچھے چھوڑ جاتی ہیں" اور اس طرح جدید اردو ادب میں عورت اسکول مسٹریس، بھکارن، جغرافی سڑک پر کنکر توڑنے والی، مزدورنی، کا چھن، بازاری عورت، کالج کی لڑکی، مغرب زدہ فیشن ایبل عورت، دیہاتی الھڑ سادہ لوح لڑکی، بے وقوف ادھیڑ، سن رسیدہ عورت (جس کو اپنی جاتی جوانی کو سنبھالنے کا بڑا خیال ہوتا ہے) غرض مختلف حیثیتوں سے نظر آتی ہے۔ وہ پچھلے دور کی "دیویاں" اور "حوریں" اب نہیں رہیں۔ اب تو کبھی گندی نالی کی سڑاند آتی ہے کبھی گھٹیا قسم کے عطر اور سینٹ کی بو، جن سے طبیعت الجھنے لگتی ہے اور کبھی کبھی خالص فرانسیسی سینٹ کا ایک ایسا بھپکا بھی آجاتا ہے جس سے طبیعت کو فرحت سی ہو جاتی ہے۔ لیکن بعد میں گرانی سی بھی ضرور ہوتی ہے۔

جب سے غزل کی بجائے نظم کا رواج زیادہ ہوا نظموں میں محبوب کا تصور خصوصی طور پر عورت کی ہستی پر چھا گیا۔ اب مرد محبوب نہیں، وہ محبوب خاص پیش نظر ہے جس کی

بولتی آنکھوں کا اس گل رنگ عارض کا جمال

ایک "مسکراتا سا تصور" اور ایک "گنگناتا سا خیال" بنا ہوا ہے۔ لیکن زندگی اس دور سے گزر رہی ہے جس میں "دو آگے چلیں گے دم لے کر" کی فرصت نہیں اور یہ عدیم الفرصتی "محبت کی فرصت" ایک نہیں دیتی۔ محبت کی "نعمت عظمیٰ" عورت کی "لذت جاں بخش" اور اس کی آغوش کے "مسرت آگیں" ہونے میں کلام نہیں لیکن شاعر مجبور ہے اور اسے ع

الگنے صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم

توڑنے ہیں جو ع

ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے

ہیں۔ اس لئے وہ اپنے محبوب سے کہتا ہے ع

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

کیونکہ ؎

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

لیکن اتنا سوچنے کے باوجود شاعر انسان ہے اس کا دل گوشت پوست کا ایک ٹکڑا —— وہ نہ "صرف روح" یعنی (Mere Soul) اور نہ ہی "صرف مضغۂ گوشت" (Just Flesh and [illegible]) محبوب کے عارض سیمیں پر اشکوں کے قطرے دیکھ کر وہ بے قرار ہو جاتا ہے۔ اسے ان آنسوؤں کی وجہ معلوم ہے، اس لئے وہ اسے اطمینان دلانا چاہتا ہے کہ تمہیں رونے کی ضرورت نہیں میں تم سے اب بھی محبت کرتا ہوں ؎

مجھ کو اک لمحہ کبھی چین بھی آیا تجھ بن
عشق ہی ایک حقیقت تو نہیں ہے لیکن
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم!

اور انجم کو اپنے گرد و پیش کی دنیا کا جائزہ لے کر افلاس، سرمایہ و محنت کی جنگ، حکومت اور غلامی کے خلاف بغاوت کرنے کا مشورہ دیتا ہے ؎

تو بھی آ وقت کے سینے میں شرارہ بن جا
تو بھی اب عرش بغاوت کا ستارہ بن جا
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم!

اور جب وہ "زندگی" کے مصائب کو ختم کرنے کی مہم پر روانہ ہونے لگا تو اس کا دل ایک بار پھر لرزا ع

اُف! یہ بھیگی ہوئی پلکیں یہ لرزتے ہوئے ہونٹ!

اور ان سے پریشان ہو کر وہ چیخ اٹھا ؎

دیکھ اب اور پریشاں تو نہ کر — زندگی ہے تو پلٹ آؤں گا
میں تری یاد کو دل میں لے کر — ہر مصیبت سے گزر جاؤں گا
دیکھ اب رنج بھی [illegible]
مجھ کو مت روک، مجھے جانے دے!

زندگی کی یہ پریشانیاں، لاچاریاں اور مجبوریاں ہیں لیکن

بقول شخصے "جب تک سانس تب تک آس" اسے امید ہے کہ اس کے دن یک نہ ایک دن ضرور پھریں گے۔ یہ عمری رجحان ہے۔ باوجود ہر قسم کی مایوسی کے امید کا دامن چھوڑا نہیں جاتا، اسی کے سہارے سب جی رہے ہیں، ایک اعلیٰ اقدار کی حامل زندگی سب کو نظر آ رہی ہے۔ اِشار کہتا ہے ؎

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
چند روز اور ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم

کیونکہ یہ ناجائز پابندیاں اس قدر سخت ہو چکی ہیں کہ ؎

جسم پر قید ہے جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے گفتار پہ تعزیریں ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے رہتے ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں

ہے "حق کی فتح" کا اتنا یقین ہے کہ وہ عزم

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

اس طرح الطاف مشہدی، قاسمی سے لے کر فیض، وجاہت یوسف ظفر و اختر الایمان سے لے کر میراجی و مخدوم، علی سردار جعفری و جاں نثار اختر سے لے کر روش صدیقی و سلام مچھلی شہری اور مخمور جالندھری سے لے کر سیکش تک سبھوں نے عورت کو محبوبہ، بیوی، پجارن، بھکارن، طوائف، کالج کی تعلیم یافتہ، سوسائٹی گرل اور مزدورنی کے روپ میں پیش کیا ہے۔ یہاں تک کہ فیض نے اسے سیاست کے الجھیڑوں میں گھسیٹا کیونکہ اب ہر طرف بیداری کی آگ پھیلی ہوئی ہے۔ اقبال میں اس کا [illegible] میں اور ساتھ ہی اسے یہ مشورہ دیا ہے کہ ؎

تو اس دامن کو اب پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

سعیدہ مظہر

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

تاریخ سیاسیات

از پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے۔ ایل ایل بی استاد استاد تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ
اردو زبان میں تاریخ سیاسیات پر پہلی کتاب ہے جس میں پروفیسر مجید صدیقی صاحب نے سیاسیات کی تاریخ کو اپنے خاص ماہرانہ انداز میں تحریر فرمایا ہے۔ یہ کتاب آپ کی سیاسی معلومات اور سالہا سال کے تجربوں کا نچوڑ ہے۔ کالج کے طلبہ کے لئے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

صفحات (۲۷۲) ——— قیمت (سے)

بۂ استقبالیہ کل ہند ترقی پسند کانفرنس

(عالی جناب ڈاکٹر زورؔ صاحب نے کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس کے اجلاس
حیدرآباد دکن منعقدہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں جو خطبۂ استقبالیہ پڑھا تھا وہ
درج ذیل ہے)

خواتین و حضرات!

میں بڑی مسرت کے ساتھ آج آپ کے اس اجتماع کا خیر مقدم کرتا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اس قسم کے
...وں اور تبادلۂ خیال سے اردو زبان اور ادب کو دیرپا فوائد حاصل ہوں گے اور ہماری آپس کی بہت سی
...میوں اور خامیوں کا ازالہ ہو سکے گا۔ ہماری زبان کی ایک بہت بڑی خوبی آج ہماری سب سے نمایاں خرابی
...ئی ہے۔ ہم سب اس حقیقت حال پر فخر کرتے ہیں کہ ہماری اردو زبان ہندوستان جیسے وسیع ملک کے
...شے میں پھیلی ہوئی ہے اور اس ملک کے ہر خطے میں۔ خواہ وہاں کی مقامی زبان کوئی ہو۔ اردو ہی
...یسا ذریعہ ہے جس سے مختلف مذہبوں اور نسلوں کے لاکھوں انسان ایک دوسرے کے رنج و راحت کو
...نے اور اپنی سماجی ضروریات کی سربراہی کر سکتے ہیں۔ لیکن مختلف اقطاع ملک کے اہل اردو کے باہمی اختلافات
...تعصبات انتشار کے باعث ہماری زبان کا یہ ہنر ہمارے لئے عیب بنتا جا رہا ہے۔ ہمارے بڑے سے بڑے
...یب اور شاعر وسیع نظری اور رواداری سے محروم ہیں اور ہماری اکثر و بیشتر انجمنیں اور جماعتیں پست
...الی اور کوتاہ بینی کا شکار بنتی جا رہی ہیں۔ ایک جماعت دوسری جماعت کے قیام اور ایک فرد دوسرے
...کے وجود کو گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی لئے اہل اردو کی نظر میں ہر نئی تحریک کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔
...ر ہر شخص دوسرے کو شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔

سال گزشتہ جب کل ہند اردو کانگریس کا ایک اجلاس ترقی پسند تحریک کے لئے وقف کیا گیا تو میرے
...خاص دوست جو اس تحریک کے روح رواں ہیں اور آج کے اس اجتماع میں دوسری بار میں ان کا
...ی مسرت سے استقبال کر رہا ہوں، بہت حیران ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ

"ہماری نظر میں حیدرآباد تو آخری مقام تھا جہاں یہ تحریک اثر انداز
ہو سکتی تھی۔ لیکن اردو کانگریس کے اس اقدام سے ہم کو اپنی رائے
بدلنی پڑی"

اس وقت تک میرے ان فاضل دوست کو ترقی پسند حیدرآباد کے دیرینہ رجحانات سے شاید واقفیت نہ تھی
اور یہ حقیقت ان کی نگاہ سے اوجھل تھی کہ یہ سرزمین صدیوں سے اس خصوص میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے
اور اردو زبان تو خاص طور پر اس ملک کے ترقی پسندانہ رجحانات ہی کا ایک نمایاں ثبوت ہے۔ آج سے
...چار پانچ سو سال قبل جب کہ فارسی زبان تمام ہندوستان کی سرکاری اور علمی و ادبی زبان سمجھی جاتی تھی حیدرآباد ہی
...نے جرأت کی اور ملک کے ادیبوں اور شاعروں کو ایک پردیسی زبان کے طوق غلامی سے آزاد کرایا اور یہاں کے
...عوام بازاروں اور گھروں میں جس زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے اس کو علم و ادب کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔
...نچہ آپ سب بخوبی واقف ہیں کہ اردو کا ابتدائی ادب جس میں نثر و نظم کی سیکڑوں کتابیں شامل ہیں دکن ہی میں

لکھا گیا اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں تقریباً دو سو سال بعد ترقی پسندی کی یہ تحریک سرسبز ہو سکی ۔ اور وہ بھی محض دکن ہی کے ایک شاعر ولی کے سفر و قیام دہلی اور اس کے دیوان کی تشہیر کے بعد ہی خاطر خواہ ترقی کر سکی ۔ اسی واقعہ کی طرف میر تقی میر جیسے وضع دار شاعر نے جس کو شاید آپ قدامت پسند بھی کہیں ایک ترقی پسندانہ انداز میں اشارہ کیا تھا کہ ؎

قائل نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے　　معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اردو ادب اپنے ابتدائی دو سو سالوں میں زیادہ تر برج بھاشا سے متاثر رہا اور پہلے پہل دکن ہی کے ایک شاعر ولی نے اپنے سفر گجرات و دہلی کے بعد محسوس کیا کہ اس کی ترقی اور مقبولیت کے لئے ضروری ہے کہ اس میں فارسی اور عربی الفاظ کثرت سے استعمال کئے جائیں اس لئے وہ اور اس کے اورنگ آبادی دوستوں اور معتقدوں نے وہ ترقی پسندانہ رجحان اختیار کیے جن کو آگے چل کر مرزا مظہر جان جاناں اور شاہ ظہور الدین حاتم نے شاہجہان آباد میں رائج کیا اور اردو زبان کی وہ شکل قائم کردی جو آج تک معیاری اردو کہلاتی ہے ۔

اردو زبان کی حد تک حیدرآباد کے ترقی پسندانہ رجحانات کی تاریخ یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کا سلسلہ برابر جاری رہا اور اب تک جاری ہے ۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ کا قیام تو اس سلسلہ کی ایک ایسی اہم کڑی ہے جو اردو کی تاریخ میں حیدرآباد کی ترقی پسندانہ خدمات کو زندگی جاوید بخشنے کا باعث ثابت ہوگی ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسرے مقامات کی طرح حیدرآباد میں بھی ایسے اصحاب موجود ہیں جو اس تحریک کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کی وجہ سے اردو ادب میں گندگی پھیل رہی ہے اور اس ادب کو پڑھ کر ہمارے نوجوان گمراہ ہوتے جارہے ہیں ان کا یہ سمجھنا ایک حد تک غلط بھی نہیں ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس خوش آیند تحریک سے فائدہ اٹھا کر بہت سے خام کاروں اور آوارہ مزاج ادیبوں اور شاعروں نے اپنے پست جذبات اور زیادہ تر شہوانی الجھنوں کی نمود و نمائش شروع کردی ہے ۔ اس لئے اس امر کی سخت ضرورت ہے جیسا کہ میں نے یوم حالی میں بھی کہا تھا کہ ” انجمن ترقی پسند مصنفین “ جلد سے جلد اپنے تحت ایک ایسی احتسابی مجلس قائم کرے جو موقع بموقع ان تمام نہاد ترقی پسندوں کے افکار نظم و نثر کا جائزہ لیتی رہے اور ان کی نسبت اپنی صریح رائے کا اظہار دیانت اور جرأت کے ساتھ کرتی جائے ۔ اگر اس قسم کا کوئی اقدام جلد نہ کیا جائے گا تو ہر ناقص شاعر اور نااہل ادیب ترقی پسندی کے روپ میں اپنی کم علمی ، ادبی بے بضاعتی اور اخلاقی نقائص کو چھپاتا رہے گا اور نہ صرف ترقی پسند تحریک کو نقصان پہنچے گا بلکہ حال اور مستقبل کے اردو ادب پر خامیوں اور گندگیوں کا ایک ایسا زنگ چڑھ جائے گا جس کی ذمہ داری اس تحریک کے مخلص بانیوں کے سر رہے گی اور جس کے دور کرنے میں مستقبل کے ادیبوں اور شاعروں کو بڑی زحمتیں اٹھانی پڑیں گی ۔

ایک ایسی ہی مجلس کی طرف سے صحیح قسم کے ترقی پسند ادب کے کئی مجموعے بھی شائع ہونے چاہئیں جو کرشن چندر کے جدید مجموعے ” نئے زاویے “ کے انداز میں مرتب کئے جائیں تو جواں سال شاعروں اور نو مشق ادیبوں کی صحیح رہبری ہوگی اور وہ گمراہ ہو کر شہوانی جذبات کی ترجمانی اور عریانی کو ترقی پسندی کا لوازمہ سمجھنے سے باز رہ سکیں گے ۔

ترقی پسند ادب کی تحریک کو اس وجہ سے بھی نقصان پہنچ رہا ہے اور شاید آئندہ بھی پہنچے کہ اس تحریک کے

بعض علم بردار ترقی پسندی اور اشتراکیت کو لازم و ملزوم سمجھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ التزام اتنا ضروری نہیں جتنا کہ ترقی پسندی اور انسانیت میں ہونا چاہئے۔ انسانوں کی زبوں حالی سے متاثر ہونا اور انسانی حقوق کی پامالیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا ایک ایسی وسیع الخیالی ہے جس کے مقابلہ میں کسی خاص سیاسی عقیدے کی تبلیغ کرنا ایک طرح کی تنگ نظری کا ثبوت دینا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ترقی پسند ادیب اور شاعر اشتراکیت کی علم برداری کی بجائے اگر انسانیت کی علم برداری کا دعویٰ کریں تو محض ایک اصطلاح کی تبدیلی سے ان کے بہت سے عیب ہنر نظر آنے لگیں گے اور ان کے بہت سے مخالف ان کے ہم نوا بن جائیں گے۔

ایک اور بات جس کی طرف ہماری اس کانفرنس کو خاص طور پر توجہ کرنی چاہئے اور جس کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوسکے گا، یہ ہے کہ ترقی پسند ادب کو افراط و تفریط سے بچایا جائے۔ اعتدال ہر کامیابی کا لازمی ذریعہ ہے اور یہ خوبی اس وقت تک پیدا نہ ہوگی جب تک کہ ہم اپنی ہر کاوش پر سنجیدگی اور ٹھنڈے دل سے غور نہ کریں۔ بڑا اندیشہ ہے کہ کہیں ترقی پسندی اور جوش و جذبات کی ہنگامہ آرائی مترادف نہ بن جائیں۔ لیکن یقین ہے کہ یہ اندیشہ دیرپا ثابت نہ ہوگا کیونکہ جیسے جیسے ترقی پسند ادیب اور شاعر پختہ مشق اور سلیم الطبع ہوتے جائیں گے، ہمارا ادب بھی نکھرتا جائے گا۔ سلامتی طبع اور خوش ذوقی بغیر اعتدال کے ممکن نہیں۔ اس لئے جب تک ترقی پسند تحریک کا ہر دلدادہ افراط و تفریط سے بچنے کی کوشش نہ کرے گا، وہ اس تحریک کے لئے مضرت رساں ثابت ہوتا رہے گا اور اس کے ذاتی اعمال و اقوال دوسروں کو اس مفید تحریک سے بدظن کرانے کا باعث بنتے رہیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ حیدرآباد میں ترقی پسند مشاہیر کا یہ اجتماع اردو دنیا کی بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں کامیاب ثابت ہوگا اور ترقی پسند ادب کی تاریخ میں یہ کانفرنس ایک نئے اور شاندار دور کی بنیاد رکھے گی اور اس توقع کے ساتھ میں آج آپ سب دوستوں کا دلی خلوص کے ساتھ استقبال کرتا ہوں اور حیدرآباد کی انجمن ترقی پسند مصنفین اور اس کے سرگرم کارکنوں کو مبارک باد دیتا ہوں کہ ان کے مساعی کے خوش گوار نتائج برآمد ہو رہے ہیں اور یوم حالی کے بعد اس شاندار اجتماع کے انتظامات میں انھوں نے جس سرگرمی اور جانکاہی سے حصہ لیا وہ اس کی متقاضی ہے کہ اگر آپ کو اجلاس حیدرآباد میں کسی قسم کی زحمت یا ناگواری محسوس ہو تو یقیناً درگزر فرمادیں گے۔

سید محی الدین قادری زور

سرگزشت حاتم۔ دہلی کے پہلے اردو شاعر اور استاد الشعراء شاہ ظہور الدین حاتم کے حالات زندگی اور اردو فارسی کلام پر تبصرہ جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے نہایت ہی تحقیق و تلاش کے بعد عالمانہ انداز میں قلمبند فرمایا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کے ذریعے سے اردو کے ایک بڑے شاعر اور استاد الاساتذہ کی شخصیت اور کردار کے ایسے پہلو روشنی میں آجاتے ہیں جو ہر زمانے میں معیاری سمجھے جائیں گے۔ ان کی زندگی کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حال اور قال ایک ہی تھا۔ ان کی زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی تکلف اور تصنع سے پاک تھی۔ تشنہ گان ادب اور محققین کے لئے یہ نادر تحفہ ہے۔ صفحات ۱۲۸۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب۔ قیمت

اُردو حروف اور رسم الخط

۱۔ اردو میں حسب ذیل حروف تہجی ہیں جن میں سے اکثر حروف عربی سے لیے گئے ہیں۔

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ی ے۔

بعض وہ آوازیں جو عام طور پر ہندی میں مستعمل ہیں مثلاً بھ پھ تھ ٹھ جھ چھ دھ، ڈھ، رھ، ڑھ، کھ، گھ، لھ وغیرہ ان سے بننے والے لفظ اکثر اردو میں بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ ان کی آوازوں کے لئے اردو میں نئے حروف نہیں بنائے گئے بلکہ متعلقہ حروف میں ہائے دوچشمی (مخلوط) شامل کرکے ایک ہی آواز فرض کر لیا گیا ہے۔ ہندی کی حرف کو چھوڑ کر باقی حرفوں کے نام ہیں۔ حروف کے ناموں کے آغاز کی آواز اس حرف کی آواز قرار دی گئی ہے جس سے ہم یہ تعبیر کر سکتے ہیں کہ سالم اکیلے حرف کا نام پکارا جاتا ہے اور حرف کی وہ صورت جو تحریر میں اتصال کی غرض سے فرض کر لی گئی ہے وہ تلفظ کہلاتا ہے۔

۲۔ اس کا رسم الخط متصل ہے اس لئے الفاظ میں حروف اپنی سالم شکل میں نہیں لکھے جاتے۔ اس میں خاص قاعدہ نظر آتا ہے۔ مستثنیات بھی موجود ہیں اور ان میں بھی ایک اصول کارفرما ہے۔

اکثر حرفوں کے دو حصے مانے گئے ہیں۔ جزو اول اور جزو دوم مثلاً ج = (۱) جر + (۲) ے اور س = ۳ + ں اور ک = کہ + ے وغیرہ پہلی علامت جزو اول اور دوسری جزو دوم ہے۔

۳۔ حروف تہجی میں سے ا د ڈ ذ ر ڑ ز ژ و یہ نو حروف منفصل ہیں۔ اس لئے کہ یہ حروف جہاں کہیں واقع ہوتے ہیں، آگے کے حرف سے ملائے نہیں جاتے، خواہ وہ ایک ہی لفظ کے درمیان ہی کیوں نہ واقع ہوں مثلاً تقابل، جذبات، دروازہ، بارش، مغرب، مشرق وغیرہ ہیں۔ اور باقی حروف ہیں ان منفصل حروف کے شامل رہنے کے باوجود اس خط کو متصل خط کہتے ہیں۔

۴۔ کل حرفوں میں سے یہ چار حروف "الف، ط، ظ، و" ایسے حروف ہیں جو کسی صورت اور کسی حال اپنی شکل نہیں بدلتے اور باقی سب حروف تحریر میں اپنی شکل کچھ نہ کچھ بدلتے ہیں اور جس طرح اوپر بیان کیا گیا ہے حرف جزو اول رہ جاتا ہے۔

۵۔ اختتام لفظ پر جو حرف واقع ہوتا ہے وہ سالم آتا ہے اور اس کے علاوہ ہر جگہ جزو اول۔ بجز منفصل اور منفصل (دفعہ ۳ کے حروف) حروف کے چونکہ ان میں جزو بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔

٦۔ ب، پ، ت، ٹ، ث، ن، ی، ے ان کا جزو اول تین شکلوں میں ہوتا ہے مثلاً ۱۔ ﺑ ۲۔ ﺮ ۳۔ ں جو نقطوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان حرفوں کی اس وقت پہلی شکل بنتی ہے جب کہ یہ لفظ کے پہلے حروف ہوں اور ان کے بعد س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق میں واؤ سے کوئی حرف واقع ہوتا ہے۔ مثلاً بسم اللہ، پشتہ، بصرہ، بضاعت، بطخ، نظر، تعرض، بغاوت، تفصیل، تقابل، توبہ وغیرہ ہیں۔

الف۔ جب کوئی لفظ یائے مجہول پر ختم ہوتا ہے اور اس کے پہلے ب، پ، ت الخ میں سے کوئی حرف واقع ہو اور اس سے پیشتر کوئی منفصل حرف واقع ہو تو ان حرفوں کی یہی " ﺮ " شکل آئے گی۔ مثلاً کھانے، کمانے، ڈرتے، نماٹے، کھوٹے وغیرہ ہیں۔ مگر "ی" اس قاعدے سے الگ ہے۔

ب۔ دوسری شکل کا محل یہ ہے کہ ب پ ت الخ میں سے کوئی حرف لفظ کا پہلا حرف ہو اور اس کے بعد

ج چ ح خ م ہ میں سے کوئی حرف ہو مثلاً بکلی، بچھو، اچھو، تحفظ، تخمیں، تم، نم، تماشا، بہت، پہلا وغیرہ

(ج) تیسری شکل یہ ہے کہ ان حروف یعنی ب پ ت الخ میں سے کوئی حرف لفظ کا سر حرف ہو اور اس کے بعد الف، ب، پ، ت، ٹ، ث، د ڈ ذ ر ڑ ز ژ ک گ ل ن ی ے میں سے کوئی حرف واقع ہو۔ جیسے:- بت، بیر، بھیڑ، تکرار، تکمی، بلہاری، بندوق، نیتر وغیرہ اور ب پ ت الخ جب لفظ کے درمیان آتے ہیں تو اس وقت بھی ان کی یہی (ہ) تیسری صورت بنتی ہے۔

۷۔ اگر لفظ کے درمیان منفصل حرف واقع ہو جائے تو لفظ کے بقیہ حصے کا آغاز بالکل اسی طرح ہوتا ہے جس طرح لفظ کا لکھا جاتا ہے۔ جیسے "خوشبودار" میں واؤ منفصل ہے اس لئے اس کے بعد "ش" کی شکل پہلی رہے گی جیسے آغاز لفظ کے وقت ہوتی ہے۔ کیونکہ "و" کے بعد "ش" واقع ہوا ہے۔ "آبکوش" کے لفظ میں پہلا حرف منفصل ہے۔ اس لئے دوسرے حرف "ب" کی شکل دوسری شکل ہے۔ اور "کابک" میں "ب" کی شکل تیسری ہے۔

۸۔ ان کے سوا باقی جتنے حروف ہیں لفظ کی ابتدا یا لفظ کے درمیان میں جہاں بھی واقع ہوں ان کا جزو اول ہی نظر آئے گا۔

۹۔ منفصل حروف میں سے "د ڈ ذ ر ڑ ز ژ" ایسے حروف ہیں کہ جن کے ماقبل کے حرف متصل ان سے ملیں تو ان کی شکلیں د ڈ ذ کے بجائے ـد ـڈ ـذ اور ر ڑ ز ژ کے بجائے ـر ـڑ ـز ـژ ہو جاتی ہیں۔

۱۰۔ ع غ کا جزو اول کبھی "ء" ہوتا ہے اور کبھی "ے" کی علامت۔ ان حروف میں پہلی شکل کا محل یہ ہے کہ یہ حروف لفظ کی ابتدا میں واقع ہوں یا منفصل حروف کے بعد واقع ہوں جیسے عادت، عرفان اور ماشاءاللہ وغیرہ میں یا غضب، غرور، اور چراغاں، مرغابی وغیرہ میں اور دوسری شکل اس وقت لکھی جاتی ہے جب اس کا ماقبل کوئی متصل حرف اس سے آملتا ہے۔ معبود، بدیع، شمع اور مغرور، تیغ، ارمغان وغیرہ میں۔

۱۱۔ "ہ" کی مختلف شکلیں نظر آتی ہیں ایک وہ شکل جو ب پ ت ٹ ث ن ق ع غ ص ض ط ظ س ش ک گ ل م کے بعد واقع ہونے سے پیدا ہوتی ہے جیسے:- بہار، پہاڑ، تہمد، ٹہلنا، سہنا، شہر وغیرہ میں۔ دوسری وہ جو لفظ کا پہلا حرف ہ ہو اور اسی کے بعد کوئی متصل حرف واقع ہو جیسے ہشت، ہم وغیرہ میں اور حرف واؤ کے ماقبل واقع ہو تو اس کی شکل یہ بنتی ہے۔ جیسے ہوش، ہوا وغیرہ میں اور اس کی وہ شکل جب کہ یہ کسی منفصل حرف یا ل ک گ سے پہلے واقع ہو جیسے:- ہدہد، ہرن، ہاتھ، ہل، ہلک وغیرہ میں (واؤ مستثنیٰ) وہ شکل جب یہ منفصل حرف کے بعد واقع ہو جیسے:- پردہ، دروازہ، قہوہ وغیرہ میں۔ ایک وہ شکل جب کہ یہ لفظ کا آخری حرف ہو اور ماقبل اس کا کوئی متصل حرف اس سے ملا ہو جیسے نوشتہ یا نقشہ وغیرہ میں اور ایک وہ شکل جس کو ہائے دوچشمی (مخلوط) کہتے ہیں جیسے:- جھرنا، گھر، آدھا، بوڑھا وغیرہ میں۔

۱۲۔ جہاں تک ہمیں علم ہے کسی اور زبان کے رسم خط میں اتنے قاعدے، اتنے ضابطے نظر نہیں آتے۔ شاید چینی یا جاپانی رسم الخط میں ہوں تو ہوں۔ اسی وجہ سے دوسری زبانیں جاننے والے نسبتاً اردو خط کو مشکل تصور کرتے ہیں۔ اگر کوئی اصلاح رسم الخط میں کرنی ہو تو اس وقت مفید ہو سکے گی جب اصولوں میں زیادتی کرنے کے بجائے موجودہ قاعدوں میں کمی کی جائے اور اس کی بنیادی خصوصیت اتصال میں فرق نہ آنے پائے۔ اکثر

مصلحین نے اس طرف توجہ فرمائی ہے۔ اس موضوع پر رسالے ہیں۔ مقالے ہیں، مضامین ہیں اور سب کا خیال ہے کہ موجودہ رسم الخط میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ مگر سب کا مطمح نظر غالباً ایک نہیں ہے۔ اس مشکل کو آسان کرنے کی جتنی تدبیریں اختیار کی جارہی ہیں ان کا بنظر غائر سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اس خصوص میں جن مشکلات کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے، وہ کسی نہ کسی صورت میں بدستور موجود ہیں اور کچھ قاعدوں کے اضافے کے ساتھ مزید پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کی اصلاح رسم الخط کی کمیٹی نے اس طرف قدم اٹھایا ہے مگر وہی بات پھر پیدا ہوگئی ہے جو پہلے بھی موجود تھی۔ یہ تازہ بہ تازہ نو بہ نو کوشش ناگپور کانفرنس میں سرخرو ہوئی۔ لیکن حال ہی میں حیدرآباد دکن میں آل انڈیا اردو کانگریس منعقد ہوئی تھی۔ اس میں کمیٹی کی طرف سے کوئی تحریک اس بارے میں پیش نہیں ہوئی۔

۱۴۔ سب سے پہلے ہم ان تجاویز پر غور کریں گے جو ناگپور کانفرنس میں (شاید) "چالیس ماہرین" رسم الخط کے اجلاس میں پاس ہوئیں۔ جس کا تذکرہ اخبار "ہماری زبان" میں اور رسالہ اردو بابتہ جنوری ۱۹۴۴ء جلد [illegible] میں "اصلاح رسم الخط" کے عنوان کے تحت مضمون کی شکل میں موجود ہے۔

دفعہ ۱۔ میں تحریر ہے کہ "لفظِ مرکب کے دو لفظوں کے درمیان واضح فصل چھوڑا جائے"۔
مرکبات کے ہر دو لفظوں میں واضح فصل چھوڑا جائے تو ضروری ہوا کہ ہر دو مفرد لفظوں کے درمیان واضح تر فصل ہو۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس امر کا پتہ چلنا مشکل ہو جاتا ہے کہ لکھا ہوا لفظ مرکب کا جزو ہے یا بجائے خود ایک جداگانہ مفرد لفظ۔ "گل کاری" لکھا جائے تو گل کو اس کے ماقبل سے متعلقہ یا کاری کو اس کے مابعد سے متعلقہ سمجھنے میں کیا امر مانع رہے گا؟ اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ جملے کے ہر لفظ میں اتنا فاصلہ رکھا جائے جس سے ظاہر ہو سکے کہ مرکب کے اجزا کون کونسے ہیں اور مفرد کون کونسے؟ اس سے تحریر کی سہولت معدوم، کاغذ کے خرچ کا لحاظ مفقود؟ ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ مرکبات کے اجزا کے درمیان یا اوپر یا نیچے کوئی مختصر سی علامت وضع کی جاتی۔ یہ ہر طرح کی سہولت کا باعث ہوتا۔

اس سلسلے میں جناب ہاشمی صاحب کی "ضروری تاکید" میں صاحب موصوف نے بیان فرمایا ہے کہ "ہمارے یہاں لفظ کے ختم ہونے کی کوئی علامت نہیں ہے"۔ ہم اس بات کو ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ ہماری تحریر پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جب لفظ کا وہ حصہ جہاں سالم حرف کا وجود ہو اور اس کے بعد فصل واقع ہو تو اختتام لفظ ہے۔ یہ صورت منفصل حرف کے واقع ہونے سے بھی پیدا ہوتی ہے مگر وہ تلفظ کے احاطے میں مقید ہے۔ لہٰذا فصل کہلایا نہیں جا سکتا۔

دفعہ ۲۔ ہمزہ کسی منفصل حرف کے بعد آئے تو جداگانہ لکھا جائے اور کوئی شوشہ نہ بنایا جائے مثلاً آ ءی، نا ءی بجائے آئی اور نائی کے۔

اگر کوئی لفظ جس کے تمام حروف متصل واقع ہوں اور ان کے درمیان ہمزہ ہو تو کیا عمل کیا جائے؟ مثلاً "کئی، نئی" وغیرہ میں۔ اگر یہ بدستور رہیں تو ہمزہ کے لکھنے کے دو قاعدے ہوتے ہیں۔ بصورت دیگر ک ءی اور ن ءی لکھنا ضروری ہوگا۔ جیسا کہ دفعہ ۲ کا منشا ہے۔

دفعہ ۳۔ میں تحریر ہے کہ "دھ، ڈھ وغیرہ میں ہائے مخلوط کو اصل حرف سے ملا کر لکھا جائے یعنی دھ، ڈھ اور اصل کی شکل انھیں بھی حرف منفصل قرار دیا جائے اور دوچشمی ھ کو لفظ کے دوسرے ٹکڑوں سے ملانے کے بجائے حسب ذیل طریق پر لکھا جائے مثلاً دھن کے بجائے دھ ن، دھرتی کے بجائے دھ رتی اور پڑھنا کے بجائے پڑھ نا"
یہاں ایک خرابی تو یہ پیدا ہوتی ہے کہ د، ر وغیرہ جو منفصل ہیں ایک جگہ منفصل اور ہائے مخلوط کے ساتھ متصل، اور ھ مخلوط جو ایک جگہ متصل ہے، کہیں دوسری جگہ منفصل۔ اس طرح پھر دو قاعدے بن گئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نئی تجویز کے موافق حرف ھ مخلوط اپنے اصلی حرف کے ساتھ مل جاتا ہے تو مخلوط حرف کو منفصل ہونا چاہئے۔ تو "پھر، گھر، گھوڑا، گھبرانا، بن گھٹ" وغیرہ پر بھی اس قاعدے کو منطبق ہوجانا چاہئے۔ اور انھیں "پھ ر، گھ ر، گھ وڑا، گھ برانا، بن گھ ٹ" وغیرہ لکھا جانا چاہئے جس کی وضاحت دفعہ میں نہیں کی گئی ہے۔ اس طرح ہائے مخلوط کے لئے بھی دو قاعدے ہوگئے ہیں۔

دفعہ ۴: میں بھی جو حروف ایک جگہ متصل نظر آتے ہیں وہی دوسری جگہ منفصل ہیں۔

دفعہ ۵۔ یہ تجویز جن مشکلات کی خاطر وجود میں لائی گئی ہے اس کا حل حروف شمسی اور قمری کے سمجھنے میں موجود ہے۔ لہٰذا تحریر میں بے ضرورت ایک علامت کا اضافہ کسی اعتبار سے بھی کیوں نہ ہو دردسری کے سوا کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔

دفعہ ۸۔ تحریر ہے کہ "صرف ابتدائی تعلیم کی حد تک علامات مصدر وغیرہ کو اصلی مادے سے دور لکھا جائے۔ لکھ نا، پڑھ نا وغیرہ۔ اسی دفعہ کی ضمن ب میں ہے کہ ابتدائی کتابوں میں ہر لفظ کے ایک ایک رکن کو جدا کرکے لکھا جائے مثلاً مصیبت کے بجائے مصی بت، قرینہ کے بجائے قری نہ وغیرہ"
اس تجویز سے ہمیں قطعی اختلاف ہے۔ ابتدائی نقوش جو دماغ میں گھر کر جاتے ہیں وہ بعد کو مٹ نہیں سکتے۔ پھر اس پر دوسرا نقش ؟ مسودے مشکوک ہونے کے اور کیا ہوسکتا ہے ؟ ماہرانِ فن تعلیم نے ابتدائی تعلیم کے وقت احتیاط برتنے پر اصرار کیا ہے، کیونکہ بعد کو اس کی صحت محال ہوجاتی ہے۔

دفعہ ۹۔ "ی کو الف اور واؤ کی طرح منفصل قرار دیا جائے۔ یہ اہم تجویز ہے" مگر کیوں ؟ کونسی رکاوٹ پیدا ہوئی ؟ کس قاعدے سے ؟ کوئی قاعدہ پرانا ہے کہ کسی نئے قاعدے کے تحت ؟
ہمارے حروف عربی سے لئے گئے ہیں اور جس وقت انھیں اردو کے لئے لیا گیا بجنسہٖ لیا گیا چنانچہ حرف "ی" کے لئے ہی کیوں ایسا فرض کیا جائے ؟ اس کی معروف و مجہول اور ماقبل مفتوح صورتوں میں کوئی علامت کیوں نہ لگائی جائے ؟ کیوں بلا وجہ خلاف قاعدہ اس کو منفصل قرار دیا جائے ؟

دفعہ ۱۰۔ یہ اہم قرارداد ہے "اس پر از سر نو رائے کے لئے اخبار "ہماری زبان" میں اس کو شائع کیا جائے۔ کیونکہ اس قسم کی اصلاح ضرور ہوتی جاتی ہے۔ تجویز یہ ہے" عربی کے ہم آواز حروف جن کی تین اور چار شکلیں آتی ہیں ان کو اردو تحریر میں گھٹا کر صرف دو شکلوں پر اکتفا کرنا جائز قرار دیا جائے۔ یعنی ث، س، جن میں سے ص کو ذ، ز، ض، ظ، س سے ض، ز کو حذف کر دیا جائے یا جو لوگ ان کے بجائے س اور ز اور ظ سے کام لیں ان پر حرف گیری نہ کی جائے۔ ایسے حروف کی باقی قسمیں یعنی ا، ع، ت، ط، ح، ہ، بدستور رہیں گی"۔ (غ، ق کے متعلق کچھ ارشاد نہیں ہوا۔ کیوں ؟) "اس دفعہ پر ناظرین اخبار اور اہل رائے حضرات کی رائے کی

درخواست کی گئی ہے"

ان تمام جدید تجاویز کا نہ سہی اس دفعہ ۱۰ کا تذکرہ آل انڈیا اردو کانگریس منعقدۂ حیدرآباد دکن میں آیا تھا۔ لیکن انجمن ترقی اردو یا اس کی رسم الخط والی کمیٹی یا مجوز صاحب کی طرف سے نہیں - افسوس کہ تحریک مسترد ہوگئی - اس سے صاف ظاہر ہے کہ اہل الرائے نے اس تجویز کو پسند نہ فرمایا - یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اس تجویز کی ضرورت اصلاح رسم الخط کے ساتھ ساتھ کیوں درپیش ہوئی ہے -

"ہم آواز حروف" کے عنوان سے علحدہ مضمون کی شکل میں دفعہ ۱۰ کی ترویج سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں پر روشنی ڈالی جائے گی -

ناگپور کانفرنس کی منظورہ تجاویز پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام تجاویز جابجا تشنہ ہیں - اس لئے مزید پیچیدگیاں پیدا کرتی ہیں - ہر تجویز کے ساتھ کم از کم اور دو دو قاعدوں کا اضافہ ہوتا گیا ہے -

اگر ٹائپ کی سہولت کے لئے یہ خط کارآمد نہیں ہوسکتا تو کسی نئے حروف کی ایجاد کی جاسکتی ہے - دستی تحریر کے لئے بھی اور طباعت کے لئے بھی - یا ٹائپ میں دیوناگری خط استعمال کیا جائے اور دستی تحریر کے لئے موجودہ اردو خط یا پھر اسی خط کو کھلم کھلا منفصل قرار دیا جائے جس سے یہ مشکلات یک قلم رفع ہوں - اور پوری تحریر بغیر اتصال کے رائج کی جائے -

دامودر ذکی ٹھاکور

اطلاع

جن خریدار اصحاب کا سالانہ چندہ ختم ہوگیا ہے وہ براہِ کرم اپنا چندہ دفتر سب رس پر روانہ فرمادیں یا "سب رس" تقسیم کرنے والے سے باضابطہ مطبوعہ رسید لے کر چندہ عنایت فرمائیں - ورنہ دفتر پر کوئی ذمہ داری نہ ہوگی -

اضلاع کے خریدار اصحاب اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرماکر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ یا دفتر ہذا کو رسالہ وی پی کرنے کا آرڈر روانہ کریں۔ اگر رسالہ وی پی کے ذریعہ آئے تو براہِ کرم اندرون مدت اسے چھڑا لیا جائے ورنہ وی پی ہونے کی صورت میں دفتر کو اخراجات ڈاک کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے -

رسالہ نہ ملنے کی اطلاع ہر ماہ کی ۲۵ تاریخ تک روانہ فرمائیں ورنہ تعمیل ارشاد نہ ہوسکے گی - مہتمم

بچہ کا بستر میں پیشاب کرنا

بچہ کا ذرا بڑا ہوکر سوتے میں بستر پر پیشاب کردینا یا بار بار پیشاب کرتے رہنا یا رنگ برنگا پیشاب کرنا یہ سب بیماری کی علامتیں ہیں جن کا لوگ ابتدا میں خیال نہیں کرتے اور بڑھ کر یہ مرض نہایت تکلیف دہ وخطرناک ثابت ہوتا ہے وصہ کی مسلسل کوششوں کے بعد دوا کمہول تیار کی گئی ہے۔ جو چند یوم میں بچہ کا سوتے میں پیشاب کرنے کو چھڑا کر نئے و پرانے مرض کو مکمل آرام بخشتی ہے - پرچہ ترکیب استعمال دوا کے ہمراہ - قیمت عہ/

دو روپے آٹھ آنے - اپنے شہر کے بڑے کیمسٹ سے طلب کیجئے - اگر کہیں نہ ملے تو وی پی کے لئے اس پتہ پر لکھئے -

ڈاکٹر ملک فارسی (۱۳۰) شاہدرہ دہلی

جو آگ لگائی تھی میں نے ...... "ایک لڑکی" کے نام

وہ پیلی پشانی ایک گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی۔ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا، میرے داخل ہوتے ہی وہ چونک پڑی
جیسے ستار کے تاروں کو کوئی یک دم چھیڑ دے۔ میں اس کی اس معصومانہ حرکت پر دل ہی دل میں مسکراتا ہوا آگے
بڑھا۔ وہ سکڑ گئی۔ میں قریب بڑھتا رہا اور وہ مجھ سے دور ہٹتی رہی۔ "قرب و بعد" کا یہ کھیل بھی بعض اوقات
کتنا دلچسپ ہو جاتا ہے۔ وہ کیوں ہٹ رہی تھی۔ میں سوچنے لگا "میں کوئی درندہ تو ہوں نہیں جو اسے کھا جاؤں گا۔
یہ ہندوستانی لڑکیاں بھی کس قماش کی ہوتی ہیں۔ وہ ہرنوں کی طرح مردوں کے سائے سے کیوں بدکتی ہیں ---- شاید
ان کی بھی فطرت میں "رمیدگی" ہے۔ یہ "رمیدگی"، "حسن و عصمت" سے کیوں وابستہ کر دی گئی۔ آخر نہ حسن کو "دوام"
ہے نہ "عصمت" کو قیام ---- یہ دونوں بھی "ہرنوں" کی طرح "رم" کر جاتے ہیں ---- لیکن وہ مجھ سے
کیوں گریزاں ہے ---- مجھ سے اجنبی بھی تو نہیں وہ "میری عم زاد" ساتھ کی کھیلی ساتھ کی پلی ---- پھر یہ
تکلف اور اجنبیت کیوں۔ "سنئے تو میں کوئی غیر نہیں" میں نے کہا اور دھیرے سے گھونگھٹ الٹ دیا۔ جھکی جھکی
آنکھیں میری طرف اٹھیں۔ سانولا سلونا رنگ۔ پتلے پتلے ہونٹ۔ چہرے پر غضب کی معصومیت۔ آنکھوں میں ڈر اور حیرت
نے کچھ عجیب سی سہمی ہوئی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ شاعر "پہلی نظر" کی قسم قسم سے تاویل کرتے ہیں کوئی "بجلی کی چمک"
کہتا ہے تو کوئی "تیر نیم کش" لیکن مجھے یہ دونوں تشبیہیں غیر حقیقی معلوم ہوتی ہیں۔ مجھے تو ایسے معلوم ہوا نسیم سحر کا
ہلکا سا جھونکا مجھ پر جھرجھری کی کیفیت طاری کرتا ہوا گزر گیا "آخر آپ مجھ سے ڈرتی کیوں ہیں۔ کچھ باتیں کیجئے۔
اب تو ہمیں زندگی کی ناؤ مل کر کھینا پڑے گی۔ یہ ڈر ---- اس اجنبیت سے کیسے کام بنے گا" میں شاعرانہ
انداز میں کہنے لگا۔ مجھے معلوم ہو سکا عورتیں پُر تکلف گفتگو سے بہت مرعوب ہوتی ہیں۔ وہ خاموش ہی رہی میں نے سلسلۂ
بیان جاری رکھا "عورت مرد کی رفیق ہوتی ہے۔ قدرت نے اسے مرد کی دل بہلائی کے لئے پیدا کیا۔ دیکھئے نا آدم جنت
جیسی جگہ سے بھی بیزار ہو گئے۔ آخر خداوند تعالیٰ کو ایک عورت پیدا کرنا پڑی" -- میں باتیں کرتے کرتے تھک سا گیا۔
انسان بالخصوص مرد اپنے مشغلوں سے کس قدر جلد تھک جاتا ہے۔ شاید قدرت نے انسان کے خمیر میں بیتابی
تڑپ رکھی ہے۔ شعلہ کی سی بے قراری ۔ وہ میری باتیں سن کر کبھی کبھی مسکرا دیتی اس طرح ہماری شب عروسی
بسر ہوئی ---- رفتہ رفتہ اس کا حجاب دور ہوتا گیا لیکن تکلف نہ گیا۔ عورت کا ظرف کتنا وسیع ہے۔ وہ کتنی بردبار
ہوتی ہے۔ یہ مجھے نزہت سے مل کر معلوم ہوا۔ اگر صبح سورج نکلنے اور دن ڈوبنے کا نام زندگی ہے تو ہماری زندگی
گزرتی گئی۔ وہ میری غیر موجودگی میں بلبل کی طرح چہکتی لیکن میرے سامنے سدھ بدھ کھو دیتی۔ اسے شعر و ادب
کا کتنا اچھا ذوق تھا۔ میں اچھے اچھے افسانوں کی کتابیں لا کر دیتا اور اس کی رائے کا بے چینی سے منتظر رہتا
لیکن وہ میرے سامنے کچھ نہ بولتی۔ رکے ہوئے پانی میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہماری زندگی بھی
خشک ہو گئی۔ اس "جمود" سے میں عاجز آ چکا تھا۔ میں زندگی میں حرکت و حیات کا قائل تھا وہ ایک برف
کا تودہ بن گئی۔ میں نے "نیاز" چھوڑ کر ناز کرنا شروع کیا۔ وہ اس خاموشی میرے سب کا جواب تھی۔ بے اعتنائی اس
امید پر کی تھی کہ "قابل اعتنا" سمجھا جاؤں گا۔ لیکن عورت کی فطرت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے ....
اور سمندر کی اتھاہ گہرائیوں کو کون پا سکا ہے؟ مجھے یک گونہ بے خودی کی تلاش تھی۔ وہ مجھے نہ ملی۔ میں نے اپنے
دوستوں سے اپنی زندگی کی بے کیفی کا شکوہ کیا۔ جمیل کہنے لگا۔

امریکہ کی صنعتی ترقی کی ابتدا

ممالک متحدہ امریکہ میں بھی انیسویں صدی حکومتی تعمیر کا ایک دور تھی۔ ۱۷۸۳ء کی صلح کے بعد تجارتی اور صنعتی معاملات کرنے کے لئے ایک مرکزی ادارہ کی ضرورت محسوس ہوئی اور ملک کی معاشی ترقی کی ضروریات اس امر کی متقاضی تھیں کہ ایک سمجھ دار اور طاقتور مرکز کی جانب سے متحدہ طور پر معاشی ترقی کے میدان میں قدم بڑھایا جائے۔ ریاستوں کی باہمی رقابت اور رنجش کی موجودگی میں یہ کام مشکل نظر آتا تھا۔ الگزینڈر ہیملٹن کی کوششوں سے معاشی مسائل کے طے کرنے کے اختیارات مرکز کے تفویض کردئے گئے۔ خانہ جنگی سے قبل امریکہ کی معاشی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے (۱) ۱۷۸۳ء تا ۱۸۱۶ء۔ اس دور میں ریاستوں کے معاشی اتحاد، محاصل اور پبلک زمینات کے بندوبست کے مسائل زیر غور رہے۔

(۲) ۱۸۱۶ء تا ۱۸۳۳ء۔ اس دور میں بھی محاصل کا سوال تھا۔ جنوبی ریاستیں زرعی علاقہ پر مشتمل تھیں اور آزاد تجارت کی مدد سے شمال کی ریاستوں کی مصنوعات خریدنا چاہتی تھیں مگر شمالی ریاستیں محاصل بندی کا طریقہ اختیار کررہی تھیں۔ جنوبی ریاستیں ان محاصل کی ادائیگی کا یہ مطلب لیتی تھیں کہ اپنا نقصان کرکے شمال کو فائدہ پہنچایا جارہا ہے۔

(۳) ۱۸۳۳ء تا ۱۸۶۱ء اس زمانے میں صنعت نے آبادی کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف منتقل ہونا شروع کردیا تھا۔ صنعتی ترقی کس نہج پر ہو اور غلاموں سے نئی آبادیوں میں کس حد تک کام لیا جائے۔ یہ مسائل اس دور میں درپیش تھے۔ خانہ جنگی کے بعد کا اہم مسئلہ یہ تھا کہ یورپ کی سستی مصنوعات کا مقابلہ کیا جائے۔ یورپ میں شرح اجرت کم تھی جس کی وجہ سے مصارف پیدائش کم ہوتے تھے امریکہ کو یہ شکایت تھی کہ یورپ کی سستی محنت سے تیار کردہ اشیا کی امریکہ کی مہنگی محنت والی اشیا سے مسابقت ہو رہی ہے۔

ابتدائی دور میں امریکہ کی صنعت کی دو اہم خصوصیات ہیں۔ اول تو یہ کہ امریکہ نوآباد علاقہ تھا اور اس میں مزدوروں کی کمی ایک قدرتی امر تھی۔ دوسرے یہ کہ زراعت ملک کا اہم پیشہ تھی۔ محنت کی کمی کی وجہ سے کارخانہ جات کی ترقی مشکل تھی اور زراعت کے معاشی زندگی پر محیط ہونے کے باعث ملک کی صنعت زیادہ تر چمڑے کی دباغت، آلات زراعت کی تیاری، آٹا پیسنے کے کارخانوں اور گوشت کی پیکنگ تک محدود رہی۔

امریکہ میں صنعتی انقلاب کا آغاز نیو انگلینڈ میں ہوا کیونکہ یہاں آبادکاری بھی پہلے ہوئی تھی۔ اصل کی رسد موجود تھی آبریانی کی قوت محرکہ بھی آسانی سے دستیاب ہوسکتی تھی۔ نیو انگلینڈ کی آبادی نے اعلیٰ قسم کی ذہانت کے کاموں مثلاً پارچہ بافی کی مشینوں کی تیاری، گھڑی سازی، اسلحہ سازی، کٹلری، مشین کے پرزے، پیتل اور ٹین کے برتنوں کی تیاری میں مہارت حاصل کی۔ انگلستان کی طرح امریکہ میں بھی اصل کی فراہمی اور بازاروں کی دریافت کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت ترقی کرتی گئی۔ انگلستان سے آزاد ہونے کے بعد امریکی نوآبادیات عارضی طور پر اس مرکز سے الگ ہوگئی تھیں جس سے کہ وہ مصنوعات حاصل کیا کرتی تھیں۔ مگر رفتہ رفتہ امریکہ میں بھی صنعتی ترقی ہوتی گئی۔ لوہے اور اون کی صنعتوں کو انعامات اور رقمی امداد دے کر جاری کیا گیا۔ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۱۵ء تک کے دوران میں امریکی کارخانے برابر ترقی کررہے تھے۔ مگر ۱۸۱۵ء میں صلح کے بعد انگلستان کا مال امریکہ میں تیزی سے برآمد ہونے لگا۔ امریکہ کی تمام منڈیاں انگلستان کے مال سے بھر گئیں۔ مگر انجام کار امریکہ کو اس گلوتراش مقابلے سے نجات مل گئی جس کے اسباب

حسب ذیل ہیں :-

(۱) ۱۸۱۶ء اور ۱۸۱۸ء کے تاریفی محاصل
(۲) اندرون ملک ایندھن اور خام پیداوار کی فراوانی
(۳) محنت کی بچت کرنے والی مشینوں کی ایجاد
(۴) سرمایہ داروں کی شغلِ عمل کے لئے آمادگی
(۵) عالمگیر خوش حالی کی تجدید
(۶) ملکی بازار کی مسلسل توسیع

امریکہ میں انگلستان کی ایجادات نے صنعتی انقلاب کی بنیاد رکھی تھی مگر بہت جلد ان میں امریکی حالات کے مطابق اصلاح اور ترمیم کرلی گئی -

سب سے پہلے سوتی اور اونی دھاگہ بننے کے کارخانے تیار ہوئے - آگے چل کر اس دھاگے سے کپڑا تیار کرنے کے کارخانے قائم کئے گئے - ۱۸۱۴ء کے بعد جگہ جگہ کپڑا بننے کے کارخانوں کا قیام عمل میں آنے لگا - ۱۸۰۸ء سے ۱۸۱۵ء تک کے عرصے میں کپڑے کے پچاس کارخانے (Massdehusetts) میں کھل گئے تھے - یہ ترقی مسلسل جاری رہی - یہاں تک کہ ۱۸۵۰-۵۵ء میں امریکہ سے سوتی صنعت کی برآمد کی مقدار دوگنی ہوگئی اور چین، مشرقی امریکہ اور جنوبی امریکہ کے ممالک کو سوتی کپڑے کی مسلسل برآمد ہونے لگی -

ریلوں اور ذرائع حمل و نقل کی ترقی نے ملک کی مصنوعات کے لئے نئے نئے بازار پیدا کئے - سڑکوں کی تعمیر کی بدولت داخلی تجارت آسان ہوگئی - حالانکہ اس کے قبل خارجی تجارت زیادہ آسان تصور کی جاتی تھی - اوائل انیسویں صدی سے ۱۸۱۴ء تک اور بالخصوص ۱۸۱۲-۱۴ء میں انگلستان سے جنگ کے زمانے میں غیر ملکی درآمد گھٹ گئی تھی جس کی وجہ سے اندرون ملک مصنوعات کی قیمتیں بڑھ گئیں اور لوگوں نے اپنا اصل صنعتوں میں لگانا شروع کردیا تھا - مگر جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے ۱۸۱۵ء میں انگلستان کی مصنوعات کی درآمد بہت زیادہ ہوگئی، اس سے شدید نقصان سوت، اون اور لوہے کی صنعتوں کو ہوا - سوت کی غیر ملکی طلب اتنی بڑھ گئی تھی کہ امریکی صناع اسے مناسب قیمت پر حاصل نہ کرسکتے تھے - اون کی صنعت کا یہ حال تھا کہ نیو انگلینڈ میں کارخانوں کی نصف مشنری بے کار پڑی ہوئی تھی - مگر اس مسابقت کے دوران میں بھی بہ حیثیت مجموعی امریکی صنعتیں ترقی کررہی تھیں - اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی کی رفتار بہت سست ہوگئی تھی - چنانچہ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے ۱۸۱۶ء اور ۱۸۲۴ء میں محاصل عاید کئے گئے اور ۱۸۳۳ء سے پھر بڑی تیزی سے صنعتی ترقی ہونے لگی - ۱۸۳۳ء سے ۱۸۶۱ء تک کے عرصے میں سوائے ۱۸۳۷ء اور ۱۸۵۷ء کی دقتوں کے مسلسل صنعت و حرفت ترقی کرتی رہی - باوجود خام پیداوار کی کمی کے اون کی صنعت نے بھی کافی ترقی کی - ۱۸۴۸ء میں بنائی کے لئے "Power loom" کی ایجاد سے قالین سازی نے خوب فروغ حاصل کیا - ہوزری میں مشینوں سے کام لیا جانے لگا - جہاز سازی نے خوب ترقی کی اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس زمانے میں امریکہ کا Tonnage دنیا بھر کا ایک تہائی تھا -

صنعتی انقلاب کے بعد دھاتوں کو صاف کرنے کے بہتر طریقے ایجاد ہوئے۔ ریلوں اور ذرائع حمل و نقل کی ترقی کی بدولت کوئلے اور لوہے کے ذخیروں کو ایک دوسرے سے ملا دیا گیا۔ لوہے کو صاف کرنے کے طریقے میں اصلاح ہوئی ۱۸۴۰ء میں لوہا صاف کرنے کے لئے چارکول کی جگہ بغیر دھوئیں کا کوئلہ (Anthrucite) استعمال ہونے لگا۔ ۱۸۴۲ء میں انگریزی لوہے کی درآمد پر محصول عائد کیا گیا جس سے لوہے کی صنعت کو بڑی ترقی ہوئی۔ خانہ داری کی ضروریات اور سب سے بڑھ کر لوہے اور فولاد کی ریلوے کی پٹڑیوں کے استعمال کی بدولت آہنی مصنوعات کی طلب بہت بڑھ گئی۔ ۱۸۵۰ء تک شمال کے سب بڑے بڑے شہروں میں لوہے کے کارخانے قائم ہو گئے تھے۔ خانہ جنگی کے ختم ہو جانے کے بعد (Tennessee) الباما اور جارجیا کی ریاستوں کے لوہے کے ذخیروں سے پوری طرح فائدہ اٹھایا گیا۔

امریکہ کی صنعتی ترقی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۱۱-۱۸۹۰ء کے درمیان فی سال اوسطاً ۷۷ اشیا پیٹنٹ کرائی جاتی تھیں مگر ۱۸۵۰-۱۸۶۰ء میں یہ اوسط ۲۸۰۰ سالانہ ہو گئی۔ خودبخود چلنے والی مشینوں کی ایجاد سے دھات کی (Automatic Machinery) بنی ہوئی اشیا کی پیدائش بڑھ گئی کیونکہ اس کی مدد سے ایک ہی شکل اور ایک ہی سائز کی ہزاروں اشیا تیار کی جاتی تعین معیار...... (Standardisation) سے اور بھی سہولت ہوئی (Eli whitney) نے مشین کے مختلف اجزا کی باہم منتقلی (Interchangeallity) کے اصول سے امریکہ کو روشناس کرایا اور بہت جلد یہ اصول امریکی صنعت کا اہم جزو بن گیا۔ جوں جوں مغرب کی طرف آبادی بڑھی جہاں جہاں گیہوں کی کاشت کے لائق رقبے نظر آئے وہاں آٹا پیسنے کے کارخانے بھی کھل گئے اور جہاں پانی کی قوت محرکہ دستیاب نہ ہو سکی وہاں ان کو بھاپ سے چلایا گیا۔ آگے چل کر بجلی کا استعمال عام ہو گیا۔ وادی اوہیو (Ohio) کے بس جانے کے بعد گوشت بند ڈبوں میں بھیجنے کی صنعت نے بڑی ترقی کی بعد میں اس صنعت نے اپنے مراکز مغرب کی طرف شکاگو Omaha اور Kanasas میں منتقل کر دئے۔ آبادی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ عمارتی لکڑی کی طلب فرنیچر وغیرہ کے لئے بڑھ گئی۔ ترقی یافتہ مشینوں کی بدولت لکڑی سستی ہو گئی۔ جوتا سازی کی صنعت کی ترقی دیر میں ہوئی۔ گر قدیم ڈگر پر یہ صنعت وسیع ہوتی گئی۔ ۱۸۶۰ء میں اس کے لئے نئی مشینیں ایجاد ہو گئیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں امریکہ میں ٹرسٹ قائم ہونے لگے جس سے مسابقتی (Competitive) صنعت کو خطرہ لاحق ہوا۔ ٹرسٹوں سے صارفین اور مزدوروں کو نقصان ہو سکتا ہے۔ وہ حکومت اور سیاست کو بھی اپنی دولت سے متاثر کر سکتے ہیں گران سے فائدے بھی ہیں۔ وہ مصارف پیدائش کو گھٹا دیتے ہیں، غیر ملکی بازار حاصل کر لیتے ہیں اور کاروبار کو زیادہ احتیاط اور دور اندیشی سے چلاتے ہیں: بہرحال ۱۹۵۵ء کے بعد ٹرسٹوں پر حکومت نے اپنی نگرانی قائم کر لی:

آیت اللہ بیگ عارف

سب رس کے قلمی معاونین سے :-

مضامین، افسانے اور نظمیں بھیجتے وقت ایک ادبی رسالے کے معیار کا ضرور خیال رکھیں یہ ضروری نہیں کہ ہر لکھی ہوئی چیز شائع بھی ہو— ادارہ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

([illegible])

روسی ادب

(انقلاب تک)

[روسی ادب اور حسن کار اپنے مخصوص زاویۂ فکر اور دو تعلق فکر کی وجہ سے دنیائے ادب میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ یہاں بارہ کلاسیکل حسن کاروں کی زندگی اور تصانیف کا مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے جو Soviet union News کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے۔ یہ ان ادیبوں کا ذکر ہے جن پر قبل انقلاب ادبی دور ختم ہوتا ہے۔ تالستائے کے بعد فلسفۂ معاشرت دستہ یفسکی کے بعد نفسیات اور روحانیات، چیخوف کے بعد تعلیم یافتہ طبقے کی عام زندگی کو ناول نگاری کا موضوع بنانا ان ادیبوں کے کلام میں اصلاح دینا تھا جو کہ انتہائی تباہی اور بربادی ہوتی اور اس کا نتیجہ جگ ہنسائی کے سوا کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ گورکی نے عوام کی زندگی ان کے جذبات اور احساسات کی تصویریں کھینچ کر روسی ناول کو قومی زندگی کا مکمل آئینہ بنا دیا۔ اس کے بعد یا تو زندگی ملتی جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہوا، یا ناول لکھنا چھوڑ دیا جاتا کوئی تیسری صورت نہ تھی۔" تو یہ ان ادیبوں کا ذکر ہے جنھوں نے ایک دور کو ختم کر دیا اور دوسرے درخشاں تر زمانے کی پیش رس کی تمنا میں ترانے گائے۔ یہاں تک کہ افق روس پر نئے سورج کی پہلی کرن پھوٹی اور سرخ سویرے سے انسانیت، ادب اور تہذیب کا دامن مالا مال ہو گیا۔]

لومونوسوف (۱۷۱۱ - ۱۷۶۵) آرچنگل کے قریب ایک دیہات میں پیدا ہوا۔ باپ نے اپنے پیشے میں شریک کر لیا جو مچھیرا تھا۔ (ایک تذکرے میں لکھا ہے کہ خوش حال کسان تھا۔ مترجم) لیکن لومونوسوف کو تحصیل علم کا ذوق تھا اس لئے سترہ سال کی عمر میں پاپیادہ ماسکو سدھارا اور کسی مدرسہ میں داخل ہو گیا بڑا ذہین طالب علم تھا اس لئے بعد کو سینٹ پیٹرزبرگ بھیجا گیا جہاں بیرون جات میں تکمیل علم کے لئے دوسرے نوجوانوں کے ساتھ اس کا بھی انتخاب ہو گیا۔ تحصیل فزکس کی تحصیل کے ساتھ ساتھ شعر بھی کہنے لگا۔ وطن کو مراجعت کی تو دار العلوم سینٹ پیٹرزبرگ میں شعبہ کیمیا کی پروفیسری مل گئی اور کچھ ہی دنوں میں رکن بنا دیا گیا۔ ۱۷۵۷ء میں سکریٹری آف اسٹیٹ کے عہدہ پر فائز ہوا۔

اس کی "خطابت"، "روسی زبان کی قواعد" اور مضامین بہت مشہور ہیں۔ سوویٹ یونین لومونوسوف کو روسی زبان کی قواعد کا بانی اور عنصری روسی ادبی زبان کا خالق تصور کرتی ہے اور روسی عوام کے فرزند اعظم کی حیثیت سے تعظیم دیتی ہے۔

کریلوف (۱۷۶۸ - ۱۸۴۴) روس کا قومی حکایت گو ہے۔ ماسکو میں ایک فوجی افسر کے گھر پیدا ہوا۔ نو سال کی عمر میں دفتری چھوکرے کی حیثیت سے کام کرنے لگا لیکن بعد میں سینٹ پیٹرزبرگ (لینن گراڈ) کے کسی دفتر میں ایک اسامی مل گئی۔ ۱۸۰۵ء میں لافونتین کی حکایتوں کا ترجمہ کیا۔ ۱۸۰۸ء میں سترہ حکایتیں شائع کروائیں جن میں بہتیری اپنی تھیں۔ ۱۸۰۹ء میں اس کی "حکایات" کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا جس میں خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقے کی اس اندھی تقلید پر طنزیات ہیں جو فرانس کی ریس میں کی جاتی تھی۔ روسی، حکایت نویسوں کے بڑے شیدائی ہوتے ہیں اس لئے کریلوف بہت زیادہ محبوب اور ہر دل عزیز رہا۔ اس کی بیشتر حکایتیں کسانوں کی روزمرہ زبان میں لکھی گئی ہیں اور سیدھے سادے قصوں میں کاہلی، حرص و آز اور روزمرہ زندگی کی لاپروائیوں پر طنز و تضحیک کی گئی ہے۔

لرمنتوف (۱۸۱۴ - ۴۱) شاعر اور ناول نگار تھا۔ اکثر "شاعر قفقاز" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ماسکو کے ایک اسکاچ نسل کے گھرانے میں پیدائش ہوئی۔ ماسکو کے جمنازیم سے دارالعلوم میں داخل ہوا لیکن کسی عدول حکمی کے سلسلے میں تعلیم منقطع ہوگئی۔ اپنے کیڈٹوں کی درسگاہ میں شرکت حاصل کی اور کوئی عہدہ مل گیا۔ پشکن کی وفات پر زار کو مخاطب کرکے ایک ولولہ انگیز نظم "شاعر کی موت پر" لکھی جس کی بنا پر گرفتاری عمل میں آئی کورٹ مارشل ہوا اور فوج سے علیحدہ کرکے قفقاز بھیج دیا گیا۔ یہ جلاوطنی صرف ایک سال جاری رہی۔ وطن لوٹا تو اپنی مشہور تصنیف "ہمارے زمانے کا ایک جواں مرد" لکھی (جس میں خود اپنی شخصیت کو پیش کیا ہے۔ شاعرانہ بانکپن اور آوارگی کا نقطۂ [illegible] میں مکمل مل گیا تھا، اور اس نے اپنی اس دہری شخصیت کو ہمارے زمانے کا ایک جواں مرد ہیرو "پچورن" میں نکھار دیا ہے۔ وہ ہر لڑکی پر ڈورے ڈالتا ہے اور جب وہ گھائل ہو جاتی ہے تو نظریں پھیر لیتا ہے اس لئے کہ گھائل کرنا ہی اس کی فطرت ہے۔ (مترجم)

۱۸۴۱ء میں پیاٹگارسک کے قریب ڈویل لڑنے میں مارا گیا۔ اس کی مشہور نظمیں یہ ہیں۔

- "اسماعیل بے"، "ہاجی ابرک"، "تواموزا"، "والرک" وغیرہ۔ "زار ایوان ویسلی وچ اور بہادر سوداگر کلاشن کوف کا گیت" اس حیثیت سے مابہ الامتیاز ہے کہ قدیم روسی بیلڈ (Ballad) کے انداز میں کامیاب کوشش ہے۔

سوویت یونین کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ لرمنتوف کی تصانیف ان دنوں ہزاروں کی تعداد میں سالانہ شایع ہوتی ہیں اور اس کا شمار سوویت یونین کے محبوب شعرا میں ہے۔

پشکن (۱۷۹۹ - ۱۸۳۷) کو بحیثیت شاعر روسی ادب میں مرکزی مقام حاصل ہے۔ بائرن کے ایک قدیم خاندان میں بہ مقام ماسکو پیدا ہوا۔ بچپن میں سینٹ پیٹرزبرگ کے قریب ایک مکتب میں شریک کردیا گیا۔ ۱۸۱۷ء میں مکتب چھوٹا تو محکمۂ وزارت خارجہ سے وابستہ ہوگیا اور اسی سال "رسلان لیودمیلا" لکھنی شروع کی۔ ایسے میں وہ خوش باشوں کی محفل میں کچھ ایسا گھل مل گیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ شاعری کی بجائے ایک فیشن زدہ ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن اسی زمانے میں "آزادی کا گیت" گورنر کی نظروں میں پڑا جس کے رد عمل کے طور پر جنوبی روس میں شہر بدر کردیا گیا۔ اسی جلاوطنی کے دوران میں وہ بائرن کی تصانیف سے متعارف ہوا جو کچھ عرصے کے لیے اس کی طبع شاعرانہ کی تحریک کا باعث ہوئی۔ یہ امر نہایت ہی عجیب ہے کہ زندگی نے اس سے کچھ دیا وہ دن نباہ نہ کی اور حالات بھی بیحد ناساز گار رہے (مضمون نگار کا مطلب شاید اس احتساب سے ہے جو نہ صرف حکومت نے عائد کر رکھا تھا بلکہ خود زار نے اسے اپنے دربار میں جگہ دے کر پابند کر دیا تھا۔ ساتھ ہی یہ نشاط انگیز صحبت تخلیقی کام کے لئے سنگ راہ ثابت ہوئی۔ مترجم) لیکن اس مختصر اور ناساز گار دور میں روسیوں کا قومی شاعر بن گیا۔ وہ وسیع القلب، آزاد خیال اور غیر معمولی طور پر مہذب و شائستہ تھا۔ ایک طرف تو وہ انتہائی روسی تھا اور دوسری طرف یورپین۔

اس نے اپنا تاریخی ڈراما "بورس گودونوف" شکسپیر کے زیر اثر لکھا۔ بعض ابتدائی نظموں میں بائرن کا رنگ جھلکتا ہے اور دو نثری تصانیف میں سر والٹر اسکاٹ کا اثر نمایاں ہے۔ ان ادیبوں کے اثرات دیرپا نہ تھے بلکہ اس کی تخلیقی جبیں کے سنوارنے اور نکھارنے کے لئے سنگ بنیاد تھے۔ پشکن کی پہلی نثری تصنیف "پیتر اعظم کا حبشی" ہے جس کے بعد "کپتان کی بیٹی"، "پگاشیف کی بغاوت کی تاریخ"، "ڈبراسکی"، "گوریوخینو کی تاریخ" وغیرہ بھی۔

گنیں پشکن کی نثر کے کتنے ہی دور رس اثرات کیوں نہ ہوں لیکن اس کا منظوم ناول (جیسا کہ وہ خود کہتا ہے)

"ایوجن دیگن" زیادہ اہم ہے۔

گوگول (۱۸۰۹-۵۲) بمقام سارو شِشنکی یوکرینی
[؟] خاندان میں پیدا ہوا اور بچپن کا زمانہ یوکرین کی
کھلی فضا میں بسر کیا۔ ۱۸۳۰ء میں مستقبل کی کامرانیوں
کی تلاش میں سینٹ پیٹرزبرگ روانہ ہوا لیکن قدم قدم
پر آفات نے خیر مقدم کیا۔ دکنی جوش، شگفتگی اور
ادا کارانہ مہارت کے ساتھ تخلیقی کام شروع کیا اور
نتیجہ "دکانکا کے قریب ایک کھیت کی شام" پیش کیا
اس کتاب کا اس لئے بھی سرگرم خیر مقدم کیا گیا کہ متداول
عقائد و رسومات اپنی پوری آب و تاب دکھلا رہے تھے
جو اس زمانے کا فیشن تھا۔ سب سے زیادہ قابل توجہ
چیز گوگول کی زبان ہے جو قافیہ، ترنم اور صنائع لفظی و
معنوی سے پرکار ہو گئی ہے۔ گوگول کی نثر کا کامل نمونہ
"وحشیانہ انتقام" ہے۔ کلاسک واقعاتی اسلوب پشکن
کی نثر میں اپنی تکمیل کو پہونچ چکا تھا، گوگول نے نثر کی
سیمابی طبیعت کو بلند کیا اور مرصع و مترنم نثر کو اس کے
نقطۂ کمال پر پہونچا دیا۔ اس کا دوسرا مجموعہ "میرگورود"
نثر میں ایک طرح کی قازق "الید" ہے۔

گوگول کی تخلیق میں اگلے وقتوں کے زمیندار
"ادان دوچ اور ادان نکو رو دوچ کی لڑائی"، "ایک
خاتون کی سرگزشت" "نفسکی پراسپکٹ" (یہ ایک سڑک
کا نام ہے۔ مترجم) "لبادہ"، "تصویر" اور "انسپکٹر
جنرل" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ گوگول کی تصانیف کا یہ
دھندلا سا خاکہ اس وقت تک کا ہے کہ اس کا شاہکار
"مردہ روحیں" پیش نہ ہوا تھا۔ یہ تخلیق یورپی ادب
کی حسن کامانہ کامران کاوشوں میں عظیم تر اہمیت رکھتی ہے۔
مردہ روحوں میں روسی معاشرے اور صوبائی زندگی کی
ناقابل فراموش تصویروں کا ایک لامتناہی سلسلہ ملے گا۔

دستہ نفسکی (۱۸۲۱-۸۱) ماسکو میں پیدا ہوا
ماسکو اور سینٹ پیٹرزبرگ کے حربی انجینیری کے مدرسے
میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۴۳ء میں فوجی کمیشن حاصل کیا۔
لیکن تین سال بعد اس سلسلے کو منقطع کر کے اپنے آپ کو
ادب کے لئے وقف کر دیا۔ اس کی پہلی تصنیف "غربا"
ہے۔ اس کتاب کی اشاعت ان اہم واقعات کے
سلسلے کی ایک کڑی ہے جو نئے ادبی دور کی غمازی کر
رہے تھے۔ نوجوان ناول نگاروں میں دستہ نفسکی
سب سے زیادہ ہونہار معلوم ہوتا تھا۔ نیم انقلابی سیاسی
انجمن (پتراشوف سکی کا حلقہ جس میں اشتراکیت کا
پرچار ہوتا تھا اور مارکسی تعلیمات پر بحث و تمحیص ہوا
کرتی تھی۔ اس حلقے کے زیادہ تر ارکان اشتراکی تھے۔
ایک دفعہ ارکان انجمن کو یکایک گرفتار کر لیا گیا۔ نہ جرم
بتلایا گیا نہ صفائی طلب کی گئی۔ خود ارکان کو بھی اپنے
جرم سے کوئی آگاہی نہ تھی۔ مترجم) کے رکن کی حیثیت
سے اس کی گرفتاری عمل میں آئی اور سزائے موت
تجویز کی گئی۔ دستہ نفسکی اور اس کے رفیقوں کو
قتل گاہ پہونچایا گیا، قتل کے تمام مراسم طے پا چکے تھے
کہ عین گردن زدنی کے وقت معافی کے احکام سنائے گئے۔
(زار کے حکم سے سزائے موت جلاوطنی میں بدل دی گئی۔ مترجم)
ان ساعتوں نے دستہ نفسکی پر گہرا رنگ چھوڑا چنانچہ
اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی تصانیف میں ذکر
کیا ہے۔ چار سال تک سائبیریا میں قید رہا اور اس کے
بعد مزید چار سال سمی پلاٹنسک میں سپاہی کی حیثیت
سے کام کرنا پڑا۔ رہائی کے بعد ہی دو تصانیف شائع
ہوئیں "مردوں کا گھر" اور "بے کس و مظلوم"۔
"جرم و سزا" "ناظر العقل" "بھوت پریت"
"برادران کرمازوف" "سدا سہاگی" "خام کار
نوجوان" اور "مصنف کا روزنامچہ" وغیرہ بعد
میں شائع ہوئے۔ موخر الذکر تصانیف اگرچہ مختصر ہیں
لیکن دستہ نفسکی کو سمجھنے میں اہم ہیں۔ ان
نگارشوں میں اس کی وہ تمام صلاحیتیں نمایاں ہیں جو

اسے بلا قید زماں سب سے بڑے ناول نگار کا مقام بخشتی ہیں اور غیر معمولی استثنائی شخصیت کی بلند ترین عظمت کی شاہد ہیں۔

نکراسوف (۱۸۲۱-۷۷) یاڑولیا میں ایک زمیندار کے سلب سے پیدا ہوا اس نے اپنے باپ کے منشاء کے خلاف سینٹ پیٹرز برگ میں تحصیل علم شروع کی جس نے بیٹے کو اپنے معاشی وسائل آپ تلاش کرنے کے لئے اکیلا چھوڑ کر اس دنیا سے چل بسا - انیس سال کی عمر میں نکراسوف کی نظموں کا پہلا مختصر مجموعہ "خواب و صدا" شایع ہوا - وہ عوامی شاعر تھا اس لئے اس نے غریب دکھیارے عوام کی بپتا اور دکھ درد کو اپنی نظموں میں پیش کیا ہے جس کی بنا پر وہ مصلحین کے لئے ایک نمونہ بن گیا - نکراسوف کی نظموں کے مشہور مجموعوں میں "سرخ کہرا" اور "روس میں چین و آرام سے کون رہ سکتا ہے" شامل ہیں۔

ترگنیف - (۱۸۱۸-۸۳) صوبہ کے ایک معزز گھرانے میں بمقام اورل پیدا ہوا - تعلیم گھر پر، جامعات ماسکو، سینٹ پٹرز برگ اور بالآخر برلن میں ہوئی - جہاں تعلیم یافتہ روسی نوجوانوں سے میل جول کی وجہ سے وہ بھی مغربی خیالات کا پیرو بن گیا - کچھ دنوں سرکاری ملازمت کی لیکن بعد میں ملازمت ترک کر کے اپنے آپ کو ادب کے لئے وقف کر دیا - پہلی کامیاب ترین کوشش "کھلاڑی کے خاکے" سے عبارت ہے - جس میں کسان اپنے آقاؤں سے زیادہ جاذب نظر دکھائی دیتے ہیں - اس کے شہ پاروں میں "سکون" "آسیا" "نگاہ اولین" جیسے فسانے اور "ردوف" "استراف کی خلوت گاہ" "جھٹپٹا" اور "باپ بیٹے" جیسے ناول شامل ہیں - جن میں پلاٹ اور عصری معاشری مسایل تار و پود کی طرح پیوست ہیں ترگنیف کی تمام تصانیف پر چوٹی کے نقادوں نے تبصرے اور تنقیدیں کیں - اس کی حساس طبیعت تنقیدی نیش زنی کی تاب نہ لا سکی اور اس نے وطن کو خیر باد کہہ کے پردیس میں سکونت اختیار کی - بعد کی تصانیف اسی تنقید کی صدائے بازگشت ہیں - اپنے دو ناولوں یعنی "دھواں" اور "اچھوتی زمین" میں اس نے انہیں حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے اس کی طبیعت کی شدت اور حساسیت کا اندازہ ہوتا ہے - غیر معمولی حساسیت بے مثال قوت مشاہدہ خاص طور پر انسانی کردار کا - طریق اثر پسندی، ماہرانہ بے رنگ، صلاحیت توازن اور زبان کا ترنم، روانی اور فصاحت ترگنیف کی چند ایک نمایاں خصوصیات ہیں - ترگنیف ہی وہ سب سے پہلا روسی ادیب ہے جسے فرنگیوں نے پڑھا اور بے حد پسند کیا۔

ٹالسٹائے (۱۸۲۸-۱۹۱۰) اپنے والدین کے دیہی مستقر یاسنایا پولیانا میں پیدا ہوا جو طولا کے صوبہ میں واقع ہے - ابتدائی تعلیم فرانسیسی (وجرمن مترجم) اتالیق کی نگرانی میں ہوئی - (لیکن یہ سلسلہ ماں باپ کے انتقال پر ختم ہو گیا بعد میں کچھ دنوں صرف فرانسیسی اتالیق کی نگرانی رہی - مترجم) اور بعد میں دار العلوم قازان میں شریک کر دیا گیا - قازان معاشری مرکز تھا اس لئے ٹالسٹائے کا زیادہ تر وقت سوسائٹی میں بسر ہوتا تھا - اس کے بعد کا زمانہ ماسکو میں بسر ہوا لیکن ۱۸۴۷ء میں قفقاز چلا گیا اور توپ خانہ کی جمعیت میں بھرتی ہو گیا - (جہاں اس کا بھائی نکولائی کپتان تھا - ٹالسٹائے کے قفقاز جانے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ نکولائی نے قفقاز کے موسم، باشندوں اور فطری حسن کی تعریف سے اس کے دل میں - اس دیس کو دیکھنے کی امنگ پیدا کر دی تھی جس کی شاعر قفقاز لرمنتوف اور پشکن نے اپنی تصانیف میں بے حد ستائش کی تھی - خود ٹالسٹائے نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایسی رومانی اور زندگی بخش فضا میں کیا - "بچپن، لڑکپن اور جوانی" "جنگل کی کٹائی" "قازق"

"جنگ کے خاکے"، "سیباسٹاپول دسمبر میں" اور سیباسٹاپول مئی میں" اسی قفقاز کے آغوش میں لکھی گئیں۔ مترجم) اور ترکوں سے مقابل اور سیباسٹاپول کے محاصرہ میں بہادرانہ حصہ لیا۔ قلعہ کی تسخیر کے بعد اسے سینٹ پیٹرزبرگ بھیج دیا گیا۔

تالستائے کی مشہور تصانیف میں "جنگ و امن" "آننا کرینینا" "اعترافات" "بچپن" "لڑکپن" اور جوانی" "قازق" "بازفاست" "کرائسٹر سوناٹا" "باطل کی قوت" "روشن خیالی کا پھل" اور "زندہ لاشیں" شامل ہیں۔ ۱۸۷۶ کے لگ بھگ تالستائے نے اپنی عیش پذیر اور خوش حال زندگی سے الجھن سی محسوس کرنی شروع کی۔ سر پر کھڑی ہوئی موت کا ناقابل تسخیر خیال آسیب کی طرح دل پر مسلط ہوگیا، اس لیے وہ اپنی زندگی کے مذہبی جواز کی تلاش میں سرگرداں ہوگیا اور یہ قوت اس پر پوری شدت کے ساتھ محیط ہوگئی۔ اس کا شر سے عدم مقاومت کا نظریہ (اک زمانہ گزرنے اور اس کے رجعت پسند ہوجانے کے باوجود بھی گاندھی جی اسی نظریے کے پرچار میں مصروف ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ گاندھی جی اپنے "استاد" سے زیادہ باعمل ہیں مترجم) اس کے عقیدے کی بنیاد بن گیا جو بہت جلد ہی "تالستائیت" کے نام سے مشہور ہوگیا۔ تالستائے نے اپنی اس معکوسیت کی بھدی روئداد "میرے اعترافات" میں بیان کی ہے۔ اس کی مذہبی تعلیمات پر بہت زیادہ بحث تمحیص اور تنقید ہوئی لیکن لزف رن نے بہت ٹھیک کہا ہے کہ "تالستائے کی اہمیت بہ حیثیت مفکر مختلف فیہ ہوسکتی ہے لیکن حسن کار تالستائے کا شمار بہرحال عظیم ترین شخصیتوں میں ہے"

الغرض تالستائے کی طبیعت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ ساری زندگی ذہنی کش مکش میں مبتلا رہا۔ یوں بھی اس کے عزائم اور خواہشات ہمیشہ اس کی دست رس سے آگے ہوتے لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ اور حیرت انگیز وہ کش مکش تھی جو خاندانی روایات اور اپنے عقاید کے مابین پیدا ہوچلی تھی۔ اس کے عقاید اسے مجبور کررہے تھے کہ روایات، قدامت اور تمول کے نشانات ختم کردے لیکن خاندان بالخصوص بیوی اور اولاد پر نہ تو اس کی تعلیمات کا کوئی اثر پڑا اور نہ وہ اپنی قدیمی وضع بدلنے کو تیار تھے بلکہ الٹے ان کی یہی کوشش رہتی کہ وہ بھی ان کا شریک رہے۔ اسی کش مکش سے تنگ آکر اس نے بیوی کو ایک خط لکھا اور گھر چھوڑ کر روانہ ہوگیا۔ اسی سفر میں موت نے اس کا خیر مقدم کیا اور اس نے کسی تیسرے درجے کے تاریک اسٹیشن میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مترجم)

چیخوف (۱۸۶۰-۱۹۰۴) ڈراما نگار اور فسانہ نویس تھا۔ تگن روگ میں پیدا ہوا جو بحر آزوف کے ساحل پر واقع ہے۔ اس کا باپ ایک کاروباری آدمی تھا اور دادا زرعی غلام (جس نے روپیہ جمع کرکے آزادی "خرید" لی تھی اور تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ مترجم) چیخوف نے اسی زمانے سے لکھنا شروع کیا جب کہ وہ جامعہ ماسکو میں طب کا طالب علم تھا۔ ابتدا کی کہانیاں زیادہ تر مزاحیہ اور طنزیہ ہوتی تھیں اور ایسے ہی پرچوں میں شایع ہوتی تھیں "گل کار کہانیاں" اسی مزاح و ظرافت کا شکار رہیں۔ لیکن بہت جلد اس میں ایک نمایاں تبدیلی رونما ہوئی جو سب سے پہلے اس کے ڈرامے "اوانوف" اور افسانوں کے مجموعے "اداس انسان" میں ظاہر ہوئی۔ یہ دونوں کتابیں زندگی کے اس گم نام موڑ کے نشان راہ کی وارفتگی پر غمازی کرتی ہیں جو عنفوان شباب کا سرمایہ ہے۔

چیخوف کے شہ پاروں میں "ماموں وانیا" "تین بہنیں" "گلستان فاش وانہ" "میری زندگی" "سنگین کنہیا" "کہنائے" "اسٹیپ" "مسرت"

"وایسٹر کی شام" "ڈویل" "وارڈ نمبر ۶" وغیرہ شامل ہیں۔ اس کا شمار ڈراما نگار کے علاوہ دنیا کے چوٹی کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

چیخوف کا اثر روسی ادب پر دیرپا نہ رہا۔ اس کی موت کے فوراً بعد ہی نئی ادبی تحریک کو عروج ہوا اور چیخوف کی ادبی روایات کے جاری رہنے کے تمام تر امکانات ختم ہوگئے۔ آج کے روس میں چیخوف اپنے ہم رتبہ ادیبوں میں سب سے زیادہ بیگانہ ہے۔ لیکن دوسری طرف روس کے باہر پچھلے چند برسوں میں اس کے اثرات بڑھتے جا رہے ہیں (چیخوف کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس کی زندگی کے دوران ہی میں اس کے افسانوں کا اکیس زبانوں میں ترجمہ ہوا تھا۔ اس کی ہردل عزیزی کا یہ عالم تھا کہ جب اس کا انتقال برلن کی صحت گاہ باڈن وائلر میں ہوا تو چھے سال بعد اس کی یاد میں ایک مجسمہ نصب کیا گیا۔ اس کا جنازہ اس اہتمام اور تزک و احتشام سے اٹھایا گیا کہ دنیا کے دوسرے ادیبوں میں دستوئفسکی کے علاوہ کسی اور کی مثال آج تک نہیں ملتی۔ مترجم)

گورکی (۱۸۶۸-۱۹۳۶) اس کا نام الکسی ماکسی موو چے پشکوف تھا۔ نشنی نوف گورود (شہر استراخان) میں پیدا ہوا جو اب اسی کے نام سے معنون ہے۔ اس کا باپ فرنیچر ساز تھا (ایک تذکرے میں لکھا ہے کہ کسی جہاز راں کمپنی کا نمائندہ تھا۔ مترجم) پانچ سال کی عمر میں یتیم ہوگیا اس لئے ماں کے ساتھ نانا کے گھر رہنے لگا نو سال کی عمر میں (جب کہ اس کی ماں نے دوسرا عقد کرلیا اور بہت جلد دق کا شکار ہوگئی۔ مترجم) خود اپنا پیٹ آپ پالنے پر مجبور ہوا اور پندرہ سال تک مختلف پیشے اختیار کرتے ہوئے مشرقی و جنوبی روس کی خاک چھانی۔ اسی دوران میں اپنی تعلیم کی طرف متوجہ ہوا اور ندیدوں کی طرح کتابوں پر ٹوٹ پڑا۔ ساتھ ہی انشا پردازی بھی شروع کردی صوبائی جرنلسٹ بنتے دیر نہ لگی اور ۱۸۹۵ء اس کی کہانی "چیلکاش" سینٹ پیٹرزبرگ کے کسی چوٹی کے ریویو میں قبول کرلی گئی۔ دو سال بعد کہانیوں کا مجموعہ شائع ہوا اور اس طرح بہت جلد دنیائے شہرت پر آفتاب بن کر چمک اٹھا۔ لینن کے دوست کی حیثیت سے انقلابی تحریکوں میں سرگرمی کے ساتھ عملی حصہ لیا۔ وہ سب سے پہلا چوٹی کا اشتراکی ادیب ہے جس کی تصانیف اور سرگرمیاں مزدور جماعت کے نام معنون ہیں۔ ۱۹۰۰ء میں گورکی کو اس کی انقلابی ذہنیت اور سرگرمیوں کی بنا پر شہر بدر کرکے نوف گورود بھیج دیا گیا۔ ۱۹۰۲ء میں شاہی اکادمی کا رکن منتخب کیا گیا لیکن اس کی معروفیت اور عقاید کی بنا پر یہ انتخاب مسترد کردیا گیا۔ چیخوف ان دنوں زندہ تھا، وہ ایک ادیب کی توہین برداشت نہ کرسکا اور احتجاجاً خود بھی شاہی اکادمی کی رکنیت سے مستعفی ہوگیا۔ تین سال بعد پھر گورکی کو قید کردیا گیا۔ لیکن اس سزا کے خلاف سارا فرنگ اٹھ کھڑا ہوا، مجبوراً زار شاہی کو اپنا فیصلہ منسوخ کرنا پڑا۔ گورکی کا کمال فن یہ ہے کہ اگرچہ وہ غیر تعلیم یافتہ تھا اور کٹر انقلابی لیکن اپنے آرٹ کی انفرادیت اور حسن کارانہ شخصیت کو برقرار رکھا اور اپنے آرٹ و شخصیت کو انقلاب کی ہنگامہ خیزی میں گم نہ ہونے دیا۔ اس کے باوجود اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر عوامی ادب کا رہبر بن گیا۔ مترجم)

اس کے تخلیقی شہ کاروں میں .... "میرا ہم سفر" "چھبیس مرد اور ایک لڑکی" "ماں" "دنیا میں"، "میری تعلیم گاہیں" "بچپن" "فوما گوردے یف" اور "وہ تینوں" وغیرہ شامل ہیں۔

مرژکووسکی (۱۸۶۵-؟) سینٹ پیٹرزبرگ میں پیدا ہوا۔ ناول نگار اور ناقد تھا عدالت کے کسی عہدہ دار کا لڑکا تھا۔ شاعر کی حیثیت سے ناکام رہا تو فلسفیانہ تنقید، تاریخی ناول، ڈرامے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

٢

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سادھو کے بول

قصہ ہے داستانِ حیات
پھول ڈھونڈے ہیں خار پائے ہیں

دیکھیں کھیل کھیل میں ایسے کچھ گزرا کبھی سوچا بھی نہیں کب صبح ہوتی تھی اور کیونکر دیکھتے دیکھتے شام ہو جاتی تھی۔ البتہ شام کی آمد کا بہت انتظار رہتا تھا کیونکہ کھیل کی اجازت لے دے کر اسی وقت تو ملتی تھی۔ لڑائی، جھگڑا، دھول دھپا، ٹھوکر لگی، گرے، خون بہہ رہا ہے گھٹنے پھٹ گئے، بھاگے جا رہے ہیں۔ آتشبازی چھوڑی دامن جل گیا، خوب ڈانٹ سنی، گالیاں کوسنے، دھکیاں، لیکن پھر ویسے کے ویسے، نہ احساس، نہ رنج نہ تکلیف نہ ملال لڑکپن کی فرصت میں یہ سب گورکھ دھندے کہاں۔ دیکھتے دیکھتے صبح زندگی کی شام ہونے لگی۔ بھرپور شام، بڑے ہونے لگے آفت آگئی۔ دھیرے دھیرے عقل آنے لگی۔ غضب ہو گیا۔ یہ نہ کرو، وہ کرو، یہاں مت جاؤ، وہاں مت بیٹھو، باہر مت نکلو، پابندیاں، اصول، نصیحتیں، غرض صبح سے شام تک کی فضیحتیں، جی بیزار ہو گیا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر یہ سب کیوں کریں جس کے کرنے کو کہا جاتا ہے اور وہ کیوں نہ کریں جس کے کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ سمجھ آئی بھی کیوں۔ کون بلایا تھا اسے ہم ایسے ہی بھلے تھے ع

مجھ کو کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

رفتہ رفتہ اسکول سے کالج کے دن آئے۔ ۱۴ سال میں میٹرک کامیاب کیا۔ سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ نظر لگنے لگی۔ صدقے اترے۔ ٹوٹکے ہوئے غرض الابلا سب ہی کچھ ہوا۔ دو سال انٹر کے بھی خیریت سے گزرے۔ شاندار کامیابی، مبارکبادیاں، دعوتیں، گلپوشی، کالج کو چھٹیاں ہو گئیں اور ہم بی اے کے سپنوں میں کھو گئے۔ دن گنتی تھی۔ کب کالج کھلے گا۔ گریجویٹ ہونے میں دو ہی سال تو رہ گئے ہیں۔ پھر کیا ہے اور پھر اس کے بعد؟ اللہ دیکھا جائے گا۔ ادھر یہ تو میرے من کے سپنے تھے۔ ادھر گھر کے جس گوشے میں دیکھوں کھسر پھسر شروع ہو گئی تھی تعلیمی نظریہ سرگوشیاں، سر جوڑ کر چپ چپ سی باتیں مجھے دیکھتے ہی سب کے سب خاموش، جیسے کوئی سنگین جرم کا تعلق ہے۔ امی جان، ابا جان، پھوپھی جان تو میری تعلیم کی دشمن بن گئی تھیں۔ جانے ان کا کیا جاتا تھا۔ بس بہت پڑھ لیا ہے اس نے۔ اب شادی کر دو اس کی۔ جیسے میں ان پر بھاری تھی۔ ان پر دوبھر تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کیا منصوبے ہیں۔ کونسے ارادے ہیں، کس قسم کی اسکیمیں زیر تجویز ہیں۔ تعلیم کے بعد شادی کے سلسلے میں ان کی کیا کیا تیاریاں ہیں ؎

درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے!

گھر کی فضا سے جی اکتانے لگا تھا۔ اب جب وہی ماحول سے ہول سی ہونے لگی تھی۔ وہ کالج کی چہل پہل، ہم سبقوں کی صحبت، ہم نواؤں کا ہجوم، ہم عصروں کا جمگھٹ — ایک جمعہ آتا تھا۔ وہ لمحہ بہت ہی بھاری ہو جاتا تھا۔ نہ کسی کی بات اچھی لگتی تھی، نہ کسی سے بات کرنے کو طبیعت چاہتی تھی ؎

دل کشمکشِ زیست سے ہے مرگ در آغوش
جینے پہ بھی اصرار ہے معلوم نہیں کیوں

جمعہ تھا۔ نصاب کی کتابوں کو دیکھتی تو الجھن سی ہونے لگی۔ افسانوں کی ایک کتاب لے لی اور مہندی کی باڑھ کے قریب ہری ہری دوب پر جہاں نیم کے پیڑ کے ہلکے ہلکے سائے تھے، لیٹ گئی۔ ایک افسانہ شروع کیا۔ ہمہ تن گم ہو گئی۔ تصور کی ہیروئن کے حالات کچھ کچھ مجھے اپنی زندگی کا پلاٹ محسوس ہونے لگے۔ کچھ سوچ سی لگ گئی۔ مستقبل کی سوچ کہ واقعی کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ خیالات بھٹکنے لگے۔ دماغ کی نامعلوم وادیوں میں۔ کہ نجمہ دوڑی دوڑی آئی۔ کیا ہے؟ کیوں ہانپ رہی ہے بدتمیز؟ کچھ چل تو نہیں گیا دماغ؟

"کچھ نہیں باجی۔ امی تم کو کب سے ڈھونڈ رہی ہیں۔ اور تمہیں آج چھٹی کے دن بھی پڑھنا سوجھا ہے۔ یہ دیکھو میں اپنی گڑیا کے گھروندے بنا رہی تھی۔ چلو امی تمہیں بلاتی ہیں۔

ان کے پاس کچھ مہمان بی بیاں آئی ہیں۔ وہ تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں"

"کیا کریں گی مجھے دیکھ کر، کچھ لعل تو نہیں لگے ہیں۔ عجائب گھر کی کوئی مخلوق تو ہوں نہیں"

یہ سب مجھے نہیں معلوم چلو بس۔

ہماری امی بڑی ہر دل عزیز ہیں۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب ابا کہا کرتے تھے کہ "اگر مجھے اس کا علم پہلے سے ہوتا کہ تمہاری سماجی گرویدگی کا یہ عالم ہے 'تمہاری سہیلیوں کی اتنی زبردست پلٹن ہے تو شاید میں تم سے شادی نہ کرتا" لیکن میں اتنی ہی آدم بیزار تھی —— کتنی مختلف تھیں ہم دونوں! خیر، نجمہ تو میری ڈانٹ ڈپٹ سے گھبرا کر چلدی - اب کیا دیکھتی ہوں بوڑھی عشرت اپنا بھاری بھرکم توند اور لوٹا سا وزنی قد لئے ٹھل ٹھل چلی آرہی ہے۔ وہیں سے الاپ رہی ہے:۔

"اے بی بی کہاں چلی جاتی ہو۔ نوج' ایک دن جمعہ کا آتا ہے۔ اس دن بھی پڑھنا' پڑھنا۔ جانے کس موئے نے یہ پڑھنا دڑھنا نکالا ہے۔ خدا ہی تو سمجھے اس سے یہ لو' یہاں بیٹھی ہیں گٹ پٹ ہو رہی ہے۔ دیکھو آنکھیں ستیاناسی ہو جائیں گی۔ دماغ دشمنوں کا بیکار ہو جائے گا" قطع کلام کرتے ہوئے:۔ "کیا ہے بوا؟ کیوں بڑبڑا رہی ہے؟ میرا کیوں پیچھا کیا ہے آج تم لوگوں نے؟ کہیں جینے بھی نہیں دیتے ہیں سے کم بخت ——"

"اے کچھ نہیں بی بی تمہاری امی کی ایک سہیلی لکھنؤ سے آئی ہیں۔ بہت دنوں کے بچھڑے ملے ہیں۔ تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں ——"

"ہٹاؤ بوا اس دیکھنے دکھانے کے قصہ کو۔ بھاگو یہاں سے۔ میرا سر نہ کھاؤ۔ نہیں آتے ہم۔ کیا کرلوگی ہمارا' وہ لکھنؤ کی ہوں یا بھوپال کی۔ ہم پہ ان کا رعب نہیں جم سکتا سمجھیں؟ جاؤ سنا دو امی کو" میں نے اس طرح اس پر اپنا رعب جما دیا۔ جانتی تھی کہ وہ کچھ بھی نہ کہے گی امی سے۔ وہ اپنا سا منہ لے کر جا رہی تھی۔ کچھ چپ چپ بڑبڑاتی بھی رہی۔ جو میں برابر سن رہی تھی۔ شاید میری بدتمیزی کی داد دے رہی تھی۔ میری ناقص تعلیم کی پھبتی اڑا رہی تھی۔ سچ بھی تو ہے۔ کہیں ڈگری لینے سے اخلاق آجاتے ہیں! انسان میں مکمل انسانیت آجاتی ہے؟ ڈگری تو محض ایک اشتہار ہے۔ شہرت کا ٹھیکہ جیسے۔ اب مجھے فلسفہ اور منطق کو چھوڑ کر زندگی کی نفسیات کو سوچنا تھا۔ اس بگولے کے سر سے ٹلنے کے بعد میں نے اطمینان کی ایک سانس لی اور قصہ پڑھنے لگی۔ قصہ کی ہیروئن۔ کتنی ملتی جلتی تھیں اس کی اکثر باتیں مجھ سے۔ ایسے لگتا تھا جیسے میری ہی اپنی زندگی کا نقشہ ہے۔ لکھنے والے نے لکھنے سے پہلے میری زندگی کو کونہ کونہ سے جھانک کر دیکھا ہے۔ کتاب میں بڑی دیر سے پڑھتی ہوں۔ بعض فقروں پر پہروں سوچ سی لگ جاتی ہے۔ غرض یوں تیوں ختم کرنے کی ٹھانی تھی کہ تیسرا جو پہری ہم بیٹھا۔ دیکھتی کیا ہوں امی سر پر سوار ہیں۔ ان کی شخصیت مجھے بہت متاثر کر دیتی ہے۔ ان کی خوبصورت آنکھیں' ان کا رعب اور ان کی گہرائی - میں انھیں دیکھ کر اپنا سب کچھ بھول گئی۔ اف! میں ان سے بہت ڈرنے لگی تھی۔ یوں نہیں چپ حالانکہ وہ مجھے بہت چاہتی تھیں۔ سب بچوں سے زیادہ ——

"فریدہ! یہاں کیا کر رہی ہے بچی۔ ساری دنیا سے نرالی طبیعت ہے۔ جی نہیں گھبراتا تنہائی سے؟ آخر ہمارے پاس بھی کبھی بیٹھا کرو۔ اتنی پڑھائی سے الجھن نہیں ہوتی تجھے؟ پگلی کہیں کی ——"

کتنا رس اور کتنا پریم تھا ان فقروں میں۔ ماں کی محبت وہ بدنصیب کیا جانے جس نے کبھی ماں کا

پیدا ہی نہ دیکھا ہو۔ جن بچوں کی مائیں لڑکپن میں ہی رہ جاتی ہیں ان کے دل بڑے پتھر ہو جاتے ہیں۔ ان کے روپ میں بھگوان بستے ہیں۔ میں امّی کا کچھ بھی تو جواب نہ دے سکی۔ لیکن اس غیر معمولی آؤ بھگت، امّی خلاف عادت خاطر داری کا پس منظر میری نگاہ دور رس کے لئے تشویشناک ضرور تھا۔ ہزار شکوک ہونے لگے۔ لیکن پھر ان توہمات کو میں ان کی محبت پر ہی محمول کرتی رہی۔ چپکے چپکے یہ گنگناتے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ ہو گئی ع

تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

یہ امائیں بھی کیسی کیسی ترکیبیں ہم کو دامِ فریب میں پھنسانے کی سوچتی ہیں۔ ان کے فتراک کے یہ معصوم نخچیر ——— دیکھئے ان کا کیا حشر ہو۔ ہمارا کھلانا پلانا جیسے انھیں کھلتا ہے۔ نجّی بھیا کی فکر ہی نہیں ہوتی کسی کو۔ اتنے سیانے ہو گئے ہیں۔ جب کبھی ان کی شادی کا ذکر چھیڑا، اماں نے منہ چڑا دیا۔ "ارے اس کا کیا ہے۔ کوئی عمر گئی ہے"۔ تو بھیا تو مجھ سے کافی بڑے ہیں۔ ان کی تو ابھی عمر نہیں گئی۔ اور میں آنکھوں کا ٹھیکرا بن گئی۔ کہیں پڑھا تھا۔ یاد نہیں کہاں۔ امّی کی باتوں سے اس فقرہ کا مفہوم اب سمجھ میں آنے لگا تھا۔ "شادی ——! جوان کو ابھی نہیں۔ بوڑھے کو کبھی نہیں" ————

خیر۔ تو مجھے اس بہانے سے بلایا تھا۔ سچ مچ مجھے دیکھنے آئی تھیں ان کی سہیلی۔ خوب گھور گھور کر دیکھا۔ جیسے جوہری کسی انمول کنکر کو دیکھے۔ یا شاہ کسی درشہوار کو پرکھے۔ قریب بٹھالیا۔ بلائیں لیں۔ ان کے ساتھ بھی ایک بوا تھیں۔ وہ بھی سرکتے سرکتے بہت قریب آ گئیں۔ کئی نگاہیں وقت واحد میں مجھ پر فلڈ لائٹ کی طرح چاروں طرف سے پڑ رہی تھیں۔ میں ساکن سی ہو گئی تھی۔ جیسے جان ہی نہ تھی سارے بدن میں۔ اپنی تنقیدی نگاہوں میں میرا جائزہ لیں اور میں کچھ محسوس نہ کروں۔ ع بعد یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

جیسے میرا طبّی معائنہ ہو رہا تھا۔ گھوڑا جب لیتے ہیں تو اس کی بال بھنوری دیکھی جاتی ہے۔ ایک انسان کو انسان ایسے دیکھتا ہے جیسے اس میں خود کسی قسم کا عیب نہیں اور انسان کی نگاہیں ہی تو انسان میں عیب ڈھونڈھ سکتی ہیں۔ غالب کہتا ہے ؎

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ

ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں

خیر۔ تو آپس کی سرگوشیوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس معائنہ تنقیدی میں ہم کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہمارے دیکھنے والے نے اطمینان کی سانس لی اور بڑی محبت سے ہمارے سرِ اقدس پر دستِ شفقت رکھا۔ گاہک کو جنس پسند آ گئی تھی اور ادھر میرا جو حال ہو سو ہو۔ من میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ اب کیا ہوگا۔ یہ سوچ لگ گئی تھی۔ کاش اس امتحان میں ناکامی ہوتی تو پھر دنیا میں کیا کچھ نہ کر لیتی ع

سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

صیاد آیا، بلا د آیا، بیداد آیا قسم کے کئی قافیے ذہن کی فضا میں گونجنے لگے۔ قصہ کی یہ دُھن کا پلاٹ، کتنا سچا واقعہ تھا، کتنی ملتی جلتی تصویریں تھیں، کیسی ہو بہو عکاسی تھی میری اپنی زندگی کی۔ جیسے واقف تھا میری زندگی سے اس قصہ کا مصنف۔!

گاہک نے اپنی اس جنس ناقص کی نظر ثانی کا دن مقرر کیا۔ گویا دن گنے جانے تھے اس دن کے لئے۔ اپنے گھر سدھاریں اور مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے ہزاروں کے زغنے سے کسی نے مجھے کھینچ لایا ہے۔ تنہائی کتنی اچھی ہوتی ہے۔ لیکن کہاں۔ یہ تو صرف ایک احساس ہی ہے۔ وہ تو چلدیں۔ لیکن اب میں کیا کروں گی۔ ذرا سوچئے۔ میری زندگی۔

اوراق کتنے منتشر کردئے تھے انھوں نے گریجویٹ ہونے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ یہ کروں گی، وہ کروں گی۔ ابھی بہنوں کی خدمت اور نہ جانے کیا کیا، سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ میرے نظام العمل کی ترتیب درہم برہم ہوگئی۔ ابھی دنیا ہی کیا دیکھی تھی۔ یہ خیال و خواب کی بستی۔ یہ میکہ کا سہانا پن، یہ بے فکری، یہ الہڑ الٹے تلے، سب کے سب صرف یاد اور تخیل ہی ہو کر رہ جائیں گے ؎

باکسے وقتے وصالے داشتیم
سالہا بگذشت و آں از دل نرفت

اب ذرا ادھر کی سنئے۔ وہ بھی تو بڑے مزے کی کہانی ہے۔ امی کی سہیلی کے صاحبزادے جو ہمارے ہونے والے "کچھ" ہوتے ہیں۔ ان سے پہنچ بچنا اب انھیں مشکل تھا۔ سوالات کی انھوں نے بھرمار کردی۔ کیسی ہے، کیا ہے، سچی سچی باتیں ہوں سب جھوٹ موٹ بناوٹی تعریف نہیں۔

بیچاری لگیں وہ ہماری تعریف کے پل باندھنے۔ کہ ایسی ہے ویسی ہے۔ چاند میلا ہے، اس میں میل نہیں۔ قدرت نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ اپنی فرصت کے لمحے میں سوچ بچار سے ڈھلی ہوئی مورتی کوئی فانی کوئی کسر، ایک نشہ کا رہے اس کے فن کا۔ کتنا سبک نقشہ، کیسے خوبصورت بال۔ آنکھوں کو تکدہ سے کیوں نہ تشبیہ دوں۔ ایک شاعر کا تصور، ایک مصور کا کمال ہے۔ بوا کریمن جو ساتھ تھیں انھوں نے ان کی شاعرانہ عکاسی میں اپنے دو بول شریک کرے۔

بی بی آپ نے غور نہیں کیا بال میں ذرا الجھن سی ہے۔ سیدھے سیدھے بال نہیں ہیں دلہن کے، اف! کتنی زبردست تنقید، کتنا گہرا تبصرہ، کیسی نکتہ رس نظریں! سلمیٰ بہن جو ہماری نند ہونے والی تھیں۔ بوا کی اس والہانہ دخل در معقولات سے جھنجھلا گئیں۔ "بس بی بی یا [illegible] عجب ہوتی ہیں۔

خیر بھئی تو رفتہ رفتہ زندگی کا وہ دن آ ہی گیا کہ پر باندھنے صیاد آیا۔ کنوار پنے کے سہانے سلونے دن سپنے ہوگئے۔ در و دیوار پر حسرت سے نظر کرتے ہم میکہ سے رخصت ہوئے۔ جس گھر کو ہم اب تک اپنا سمجھتے تھے وہ حقیقت میں اپنا نہ تھا۔ اپنے تو غیر تھے، اپنے تو پرائے تھے جو پھر اپنے ہی ہوگئے۔

سسرال میں ہماری بڑی قدر و منزلت تھی۔ بڑے چاؤ ارمان تھے، حامد مجھے بے انتہا چاہتے، میری ہر خواہش ایک حکم کا اثر رکھتی۔ میرے اشاروں پر دنیا ناچ رہی تھی۔ سب مجھے اس طرح گھیرے رہتے جیسے شمع کو پروانے۔ اتنی گرویدگی، اتنا دیوانہ پن، اس ہر دل عزیزی کا اب ردِ عمل شروع ہوا۔ مجھ میں غیر ارادی تبدیلی سی مجھے خود محسوس ہوتی، نشۂ حسن نے مدہوش کردیا۔ چشم نظر نما آئینہ دائم نقاب میں۔ میرا سر پھر گیا، غرور نے دعا دا بول دیا۔ میں بھی خود کو کوئی چیز سمجھنے لگی تھی۔ غرض حسن اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا، اتنی محبت و گرویدگی سے بجائے اس کے کہ مجھ میں انکساری پیدا ہوتی الٹا اثر ہونے لگا۔ بے حس پتھر جیسے۔ ان سب کی محبت اکتا دیتی۔ وارفتگی بیزار کردیتی۔ طبیعت میں چڑچڑا پن، بدمزاجی، غرض میں کیا تھی اور کیا ہو کر رہ گئی تھی۔ واقعی صرف شکل و شمائل پر ریجھ کر جو گرفتار ہوتے ہیں وہ کتنی غلطی کرتے ہیں۔ غلط بیں نگاہوں کا یہ رنگین دھوکا اب خود فریب دینے لگا تھا۔ حامد کی اور میری محبت کو نظر بد سے بچانے کے لئے میرے میکے والوں نے جنتر منتر کا ایک ڈھونگ مچایا تھا۔ شاید یہ نفرت اور تبدیلی ان ہی تعویذوں کا اثر تھا۔ ان سب نے ایک دن ہم دونوں کو مخاطب کیا اور کہنے لگیں "تم دونوں حسن صورت میں یکتا ہو۔ نظر لگتی ہے اس جوڑے کو، یہ تعویذ ہے، اس کو علحدہ علحدہ دونوں پہن لو۔ اپنے سے کبھی جدا نہ کرنا، اس کی تاثیر سے نظر بد بے اثر ہو جائے گی" حامد۔ ایک الھڑ قسم

[illegible]

پرچھائیاں

یوکلپٹس کا درخت پُراسرار طور پر جھوم رہا تھا — ہلکی ہلکی چاندنی اور خوبصورت تاریکی میں سرو کے درخت کانپ رہے تھے - سارا باغ "ملکۂ شب" کی خوشبو سے مہک رہا تھا - رات بہت حسین اور رومان انگیز تھی' مگر میں ان سب سے بے پرواہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی - میری نظروں میں بہت سے بلند و بالاقد' حسین انداز اور مسکراتے چہرے گھوم رہے تھے رُوفی اور اس کی دلربا مسکراہٹ — احمد - شرارت سے لبریز آنکھیں' ہر وقت مسکراتا رہتا ہے - کالج کی فضا میں سب سے زیادہ اسی کے قہقہے بلند ہوتے ہیں - شفو سراپا رحم - اس کے انداز کچھ ایسے تھے کہ بعض اوقات مجھے اس پر رحم آنے لگتا - کیسے جیتا ہے یہ اتنا سنجیدہ رہ کر - اور اس وقت جب کہ سب لڑکے میری کسی چیز کی تعریف کرنے لگتے تو ان حضرت کی سنجیدگی اور بڑھنے لگتی - میں اکثر اس کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو جاتی - شیام گھنگر والے پریشان بال معصوم چہرہ' یونس اور اس کی خوبصورت باتیں - فرخ جدید شاعری کا بہترین نقال -

اوہ! — ان لوگوں نے مختلف اوقات میں میرے قدموں پر اپنے سر جھکائے تھے - کپکپاتے ہونٹوں سے اظہار کیا تھا - اپنی محبت کا یقین دلایا تھا اور وفا کے عہد و پیمان باندھے تھے - مگر شفو - اس نے اب تک مجھ سے بات بھی نہیں کی تھی - جب کبھی میں اس کے پاس سے گزرتی اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں' مگر میرے ساتھ کسی اور کو دیکھ کر اس کی نظریں گہری ہو جاتیں' ان میں عجیب قسم کی وحشت چھا جاتی' اس کا سر اس کے ہاتھوں پر جھک جاتا اور وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگتا -

ایک شام میں لائبریری میں بیٹھی پڑھ رہی تھی کہ شفو نہ جانے کہاں سے آ گیا -- اس کے چہرے پر وہی سنجیدگی طاری تھی - مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا' مسکراتے ہونٹوں سے اس نے کہا "عذرا" اور جب میں اٹھ کر جانے لگی تو اس کے چہرے پر غم کی ایک لہر چھا گئی - اس نے آہستہ سے پھر ایک بار کہا "عذرا" اور چپ ہو گیا - بہت دیر تک میں انتظار کرتی رہی مگر وہ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا - آخر میں غصے سے واپس چلی گئی - کتنا عجیب ہے یہ — ہر وقت نہ جانے کیا سوچا کرتا ہے - مجھے اس کے انداز ذرا بھی پسند نہیں - میں چاہتی کہ کالج کے لڑکے جب میری کسی چیز کی تعریف کریں تو ان میں شفو بھی شامل ہو مگر وہ ایسے موقعوں پر اٹھ جانے کہاں رہتا تھا - اور اس کی یہی بات مجھے پسند نہ تھی - مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے اس کی خاموشی میرا مذاق اڑا رہی ہے اور میری نفرت میں اضافہ ہو جاتا -

سب سے زیادہ تعجب مجھے اس بات پر تھا کہ احمد جس کے قہقہے کالج میں سب سے زیادہ گونجا کرتے تھے، جو شرارت میں سب سے بڑھ چڑھ کر تھا وہی شفو کا گہرا دوست تھا — شفو جو کسی پارٹی میں حصہ نہ لیا کرتا تھا احمد کے کہنے سے کبھی کبھی ان مجلسوں میں نظر آ جایا کرتا - گو چہرے پر وہی سنجیدگی اور آنکھوں میں عجیب طرح کی بے بسی - اس کی آنکھیں سب سے زیادہ خوبصورت تھیں — جن میں نرم سرخ ڈوروں نے ان کے حسن میں اور اضافہ کر دیا تھا - اس کی آنکھیں مجھ سے نہ جانے کیا کیا کہتیں مگر مجھے ان کی باتیں سمجھنے کی فرصت ہی کہاں تھی - ہاں کبھی کبھی جب میں تنہا ہوتی اس وقت سوچا کرتی کہ کاش سنجیدگی کے ساتھ اس کی آنکھوں میں شرارت ہوتی -

بہار کے دن تھے - ہلکی ہلکی گھٹائیں اٹھ رہی تھیں' احمد نے تجویز پیش کی کہ بجائے کلاس میں پروفیسروں کی بکواس سننے کے کیوں نہ کہیں پکنک کے لئے چلے جائیں - احمد کی رائے سب کو پسند آئی کیونکہ موسم ہی اتنا دلفریب تھا - چنانچہ رُوفی کی موٹر میں سب روانہ ہوئے - آج احمد نے زبردستی شفو کو بھی ساتھ لے لیا تھا - فرخ سے کسی نے

گانے کی فرمائش کی اور اس نے طلعت محمود کا گانا شروع کیا۔ اس کی آواز سب سے زیادہ پیاری تھی اور وہ جب اس فقرے پر پہنچا ـــ

وہ صباحتیں، وہ ملاحتیں، وہ نزاکتیں وہ لطافتیں وہ نظر جسے سمائیں مجھے آنکھ اٹھانا بھی بار ہے

اس کی اس جرأت پر بے اختیار قہقہے بلند ہوئے اور میں شرما کر رہ گئی ـــ یہ فرخ ہمیشہ یونہی کیا کرتا تھا ـــ میری نظریں اس وقت بے اختیار شفو کی طرف اٹھ گئیں۔ سب ہنس رہے تھے مگر شفو کھڑکی میں سے باہر نہ جانے کس چیز کو دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں سے گہرے رنج کا پتہ چلتا تھا۔ بال اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کی بھویں کمانوں کی طرح کھنچی ہوئی تھیں۔ اس وقت اچانک میرے دل نے کہا "کتنا خوبصورت ہے یہ ـــ کاش! زندہ دل بھی ہوتا ـــ" اور اس کے ساتھ ہی اس کی سنجیدگی نے مجھے پژمردہ کر دیا۔

چشمے کے کنارے پہنچ کر شفو نہ جانے کہاں غائب ہو گیا ـــ سرخ پھولوں کی گھنی جھاڑیوں کے نیچے چشمہ بہہ رہا تھا۔ میں نے ان پھولوں کا ایک گچھا توڑتے ہوئے کہا "کتنا پیارا رنگ ہے ان پھولوں کا ـــ" اور احمد نے شرارت سے فوراً کہا "بالکل تمہارے ہونٹوں کی طرح ـــ اف! کتنا شریر ہے یہ ـــ

آفتاب غروب ہو رہا تھا اور ہم سب چشمے کے کنارے کھڑے غروبِ آفتاب کا منظر دیکھ رہے تھے۔ دور افق تک آنکھوں کے سامنے چشمے کا پانی سونے کی طرح دمک رہا تھا۔ روپہلی کہرہ لئے اس خوبصورت منظر کی تصویر لے رہا تھا۔ ہم نے آخری نظر آسمان کے زرین کناروں پر ڈالی اور لوٹ آئے ـــ

زندگی حسین خوابوں کے سہارے گزرتی رہی۔ بی اے کے پہلے سال کا نتیجہ نکلا ـــ ہم سب دوست پاس ہو گئے تھے اور شفو فیل۔ جس وقت نتیجہ سنایا گیا اور اسے معلوم ہوا کہ وہ فیل ہو گیا تو اس وقت بھی وہ ہمیشہ کی طرح بے حس بیٹھا رہا۔ ہاں اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی ـــ اس دن کے بعد شفو کالج میں نظر نہیں آیا ـــ احمد سے معلوم ہوا کہ وہ فوج میں شریک ہو کر کہیں دور چلا گیا ہے۔

دن اب بے کیف گزر رہے تھے کیونکہ پہلی سی باتیں نہ رہی تھیں ـــ احمد جسے میں سب سے زیادہ پسند کرتی تھی کسی امیر لڑکی سے منسوب ہو گیا تھا اور اس کا دل دولت کے انبار میں کہیں دب گیا تھا۔ فرخ کی شاعری کا مرکز اب ایک شرمیلی لڑکی لیلیٰ تھی ـــ شیام نے اوشا کو اپنے دل کی رانی بنا لیا تھا۔ غرض کہ کالج کی فضا بالکل بدل گئی تھی۔

اف یہ مرد ـــ ان کے لئے زندگی ایک حسین کھیل ہے اور لڑکیاں کھلونے۔ جب تک جی چاہا کھیلتے رہے اور پھر توڑ پھوڑ دیا۔ اس سے پہلے کبھی زندگی مجھے اتنی اداس نظر نہ آئی تھی گو کہ اب بھی رؤفی کی دلربا مسکراہٹ میرے سامنے اور حسین ہو جاتی اور یونس کی باہیں جھوم کر آگے بڑھنا چاہتیں مگر میں ان کی طرف بہت کم متوجہ ہوتی ـــ میری آنکھیں کھل چکی تھیں۔ آخر میں نے کالج جانا چھوڑ دیا۔

ایک دن میں اداس بیٹھی تھی کہ احمد نہ جانے کیسے آ گیا اور آتے ہی اس نے مجھ سے کہا کہ شفو نے جاتے وقت اسے ایک لفافہ دیا تھا کہ مجھ تک پہنچا دے اور التجا کی تھی کہ بھول نہ جائے مگر اس کے باوجود احمد مجھے لفافہ دینا بھول گیا تھا ـــ جسے آج لے کر وہ آیا تھا۔ وہ بہت دیر تک بیٹھا کالج کی باتیں کرتا رہا پھر وہ چلا گیا اور میں نے خط کھولا۔ اندر سے ایک رنگین کاغذ نکلا جس پر یہ عبارت لکھی تھی:ـ

"جب بہار کے دنوں میں دور۔ کہیں جھاڑیوں میں چھپی ہوئی بلبل نغمہ زن ہو اور پھولوں کی خوش بو ساری فضا میں پھیلی ہوئی ہو، فطرت بے حد رنگین اور جاذبِ نظر ہو جائے، اس وقت جب کوئی "خوش نصیب" تمہارے حسن کی تعریف کرے اور تم شرما جاؤ تب سوچنا کہ کبھی تمہاری انہیں آنکھوں کے سحر نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔ سیاہ بالوں کی پریشان لٹیں جو تمہارے شانوں پر بکھری رہتی تھیں میرے دل و دماغ پر چھا گئی تھیں۔ تمہارے دمکتے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ کتنی دلفریب معلوم ہوتی تھی۔ اسی حسین مسکراہٹ نے میرا دل موہ لیا تھا۔ میرے نزدیک تمہارا حسن بہار کی رنگینیوں سے کہیں زیادہ رنگین تھا۔ میں تمہارا پرستار تھا۔ تمہارا نام لے لے کر جیتا تھا اور کتنے خوش گوار تھے وہ لمحے جو میں نے تمہیں دیکھ کر گزارے تھے۔ پھر یاد کرنا کہ تمہاری محبت میرے لئے کتنی حسین تھی جس سے میری دنیا جگمگا اٹھی۔ پھر تمہارے تغافل نے میری محبت کو ٹھکرا دیا۔ میری آرزوئیں میرے سینے میں دفن ہو گئیں۔ اور اپنی آنکھوں میں ہزاروں مایوسیاں لئے میں ہمیشہ کے لئے تم سے جدا ہو گیا ——"

اور میری آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے اور نگاہیں دھندلی ہو گئیں۔ اس دھندلکے میں پچھلے گزرے ہوئے دنوں کی باتیں اجاگر ہونے لگیں۔

چشمے کے سوتے ہوئے پانی کے کنارے —— پھولوں کی جھاڑی کے نیچے مخملیں گھاس پر شنو سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میں پھولوں کے گچھے توڑتے ہوئے وہاں پہنچی مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں کنول کی طرح کھل گئیں۔ مدھم آواز میں اس نے کہا "عذرا —— مجھے تم سے کچھ کہنا ہے" یہ کہہ کر اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جس میں التجا تھی۔ میں سبزے پر بیٹھ گئی اس کا سر جھک گیا اور وہ نہ جانے کس سوچ میں گم ہو گیا۔ اس کی خاموشی سے اکتا کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے کھڑے ہوتے دیکھ کر اس نے گہری سانس لی اور کہا "میں سمجھتا تھا کہ میری آنکھیں وہ سب کہہ دیں گی جو میں زبان سے ادا نہیں کر سکتا مگر تم نے کبھی توجہ نہیں کی۔ تم ——" وہ چپ ہو گیا۔

"میرے پاس آپ کی آنکھیں پڑھنے کا وقت نہیں" یہ کہہ کر میں وہاں سے چلی آئی حالانکہ اس کی نگاہیں مجھے ٹھہرنے کی التجا کر رہی تھیں۔

میرے اس جواب کے بعد ہی سے شنو کی سنجیدگی میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ پہلے احمد کے اصرار پر کبھی کبھی ہمارے ساتھ تفریحوں میں شریک ہو جایا کرتا تھا مگر اب جیسے اسے ان چیزوں سے واسطہ ہی نہ رہا ہو —— کلاس میں بھی وہ سب سے پیچھے بیٹھے نہ جانے کیا کیا سوچا کرتا۔ شاید وہ کچھ بھی نہ سنتا ہو —— کبھی مجھے اس کا خیال آ جاتا مگر میں پھر بہت جلد کالج کی رنگین فضا میں کھو جاتی۔ مگر آج اس کی اس تحریر نے مجھ پر سب کچھ ظاہر کر دیا تھا جس سچی محبت کی میں متلاشی تھی وہ اس کے خط سے نمایاں تھی۔ جس کے لئے میرے دل میں ذرا بھی جگہ نہ تھی اسی کے لئے اب میرا دل بھٹکا مارہا تھا۔ کاش وہ ایک بار آ جائے۔ صرف ایک بار —— مگر وہ مجھ سے دور —— بہت دور —— نہ جانے کہاں ہے۔

نکہت ناز

[illegible] ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	قیمت آنہ
مٹی کی پیتا	[illegible]	۰	۸
سرگزشت غالب ...	۹۳	۰	۸
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۹۵	۱	۰
ارمغان جذب ...	۱۲۰	۱	۱۲
یورپ جنگ سے پہلے	۴۱۸	۲	۸
تاریخ سیاسیات ...	۴۷۲	۳	۸
سرسالار جنگ ...	۴۸	۰	۶
مغربی تصانیف اردو کے تراجم	۱۴۵	۱	۴
معجب کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴
اقبال نمبر ...	۱۶۸	۱	۴
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲
مکتوبات شاد عظیم آبادی ...	۳۰۰	۲	۸
دادا بھائی ...	۱۶	۰	۲
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	۰
سرگزشت حاتم ...	۱۲۸	۲	۰
عماد الملک ...	۴۰	۰	۶
اردو دانی کی پہلی کتاب ...	۵۶	۰	۵
" دوسری کتاب ...	۵۶	۰	۵
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴
فن تقریر ...	۹۲	۰	۸
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰
ہندوستانی تمدن ...	۳۴۰	۳	۸
پودوں کی کہانی ...	۸۰	۰	۰
مرلقا ...	[illegible]	۱	۹
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	[illegible]
رسایل طبیہ ...	۳۱۲	۳	۸
سلک گوہریں ...	۴۰	۰	۴
تاریخ ادب اردو ...	۷۶	۰	۸
رفیق اردو داں ...	۲۲۴	۱	۱۲
آشوب ...	۵۸	۰	۸
حیدرآباد ...	۸۸	۰	۱
شاد اقبال ...	۱۷۶	۲	۸
آریائی زبانیں ...	۱۰۴	۱	۰
نظام علی خاں ...	۳۲	۰	[illegible]
تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰
عرب اور عربستان ...	[illegible]	۰	۱۰

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	قیمت آنہ
سحر کا جادو	۴۸	[illegible]	[illegible]
طبیعیاتی کائنات ...	۹۸	۰	۸
مطلع سخن	۱۲۳	۰	۱۲
کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲
بادہ سخن	۱۲۷	۰	۱۲
سراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲
ایمان سخن	۱۲۰	۰	۱۲
فیض سخن	۱۳۴	۰	۱۲
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰
دوم (۵۰)	۴۳۲	۵	۰
نقد سخن	۱۷۵	۱	۰
نذر ولی	۲۳۸	۲	۸
گریہ و تبسم ...	۱۹۲	۲	۰
مشاہیر قندھار دکن ...	۱۸۴	۲	۰
من کی دنیا ...	۱۹۵	۱	۰
مدراس میں اردو ...	۱۳۶	۱	۸
معزز نامہ ...	۱۱۲	۲	۰
نذر دکن	۱۵۴	۱	۴
روح غالب	۲۴۰	۲	۸
عاصم	۲۰۰	۱	۴
دفتری معلومات ...	۵۶	۰	۶
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۹
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲
ثمرۂ زندگی	۲۱۶	۱	۸
سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	۰	۱۲
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸
بلقان	۳۲	۰	۳
خطابیات	۱۱۳	۰	۱۲
علم خانہ داری ...	۱۵۰	۱	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۸۰	۰	۱۲
انوار	۱۶۸	۱	۸
گلشن ثانی (۳) تصاویر	۸۰	۰	۱۰
ارمغان دکن	۱۲۸	۱	۴
رات کا بھولا ...	۱۶۸	۱	[illegible]
سکندر جاہ	۲۴	[illegible]	[illegible]
بلاغت	۵۹	[illegible]	[illegible]
ادارہ سفر ۱۹۳۴ء میں	۲۰۰	۰	۸
نصیر الدولہ ...	۳۲	۰	[illegible]
افضل الدولہ ...	۳۲	[illegible]	[illegible]
نواب میر محبوب علی خاں	۳۲	[illegible]	[illegible]

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

سب رس

بچوں کے لئے

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

زیر ادارت
معین الدین احمد انصاری
بی ایس سی (علیگ)

[illegible] ۱۵۳
[illegible] ۲۹۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ دو روپے آٹھ آنے
ششماہی ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ
۴ر

جلد (۸)	بابت ماہ نومبر ۱۹۴۵ء	شمارہ (۱۱)

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین ایم اے (عثمانیہ) کے اہتمام سے صحیفہ پریس میں طبع ہو کر خیرت آباد سے شائع ہوا

آپ کی ہماری باتیں

کھلونا کی عمر کے آٹھ سال ختم ہوا چاہتے ہیں۔ جنوری [illegible] میں اس کی سالگرہ منائی جائے گی۔
کہئے آپ نے اس کی سال گرہ کے لئے کیا تیاری کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس دفعہ اس کی سال گرہ ہمیشہ سے اچھی منائی جائے۔ جنوری کا پرچہ سال گرہ کی خوشی میں شاندار نکالا جائے، یعنی ہم اس خاص نمبر کے لئے اس کے صفحات بڑھائیں گے۔ اس میں اچھے اچھے مضامین اور دوسری دلچسپ باتیں شائع ہوں گی۔ دسمبر کی ۱۵ تاریخ تک ہمارے پاس اپنے مضامین بھیج دیجئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ سال گرہ نمبر بے حد دلچسپ نکلے اور یہ صرف آپ لوگوں کی کوشش سے ہو سکتا ہے۔
نومبر کا پرچہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ نے اسے یقیناً دلچسپ پایا ہوگا۔ ہر قسم کی دلچسپیاں ہیں۔ اس سے متعلق اپنی رائے سے مطلع کیجئے اور سال گرہ نمبر سے متعلق آپ اپنی رائے لکھ بھیجئے کہ آپ کس قسم کے مضامین چاہتے ہیں اور اس پرچہ میں کیا کیا دلچسپیاں ہوں۔ ہم آپ کے مشوروں پر غور کریں گے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔ سال گرہ نمبر میں ان بچوں کے نام بھی شائع کریں گے جو اس سلسلہ میں ہمیں مفید مشورے دیں۔ لفافہ کے ایک بازو "سال گرہ" لکھ دیجئے تاکہ ہم یہ سمجھ جائیں کہ آپ نے سال گرہ سے متعلق کچھ لکھا ہے۔ اسے ہم دوسرے خطوط اور مضامین سے علٰحدہ رکھیں گے۔ نومبر کے مضامین کو غور سے پڑھئے بعض آپ کے لئے مفید ثابت ہوں گے "جراثیم کیا ہیں" مفید مضمون ہے اور ساتھ ہی ساتھ معلومات آفریں۔ دنیا کے سب سے چھوٹے جاندار اجسام یہی ہیں۔ مضمون پڑھنے سے آپ کو پتہ چلے گا کہ ان میں سے بعض فائدہ پہنچاتے ہیں اور بعض نقصان۔ مضمون کے ساتھ شکلیں بھی دی گئی ہیں۔ "عقلمند بادشاہ" کی دلچسپ کہانی ہے۔ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنی چاہئیں۔ آج کل اس قسم کی مختصر کہانیاں زیادہ پسند کی جاتی ہیں۔ "لفافہ" اور "بارہ خطوط مستقیم" بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہم کوشش کریں گے کہ سال گرہ نمبر اس سے بھی زیادہ دلچسپ نکلے۔

معین الدین احمد انصاری

مشاہیر کے آخری الفاظ

سکندر اعظم:- جس نے ساری دنیا کو ہلا دیا تھا اور جس نے لاکھوں انسانوں کا خون بہایا تھا، جب موت کا احساس ہوا تو اس نے کہنا شروع کیا کہ:-

"میں دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا مگر موت نے مجھ ہی کو فتح کر لیا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے کتنے انسانوں کا خون بہایا ہے اور آخری وقت میں کیا لے کر جا رہا ہوں۔ افسوس کہ مجھے وہ سکونِ زندگی بھی حاصل نہ ہو سکا جو ایک معمولی انسان کو حاصل ہے۔ بہتر ہوا کہ میں دنیا فتح نہ کر سکا۔ اگر میں دنیا فتح کر لیتا تو اس سے زیادہ کچھ حاصل نہ ہوتا کہ اپنے گناہوں میں اور اضافہ لے کر دنیا سے جاتا۔ مجھے فوجی لباس میں دفن کرنا کیونکہ میں سپاہی تھا اور ہوں"۔

نپولین اعظم:- جس نے انتہائی مایوسی میں جان دی اور جس نے سینٹ ہلینا میں قید رہ کر دنیا کو دکھایا کہ کوشش ہر حال میں جاری رہ سکتی ہے۔ اس کے الفاظ سکندر سے بھی زیادہ دردناک تھے اس نے کہا کہ:-

"مایوسی میرے نزدیک گناہ تھی۔ مگر مجھ سے زیادہ مایوس انسان دنیا میں نہیں ہے۔ میں دنیا میں دو چیزوں کا بھوکا تھا۔ ایک حکومت دوسری محبت۔ حکومت مجھے ملی مگر وہ میرا ساتھ نہ دے سکی۔ محبت کو میں نے تلاش کیا مگر حاصل نہ کر سکا۔ جس سے محبت کی اس نے مجھے دغا دی۔ شاید محبت کا جواب دغا ہی ہوتا ہے۔ اگر کسی انسان کی زندگی کا یہ مقصد رہا ہے تو وہ زندگی بے معنی ہے۔ میرے نزدیک دنیا مایوسی ہے اور مایوسی ہی کا نام دنیا ہے"۔ یہ ایک ایسی ہستی کے آخری الفاظ ہیں جس نے سارے یورپ کو ہلا دیا تھا اور جسے آج بھی دنیا کی تاریخ میں ایک امتیازی درجہ حاصل ہے۔

خلیفہ ہارون الرشید:- خلیفہ ہارون الرشید طوس میں بسترِ علالت پر پڑا ہوا تھا۔ موت گھیرے ہوئے تھی۔ اس نے اسی مکان میں جس میں وہ ٹھیرا ہوا تھا اپنی قبر کھدوائی جب قبر کھد کر تیار ہو گئی تو اس نے اپنی چارپائی قبر کے کنارے پر بچھوائی اور پڑے پڑے قبر کو دیکھتا رہا۔ ہارون کی زبان سے

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

معمہ طالع نمبر (۱۴) بتائیے یہ چار حرفی لفظ کیا ہے ؟

چار سے ایک اگر جائے تو رہیں چار کے چار چار سے دو اگر جائیں تو رہیں چار کے چار
چار سے تین اگر جائیں تو رہیں چار کے چار چار سے چار اگر جائیں تو رہیں چار کے چار

(نوٹ) دوسرے اور تیسرے مصرعہ میں ابجد کی گنتی کو دخل ہے۔ اس لئے ہم آپ کی سہولت اور اضافۂ معلومات کی خاطر مقررہ اعداد بھی لکھے دیتے ہیں۔

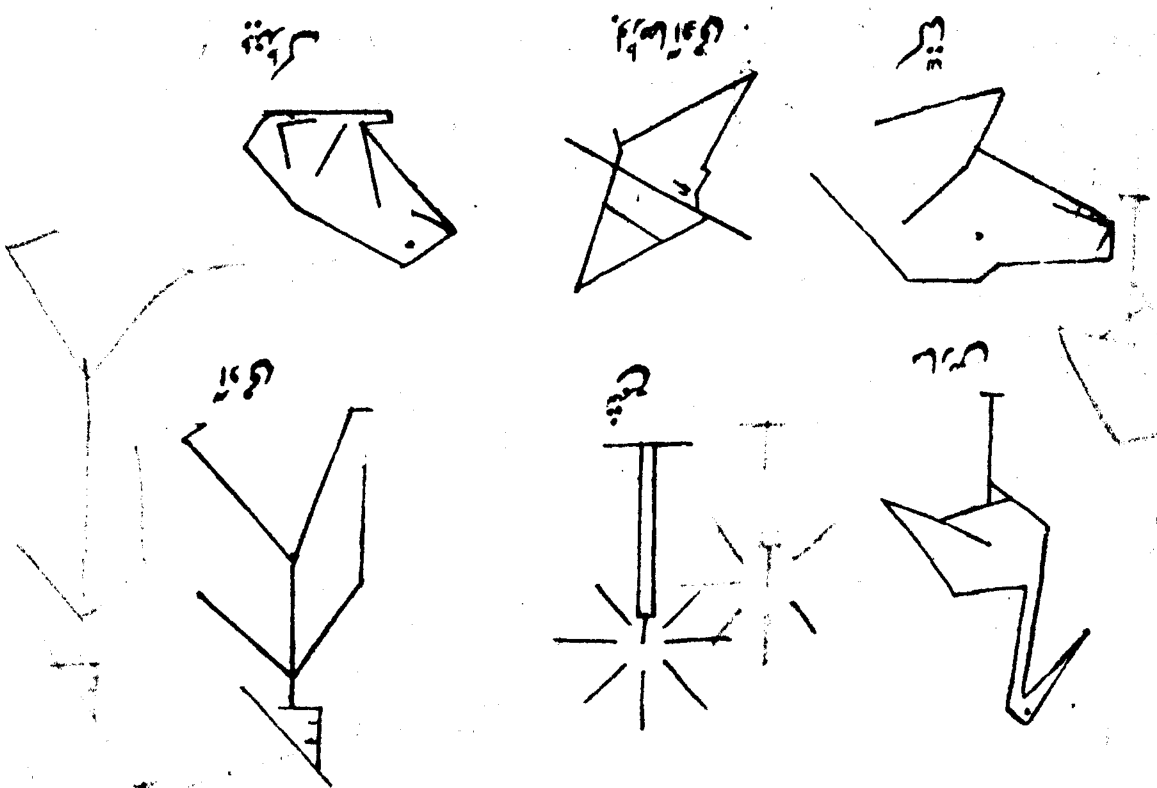
ا ب پ ج چ د ڈ ہ و ز ژ ح ط ی ک گ ل م ن س ع ف ص ق ر ش ت ٹ ث خ ذ ض ظ غ۔
۱ ۲ ۲ ۳ ۳ ۴ ۴ ۵ ۶ ۷ ۷ ۸ ۹ ۱۰ ۲۰ ۲۰ ۳۰ ۴۰ ۵۰ ۶۰ ۷۰ ۸۰ ۹۰ ۱۰۰ ۲۰۰ ۳۰۰ ۴۰۰ ۴۰۰ ۵۰۰ ۶۰۰ ۷۰۰ ۸۰۰ ۹۰۰ ۱۰۰۰

ہدایات

۱۔ تمام حل اس مہینہ کی آخری تاریخ تک دفتر سب رس پہنچ جانے چاہئیں۔
۲۔ مقابلے میں شرکت کے لئے حل کے ساتھ آٹھ پائی کا ٹکٹ یا پوسٹ کارڈ سادہ آنا ضروری ہے۔
۳۔ ایک حل ایک ہی نام سے قبول کیا جائے گا۔
۴۔ اپنا پورا نام اور صحیح پتہ صاف خط میں لکھئے۔
۵ صحیح حل پر ایک باتصویر کتاب (نظام الملک آصف جاہ اول) انعام میں دی جائے گی۔
۶۔ زیادہ تعداد میں صحیح حل وصول ہوں تو قرعہ اندازی ہو گی۔

سید مراد علی طالع

نظام الملک آصف جاہ اول ۔ مولوی سید مراد علی صاحب طالع نے بانیٔ سلطنت آصفیہ کے مجمل حالات و مستند واقعات زندگی عوام اور طلبہ کے لئے سلیس اور شگفتہ زبان میں تحریر کئے ہیں ان کو ادارہ نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ صفحات (۴۰) مع تصویر نظام الملک آصف جاہ ۔ قیمت (۶ر)



[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

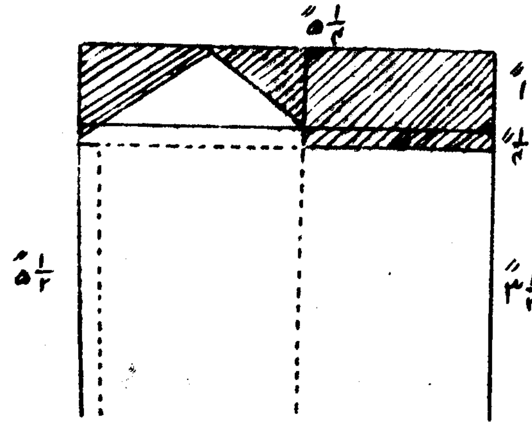
[illegible]

[illegible]

[illegible]

آج ہم آپ کو ایک مفید کام کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی نئی چیز اور نیا کام سیکھنا چاہیئے۔ آیئے آج ہم آپ کو لفافہ بنانے کی ترکیب سکھاتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ آپ بازار سے لفافہ خرید لائیں، اپنے ہاتھ سے بنائیے، یہ لفافہ بڑی سائز کا ہے تاکہ آپ اس میں اپنا مضمون رکھ کر ہمارے پاس بھیج سکیں آئندہ جو مضامین ہمارے پاس وصول ہوں گے ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس کے لفافے آپ ہی کے ہاتھ سے بنائے ہوئے ہوں۔

اس کی ترکیب بہت آسان ہے۔ یہ اگر بادامی (براؤن) کاغذ سے بنایا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ مدرسے میں آپ جیومٹری تو ضرور سیکھتے ہوں گے اور جیومٹری کا ڈبہ بھی آپ کے پاس ہوگا ورنہ اپنے بڑے بھائی یا بہن سے حاصل کر لیجئے۔ کاغذ پر $10\frac{1}{2}$ انچ کا مربع بنایئے اور پھر اسی حساب سے جو کہ شکل میں دکھایا گیا ہے کاغذ پر شکل بنا لیجئے اور بے ضرورت حصہ جس پر نشانات بنا دیئے گئے ہیں کاٹ کر علیحدہ کر دیجئے۔ اب اس شکل کو موڑ دیجئے اور پھر گوند لگا دیجئے بس لفافہ تیار ہو جائے گا اس پر "سب رس" کا پتہ لکھ دیجئے اور اپنا مضمون یا نظم، لطیفے یا پہیلیاں رکھ کر بھیج دیجئے۔ اس بات کا خیال رکھئے کہ کاغذ پر پنسل سے نشانات ہلکے بنائے جائیں اور موڑتے وقت بھی احتیاط ضروری ہے۔ اگر آپ کو یہ لفافہ پسند آئے تو ہم اس سلسلہ میں اور بھی مختلف کام کی چیزیں بنانے کا طریقہ اور ترکیب بتائیں گے۔



ادارہ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جراثیم کیا ہیں

یوں تو دنیا میں بہت سے جاندار ہیں۔ بعض تو ایسے جاندار ہیں جن کو ہم آسانی سے دیکھ سکتے ہیں اور بعض جاندار اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ان کا نظر آنا بھی مشکل ہے۔ اسے دیکھنے کے لئے خردبین کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان ننھے اور چھوٹے جاندار اجسام کو جراثیم کہتے ہیں۔ جراثیم بہت چھوٹے ہوتے ہیں اگر پچیس ہزار جراثیم ایک ایک دوسرے کے ساتھ قطار باندھ کر نکلیں تو ان کا طول ایک انچ کے برابر ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ جراثیم کس قدر چھوٹے ہوتے ہیں۔۔

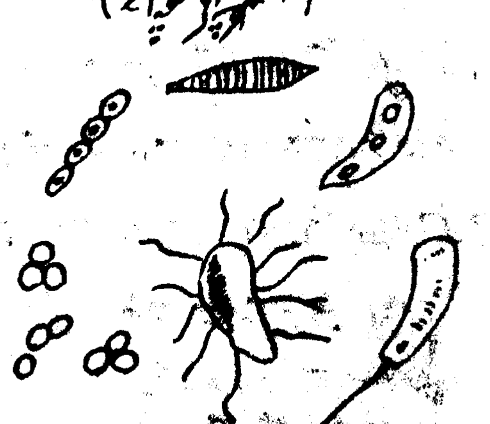
جراثیم مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ اور..... مختلف قسم کے کام انجام دیتے ہیں۔ ان میں کوئی تو مفید جراثیم ہوتے ہیں اور کوئی مضر تو کوئی بے ضرر ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو بہت ہی مفید ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک قسم کا جرثومہ جو دودھ کو دہی بنانے میں مدد دیتا ہے اور دوسرا انگور اور گنے کے رس کو سرکے میں تبدیل کر دیتا ہے اور تیسرا اہم جرثومہ جو خمیر کی تیاری میں مدد دیتا ہے۔ ان سب کے علاوہ اور بھی جراثیم ہیں جو گندگی کو ضائع کرنے میں بہت کچھ مدد دیتے ہیں اور ایک لحاظ سے یہ بھی مفید ہوتے ہیں کیونکہ گندگی کی وجہ سے ہزاروں قسم کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جراثیم سڑی گلی چیزوں میں پیدا ہوتے ہیں چنانچہ زمین کے اندر بھی مفید جراثیم پائے جاتے ہیں جو پودوں کی نشو و نما کے لئے ضروری اجزا فراہم کرتے ہیں۔ یہ تو سب مفید جراثیم ہوئے۔ لیکن بعض جراثیم نقصان دہ ہوتے ہیں۔ جو انسان اور پودوں میں طرح طرح کی بیماریاں پیدا کر دیتے ہیں مثلاً چیچک، پلیگ، ہیضہ وغیرہ یہ سب بیماریاں نقصان پہنچانے والے جراثیم سے پھیلتی ہیں۔ خردبین سے دیکھنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جراثیم الگ الگ شکلوں میں پائے جاتے ہیں بعض پیچ دار ہوتے ہیں اور بعض سلاخ نما تو کوئی گول ہوتے ہیں۔ دق کے جراثیم سلاخ نما ہوتے ہیں۔ ہیضہ کے جراثیم پیچ دار نمونیا اور خون میں زہریلا مادہ پیدا کرنے والے جراثیم گول ہوتے ہیں۔ میعادی بخار کے جراثیم کے

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]



[illegible]

[illegible]

ނިމުނީ

[illegible]

[illegible]

[illegible]



[illegible]

مسٹر ونسٹن چرچل



مسٹر چرچل ۳۰ نومبر ۱۸۷۴ء کو انگلستان کے ایک غیر معروف گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام رینڈالف چرچل تھا جو انگلستان کے بڑے بڑے امراء میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کی ماں امریکہ کی رہنے والی تھیں۔ چرچل کی ابتدائی زندگی بڑی دلچسپ ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اکثر نامور لوگ ایسے ہیں جنھیں بچپن میں پڑھنے لکھنے سے بڑی نفرت رہی ہے۔ بالکل یہی حالت مسٹر چرچل کی تھی۔ ابھی یہ تین چار برس کے تھے کہ ان کی نرس نے انھیں پڑھانا شروع کیا۔ جب نرس انھیں پڑھانے لگتی تو یہ بالکل انجان ہو کر اس کے بالوں سے کھیلا کرتے۔ جب ماں نے دیکھا کہ چرچل نرس سے پڑھتے نہیں تو ان کی پڑھائی کے لئے ایک استانی مقرر کی گئی۔ چرچل اس سے بہت ڈرا کرتے تھے اور اس کے آنے کے وقت پر باغ میں چھپ جاتے تھے۔ اس کے بعد ان کو ناروے کے ایک اسکول میں شریک کیا گیا جہاں یہ پڑھنے کے بجائے کھیلا کرتے تھے۔ ان کا شمار جماعت کے کند ذہن اور نکھٹو طالب علموں میں ہوتا تھا۔ یہ اکثر مدرسہ سے بھاگ جایا کرتے اور شہر کے آوارہ لڑکوں سے لڑنے کی مشق کیا کرتے۔ ان کو جتنی پڑھنے لکھنے سے نفرت تھی اتنی ہی کھیل سے دلچسپی تھی۔ ان کا شمار اسکول کے اچھے کھلاڑیوں میں ہوتا تھا۔ ان کی غیر حاضریوں پر استاد نے ان کے باپ سے شکایت کی اور کہا کہ یہ لڑکا ہر روز ایک نہ ایک شرارت کرتا ہے۔ چھوٹا سا تو ہے مگر بڑے بڑوں سے لڑ لیتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ انھیں فوج میں ملازم کروا دیا جائے۔ جب باپ نے ان کی یہ شکایت سنی تو ان کا نام مدرسے سے خارج کر الیا۔

۲۱ رسال کی عمر میں ۱۸۹۵ء میں انھیں فوج میں ملازم کروا دیا گیا تاکہ یہ اپنی روز افزوں

انھیں تقریر کرنی ہو تو وہ سات بھر اپنے سر کو دونوں تکیوں میں دبا کر تقریر کا مضمون سوچا کرتے ہیں اور پھر صبح ایسی بہترین تقریر کرتے ہیں کہ سب عش عش کرتے رہ جاتے ہیں۔ اب مسٹر چرچل کی عمر (۸۰) سال کے قریب ہے۔

سید شاہ مصباح الدین حسین جمیل

عقلمند بادشاہ

سنتے ہیں کسی زمانے میں سالمین نامی ایک بادشاہ کسی وسیع سلطنت کا فرمانروا تھا۔ وہ اپنی دولت سے زیادہ عقلمندی میں ۔۔۔ مشہور تھا۔ مختلف ملکوں کے عقلمندوں نے مختلف طریقوں سے اس کی دانائی کا امتحان لیا اور ہر مرتبہ شاہ سالمین کامیاب رہا۔

ایک مرتبہ شہاما نامی ایک شہزادی اس کے ہاں مہمان آئی۔ یہ نوجوان اور خوبصورت شہزادی بھی اپنی عقلمندی کی وجہ سے بہت مشہور تھی۔ اس نے دورانِ قیام میں شاہ سالمین کی عقلمندی کا امتحان لینے کا تہیہ کیا چنانچہ ایک روز اس نے دو گلاب کے پھول میز پر رکھ دیئے۔ اس میں ایک اصلی پھول تھا اور دوسرا مصنوعی اس نے شاہ سالمین سے دریافت کیا کہ "اصلی پھول کونسا ہے اور مصنوعی کونسا؟



شاہ سالمین نے ایک لمحہ تک سوچا پھر مسکرا کر کہا "کمرے کی سب کھڑکیاں کھول دو۔"

اس کے حسبِ حکم سب کھڑکیاں کھول دی گئیں جب پائیں باغ کی طرف کی کھڑکی کھلی تو ایک تیتری اڑتی ہوئی آئی اور تھوڑی دیر ادھر ادھر اڑنے کے بعد اصلی پھول پر بیٹھ گئی۔ شاہ سالمین نے کہا "یہی اصلی پھول ہے۔ تیتری کبھی دھوکا نہیں کھا سکتی" شہزادی اس عقلمندی پر دم بخود ہو گئی اور اس نے سالمین کی عقلمندی کو مان لیا۔

رضیہ رضویہ

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ޖުމްލަ		ޖުމްލަ	

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
ہندراج سکسینہ ایم ایس سی

۱۵۲
۳۹۵
۲۲۰۹
سالانہ ... روپیہ ... آنے
... سالانہ ... روپیہ ... آنے
فی پرچہ
(۸/)

جلد ۸ | بابت ماہ ڈسمبر ۱۹۴۵ء | شمارہ ۱۲

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے صحیفہ مشین پریس اعظم پورہ میں چھپ کر حضرت آباد سے شائع ہوا

غزل

طلسمِ فکر و فریبِ نظر ہے کیا کہیے — شباب موسمِ دیوانہ گر ہے کیا کہیے
مچل رہا ہے کوئی بات مانتا نہیں دل — تری نگاہ کے زیرِ اثر ہے کیا کہیے
ہر التماس پہ کہتے ہیں جانتے ہیں ہم — جب اپنے حال کی ان کو خبر ہے کیا کہیے
حریمِ دل کی مرے راہ پوچھنے والے — مرا خیال تری رہگزر ہے کیا کہیے
رموزِ عشق بتائے گئے اشاروں میں — حیات فرصتِ رقصِ شرر ہے کیا کہیے
کھلے نہ راہ میں اسرار زندگانی کے — ازل سے پیکِ اجل ہم سفر ہے کیا کہیے
کمالِ شوق اسیری جنوں نہیں ہمدم — یہ رازِ تربیتِ بال و پر ہے کیا کہیے
زمانہ درپئے آزار اور میں چپ ہوں — ہنوز حوصلۂ درگزر ہے کیا کہیے
یقینِ دورِ مسرت مجھے بھی ہے لیکن — ابھی تو گردشِ شام و سحر ہے کیا کہیے
چمن میں نرگسِ بیدار کو سکوں نہ ملا — وطن مخالفِ اہلِ نظر ہے کیا کہیے

میں فصلِ گل میں دکھاتا نہ دل کے داغ کبھی
وفورِ جوشِ جنوں پردہ در ہے کیا کہیے

سکندر علی وجد

[illegible] تاثر

[illegible] مسلم یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد [illegible] بہادر نے جو خطبہ [illegible] یونیورسٹی کے ضروری [illegible] (ذیل ہے)

نواب صاحب ممدوح نے مسلم یونیورسٹی سے اپنے [illegible] خاندانی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

مجھے اس خیال سے اس دعوت کے قبول کرنے کی ہمت ہوئی کہ میرے بعض اراکین خاندان کے جو گہرے تعلقات یونیورسٹی سے رہے ہیں ان کی بنا پر ایک حیثیت سے میرا بھی تعلق یونیورسٹی سے ہے۔ میرے ایک چچا نواب عماد الملک بہادر سید حسین بلگرامی سرسید کی تحریک کے بہت پر جوش حامی تھے اور میرے دوسرے چچا ڈاکٹر سید علی بلگرامی علی گڑھ کالج کے عملی کارکنوں میں سے ایک تھے جنہوں نے اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں اس وقت جب کہ علی گڑھ کالج یونیورسٹی کی صورت میں منتقل ہو رہا تھا اس کا دستور مرتب کیا تھا اس طرح آپ کو معلوم ہوگا کہ کیوں اس ادارہ کی ترقی اور فلاح سے میں ایک حقیقی اور پائیدار دلچسپی رکھتا ہوں۔

مسلم یونیورسٹی کیا تھی

آدھی صدی سے زیادہ زمانہ گزرا جب سے مسلم تہذیب اور افکار کے ارتقاء سے مسلم یونیورسٹی کا تعلق رہا ہے۔ شاید یہ کہنا حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ اس زمانہ میں مسلم ہندوستان کی تاریخ فی الاصل مسلم یونیورسٹی کی تاریخ ہے۔ بہت سے بڑے لیڈر جن کی کوششوں پر مسلمانوں کی تہذیب اور افکار کی ترقی منحصر رہی جیسے کہ مولنا محمد علی، مولنا شوکت علی، مسٹر سر راس مسعود ان سب کا کبھی نہ کبھی زمانہ میں مسلم یونیورسٹی سے تعلق رہا تھا۔ اس فہرست میں مجھے جسٹس سید محمود، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے نام بھی شامل کرنے چاہئیں جنہوں نے اپنے نہ مٹنے والے نشانات مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں چھوڑے ہیں۔ وہ سب ایسے مہاتما تھے جو قوت عمل رکھتے تھے اور ان کے اندر ایک قسم کی ایسی خوش مزاجی اور یار باشی بھی تھی جو علی گڑھ کی خصوصیت ہے اور جس کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ آج بھی مسٹر وائس چانسلر! آپ کے طلباء ریلوے اسٹیشنوں پر ٹکٹ کلکٹروں کی نگرانی سے بچ نکلتے ہیں

. . . .

بانی کا مقصد

اس عظیم المرتبت بانی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہمارے نوجوانوں کے کردار کو بلند کیا جائے ان کے خیال میں کردار کی مناسب تربیت اس تحقیق علم سے جو بڑی محنت کے ساتھ سبق کے کمروں اور کتب خانوں میں حاصل ہوتا ہے زیادہ ضروری تھی میری رائے میں کردار کی تربیت کے لئے ضبط و نظم ایک ضروری چیز ہے۔

ضبط و نظم

ہماری یونیورسٹیوں میں ضبط و نظم پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے اس لئے کہ آج جو طالب علم ہے وہی کل اس ملک کا شہری بننے والا ہے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب ہم نے برطانوی قوم کو جلتی ہوئی آگ سے فتحمند نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ جن لوگوں نے لندن کی بمباری اور بموں کی ہلاکت آفرینی کو دیکھا ہے وہ عام لوگوں کے اس ضبط و نظم کی بے حد تعریف کرتے ہیں جو (اس موقع پر) ظاہر ہوا۔ . . . . . . یاد رکھئے کہ جنگ کا شور و غوغا ابھی ختم نہیں ہوا ہے اور جذبات کا سیلاب جاری ہے اور مزاجوں کی گرمی باقی ہے ایسی حالت میں ضبط نفس کی ضرورت اور بھی زیادہ ہو گئی ہے . . . . جنگ کے زخموں کے اندمال میں بہت وقت صرف ہوگا اور ہمیں اپنی پوری قوت کی ضرورت ہو گی تاکہ ہم اس آنے والے زمانہ سے گزر سکیں جس میں فلاح اور امن یقینی نہیں۔ بہتر ہوگا کہ ہم اس بات کو بھی سمجھ لیں کہ دریاؤں اور

پہاڑوں کی حد بندی ختم ہو چکی ہے اور بڑے بڑے فاصلوں کو ہوائی جہازوں نے کم کر دیا ہے اس حالت میں کوئی قوم اپنے ہمسایہ کو نظر انداز نہیں کر سکتی اور نہ اپنے علاقے میں سب سے جدا رہ سکتی ہے۔ زمین سکڑ گئی ہے اور اس کی سطح پر کوئی مقام راکٹ اور ایٹم بم سے محفوظ نہیں رہا ہے۔ انسانیت کا مستقبل اب قوموں کی باہمی رفاقت، میل جول اور مفاہمت پر منحصر ہوگا......

ڈگری کے علاوہ بھی کچھ اور

نوجوان طلبہ کو مخاطب فرماتے ہوئے نواب صاحب نے انہیں یاد دلایا کہ "جب تم ایک ایسی یونیورسٹی سے جیسی کہ یہ یونیورسٹی ہے رخصت ہوتے ہو تو تم اپنے ساتھ ایک ڈگری کے علاوہ بھی بہت کچھ لے جاتے ہو۔ اقامتی .... یونیورسٹی کے بڑے فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ تمہیں ہم آہنگی اور رفاقت کے ساتھ زندگی بسر کرنا سکھاتی ہے کہ دوسروں کی رائے کو سننا گوارا کرو۔ اسی لئے کہ رواداری ہی جمہوریت کی روح ہے۔ جب تم اس بات کو تسلیم کرو کہ کسی ایک مسئلہ کے متعلق دو رائیں بھی ہو سکتی ہیں تو گویا تم نے جمہوریت کی بنیادی حقیقت کو تسلیم کر لیا....... ہمیں معلوم ہے کہ اندھا تشدد آمیز تعصب....... انسانوں کی روح کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتا ہے۔ اسلامی مبلغین کے ترغیبی طریقوں کا ذکر کرتے ہوئے سر تھامس آرنلڈ نے لکھا تھا کہ:۔

"اسلام کے مبلغ کی روح کلیتہً نہ تو ہم ظالم کی بے رحمی، تعصب اور غضبناکی میں پا سکتے ہیں اور نہ قصے کہانیوں کی شخصیتوں کے کارناموں میں جہاں مسلمان جنگ آزما ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک میں قرآن لئے ہوئے بتایا جاتا ہے۔ بلکہ یہ روح ہم کو اس خاموش اور سنجیدہ اور محنتی واعظ اور تاجر میں ملتی ہے جو اپنے مذہب کو کرہ ارض کے ہر گوشہ میں لے کر گیا۔"

رواداری میں نے رواداری کا ذکر کسی قدر طویل کیا ہے اس لئے کہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جمہوری طرز زندگی کا رواداری سنگ بنیاد ہے اس لئے بھی کہ آج جب کہ فصاحت و بلاغت کی جگہ

محض نعروں اور چیخ پکار [illegible] ترغیب کے طریقوں کا [illegible] جن کو اسلام نے جمہوری اصول [illegible] تہیہ کر لیں کہ ہر شخص کی بات انصاف [illegible] کے ساتھ سنی جائے گی۔

....

اہل نظم شعراء اندرونی خصوصیات [illegible] سے میں کہوں گا کہ زمانہ ماضی کا دور اور گزری ہوئی باتوں [illegible] ہماری قوم کی موجودہ تاریخ کا [illegible] ہیں۔ جن کی جوانی کی توانائی بڑھاپے کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ میں کہوں گا کہ:۔

"سیکھنے کی کوشش کرنا چھوڑ دو اور اس کے بجائے نہ سیکھنے کی کوشش کرو۔ دنیا کی وسعت میں نکل کھڑے ہو۔ سمندری ڈاکو بن جاؤ۔ بورنیو کے بادشاہ بن جاؤ۔ سوویٹ روس کے مزدور بن جاؤ جو چاہے بن جاؤ مگر اپنا وجود ایسا بناؤ جس میں تمہاری قدرتی غروروں کے پورا کرنے میں تمہاری تمام قوتیں مصروف رہیں۔"

ان لوگوں کے لئے یہ ایک اچھا علاج ہو دنیا کی ویران حالت .... سے آزردہ ہوتے ہیں اور جن کے دل انسانیت کی مصیبت سے بیزار ہو گئے ہیں لیکن جو اپنے گھروں میں پڑے رہتے ہیں اور مایوسی کے خیالات میں مبتلا رہتے ہیں اور زندگی کو اپنے گھر کے دروازوں سے باہر نکال دیتے ہیں۔

خواتین مسٹر وائس چانسلر۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ خواتین بھی آپ کی یونیورسٹی میں شامل ہیں اور ان کو بھی مردوں کے ساتھ ساتھ ڈگری حاصل کرنے کی اجازت ہے۔ اس صورت میں تو آپ کیمبرج یونیورسٹی سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ کیمبرج میں نہیں [illegible] کے دار العلوم نے صنف نازک .... کو ابھی [illegible] سے خارج رکھا ہے۔ یہ تو ہم سب کو معلوم ہے کہ [illegible]

[illegible] بہت قدیم ہے حضرت آدم [illegible] جنت سے نکالے جانے کے بعد سے [illegible] کوشش کر رہا ہے کہ اصل تنقیح [illegible] اور اسی لئے وہ اپنے شریک زندگی [illegible] کو یاد دلاتا ہے گر اپنی آسانی کے لئے [illegible] بھول جاتا ہے لیکن مرد کے اس تفوق کا [illegible] ہو چکا۔ اب یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مردوں کی دنیا میں عورتیں بھی کام کرنے کے قابل ہیں کسی مہذب سماج میں اب ان کے حقوق نظرانداز نہیں کئے جا سکتے۔

[illegible] میں اسقفوں کی مجلس...... میں یہ سوال زیر بحث آیا تھا۔ اس مجلس میں ایک اسقف نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ عورتوں کو انسان نہیں سمجھا جا سکتا۔ گر بحث و مباحثہ کے بعد دوسرے اسقفوں نے اس بحث کا فیصلہ مدعی کے خلاف کیا اور اس دن سے عورت تمدنی کی منزلیں یکے بعد دیگرے طے کر رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا جب مرد کی وحشت اور عامیانہ بدتہذیبی عورت ہی کے اثر سے کم ہو سکے گی۔......

...... اب تمام دنیا میں ایک انقلاب ہے اور میں تو اس انقلاب کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

....

لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ایسے ملکوں میں جیسے کہ ہمارا ہے جہاں کثیر آبادیاں، بہت زیادہ جہالت، زندگی کا یہ پست معیار اور سماجی خرابیاں موجود ہیں عورتوں کا کام گھروں کے اندر رہے۔ جس وقت معاشی دست نگری کا خوف باقی نہ رہے اور مردوں کے ساتھ مساوی حیثیت قائم ہو جائے تو ہندوستان کی عورت اپنے گھر کے انتظام کو درست کر کے ایسی نسلیں پیدا کر سکتی ہے جو شہری ذمہ داریوں کا وزن اٹھا سکیں۔ یہ کام میرے خیال میں زیادہ بڑا اور زیادہ محنت کا کام ہے بہ نسبت اس کے کہ سرکاری دفتروں میں مناسب عہدے ل جائیں یا ہوائی جہاز میں پرواز کی جائے یا ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی پر چڑھا جائے۔

علی گڑھ کی انتہائی خوش قسمتی ہے کہ اس کو ہز اگزالٹیڈ ہائی نس حضور نظام حیدرآباد و برار جیسی بلند مقام شخصیت کا چانسلر نصیب ہوا۔ اعلیٰ حضرت کی علم نوازی اور تعلیم کے مقصد کی ترقی کے لئے اعلیٰ حضرت کی آرزومندی نے ان کے لئے سلطان العلوم کے لقب کو بجا طور پر بہت موزوں بنا دیا ہے۔

....

میں اس موقع پر یونیورسٹی کے ایسے دوسرے مشاہیر کی شخصیتوں کا ذکر کرنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔ جیسے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حسرت موہانی ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی تہذیب اور افکار کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں...... آخر میں اس سال کے گریجویٹس کو مخاطب کرتے ہوئے نواب صاحب ممدوح نے فرمایا کہ۔

علم ایک غم ہے

علم در اصل ایک غم ہے۔ اگر وہ تہذیب کے مجتمع خزانوں کی بربادی میں مدد کرے مجھے امید ہے کہ اپنی طالب علمی کے قیمتی سالوں میں جو علم تم نے حاصل کیا ہے وہ تمہیں اس قابل بنائے گا کہ تم وحشیانہ جہل کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ بغیر خوف اور بغیر تعصب کے کر سکو......

خدائے تعالیٰ صداقت اور حق کے راستے پر تمہاری رہنمائی کرے اور گزرے ہوئے زمانہ کے ساتھ تم ایک عظیم الشان ملک کے قابل سپوت اور اقوام عالم میں اپنی صحیح جگہ حاصل کرنے کے قابل ثابت ہو۔ میں اپنے خطبہ کو اس دعا کے ساتھ ختم کروں گا جو ہمارے محبوب شاعر اور فلسفی سر محمد اقبال نے مانگی تھی ؎

خود کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر

(ماخوذ از پیام)

اکیلی عورت

نیلا تم پوچھتی ہو کہ میں تمھارے خطوط کے جواب میں
ایسی پراسرار خاموشی کیوں اختیار کئے ہوئے ہوں کہ تمھیں
اپنی ازدواجی زندگی کا ایک نقطہ بھی سنانا نہیں چاہتی۔ تم
یہ کیسے سمجھ بیٹھی ہو کہ میں شیام کے ساتھ رنگ رلیوں میں
ایسی محو ہوں کہ نہ صرف تم بلکہ کالج کی تمام ساتھی سہیلیاں
بھی فراموش ہو گئیں۔ تم تو زندگی کی رفیق نہیں نیلا بلکہ میری
روح اور میری زندگی ہو۔ تمھارا ہی تو سہارا لیکر میں نے
کالج کی زندگی کے تمام منازل طے کئے ہیں۔ میرے حواس نے
ابھی جواب نہیں دیا ہے کہ میں نیلا کو بھول جاؤں اور اسے
پہچان بھی نہ سکوں۔ میری طویل اور پراسرار خاموشی ایک دردناک
حقیقت ہے۔ انہی خاموش دنوں میں میری زندگی کا جنازہ نکل
چکا ہے۔ نصیب کی کمی ساری خوشیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا
کی گود میں سو چکیں۔ نیلا بہت اب میں ایک ٹوٹا ہوا رباب
ہوں جس سے کوئی نغمہ نہیں نکل سکتا۔ تم مجھ سے کالج کی
چہلیں بیان کرتی ہو اور مجھ سے چاہتی ہو کہ شیام کا حال سناؤں۔
اگر تم میری بدنصیبیوں اور محرومیوں کی دردناک داستان سننے
کی سکت رکھتی ہو تو میرے پتی، شیام کی داستان بھی سن لو۔
اور میری زندہ موت کا ماتم کرتی رہو۔ یہ نہ سمجھو نیلا کہ شیام کا
مزاج، نصیب دشمنان ہو گیا ہے۔ بلکہ میری تقدیر تقدیر
دشمنان بن چکی ہے۔ یہ جان کر درد و غم میں ڈوب نہ جاؤ کہ
شادی کے تین چار مہینے بعد ہی میری تقدیر کیوں سوئی۔

شیام کچھ عجیب سا جوان ہے۔ بہکا بہکا، الجھے
خیالوں میں گرفتار، نگاہوں میں سحر، حرکتوں میں چھپی
داستانیں، گفتگو میں خاموشی، خاموشی میں پہیلیاں۔ اس کو
بوجھنے جو چلی تو اپنا پتہ بھی بھول گئی۔ اس رات جب میں نے
اسے پہلی مرتبہ دیکھا تو ایک الجھن میں پڑ گئی کہ پرماتما نے
مجھے کس وحشی کے پلے باندھا ہے۔ لیکن نیلا میری زندگی

اسے [illegible] زندگی [illegible]
کی کہانی [illegible]
[illegible]
میں چلا گیا۔ اس نے دنیا چھوڑ [illegible]
اور آتما کے پھندوں میں گرفتار ہو کر [illegible]
باپ اور میں، بلکہ تمام رشتوں ناتوں کو [illegible]
بنا کر آشرم میں جا بیٹھا۔ آشرم میں [illegible]
نصیب ہونے والی ہے۔ نیلا وہ آشرم چلا گیا [illegible]
جانے کہ وہ کبھی لوٹنے کا بھی نہیں۔ میں اس کے [illegible]
رو کر کیا کرتی تھی۔ عورت کا آشرم اس کی دنیا اس کی [illegible]
بھی تو اس کا پتی ہے میں بھی انہی قدموں چل گئی۔ مہرے
آشرم پہنچ نہ سے وہ گرد بیٹھا۔ قہر و غضب کا جیسا [illegible]
برس پڑا۔ میری ساری کوششوں کے باوجود [illegible]
آشرم والوں کو بھی میرا قیام گراں گزر رہا تھا۔ گرو [illegible]
چیلوں نے کہا کہ آشرم میں ایک سندری آئی ہے جو [illegible]
پاس ہے اور اسکول میں لڑکیوں کو پڑھاتی بھی ہے۔ شاید
شیام کی بیوی ہے۔ لیکن اس کا قیام آشرم پر کلنک کا ایک
ٹیکہ بن جائے گا۔ مہاراج نے مالا جپتے ہوئے آنکھیں بند
کئے شیام سے کہا کہ وہ مجھے آشرم سے چلے جانے کو کہے ورنہ
اس کو بھی آشرم میں جگہ نہ مل سکے گی۔ شیام بھر پور جذبہ ہوا
میرے تار و پود بکھیرنے چلا آیا۔ میں سوائے اس کے اور کیا
کر سکتی تھی کہ آشرم سے گھر واپس چلی آؤں۔

نیلا میں درد و غم کی اسی دنیا میں سانس لیتی رہی تھی، تم
کمان تھی کہ ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ شیام کی ماں نے کہا کہ
وہ میری وجہ سے آشرم چلا گیا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ
ایک میم بیاہ لائے جو نہ گھر کی لاج ہو سکتی ہے اور نہ ایک
بیوی بن سکتی ہے۔ اسکول اور کالج کی پڑھی لڑکی کی
آنکھوں کا پانی مر جاتا ہے۔ شرم و حیا [illegible]
اور پھر اس پر طرہ یہ کہ اب بھی یہ لڑکیوں کو پڑھاتی ہے۔ [illegible]
کی لڑکیاں جو آج اپنا فیصلہ آپ خود کر رہی ہیں [illegible]

اپنے ساتھ میری دنیا کیوں خراب کرتا ہے۔ وہ مجھے کیوں تنہا کر رہا ہے۔ اس دیس کی یہی ریت ہے۔ لڑکیاں قربانی کے جانور ہیں جو مردوں کی خوشی کے لئے بھینٹ چڑھتی ہیں۔ اسلم پاگل تھا جب اس پر دورے پڑتے تھے وہ نیک اور بد کا کوئی امتیاز نہیں کر سکتا تھا لیکن پھول سی نازک اور گلاب کی پنکھڑی شاہدہ اس کے ساتھ بیاہی گئی جانتی ہو تم پھر کیا ہوا۔ اسلم پاگل خانہ گیا اور شاہدہ ملن کے سپنے [illegible] میں شریک کی گئی۔ مہندرا قلب کا مریض تھا۔ لیکن ڈاکٹروں نے اسے رائے دی تھی کہ اگر وہ بیاہا جائے تو اس کا مرض جاتا رہے گا۔ کملا اس کی بیوی بن کر آئی مگر کچھ ہی دنوں بعد قلب کے مریض نے کملا کو مفارقت کا دائمی مرض عطا کر دیا۔ اور میں شیام کے آشرم کے جنون پر بھینٹ چڑھ رہی ہوں۔ اس دنیا میں بیویاں اپنے شوہروں کی باندیاں ہی بن کر نہیں رہتی ہیں بلکہ بھینٹ چڑھنے کے لئے ہی پیدا کی جاتی ہیں۔ عورت کی تقدیر ہی میں لکھا ہے کہ وہ اپنی بربادیوں پر اُف نہ کرے۔ ان ناانصافیوں کے خلاف اگر کوئی جہاد کرنے کا ارادہ کرے تو وہ مسمار کر دیا جائے گا۔ ستی کی رسم دوبارہ شروع کر دی جائے گی کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بنسری۔

شیام کے باپ کہہ رہے تھے کہ اس نئے زمانے نے دھرم کو بھی بگاڑ دیا۔ ان کے خیال میں وہ بڑے اچھے دن تھے جب کہ شوہر کے مرنے پر اس کی بیوی بھی چتا میں جل کر اپنے شوہر کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ اب جو یہ طریقہ اٹھ گیا ہے زمانہ میں کیسی کیسی برائیاں پھیل رہی ہیں۔ بیوہ لڑکیاں مردوں سے میل جول کرتی ہیں۔ تم نے اس گفتگو کا مطلب نہیں سمجھا، نیلا وہ ستی پر اس لئے غور کر رہے تھے کہ بیوہ عورتوں کے لئے یہ طریقہ مفید تھا لیکن ان عورتوں کے لئے کیا علاج ہو سکتا ہے جن کے شوہر زندہ ہیں لیکن آشرم میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ یا تو مجھے جلا دینا چاہتے ہیں یا قید کر دینا چاہتے ہیں تاکہ ان پر کلنک کا کوئی ٹیکہ نہ لگنے پائے۔ مجبوریوں اور لاچاریوں کے اس پشتارے کو لیکر میں نہ جانے کہاں چلی جا رہی ہوں۔ کالج میں شیکسپیر کا انتونی اور قلوپطرہ اور رومیو و جولیٹ جب پڑھتی تھی تو مجھے زندگی پیاری لگتی تھی۔ جب کالج چھوڑ کر زندگی میں چلی آئی تو کالج کے وہ دن ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں جس میں دور کے ڈھول ہی سہانے لگتے۔ اس دنیا میں شیام بھی بستا ہے جس کو آشرم کی پروا ہے جو زندگی کی حقیقت کو پہچاننا چاہتا ہے۔ روح اور جسم کے تعلقات سے پردے ہٹا رہا ہے لیکن ایک عورت کا دل نہیں پڑھ سکتا۔ آنکھوں کو پہچان نہیں سکتا۔ اس کی دھڑکنوں کو سن نہیں سکتا۔ ایک عورت کی بربادی پر وہ اپنے عرفان کا محل تعمیر کر رہا ہے۔

نیلا شیام کی ماں صبح سے مجھ پر طعن و طنز کر رہی ہے کہ میرے قدموں کی برکت سے اس کا چاند سا بیٹا ہاتھوں سے جاتا رہا۔ اگر مجھ سے ممکن ہوتا تو میں شیام کی جٹائیں پکڑ کر آشرم سے کھینچ لاتی اور محبت کی ماری ماں سے کہتی کہ اسے لا دیا ہے۔ پوچھو وہ آشرم کیوں گیا؟ اپنی ماں کے محبت بھرے دل کو کیوں دکھ پہنچایا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اگر مناسب سمجھو تو پوچھو کہ ایک جوان لڑکی کی زندگی بھی کیوں تباہ کر گیا؟

نیلا میں یہی سوچتی رہتی ہوں کہ کیا ہمارے ملک میں کوئی ایسا شخص بھی پیدا ہوگا جو آشرم جانے والوں سے نوجوان لڑکیوں کو بچا کر انہیں زندگی عطا کر سکے۔ میں بھی یہ طاقت رکھتی ہوں کہ آشرم جانے والوں کو آشرم جانے دوں لیکن ان کے ساتھ ایک دوسری زندگی بھی تباہ ہونے سے بچا لوں۔ لیکن نیلا میں اکیلی ہوں، کام بہت دشوار ہے اور راستے میں بڑی مشکلات ہیں۔ اگر کوئی ساتھی مل جائے تو میں ناانصافیوں سے لڑنے نکل پڑوں لیکن ابھی میں اکیلی ہوں۔ تنہا۔ اکیلی ـــــ وقت اور ساتھی دونوں کا انتظار کر رہی ہوں۔

محمد محبوب حسین جگر

کارڈینل نیومن

(ریورینڈ ہنری ٹرسٹرام کے قلم سے)

میں یہ مضمون اس کمرے میں لکھ رہا ہوں جہاں
کارڈینل نیومن ۱۸۵۲ء سے اپنی وفات تک مقیم
رہے، اور اسی میز پر جس پر وہ مضمون لکھا کرتے تھے۔
میرے بالکل سامنے ان کی ایک عکسی تصویر آویزاں ہے
جس میں دکھایا گیا ہے کہ وہ ایک مضمون کا مسودہ ہاتھ
میں لئے اس میز کے سامنے بیٹھے ہیں۔ یہ تصویر ۱۸۸۰ء
سے زیادہ بعد کی نہیں لوگوں کی عقیدت کی وجہ سے
یہ کمرہ ہمیشہ اسی حالت میں رکھا جائے گا جس میں وہ
۱۱ اگست ۱۸۹۰ء کو تھا، جب وہ اپنی آخری مختصر بیماری
کے بعد اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔
ہر طرف ان کی معمولی چیزیں مثلاً چاقو چند [illegible]
قلم وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ سامنے قلموں کا ایک سٹینڈ اور
حوالے (ریفرنس) کی کتابوں کی چھوٹی سی الماری رکھی ہے۔
بائیں طرف دیوار کو ایک بڑی الماری نے چھپا رکھا ہے
جس میں ان کے کاغذات کا ذخیرہ ہے جو اب فائلوں
میں رکھ دیئے گئے ہیں اور جن کا انڈکس مرتب کر لیا
گیا ہے ——— مضمونوں کے مسودے، ڈائریاں،
یادداشتیں اور مضامین کے کٹنگ (تراشے) رکھے
ہوئے ہیں جو ان کی ساری زندگی کا اندوختہ اور خزانہ
ہے۔ دائیں طرف اور پیچھے اونچی اونچی الماریاں ہیں جن میں
بہت سی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ میز کے آگے لکڑی کے
تختوں کی "دیوار" قائم کر کے کمرہ کو دو حصوں میں تقسیم
کر دیا تھا۔ اور انھوں نے دوسری طرف کے حصہ کو [illegible]
میں ایک گرجا میں تبدیل کر دیا تھا اور یہاں وہ ہر صبح عشائے
ربانی کی رسم ادا کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ بہت زیادہ
بوڑھے ہو جانے کی وجہ سے اس قابل نہ رہے۔
یہ کمرہ تاریک اور اس میں سامان کم ہے مگر
اس کی حیثیت تاریخی ہے۔ اس سے ایک بڑے پادری

کی یاد تازہ ہوتی ہے جو عیسائیوں کے ٹرکٹیرین فرقہ کے رہنما
اور رومن کارڈینل تھے اور جو سینٹ فلپ نیری کے قول
کے مطابق یہاں مدت تک اپنی روحانی تبلیغ میں مصروف
رہے۔ انھوں نے اس مکان کو تقریباً سو سال پہلے
بنایا تھا اور اس کا ہر حصہ اور ہر ایک گوشہ ان سے
نسبت رکھتا ہے۔ ان کے کمرے سے چند گز کے فاصلہ پر [illegible]
گرجا کے اس طرف گرجا ہے جہاں وہ عشائے ربانی
کی [illegible] رسم ادا کرتے تھے اور اس کے بازو میں کتب خانہ
ہے جس کا خاکہ اور ترتیب انہی کی تجویز کی ہوئی
ہے۔ اس کتب خانہ کی الماریوں میں آپ کو کلیسا سے
متعلق کتابیں، دینیات، فلسفہ اور تاریخ کی کتابیں رکھی
ہیں جو انھوں نے جوانی سے لیکر بڑھاپے تک جمع کی تھیں
اور یہ کتب خانہ ایسا ہے کہ اسے گبن اپنی کتاب زوال سلطنت
روما کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔
زینہ کے نیچے طعام خانہ میں ایک میز رکھی ہے جس پر وہ
کھانا کھایا کرتے تھے۔ قریب کے [illegible] میں ایک [illegible]
بڑی ہے جس پر وہ شام کے وقت کھانے کے بعد [illegible]
کے آدمیوں کے ساتھ بیٹھتے تھے۔
پادریوں کے کمرہ اور سکرسٹی (گرجا کے کپڑے اور برتن
رکھنے کی جگہ) میں ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اعلان
اور ہدایتیں اب بھی لٹک رہی ہیں مگر ان کے حروف مدھم
پڑ گئے ہیں۔
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود یہاں موجود ہیں اور
جو لوگ ماضی کا تصور باندھتے ہیں انھیں احساس ہوتا ہے
کہ وہ ان کے قدموں کی چاپ اور ان کی شیریں اور
رقت انگیز آواز سن رہے ہیں اور ان کے زرد پتلے اور رنجیدہ
چہرے کو دیکھ رہے ہیں جس پر جھریاں پڑی ہوئی ہیں اور
جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی آنکھ نظر سے اوجھل [illegible]

لیکن پوپ لیو سیزدہم نے کارڈینل بنانے کے ذریعہ جو
خطاب دیا تھا اس میں انھوں نے نیومن کو کارڈینل کا
اعلیٰ منصب عطا کرنے کی خواہش کا اعلان کیا تھا اور اس کی
یہ وجہ بتائی تھی کہ نیومن ذہین عالم، پارسا اور چرچ کے
اور "ہولی سی" کے وفادار ہیں۔

نیومن نے ۱۲ مئی ۱۸۷۹ء میں بگلیٹو میں جو
تقریر کی اس میں انھوں نے اپنی زندگی کا اصل مقصد یہ
بتایا کہ "مذہب میں آزادی کے جذبہ کی مخالفت کی جائے"
یعنی ایسے معاملات میں خیال آرائی کی مخالفت کی جائے
جن میں انسانی دماغ غور کر کے کوئی کامیابی حاصل نہیں کرتا
ان کے خیال میں ان حالات میں ابتدائی اصول شامل ہیں
ان میں سب سے زیادہ مقدس اور اہم وحی کے حقایق ہیں
اور وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا کلام رسول پر نازل ہوتا ہے۔

لڑکپن میں نیومن کے ذہن میں جو اصول جم گئے
تھے ان کے نقوش کبھی مدہم یا زائل نہیں ہوئے۔ آکسفورڈ
میں انھیں لبرل پارٹی کے مقابلہ میں کام کرنا پڑا۔ ٹریکٹیرین
تحریک کے ماتحت وحی کے حقایق کا اعلان ان لوگوں کے
مقابلہ میں کیا گیا جو ان کے متعلق شبہ رکھتے تھے یا ان کی
قدر و قیمت گھٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ لبرل پارٹی ہی نے
انھیں آکسفورڈ سے نکال دیا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد لبرل تحریک الحاد کا ایک بڑا
فتنہ بن گئی۔ ہر جگہ اس کی ایک ہی حیثیت تھی۔ گو ایک ملک
کی بہ نسبت دوسرے ملک میں اس کے مظاہرے کی شدت
میں تھوڑا بہت فرق تھا۔ نیومن ابتدا ہی سے اس تحریک
کو "اصولی مذہب" کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔
اور وہ اس تحریک کی مخالفت اور اصول کی حمایت کے سلسلہ
میں اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔

انھوں نے انگلستان کے کیتھولک آدمیوں کی
ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور ترغیب دی کہ وہ
فکر و نظر کی ترقی کے ساتھ ساتھ چلیں۔ انھوں نے ۱۸۵۱ء
میں ایک لکچر میں کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ عام لوگ اپنے
مذہب سے واقف ہو جائیں جو اپنی حیثیت کو سمجھیں جو
یہ سمجھیں کہ ان کے پاس کیا چیز ہے اور کیا نہیں ہے جو اپنے
مذہب سے اتنی اچھی واقفیت رکھتے ہوں کہ اس کی وضاحت
کر سکیں اور جنھیں تاریخ کا اتنا علم ہو کہ اپنے مذہب کا دفاع کر سکیں۔

میں چاہتا ہوں کہ عام آدمی اچھی واقفیت رکھتے ہوں
آپ اپنے علم کو وسعت دیں۔ استدلال کی قوت بڑھائیں۔
چیزوں کا صحیح طور پر مشاہدہ کریں۔ یہ سمجھیں کہ ایک حقیقت کا
دوسری حقیقت کے ساتھ کیا تعلق ہے عقیدہ اور عقلیت
کے درمیان کیا تعلق ہے۔ کیتھولک مذہب کی بنیاد اور اصول
کیا ہیں۔ اگر آپ ان موضوعات سے واقفیت حاصل کریں
تو آپ کی مذہبیت میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوگی۔
بشرطیکہ آپ کو اس بات پر اعتقاد ہو کہ آسمان پر خدا موجود
ہے اور آپ کی روحوں سے حساب لیا جائے گا اور
انھیں نجات حاصل کرنی ہوگی۔"

مگر انگلستان ان کے نصب العین پر پورا نہیں اترا۔
انھوں نے ۱۸۶۳ء میں ایک یادداشت میں شکایت
کی کہ "انگلستان کے کیتھولک آدمی اپنے نابینا ہونے کی وجہ
سے یہ نہیں دیکھ سکتے کہ وہ نابینا ہیں۔ اس وجہ سے
ان کا خیال ہے کہ کیتھولکوں کی حالت اور مرتبہ کو ترقی
دینے کے لیے کیتھولکوں کی حیثیت کی استدلالی بنیاد اور
فلسفہ اور موجودہ زمانہ کی خصوصیت کے باہمی تعلق کا
احتیاط سے جائزہ لینا ان میں وہ معقول خیالات
پیدا کرنا اور ان کے دماغوں کو روشن کرنا مختصر یہ کہ
انھیں تعلیم دینا فضول مشغلہ ہے بلکہ توہین ہے۔ اس سے
معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس ٹھوس دلائل کی کمی ہے۔
اب شروع سے آخر تک میرا کام یہ ہے کہ تعلیم ان وسیع
معنوں میں دی جائے۔"

چونکہ انھوں نے برابر اس قسم کے خیالات ظاہر
کیے اس لیے بعض حلقوں میں ان پر طرح طرح کے

[illegible]

شاہد کے نام

آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

بادۂ تلخ سے لبریز ہے یہ جامِ حیات
کتنی صدیوں سے جواں ہیں غم و آلامِ حیات
کتنی افسردہ و غمگین سی ہے شامِ حیات
زندگی آج بھی اک بارِ گراں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

نغمۂ شوق کوئی جھوم کے گائے بھی تو کیا!!
سر بہ سر غم کی حکایت ہے سنائے بھی تو کیا
پردۂ جبرِ مشیت کو اٹھائے بھی تو کیا!
کیوں مری سمت یہ حیرت نگراں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

کتنے سینوں میں دہکتی ہوئی اشکوں کا دھواں!
یہ تبسم کا مزار اور یہ قلبِ انساں!
چلتی پھرتی ہوئی لاشوں کا یہ مدفن یہ جہاں!
مری نظروں پہ غمِ دہر عیاں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

غنچہ و گل کا خزاں بار تبسم بھی اداس
زہرہ و اختر و پروین کا ترنم بھی اداس
مہ جبینانِ سمن بر کا تکلم بھی اداس
زندگی دردِ مسلسل ہے فغاں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

ہر مصیبت میں جو خنداں تھا وہ دل ٹوٹ گیا!
جو ہر اک درد کا درماں تھا وہ دل ٹوٹ گیا!
جو حریفِ غمِ دوراں تھا وہ دل ٹوٹ گیا!
مضمحل اب وہ دلِ گرم و جواں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
اور افسانے بھی ہیں تیری حقیقت کے سوا
فرض کچھ اور بھی ہیں عشرت و راحت کے سوا
زندگی صرف محبت ہی کہاں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

جا رہا عزمِ بغاوت کو جگانے کے لئے!
مادرِ ہند کو آزاد کرانے کے لئے!
تجھ سے جاتا ہوں بہت دور نہ آنے کے لئے!
منتظر کشمکشِ دورِ جہاں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

رخصت اے دوست کہ منزل نے پکارا ہے مجھے!
رخصت اے دوست جدائی بھی گوارا ہے مجھے!!
رخصت اے دوست کہ طوفاں کا سہارا ہے مجھے!!

عزمِ محکم پہ مرے اب بھی گماں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

مجیب خیرآبادی

[illegible]

نکال دو، تاکہ دنیا کی ٹھوکریں کھا کھا کر خود اپنا راستہ
ڈھونڈنے کے قابل ہو جائیں۔

حیدر۔ اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو بندہ ہر طرح تیار ہے۔

تنویر۔ چپ رہئے! بڑوں کے منہ نہیں لگتے۔ ابا جان
انہیں معاف کر دیجئے۔ یہ نادانی کرتے ہیں۔

تراب۔ ڈھٹائی کیوں ہو بیٹی۔ حیدر نے کوئی بدتمیزی نہیں
کی اچھی باتیں کہہ رہا ہے۔ کتنی ہمت آ گئی اس میں۔
کتنے بلند ہو گئے اس کے حوصلے۔ وہ انسان ہی کیا
جس کو اپنے مستقبل کا خیال نہ ہو۔ آخر اپنے پیروں پر
کھڑا ہونا ہی تو ہے۔ میرا تو چل چلاؤ ہے آج ہوں
کل نہیں۔ حیدر کچھ روپیہ تم کو ادا دوں گا۔ اسی سے
اپنی زندگی سنوارو۔ اپنے آپ کو کام کے اہل ثابت کرو
یہ تمہارا امتحان ہوگا اگر کامیاب ہو جاؤ تو میری
ساری کائنات تمہاری ہے۔ ہاں جب تک
تمہاری حالت درست نہ ہو جائے دولہن بیٹی
یہیں رہیں گی۔

تنویر۔ لیکن ابا جان!

تراب۔ اپنے فرض کا خیال ہے۔ اچھا تم بھی جاؤ۔ تم اپنا
فرض ادا کرتی رہو۔ میں اپنا فرض ادا کرتا رہوں گا
—— خدا حافظ۔ (تیز تیز قدموں سے جانے کی آواز
ایک ساز)

تنویر۔ کیا کہہ دیا تم نے؟ کیا کرو گے الگ جا کر؟ خدا
اب کیا ہوگا؟؟

حیدر۔ وہی ہوگا جو ابا جان نے کہہ دیا!

(ایک ساز جس سے گھبراہٹ اور غم کا اظہار ہوتا ہے)

داستان گو۔ حیدر باپ کے گھر سے نکل کر سٹہ بازی کے سہارے
اپنی زندگی بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن سٹہ بازی
جو انسانیت کے لئے مرض دق سے زیادہ خطرناک
ہے، حیدر کی شرافت عزت دولت کو اندر ہی
اندر کھا گئی۔ وہ گمراہی کے سمندر میں ڈوبتا گیا۔
بدکاروں کی صحبت نے اسے مستقبل سے غافل بنا دیا اور
روز بروز اس کی عزت ذلت میں [illegible] گئی۔
تراب اپنے ناخلف بیٹے کی بربادی کا تماشا دیکھتا اور
خون کے گھونٹ پی کر چپ سادھ لیتا۔ عزت دولت
تنویر کا زیور سٹے کی نذر کرنے کے بعد آج پہلی
مرتبہ حیدر کے گھر اناج نہیں تھا سننے وہ بھوکا پیاسا
شام گھر لوٹ کر دروازہ پیٹ رہا ہے۔ ناعاقبت
اندیش (دروازہ پر کھٹکا کھلنے اور بند کرنے کی آواز
[illegible] ——)

حیدر۔ تنویر کھانا کھا لیا تم نے؟

تنویر۔ آپ تو ہوٹلوں میں کھا چکے ہوں گے۔

حیدر۔ لیکن گھر کے کھانے میں بھی میرا حصہ ہونا چاہیے۔
تنویر! تم بھی مصیبت کے وقت ذلیل سمجھ رہی ہو۔

تنویر۔ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟ جب اناج ہی نہ ہو تو کھانا
کہاں سے پکے چولہا کیسے جلے؟

حیدر۔ یعنی آج ہم کو فاقہ کرنا ہوگا۔ اوہ! کتنا گر گیا ہوں کیا کرنا
تھا۔ کیا کرنا چاہیے۔ کیا کرنا ہوگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا
کچھ نہیں آتا۔ کچھ نہیں آتا۔

تنویر۔ ابا جان نے ہم کو علیحدہ اس لئے کیا تھا کہ آپ کو اپنی
ذمہ داریوں کا احساس ہو سنبھل کر اپنی راہ بنا
آپ کرنا سیکھ جائیں۔

حیدر۔ ہو گئی۔ میں ابا جان کو صورت دکھانے کے لائق نہیں
ہوں۔ تم جا سکتی ہو۔

تنویر۔ اب جا کر ابا جان کی نظروں میں ذلیل ہونا نہیں چاہتی
[illegible] پہلے ہی نہیں آتی۔

حیدر۔ (اپنی دھن میں) تو سنا کی ایک لوہار کی "آخر
کب تک سنار کی چلتی رہے گی۔ لوہار کو بھی گھن لگانی
ہو گی۔ ضرور لگانی ہو گی۔ صرف ایک گھن بالکل ایک۔
سب کسر نکل جائے گی سارا افلاس دور ہو جائے گا۔
پھر ایک بار ہم ابا جان کو منہ دکھلانے کے لائق ہو جائیں گے۔

[illegible]

[illegible]

جان دیدی۔ (لڑکھڑا کر گرنے کی آواز) بیٹی!

تنویر۔ چراغ جلائیے ابا جان۔ اندھیرا ہو گیا۔ کچھ دکھائی نہیں۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ (آواز بتدریج کم ہو جاتی ہے)

تراب۔ بیٹی ـــ دولہن بیٹی (دیا سلائی جلانے کی آواز) تنویر بیٹی کیا ہو گیا تجھے۔ او خدا تیرا چہرہ کیوں سیاہ پڑ گیا۔ یہ کیا کیا۔ زہر پی لیا تو نے؟؟ بیٹی ـــ بیٹی۔ اب میں کس کے سہارے جیوں گا؟ کون ہے میرا؟

تنویر۔ (رکتے ہوئے) ابا جان۔

تراب۔ حیدر نے موٹر کے نیچے آکر خودکشی کر لی۔ تو نے زہر پی لیا۔

تنویر۔ حیدر نے خودکشی کر لی؟ وہ بھی چلے گئے۔ اب مجھے تنہائی کا ڈر نہیں۔ موت کو خوشی سے قبول کروں گی۔

تراب۔ (روتے ہوئے) بیٹی میں تباہ ہو گیا۔ میری دنیا تاریک ہو گئی۔ سٹہ بازی نے بڑھاپے کا سہارا چھین لیا۔ میں کہیں کا نہ رہا۔ میرا بچہ۔ میرا خون۔ میری تمنا۔ میری زندگی (رونے کی آواز سن کر) آپ روتے ہیں؟ اب ہو کر روتے ہیں؟ حیدر ہمیشہ ہارتے رہے کبھی افسوس تک نہ کیا۔ ہمیشہ سو سنار کی ایک لوہار کی فکر کرتے رہے۔ مجھے دیکھئے سٹہ بازوں نے ہوس کی بازی لگائی تھی مجھ سے میں نے زندگی دیکر ایک آبرو کو بچایا۔ میں زندگی کو کبھی نہیں روتی کیونکہ میں جیت گئی دنیا ہار گئی۔ لیکن نہیں آپ ہار کر رونے لگے۔ ایک ہی بازی میں سب کھو دیا!

تراب۔ بازی۔ میں نے کب بازی لگائی تھی کب کھیلا تھا سٹہ میں نے؟ بیٹی!

تنویر۔ بھول گئے۔ آپ نے بہت بڑی بازی لگائی تھی جس اولاد کا ذمہ دار باپ رہبری چھوڑ دے اس کی خدا بھی رہنمائی نہیں کرتا۔ حیدر کو گمراہ چھوڑ کر آپ نے راہ راست کی امید کی تھی۔ کیا یہ اچھائی اور برائی کے سٹہ میں اولاد کی بازی نہیں تھی۔ اولاد کی بازی! بہت بری بازی لگائی تھی آپ نے سب کچھ لگا دیا تھا۔ سب ہار بیٹھے۔ کچھ نہ رہا سب کھو گیا۔ کچھ نہ رہا کچھ نہ رہا۔

(آواز بتدریج کم ہو جاتی ہے)

تراب۔ بیٹی۔ بیٹی خاموش ہو گئی؟ چلی گئی؟ سچ سچ کچھ بھی تو نہ رہا۔ سب تباہ ہو گیا۔ سارا برباد ہو گیا۔ میں سٹہ باز ہوں؟۔ میں نے حیدر کی بازی لگائی تھی؟ نہیں نہیں جگر کا خون دے دے کر اس کی زندگی سنواری تھی چاند سی دولہن بیاہ لایا تھا۔ پھر ایسا کیوں میں نے ان کی بازی کیوں لگا دی؟ نہیں نہیں باہر کے ماحول کا باپ ذمہ دار نہیں۔ کوئی اور طاقت ہے کوئی اور اقتدار ہے لیکن میری بربادی مظلوم اپنی مظلوم آہیں۔ نامراد تمنائیں بے خبر اقتدار کا خاتمہ کر دیں گی۔ آسمان ٹوٹے گا۔ بجلیاں گریں گی۔ زلزلے آئیں گے دیکھو ہوشیار ہو جاؤ! مجبور ان انقلاب کی چنگاری کو سرخ بنا رہی ہیں۔ ایک دن سب بھسم ہو جائے گا۔ راکھ ہو جائے گا۔ بھسم ہو جائے گا بھسم ہو جائے گا۔ آہاہاہاہا کچھ بھی نہ رہا۔ سب مٹ چکا آہاہا سب مٹ گیا۔ آہاہاہاہا (ایک غمگین ساز ـــ) فیڈ آؤٹ!

تلاوت یداللہی

حضرت سید انوار اللہ شاہ بادشاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ ننگوی

خطۂ دکن ہمیشہ سے مردم خیز رہا ہے اور اس سرزمین نے ہر شعبۂ زندگی میں ایسے فرزند پیدا کئے ہیں جن پر مادرِ گیتی کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔ بالخصوص جب اسلام کے آفتاب جہانتاب نے اس سرزمین کو اپنی ضیا پاش شعاعوں سے بقعۂ نورانی بنایا تو اس کی خاک سے ایسے ایسے افراد اٹھے جن پر اسلام بجا طور پر نازاں ہے۔ ان ہی بزرگانِ دین میں وہ بزرگ بھی ہیں جن کا نام زیب عنوان ہے۔

حضرت سید انوار اللہ شاہ بادشاہ قادری اپنے زمانہ کے بڑے خدا رسیدہ بزرگ تھے آپ کی ذات گرامی سے صد ہا بندگانِ خدا نے راہ ہدایت پائی اور سینکڑوں گم کردہ راہ رستے پر لگ گئے۔ حضرت کا متاخرین صوفیا میں بڑا رتبہ ہے۔ آپ کے مریدین اور معتقدین اقطاع دکن میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بعض صاحبین نے اولیائے کرام کے حالات میں جو تذکرے لکھے ہیں ان میں زیادہ تر اظہار کرامات اور ذاتی عقیدت اور مداح گستری سے کام لیا ہے مگر زمانہ بدل چکا ہے، ذکر کرامات سے زیادہ موثر اور بہتر طریقہ [illegible] ان کے اخلاق [illegible] اور سادہ معاشرت کا تذکرہ ہے اور جن کی تقلید ابنائے جنس اور اخلاف کر سکتے ہیں۔

آپ کا وطن ننگہ ہے جو ضلع بیدر کا ایک مستقر تعلقہ ہے [illegible] بڑی تعداد میں آرام فرما ہیں۔ شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب [illegible] حضرت میران محی الدین سید عبد القادر جیلانی [illegible] قادری بغداد سے عہد بہمنیہ میں وارد ننگہ ہوئے تھے [illegible] حضرت سید السادات سید حضرت قادری عہد عادل شاہیہ میں پون لاکھ کے جاگیردار اور سلاطین عادل شاہیہ کے [illegible] تھے۔ علی عادل شاہ ثانی کے زمانہ تک ننگہ آپ کی جاگیر تھی۔ تفصیلی حالات روضۃ الاولیاء بیجاپور میں درج ہیں۔

آپ کے اجداد میں سے حضرت سید السادات سید عبد الرزاق تاج الدین [illegible] اور حضرت سید السادات ابو صالح نصر قادری بھی خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں قاضی القضاۃ ہوئے ہیں۔ آپ کے والد ماجد کا نام سید شاہ محی الدین بادشاہ عرف سید مظہر اللہ صاحب قادری ہے آپ علوم ظاہری میں فارغ التحصیل تھے ہمیشہ تعلیم ظاہری و باطنی میں مصروف رہتے تھے۔ تصوف کی مشہور کتابوں پر پورا عبور تھا۔

۹۔ ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ کو انتقال فرمایا۔ مزار اورنگ آباد میں ہے۔

سید انوار اللہ بادشاہ قادری ۱۲۴۳ھ میں پیدا ہوئے علوم ظاہری کی تحصیل اپنے والد ماجد سے فرمائی ۱۲۶۲ھ میں آپ کو خرقۂ خلافت عطا ہوا۔ ہمیشہ طالبان حق کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہتے تھے حضرت نے جو مقامات عالیہ سلوک میں طے فرمائے ان کی حقیقت اور شان ان کے کلام سے ظاہر ہے جس سے وہی بزرگ آگاہ ہو سکتے ہیں جو فہم و بصیرت کا نور رکھتے ہوں۔ ۱۳۰۹ھ میں اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔ مزار شریف ننگہ میں شاہراہ عام پر زیر آسمان ایک چبوترہ پر واقع ہے۔ ننھیالی سلسلہ اس طرح ہے۔ سید انوار اللہ شاہ قادری بن [illegible] بی بی زوجہ سید محی الدین قادری بنت بی صاحبہ بی بی بنت فاطمہ صاحبہ بی بی بنت سارہ صاحبہ بی بی زوجہ محمد آصف بنت سید السادات خلاصۂ اولاد محبوب سبحانی ہمشیرہ قدسیہ صاحبزادی قطب الاقطاب سید نور الدین نور الحق عرف پیر بادشاہ صاحب قادری قدس سرہ العزیز ننگوی

[illegible]

(۷) ہوشیار ہو تو کرے کیں داؤ نہ تجھ پر چڑے … بات میں دے یاد من تو مفت نہ کل کے کڑے
کیں کھیل میں ایسا نہ ہو تو نا نہ کیں دامن تر ہے … کی اگل سے آ پڑے دانڈو زمیں پر گر پڑے
بن کر اگل کہوت کیں دانڈو کو کہاویں کو رلے

گلی اوڑا بدکھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے … کرار بڑے اور کھڑ بڑے اور ماگلے اور مھور لے
(۸) گلی اگل پر دھر کے جب دیوے گا تو حسن دم کو بجا … رکھ شست سے دانڈو جمع اصول کے ٹھوکرے مار
جو نفس ہے تیرا بعزو کر اس کو تو قابو مار … چڑ اگل کے پاس تو گلی کو مت آنے دے آر
آکر کئی قابو سے چر چھپکے وہ گلی بدلا اور لے

گلی اوڑا بدکھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے … کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ماگلے اور مھور لے
(۹) چھپکے گا گلی پھیر کر کئی داؤ کر دھوکا تجھے … گر کر غفلت میں بہا دانڈو نظر کتیں جکا
پڑھ آ تنا یا ربنا وانصرنا آعوذ بک … جب یاد کی باتوں دہیں سر میں دغا کے دوانکا
کر ہوش کو در گوش تو غفلت کے در کو بھڑ لے

گلی اوڑا بدکھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے … کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ماگلے اور مھور لے
(۱۰) کر شرم کو مت ہے لپٹ گلی سمٹ وہ بے حیا … [illegible] گا لینے کو اگل لے کر طمع حرص و ہوا
بغض و حسد کینہ، کبر، غصہ، غضب، جور و جفا … جب تو بھی اپنے سنگ لے سانتے رضا علم و وفا
پھر ان سب کا تو سنگ صبر کے رکھوڑ لے

گلی اوڑا بدکھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے … کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ماگلے اور مھور لے
(۱۱) تجھ پر تکبر وہ اگر بھیجے غروری کتیں … تو عاجزی اور حلم کی حلقہ میں ہکا دے ہیں
لے غیر خطروں کے اگر آوے حمایت سے نہیں … جب بڑ کے تو ارفع بلا واللہ خیر الحافظین
رد کر دے ان سب کے تئیں تو ٹھیر جا یک ٹھوڑ لے

گلی اوڑا بدکھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے … کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ماگلے اور مھور لے
(۱۲) کر کرار ادہ آوے گر لینے اگل بھلو نہ جھل … تو لے شجاعت اور سخا دھکے دلا وہاں ڈھل
موذی یہیں ان کی نگت ان پانچ کو کر تو قتل … دے پاؤں میں پستی کے تو مستی کو ہستی کے کھول
آعوذ باللہ ورد کر پھر نفس کو کر زیر لے

گلی اوڑا بدکھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے … کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ماگلے اور مھور لے
(۱۳) یہ نفس کئی مکئی داؤ سے کر جالگا قابو بلا … ہوشیار ہو گلی نہ کیں ڈالے اگل کے بیچ لا
چھپکے اگر گلی سمٹ مٹی میں لے ہاٹی میں ملا … تو جب نظر گلی پر دھر دانڈو پکڑ کر بڑ بلا
اور لول جھٹ آگے رہیں تو ورلڑے اور جھوڑ لے

گلی اوڑا بدکھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے … کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ماگلے اور مھور لے
(۱۴) میدان اگل کا گھیر کر ڈانڈو کتیں تو خوب رول … شست بند کر تو ٹھیں دے گلی کو تو ماٹی سے ٹول
جس جا پہ گلی جا پڑے دانڈو سے گنتی کر کے بول … جھلے جمع سب جوڑ کر ہر سے بھڑ وے کے کان کھول

[illegible]

منقبت چینڈول

(۱) ہے دنیا [illegible] کی بازہ بیلی — کندو کی مولی ہوخاں کی بلی
عجب کھیل [illegible] ہے [illegible] چلی — دکھا اپنے [illegible] دل کی سب کو تجلی
[illegible] سب تیغ چلی
توجا کھیل اے دل کنیا کی گلی — سمٹ دم کا چینڈول اوڑا تن کی ہیلی

(۲) یہ دنیاں ہی پر [illegible] کھیل والی — بہت سوں کو [illegible] کاڑی بہوت سے نکالی
حریفوں کی بازی ہے [illegible] — کہے دیو [illegible] دیوے گا لی
دکھا اس کو [illegible]
توجا کھیل اے دل کنیا کی گلی — سمٹ دم کا چینڈول اوڑا تن کی ہیلی

(۳) ہے ...... [illegible] — کہ ہے [illegible] جس کا [illegible]
پڑے [illegible] عاشق ہوکے تن [illegible] — کہ اس کو دے [illegible] کرتی ہر [illegible]
[illegible]
توجا کھیل اے دل کنیا کی گلی — سمٹ دم کا چینڈول اوڑا تن کی ہیلی

(۴) ارے دل [illegible] مت کھیل مانڈو — طمع کی تو [illegible] جز [illegible]
تو اپنے ساتھی جو [illegible] پانڈو — اٹھا لے تو [illegible]
طمع کی آگ میں تو [illegible]
توجا کھیل اے دل کنیا کی گلی — سمٹ دم کا چینڈول اوڑا تن کی ہیلی

(۵) ارے دل یہ سن بات رکھ یاد پھر تو — تو کھیل [illegible] سے تو
یہ دنیا کی [illegible] لالچ نہ لے تو — اگرچہ وہ آوے تو [illegible] تو
اگر [illegible] آوے تو توڑ اس کی [illegible]
توجا کھیل اے دل کنیا کی گلی — سمٹ دم کا چینڈول اوڑا تن کی ہیلی

(۶) ہے دنیا بہوت [illegible] سے [illegible] — [illegible] نے بہو توں کی پگڑیاں اوتاری
ارے دل یہ دنیا سے مت رکھ تو یاری — [illegible] حلق میں [illegible]
[illegible] سکے تیل [illegible]
توجا کھیل اے دل کنیا کی گلی — سمٹ دم کا چینڈول اوڑا تن کی ہیلی

(۷) [illegible] ہے [illegible] کھاڑی — [illegible] سے [illegible]
[illegible] میری [illegible] — پھر [illegible] تو [illegible]
[illegible] چھاپ چمک [illegible]
توجا کھیل اے دل کنیا کی گلی — سمٹ دم کا چینڈول اوڑا تن کی ہیلی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

زندگی

(منشی پریم چند کا لکھا ہوا)

ہندو فلسفہ میں قنوطیت کی جھلکیاں ہیں۔ بدھ مذہب میں بھی اس کے کچھ نہیں، اور عیسائی مذہب کا بھی یہی حال ہے۔ انسان ابتدا ہی سے سکھ کی کھوج میں رہا ہے۔ اور یہی اصول اس کی زندگی کا خاص مقصد رہا ہے۔ لیکن وہ اتنا گھبراتا ہے کہ اس زندگی ہی میں نہیں بلکہ آنے والی زندگی کے لئے بھی ایسا انتظام کرنا چاہتا ہے کہ وہاں بھی وہ سکھ چین کا تصور کرے۔ جنت اور سورگ، نجات اور نروان سب اسی آرزو کی پیداوار ہیں۔ سکھ کے حاصل کرنے کے لئے ہم نے زندگی کو ڈھلتی پھرتی چھاؤں اور دنیا کو فانی کہہ کر اپنے دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب زندگی کو ثبات ہی نہیں اور دنیا فانی ہے تو پھر کیوں نہ اس سے منہ موڑ کر بیٹھیں؟ مگر ہم نے اب تک اس پر غور ہی نہیں کیا کہ ہم کیوں مغموم ہوتے ہیں؟ وہ کونسی ذہنیت ہے جو ہمیں غم کی جانب لیجاتی ہے؟ آج ہم اس سوال پر غور کریں گے اور دیکھیں گے کہ اس اندھیارے میں کہیں اجالا بھی نظر آ سکتا ہے یا نہیں۔

دکھ کے دو بڑے اسباب ہیں۔ ایک تو وہ سخت قدیم قوانین ہیں جن میں ہم نے اپنے کو اور سماج کو جکڑ رکھا ہے، دوسرے وہ شخصی الجھنیں ہیں جو ہمارے دل کو الجھائے رکھتی ہے، اور اس میں باہر کی ہوا اور روشنی کو جانے نہیں دیتیں۔ ان قدیم بندشوں سے تو ہم اس وقت بحث کرنا نہیں چاہتے کیونکہ ان کی اصلاح ہمارے بس کی بات نہیں، کیونکہ ان کا دارومدار تو اس پورے نظام پر ہے۔ البتہ شخصی الجھنیں ہمارے بس کی بات ہیں اور ہم اپنا خیال یہیں تک محدود رکھیں گے۔

اکثر ایسے لوگ بہت کبیدہ خاطر دکھائی دیتے ہیں جو بے اعتدالی کے باعث اپنی صحت کھو بیٹھتے ہیں یا جن کے پاس مال و دولت کی کمی ہے۔ لیکن درحقیقت دیکھا جائے تو مسرت کے لئے نہ دولت کی ضرورت ہے نہ صحت کی۔ کئی متمول دکھی ہیں اور کئی بیمار خوش ہیں۔ سکھی جیون کے لئے دل کا صحت مند ہونا نہایت ضروری ہے مگر اس کے لئے بیمار نہ ہونے والا جسم بھی لازمی ہے۔ سب ہی تو رشی نہیں ہوتے جو اتنا اور صحت مند جسم اور دل میں علت و معلول کی نسبت ہوتی ہے گر ایک معمولی انسان عقل سے کام لے اور صحت مند زندگی کی طرف سے آنکھیں نہ بند کرے تو وہ اپنے جسم کو امراض سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ جسم ایک مشین ہے۔ اسے جس طرح کوئلہ پانی کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اس سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم اس مشین سے کام نہ لیں تو بہت تھوڑے دنوں میں اس کے پرزوں میں زنگ لگ جائے گا۔ مزدوروں کے لئے تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ ان لوگوں کے لئے جو گدی یا کرسی پر بیٹھ کر کام کرتے ہیں کسی نہ کسی ورزش کی سخت ضرورت ہے۔ کرکٹ اور ٹینس کے لئے ہمارے پاس اسباب نہیں نہ ہوں تو کیا ہم اپنے گھر میں سو پچاس ڈنڈ بیٹھک بھی نہیں لگا سکتے اگر ہم اپنی صحت کے لئے ایک گھنٹہ بھی نہیں دے سکتے تو اس کا یہ صاف مطلب ہے کہ ہم سکھ کو ٹھوکروں سے مار کر اسے اپنے ہی دروازے سے بھگا دیتے ہیں۔

کھانے کا سوال بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ کونسی چیز کس طرح اور کتنی کھائی جائے؟ اس بارے میں بیوقوفوں سے زیادہ عقلمند غلطیاں کرتے ہیں۔ اکثر ایسے ملیں گے جو اس معاملے میں بالکل کورے ہیں۔ زندگی کا سب سے بڑا کام ہے کھانا، اسی پر تو دنیا کا سارا چکر چلتا ہے اور اسی کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ بچوں کا پہلا سبق پیسے اور بڑوں کا کھانے سے شروع ہوتا ہے۔ یہ بات کتنی مضحکہ خیز ہے اور ہم اس سے بے خبر ہیں کہ ہماری صحیح نشوونما اور ترقی کا راز کھانے ہی میں ہے۔

رنج کا بڑا سبب ہے اپنے آپ میں غرق رہنا۔ ہمیشہ اپنے ہی بارے میں سوچتے رہنا۔ ہم یوں کرتے تو یوں ہوتے۔ وکالت پاس کر کے مٹی خراب کی۔ اس سے کہیں اچھا ہوتا کہ نوکری کرلی ہوتی۔ اگر نوکر ہیں تو یہ افسوس ہے کہ وکالت کیوں نہ کرلی۔

لڑکے نہیں ہیں تو یہ فکر مارے ڈالتی ہے کہ لڑکے کب ہوں گے۔ لڑکے ہیں تو رو رہے ہیں کہ یہ کیوں ہیں، یہ بچے کچے نہ ہوتے تو کتنے آرام سے زندگی کٹتی۔ کئی ایسے ہیں جو اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن نہیں ہیں، کوئی ماں باپ کو کوستا ہے جنھوں نے ان کے گلے میں زبردستی جوا ڈال دیا۔ کوئی ماموں یا پھوپا کو جنھوں نے یہ رشتہ جوڑا تھا۔ اب ان کی صورت بھی انھیں پسند نہیں۔ بیوی سے آئے دن ٹھنی رہتی ہے۔ وہ سلیقہ نہیں رکھتی، میلی رہتی ہے، پھوہڑ ہے، مردہ ہے، نحوسی ہے جب دیکھو منہ لٹکائے بیٹھی رہتی ہے۔ یہ نہیں کہ شوہر صاحب دن بھر کے بعد گھر میں آئیں تو ایک زبان کے گلے سے لپٹ جائے۔ اس گروہ میں زیادہ تر نئے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ہے۔ یہ دوسروں کی بیویوں کو دیکھ کر اپنی قسمت کو رو تے پیٹتے رہتے ہیں۔ وہ کیسی سلیقہ مند ہے، کتنی سمجھ، کتنی خیال رکھنے والی۔ دن رات بیچارے اسی خیال میں جلا کرتے ہیں۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو چاہتے ہیں کہ ساری دنیا ان کی تعریف کرتی رہے۔ خود جب موقع پاتے ہیں اپنی تعریف شروع کر دیتے ہیں وہ خود کسی کی تعریف نہیں کرتے۔ کسی سے محبت نہیں رکھتے لیکن آرزو ہے کہ دنیا ان کے آگے سر تسلیم خم کرکے کھڑی رہے، ان کے گن گائے۔ وہ اس فکر میں گھلے جاتے ہیں کہ دنیا ان کی قدر نہیں کرتی۔ اس کے باعث ان کے کردار میں حسد آجاتا ہے اور ایسے لوگ تو گھر گھر ملیں گے جو تنا نوے کے پھیر میں پڑکر زندگی کو مستقل عذاب بنا لیتے ہیں۔ فکر ——— فکر۔ اس میں ان کی زندگی ہے۔ ایسے آدمی صرف انھیں سے خوش ہوتے ہیں جو ان کی فکر اور ان کے مقاصد میں مدد ہوں۔ اور کسی سے انھیں سروکار نہیں ہوتا۔ ان کے پاس بیوی سے گفتگو کرنے کو وقت نہیں۔ بچوں کو پیار کرنے کی انھیں بالکل فرصت نہیں۔ گھر میں کسی سے ایک پائی کا نقصان ہو جائے تو گھر سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ بیوی نے اگر ایک آنے کے بجائے سات پیسے کی ترکاری منگوالی تو خانہ مذکورات بھر جھینکنے کا مسالہ مل گیا۔ تم گھر لٹا دو گی۔

تمھیں کیا خبر پیسے کیسے آتے ہیں؟ آج مر جاؤں تو بھیک بھی مانگو۔ پھرو ایسی دل جلانے والی باتیں کرکے آپ روتے ہیں اور دوسروں کو رلاتے ہیں۔ لڑکے سے کوئی چیز ٹوٹ پھوٹ گئی تو کچھ نہ پوچھو۔ بیچارے معصوم و بے قصور بچے کی شامت آگئی۔ مارتے مارتے اس کی کھال ادھیڑ ڈالی ——— مانا کہ اس نے نقصان کیا۔ تم غریب ہو اور تمھارے لئے دو چار آنے کا نقصان بھی بہت ہے۔ لیکن لڑکے کو مار پیٹ کر تم نے کیا پایا؟ چیز تو جڑ نہیں گئی؟ ہاں محبت کا بندھن ضرور ڈھیلا ہو گیا۔ یہ سب اپنے آپ میں ڈوبے رہنے والوں کا حال ہے۔ اس کی دوا صرف یہی ہے کہ اپنے بارے میں اتنی فکر نہ کریں، دوسروں میں دلچسپی لینا سیکھیں۔ سیر، باغ، پالنا، پھول بوٹے لگانا، گانا بجانا، گپ شپ کرنا، کسی تحریک میں حصہ لینا۔ غرض دل کو اپنی جانب سے ہٹا کر باہر کی طرف لیجانا ایسی طبیعت والوں کے لئے سکھ کا باعث ہو سکتا ہے۔

اداس طبیعت والے بھی اکثر مغموم رہتے ہیں، دنیا میں ان کے لئے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ مرض زیادہ تر ادھیڑ عمر والوں کو ہوتا ہے۔ انھوں نے دنیا کے فلسفہ کو جانا بوجھا ہے اور اب زندگی میں انھیں ایسی کوئی شے نہیں ملتی جس کے لئے وہ زندہ رہیں۔ دنیا تحت الثریٰ کی طرف جا رہی ہے، لوگوں سے محبت اٹھ گئی، ہمدردی کا کہیں نام نہیں۔ ادب کی کشتی ڈوب گئی جس سے محبت کرو وہ بے وفائی کرتا ہے۔ دنیا میں کس پہ اعتماد کیا جائے؟ یہ چیز تو اب دنیا سے اٹھ گئی۔ اب لکشمن کے بھائی اور ہنومان جیسے خدمت گزار کہاں؟ یہ اداسی انھیں لوگوں میں ہوتی ہے جو گھر کے اچھے ہیں۔ جنھیں زندگی کے لئے کوئی کام کرنا نہیں ہوتا۔ مزے سے کھاتے اور سوتے ہیں۔ وہ دنیا میں صرف رونے کے لئے آئے ہیں۔ ان کی ذات سے کسی پر احسان کی توقع نہیں۔ ہر ایک چیز میں عیب نکالنا، ہر ایک چیز سے مطمئن نہ ہونا، بس یہی ان کا کام ہے۔ ایسے لوگوں کا علاج یہی ہے کہ فوراً کسی کام میں لگ جائیں اور کچھ نہ ہو سکے تو تاش ہی کھیلنا شروع کر دیں، کوئی بھی کام ہو رونے سے

اچھا ہے۔

دنیا کب تنزلی کی طرف نہیں جا رہی تھی؟ جب کوروؤں نے دروپدی کو بھری محفل میں عریاں کر دینا چاہا اور پانڈو بیٹھے دیکھتے رہے۔ کیا دنیا اس وقت زوال کی طرف نہیں جا رہی تھی؟ کس زمانہ میں بھائی نے بھائی کا گلا نہیں کاٹا؟ دوستوں نے کب دوستوں کا گلا نہیں گھونٹا؟ عیاشی کب نہیں ہوئی؟ شراب کے دور کب نہیں چلے؟ لڑائیاں کب نہیں ہوئیں؟ دنیا آج بھی وہی ہے جہاں دس ہزار برس پہلے تھی۔ نہ ترقی کی طرف گئی اور نہ اسے زوال ہوا۔ اور اسی طرح آخر تک رہے گی۔ اضطراب زندگی کا راز ہے۔ خاموش دل میں ہمیشہ اضطراب کی موجیں اٹھتی رہتی ہیں۔ دنیا میں جو کچھ ترقی ہو رہی ہے یا ہوئی ہے اس میں اسی مطمئن نہ ہونے کے احساس کا بڑا ہاتھ ہے۔ لیکن اس اضطراب کو حرکیاتی Dynamic قسم کا ہونا چاہیے جو نت نئی راہیں پیدا کرے اور نئے مقاصد معلوم کرتا ہے جو ادب اور آرٹ کی تخلیق کرتا رہے ——

دنیا اگر فانی ہے تو آپ کو اس کی کیوں فکر؟ یقین مانئے آپکی زندگی میں سکون ہوگا۔ اور اگر سکون ہو جائے تو آپ کے فکر کرنے کی چنداں ضرورت؟ جو سب کی حالت ہوگی وہی آپ کی بھی ہوگی گھر سے باہر نکل کر دیکھیے میدان میں کتنی دلکش ہریالی ہے درختوں پر پرند کیسی خوش الحانی کے ساتھ گا رہے ہیں ندی میں چاند کیسا تھرک رہا ہے۔ کیا ان مناظر سے آپ کو ذرا بھی خوشی نہیں ہوتی؟ کسی جھونپڑی میں جا کر دیکھیے ماں فاقے کر رہی ہے مگر کتنی محبت سے بچے کو اپنی دکھی چھاتی سے چمٹائے ہوئے ہے۔ بیوی اپنے بیمار شوہر کے سرہانے بیٹھی موتی برسا رہی ہے اور خدا سے یہ التجا کر رہی ہے کہ شوہر کے بجائے وہ خود بیمار ہو جائے —— یقین کیجیے آپ خدمت، ایثار، یقین کے ایسے ایسے مناظر دیکھیں گے کہ آپ کی آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔ ہو سکے تو ان کی کچھ مدد کیجیے۔ محبت کرنا سیکھیے اس دکھ کا، ان انسانی مصیبتوں کا علاج بھی ہے۔ آج کل دکھ کی ایک نئی ٹکسال کھل گئی ہے اور وہ ہے زندگی کی جنگ۔ جدل حیات جدھر دیکھیے یہی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس جنگ میں کسی سے ہمدردی کی، رحم کی امید نہیں کر سکتے۔ سب ہی اپنے اپنے ناخن اور دانت نکالے شکار کی تاک میں بیٹھے ہیں۔ ان کی بھوک بحر الکاہل سے بھی زیادہ گہری ہے۔ کسی طرح سیر نہیں ہوتی۔ کاش یہ دن چوبیس گھنٹوں کے بجائے اڑتالیس گھنٹوں کا ہو جاتا۔ ادھر سورج نکلا اور ادھر مشین چلی۔ پھر وہ دو بجے رات سے پہلے نہیں بند ہو سکتی۔ ایک منٹ کے لئے بھی نہیں۔ ناشتہ کھڑے کھڑے کیجیے۔ کھانا دوڑتے دوڑتے کھائیے۔ دوسروں سے ملنے کے لئے وقت نہیں۔ نا تو باتیں سننے کی فرصت نہیں۔ مطلب کی بات کیجیے صاحب [illegible]۔ وقت کا ایک ایک منٹ اشرفی ہے۔ موتی ہے۔ اسے فضول نہیں کھو سکتے۔ اس جنگ کی ذہنیت مغرب سے آئی ہے اور بڑے زور سے ہندوستان میں پھیل رہی ہے۔ بڑے بڑے شہروں پر تو اس کا قبضہ ہو چکا اب چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی اس کی عملداری ہوتی جا رہی ہے۔ مندی تیزی، بازار کے چڑھاؤ اتار، محصول کا گھٹنا بڑھنا یہی زندگی ہے۔ یہ خواب میں بھی تیزی مندی کا خواب دیکھتے ہیں۔ کتابیں پڑھنے کی کسے فرصت! سینما دیکھ لیں گے۔ ناول کون پڑھے چھوٹی چھوٹی کہانیوں سے دل بہلا لیتے ہیں؟ لیکن یہ خبط بھی ہے کہ ہم کسی میدان میں بھی پیچھے کسی سے نہ رہیں۔ ادب، آرٹ، سیاست ہر موضوع پر نئی سے نئی باتیں بھی ہم سے نہ چھپنے پائیں۔ ہمہ دانی اور ہمہ خوانی کی نمائش کے لئے نئی سے نئی کتابیں میز پر ہونی ہی چاہئیں۔ کسی طرح ان کا خلاصہ مل جائے تو کیا کہنا۔ دس منٹ میں کتاب کا لب لباب معلوم ہو جائے۔ تبصرہ پڑھ کر بھی تو کام چل سکتا ہے۔ اسی لئے لوگ تبصرے بڑے شوق سے پڑھنے لگے ہیں۔ اب ہم ان کتابوں پر اپنی رائے دینے کا حق رکھتے ہیں۔ مہذب محفل میں ہمیں کوئی بیوقوف نہیں کہہ سکتا۔ اس بھاگ دوڑ کی زندگی میں مسرت کہاں نصیب ہو سکتی ہے؟ زندگی میں سکون و اطمینان یقیناً زندگی کے بڑے جزو ہیں۔ مگر ہمیں اس تیز گھوڑے کو اپنی رانوں کے نیچے رکھنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ

وہیں جدھر جا رہا ہے لئے دوڑتا پھرے ، زندگی کو جنگ سمجھنا یہ سمجھنا کہ یہ صرف پہلوانوں کا اکھاڑہ ہے اور ہم صرف اپنے ہی مقابل کو پچھاڑنے کے لئے دنیا میں آئے ہیں ، ایک طرح کا فریب ہے ۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہماری آرزو طاقتور ہو جاتی ہے لیکن سکون تباہ ہو جاتا ہے ۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ہم سکون و اطمینان کی قیمت سمجھیں ۔ زندگی کی خوشی کھو کر جو اطمینان لے وہ لیا ہی ہے جیسے اندھی آنکھوں کے سامنے کوئی تماشا ۔ سکون کی غایت ہے مسرت ۔ اگر کامیابی سے دکھ بڑھے اضطراب بڑھے تو وہ حقیقی مسرت نہیں ۔

مستقبل کی فکر دکھ کا سبب ہی نہیں بلکہ علت غائی ہے کل کہیں چل بسیں تو کیا ہوگا گھر کا کچھ انتظام نہ کر سکے ۔ مکان نہ بنوا سکے ۔ پوتے کا بیاہ بھی نہ ہو سکا ۔ اور ہم نے آنکھیں بند کیں اور ادھر ساری گرہستی تین تیرہ ہوئی ۔ لڑکا آزاد ہے پیسہ کی قدر نہیں کرتا نہ زمانہ کا رخ دیکھتا ہے ، اسی فکر سے اکثر رات کو نیند نہیں آتی جس کی وجہ سے صحت پر برا اثر پڑتا ہے ایسی ذہنیت نئی نئی فکروں کے پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہے ۔ دو چار دن کھانسی ہوئی تو فوراً تپ دق کا شک ہو گیا دو چار روز ہلکا سا بخار آ گیا تو ٹائیفائڈ کا شبہ ہونے لگا ۔ اگر جوانی میں آنکھیں بہک گئی تھیں تو اب گناہ کا احساس دل کو دبائے جا رہا ہے ، یہی فکر دامن گیر ہے کہ اس گناہ کا بدلہ کیا آفت لائے ؟ لڑکا بیمار ہو گیا اور منت مرادیں ہونے لگیں ۔ بس اسی کی سزا ہے ۔ کسی بڑے مقدمہ میں ہارے اور وہی خیال سر پر سوار کہ یہ سب اسی کا پھل ہے ۔ اتنا بوجھ رکھ کر زندگی کیسے بیتے گی ۔ دوزخ کا ہیبت ناک تصور کھانا پینا حرام کر دیتا ہے ۔ اس کا علاج یہی ہے کہ آدمی ٹھنڈے دل سے ہر ایک موضوع پر غور کرے یہاں تک کہ اس پر اس کے سارے پہلو روشن ہو جائیں ، تم کیوں سمجھتے ہو کہ تمھارے لڑکے تم سے زیادہ نالائق ہوں گے ؟ اسی طرح تمھارے باپ نے بھی تو تمھیں نالائق سمجھا تھا ۔ مگر تم تو لائق ہو گئے اور آج گرہستی کی دیکھ بھال مزے سے کر رہے ہو ، تمھارے بعد تمھارا لڑکا بھی اسی طرح گھر سنبھال لے گا ۔ ممکن ہے تم سے زیادہ عقلمند نکلے

اور گناہ کو تو ایک ڈھکوسلا بنا دیا گیا ہے [illegible] حساب سے تو کوئی شرابی نہیں ہم نے پانی پی تو گناہ کے مرتکب ہوئے ۔ کیوں گناہ کیا ؟ کروڑوں آدمی روز پیتے ہیں [illegible] اسے گناہ نہیں سمجھتے ۔ بلکہ ان کی نگاہ میں جو شراب نہیں پیتے وہی پاپی ہے ۔ ہمارے کل میں گوشت کھانا پاپ ہے ۔ ہم نے کھایا تو کوئی پاپ نہیں کیا ۔ ساری دنیا کھاتی ہے پھر ہمارے لئے گوشت کھانا کیوں پاپ ہے ؟

گناہ وہی ہے جس میں اپنا یا دوسروں کا نقصان ہوتا ہے اگر شراب پینے سے تمھارے سر میں درد ہونے لگتا ہے ، تم بہک کر گالیاں بکنے لگتے ہو تو بے شک شراب تمھارے لئے گناہ ہے ۔ اگر تم شراب کے لئے اپنے بچوں کو کھانے پینے کی تکلیف دیتے ہو تو وہ بے شک گناہ ہے ۔ اور اسے فوراً چھوڑ دو ۔ اسی طرح اگر گوشت کھانے سے تمھارے پیٹ میں درد ہونے لگے تو وہ تمھارے لئے جائز نہیں ۔ گوشت ہی کیوں ، دودھ پینے سے تمھارا ہاضمہ بگڑ جائے تو دودھ بھی تمھارے لئے جائز نہیں ۔ مذہبیت و لامذہبیت کے جھگڑوں میں پڑ کر خدا کے متعلق بحثیں کر کے کیوں خود کو دکھی کرتے ہو ؟ ہاں ممکن ہے اس قسم کی غلامی اگر تمھارا اس قسم کے لوگوں میں کچھ رسوخ بڑھا دے ۔ لیکن یہ ہے بیوقوفی تم خود سوچو کہ حقیقت میں برا کام کون سا ہے ۔ اپنے کاروبار میں اوچھاپن ، نوکروں سے خراب برتاؤ ، بچوں پر ظلم اور سختیاں ، اپنے ساتھیوں سے رشک بغض و حسد ، دوسروں پر اتہام ، بری نیت ، دغا ، فریب یہ سب حقیقت میں برے جذبے اور برے کام ہیں جن کی قانون میں بھی سزا نہیں ۔ لیکن جس کے باعث انسانی سماج تباہ ہو رہا ہے ۔ دل میں گناہ کے تصور کا بیٹھ جانا ہماری خودی کو مٹا دیتا ہے ۔ اور جب خودی کو ٹھیس پہنچے تو سمجھو بہت کچھ چلا گیا ۔ پاپی سدا بغض و حسد سے جلا کرتا ہے ۔ ہمیشہ دوسروں کے عیب دیکھا کرتا ہے ۔ سدا مذہب کا ڈھونگ رچا کرتا ہے ۔ جب تک وہ دوسروں کے گناہ کا پردہ نہ کھول دے اور اپنے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

وقت کا نقاش

ہو نہ جائے زندگی مایوس لمحوں کا شکار
مضمحل افکار ہیں ماحول یاس انگیز ہے
مشتعل جذبات میں جوشِ قیامت خیز ہے
حادثاتِ زندگی سے آرزوئیں پاش پاش
زندگی تو ہیں، ذوقِ زندگی ہے دل خراش
کچھ نہیں ہے عظمتوں کے قافلے کا اعتبار
انتہائے مرگ ہے گل کو تبسم کا قمار
چاند کی کرنیں بھی ہیں تاریکیوں سے ہمکنار
زندگی کا خواب اک خوابِ فسوں انگیز ہے
وقت کا نقاش ہے ہنگامہ گر افسوں تراش

نور کے تڑکے چمن کیا جلوہ در آغوش تھا
ڈالیاں گلزار کی گویا سراپا نور تھیں
مستیاں تھیں، نکہتیں تھیں، زندگی نغمہ جوش تھا
کیف میں ڈوبی ہوئی تھیں قہقہوں میں چور تھیں
اک طرف یہ رنگِ محفل پھول تھے نکھرے ہوئے
دوسری جانب، ادھر پہ کیف ہنگاموں سے دور
زندگی کا منظر غمناک وحشت کوش تھا
عشق ہیجاں کے فریب ان زرد رو آہوں کے دور
ایک ننھی سی کلی تھیں جس کی آشا میں جواں
موت کے آغوش میں کچھ پتیوں کے درمیاں
اور اس مرقد پہ آنسو جا بجا بکھرے ہوئے

زندگی کے میکدے پہ ابر پاروں کا خرام
چھوڑ، پی لینے دے پی لینے دے جرعاتِ شباب
مستیوں کے آبشاروں پہ بہاروں کا خرام
جھیل کی موجیں درخشندہ ستاروں کا خرام
یہ حسیں لمحات آنے کے نہیں پھر بار بار

میرے ہونٹوں پر ترے بوسوں کی [illegible]
ہاں، ہو سکتی ہے تشنہ کام [illegible]
بخش سکتی ہے دلوں کو خندۂ [illegible] بہار
روح کو بالیدگی اور زندگی کو برگ و بار
مضطرب سینے میں اک جذبات کا طوفان ہے
دل میں ارماں اور ارمانوں میں اک ہیجان ہے
سر ترے سینے پہ ہو مدہوش سا کھویا رہوں
اس طرح سوؤں ہمیشہ کے لئے سویا رہوں

چھوڑ، پی لینے دے، پی لینے دے جرعاتِ شباب
یہ شبابِ چند روزہ اور کیف آور شراب
ہاں میسر ہو نہیں سکتے ہیں پھر بار بار
ایک دن ہو جائیں گے مایوس لمحوں کے شکار
مضمحل افکار ہیں ماحول یاس انگیز ہے
حادثاتِ زندگی سے آرزوئیں پاش پاش
زندگی کا خواب اک خوابِ فسوں انگیز ہے
وقت کا نقاش ہے ہنگامہ گر افسوں تراش

افسر آذری

پکنک

برسات کا دل فریب موسم، رات بھر برس کر بارش تھم چکی تھی۔ آسمان پر چھایا ہوا ابر غائب ہو چکا تھا اور ہلکی سی دھوپ دھندلے بازاروں کو روشن کر رہی تھی۔ ایسے میں ناہید باجی نے پھولوں کو گلدان میں رکھتے ہوئے پوچھا — "اب کا اتوار کہاں گزارا جائے؟"

ننھے بھیا جھٹ بول اٹھے "قطب!"

ہم نے منہ چڑا دیا۔ "قطب، بڑے آئے قطب کے۔ دھرا ہی کیا ہے وہاں — ایک ادھوری مسجد۔ چند ٹوٹی پھوٹی قبریں — ایک اجڑا سا باغ —"

ابا جی ہنستے ہوئے بولے "سچ تو کہتی ہے ننھی۔ گزشتہ اتوار قطب ہی میں تو گزرا۔ کوئی نئی جگہ بتاؤ —"

ناہید باجی نے ہمیں اشارے سے رات والی بات یاد دلائی۔ میں جلدی سے بول اٹھی۔ "اچھے ابا جی اوکھلا چلئے اب کے —" بھیا نے منہ بنایا — امی واہیات کہہ کر خاموش ہو گئیں اور ابا جی کچھ سوچنے سے لگے۔ کچھ دیر بعد بولے۔ "اچھا اس دفعہ اوکھلا سہی۔ یہ کوئی خاص جگہ نہیں —"

"واہ اس دن سنا نہیں نازو کتنی تعریف کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی دلی میں رہ کر جس نے اوکھلا کی سیر نہ کی اس نے سیر کا لطف اٹھایا ہی نہیں۔" ہم نے ابا جی کی گھڑی کی زنجیر سے کھیلتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو اتوار کب ہے؟" ابا جی نے پوچھا۔

"پرسوں —" سعید باجی نے پہلی دفعہ ہماری باتوں میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ یہ سعید باجی ہماری بس کچھ یوں ہی سی ہیں۔ فلسفہ سے بڑی دلچسپی ہے انھیں۔ لیکن پڑھتی نہیں۔ بس یوں ہی بغیر پڑھے لکھے چاہتی ہیں کہ ایک دم سے فلسفی بن جائیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے ان کی۔ بغیر جانے بوجھے کوئی ڈاکٹر بن جائے، کوئی فلسفی بن جائے اور جانے کیا کیا کچھ بن جائے۔ گزشتہ اتوار جب ہم قطب گئے تھے تو اس وقت ابا جی اور امی تو جانے کیا کہہ کر ہنس رہے تھے اور ہم تینوں بھیا بہن اور ناہید باجی قطب کی سیڑھیاں ہر بار اپنی بے پناہ باتوں اور ہنسی میں بھول کر پھر سے ٹھیک گننے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے تو ہماری سعید باجی، ابا اور امی سے کچھ دور ایک ننھی سی جھاڑی کے نیچے بیٹھی ہیں تو کچھ اونگھتی سی لگیں۔ جانے کیا کیا سوچ رہی تھیں۔ جب میں نے قریب آکر انھیں گدگدایا تو وہ یوں چونک سی گئیں جیسے ان کے سنہرے سپنے کے تار بکھر اٹھے ہوں —!

ہاں تو میں کہاں بہک گئی — کہہ رہی تھی اوکھلا کی بات اور پہنچ گئی قطب۔ تو ہفتے کے دن میں نے اور ناہید باجی نے کل ساتھ لے جانے والے سامان اور مختلف کھانوں کی فہرست تیار کی۔ کچھ سامان خود درست کیا اور باقی شرفو نے کر لیا۔ کھانوں کی فہرست باورچی کو دے دی اور چپکے سے کہہ دیا میٹھی چیزیں زیادہ تیار کرے اور پھر رضیہ اور فرحت کو نوکر بھیج کر بلا لیا اور پھر باتوں میں دن گزر گیا جیسے کبھی آیا ہی نہ ہو — رات بھر اوکھلا کے خواب دیکھتے رہے۔

صبح ابھی چڑیوں کی چوں چوں بند نہ ہوئی تھی کہ ہارن کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ کھڑکی میں سے جھانکا کچھ نظر نہ آیا۔ ہر چیز دھند کے پردوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ جلدی سے بستر بھولا پر سے اتری۔ ابا جی اٹھ چکے تھے۔ موٹر گیٹ کے اندر آ گئی تھی میں قریب گئی — ۱۰۹۱ — ابا جی کے دوست اور

ان کی بیوی - اور ارے یہ ہماری شمسی ـــ "ٹھیک موقع پر آئی بھئی - چل اوپر - یہاں تو ٹھنڈی ہوا سے جان نکل رہی ہے" اور ہم دونوں اوپر بھاگے۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے شمسی نے بتایا کل اباجی نے ٹیلی فون پر کہا کہ ہم سب صبح سات بجے تک اوکھلا جارہے ہیں شام تک واپس آجائیں گے تم لوگ ضرور آنا۔ رضیہ اور ناہید باجی تو جاگ اٹھی تھیں گر نیند کی ماتی فرحت سورہی تھی - شرارت جو سوجھی تو ایک گلاس بھر ٹھنڈا پانی اس کی گردن اور منہ پر الٹ دیا۔ معصوم گھبرا کر اٹھ ہی تو بیٹھی - وہ کانپ رہی تھی - جانے اس ٹھنڈے پانی کے اثر سے یا پھر خواب میں کسی بھیانک دیو کو گلا گھونٹتے دیکھ پایا ہو - پانچ منٹ بعد ہوش میں آئی تو لگی غصہ کرنے ـــ سیکڑوں صلواتیں سنا ڈالیں ـــ بدلہ لینے کی دھمکی دی ـــ اور پھر کھو گئے سب باتوں میں ـــ کبھی نہ ختم ہونے والی باتیں ـــ بے سروپا باتیں ـــ

"اے لڑکیو - بس ختم بھی کرو اپنی باتیں ـــ کب سے انتظار ہو رہا ہے چائے پر تمہارا ـــ اوئی! تونے ابھی تک کنگھی تک نہیں کی ـــ" امی نے میرے بکھرے بالوں کی لٹ کھینچتے ہوئے کہا۔

"ابھی پانچ منٹ امی ـ اور ہم آئے ـــ" کہہ کر بھاگی میں غسل خانہ میں ـــ بس ذرا یوں ہی سا منہ دھو - کپڑے بدل کرکے میں آئی - فرحت، رضیہ، ناہید اور شمسی سب ہی تو چلنے تیار کھڑے تھے - ایک دوسرے کے رنگ برنگ کے لباس پر قہقہے لگاتے ہوئے نیچے آئے۔ اباجی کے دوست کو چچا کہہ کر سلام کیا اور ان کے قریب ہی بیٹھ گئی - یہ ہماری شمسی کے بھی تو چچا ہیں نا۔ باجی نے جلدی جلدی سب کو چائے بنا کر دی اور کوئی قریب آدھ گھنٹہ لگا چائے پینے میں - اسی دوران میں نوکر نے اطلاع دی کہ موٹریں تیار رہیں اور سب

سامان موٹروں میں رکھ دیا گیا ہے۔ ہم نے سوچا اپنی والی موٹر میں بیٹھیں - بھیا جو ڈرائیو کریں گے بڑا مزہ رہے گا - جلدی سے میں اور شمسی بھاگے ـــ کیمرہ اور گراموفون بھولا آئے تھے۔ پکنک بغیر گراموفون اور کیمرے کے کچھ پھیکی پھیکی سی لگتی ہے یہ رضیہ کہتی ہے ہم نہیں - بوجھل سا گراموفون اور کیمرہ سنبھالے جب ہم نیچے آئے تو موٹروں میں سب بیٹھ گئے تھے - سامنے والی سیٹ پر بھیا کے پاس شمسی اور ننھی سی فرحت بیٹھی تھی - فرحت کو گدگدایا شمسی کے چٹکی لی ـــ "ہٹ یہاں سے نہیں تو کہہ دوں گی سب سے رات والی بات ـــ" وہ کچھ کسمسائی اترنے کے لئے - بھیا نے شمسی کا بازو پکڑ لیا "نہ جانا شمسی یہاں سے - یہ یہاں بیٹھ کر چیزوں کو چھیڑ چھیڑ کر بیکار سوالوں سے میرا دماغ چاٹ جائے گی" بڑی مشکل سے بھیا راضی ہوئے اپنے ساتھ بٹھانے - شمسی اور فرحت پیچھے چلی گئیں ـــ راستہ قہقہوں اور دلچسپ باتوں میں گزرا ـــ سرسراتی ہوئی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے دل کو گدگدا رہے تھے - آسمان پر اجلے اجلے بادل منڈلا رہے تھے اور جب ہم بند کے قریب پہنچے تو بادل نیچے کی طرف پھیل رہے تھے - ہوا میں جاں بخش خنکی تھی اور ایک عجیب سی خوش بو - شکر ہے سعید باجی اس دفعہ بجائے امی کے ساتھ بیٹھ کر ہم پر رعب جمانے کے ہمارے مسکراتے قہقہوں میں شریک تھیں۔

دہلی کے تفریحی مقامات میں اوکھلا ایک پرفضا تفریح گاہ ہے - یہاں ایک چھوٹا سا بند اور ایک ننھا سا آبشار ہے جس سے اطراف میں ایک دلفریبی پیدا ہو گئی ہے اور جب وقت دریائے جمن کا چمکتا ہوا پانی لاکھوں پیچ و تاب کھاتا ہوا نفس چھوٹے سے بند سے ٹکراتا ہے اور پھر اس ننھے سے آبشار سے چادر بن کر شور کرتا نیچے گرتا ہے تو بے حد

دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ ایک جگہ آبشار بہت زور شور
سے گرتی ہے اور جب وقت یہ ہزاروں ننھے ننھے
تاروں سے چمکتی ہوئی پانی کی چادر نیچے گرتی تو پانی
میں ایک تلاطم ایک ہیجان بپا کر دیتی — ان گنت
بلبلے بنتے اور پھر بگڑ جاتے اور اس بننے اور بگڑنے
نے نظارے کو افسانوی اور دل فریب بنا دیا ہے۔

موٹر سے اتر کر ہم لوگ ریشم کی طرح نرم
اور ملائم گھاس پر بیٹھ گئے۔ ابا جی اور چچا سگار
پیتے ہوئے ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔
امی اور ان کی سہیلی بھی کچھ باتیں کرنے لگیں جو
ہماری سمجھ میں خاک نہ آئیں — یہی خاندان کی
باتیں — کسی کی شادی کی — کسی کے مرنے اور
کسی کی پیدائش کی۔ اور خدا جانے وہ لوگ کیا کیا
کہتے رہے ایک دوسرے سے۔ بھیا بندوق میں
کارتوس بھر رہے تھے اور شرفو مچھلیاں پکڑنے
ڈور کو درست کر رہا تھا اور ہم ان سب کے
درمیان بیٹھیں کچھ احمق سی لگ رہی تھیں —
کسی نے رائے دی کہ گراموفون لے کر یہاں سے
نو دو گیارہ ہو جانا چاہئے اور اس طرف
دور پرے جو بڑا سا درخت ہے اس کے موٹے سے
تنے کی اوٹ میں بیٹھ کر گراموفون بجایا جائے۔
میں نے اور رضیہ نے اس کی تائید کی اور گراموفون
اٹھا کر چلے۔ ابا جی نے جاتے جو دیکھا پوچھا —
"کہاں چلیں — ؟"
"کہیں نہیں — بس ذرا یہاں تک —
اس درخت تک — ذرا وہ —" بات پوری
کہنے نہ پائی کہ چچا جو شاید کچھ لکچر دے رہے تھے
اس ڈر سے کہ وہ اپنی تقریر بھول نہ جائیں
جلدی سے بولے — "اچھا تو جاؤ" — کچھ دور
تیز تیز قدموں سے چلے پھر کسی کو دھکا دیا۔
کسی کو گدگدایا اور کسی کے کان میں زور سے
سیٹی سی بجا دی — یوں ہنستے کھیلتے اس تناور
درخت تلے پہنچے۔ کہ اگر اس کے تنے کی اوٹ میں
ہم میں سے چار چھپ جائیں تو اس پار والے
بالکل نہ دیکھ پائیں۔ اور پھر دھپ دھپ کر کے
گھاس پر یوں جم کر بیٹھ گئے جیسے اب وہاں سے
اٹھنے کے ارادے ہی نہیں — کچھ دیر گراموفون
بجایا۔ پھر رضیہ نے، شمسی نے اور ناہید باجی
نے فلمی گیت سنائے اور پھر بس یوں ہی ایک
دوسرے کو گدگداتے رہے اور ہنستے رہے اور
جب جلدی جلدی ان سب باتوں سے جی بھر گیا
تو (Opinion) کھیلتے رہے اور پھر جب
یہ کھیل بھی ناہید باجی کے کوئین (Queen) (ق)
بن جانے پر ختم ہو گیا تو آنکھ مچولی شروع ہوئی۔
آنکھ مچولی میں بڑا لطف آیا۔ کھیل بہت دلچسپ
تھا۔ سعید باجی ہر بار چور بن جاتیں۔ کچھ ان کے
چور بننے پر رحم سا آ رہا تھا اور کچھ کھیل کود سے
نڈھال سے ہو رہے تھے اور کچھ بھوک بھی لگ
رہی تھی، اس لئے کھیل ختم کیا اور واپس آئے۔

شرفو اور بھیا نے چار پانچ مچھلیاں پکڑی
تھیں۔ سب کے بے حد اصرار پر سعید باجی اور شمسی
نے مچھلیوں کو تلا اور پھر سب نے وہیں ہری ہری
گھاس پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ شرفو اپنی بانسری بجاتا
رہا اور ہم کھاتے رہے۔ اسے بھوک نہ تھی —
کم بخت نے کھایا ہوگا ڈٹ کر صبح — اور پھر کھانے
کے بعد دیکھتے دیکھتے آسمان پر کالے کالے بادل
پھیلتے ہی گئے — ہلکا سا جھکڑ بھی چلنے لگا —
بارش کے آثار تھے۔ جلدی جلدی سب سامان
موٹروں میں ڈالا — بس تھوڑی سی دیر ہلکی سی
بارش ہو کر آسمان صاف ہو گیا اور ہم ایک درخت کے

کھڑے بغاوت کے مذاق کی اس آن کا ملاحظہ کرتے رہے۔
قریب کوئی چار بجے چائے پی اور وہ مٹھائیاں وسامانہ تھیں خوب کھائیں اور پھر یوں ہی باتیں کرتے کرتے شام ہوگئی۔ بھیا نے کہا آؤ چلو شکار کریں۔ فرحت اور سعید باجی وہیں رہیں اور ہم چاروں اور بھیا اور شرفو چلے شکار کرنے۔ پیاری پیاری مرغابیاں چکیلے پر پھیلائے نہر میں تیر رہی تھیں۔ بھیا نے ان کا نشانہ لگایا تو شمسی نے سہم کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"نہیں بھیا ان تیرتی ہوئی خوبصورت مرغابیوں کو تو نہ مارو۔" بھیا نے ہنس کر اڑتے ہوئے جل کوے کا نشانہ لگایا۔ انھائیں کی آواز اور دور پرے بیچارا جل کوا مرا پڑا تھا۔ شمسی بندوق کی آواز سے کانپ اٹھی، اس نے بھیا سے بندوق چھین لی۔ اب کسی کو نہ مارنا۔ وعدہ کر دیجئے۔ ہائے رے! کتنی کمزور دل کی لڑکی ہے یہ شمسی اور پھر شرفو سے بھیا نے اپنا سوئمنگ ڈریس لیا اور چلے درخت کی آڑ میں پہننے۔ شمسی اور ناہید ریت پر کچھ نیم دراز باتوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ میں اور رضیہ ہم دونوں نہر میں پاؤں لٹکائے پانی میں ننھی ننھی کنکریاں پھینک رہے تھے۔ لہریں ہمارے پاؤں سے آ آ کر ٹکرا رہی تھیں۔ ایک لہر آ کر ٹوٹتی تو دوسری دور سے سر بلند کرتی اور وہ بھی یوں ہی آ کر ٹوٹ جاتی۔ شلوار گیلی گیلی سی ہوگئی تھی مگر ہم لہروں کی دلچسپیوں میں گم سوچ رہے تھے "اگر ہم جل پریاں ہوتیں تو ——" غڑاپ کی آواز کے ساتھ ہی ہم دونوں پلٹیں۔ "کوئی گرا۔" رضیہ نے تقریباً پریشان ہوکر کہا —— میری چیخ نکل گئی "بھیا" اور دوسرے لمحہ متلاطم پانی کی سطح پر بھیا کا مسکراتا چہرہ نظر آیا اور ہم دونوں ہنس پڑیں اپنی بھول پر — رضیہ بھاگی کیمرہ لینے۔ بھیا کی نہاتے ہوئے تصویر لی۔ نہر کا پانی شیشہ کی طرح چمک رہا تھا۔ آسمان پر گھٹائیں سی چھائی ہوئی تھیں اور ایک طرف دور نہر کے اس پار افق پر دھنک نکلی ہوئی ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے کوئی الھڑ دوشیزہ رنگ برنگی چنری اوڑھے کھڑی ہو۔ پانی سے بھیگی ہوائیں طبیعتوں کو گدگدا رہی تھیں۔ نہر کی پُرشور لہریں ابھر ابھر کر پیاری پیاری راگنیاں سنا رہی تھیں — ناہید باجی گا رہی تھیں —— "گھر کر آئی بدریا گھر آؤ" شام کا وقت، نہر کی مضطرب لہریں ہوا کے سرد، انگیز جھونکے —— ناہید باجی کی سحر انگیز آواز، فضا ایک روح افزا نشہ میں ڈوب گئی۔ ہستی کا ذرہ ذرہ مدہوش سا ہونے لگا۔ اس وقت کی یاد مدتوں ہمارے دل میں رہے گی اور پھر جب آسمان پر گھٹائیں کچھ کالی اور کچھ اودی سی ہونے لگیں تو ناہید باجی اور شمسی نے ایک گیت "چھائی ہے کالی گھٹا چھیا مورا لہرائے ہے" گا کر فضا میں ایک سحر آلود کیفیت پیدا کردی اور پھر ایک دوسرے کو گدگدا کر ہنس ہنس کر وہیں ریت پر لوٹ لوٹ گئے۔ نہر کا چمکتا ہوا پانی اور اس چمکتے پانی کی مچلتی لہروں کے سینے پر غروب آفتاب کی ارغوانی کرنوں کا عکس، پانی سے بھیگی ہوا کے سرد انگیز جھونکے، دور تک کھلے میدان اور لہلہاتی کھیتیاں اور ذرا دور پر شور مچاتا ہوا وہ ننھا سا آبشار ہماری لاانتہا مسرتوں میں برابر کے شریک تھے۔ فضا کی لامحدود وسعتوں میں تاریکیاں پھیل رہی تھیں۔ اباجی اور سب ہماری طرف آرہے تھے اور جب گھر واپس چلنے کو کہا —— "گھر، اتنی جلدی" ایسے دلفریب اور حسین نظارے کو چھوڑ کر کس کا جی جانے کو چاہے گا۔ لیکن رات آگئی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں کوئی ستارہ نظر آرہا تھا۔ پھیکا پھیکا زرد زرد

[illegible] کے [illegible] چھائی ہوئی سیاہ گھٹاؤں کے [illegible] تھا۔ [illegible] میں وقت کا اندازہ [illegible] ہوئے انداز میں ہم سب [illegible] کا سہانا پن کھوئی [illegible] ہوئے متلاطم پانی، ننھے سے شور مچاتے آبشار اور کالی کالی اودی اودی گھٹاؤں اور فضا کی سحر آلودگی کا [illegible]۔ رضیہ نے گدگدایا اور میں چونک سی پڑی [illegible] یوں کھو گئی جیسے۔ جیسے" اور ہم دونوں ہنس پڑے وہ مثال نہ دے سکی۔

اختر محمود

غزل

ان کی باتوں میں دلِ امیدوار آہی گیا — جھوٹے وعدوں پہ بھی مجھ کو اعتبار آہی گیا

پھر مری اجڑی سی دنیا میں پلٹ آئی بہار — پھر خیالِ یار جنت در کنار آہی گیا

[illegible] حد سے افزوں بے قراری ہو گئی — آتے آتے قلبِ مضطر کو قرار آہی گیا

آخرش سلماں شکستِ توبہ کے ہو ہی گئے — آسماں پر جھوم کر ابرِ بہار آہی گیا

جب شبِ وعدہ ذرا سی بھی کوئی آہٹ ہوئی — میں نے یہ سمجھا وہ جانِ انتظار آہی گیا

دل میں برپا ہو گیا طوفانِ رقت اے بہار — لب پہ میرے نالۂ بے اختیار آہی گیا

شوراج بہل

ستی

اتنی جلدی اپنی دنیا اجڑتی دیکھ کر لیلا دم بخود رہ گئی۔ اس کا پتی دیو اتنی جلدی دنیا سے آنکھیں پھیرے گا اور اس کے سپنوں کی دنیا پتی کی چتا کے ساتھ یوں جل کر راکھ ہو جائے گی، اسے تو اس کا گمان بھی نہ تھا۔ آہ! وہ اندوہناک لمحہ ——!
جب اس کی غم آگیں اور اشک آلود آنکھیں اس کی چوڑیوں سے بھری خوبصورت کلائی کو آخری بار نظر بھر کر دیکھ رہی تھیں —! پھر اس نے سب چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ ٹوٹی ہوئی نیلی پیلی چوڑیوں کا ڈھیر اس کے سامنے تھا —— اس کی پھوٹی امنگوں کا انبار عظیم

اب اس کے کان اس کی چوڑیوں کی نشاط آور کھنک کبھی نہ سنیں گے، اس کی آنکھیں اس کا عکس جمال کبھی نہ دیکھیں گی، اور اس کے ماتھے پر وہ من موہن تلک کبھی نہ چمکے گا — وہ کتنی مجبور تھی بیوگی کا سوانگ بھرنے پر —! جیسے اسے دنیا میں ڈھنڈورا ہی تو پیٹنا تھا کہ بھئی میں بیوہ ہو گئی ہوں، مجھے نہ چھوؤ، میں اپیچ ہوں، سہاگنو! مجھ سے دور رہو، دلہنو! مجھ سے خوف کھاؤ، میں ابھاگن ہوں، رانڈ ہوں رانڈ۔ تمہیں یقین نہیں آتا تو لو دیکھ لو میرے ننگے[1] ہاتھ، میری بے نور آنکھیں، میرے بے ترتیب بال، میری زندہ درگور جوانی ....!!

لیلا کی عمر سولہ سال کی تھی جب اس کی ماں نے اسے پرائی کر دی تھی۔ بے چاری نے بڑی دوڑ دھوپ کر کے بیٹی کا بیاہ رچایا تھا، مگر بیٹی کے دکھ سکھ دیکھنے کے لئے وہ زندہ نہ رہی اور شادی کے ایک سال بعد ہی کرموں جلی لیلا کا سہاگ لٹ گیا کتنے مختصر تھے اس کی خوشی کے لمحے —! صبح کے کیف آور ساعات کی طرح مختصر و جمیل —

اب دنیا میں لیلا کی صرف ایک بڑی بہن کملا اور اس کے شوہر شیورام تھے۔ جب انہوں نے یہ غمناک خبر سنی تو بہت افسوس کیا اور دوسرے دن ہی لیلا کے گھر جا پہنچے۔

کملا نے جب اپنی بیوہ بہن کو کمرے کے کونے میں دبکی بیٹھے پایا تو وہ بے اختیار اس کی طرف لپکی اور اس سے لپٹ کر خوب رو دی۔ خوب واویلا مچایا۔ جیسے اسی کا گھر اجڑ گیا تھا جیسے اسی کی مٹی پلید ہو گئی تھی۔ لیلا سوچتی کیا میری بہن کو مجھ سے اتنی محبت ہے، کیا میرے برباد ہونے کا اسے اتنا دکھ ہے —؟ اس سے بھی نہ رہا گیا، یہ بھی رو دی مگر اس کا دل شدت غم سے جیسے پھٹ گیا تھا اور آنکھوں میں آنسو جیسے خشک ہو گئے تھے۔ وہ صرف سسکیاں بھرتی رہ گئی، ایک موت تو اتنی خوفناک چیز نہیں، موت تو سب کو آتی ہے، مگر ایک نوجوان ہندو شوہر کی موت —— ! اف!! ایک جوان بیوہ کا پتی کی یاد کو چھاتی سے چپکائے جیون بتانا کتنا کٹھن ہے ——!

شیورام جو اب تک دور کھڑے آنکھوں میں آنسو لانے کی کوشش کر رہے تھے لیلا کے قریب آکر نہایت شفقت و محبت سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگے "نہ رو لیلا! دنیا میں کس کے دن ایک سے رہے ہیں؟ کبھی سکھ کبھی دکھ، بھگوان کی یہی مرضی تھی !!

"بھگوان" لیلا سوچنے لگی کیا بھگوان کو ہم دکھیاروں کو رلانے میں اتنا مزا آتا ہے؟ وہ کتنا چاہتی تھی کہ اس سے کوئی والہانہ محبت کرتا

[1] چوڑیوں سے خالی ہاتھ

[illegible] شادی کے دن وہ مرگئی ہوتی، زندگی بھر [illegible] انتقام لیتی خوب...... اور اسے [illegible] غصہ آنے لگا، بھلا اتنی جلدی مرنا تھا [illegible] کیوں کی تھی مجھ سے........

[illegible] "سرپرستانہ" وقار سے لیلا کی طرف [illegible] ہوئے کہنے لگے، "لیلا! تم چنتا نہ کرو۔ آخر ہم کس دن کے لئے ہیں۔ ہمارا گھر تمہارا ہی گھر ہے اور ہمارے بچے......" بملا نے بھی اڑے ہوئے گلے سے کہنا شروع کیا "ہاں ہاں سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ تم کوئی غیر ہو" اور قدرے توقف کے بعد ایک آہ بھر کر کہنے لگی "اچھا ہی ہوا اماں [illegible] چل بسیں، ورنہ اس صدمہ کی تاب نہ لاتیں گھل گھل کر مرجاتیں!"

لیلا کو آسرا مل گیا۔ ایک سال بیت گیا۔ اب بملا بالکل بے فکر تھی۔ اب اس کے جسم پر موٹاپے کے آثار نمایاں تھے۔ وہ مزے سے کھا کر ایک جگہ پڑی رہتی اور دن بھر بہن کو حکم دیتی رہتی۔ کبھی کہتی "لیلا میری اچھی بہن ذرا وہ تو کر ذرا یہ تو لا" ایک کنبے میں ایک جوان بیوہ کا رہنا کتنا ضروری ہے۔! اس کے گوشت سے بھرے قوی اعضاء پر سماج کی نگاہیں کس حسرت سے پڑتی ہیں —!! شائد انھیں اسی لئے زندہ سلامت رکھا جاتا ہے تاکہ وہ سماج کے بے دام غلام بن کر رہ جائیں تاکہ ان کی انفرادیت ملیامیٹ ہو کر ان کی زندگی اور ان کا سنسار کسی اور کے سنسار کا جزو بن کر رہ جائے۔ لیلا سوچتی کتنے اچھے دن ..... تھے وہ جب بیوی پتی کے جلتی چتا میں زندہ جھونک دی جاتی تھی —! یوں گھل گھل کر مرنے سے تو وہ کہیں اچھا تھا —

لیلا حد درجہ جذباتی عورت تھی۔ وہ سوچنا ہی نہیں چاہتی تھی کہ وہ بیوہ ہے اور سماج اس سے گھن کھاتا ہے۔ اسی لئے وہ اب بھی بال بناتی، مانگ چوٹی سنوارتی، باہیں ننگی رکھتی اور چہرے پر غازہ ملتی تھی۔ بملا اس کے یہ رنگ دیکھ کر خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔

گھر کا سارا کام کاج اب لیلا ہی کے سپرد تھا۔ رسوئی بنانا، بچوں کو نہلانا، کھلانا، پلانا سب کام یہی کرتی تھی۔ کام کی دھن میں اسے کچھ احساس نہ ہوتا تھا، ایک مشین کی طرح کام میں الجھی رہتی ——— مگر جب رات ہوتی اور سارا عالم نیند کی میٹھی آغوش میں سانسیں لینے لگتا تو اسے اپنی ہولناک تنہائی کا احساس ہوتا۔ اس کے دل میں آتشیں جذبات کروٹیں لینے لگتے اور اس کے خیالات بہک بہک جاتے۔ وہ سوچتی پتی برتا استری۔! کتنا مکروہ لفظ ہے ———! عفت و پاکدامنی۔! استری کی متاع عزیز ———! کتنا فریب ہے!! اور اس کا جی چاہتا اس دکھاوے کی عزت و عصمت کا لباس تار تار کردوں اور بر سر عام لوگوں سے چیخ چیخ کر کہوں "اے سنگدل انسان! دیکھ میں ہوں عورت، تمہاری خوشیوں کا مرکز، تمہاری زندگیوں کا سرمایۂ بے بہا، لوٹ لو اس سرمایہ کو ——— میں ہوں عورت — حسین ...... جوان دیکھتے نہیں میرے سینے سے جوانی کس بے باکی سے جھانک رہی ہے ———! کیا تم مجھ سے دور بھاگتے ہو، ٹھکراتے ہو اس سرمایہ کو، ہنستے ہو مجھ پر ———" اور اس کے اعضا میں خوفناک تشنج پیدا ہوتا۔ وہ ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اٹھ کھڑی ہوتی، وہ چاہتی میں ایک زلزلہ ہوں، ایک خوفناک زلزلہ اور سارے نظام کائنات کو درہم و برہم کردوں، مہا کالی بن کر

سارے عالم پر چھا جاؤں، ساری انسانیت کو کچل
کے رکھ دوں، ہر طرف تاراجی پھیلا دوں —
تباہی ——— تاراجی ——— خون ——— خوب پی لوں
خون، خوب۔ روح کی پیاس بجھاؤں ——"۔ اور
وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں بستر پر اوندھے منہ
گر پڑی —

اور جب صبح ہوتی تو اس کے جذبات کا
سمندر پرسکون ہو جاتا اور متلاطم لہریں تھم جاتیں
جیسے تھک کر چور ہو گئی ہوں اور وہ روز کے کام
دھندوں میں کھو سی جاتی، پھر اُسے نہ منگل کی
سُدھ رہتی نہ بدھ کی، ایک دن شیورام نے
اسے بے طرح چھیڑا - وہ ایک دھلا ہوا فراک
الگنی پر سکھا رہی تھی، پاس ہی شیورام چارپائی
پر بیٹھے ہوئے تھے - ان کا دو سالہ بچہ ان کے
زانوں پر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ شیورام بچے
کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہنے لگے "لیلا! تم کتنی سگھڑ
ہو، دیکھتے دیکھتے گھر کا نقشہ بدل ڈالا تم نے،
تمہاری بہن سے کچھ ہونا نہ تھا اور اگر تم نہ آتیں
........" لیلا کا گلابی چہرا ایک دم تمتما اٹھا،
اس کے تن بدن میں ابال سا آنے لگا، اس کے
دل سے گرم اور کھولتے ہوئے خون کے فوارے
سے چھوٹنے لگے۔ اور اس کی نبضیں تن کر بے حس
سی ہو گئیں، اسے شیورام پر بے حد غصہ آرہا تھا،
وہ سوچتی کیا انہوں نے مجھے اسی لئے گھر پر بلا رکھا ہے۔
کیا اس کام کے لئے میں ہی رہ گئی تھی؟ جیسے میرا
کوئی دوسرا مصرف ان کی سمجھ میں آتا ہی نہیں،
بزدل ——— ! نامرد ——— !! آج بہن کے
تیور بھی بگڑے ہوئے تھے۔ لیلا کام کاج سے فارغ
ہو کر سنگار کرنے بیٹھ گئی تھی - کملا کمرے میں آکر
اسے ایک ٹک دیکھتی رہی - جب وہ سنگار ختم
کر چکی تو کملا نے کہا "لیلا تمہارے یہاں ٹھیک
نہیں - تم دو دھوا ہو - تمہیں یہ بناؤ سنگار کی
کیا ضرورت ہے۔ اور یہ منہ پر سفید پوڈر کیوں
تھوپ لیا تم نے ——؟ دنیا کیا کہتی ہے تمہیں
کچھ پتہ بھی ہے ——؟
لیلا کے جی آئی کہاں نوچ لوں، کپڑے
پھاڑ ڈالوں اور چہرے پر کولتار مل لوں....
مجھے کیا حق ہے میں دو دھوا........ آج کام
میں کسی طرح اس کا جی نہ لگا - دن بھر دل میں
بے کلی سی رہی، پھر رات کی مہیب تنہائی کے
خیال کر کے ابھی [illegible] س کا دل بیٹھا جا رہا تھا
مگر آج اس کا مضمحل اور تھکا ہوا جسم بہت
جلد نیند کی سکون آمیز زنجیروں میں جکڑ گیا —
رات میں اس نے عجیب عجیب خواب دیکھے -
اس نے دیکھا ہندوستانی بیوہ استریوں کا
ایک جلوس چلا آرہا ہے - زرد زرد مرجھائے
ہوئے چہروں والی بیوائیں جن میں جوان بھی تھیں
اور ادھیڑ بھی - بیوائیں جن کے بہادر اور کڑیل
نوجوان شوہر جنگ میں آخری وقت تک لڑتے
لڑتے دم توڑ دیئے تھے اور جن کی بہادری کے
صلے میں انھیں "وکٹوریا کراس" عطا کیا گیا تھا!
سب کی سب ایک جہنمی بھٹی، ایک نمرودی الاؤ
کے گرد آکھڑی ہوئی تھیں - الاؤ سے آگ کے
شعلے بلند ہو رہے تھے اور ایک قوی جثہ اہرمنی
شکل کا دیو باری باری سے انھیں پکڑ کر دہکتی
آگ میں جھونک رہا تھا - ان کے نالہ و شیون
اور دیو کے خوفناک قہقہوں سے فضا گونج رہی
تھی ... لیلا چیخ مار کر اٹھ بیٹھی - وہ کانپ
رہی تھی اور اس کا دل زور زور سے دھڑک
رہا تھا - اس نے محسوس کیا جیسے ان الھاگنوں میں

[illegible] تھی۔

تین چار دن سے شیو رام کے گھر میں غیر معمولی
چہل پہل تھی۔ پوتا سے ان کا چھوٹا بھائی
ہری رام آیا ہوا تھا۔ پچیس چھبیس سال کا سن تھا
بشرہ زرد اور مرجھایا ہوا، کوئی عاشقِ تشنہ کام
معلوم ہوتا تھا۔

لیلا دن بھر ہری رام کی دلجوئی میں لگی رہتی
تھی۔ اس کام میں اسے ایک قسم کا سکھ ملتا تھا
اور لذت سی محسوس ہوتی تھی۔ ان دنوں وہ
ہشاش بشاش بھی نظر آنے لگی تھی، چہرے پر
نہ وہ افسردگی کی زردیاں تھیں اور من پر
نہ وہ غموں کی کالی بدلیاں۔ اب راتوں میں
جھلملاتے تارے اسے ان جانے سے اشارے
کرتے اور چندرما مسکراتا ہوا اس کی طرف معنی خیز
نگاہوں سے گھورتا —— جب وہ نیند کی گود
میں سر رکھے بے خود پڑ جاتی تو رات کے سناٹے
میں چپکے چپکے اس کے من کے چور دروازوں
سے کوئی انجانی ان دیکھی موہوم سی ہستی دبے
پاؤں داخل ہوتی اور اس کے من پر چھا جاتی۔
پھر وہ سپنوں کی دنیا میں کھو جاتی، سندر اور
سہانے سپنے —— اسے خود تعجب تھا کہ وہ
یوں کیسے بدلتی جا رہی ہے اور اس کی روح
کی گہرائیوں میں [illegible] دمانیت سی کیوں اترتی
جا رہی ہے۔ مگر لیلا ہری رام کو ایک آنکھ نہ بھاتی
تھی۔ وہ اس کے [illegible] ڈھنگ دیکھ کر دل میں
بہت کڑھتا تھا۔ بظاہر خندہ پیشانی سے ملتا اور
اس کے ہر سوال کا سیدھے منہ جواب دیتا
مگر اس کے دل میں لیلا کے خلاف شدید تنفر
کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ دنیا کی اس دھتکاری

اور دندی ہوئی مخلوق کو کیا حق تھا کہ سولہ سنگار
کرے اور مسکرا مسکرا کر اس کی طرف یوں دیکھے
جیسے صرف اس کی بیوی ہی دیکھ سکتی تھی —!

ہری رام کو آئے آج پانچواں دن تھا —
آج لیلا معمول سے زیادہ مسرور نظر آتی تھی۔
دن بھر وہ ہنستی بولتی رہی۔ رات میں کھانے
کے بعد شیو رام اور ہری رام دونوں میں بہت
دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ جب
رات بہت ہو چکی تو شیو رام اٹھ کر اپنے کمرے
میں چلے گئے۔ ہری رام بالکونی میں آ کر اپنی چارپائی
پر بیٹھ رہے۔ مگر لیلا کی کسی طرح آنکھ نہ لگتی تھی۔
جب بہت دیر تک بستر پر پہلو بدلتے بدلتے آنکھ
نہ لگی تو وہ ہولے ہولے کمرے کا دروازہ کھول کر
باہر کھسک آئی۔ فضا میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی
اور ہر سو خاموشی سو رہی تھی۔ آبادی سے قدرے
دور جہاں گاؤں کے ڈھوروں کا ریوڑ سوتا
تھا، کوئی گوالا دھیمے دھیمے سروں میں بانسری
بجا رہا تھا، بانسری کی مدھر مدھر لڑکھڑاتی تانیں
لیلا کے کانوں میں جیسے رس گھول رہی تھیں ——
اس کی روح وجد میں آ کر ناچنے لگی، اس کا من
جھولنے لگا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کو کوئی اپنی
مضبوط باہوں میں بھینچ لے .... اس کی ہستی
کسی کی ہستی میں سما جائے۔ اس کی روح کسی
کی روح میں اتر جائے۔ وہ پلٹ کر ہری رام
کی چارپائی کی طرف بڑھی مگر قریب پہنچ کر اس کے
پاؤں خود بخود رک گئے۔ تھوڑی دیر کے لئے
وہ ٹھٹھکی۔ مگر اس کے دل میں ہیجان بپا تھا
اور جذبات میں ہل چل مچی ہوئی تھی ——
قریب پہنچ کر وہ اپنے بائیں ہاتھ کی لرزتی ہوئی انگلیاں
ہری رام کے خشک بالوں میں الجھا کر کانپتی ہوئی

مدھم آواز میں بولی "سو رہے ہیں آپ؟" ہری رام ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور مندی مندی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ لیلا اب ان کی چارپائی کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گئی اور کہہ رہی تھی "دیکھئے موسم کتنا خوش گوار ہے...... ہر طرف چاندنی...... اور......" اس کی آواز گلے میں اٹک گئی —
ہری رام کی کرخت آواز اس کے کانوں میں آئی "ذلیل عورت! تیرے یہ لچھن — !! ناشدنی تجھے لاج نہیں آتی — آخ...... تھو...... کہا پاپنی...... !!"

لیلا کے دل پر جیسے ہزاروں بجلیاں گر پڑیں۔ اس کی جوانی جیسے کسی سنگلاخ چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ وہ دم سادھے تھوڑی دیر کے لئے مبہوت و مضطرب کھڑی رہی اور پلٹ کر بے تحاشا دوڑتی ہوئی آئی اور کمرے کے اندر گھس کر بستر پر اوندھے منہ گر پڑی۔

اب وہ سچ مچ بیوہ معلوم ہونے لگی تھی۔ اب نہ بناؤ تھا نہ سنگار۔ اس کا دل اب چٹان کی طرح مضبوط تھا۔ اس کی زندگی میں کئی ایسے موقعے آئے جب اس کا دماغ بہک جاتا اور دل بے قابو ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے پیروں کو کبھی لغزش نہیں ہوئی اور اس کے قدم کبھی نہ ڈگمگائے۔ وقت گزرتا رہا۔ بسنت رت آتی رہی اور ان گنت چڑیاں ہری بھری گھنیری شاخوں پر جھوم جھوم کر گاتیں الاپتی رہیں، ساون کی کالی کالی گھٹائیں آسمان کے لامحدود پھیلاؤ میں مچلتی رہیں، ... کے مرغوں کی طرح رنگین رہیں مگر لیلا کے من میں وہ رنگینی کبھی نہ اٹھی اور وہ وجد آفریں نغمے کبھی نہ پھوٹے......

اب راتوں میں کبھی کبھی اس پر غشی طاری ہوتی تھی اور دن میں کام کرتے بہت جلد تھک جاتی تھی۔ اس کی روح ایک ابدی سکون کے لئے بہت تڑپتی تلملاتی، مگر اس کی منزل جیسے بہت دور تھی اور وہ تھکی ہاری...... مضمحل...... افسردہ......

وقت کا بوڑھا دیوتا بیٹھا اونگھتا رہا...... اونگھتا رہا...... ہر چیز آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر اپنے انجام کی طرف بڑھتی اور مٹتی گئی، فطرت کی بڑی اسرار و سعتوں میں گم ہوتی گئی۔ مدتیں بیت گئیں...... زمانے گزرتے گئے۔ اب شام ہونے والی تھی، اس کی زندگی کا اداس سایہ ڈھلنے والا تھا۔ ناکام و نامراد وہ صفحۂ ہستی سے گم ہونے والی تھی......

سی۔ ایم۔ ریڈی (عثمانیہ)

محبت کی چھاؤں ۔ مرزا ظفر الحسن صاحب بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جوان دلے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ ہر افسانہ میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کارفرما ہیں۔ [illegible] کے نصب العین معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔ [illegible] تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد عمر

[illegible]

[illegible] ہم ایک "برخوردار" بیمار کو میسور لے گئے تھے، یہ بیمار کوئی آٹھ مہینے سے ہلکے بخار میں مبتلا تھا۔ علاج کے سارے پاپڑ بیل ڈالے مگر بخار نہ جانا تھا نہ گیا! "تغب ازجا نمی جنبد" کا مضمون تھا!! پہلے "ٹیفائیڈ" میں مبتلا رہنے کے بعد تین ہفتوں تک ٹمپریچر نارمل بلکہ سب نارمل رہا مگر پھر ۹۹ اور ... کے درمیان رہنے لگا۔ "ٹائیفائیڈ" کے دوران میں جو ڈاکٹر صاحب علاج کرتے تھے کوئی دو درجن انجکشن بخار جانے کے دئے مگر کچھ نہ ہوا! ایک اور مشہور ڈاکٹر ان کے شریک ہوئے بعد "غور کامل" ایک دن اور انجکشن دینے کی رائے ہوئی، اس کے بعد بھی بخار کا وہی حال تھا!!

تنگ آمد بجنگ آمد! ہم نے ڈاکٹروں کو خیرباد کہہ کر طبیبوں سے مشورہ کیا، ایک مشہور طبیب نے "جگر کی خرابی" تشخیص کی۔ گولیاں، جوارش، معجون، سفوف، عرق وغیرہ وغیرہ سب کچھ دئے مگر ہنوز روز اول!! ایک مہینہ اس طرح گزرا۔ ایک حاذق مشہور ڈاکٹر باقی رہ گئے تھے ایک دن انھیں بھی تکلیف دی گئی۔ ان کے ساتھ قدیم معالج بھی بلائے گئے۔ دونوں نے کوئی ایک گھنٹہ تک امتحان کرکے مشورہ دیا کہ بجلی کا علاج کرانا چاہئے کیونکہ حلق کے غدود بڑھ گئے ہیں۔ دس مرتبہ بجلی دینے کے بعد وہ ٹھیک ہو جائیں گے، یہی سبب بخار رہنے کا ہے۔ یہ پکی تشخیص تھی! اب ہفتہ میں تین مرتبہ بجلی کے علاوہ کے لئے موجودہ پیٹرول کی سخت راشننگ کے مریض کو موٹر میں ہسپتال لے جانا پڑتا تھا۔ یہ بنفشی شعاعوں کا علاج تھا، روشنی بڑی خوبصورت ہوتی تھی۔ ایک بڑے لیمپ کے نیچے بیمار بیٹھا رہتا تھا، دس مرتبہ کے عوض ہسپتال کے "بجلی ڈاکٹر" کے مشورہ سے ہم نے بیس مرتبہ مریض کو لیمپ کے نیچے بٹھایا مگر چراغ تلے اندھیرا ہی رہا! اب کیا کیا جائے؟

ہمارے ایک دوست "صادق" نے مشورہ دیا کہ ایک ڈاکٹر پرانے بخاروں کے ماہر حال ہی میں کہیں سے آئے ہیں، ان سے مشورہ کرنا چاہئے۔ ایک دن ہم ان سے ملے، کوئی ایک گھنٹہ تک ڈاکٹر صاحب نے بیمار کو بٹھا کر، لٹا کر، اٹھا کر، پلٹا کر، ٹھونک کر، بجا کر دیکھا۔ رائے ہوئی کہ ریڑھ کی ہڈی کی مختلف زاویوں سے تصویریں لینی چاہئیں۔ حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ تصویریں دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کچھ صاف نہیں آئی ہیں، دوبارہ لینی چاہئیں۔ بجلی کا علاج کراتے کراتے اور تصویریں لیتے لیتے اب ہم بیزار ہو گئے تھے۔ اس لئے سوچا کہ کیوں نہ بیمار کو میسور کے "سینا ٹوریم" میں لے جا کر تشخیص کرائیں۔ اللہ کا نام لے کر ہم مریض کو لئے نکل پڑے۔ ریل کی نشستیں کوئی پندرہ دن پہلے محفوظ کرائی تھیں لیکن خدا جنگ کا بھلا کرے ٹرین میں مسافروں کا وہ ہجوم تھا کہ پناہ بخدا! ہمارے ڈبہ میں کوئی سو نہ مسافروں کی "کمسڈ پارٹی" تھی۔ برتھ کے علاوہ ٹرنکوں پر، بستروں پر، حتیٰ باسکٹوں پر مسافر ہی مسافر تھے، ہم بھی ایک ٹرنک پر بیٹھ گئے بیمار کو بڑی مشکل سے برتھ پر جگہ ملی۔ ڈورنا چلم تک ڈبہ میں میلہ لگ رہا تھا۔ جب یہاں سے ٹرین چلی صرف آٹھ مسافر رہ گئے تھے۔

ٹرین کی رفتار اب کچھ بڑھ گئی تھی، ہمارے سامنے کی برتھ پر ایک بھاری بھرکم خاتون کچھ بیٹھی اور کچھ لیٹی کتاب پڑھ رہی تھیں، محترمہ نے پانی کچھ زیادہ پی لیا تھا، ٹرین کی رفتار بڑھتے ہی کچھ عجیب قسم کی

آوازیں ان کے پیٹ میں سے آنے لگیں! محترمہ شرما کر اٹھ بیٹھیں۔ پھر بھی ... "ہم ..."
ایک مرتبہ کنکھیوں سے ہماری طرف دیکھ کر مسکرائیں ہم نے بھی ہمدردانہ نظروں سے ان کی
مسکراہٹ کا جواب دیا۔ اتنے میں ٹرین کی رفتار کم ہونا شروع ہو گئی اور جان میں جان آنے
لگی محترمہ کے چہرے پر بحالی آنے لگی۔ یہاں تک کہ ٹرین ایک جنگل کے بیچوں بیچ کھڑی ہو گئی!
مسافروں نے سمجھا شاید سگنل نہیں گرا!! ہم نے ڈبے سے گردن نکال کر جو دیکھا تو کہیں سگنل
کا پتہ نہیں تھا! ایک آدمی انجن سے اترا اور جنگل میں پھرنے لگا!! ہم نے ٹرین ٹھہرنے کی
وجہ پوچھی تو اس نے کہا "ڈرائیور صاحب کی ٹوپی ہوا سے اڑ گئی ہے تلاش کر رہا ہوں"۔ اتنے
میں گارڈ صاحب تشریف لائے اور انجن کی طرف جانے لگے، ہم نے ان سے ٹرین رکنے کا سبب
پوچھا تو ارشاد ہوا "یہی معلوم کرنے تو جا رہا ہوں"! ہم بھی ان کے ساتھ ہو گئے، انجن ہمارے
ڈبے سے قریب ہی تھا، گارڈ صاحب انجن پر چڑھ گئے۔ اور لگے ڈرائیور کو ڈانٹنے!! اس نے کہا
ٹوپی بالکل نئی تھی، پندرہ روپے میں خریدی تھی، اس کے بغیر وہ انجن چلانے تیار نہیں ہے،
تلاش کرنے کی اجازت دی جائے! اس وقت وہ آدمی جو جنگل میں ٹوپی ڈھونڈ رہا تھا واپس
آیا کہ ٹوپی کہیں نہیں ملی، گارڈ نے ڈرائیور سے پوچھا اب کیا کرو گے؟ اس نے کہا ٹرین کو واپس
لے جائیں گے، کہیں نہ کہیں تو ٹوپی مل جائے گی! اس وقت ہمیں جناب شوکت تھانوی کی "سودیشی ریل"
یاد آ گئی!!

ٹرین واپس چلی، کوئی تین چار فرلانگ پیچھے جانے کے بعد ایک درخت پر ٹوپی اٹکی ہوئی نظر
آئی! .... ٹوپی کا نظر آنا تھا کہ سارے مسافروں نے ٹوپی! ٹوپی!! چلانا شروع کیا۔
گویا سبھوں نے عید کا چاند دیکھ لیا! ڈرائیور نے ٹھیک ٹوپی کے درخت کے سامنے انجن ٹھہرایا،
ٹوپی اتاری گئی اور ڈرائیور نے پہن لی، تب کہیں ٹرین چلی!! ڈرائیور نے آنے والے اسٹیشن پر بروقت
پہنچنے کے لئے ٹرین کی رفتار اس قدر تیز کر دی کہ ہماری ہم سفر خاتون کا بیٹھنا بھی دشوار ہو گیا۔
سب مسافروں کے ساتھ وہ بھی اچھلنے لگیں۔ سب کے سب اچک رہے تھے اور ہنس رہے تھے مگر
محترمہ مارے شرم کے پانی پانی ہو رہی تھیں۔

رات کے کوئی دس بجے ہوں گے کہ ایک ایسے اسٹیشن پر پہنچے جہاں "صاحب لوگ" بڑا کھانا
کھاتے ہیں، ان کی خاطر ٹرین یہاں کوئی پون گھنٹہ ٹھہری، ہم نے اور ہماری ہم سفر خاتون نے اپنے
اپنے توشہ دان کھولے اور کھانا شروع کیا، محترمہ نے اپنے توشے میں سے سالن ملے ہوئے چاول
ہماری طرف بڑھائے اور کہا "ہمارے گھر کی یہ خاص چیز ہے تھوڑا سا چکھ کر دیکھئے"! واقعی یہ چاول
بڑے مزیدار تھے!! چٹنی، اچار، بگھارے بیگن، ماہی قلیہ اور دو چار قسم کے سالن کا مزہ آ رہا تھا۔
ہم نے تعریف کی تو محترمہ نے اصرار کے ساتھ ہمیں اس قدر کھلایا کہ پیٹ میں مطلق گنجائش نہیں
رہی، ہم دونوں کھانے سے فارغ ہو کر اپنے اپنے بستر صاف کر رہے تھے کہ ایک تربوز فروش ہمارے
ڈبے کے قریب ... نازل ہوا۔ ہماری دوست نے ایک تربوز خریدنا چاہا ... تربوز ... لئے

[illegible] کہ وہ پھسل پڑا اور پلیٹ فارم پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا !! اب تو مجبوراً [illegible] اور ہمیں رات کے بارہ بجے اس کو زہر مار کرنا پڑا۔ ہزار ہم نے انکار کیا کہ اس وقت تربوز کھانے سے نزلہ ہو جائے گا' حلق میں خرابی پیدا ہوگی' مگر محترمہ نے ایک نہ سنی اور [illegible] خراب ہو جائے گا' بارہ آنے کا خون ہوگا' مجبوراً کچھ کم آدھا تربوز ہمیں کھانا پڑا [illegible] نوش فرمایا' یہاں سے کچھ جاگتے کچھ سوتے صبح کے چھ بجے بنگلور پہنچے۔ یہاں ٹرین کوئی [illegible] میسور جانے کے لئے ٹرین بدلنی پڑی۔ ہماری دوست نے ہمیں "خدا حافظ" کہا کیونکہ وہ بنگلور میں اپنی والدہ کے ہاں گرمیاں گزارنے آئی تھیں۔ بنگلور ان کا وطن تھا مگر اردو ایسی صاف بولتی تھیں کہ گویا ان کی مادری زبان ہے ! وہ ہمارے ہاں کے ایک بڑے عہدے دار کی رفیق حیات ہیں۔ خدا انہیں اچھا رکھے کہ ان کی وجہ سے ہمارا سفر پر لطف رہا۔

میسور کے اسٹیشن پر اترتے ہی دو چار ہوٹل والوں نے ہمیں گھیر لیا کہ ان کے ہوٹل کو چلیں! ہم نے "ومنی کیتل" کے "آنند بھون" کی تعریف سنی تھی سیدھا وہاں پہنچے !! ہوٹل کے کمرے نہایت نفیس اور آرام دہ تھے جگہ بھی بڑی پر فضا تھی مگر یہاں ایک دو دن بھی چین سے رہنے نہ پائے تھے کہ منیجر نے کمرے خالی کرنے کے لئے کہا۔ وجہ پوچھی تو بتایا کہ ہمارے ساتھ "دق" کا بیمار ہے ہم نے کہا بیمار کو "دق" ہونا کس نے بتایا؟ اس نے جواب دیا خود بیمار نے ! جس طرح ناٹک میں مار مار کر جبراً حکیم بنایا جاتا تھا اسی طرح ہمارے برخوردار بیمار نے خود کو "دق" کا بیمار بنا لیا !! ہزار اس کو سمجھایا کہ بھئی دق وق کچھ بھی نہیں ہے صرف ہلکا بخار کبھی رہتا ہے کبھی نہیں رہتا۔ تبدیل آب و ہوا کی غرض سے آئے ہیں مگر اس نے ہرگز یقین نہیں کیا۔ مجبوراً ہوٹل چھوڑنا پڑا !

بڑی تلاش و جستجو کے بعد مارکٹ کے قریب ایک ہوٹل میں اچھا کمرہ مل گیا' گو یہ مقام ویسا پر فضا نہیں تھا۔ ہم نے بیمار کو سخت تاکید کر دی کہ اپنا حال زار کسی کو نہ سنائے' نہ ہوٹل کے منیجر سے دوستی کرے ورنہ یہاں سے بھی کوچ کرنا ہوگا اور یہی رفتار رہی تو ایک دن ہم "خانہ بدوش" ہو جائیں گے۔ اس تقریب میں دو دن بیکار گئے۔ چوتھے دن بیمار کو لے کر ہم سینا ٹوریم پہنچے۔ ڈاکٹر نے بیمار کو بٹھا کر خوب ٹھونک بجا کر امتحان کیا' بجلی سے تصویر بھی لی۔ بجلی کے مشین کے سامنے کھڑا کر کے جسم کے اندر کا حصہ بھی دیکھا۔ خون کا امتحان بھی ہوا اور ان سب امتحانوں کی فیس صرف چالیس روپے ہوئی۔ اپنے وطن کے ہسپتال میں ایسے ہی امتحانوں کے اخراجات جب ہمیں یاد آئے تو یہاں نہیں بلکہ اپنے ہی وطن میں ہم نے "غریب الوطنی" محسوس کی ! صرف بجلی سے تصویریں لینے کی فیس ہم نے اڑتالیس روپے دی تھی۔ اس کے باوجود تصویریں بھی صاف نہیں آئی تھیں۔ غرض کہ یہ سارے امتحان ہونے کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ بیمار کو کوئی مرض نہیں ہے ! نہ علاج کی ضرورت ہے نہ دوا کی !! کوئی چار ہفتے میسور میں رہنے کے بعد بیمار بالکل چنگا ہو گیا ! جان بچی لاکھوں پائے۔ خیر سے اب وہ گھر کو آئے !!

باغبان

[illegible] ادب کے لئے نوبل انعام [illegible]
کا حامل ہے۔ اس ادب نے [illegible] نوبل انعام
حاصل کیا اور دنیا کے مشہور ادیبوں کی صف میں جگہ پائی
وہ مشہور [illegible] جی پیر تھو وہ مشہور
شاعر [illegible] کار دوستی سے کم وجہ کی الگ نہیں" [illegible]

ایک پہاڑی ندی کے بیچ ایک چھوٹا سا ٹاپو ابھرا ہوا تھا
اور اس ٹاپو کے بیچ ایک ننھی سی جھیل تھی، جھیل کیا ایک ہرا بھرا
چاندی کے رنگ کا تالاب تھا، چاروں طرف سے جنگلی ببول کی
جھاڑیوں اور چنار کے درختوں سے گھرا ہوا، لمبی گھنی اور بیگنی رنگ
کے سورج مکھیوں سے جڑا ہوا، گھاس سے گھرا ہوا۔ پت جھڑ
کے دنوں میں آسمان کے بدلتے ہوئے رنگ اور پرچھائیاں اور گزر
گزر جانے والے رنگ برنگ کے بادل، رات کے وقت دمکتا چاند اور
جگمگاتے تارے، جھیل کے گہرے آئینے میں جھانکتے ہوئے چنار کے
کانپتے ہوئے پتے، اس جگہ، اس جھیل کے قریب ایک عجیب سماں
پیدا کر رہے تھے۔

ایک شام کو، شکاری نے جس نے اپنی ناؤ ویرانے ٹاپو
کے ریتیلے ساحل سے باندھ دی تھی اور اچھوتی ریت پر چوڑے
قدموں کے نشانوں کا راستہ بنا ہوا گیا تھا، اس بڑے دمکتے
ہوئے چاند کو چناروں کے بیچ سے نکلتے ہوئے دیکھا اور پھر اس سے
بھی زیادہ حسین روپ میں اسی چاند کو اس نے اس چھوٹی سی
جھیل کے پانی میں دیکھا۔ وہ ایک پل کے لئے رکا۔ اس کی
آنکھیں اس جگہ اور پانی کی تصویر پر گڑی ہوئی تھیں، معلوم ہوتا تھا
آسمان خود ہی زمین کے دل سے نکل آنے کے لئے بے چین ہے،
ایک نئی دنیا بسانے کے لئے۔

ایک بوڑھی مادہ خرگوش نے جو کنارے پر ببول کی
جھاڑیوں میں رہتی تھی، اس کالے آدمی کو، اپنے خوفناک
دشمن کو دیکھا اور وہ بھاگی — ہلکی — لمبی — اور — خاموش
اس کے کان سخت اور یوں کھڑے ہوئے تھے جیسے اس کی
حفاظت کے لئے دو تیز چھریاں ہوں۔

آدمی اپنے خوابوں کی دنیا میں مگن رہا، خرگوش نے
اپنے سپنے کھو دئے لیکن جڑی بھاگی۔ جب وہ جنگل کے بیچ
پہنچ گئی تو ایک گھنی جھاڑی کے اندر دبک کر بیٹھ رہی اور ڈری

[illegible] کا پتی
[illegible] اس قدر
[illegible] تھا
[illegible] جب
ٹاپو کے سارے [illegible] دل مارے
جاڑا بڑا کل کل کرتی [illegible] تھے تو
بوڑھی مادہ خرگوش سمجھتی تھی کہ اس [illegible] اکیلی
مالک ہے اور اپنی زندگی کو [illegible] شان [illegible]
کے دنوں میں جتانے کے پیچھے اس نے [illegible] تھے۔ وہ
بوڑھی تھی اور تھی بھی زندگی سے بالوں۔ بغیر کسی ساتھی
کے اکیلی، تنہا۔ اس کے بچوں نے اسے چھوڑ دیا تھا اور نر
خرگوشوں کو اب اس کی چاہ نہ تھی۔ ٹاپو کے ایک سنسان
کونے میں وہ بہت آسانی سے، نہایت اطمینان سے بالکل
خوف خطرے کے رہ سکتی ہے۔

بسنت کے دنوں میں جب باڑھ آئی تھی وہ ان پیڑوں
کے تنوں میں رہی تھی جو اس چھوٹی سی جھیل کے اوپر اونچے
کناروں تک بہہ کر آ گئے تھے۔ ٹاپو کے اس دلدلی اور
ریتیلے حصہ کو پار کرنے کی کسی کو ضرورت کیوں ہونے چلی تھی
اور بعد میں جب ریت خشک ہو گئی اور جھیل کے کنارے
پر گھاس اگ آئی، تب بھی شکاری بھی ٹاپو پر گئے اور نہ ہی گیری۔
مکمل امن — اور — خاموشی ...... صرف بلبلیں ہی
چنار کے لمبے درختوں میں، بہتے پانی کا استقبال کرتی ہوئی،
پتوں کی کھڑکھڑ تال کے ٹھیک پر گا رہی تھیں۔ پتوں نے
چاند کی حسین کرنوں میں نہاتے ہوئے کہا:—

"الوداع پانی! کھڑے رہنے سے دوڑنا اچھا ہے"
اور پانی نے سمندر کی طرف دوڑتے ہوئے کہا —
"الوداع ہمیشہ کے لئے! سدا دوڑتے ہی رہنے سے کھڑا رہنا اچھا ہے"
اور بوڑھی مادہ خرگوش نے سنا۔ وہ اپنے آپ میں مگن تھی،
اس نے اپنے کو پیڑوں سے زیادہ مضبوط اور پانی سے زیادہ
خوش نصیب سمجھا کیونکہ اسے اطمینان تھا کہ وہ اپنی خوشی
کے موافق دوڑ اور کھڑی رہ سکتی ہے۔

جیتے جیتے بلبلیں خاموش ہو گئیں اور چناروں کی [illegible]

[illegible] مادہ خرگوش نے زندگی میں
[illegible] تھا مگر — اب —
[illegible] پھر سے آگیا اور بلا دہ
[illegible]

[illegible] کے اندر دبکی پڑی رہی اور اس کی
آنکھیں [illegible] لال پلکوں کے اندر سے اس دور تک
[illegible] ریت کا پھیلاؤ دیکھ سکتی تھیں جو جھاڑیوں
سے بنا ہوا تھا — ایک طرح کا کھلا میدان، جہاں وہ بھی
اپنی جوانی کے [illegible] دنوں میں اچھلتی کودتی تھی اور اپنی ہی
پرچھائیں کا پیچھا کیا کرتی تھی ان راتوں کو، جب چاند خوب تیز
چمکتا ہوتا، اپنے محبوب کا انتظار کیا تھا۔

ریت پر ایک پرچھائیں جھولتی تھی اور پھر دوسری،
بوڑھی مادہ خرگوش نے سوچا کہ وہ یقیناً ایک خواب ہی
دیکھ رہی ہے، لیکن پرچھائیاں پھر لوٹ آئیں، رکیں
اور پھر اپنا طلسمی کھیل جاری کردیا۔ اس بارے میں
کوئی بھول اس کی نہ تھی۔ وہ دو خرگوش تھے اور تب
اس بوڑھی نے جان لیا کہ کیوں اس کا کالا دشمن،
شکاری، رات کو ایک بار پھر ٹاپو پر آیا ہوا تھا۔ شکاری
نے مار ڈالا تھا۔

ایک بچہ اپنے بھائی کے سر اور کان کو چاٹ رہا تھا۔
جب اس کی نظر بوڑھی مادہ خرگوش پر پڑی اس نے اسے
غور سے دیکھا۔ اپنی ناک باہر کو نکالی اور پھر اپنی جرأت پر
خوف زدہ ہو کر وحشت کھا کر، اسے پھر اندر سکیڑ لیا۔
بوڑھی خرگوش اپنی راہ گئی لیکن کچھ دیر بعد پھر واپس
آئی اور اس نے دونوں غریب خرگوش کے بچوں کو ساتھ
کھیلتے اور ایک دوسرے کو چاٹتے دیکھا۔

وہ ایک اداس ٹھنڈا دن تھا، لگ بھگ شام
کے بادل ہونے لگی اور بوڑھی مادہ خرگوش پھر اپنی پرانی
جھیل کے اونچے کناروں پر، پیڑ کے تنے والے گھونسلے کو
لوٹ گئی۔ بارش ہوتی رہی اور ہوتی رہی لیکن بوڑھی
مادہ خرگوش کو اور کوئی زیادہ اداسی محسوس نہیں ہوئی۔
اس کے نزدیک بارش کا مطلب اچھے موسم کا خاتمہ ہوتا تھا۔
جلد ہی ریت پھر دھنسنے کے قابل ہو جائے گی اور پھر کوئی
شکاری، مکھیلے، سپاٹ جنگل کو پار کرنے کی ہمت نہیں
کرسکتا۔

اور ان بے چارے خرگوش کے بچوں کا کیا ہوگا؟
ان کے اس چھوٹے سے کھوکھلے میں ان پر کیا بیتے گی؟
کیا اس بوڑھی مادہ کو خود اپنے ننھے بچوں کا، ان کے
گھونسلے کی گرمی، اپنی بڑھتی ہوئی امنگوں کا یکایک
خیال آگیا؟ یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن سویرے کے
وقت اس نے اپنی چھپنے کی جگہ چھوڑی اور ان خرگوش
کے بچوں کو پھر دیکھنے گئی۔ وہ بے چارے ننھی سی
جانیں سو رہی تھیں ایک پر دوسری، لیکن نیند میں بھی وہ
ضرور ہی اپنی ماں کا انتظار کرتے رہے ہوں گے کیونکہ
جب وہ بوڑھی مادہ ان تک آئی، انھوں نے اپنی
ناک بڑھائی اور اپنے ذرا ذرا سے کان ہلائے اور
بوڑھی مادہ نے انھیں اپنی بڑی چمکیلی آنکھوں سے
دیکھا اور اس نے بھی اپنی ناک بڑھا دی گویا وہ گھونسلوں
کی بو سونگھ رہی ہے۔

بارش پھر سے ہونے لگی آٹھ دن اور آٹھ رات،
کہر اور مینہ کا ایک تھوڑا سا پردا ٹاپو کو گھیرے اور
ڈھنکے رہا۔ جھیل، کالی چمکتی ہوئی سیاہی سے بھری
نظر آنے لگی اور پانی چڑھتا رہا اور چڑھتا رہا یہاں تک کہ
آخرکار اس نے بوڑھی مادہ کے جسم کو چھو لیا۔ اس نے
لوٹ کر، ان خرگوشوں کے بچوں کو پھر دیکھنے کی کوشش
کی تھی لیکن اس کے قدموں کے پاس کی ریت بہت
جگہوں پر اندر دھنسنے کو تھی اور پانی سے بالکل
دلدلی ہو رہی تھی اس چھوٹی سی ترائی تک پہنچنا اس کے
لئے بالکل ناممکن تھا۔ پانی برستا رہا اور برستا رہا
اور دوری پر اس علاقے سے گزرتی، سب کو تہس نہس

کرتی، اپنی قوت پر نازاں سستاتی ہوئی کوئی چیز آ رہی تھی بالکل ویسے ہی جیسے کسی چڑھائی کرنے والے کی فوج ہو۔

بوڑھی مادہ خرگوش اس آواز کو، اس چیز کو اچھی طرح جانتی تھی، وہ فتح اور کامیابی کے ساتھ دوڑنے والی ندی کی آواز تھی۔ اسے اپنی جگہ چھوڑنے کی ہمت نہ ہوئی اور ساتھ ہی بھوک اسے ستا رہی تھی اور اس کے پاس کھانے کے لئے کچھ سوکھی پتیوں کو چھوڑ کر اور کچھ نہ تھا۔ ایک دن اسے فاقے سے بھی رہنا پڑا کیونکہ پانی بالکل تنوں تک پہنچ گیا تھا اور اس وقت ذرا بھی ہلنا جلنا خطرناک تھا۔

بھورا اور ایک رنگ کا لالپانی چڑھا اور زیادہ بڑھا، زمین اور آسمان اور دیوانی ہوا سب ٹھنڈے ہو گئے تھے اور گندے پانی کا ایک ڈھیر سا ہو گیا تھا۔ لیکن آٹھویں دن کی شام کو پانی رکا اور اچانک بادل پھٹ گئے۔ پھر کو چیر کر، یہاں وہاں، ہرا نیلا سا آسمان نکل آیا اور بادلوں کی اوٹ سے، دھند کے کی گہرائیوں میں سے چاند کا چہرہ دکنے لگا۔

پانی نیچے ہٹا، گویا اپنی فتح پر نازاں اپنی موجوں میں پتیوں، شاخوں، ریت اور مردہ جانوروں کو چھوڑ کر واپس چلا گیا ہو۔

دوسرے دن سورج نے [illegible] اپنی روشنی پھینکی اور غریب [illegible] سے دھوپ مادہ خرگوش نے اپنے جسم کو [illegible] اور سینے کو گرم کیا اور چاروں طرف کی سیر کی۔

ننھی سی جھیل کا پتہ نہ تھا [illegible] چھوٹا سا گدلا نالا اس اونچے کگار کے نیچے شور کرتا بہا جا رہا تھا، جو کہ ایک بندھ کی طرح کھڑا ہوا تھا وہ اپنی لوٹ اور اپنے شکاروں کو بہا ہی لے گیا — اور یکایک سوکھی ٹہنیوں اور سوکھی پتیوں اور ایک ٹوٹے ہار کے دانوں کی طرح بالکل بلبلوں کے بیچ ہی مادہ خرگوش نے ان دو ننھے خرگوش کے بچوں کو دیکھا۔ مرے ہوئے، لمبے اور پھیلے، ان کی آنکھیں پھیلی ہوئی اور کان تنے ہوئے تھے۔ وہ پانی پر دوڑ رہے تھے اور دوڑتے رہے، دو اچھے نادان بچوں کی طرح جو موت کے بعد بھی ایک دوسرے کو پیار کرتے تھے۔

اب بوڑھی مادہ خرگوش ٹاپو پر سچ ہی اکیلی تھی —

(ترجمہ۔ ہندی سے)

وحید یوسف زئی

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

دو گھنٹے

گھنٹی بجی، ہم سب دو گھنٹوں کے لیے پھر روم میں داخل ہوئے۔ [illegible]
گونجنے لگی، ہماری نظریں آواز کی طرف اٹھ گئیں ——— [illegible]
فضا جھنک رہی تھی —— دیکھیں کون آرہے ہیں — اچھا! آپ ہیں — [illegible]
اوہو، شاعر صاحب —— ارے یہ کون؟ کون! جانتی نہیں۔ نہیں تو —— اچھا اب [illegible]
شمشاد کو واقعی پسینہ آگیا۔ نجمہ نے شمشاد کے بازو چٹکی لی، کیوں اب پہچان لیا نا۔ [illegible]
شمشاد کا چہرہ لال گلال ہوگیا۔ ہٹ، ہر وقت ایسی ہی باتیں۔ واللہ کیسے رنگین مزاج [illegible]
پائی ہے۔ آپ کے انداز قدم تو ملاحظہ ہوں —— قہقہے —

نجمہ نجمہ مجھے دیر تو نہیں ہوگئی۔ کیا ابھی تک پروفیسر نہیں آئے۔ گلاب گھڑی دیکھتے ہوئے بولی،
اوہو، اب آئی ہیں۔ کہاں دیر لگا دی تھی۔ تیوری پر بل ڈال کر نجمہ نے رقیبانہ انداز میں کہا۔ دیکھی
ساڑی کی بہار۔ شفق کو بھی مات کر رہی ہے۔ چھیڑتے ہوئے کملا بولی —— گلاب کا سانس پھول رہا تھا
وہ قدرتی طور پر موٹی تھی۔ اس کا رنگ گلاب جیسا سرخ تھا۔ جب وہ تیز چلتی تو ہانپنے لگتی۔ گلاب کو اس
حال میں دیکھ کر اس کی سہیلیاں ہنسنے لگتیں۔ کلثوم تو ہر وقت گلاب کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ کلثوم نے
آہستہ سے کملا کے کان میں کچھ کہدیا۔ کملا ہنس پڑی، کملا نے نجمہ کے کان میں بھی وہی بات کہہ دی۔
سب سہیلیاں ہنسنے لگیں۔ گلاب دیوانوں کی طرح ہر ایک کا چہرہ تک رہی تھی —— "آخر کچھ تو
جانوں۔ تم سب ہنس کیوں رہی ہیں؟" گلاب بولی، اس جملے پر اور بھی قہقہے پڑے۔ "ہائی ڈیر گلاب۔ تجھے
دیکھ کر میرا دل انار کھانا چاہتا ہے،" کملا بولی، اب تو گلاب کالج بھر میں انار کلی کے نام سے مشہور ہوگئی۔

اس دلچسپ محفل سے دور ثریا پھولوں کے تختے کے قریب کھڑی، سر کے بال الجھا رہی تھی۔ چند ماہ سے
ثریا نے اپنی تمام سہیلیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ ثریا سنجیدہ لڑکی تھی، کملا ہر وقت ثریا کو
بنایا کرتی تھی، ثریا کو یہ بات پسند نہ تھی۔ باتوں باتوں میں ثریا اور کملا میں جھڑپ ہوگئی۔ سہیلیوں نے
بھی کملا کا ساتھ دیا۔ ثریا نے اپنی سہیلیوں سے بائیکاٹ کر رکھا تھا —— تنہائی میں ثریا کو سوائے سر کے
بال الجھانے کے اور کوئی کام نہ تھا ——— کئی ماہ بعد آج کالج کھلا، کملا اور دوسری لڑکیاں
کامیاب ہوگئی تھیں، ایک زمانہ بعد جب سب کی سب ملیں تو دل کے سوئے ہوئے خواب بیدار ہو
ایک دوسرے کو دیکھ کر خوشی کی بجلیاں رگ رگ میں کوندنے لگیں — اب بھی ثریا کے دل کا ناسور ہرا تھا۔
وہ اپنی تمام سہیلیوں سے علٰحدہ کھڑی کچھ سوچ رہی تھی، کملا کا دل صاف تھا وہ لڑتی تھی اور بہت جلد
سہیلیوں کو منا بھی لیتی تھی، آج ثریا کو منانے کا اچھا موقع تھا۔ آہستہ سے کملا ثریا کے پیچھے کھڑی
ہوگئی۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے ثریا کی آنکھیں بند کر دی، دوسری لڑکیاں بھی ان کے اطراف جمع ہوگئیں۔
قہقہے برسنے لگے، وہ دستے ثریا تلملا اٹھی، چند لمحوں کی کش مکش کے بعد کملا نے اپنا ہاتھ ثریا کی آنکھوں سے
ہٹا لیا۔ دونوں میں پھر دوستی کی پینگیں بڑھنے لگیں —— نجمہ کی نظریں ثریا کے قیمتی لباس پر تھیں —
ثریا انگوری رنگ کا دوپٹہ اور سلمہ ستارے والے بلاؤز کو دیکھ کر نجمہ کی آنکھوں میں تارے جھلملانے لگے

[illegible] اس ڈوپٹہ کا رنگ کتنا پیارا ہے۔ کیوں فریدہ۔ کتنا پیارا [illegible] وہی اپنی دیوانی باتیں۔ نجمہ، تجھے زندگی میں سوائے رنگ، قیمت، دکان [illegible] جب دیکھو، اہا کتنا پیارا رنگ ہے، کتنا قیمتی لباس ہے، کہاں سے [illegible] رہا ہے، یہ کیوں نہیں کہتی کہ خریدنے کی سکت نہیں ہے، جمیلہ نے فریدہ پر طعن کی۔ [illegible] آگ سی لگ گئی، جمیلہ میں تجھے جانتی ہوں، مکار، دسترخوان کی بلی، غصہ سے فریدہ [illegible] دیا — کیا ڈھڑنگا رکھی ہے، کوئی کام بھی کرنے دوگی یا یوں ہی بک بک کئے جاؤگی، [illegible] ہوئے فہمیدہ بولی — اچھا اب مینڈک کو بھی زکام ہونے لگی۔ بڑی آئی پڑھنے والی فہمیدہ کی [illegible] بند کرتے ہوئے کملا بولی۔ ایم اے میں فہمیدہ نے فلسفہ لے رکھا تھا، جب دیکھو بغل میں موٹی موٹی کتابیں [illegible] پر موتی سی عینک، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے — علم کے ذوق شوق نے فہمیدہ کو عجیب وغریب فہمیدہ بنادیا تھا۔ سوسائٹی، ہنسی مذاق، سے وہ ہمیشہ بیگانہ رہی، شاید ہی کسی نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی ہو، جب دیکھو ہاتھ میں پنسل، نوٹ بک اور سامنے کھولی ہوئیں بڑی بڑی کتابیں، فہمیدہ کے اس دیوانے مطالعہ سے دیکھنے والوں کی آنکھیں دکھ گئی تھیں، کملا کو فہمیدہ کے اس مطالعہ سے چڑ سی ہوگئی تھی، جب کبھی فہمیدہ کوئی کتاب پڑھتی تو کملا اس سے نوٹ بک کھینچ لیتی، کتابیں بند کردیتی اور پنسل سے کھیلنے لگتی، کملا کی ان حرکتوں پر فہمیدہ تلملا اٹھتی، غصہ سے کانپنے لگتی، کئی بار کالج کے برانڈے میں ان دونوں میں خوب نوک جھونک ہوئی، لیکن کملا کبھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی، جب کبھی فہمیدہ غصہ سے نیلی پیلی ہوجاتی تو کملا مسکراتے ہوئے اس کے قریب آتی، اپنی باہیں فہمیدہ کے گلے میں حمائل کرکے کہتی "ڈیر فہمیدہ تو اس حال میں مجھے کتنی پیاری معلوم ہوتی ہے" [illegible] فہمیدہ مسکرادیتی۔

ادھر نجمہ اور ثریا میں سینما جانے کی تیاریاں ہورہی تھیں، ثریا انگلش پکچر کی دیوانی تھی، ثریا کی ساتھ داری نے نجمہ کو بھی سینما بینی کا چسکا لگا دیا تھا۔ موٹر نجمہ کی ہوتی اور ٹکٹ ثریا کے — نجمہ سنا ہے کہ گریٹا گاربو کا پکچر آیا ہوا ہے، چلوگی، نجمہ کی پیشانی خوشی سے چمکنے لگی، سچ — تو پھر کملا کو بھی لے چلو، کیوں کملا تیار ہے — ہاں ہاں، کیوں نہیں، ایسے دکھانے والے مل جائیں تو انکار کیسے ہوسکتا ہے، — "ہم بھی دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں، عینک درست کرتے ہوئے فلسفی فریدہ بولی — ارے یہ زاہد خشک کیسے ٹپک پڑے، سب لڑکیوں نے ہنسنا شروع کیا۔ کملا نے موٹی موٹی کتابیں فریدہ کے سامنے رکھ دیں، اور کہنے لگی، بی فلسفی کہاں کا کھیل، کیسا تماشا، تمہاری دلچسپی تو گوئٹے، نطشے، شوپن ہاور میں دفن ہے، کانٹ کا فلسفہ چھانتی رہو، کہاں تم اور کہاں یہ پیار، محبت کی باتیں، توبہ توبہ — نجمہ، جمیلہ، ثریا سب کی سب ہنسنے لگیں، واللہ اچھا پارٹ ادا کیا، کمال ہی کردیا، میں کہتی ہوں کہ تو کسی فلم کمپنی میں شریک ہوجا — نقال کہیں کی۔ یہ ہے اسی کام کی، فریدہ نے چوٹ کی۔ [illegible] کیا طے ہورہا ہے، آخر ہم بھی تو سنیں، اچھا سینما جانے کی تیاریاں ہونے لگیں، ہم بھی دیکھیں [illegible] جاتے ہیں۔ سنا نہیں، آج ریڈیو پر ریحانہ کا افسانہ نشر ہورہا ہے۔ [illegible]

اس کے ہاں کھانا ہے۔ نزہت بولی' یہ سنتے ہی سب کی خوشیوں پر اوس سی پڑ گئی۔ [illegible] نہیں کل جائیں گے' ہونٹ لٹکائے ہوئے ثریا نے کہا'

یہ ریحانہ کو کیا ہو گیا۔ کالج کیوں نہیں آ رہی ہے' بجو تجھے تو معلوم ہو گا۔ بتا' بات کیا ہے' فہمیدہ انگڑائی لیتے ہوئے بولی' سنا ہے کہ اس کی شادی ہو رہی ہے ——— آپ بتائیے کب [illegible] سے رنگے جا رہے ہیں۔ کملا بولی ——— مہندی کا نام سنتے ہی فہمیدہ کے کانوں میں شہنائیاں بجنے لگیں' نظروں کے سامنے تاج محل جگمگانے لگے۔ مسرت بھری زندگی کا دلفریب تخیل دماغ میں گھومنے لگا ——— ابھی تک پروفیسر نہیں آئے! بات بدلتے ہوئے فہمیدہ بولی ——— بھاگو بھاگو پروفیسر آ گئے' فریدہ چلا اٹھی'

کھٹ پٹ' کھٹ پٹ کرتی ہوئیں' لڑکیاں اپنے لکچر روم میں داخل ہوئیں' چند لمحوں کے لئے خاموشی طاری ہو گئی' تعظیم کے لئے لڑکے اور لڑکیاں اٹھ گئیں' لڑکیوں کے چہروں سے علم کے چشمے ابل رہے تھے' ان کی آنکھیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں ہم نے علم کے میدان میں قدم رکھا ہے ہم کو لڑکوں کا مقابلہ کرنا ہے' ہم کو انھیں نیچا دکھانا ہے۔ خواہ مخواہ مردوں نے اپنا سکہ جما رکھا ہے' زندگی کے ہر شعبہ میں ان کو نیچا دکھانا ہو گا ——— بہار زندگی کی ان نو شگفتہ کلیوں کو دیکھ کر پروفیسر کے مرجھائے ہوئے چہرے پر اطمینان اور مسرت کی لہر دوڑ گئی' ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔

پروفیسر کے چہرے کو دیکھ کر لڑکیاں سہم گئیں' ان کے وہ ولولے اور وہ [illegible] کچھ دیر کے لئے دب گئے وہ بید کی طرح کانپنے لگیں' جب کبھی پروفیسر کوئی سوال کرتے' ادھر سے خاموشی کے سوائے کوئی جواب نہیں آتا۔ ادھر لڑکوں کے قہقہوں سے فضا گونجنے لگتی' لڑکیوں کی خود داری نے اپنا زور دکھایا۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ آخر ہمت کرکے ایک لڑکی نے اپنی سہیلیوں کی وکالت کا ذمہ لیا۔ اس نے اپنا اور اپنی سہیلیوں کا تعارف کر دیا ——— "آپ میں سے اول کون آئی ہیں؟" پروفیسر کی آواز کمرے کی فضا میں تیرنے لگی۔ لڑکیوں کی قطار سے جی جی کی سرگوشیاں فضا میں گونجنے لگیں' ادھر سے قہقہے ابلنے لگے ——— "جی یہ آئی ہیں" ہمت کرکے ایک لڑکی بولی' پروفیسر لکچر دے رہے تھے' ادھر اور ادھر باتیں ہو رہی تھیں ——— یہ کیا ہو رہا ہے۔ میز پر مکا مار کر گرجدار آواز سے پروفیسر نے پوچھا۔ لڑکیاں اپنی جگہ سے اچھل پڑیں ——— ڈرتے ڈرتے ایک نے کہا' جی۔ آج مضمون کا دن تھا ——— آج مضمون کا دن ہے! کیا آپ لڑکیوں نے مضمون لایا ہے' پروفیسر نے پوچھا "ہاں لایا ہے" پروفیسر کی نظریں لڑکوں کی طرف اٹھ گئیں ——— کیا آپ لوگوں نے بھی لایا ہے ——— بڑی مصیبت میں پھنس گئے' ان لڑکیوں کو خدا سمجھے' اب کیا کہیں ——— بیٹھے بیٹھے لڑکوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک کونسل کر ڈالی ——— ایک صاحب اٹھے اور پروفیسر سے لڑکیوں کے مضامین سننے کی خواہش کی' پروفیسر موقع ہی ڈھونڈھ رہے تھے' کسی نہ کسی طرح سے لڑکیوں کے مضامین سنا کر لڑکوں کو غیرت دلائیں۔ پروفیسر نے عینک درست کی' مضامین پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور اپنے نپے تلے الفاظ میں تنقید کرتے ہوئے کہا

[illegible] مضمون ہے، ابھی مضمون کی دو چار سطریں بھی ختم نہ ہوئی تھیں کہ ایک صاحب نے مضمون [illegible] میں بھیجنے کی فرمایش کی اور کہا فی الحال ہمارے سیاسی لیڈروں کو غیرت کی سخت ضرورت ہے، [illegible] دوالیں طرف سے خوب قہقہے پڑے "وہاں" کے عنوان کا ایک اور مضمون فضا میں لہرانے لگا۔ [illegible] سنتے ہی میرے تخیل میں غالب کا ایک شعر گھومنے لگا ——— ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی ——— واقعی میں کہاں ہوں میں دیوانوں کی طرح اپنے اطراف دیکھنے لگا —— میرے سیدھے بازو چند لڑکے بیٹھے ہوئے تھے، دائیں بازو لڑکی کا ایک چھوٹا سا خوبصورت گروہ تھا۔ سامنے ایک کالا تختہ اور اسٹیج پر پروفیسر کا مرجھایا ہوا چہرہ، فضا میں ہنسی، قہقہے، سرگوشیاں اور حسین آوازیں۔ یہ وہاں تھا جہاں مجھے سب کچھ میسر تھا۔ مضمون شروع ہوا اور ختم بھی، لیکن میں تخیلات کی دنیا میں کچھ اس طرح بھٹک رہا تھا کہ مجھے اپنی حماقت کا اس وقت احساس ہوا جب کہ ایک نیلا کاغذ پروفیسر کی انگلیوں میں پھیلنے لگا۔ کاغذ کی رنگینی اور خوش خطی کو دیکھ کر میرا ذوقِ تجسس پرواز کرنے لگا۔ میری دلچسپی خط کی رنگین عبارت آرائی کی طرف تیز ہونے لگی ——— مضمون اب شروع ہوگیا —— پروفیسر نے بٹوا کھولا، گلوری ہونٹوں میں دابی، اچٹتی ہوئی نظر سے ہمیں دیکھا اور اپنی نشست کا رخ بدلتے ہوئے مضمون کا عنوان پڑھا۔ جس کا مجھے بڑا اشتیاق تھا، میرے ایک ساتھی نے اس زور سے چھینکا کہ عنوان چھینک کی زد میں بہہ گیا۔ تب کچھ بھی سن نہ سکا۔ میں نے صرف اتنا سنا۔

"بارش کے دن تھے، تاریک راتیں تھیں، ہم کو ایک طویل سفر درپیش تھا۔ میں، دادی، امی اور بھائی سب کے سب موٹر میں بیٹھ گئے، امی کہتی رہیں، لمبا سفر ہے، رات کا وقت ہے، صبح سے سفر شروع کیا جائے تو مناسب ہے، ابا ضدی تھے، اپنی ہٹ پر اڑے رہے۔ ابا کو اپنے پستول پر بڑا ناز تھا۔ انھوں نے اپنے اس پستول کی ہمت پر بڑے بڑے خطرناک سفر کئے تھے .... یہ سفر ان کے لئے کوئی بات نہ تھی۔ مجھے تو سفر کے نام سے خوشی ہوتی۔ خوش کیوں نہ ہوتی۔ مجھے اپنی پرانی سہیلی ذکیہ سے ملاقات کی زمانہ سے آرزو تھی۔ میں تو چاہتی تھی کہ جتنا جلد ہوسکے میں اپنی سہیلی کے ہاں پہنچ جاؤں" ——— واقعی مضمون بڑا ہی دلچسپ تھا۔ الفاظ کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ ہمارا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ ہماری دلچسپی مضمون میں تھی —— ایسے وقت، رنگ رنگ، رنگ گھنٹی بجنی شروع ہوئی۔ پروفیسر نے کاغذ کو میز پر رکھ دیا۔ جانے کی تیاری کرنے لگے،

رات کا وقت تھا۔ آٹھ بجے تھے، میں یوں ہی ریڈیو کا ڈائل گھما رہا تھا۔ ۱۱۱م میٹر پر کوئی لڑکی اپنا افسانہ نشر کر رہی تھی، لڑکی کی آواز کے ساتھ آج کے دو گھنٹوں کی پرلطف زندگی کا سہانا ماحول آنکھوں میں پھر گیا۔ افسانہ ختم ہوا —— میں یوں ہی اپنے کمرے میں لیٹا ہوا ایک حسین خواب دیکھ رہا تھا۔ چاندنی رات تھی چاند آسمان کے سمندر میں ہلکورے کھا رہا تھا۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے میرا دماغ بہکنے لگا۔ میرے دماغ کی چٹانوں سے تخیلات کے حسین ٹکڑے ٹکرانے لگے۔ —— وہی لکچر روم، کھڑکی کھڑکی کے رنگین پردے اسٹیج، میرے ساتھی، ساتھیوں کی دلچسپ اور تیز پرلطف گفتگو کے دل آویز ٹکڑے —— آہستہ آہستہ میری آنکھیں نیند کے بہاؤں سے چھلکنے لگیں۔

سید محی الدین احمد

خواہش

ٹوٹے ہوئے سفینۂ ہستی کی نا خدا — صحرائے زندگی پہ برستی ہوئی گھٹا

پژمردہ دل کی حسرتِ بیدار بھی تو ہے — دل اپنا دے کے دل کی طلبگار بھی تو ہے

مہتاب کی کرن کا سہارا تو ہی تو ہے — دریائے زندگی کا کنارا تو ہی تو ہے

دوشیزگی تو ہی ہے عروسِ بہار کی — صورت تری سحر ہے شبِ انتظار کی

تاروں کی روشنی، گلِ تر کی شگفتگی — تیری جبینِ ناز ہے معراجِ بندگی

تیرا شباب عہدِ جوانی کی آرزو ! — سینے میں تیرے دفن محبت کی آبرو

تو بے حجاب ہوتی ہے بادل کے سائے میں — سوتی ہے زندگی ترے آنچل کے سائے میں

موجوں کے اضطراب کو تجھ سے ملے قرار — عمرِ رواں کے ساتھ ٹھہر جائے آبشار

خوابیدہ ہے فسوں تری نظروں کی گود میں — دل بن کے میں رہوں تری نظروں کی گود میں

آ میری شامِ ہجر کی زلفیں سنوار دے — آ مجھ خزاں زدہ کو پیامِ بہار دے

آ اے چراغِ حسن کہ پروانہ ہو نثار — آ میرے آنسوؤں کو بنا لے گلے کا ہار

آ مدتوں سے ہوں میں ترے انتظار میں — ماتم ہے حسرتوں کا دلِ بے قرار میں

پورا نہ ہو سکا اگر ارمان دید کا
نکلے گا میرے ساتھ جنازہ امید کا

جبریل
(جبل پور)

۱- [illegible] جہاں بانو بیگم - حجم ۲۰۰ صفحے قیمت عہ پتہ دفتر رسالہ شہاب بیرون دبیر پورہ - حیدرآباد دکن
۲- [illegible] (افسانے) از ابراہیم جلیس - حجم ۲۴۰ صفحے قیمت عہ پتہ نفیس اکیڈیمی - عابد روڈ - ″
۳- [illegible] (افسانے) مترجمہ قاضی زین العابدین قیمت عہ پتہ کتبہ علیہ - قاضی واڑہ - میرٹھ
۴- [illegible] (ریڈیائی ڈرامے) از سعادت حسن منٹو - حجم ۲۰۸ صفحے قیمت عہ پتہ اردو اکیڈیمی - لاہور
۵- [illegible] (افسانے) از نورالحسن بی اے ″ ۲۳۱ ″ ″ عہ ″ حیدرآباد بک ڈپو - حیدرآباد دکن
۶- دنیائے قبر [illegible] (ورق کے حالات) از محمود رضویہ حجم ۱۴۶ صفحے قیمت عہ پتہ شعاع اردو دارالاشاعت - کراچی
۷- [illegible] (بادشاہ کا ڈرا) مترجمہ برزوجی فیروزشاہ ″ ۲۶۴ ″ ″ ہیہ ″ نفیس اکیڈیمی - عابد روڈ - حیدرآباد دکن
۸- سلمان [illegible] - از ابوالکلام آزاد - قیمت عہ پتہ ادبستان - موچی دروازہ - لاہور
۹- [illegible] (افسانے) از شیریں ″ عہ ″ کتب خانہ علم و ادب - دہلی
۱۰- تاریخ گجرات - از شمیم احمد - حجم ۱۵۸ صفحے - قیمت عہ - پتہ ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس - الہ آباد
۱۱- تجلیات (مجموعہ کلام) از میر عثمانی - قیمت عہ - پتہ - مکتبہ قصر الادب - آگرہ
۱۲- دلکش [illegible] - مترجمہ - فیروزشاہ تاراپوری حجم ۲۱۱ صفحے - قیمت مجلد عہ
۱۳- جام شکستہ (افسانے) از ایم اسلم - قیمت ﴿ - پتہ کتب خانہ دارالبلاغ محمد نگر میو روڈ - لاہور
۱۴- اجالے سے پہلے (″) از مخدوم سوون - حجم ۲۱۶ صفحے قیمت عہ پتہ اردو محل - معظم جاہی مارکٹ - حیدرآباد دکن
۱۵- دنیا ہماری (″) از پردیسی ″ ۲۴۹ ″ ″ عہ ″ راج محل پبلشرز - جموں - کشمیر
۱۶- پہلو (افسانے) از لطیف اللہ عدیل - حجم ۱۶۲ صفحے ″ عہ ″ محمد امان اللہ خاں معہ نذر علی بلڈنگ - دھوبی اسٹریٹ بمبئی
۱۷- پریشان جلوے (مضامین نظم و نثر) مرتبہ حیات ترین حجم ۲۳۹ صفحے قیمت عہ پتہ عباسیہ اکادمی بغداد الجدید - بہاول پور
۱۸- ادب پارے (ریڈیائی تقاریر) از ضیاء الاسلام حجم ۱۰۹ ″ پتہ حلقہ ادب ۱۳ - اسٹینلی روڈ - الہ آباد
۱۹- شب تاب (مجموعہ کلام) از اسرار الحق مجاز - قیمت عہ - ″ ہندوستانی پبلشرز - اردو بازار - دہلی -
۲۰- مجھے خرید لو - (ریڈیائی ڈرامے) ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″
۲۱- ایک جام اور (ناول) از نواب خواجہ محمد شفیع ″ عہ ″ ″ ″ ″ ″ ″
۲۲- معاہدۂ ہند و برطانیہ از سر سلطان احمد ″ عہ ″ ″ ″ ″ ″
۲۳- قندیل (آزاد نظمیں و غزلیں) از قیوم نظر ″ عہ ″ اردو بک اسٹال لوہاری دروازہ - لاہور
۲۴- تعمیر [illegible] - از محمد شریف چشتی ″ عہ ″ ″ ″ ″
۲۵- اس نظمیں از میراجی - قیمت ﴿ پتہ ساقی بک ڈپو - دہلی
۲۶- پائل (گیت) از سلام - ″ عہ ″ ″ ″ ″ ″
۲۷- [illegible] (نظمیں) از ضیاء الاسلام قیمت عہ پتہ حلقہ ادب ۱۳ - اسٹینلی روڈ - الہ آباد
۲۸- [illegible] اور زنجیریں (مجموعہ کلام) از مخمور جالندھری - حجم ۱۷۲ صفحے قیمت ﴿ پتہ مکتبہ جدید - بیرون لوہاری دروازہ - لاہور
۲۹- شہید و لفین (افسانے) از سیاح سنامی قیمت عہ پتہ نراین دت سہگل اینڈ سنز - لاہور
۳۰- کچھ آثار (افسانے) از انور کمال قیمت عہ ″ ″ ″

اردو شاعری کی خدمت

(از [illegible] الیاس برنی [illegible] شاعری [illegible] کی اطلاع کے لئے شائع کی جاتی ہے)

غالباً آپ کو علم ہوگا کہ اردو شاعری کا ایک جامع انتخاب بترتیب خاص بنام "سلسلۂ منتخبات کلام اردو" ۱۹۴۶ء سے شائع ہونا شروع ہوا اور اس کے تین عنوان مستقل قرار پائے :-

(۱) "معارف ملت" جلد اول، دوم، سوم و چہارم (۲) "جذبات فطرت" جلد اول، دوم، سوم و چہارم (۳) "مناظر قدرت" جلد اول، دوم، سوم و چہارم۔ ہر عنوان کے تحت چار چار جلدیں چار ہی سال میں ۱۹۵۰ء تک شائع ہو گئیں۔ جملہ بارہ جلدوں میں دو سو قدیم و جدید شعرا کا کلام انتخاب شدہ کلام کی شکل میں کم و بیش دو ہزار صفحات پر جمع ہو گیا جو کیفیت و کمیت کے لحاظ سے بہت قابل قدر قرار پایا۔ چنانچہ سلسلۂ مذکور علمی و ادبی حلقوں میں، تعلیمات و جامعات میں اور عام طبقات میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہر جلد کے کئی کئی اڈیشن نکل چکے اور نکل رہے ہیں۔ غرض یہ کہ تا حال پچاس ہزار سے زیادہ نسخے شائع ہو چکے ہیں۔ حالانکہ تجارتی معمول کے پیمانہ پر اس سلسلہ کا اشتہار کبھی نہیں نکلا۔ پہلے اشاعت کا مرکز مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ رہا۔ چند سال سے اس کی اشاعت جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے تعلق سے ہے۔ [illegible] اردو میں ماشاء اللہ جس جس رنگ کی شاعری جس پیمانہ پر ترقی کر رہی ہے اس میں اردو ادب کا نیا دور نظر آتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ بیس پچیس سال میں بہت کچھ قابل قدر کلام شائع ہو چکا ہے۔ مجموعوں میں، رسالوں میں اور بہت کچھ کلام غالباً بیاضوں میں موجود ہے۔ جو آئندہ شائع ہوگا۔ غرض اردو شاعری کا مستقبل بفضلہ امید افزا نظر آتا ہے۔ رہا کلام کا ذوق اور معیار۔ سو یہ ماحول کے بے شمار اثرات سے بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہیگا۔ دوامی یک رنگی ناممکن ہے اور نامناسب بھی کہ فطرت بجائے خود تغیرات کا تسلسل ہے۔

اس دوران میں بعض جوانب سے تقاضا بلکہ ابرام ہوتا رہا کہ بعد کی شاعری بھی سلسلے میں منسلک کر لی جائے تاکہ انتخاب حال تک مکمل ہو جائے۔ ہر سہ عنوانات مذکورہ کے تحت مزید جلدیں ساتھ ساتھ شائع ہوں۔ خود مرتب کا بھی مدت سے یہ خیال تھا۔ لیکن کثرت کار نیز دیگر موانع حائل رہے۔ تاہم اردو کی خدمت ہر حال واجب ہے اور قصد ہے کہ حضرات شعرا اگر اردو کی صلاح و فلاح کی خاطر حسب سابق ازراہ کرم تعاون فرمائیں تو قدیم طرز کے باوجود منتخبات کی مزید جلدیں ترتیب دے دے کر حسب فراغت بالاقساط شائع کی جائیں تاکہ اردو کلام کا انتخاب اس سلسلے کی مدد تک محفوظ ہوتا جائے اور اردو شاعری کی نت نئی نوعیت و وسعت بھی اجمالی شکل میں ملک کے پیش نظر ہوتی رہے انشاء اللہ۔

حضرات شعرا کے تعاون کی وہی شکل ہے کہ اول تو کلام کے مطبوعہ مجموعے عنایت ہوں جو بعد مطالعہ واپس کر دئے جائیں گے یا جن کی قیمت ارسال کر دی جائے گی۔ البتہ ہدیۃً عنایت ہوں تو دوسری بات ہے شکریہ۔ دوسرے جو کلام رسالوں میں متفرق شائع ہوا ہو۔ یا جو بیاضوں میں جمع ہو حسب صوابدید اس کی نقلیں ارسال فرمائی جا سکتی ہیں۔ لیکن وہ واپس نہ ہو سکیں گی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ جو بیاضیں دست بدست وصول ہوں۔ ان کو بعد مطالعہ دست بدست واپس کر دیا جائے۔ توقع ہے کہ مستقل تعاون کے ساتھ کلام کی ترسیل اور منتخبات کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہے گا۔ تازہ بتازہ نو بنو غرض کہ جوں جوں کلام کافی منتخب ہوتا جائے گا۔ معارف ملت، جذبات فطرت، مناظر قدرت ہر سہ عنوانات کے تحت ایک ایک جلد ترتیب پا کر تینوں جلدیں ساتھ ساتھ شائع ہوتی جائیں گی۔ مثلاً ہر سہ عنوان کی جلد ہائے پنجم یا جلد ہائے ششم وغیرہ۔

جو حضرات ازراہ کرم اپنا کلام ارسال فرمائیں۔ اس کے ساتھ اپنے مکتوب میں اجازت طبع تحریر بھی فرما دیں تو بہتر ہو اور اپنے متعلق ضروری معلومات بھی درج فرما دیں۔ یعنی اپنا پورا نام، اپنا تخلص، اپنا وطن یا پتہ، سن ولادت، اگر کچھ کلام شائع ہو چکا ہے تو مجموعوں کے نام اور اشاعت کے مقام تاکہ انتخاب کلام کی صورت میں ضروری معلومات متعلقہ جلد کے ضمیمے میں درج ہو سکیں۔ جن حضرات کا کلام کسی جلد میں شائع ہوگا۔ ان کی خدمت میں متعلقہ جلد کا نسخہ ہدیۃً پیش ہوگا۔ اگر کسی صاحب کا کلام انتخاب میں نہ آ سکے تو ان سے پیشگی معذرت چاہی جاتی ہے اور عدم انتخاب سے خدانخواستہ ان کے کلام پر حرف نہیں آتا۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ مذکورہ کلام کا علمی و ادبی معیار انتخاب کے عام فہم معیار سے بلند ہو۔

جن حضرات شعرا کے پتے معلوم ہو چکے ہیں یا آئندہ معلوم ہوں گے ان کی خدمت میں یہ معروضہ بذریعۂ ڈاک روانہ ہوگا۔ ایسے حضرات اگر دوسرے پتوں سے مطلع فرمائیں تو باعث تشکر ہوگا۔ پھر بھی جن حضرات کے پتے معلوم نہ ہو سکیں ان سے عدم ترسیل معروضہ کی معذرت چاہی جاتی ہے۔ اطلاع ملنے پر وہ خود ہی التفات فرمائیں تو کرم اور بھی زیادہ ہوگا۔ اردو رسائل و اخبارات سے بھی استدعا کی جاتی ہے کہ وہ ازراہ کرم یہ معروضہ یا اس کا خلاصہ بشرط گنجائش شائع کر کے تعاون فرمائیں۔ توقع ہے کہ یہ استدعا کسی نہ کسی حد تک ضرور قبول ہوگی اور صحافت کے ذریعے بھی حضرات شعرا تک عام اطلاع پہنچ جائے گی۔ حامیان اردو کی خدمت میں اردو کے ایک ادنیٰ خادم کی یہ ناچیز استدعا ہے

"گر قبول افتد زہے عز و شرف"

[illegible]

[illegible]

علمی کام کے لئے دے کر امتحان گاہ کی نگرانی کی زحمت اٹھائی۔

مرکز نظام آباد ۸ر دسمبر ۱۹۴۵ء یوم شنبہ سہ پہر کو روانہ ہو کر رات میں سوا نو بجے نظام آباد پہنچا۔ اسٹیشن پر مولوی محمد حسین خاں صاحب معتمد شاخ نظام آباد موجود تھے۔ صاحب ممدوح نے میرے قیام و طعام کا انتظام اپنے گھر پر نہایت ہی فراخدلی و سلیقہ کے ساتھ کر کے میرا ہر طرح خیال رکھا جس کا میں دل سے ممنون ہوں۔

امتحان گاہ کے انتظامات قبل از قبل مدرسہ فوقانیہ میں نہایت عمدگی سے عمل میں لائے گئے تھے۔ ڈرائنگ ہال میں ذکور اور اسی سے متصل ایک وسیع کمرہ میں اناث کی نشستوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ امتحان ۹ر دسمبر ۱۹۴۵ء کو وقت مقررہ پر شروع ہوا اور دوپہر میں زبانی امتحان ٹھیک ۲ بجے سے شروع ہو کر پانچ بجے اختتام کو پہنچا۔ ذکور میں منجملہ (۳۱) امیدواروں کے (۲۶) امیدواروں نے شرکت کی اور اناث میں منجملہ (۲۵) طالبات کے (۲۰) حاضر تھیں۔

صاحبزادہ میرزا احمد علی خاں صاحب مہتمم تعلیمات نظام آباد و صدر مجلس ادارۂ ادبیات اردو شاخ نظام آباد کی ادب نوازی اس بات کا یقین دلا رہی ہے کہ جناب والا کی سرپرستی ادارہ کے لئے ایک فال نیک ہے۔

مولوی سید انیس الحق صاحب صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ نظام آباد بہت زیادہ شکریہ کے مستحق ہیں کہ جناب والا کی عنایت اور مہربانی سے مدرسہ کی وسیع عمارت اور امتحانی ضروریات کی جملہ چیزیں میسر آ سکیں۔

مولوی محمد حسین خاں صاحب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ [illegible] اس شاخ کے معتمد ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے انتہائی مسرت ہوتی ہے کہ صاحب موصوف ادارہ کے حق میں ایک نعمت غیر مترقبہ ہیں۔ خلوص و ایثار اور بلا تفریق مذہب و ملت طلبہ کی تعلیم کا انتظام فرما کر شریک امتحان کراتے ہیں۔ اس کے لئے وہ ہر طرح لائق مبارکباد ہیں۔ اگر ادارہ کی باگ ڈور چند ایسے ہی مخلص کارکنوں کے ہاتھوں میں ہو تو قدم قدم پر [illegible] کامیابی یقینی ہے۔

مولوی غلام احمد صاحب وکیل [illegible] نے نگرانی فرمائی نیز زبانی امتحان کے وقت بڑی مدد فرمائی۔ [illegible] کی خدمت گزاری اور ذوق ادب [illegible] نوجوانوں سے بھی [illegible] آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ مولانائے موصوف کی سعی سے امیدواروں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

مسٹر کاشی ناتھ راؤ کمبال کر وکیل ہائی کورٹ ادارہ کے مخلص معاون ہونے کے علاوہ نادار طلبہ کی اعانت سے دریغ نہیں فرماتے۔ وکیل صاحب کا یہ ایثار قابل تقلید ہے۔

مولوی محمود عالم صاحب سالک مدرس مدرسہ تحتانیہ [illegible] و مولوی عبدالواحد صاحب مدرس مدرسہ تحتانیہ قلعہ نے ہر دو پرچوں میں نگرانی فرماتے ہوئے ہر موقع پر میری مدد فرمائی جس کا دل سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

مولوی عبدالغنی صاحب مدرس مدرسہ تحتانیہ [illegible] نے بھی معہ دو امیدواروں کے امتحان گاہ تک آنے کی زحمت کی۔ امید ہے کہ آئندہ زیادہ سے زیادہ امیدوار متعدد امتحانوں میں شریک کروا کر ادارہ کو شکریہ کا موقع دیں گے۔

مولوی محمود علی خاں صاحب محمود نے مرکز کے ضروری انتظامات میں غیر معمولی دلچسپی لے کر اپنے خلوص کا اظہار فرمایا نیز صاحب موصوف نے محبت آمیز سلوک کو جو شروع سے آخر تک میرے ساتھ روا رکھا گیا میں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔

طبقہ اناث کی صدر نگران کار جناب صفیہ بیگم صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ وسطانیہ نسواں نے باوجود اپنے خانگی مصروفیات کے محض ادارہ کے امتحان کی خاطر [illegible] غیر معمولی دلچسپی لی جس کا دل سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

جناب بھیمہ بائی صاحبہ نے اگرچہ کہ یہ مرہٹی داں ہیں لیکن اردو ادب کی طرف ان کا زیادہ میلان پایا جاتا ہے۔ موصوفہ نے بھی صدر معلمہ صاحبہ کا ہاتھ بٹایا اور ہمیں شکریہ کا موقع دیا۔

[illegible]

مرکز نرمل ہوا [illegible] بذریعہ موٹربس نرمل پہونچا۔ وہاں معزز [illegible] مولوی سید عارف الدین حسن صاحب [illegible] آمد کے منتظر تھے۔ میرے قیام وطعام [illegible] تک معزز سرپرست ادارہ نے [illegible] دولت کدہ پر فرمایا تھا۔ سرپرست صاحب کی [illegible] دلچسپی کی وجہ امتحان گاہ کا انتظام بہترین تھا۔ امیدواروں کی نشستیں بہت ہی اصولی طریقہ پر تھیں۔

امتحان اردو دانی کا آغاز ہوا۔ طبقہ ذکور کے (۲۹) امیدواروں میں سے (۲۳) شریک امتحان تھے۔ تحریری پرچہ ختم ہونے کے بعد زبانی امتحان میں نے خود لے کر نمبرات دئے۔

طبقۂ اناث کی (۷) امیدواروں میں سے (۵) شریک امتحان تھیں جن کا زبانی امتحان اور زنانہ مرکز کی نگرانی محترمہ اہلیہ عبدالحمید صاحب ڈاکٹر حیوانات نے کی۔

جن مقامی عہدہ داروں نے شاخ کی سرگرمیوں میں دلچسپی لی اور ادارہ کی قدر ومنزلت بڑھانے میں اپنے عزیز وقت کو آغاز امتحان سے آخر وقت تک صرف فرمایا اور ضروری انتظامات اور کاروبار امتحان میں شاخ کی اعانت فرمائی ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ مولوی عبدالحفیظ صاحب مددگار مہتمم پولیس
۲۔ ” مظہر الحق صاحب تحصیلدار
۳۔ ” حبیب الرحمن صاحب بی۔ ٹی۔ سی۔ او
۴۔ ” غلام محی الدین صاحب انسپکٹر انجمن امداد باہمی
۵۔ ” عبدالحمید صاحب ڈاکٹر حیوانات

معزز سرپرست ادارہ جہاں بھی رہے اردو زبان کی اشاعت اور ترویج میں سعی بلیغ فرماتے رہے اور اس وقت مقامی ادارہ نے جو بھی ترقی کی وہ معزز سرپرست کی انتہائی دلچسپی ایثار اور جوش عمل کا نتیجہ ہے۔ ایسے مخلص اور با اثر حضرات کی وجہ یقیناً ادارہ کو تقویت پہونچے گی۔

ظہیر الدین احمد

مرکز دوم کنڈہ سمستان دوم کنڈہ میں ادارۂ ادبیات کا یہ دوسرا سال ہے اس عرصہ میں یہاں تین مرتبہ مرکز کا قیام عمل میں آیا اور مجھے دو مرتبہ بحیثیت صدر نگران کار جانے کا اتفاق ہوا۔

اس مرتبہ میں نے دوم کنڈہ میں غیر معمولی انقلاب محسوس کیا وہ یہ کہ یہاں کے رہنے والوں میں سے عموماً ہر شخص کے دل میں اردو تعلیم کے حصول کا شوق موج زن ہے۔

مجھے اکثر امیدواروں سے گفتگو کا موقع ملا۔ بہت ہی سلجھے ہوئے پیرایہ کے ساتھ سلیس اردو زبان میں آئندہ کے لئے اپنے سلسلۂ تعلیم کو جاری رکھنے کے علاوہ انھوں نے ادارہ کی خدمت کرنے کا بھی وعدہ کیا۔

عام طور پر بلا لحاظ پیشہ وعمر ہر شخص کے خیالات میں اس قسم کا بڑھتا ہوا شوق ادارہ کی کامیابی کا بین ثبوت ہے۔ بہرکیف اس لہلہاتے ہوئے باغ اردو کی یہ پرزور ترقی حضرت زور کے لئے مبارک ہو۔ بالخصوص دوم کنڈہ میں ادارہ کی یہ نمایاں ترقی جناب مولوی سید غوث صاحب ڈویژنل افسر و نیز مسٹر لکشمی نارائن راؤ کی جد و جہد کا نتیجہ ہے۔

اغراض و مقاصد ادارہ سے دلچسپی و شغف رکھنے والے ایسے ہی حضرات اگر دوسرے اضلاع اور تعلقات و قصبات وغیرہ کے لئے دستیاب ہوجائیں تو

مسرت توقع بلکہ یقین کامل ہے کہ اس آفتاب ادارۂ
اردو کی شعاعیں ارض مملکت ابد مدت کے کناروں
کو بھی بہت جلد منور کردیں گی۔

اردو عالم و فاضل کی تعلیم کے لئے اساتذہ
کی فراہمی وغیرہ کا مسئلہ فوری توجہ کا محتاج ہے
تاکہ ان امتحانات میں بھی طلبہ کافی تعداد میں
شریک ہوسکیں۔

میں بتاریخ ۸ر ڈسمبر ۱۹۴۵ء مطابق ۵ر بہمن ۱۳۵۵ف
یوم شنبہ بوقت تین بجکر بیس منٹ روز بلدہ
سے روانہ ہوکر اسٹیشن تلمنڈلہ پر شب کے آٹھ بجے
پہونچا۔ اسٹیشن پر جناب لکشمی نارائن راؤ صاحب
منتظر تھے۔ موصوف کے ہمراہ کھاچر کے ذریعہ
مرکز دوم کنڈہ کو رات کے گیارہ بجے پہونچا۔

دوسرے روز یعنی ۹ر ڈسمبر ۱۹۴۵ء کو بوقت
ساڑھے نو بجے امتحان گاہ پہونچا۔ صاحب موصوف
نے نشستوں کا نہایت معقول انتظام فرمایا تھا۔ میں نے
پہلا تحریری پرچہ گیارہ بجے امیدواروں میں تقسیم کردیا
جو ایک بجے ختم ہوا

دوسرا زبانی پرچہ دو بجے سے شروع کیا گیا
جو شام کے پانچ بجے ختم ہوا۔

جملہ چونتیس امیدواروں میں سے اکتیس حاضر
تھے جن میں ایک بی بی سوشیلا بائی بھی شریک امتحان
تھیں۔ پرچہ جات سر بمہر لفافہ میں محفوظ کئے جاکر
روانہ خدمت کئے جاچکے ہیں۔ براہ کرم اس کا اطمینان
فرمالیا جائے۔

جناب لکشمی نارائن راؤ صاحب کا میں ممنون
ہوں کہ موصوف کے قابل ستائش اخلاق کی وجہ
سے قیام وغیرہ میں مجھ کو انتہائی آرام ملا۔

میر باقر علی خاں

شاخوں کے قاعدے اور طریقہ کار

(۱) حیدرآباد سے باہر اگر کسی مقام کے اہل ذوق حضرات
اردو زبان اور ادب کی توسیع و اشاعت کی غرض سے
کوشش کرنا چاہتے ہوں تو ادارۂ ادبیات اردو کے معتمد
کے نام پانچ علم دوست اصحاب کے دستخطوں کے ساتھ ایک
خط روانہ فرمائیں تاکہ قیام شاخ کے لئے اجازت نامہ
بھیجا جائے۔ اس فارم کو بعد خانہ پری واپس کرنے پر
معتمد صاحب مذکور ادارہ کی مجلس انتظامی سے منظوری
حاصل کرکے قیام شاخ کی اطلاع دیں گے اور اس سلسلہ
میں ضروری کارروائی کریں گے۔

(ادارہ کی شاخوں کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں)

۱۔ ادارہ کے اردو امتحانات کا چرچا کرنا۔
۲۔ امتحان اردو دانی کے لئے مفت تعلیم کا انتظام کرنا
۳۔ اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات کی تعلیم
کے لئے معاوضہ کے ساتھ انتظام کرنا۔
۴۔ اردو مطالعہ خانہ قایم کرنا۔
۵۔ سب رس کے لئے قلمی معاون اور خریدار فراہم کرنا
۶۔ ادارہ کے قواعد کے تحت اپنے ارکان بنانا اور
جمع شدہ رقم میں سے نصف صدر ادارہ کو روانہ کرنا اور
نصف سے اپنی شاخ اور مطالعہ خانہ کے اخراجات کا
انتظام کرنا۔
۷۔ شاخیں سب رس کے جو خریدار فراہم کریں گی
ان کے چندے کا ایک چوتھائی حصہ ادارے کی جانب
سے بطور امداد اخبارات و رسائل کی صورت میں شاخوں
کو دیا جائے گا۔
۸۔ ہر شاخ کے دارالمطالعہ کے لئے ادارے کی
تمام مطبوعات کا ایک ایک نسخہ نصف قیمت پر دیا جائے گا اور
شاخوں کی کوشش سے جس قدر مطبوعات فروخت ہوں گی ان پر
۱/۸ کمیشن شاخوں کو دیا جائے گا۔
۹۔ ان کے علاوہ شاخوں کے مزید قواعد و ضوابط جو
جو ادارۂ ادبیات اردو کے مطبوعہ کتابچہ میں درج ہیں

ادارہ کی مطبوعات دوسروں کی نظر میں

اشوک اعظم :-

بچوں کے لئے یوں تو ہر صوبے سے کتابیں شائع ہوتی ہیں اور ان میں تعلیمی پہلو بھی خاصا نمایاں ہوتا ہے لیکن صحیح معنوں میں جو کام حیدرآباد نے کیا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہے۔ یہ سلسلہ جہاں بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھتا ہے وہاں ان کی تعلیم اور تاریخی واقفیت کو ترقی دینے میں تمام دوسرے صوبوں کے ادب پر سبقت لے گیا ہے۔ اشوک اعظم ہندوستان کی تاریخ میں ایک بہت ممتاز اور زندۂ جاوید حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی زندگی اور حکومت کے واقعات بہت آسان اور شستہ زبان میں لکھے گئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ والدین اور اسکولوں کے لائبریرین اس کتاب کی سرپرستی قبول فرمائیں گے۔ صفحات ۴۸ قیمت ۱۰/

ہمایوں لاہور۔ جولائی ۱۹۴۵ء

اشوک اعظم کے نام سے ہندوستان کا ہر تعلیم یافتہ شخص بخوبی واقف ہے۔ اشوک کے کتبے اور فرامین مشہور ہیں جو اس نے جگہ جگہ میناروں پر کندہ کرائے تھے۔ اس رسالہ میں جو سید مہدی جعفری حیدرآبادی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اشوک اعظم کے آباو اجداد، اس کے طریقۂ حکومت، مذہبی تبلیغ و اشاعت، فرامین، کتبہ جات، نظم و نسق، عمارات وغیرہ پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے اور خوب لکھی گئی ہے جس سے بڑے بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔ کتاب کی عبارت سلیس اور عام فہم ہے۔

زمانہ۔ کانپور۔ اگست ۱۹۴۵ء

حیدرآباد :-

حیدرآباد کی تاریخ اور جغرافیائی نوعیت پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ بچوں کو حیدرآباد کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کرنے کے لئے یہ کتابچہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ قیمت ۱۰/

ہمایوں۔ لاہور۔ جولائی ۱۹۴۵ء

یہ چھوٹی سی کتاب ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کے مطبوعات کی چودھویں اور ادارۂ مذکور کے شعبۂ ادبیات اطفال کے سلسلہ کی پانچویں کڑی ہے جس میں ایک ہونہار خاتون رفیعہ سلطانہ (متعلمہ بی اے عثمانیہ) نے بچوں کو ریاست حیدرآباد دکن اور اس کے متعلقات کی نہایت آسان اور سلیس زبان میں سیر کرائی ہے۔ یہ کتاب کیا ہے گویا ریاست حیدرآباد دکن کی مختصر تاریخ اور جغرافیہ ہے جس میں ریاست کی صنعت و حرفت، پیداوار، طرز معاشرت وغیرہ پر بہت عمدگی اور خوش اسلوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب اس قابل ہے کہ اس کے نمونے پر ہندوستان کے دوسرے ممالک میں بھی بچوں کے لئے درسی کتابیں لکھی جائیں۔ ہم اس عمدہ تصنیف پر مصنفہ کو مبارکباد کی مستحق سمجھتے ہیں۔

زمانہ۔ کانپور۔ اگست ۱۹۴۵ء

سرگزشت حاتم :-

شاہ ظہور الدین حاتم اردو کے ان قدیم شعراء میں سے ہیں جنہوں نے ولی دکھنی کے تتبع میں مستقلاً اردو شاعری کی اور اس کو پروان چڑھایا اور اپنے بعد شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ چھوڑ گئے۔ جنہوں نے اردو شاعری کی انگلی پکڑ کر اسے اور آگے بڑھایا۔ زور صاحب نے اس کتاب میں آپ ہی کے حالات و سوانح خصوصیات کلام اور بعض

اور متعلقہ مباحث پر روشنی ڈالی ہے۔ انداز گفتگو محققانہ ہے۔ مولانا آزاد کے بیانات پر اس ذیل میں خاص تنقید ہوگئی ہے۔ مرحوم حاتم کا مجموعۂ کلام "دیوان زادہ" بھی ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام طبع ہو رہا ہے۔ دیوان زادہ کے ساتھ سرگزشت حاتم کا مطالعہ اردو زبان و ادب کی تاریخ کے طالب علم کے لئے بہت مفید و سودمند ثابت ہوگا۔

برہان - دہلی - بابت جون ۱۹۳۵ء

معلم بالغاں :-

کچھ دن ہوئے نواب مہدی یار جنگ بہادر دارالمہام صیغہ تعلیمات ریاست حیدرآباد دکن نے پبلک میں تعلیم بالغاں سے دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے اسی موضوع پر عمدہ اور بہترین مقالات لکھنے والے حضرات کے لئے انعامات کا اعلان کیا تھا۔ سید زاہد حسین صاحب ایم اے (عثمانیہ) ہیڈ ماسٹر مدرسۂ وسطانیہ مشقی عثمانیہ ٹریننگ کالج نے بھی ایک مقالہ قلم بند فرمایا تھا جس پر فاضل مصنف کو اول انعام عطا ہوا تھا۔ بعد میں اسی مقالہ میں اضافہ کرکے اس کو "معلم بالغاں" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا اور واقعی یہ کتاب اپنے موضوع پر کافی غور و فکر کے بعد لکھی گئی ہے۔ بالغوں کا پڑھانا بھی ایک خاص فن ہے جو اس فن میں مہارت نہیں رکھتا وہ عموماً اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اس کتاب میں بالغوں کو تعلیم دینے کے خاص اصول بتائے گئے ہیں۔ کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔

زمانہ - کانپور - اگست ۱۹۳۵ء

یورپ جنگ سے پہلے :-

۱۹۳۵ء میں یعنی جنگ سے پہلے سوئزرلینڈ کے شہر زیورک میں ایک بین الاقوامی [illegible] منعقد ہوئی تھی جس کے لئے کتاب [illegible] مصنف مسٹر ہارون خاں شروانی نے [illegible] کے عنوان سے ایک اس قدر [illegible] لکھا تھا کہ اسے مبصرین و ماہرین فن نے [illegible] دیکھا اور اس کا کانگریس میں پڑھا جانا [illegible] چنانچہ فاضل مصنف نے کانگریس مذکور میں شرکت کرنے کے علاوہ مشرقی، جنوبی و مغربی یورپ کے اکثر ممالک کی سیر کرکے اکتوبر ۱۹۳۵ء میں ہندوستان واپس ہوئے۔ اس قلیل مدت میں فاضل مصنف نے سواحل عرب، اطالیہ، بحیرہ ایڈریاٹک، یوگوسلاویہ، استنبول یا قسطنطنیہ، ایڈریانوپل یا ادرنہ، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، فرانس، انگلستان، سوئزرلینڈ وغیرہ کے اکثر مقامات کی سیر و سیاحت میں جن باتوں سے آپ متاثر ہوئے وہ آپ نے اس مختصر سفرنامے میں بہت عجیب پیرائے میں درج کردئے ہیں۔ سفرنامہ کا وہ حصہ جو سواحل عرب، استنبول، بلغاریہ، یوگوسلافیہ سے تعلق رکھتا ہے مسلمانوں کے لئے اور بقیہ سفرنامہ عام ہندوستانیوں کے لئے خاص دلچسپی کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ حالات سے متاثر ہوکر آپ نے جگہ جگہ ایسے ریمارک بھی کئے ہیں جو نہ صرف عبرت انگیز بلکہ سبق آموز بھی ہیں۔ سوئزرلینڈ وسطی یورپ میں ایک چھوٹا سا کوہستانی ملک ہے جو بلحاظ سلسلۂ مواصلات اور قدرتی وسائل و ذرائع دولت ہندوستان کے مقابلہ میں کچھ بھی وقعت نہیں رکھتا لیکن جن طریقوں سے وہاں کے لوگ حصول معاش اور زندگی بسر کرتے ہیں ان سے ہم ہندوستانیوں کو ضرور سبق لینا چاہئے۔

اس سفرنامے کا پیرایۂ بیان دلچسپ اور طرز نگارش دلآویز، اخذ کردہ نتائج سبق آموز اور زبان سلیس و عام فہم ہے۔ بند سعید کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مصنف نے لفظ "[illegible]" استعمال کیا ہے۔ جو انگریزی لفظ میٹروپولٹن Metropolitan کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ بہت خوب اور قابل داد بلکہ تعریف سے مستغنی ہے۔ کتاب میں گیارہ ہاف ٹون تصویریں بھی دی گئی ہیں جن سے کتاب کی معنوی و صوری حیثیت [illegible]

زمانہ - کانپور - [illegible]

اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	روپیہ	آنہ	نام کتاب	صفحات	روپیہ	آنہ
سن کی بہا	۸۰	۰	۸	سحر کا جادو	۴۸	۰	۳
سرگزشت غالب	۶۴	۰	۸	طبیعیاتی کائنات	۹۸	۰	۸
نظام الملک	۴۰	۰	۴	متاع سخن	۱۳۴	۰	۱۲
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	بادہ سخن	۱۲۷	۰	۱۲
ارمغان جذب	۱۲۰	۱	۱۲	سراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲
یورپ جنگ سے پہلے	۴۱۸	۲	۸	ایمان سخن	۱۴۰	۰	۱۲
تاریخ سیاسیات	۲۷۲	۳	۸	فیض سخن	۱۴۴	۰	۱۲
سر سالار جنگ	۴۸	۰	۶	مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰
مغربی تصانیف اردو کے تراجم	۱۴۵	۱	۴	دوم (۵۰)	۴۳۲	۵	۰
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	نقد سخن	۱۷۵	۱	۰
اقبال نمبر	۱۶۸	۱	۴	نذر ولی	۲۴۸	۲	۸
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	من کی دنیا	۱۴۵	۱	۰
دادا بھائی	۱۶	۰	۲	مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸
اردو نامہ	۲۰۰	۲	۰	محرم نامہ	۱۱۲	۲	۰
سرگزشت حاتم	۱۲۸	۲	۰	نذر دکن	۱۵۴	۱	۴
عماد الملک	۴۰	۰	۶	روح غالب	۲۴۰	۲	۸
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۵	عاصمہ	۲۰۰	۱	۴
دوسری کتاب	۵۶	۰	۵	دفتری معلومات	۵۶	۰	۶
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	۰	آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶
کاغذ کی ناؤ	۱۲۰	۱	۴	اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲
فن تقریر	۹۲	۰	۸	نمود زندگی	۲۱۶	۱	۸
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴	۱	۰	سرگذشت ادارہ	۳۰۴	۰	۱۲
ہندستانی تمدن	۳۴۰	۳	۸	میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸
پودوں کی کہانی	۸۰	۰	۵	بلقان	۳۲	۰	۳
سرلقا	۰۰	۱	۰	خطابیات	۱۱۳	۰	۱۲
پانی کی کہانی	۴۸	۰	۶	علم خانہ داری	۱۵۰	۱	۰
رسایل طبیہ	۳۱۲	۲	۸	جیونٹی (۱۶) تصاویر	۸۰	۰	۱۲
سلک گوہریں	۴۰	۰	۴	انوار	۱۶۸	۱	۸
تاریخ ادب اردو	۱۷۶	۰	۸	کشمش ثانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰
رفیق اردو داں	۲۲۴	۱	۱۲	گارساں دتاسی	۱۲۸	۱	۴
آشوب	۵۶	۰	۸	رات کا بھولا	۱۶۵	۱	۴
حیدرآباد	۸۸	۰	۱۰	سکندر جاہ	۳۴		۴
شاد اقبال	۱۷۶	۲	۸	بلاغت	۵۹	۰	۱۰
آریائی زبانیں	۱۰۴	۱	۰	ادارہ سفر ۱۹۳۳ء میں	۲۰۰	۱	۸
نظام علی خاں	۳۲	۰	۴	ناصرالدولہ	۳۲	۰	۴
تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰	افضل الدولہ	۳۲	۰	۴
عرب اور عربستان	۵۶	۰	۱۰	نواب میر محبوب علی خاں	۳۴	۰	۴

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن